UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224608
UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٨٩١٥٤٣-٥ Accession No. ٩٢٥٠٣

Author مجلة عثمانية

Title مجلة عثمانية

This book should be returned on or before the date last marked below.

مجلس انتظامی مجلۂ عثمانیہ

سال تعلیمی ۱۳۳۰ف

صدر

مولوی محمد عبدالرحمن خانصاحب صدر کلیۂ جامعہ عثمانیہ

نگران حصہ انگریزی

ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پروفیسر انگریزی

نگران حصہ اردو و خازن مجلہ

ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب پروفیسر فارسی

نائب صدر انجمن اتحاد

خواجہ محمد احمد صاحب

مدیرین

محمد عبدالجلیل صاحب (حصہ انگریزی)

سید محمد اکبر وفاقانی صاحب (حصہ اردو)

جلال الدین صاحب اشک (حصہ اردو)

اطلاع

۱۔ طلبۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ کا یہ سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ حسب فصل مہینوں کے آخری ہفتوں میں شائع ہوا کریگا
امرداد (جون) آبان (ستمبر) بہمن (دسمبر) اردی بہشت (مارچ)
سال تعلیمی اور مجلہ کا سال ایک ہوگا۔

۲۔ رسالہ انگریزی اور اردو دو حصوں پر مشتمل ہوگا۔ حصہ اردو کے لئے تقریباً ۸ جزو اور حصہ انگریزی کیلئے تقریباً ۴ جزو مختص کئے جائیں گے۔ رسالہ کا سالانہ حجم کم از کم ۸۰۰ صفحات ہوگا۔

۳۔ مجلس نگرانی اشاعت کے متعلق ردّ و بدل کی مجاز ہوگی۔
مجلس انتظامی مضامین کے انتخاب کی مجاز ہوگی۔

۴۔ تمام مضامین منظوم و منثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔

۵۔ خریداری اور دیگر امور کے لئے اعزازی منتظم رسالہ سے دفتر کے پتہ پر خط و کتابت کیجائے۔

۶۔ چندہ کی تمام رقمیں اعزازی خازن مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں۔

چندہ

(۱) سرکار آصفیہ و برطانیہ سے ۱۰ سالانہ پیشگی (۵) طلبۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ سے ۱۱ سالانہ پیشگی
(۲) ارباب جامعہ اصحاب اقتدار اور دوسرے ۱۲ (۶) ممالک بیرون ہند سے ۱۵ شلنگ
(۳) عام خریداروں سے ۱۳ (۷) بلاد یورپ کے طلبہ قدیم سے ۱۰ شلنگ
(۴) طلبۂ قدیم رفاہیہ انجمنوں اور مطابع خانوں سے ۱۴ (۸) فی رسالہ ۱۶

بیرون ممالک سرکار عالی کے لئے چندہ سکہ کلدار ہوگا۔ خرچ ڈاک و رجسٹری اسکے علاوہ ہوگا۔ برٹش انڈیا کے اخراجات معہ رجسٹری ۱۷ کلدار ہوں گے۔ ممالک محروسہ کیلئے ۱۲ ر خرچ وی۔ پی ذمہ خریدار ہوگا چندہ سالانہ پیشگی ا

مجلۂ عثمانیہ

فہرست مضامین جلد دوم شمارۂ اوّل

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	معنوی تغیرات	مولوی سید سجّاد صاحب ایم۔ اے آنریری پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ	۱
۲	نقش قدم (نظم)	مولوی شبّیر حسن خاں صاحب جوشؔ ناظر ادبی دارالترجمہ	۱۶
۳	حیات اجتماعی اور جبلّت انسانی	جناب میر حسن الدّین صاحب بی۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ)	۱۸
۴	فریب ہستی (نظم)	جناب قاضی غلام احمد شریف صاحب آرامؔ سابق متعلم کلیہ	۳۹
۵	موالی	مولوی محمد عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ) مددگار پروفیسر تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ	۴۱
۶	حسن کی دیوی (نظم)	سید محمد اکبر وفاقانی، مدیر	۴۷
۷	اردو کا رواج ٹیپو سلطان کی فوج میں	جناب محمد حمید اللہ صاحب متعلم ایم۔ اے، ال ال۔ بی	۴۸
۸	رات سے خطاب (نظم)	محمد جلال الدین اشکؔ متعلم۔ ایم۔ اے، ال ال۔ بی، نائب مدیر	۶۴
۹	رودکی کا اصلی اور فرضی کلام	جناب سید محمد صاحب ایم۔ اے عثمانیہ لکچرار سٹی کالج	۶۵
۱۰	شباب (نظم)	جناب میر حسن الدین صاحب بی۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ)	۹۳
۱۱	دہریہ اور خدا	جناب محمد ابراہیم صاحب ایم۔ ایس سی سابق متعلم کلیہ	۹۴

۱۲	سکہ جات ٹیپو سلطان	مولانا حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری	۱۰۰
۱۳	رخصتِ شباب (نظم)	جناب محمد حبیب اللہ صاحب رشدی ایم۔اے (عثمانیہ)	۱۲۶
۱۴	طلسمی دروازہ (افسانہ)	مولوی احمد عارف صاحب مدیر صبح دکن	۱۲۷
۱۵	سورما (نظم)	جناب ابوالکلام محمد بدرالدین صاحب بدر متعلم (عثمانیہ میڈیکل کالج)	۱۴۹
۱۶	وفات نامہ مولوی وحیدالدین سلیم	جناب عبدالقادر صاحب سروری۔ایم۔اے، ال ال۔بی (عثمانیہ)	۱۵۱
۱۷	نوحۂ سلیم	مولانا سید احمد حسین صاحب امجد	۱۵۴
۱۸	تنقید و تبصرہ	مولانا حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری	۱۵۷
		سید معین الدین قریشی۔ مدیر	۱۶۴
۱۹	کلیہ کی خبریں	سید محمد اکبر وفاقانی۔ مدیر	۱۷۴

اک نشانِ پا سے ظاہر ہے گرانخوابی کا رنگ
اک نشانِ پا میں ہے تصویرِ بیتابی کا رنگ

اک نشاں آباد ہے اک نقشِ پا برباد ہے
عالمِ فانی بھی کیا مجموعۂ اضداد ہے

یہ مسافر دیکھ نشانِ پیچ و تابِ زندگی
یہ نشانِ پا ہیں اوراقِ کتابِ زندگی

حرف ذرّوں کے ہیں، دفترِ راہِ ناہموار کا
لکھ گیا ہے خاک پر کیا کیا قلم رفتار کا

دیدۂ احساس میں تسبیح کے دانے ہیں یہ
کاروانِ ہستیٔ انساں کے افسانے ہیں یہ

حیاتِ اجتماعی اور جبلّتِ انسانی

از جناب میر حسن الدین صاحب بی اے ال ال۔ بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ

جب ہم افعالِ انسانی کی تحلیل کرکے انمیں سے بعض افعال کو جبلّی (Instinctive) کہتے ہیں تو بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جبلّت ایک ایسا لفظ ہے جو ہماری لاعلمی کو چھپانے کا ایک پردہ ہے۔ بعض افعالِ انسانی کی یہ توجیہ کہ وہ جبلّی ہیں درحقیقت کوئی توجیہ نہیں۔ اور ایسا علم الاجتماع جو جبلّت کی اصطلاح کو استعمال کرتا ہے وہ یا تو بالکل نامکمل ہوگا یا اوسکی نوعیت بالکل مابعد الطبعی ہوگی۔ اسکا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ کسی ماہر اجتماعیات (Sociologist) کیلئے جو نفسیات کو اپنی تحقیقات کی بنیاد قرار دینا چاہتا ہے جبلّت کی اصطلاح کا استعمال ناگزیر ہے۔ جدید نفسیات نے اس اصطلاح کے مفہوم کو واضح طور پر متعیّن کردیا ہے جماعت کا ایسا نفسیاتی نظریہ جس میں انسانی جبلّتیں نظر انداز کردی گئی ہوں وہ یک طرفہ اور خالص

لے اس مضمون کے ماخذ یہ ہیں:—

1. Introduction to Social Psychology by Mc Dougall.

2. Principles of Psychology by William James.

3. Sociology in its Psychological aspects by Prof: Ellwood

عقلی (Rational) نظریہ ہوگا۔ جماعت انسانی کے نفسی پہلو کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسانی جبلتوں سے بحث کا آغاز کیا جائے۔ اجتماعی نفسیات (Social Psychology) مکمل نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ اس بات پر روشنی نہ ڈالی جائے کہ حیاتِ اجتماعی کی تشکیل اور رہنمائی میں جبلت کا کیا حصہ ہے۔ ہم سطور ذیل میں جبلت اور حیات اجتماعی کے باہمی تعلق پر کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے۔

ارسطو کے زمانہ سے حیات اجتماعی کے متعلق جتنے بھی نظریات پیش کئے جاتے رہے ہیں اُن میں بلاواسطہ یا بالواسطہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ حیات اجتماعی کی تشکیل میں بہ نسبت عقل کے جبلی عناصر کا زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ ارسطو کے نظریۂ جماعت کا ماحصل یہ ہے کہ جماعت انسانی کی ماہیت بالکل جبلی ہے۔ ارسطو کے زمانہ سے لیکر عہد حاضر تک کے اکثر مفکرین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اجتماعی جبلت یا جبلتوں سے جماعت کی تشکیل وارتقا ہوتا ہے۔ اس ابتدائی نظریہ میں بداہتہً یہ نقص نظر آتا ہے کہ یہ جماعت کو ایک یا چند جبلتوں پر مبنی کردیتا ہے حالانکہ خود انسان کی تمام جبلتیں حیات اجتماعی کے اثر وعمل سے تغیر پاتی رہتی ہیں۔ وہ اجتماعی تعلقات نہ صرف ایک یا چند جبلتوں کی بنا پر قائم کرتا ہے بلکہ اوسکی تمام جبلتیں اجتماعی میلان رکھتی ہیں۔ اجتماعی جبلتوں کے تحت حیات اجتماعی کی توجیہ کرنیکا یہ قدیم طریقہ ایک حدتک غیر عملی ہے' گو کامتے (Comte) نے جس کو سائنس میں مابعد الطبیعیاتی عنصر شامل کرنے سے سخت نفرت تھی اس عام خیال کو تسلیم کرلیا ہے کہ انسان بالطبع ایک اجتماعی حیوان ہے۔ علوم اجتماعی کے تمام مصنفین نے صریحی یا معنوی طور پر جبلت کو حیات اجتماعی کا ایک لازمی عنصر تسلیم کیا ہے۔ بعض مصنفین جبلت کی اصطلاح کو بہت مبہم طریقہ پر استعمال کرتے ہیں۔ ابتدائی معاشین نے "محنت سے نفرت" یا "جلب منفعت" جیسی ذہنی کیفیات کو "فطرت انسانی کے خواص" ٹھہرایا ہے۔ لیکن جدید نفسیات کی روشنی میں غور کیا جائے تو "فطرت انسانی کے خواص" سے یہی مفہوم نکلیگا کہ یہ خلقی میلات (Innate tendencies) یا صلاحتیں ہیں' یعنے وسیع معنوں میں جبلتیں ہیں۔ اگر علوم اجتماعی کو سائنٹفک یعنے علمی بنانا ہو تو اس قبیل کی تمام اصطلاحات کی تشریح جدید نفسیات کی روشنی میں کی جانی چاہیئے۔

کامتے یہ تسلیم کرتا ہے کہ حیات اجتماعی کی تشکیل میں جبلت ایک اہم حصہ لیتی ہے۔ وہ اپنے

ہمعصر ماہرین اجتماعیات پر یہ الزام لگاتا ہے کہ انہوں نے اس خیال کو تسلیم کرلیا کہ حیات انسانی کا عام کردار عقل کے تابع ہوتا ہے لیکن اس الزام سے خود کاسمتے بری نہیں ہوسکتا کیونکہ اوس کے بیان میں تناقص موجود ہے۔ اوسکا بھی یہ خیال ہے کہ جماعت کی تشکیل و تنظیم عقلی بنیاد پر ہوتی ہے۔ کاسمتے کو اس الزام سے بری رکھنا چاہئے کیونکہ وہ جدید نفسیات سے ناواقف تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ بعض ماہرین اجتماعیات حیات اجتماعی کی تشکیل و تنظیم میں جبلت کا جو کچھ حصہ ہے اوسکو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن پروفیسر وارڈ اور دیگر مصنفین نے اجتماعی نشو و نما کی غیر شعوری نوعیت پر زور دیا ہے۔ جماعت میں اس غیر شعوری عنصر سے اونکی مراد جبلی یا حیاتیاتی (Biological) عنصر ہے۔ وارڈ نے اپنے اجتماعی نظریات میں "خواہش" کا جو لفظ استعمال کیا ہے اوس سے ظاہر ہے کہ یہ "خواہش" کم و بیش کورانہ ہیجان کے مترادف ہے جو جبلت سے نہایت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ بہرحال مکڈوگل کی کتاب "نفسیات اجتماعی" کے شائع ہونے تک اس بات پر پوری طرح روشنی نہیں ڈالی گئی تھی کہ حیات اجتماعی کی تشکیل میں جبلت کا کیا حصہ ہے۔ حیات اجتماعی میں جبلتوں کے عمل و اثر کے متعلق مکڈوگل اور اسکے ہمعصر مصنفین نے جو آراء و خیالات ظاہر کئے ہیں اونکا مشترک ماخذ پروفیسر جیمس کی مشہور کتاب "اصول نفسیات" ہے جس کے چوبیسویں باب میں جیمس نے جبلت انسانی پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یوں تو اور مصنفین نے جبلت اور حیات اجتماعی پر بہت سے مضامین لکھے ہیں لیکن سب سے پہلے مکڈوگل ہی نے منضبط طور پر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جبلت کا نہ صرف حیات اجتماعی سے بلکہ تمام علوم اجتماعی سے کیا تعلق ہے۔ اس بات پر بحث کرنے کے بعد کہ تمام اجتماعی مظاہر میں جبلت کا کیا حصہ ہے مکڈوگل کہتا ہے کہ "تمام ملتف و پیچیدہ افعال کے ماخذ و منفذ کو جن سے جماعتوں کی زندگی تشکیل پاتی ہے جبلتوں اور اون ابتدائی میلانات میں تلاش کرنا چاہئے جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں اور جن کا سلسلہ نسل انسانی کے مورث بعید تک پہونچتا ہے"۔ اگر ہم نفسیاتی نقطہ نظر سے جماعت انسانی کا مطالعہ کرنا چاہیں تو یہ ناگزیر ہے کہ حیات انسانی کے اون ذاتی اور خلقی عناصر سے بحث کا آغاز کیا جائے جو اون افراد میں پائے جاتے ہیں جن سے جماعت مرکب ہوتی ہے۔ اور اسکے بعد یہ دکھایا جائے کہ

ہمعصر ماہرین اجتماعیات پر یہ الزام لگاتا ہے کہ انہوں نے اس خیال کو تسلیم کرلیا کہ حیات انسانی کا عام کردار عقل کے تابع ہوتا ہے لیکن اس الزام سے خود کاسمتے بری نہیں ہوسکتا کیونکہ اوس کے بیان میں تناقص موجود ہے۔ اوسکا بھی یہ خیال ہے کہ جماعت کی تشکیل و تنظیم عقلی بنیاد پر ہوتی ہے۔ کاسمتے کو اس الزام سے بری رکھنا چاہئے کیونکہ وہ جدید نفسیات سے ناواقف تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ بعض ماہرین اجتماعیات حیات اجتماعی کی تشکیل و تنظیم میں جبلت کا جو کچھ حصہ ہے اوسکو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن پروفیسر وارڈ اور دیگر مصنفین نے اجتماعی نشو و نما کی غیر شعوری نوعیت پر زور دیا ہے۔ جماعت میں اس غیر شعوری عنصر سے اونکی مراد جبلی یا حیاتیاتی (Biological) عنصر ہے۔ وارڈ نے اپنے اجتماعی نظریات میں "خواہش" کا جو لفظ استعمال کیا ہے اوس سے ظاہر ہے کہ یہ "خواہش" کم و بیش کورانہ ہیجان کے مترادف ہے جو جبلت سے نہایت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ بہرحال مکڈوگل کی کتاب "نفسیات اجتماعی" کے شائع ہونے تک اس بات پر پوری طرح روشنی نہیں ڈالی گئی تھی کہ حیات اجتماعی کی تشکیل میں جبلت کا کیا حصہ ہے۔ حیات اجتماعی میں جبلتوں کے عمل و اثر کے متعلق مکڈوگل اور اسکے ہمعصر مصنفین نے جو آراء و خیالات ظاہر کئے ہیں اونکا مشترک ماخذ پروفیسر جیمس کی مشہور کتاب "اصول نفسیات" ہے جس کے چوبیسویں باب میں جیمس نے جبلت انسانی پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یوں تو اور مصنفین نے جبلت اور حیات اجتماعی پر بہت سے مضامین لکھے ہیں لیکن سب سے پہلے مکڈوگل ہی نے منضبط طور پر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جبلت کا نہ صرف حیات اجتماعی سے بلکہ تمام علوم اجتماعی سے کیا تعلق ہے۔ اس بات پر بحث کرنے کے بعد کہ تمام اجتماعی مظاہر میں جبلت کا کیا حصہ ہے مکڈوگل کہتا ہے کہ "تمام ملتف و پیچیدہ افعال کے ماخذ و منفذ کو جن سے جماعتوں کی زندگی تشکیل پاتی ہے جبلتوں اور اون ابتدائی میلانات میں تلاش کرنا چاہئے جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں اور جن کا سلسلہ نسل انسانی کے مورث بعید تک پہونچتا ہے"۔ اگر ہم نفسیاتی نقطہ نظر سے جماعت انسانی کا مطالعہ کرنا چاہیں تو یہ ناگزیر ہے کہ حیات انسانی کے اون ذاتی اور خلقی عناصر سے بحث کا آغاز کیا جائے جو اون افراد میں پائے جاتے ہیں جن سے جماعت مرکب ہوتی ہے۔ اور اسکے بعد یہ دکھایا جائے کہ

توسط سے حاصل کرنے میں اعانت کرتی ہے۔

ایک اور بات قابل غور یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کے حیوانات میں بہ نسبت ادنیٰ حیوانات کے جبلتیں بتدریج ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جبلتوں کو مکمل ارتقاء حاصل کرنے کیلئے کئی مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔ ایک بالغ فرد میں اپنی نوع کی تمام جبلتیں موجود ہوتی ہیں لیکن ان میں سے صرف وہی جبلتیں پوری طرح نمو پاتی ہیں جن پر خارج سے مناسب مہیجات کا اثر پڑتا ہے ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ عضوی تغیرات کے دوران میں بعض جبلتیں کمزور یا سلب ہو جاتی ہیں۔

اب ہم یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ انسانی جبلتوں کی کیا ماہیت ہے اور دوسرے حیوانات کے جبلی افعال سے یہ کس حد تک مختلف ہیں۔ انسان میں تمام اعلیٰ درجہ کے حیوانات کی طرح ایک اعلیٰ درجہ کا نمو یافتہ نظام عصبی موجود ہے اور اس میں ردِ عمل کی مکمل قوتیں پائی جاتی ہیں۔ ردِ عمل کی یہ قوتیں کسی نوع کی جسمانی خصوصیات کی طرح ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ردِ عمل کی ان موروثی قوتوں کو دو اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اضطراری (Reflexive) اور جبلی۔ لیکن سہولت کی غرض سے ہم ان خلقی پیدائشی قوتوں کو جبلت کی اصطلاح سے تعبیر کریں گے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے انسان میں ردِ عمل کی یہ خلقی قوتیں متعین اور ناقابل تغیر نہیں ہوتیں بلکہ ماحول کے تغیر کے ساتھ ساتھ انہیں بھی تغیر واقع ہوتا ہے اور یہ سلب بھی ہو سکتی ہیں۔ ادنیٰ درجہ کے حیوانات کی طرح انسانی جبلتیں متعین و مخصوص نہیں ہوتیں بلکہ یہ غیر متعین، مبہم، عام اور تغیر پذیر ہوتی ہیں۔ انسان میں جبلی ردِ عمل کا ایک ملتف اور عام سلسلہ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان آسانی کے ساتھ اپنے ماحول سے تطابق پیدا کر لیتا ہے اور صحیح معنوں میں انسان کی حیات ذہنی کی بنیاد بھی یہی ہیں۔ لہٰذا جبلی ردِ عمل انسان کی ذہنی و اجتماعی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے۔ اسی بنیاد پر تمام عادتیں تشکیل پاتی ہیں۔ بقول تھارن ڈائک (Thorndike) کے جبلتیں عادتوں میں منتقل ہو کر انسان کی منتقل ملک بن جاتی ہیں۔

بہر حال انسان کے یہ نفسی طبعی میلانات (Psycho-physical tendencies) جو خلقی ہیں کسی نظریہ اجتماع میں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ حیاتِ انسانی کی کسی خاص مثال کو لیکر یہ دکھلانا ناممکن نہیں

دشوار ضرور ہے کہ اس میں خلقی عنصر کس قدر ہے اور اکتسابی کس قدر۔ گو ان دونوں عناصر کے باہمی تعلق کو متعین کرنا دشوار ہے لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان دونوں کا وجود لازمی ہے اور خلقی عنصر کو اولیت حاصل ہے۔

مکڈوگل نے جبلت کی یہ تعریف کی ہے کہ "یہ ایک موروثی یا خلقی نفسی طبعی میلان ہے جو اپنے حامل کو ایک خاص صنف اشیاء کا ادراک کرنے اور اوس پر متوجہ ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ اور (انسان) کو اس قسم کی اشیاء کے ادراک سے ایک خاص قسم کا جذبہ محسوس ہوتا ہے جس کے متعلق وہ ایک خاص طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ یا کم از کم اس میں اس قسم کے عمل کا ہیجان پیدا ہوتا ہے"۔ اس تحدید سے جبلت کا تصور بے حد ملتف ہوجاتا ہے۔ خود مکڈوگل اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ بہت سی جبلتیں ایسی ہیں جن کے ساتھ متعین طور پر کوئی جذبہ وابستہ نہیں ہوتا۔ اس تحدید کے لحاظ سے بہت سے عام اور غیر متعین میلانات جیسے تقلید Imitation اور ہمدردی وغیرہ جبلت کی تعریف سے خارج ہوجاتے ہیں۔ مکڈوگل کی تحدید کا عطر بس یہی ہے کہ جبلت ایک "خلقی نفسی طبعی میلان" ہے۔ ہمارے پیش نظر مقصد کے لئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت انسانی کے ان تمام میلانات کو "جبلی میلانات" کے ایک مجموعی نام سے تعبیر کیا جائے۔ اور یہ ملحوظ رکھا جائے کہ انسان میں بعض جبلتیں کم و بیش متعین و مخصوص ہیں اور یہ اس قدر نمایاں ہیں کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں فعل فلاں جبلت سے متعلق ہے۔ تھارن ڈائک کا یہ خیال بھی قابل قبول ہے کہ انسان کی اکثر جبلتیں مبہم اور نسبتہً غیر متعین ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے جیسا کہ جیمس کا خیال ہے انسان میں جبلتوں کی تعداد بہ نسبت دوسرے حیوانات کے زیادہ ہوتی ہے۔

اس بات کو قطعیت کے ساتھ متعین کرنا دشوار ہے کہ انسان کے کون کونسے افعال حقیقتہً جبلی ہیں عام طور پر اون افعال کو جبلی کہا جاتا ہے جو تمام نوع میں پائے جاتے ہیں یعنے وہ افعال جو تمام انسانوں میں اور تہذیب کے تمام منازل میں نسبتہً بالاشتراک پائے جاتے ہیں۔ یہ خیال بھی قطعی طور پر صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ مختلف انسانی مجامع مختلف ماحول کے تابع رہتے ہیں مختلف نسلوں کے جبلی ردعمل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک مہذب آدمی کے ردِ عمل کا طریقہ ایک غیر مہذب آدمی سے مختلف ہوتا ہے۔

لہذا ہم اون افعال کو جبلی یا خلقی کہینگے جو کسی نوع کے سوادِ اعظم (Majority) میں بالاشتراک پائے جائیں۔ انسان اور حیوان کے افعال کے باہمی موازنہ سے بھی ہم انسانی جبلتوں کو دریافت کر سکتے ہیں۔ اعلےٰ درجہ کے حیوانات میں ایسی جبلتیں پائی جاتی ہیں جو انسانی جبلتوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔ اطفال کے مطالعہ سے بھی ہم ان خلقی میلانات کے تدریجی نمو کو معلوم کر سکتے ہیں جو ابھی تربیت کے اثر سے محفوظ ہیں۔ اب ہم ذیل میں انسانی جماعتوں کی تشکیل و تنظیم اور انسانی اداروں کی ساخت و نمو میں جبلتوں کے عمل کو متحقق کرنے کی کوشش کرینگے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جبلی ردِ عمل افرادِ جماعت کے اتحاد و اتفاق کی بنیاد ہے یعنے اجتماعی تعلقات اسی پر مبنی ہوتے ہیں۔ انسانی جبلتوں سے نہ صرف جماعت کی سادہ صورتیں وجود میں آتی ہیں بلکہ اداروں کی تشکیل و تنظیم بھی جبلی افعال پر مبنی ہوتی ہے۔ انسانی ادارے جو جبلتوں پر مبنی ہوتے ہیں وہ جماعت کی ایسی نمو یافتہ صورتیں ہیں جو مستند سمجھی جاتی ہیں۔ حیات اجتماعی جن چیزوں کو مستند قرار دیتی ہے اونکا انحصار خالص عقل پر نہیں بلکہ جبلت پر ہوتا ہے۔

تاہم انسانی اداروں میں جیسا کہ وہ عہد حاضر کے تہذیب یافتہ ممالک میں پائے جاتے ہیں جبلی عناصر کا پتہ لگانا ذرا دشوار ہے۔ اسکی محض یہ وجہ نہیں کہ جبلی افعال پر عادات کا گاڑھا غلاف چڑھ گیا ہے جس کو ہم رواج یا روایات سے تعبیر کرتے ہیں بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ خود انسانی جبلتیں بیحد ملتف و پیچیدہ ہیں۔ ہم ردِ عمل کی خلقی قوتوں کے باہمی تعلق کو کسی درخت کی مختلف شاخوں سے تشبیہ نہیں دے سکتے جبلی افعال ایسے پیچیدہ طریقہ سے ایک دوسرے سے متحد و متفق ہوتے ہیں کہ ان کی توضیح کے لئے عالم خارجی میں کوئی تشبیہ نہیں ملتی۔ انفرادی اور اجتماعی اعمال میں بعض جبلتیں اس طریقہ سے متحد ہو کر اثر کرتی ہیں اور تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کے اشتراک عمل میں اس طرح تغیر واقع ہوتا ہے کہ مہذب جماعتوں میں جبلتوں کا تعین کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ انسانی ادارے ایک یا کئی جبلتوں کے اشتراک عمل کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ جبلی افعال درحقیقت عضوی اعمال ہیں اور اسی لئے ہر عضوی عمل کی طرح غیر متعین اور پیچیدہ ہوتے ہیں اور ایک

دوسرے پر عمل و اثر کرتے ہیں۔

انسانی جبلتوں کی پیچیدگی کی وجہ سے ابتک جبلتوں کی کوئی تشفی بخش تقسیم نہیں ہوسکی۔ مارٹنل نے حسب ذیل تقسیم پیش کی ہے۔

(۱) جبلتیں جو فرد کی بقائے حیات سے وابستہ ہیں۔

(۲) جبلتیں جو نوع کی بقا سے وابستہ ہیں۔

(۳) جبلتیں جو مجامع یا جماعتوں کی بقا سے وابستہ ہیں۔

یہ تقسیم ایک حد تک تشفی بخش ہے لیکن پھر بھی قطعی نہیں کہی جاسکتی مثلاً بعض جبلتیں ایسی ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ فرد، نوع یا جماعت میں سے کس کی بقا سے وابستہ ہے۔ ایک دوسری تجویز یہ پیش کیجاتی ہے کہ جبلتوں کو انسانی اداروں کے لحاظ سے تقسیم کرنا چاہئے۔ لیکن ایک ہی جبلت مختلف اداروں میں عمل پیرا ہوتی ہے اور ایک ہی ادارہ کئی ایک جبلتوں پر مبنی ہوتا ہے۔ لہذا اس طریقہ سے جبلتوں کی تقسیم دشوار نظر آتی ہے۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ جبلتوں کو تقسیم کرنے کے بجائے حیات اجتماعی کے خاص خاص مظاہر اور جبلتوں سے ان کے باہمی تعلق پر غور کیا جائے۔

انسان کی سب سے پہلی احتیاج غذا ہے غذا کے فراہم کرنے اور اس کو محفوظ رکھنے کی جبلتیں انسان اور نیز حیوانات میں موجود ہیں۔ شکار کی جبلت جو ابتدائی انسان میں بہت ہی قوی نظر آتی ہے وہ جدید جماعات میں غذا کے فراہم کرنے کی مختلف صورتوں میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ تمام نسلیں خواہ وہ شکار کے ذریعہ سے غذا مہیا کرتی ہوں یا کسی اور طریقہ سے جبلی طور پر یہ کوشش کرتی ہیں کہ غذا فراہم کرنے کے ذرائع پر قابو حاصل کیا جائے اور غذا کو محفوظ رکھا جائے۔ انسانی مجامع یا جماعات کی ابتدائی دولت یا ملک یہی فراہم کردہ غذا ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں تمام اعلیٰ درجہ کے حیوانات اور بالخصوص انسان میں غذا فراہم کرنے کیلئے محنت کرنے کا جبلی میلان پایا جاتا ہے۔ قدیم معاشیین نے اس بات پر بہت زور دیا تھا کہ انسان میں محنت سے گریز کرنے کا میلان ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان اور بالخصوص مہذب انسان میں چند حالات یا ہیجانات کے تحت محنت کرنے کی جبلت پائی جاتی ہے۔ انسان بغیر محنت کے زندہ نہیں رہ سکتا محنت کی

جبلت جو ابتداً غذا فراہم کرنے سے وابستہ ہوتی ہے وہ تدریجی نشو ونما کے بعد دوسری صورتوں میں ظاہر ہونے لگتی ہے۔ آبادی کے تغیرات جیسے نقلِ مقام، نوآبادیات وغیرہ اسی فراہمی غذا کی جبلت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس جبلت کے خاص خاص مظاہر سے آگے بحث کیجائیگی۔ یہاں صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ اس جبلت کی اہمیت کو کوئی اجتماعی نظریہ نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اس جبلت میں اکثر و بیشتر اختلال بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ گداگری، سرقہ وغیرہ اسی اختلال کی نمایاں مثالیں ہیں۔

جو جبلت تناسل یا افزائش نسل سے وابستہ ہوتی ہے وہ نہ صرف خاندان بلکہ اون اداروں کی بھی بنیاد ہے۔ جو اطفال کی تربیت وحفاظت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس جبلت کی تحلیل دو اور ابتدائی یا بسیط جبلتوں میں کی جاتی ہے۔ (۱) جبلت شہوانی (۲) جبلت ولدیت۔ جبلت شہوانی کے تحت میلان جنسی (Sex attraction) کو اور جبلت ولدیت کے تحت پدری ومادری محبت کو رکھنا چاہئے۔ جبلت شہوانی دونوں جنسوں کے باہمی انجماد واشتراک عمل کی بنیاد ہے۔ اسی سے ازدواج اور خاندان جیسے ادارے نمو پاتے ہیں۔ انسان کے ابتدائی مجامع میں اس جبلت کا ہونا ضروری تھا تاکہ ہر آنیوالی نسل کے افراد کی تعداد اپنی گذشتہ نسل کے افراد کی تعداد سے زیادہ رہے ورنہ وہ جماعت بہت جلد ناپید ہوجاتی ہے۔ جن افراد میں یہ جبلت کمزور ہوتی ہے وہ اپنی نسل میں اضافہ نہیں کرسکتے اس کے برعکس جن میں یہ غیر معمولی طور پر قوی ہوتی ہے وہ اپنی نسل میں کمزور افراد کا اضافہ کرتے ہیں جماعت انسانی میں جبلت شہوانی کو قابو میں رکھنے کا مسئلہ ایک اہم اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ قانونِ ملک اخلاق، جماعت کا رواج، اور مذہب وغیرہ اس جبلت کے اظہار پر بہت سے قیود اور شرائط عائد کرتے ہیں۔ اسی جبلت کی تنظیم پر نسل کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ اس جبلت کا اختلال جماعت کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ زنا، عیاشی وغیرہ اسی اختلال کے مظاہر ہیں۔

جبلت شہوانی سے میلان جنسی اور ازدواج نمو پاتے ہیں۔ اور خاندانی زندگی کا بھی سنگِ بنیاد یہی ہے لیکن جبلت ولدیت خاندانی زندگی کو مستحکم کردیتی ہے۔ لہٰذا اس ادارہ (خاندان) کی حقیقی بنیاد جبلت ولدیت ہے چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ مہذب یا غیر مہذب اشخاص میں جو لاولد ہوتے ہیں ازدواجی تعلقات

آسانی سے منقطع ہو سکتے ہیں۔

جبلّت ولدیت کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ اون جبلّتوں میں سے ہے جن کی قوت دونوں جنسوں میں مختلف ہوتی ہے۔ مادری محبّت بہ نسبت پدری محبّت کے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ ایک زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بچّہ کے بیچارگی و کمزوری وغیرہ کے ادراک سے مادری محبّت نمو پاتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر مادری محبّت چند عقلی عناصر پر مبنی ہے۔ یہ ایسا سطحی خیال ہے جو انسان کے جذبات و تاثرات کے حیاتیاتی مبداء (Biological origin) کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر ہم اس جبلّت کے نشو و نما میں عقلی عناصر کو شامل بھی کر لیں تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک خلقی میلان ہے۔

جماعت کی ترتیب و تنظیم میں جبلّت ولدیت کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ والدین کی محبّت کے بالمقابل پسری محبّت ہوتی ہے۔ بچّہ کو اس بات کے سکھانے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی حفاظت و پرورش کرنے والوں سے محبّت کرے۔ بچّوں کے مابین ایک فطری میلان نمو پاتا ہے جس کو برادرانہ محبّت کہتے ہیں۔ والدین جب اپنے بچّوں کی حفاظت و پرورش کرتے ہیں تو اس سے اون میں خدمت گزاری اور ایثار کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ افراد میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے بچّوں کی محبّت محرک و مہیج کا کام دیتی ہے۔ بعض علمائے نفسیات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جبلّت ولدیت کی نشو و نما کا اعلیٰ نتیجہ اخوانیت (Altruism) ہے۔ علمائے اجتماعیات نے بھی یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اخوانیت کے پیدا کرنے میں خاندانی زندگی کا ایک خاص عنصر ہوتا ہے۔ کسی جماعت میں خاندانی زندگی کی نوعیت معلوم کرنے کیلئے یہ دیکھنا چاہئے کہ اوسمیں اخوانیت کس قدر پائی جاتی ہے۔

فلسفۂ اجتماع کی قدیم تصانیف میں صیانت ذات کی جبلّت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن جدید نفسیات نے اس جبلّت کو بہت سی ابتدائی جبلّتوں میں تحلیل کر دیا ہے۔ تمام حیوانات میں جبلی طور پر یہ میلان موجود ہے کہ ماحول کے مضر اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔ خطرہ سے گریز کرنا اور اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا اسی جبلّت کی سلبی صورتیں ہیں۔ دست و بازو سے دشمن کا مقابلہ کرنا یعنے جسمانی قوتوں کو استعمال کرنے اور لڑنے کا میلان اسی جبلّت کی ایجابی صورت ہے۔ حفاظت ذات سے جو جبلّتیں متعلق ہیں ان میں سے

جبلتِ نزاعی (Instinct of Combativeness) بالکل بنیادی ہے۔ ایک ہی نوع کے افراد کے مابین جو پیکار و تنازع ہوتا ہے وہ فراہمی غذا اور افزائش نسل کی جد وجہد کا ایک سلبی پہلو ہے۔ کسی نوع میں پیکار کے مواقع اوسی وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ افراد غذا فراہم کرنے' یا شریک زندگی کو تلاش کرنے یا اپنی اولاد کی حفاظت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب جبلت نزاعی پوری طرح نمو پا چکتی ہے تو افراد حیثیت مجموعی جنگ آزما ہوتے ہیں یعنے ایک جماعت دوسری جماعت سے مقابلہ کرتی ہے۔

اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نوعِ انسانی کے ابتدائی دور میں جبلت نزاعی نہایت قوی ہوگی اور ابتدائی حالات کچھ ایسے ہونگے کہ ایک فرد دوسرے فرد کے اور ایک جماعت دوسری جماعت کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہوگی۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ ایک حیوان بھی اوسوقت تک لڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا جبتک کہ اوس پر حملہ نہیں کیا جاتا اور بالخصوص وہ اپنی ہی نوع کے افراد سے شاذ ہی برسرِ پیکار رہتا ہے۔ یہی بات ابتدائی انسان پر بھی صادق آتی ہے۔ جب انسانی آبادی گنجان ہونے لگی اور غذا و مقامات رہائش کے لئے مسابقت شروع ہوگئی تو انسان کی جبلت نزاعی اپنی پوری قوت کے ساتھ ظہور پذیر ہونے لگی۔ یہ خیال غلط نہیں کہ دورانِ ارتقاء میں انسان کی جبلت نزاعی کی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس کا انتہائی مظہر تہذیب کا وہ دور ہے جو بربریت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک مہذب انسان میں بھی یہ جبلت غیر ضروری طور پر قوی ہوتی ہے۔ عہدِ حاضر میں بھی صنعتی' سیاسی' اور اجتماعی زندگی کی کشاکش انسان میں اس قدر وحشت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ جرائم کے ارتکاب پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور جدید قومیں ذرا سے اشتعال پر ایک دوسرے کا گلا گھوٹنے اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ اجتماعی و اخلاقی اصلاح کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ جماعت سے اون اسباب کو رفع کیا جائے جو پیکار و تنازع کے مواقع پیدا کرتے ہیں اور اون ہیجانات کو روکا جائے جو جبلت نزاعی کو اکساتے ہیں۔ مدبرین کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ اون مواقع کو پیدا نہ ہونے دیں جو اقوام کے باہمی تنازع کا باعث ہوتے ہیں۔ معلمین کے لئے یہ اہم ترین مسئلہ ہے کہ افراد کو اپنی جبلت پر قابو رکھنے کی تربیت دیں تاکہ ایک فرد اپنی جماعت کے دوسرے افراد سے مطابقت پیدا کرنے کے قابل ہو سکے۔

اوپر یہ بحث گزر چکی ہے کہ جماعات کے ارتقاء میں جبلّت نزاعی کا کیا حصّہ ہوتا ہے۔ کسی جماعت کے افراد مدافعت کے وقت کس طرح آپس میں متحد و متفق ہو جاتے ہیں، اُن میں کسطرح ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے اور اُن کو اپنی حیات اجتماعی کا کسطرح احساس ہوتا ہے۔ جنگ کے موقعوں پر خواہ وہ مدافعانہ ہی کیوں نہ ہوں جماعت کو منتظم کرنے کے لئے ایک قائد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ قائدین کی وجہ سے نہ صرف جماعت کی سیاسی بلکہ اجتماعی ترقی میں بھی مدد پہونچتی ہے۔ اس طریقہ سے جبلّت نزاعی انسانی مجامع میں منفی حیثیت سے اتحاد عمل پیدا کرتی ہے۔ تمام فوجی اداروں کا تعلق براہِ راست حفاظت ذات کی جبلّت سے اور خصوصاً جبلّت نزاعی سے ہوتا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جن جماعتوں میں بہترین سپاہی پیدا ہوتے تھے انہوں نے دنیا کے سامنے تمدن اور اجتماعی اداروں کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔ بعض وقت یہ نزاعی جبلّتیں اس قدر قوی ہو جاتی ہیں کہ اون سے جماعت کی زندگی کو صدمہ پہونچتا ہے اور ان سے تہذیب و تمدن کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ اور بعض دفعہ خود کسی جماعت کے افراد آپس میں جنگ آزما ہو کر اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں۔ جبلّت نزاعی کا اختلال نہ صرف افراد میں بلکہ جماعتوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

جبلّت نزاعی سے قریبی تعلق رکھنے والی رقابت یا رشک کی جبلّت ہے۔ یہ بھی جبلّت نزاعی کی ایک دُھندلی سی صورت ہے لیکن اسکے مظاہر کسی قدر مختلف ہوتے ہیں۔ مکڈوگل کہتا ہے کہ "جبلّت نزاعی اون افراد یا جماعتوں کو تباہ کرنے کا میلان رکھتی ہے جو حفاظت ذات کے ناقابل ہوتی ہیں لیکن رقابت کی جبلّت افراد یا جماعتوں کی تباہی سے براہِ راست متعلق نہیں ہوتی"۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ جبلّت رشک کا اقتضاء یہ ہے کہ مقابلہ کرنے والے برقرار رہیں۔ رشک یا رقابت ایک قسم کی مسابقت ہے جو انسان سے خاص طور پر متعلق ہے۔ افراد کی طرح جماعات میں بھی رشک کی جبلّت پائی جاتی ہے۔ جدید جماعتوں میں حیاتِ اجتماعی کی تمام صورتوں میں اسکے مظاہر پائے جاتے ہیں۔ جبلّت رقابت میں جب اختلال پیدا ہوتا ہے تو وہ خونخواری اور بربریت کے بدترین نمونے پیش کرتی ہے جیسا کہ گزشتہ جنگ عظیم سے ظاہر ہے۔

انسان بالعموم دیگر اعلیٰ حیوانات کی طرح جہاں تک پتہ چل سکا ہے خاندان سے زیادہ وسیع مجامع میں زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ اسکی وجہ اوپر ظاہر کر دی گئی ہے۔ حیاتِ اجتماعی سے انسان کو ابتداہی سے

جو فوائد حاصل ہوتے رہے اوسکی وجہ سے انسان کی جبلّت اجتماعی مستحکم ہوتی گئی ۔ انسان ہمیشہ جماعت میں رہنا چاہتا ہے تنہائی سے اوس کو تنفر ہے ۔ قید تنہائی ہر زمانہ میں سخت ترین سزا تصور کی گئی ہے ۔ وحشی جانوروں سے محفوظ رہنے' غذا فراہم کرنے' اور دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ ناگزیر تھا کہ انسان وسیع ترین مجامع میں زندگی بسر کرے تاکہ وہ اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکے ۔ جب کبھی مختلف جماعتوں میں پیکار و تنازع واقع ہوا ہے صرف وہی جماعت اس تنازع للبقا سے صحیح سلامت نکل سکی ہے جس کے افراد کی تعداد نسبتہً زیادہ تھی ۔ اسی لئے انسان میں یہ زبردست میلان پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جماعت کا ایک جزو لاینفک بنادے ۔

انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے جبلّت اجتماعی سے زیادہ اہم کوئی اور جبلّت نہیں ۔ مکڈوگل کا خیال ہے کہ انسان کا یہ میلان کہ وسیع ترین آبادیوں میں زندگی بسر کرے جس کو ہم شہری زندگی کہتے ہیں درحقیقت اسی جبلّت اجتماعی پر مبنی ہے ۔ جوں ہی مادی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے انسان میں فطری طور پر شہری زندگی کا میلان پیدا ہو جاتا ہے ۔ اگرچہ اس زمانہ کے بڑے بڑے شہر صنعتی و تجارتی قوتوں کی پیداوار ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے عقب میں وہی جبلّت اجتماعی عمل پیرا ہے ۔

اکثر علمائے نفسیات کا خیال ہے کہ جبلّت اجتماعی اون جبلتوں کی ایک نمو یافتہ صورت ہے جو خاندانی زندگی سے وابستہ ہوتی ہیں ۔ اتنا تو بہرحال تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ جبلّت بھی انہی جبلتوں کے تحت آتی ہے جن کو ہم اخوانی جبلتوں سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اخوانیت جو خاندانی زندگی سے پیدا ہوتی ہے ترقی کرتے کرتے بڑی بڑی جماعتوں میں ظہور پذیر ہونے لگتی ہے ۔ اجتماعی جبلّت ہمدردی کی جبلّت سے ملکر مختلف اور وسیع تر جماعتوں کے افراد میں اتحاد و اتفاق پیدا کرتی ہے اور اجتماعی تنظیم کا مفہوم اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ اسمیں کُل نوع انسان داخل ہو جاتی ہے ۔

یہ مسئلہ بھی علمائے نفسیات میں متنازعہ فیہ ہے کہ آیا راست گفتاری اور وفاشعاری جیسے اجتماعی فضائل کسی جبلّت پر مبنی ہیں یا نہیں ۔ محدود معنوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی اجتماعی فضیلت غور و تامل اور مختلف طرز عمل کے باہمی مقابلہ کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہے ۔ لیکن فضائل کردار کی مختلف صورتیں ہیں اور

کردار جبلت پر مبنی ہے لہٰذا فضائل کی انتہائی تکمیل بھی جبلت پر ہوتی ہے۔ مثلاً راست گفتاری انسان کا ایک فطری میلان ہے اور کسی جماعت کے افراد میں ایک موثر اتحاد پیدا کرنے کے لئے یہ طرز عمل (راست گفتاری) نہایت ضروری ہے۔ صحیح معنوں میں یہ جبلت ہی پر مبنی ہے اور جبلت اجتماعی سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیں کہ راست گفتاری ایک فطری میلان ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دروغ و فریب جبلی نہیں ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں میں سچ بولنے کا ایک میلان ہے لیکن بعض حالات کے تحت ہم صاف طور پر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اون میں فریب و اخفائے راز کا بھی میلان پایا جاتا ہے۔ جیمس اور دیگر علمائے نفسیات کا یہ خیال ہے کہ یہ متضاد میلانات انسان کو اپنے ماحول سے تطابق پیدا کرنے میں آلات کا کام دیتے ہیں۔

انسان جس جماعت میں رہتا بستا ہے اوسکے ساتھ وفاشعاری برتنا اوسکے نزدیک بڑی فضیلت ہے۔ جماعت سے وفاشعاری برتنے کا میلان جبلی و خلقی نہ ہو تو یہ خیال کرنا ہی ناممکن ہے کہ حیات اجتماعی کسطرح ترقی کرسکتی ہے۔ اس جبلت کے بغیر جماعت کا شیرازہ ہی بکھر جاتا ہے۔ یہ جبلت جب نمو پاتی ہے تو وطنیت کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ جماعت سے وفاشعاری برتنے کا میلان حیات اجتماعی کی نشو و نما میں بہت بڑا حصہ لیتا ہے۔ اسلئے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور رہیں کہ اسکی بنیاد بھی جبلی ہے اور جبلت اجتماعی سے اس کو قریبی تعلق ہے۔

تقلید (Imitation) کی جبلت کے متعلق علمائے نفسیات میں بے حد اختلاف آرا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تقلید محض ایک عصبی میلان ہے جو نہ صرف اوسوقت عمل پذیر ہوتا ہے جبکہ خارج سے مناسب مہیجات اثر کرتے ہیں، بلکہ اوس وقت بھی عمل میں آتا ہے جبکہ ہم کسی اور افراد سے اسی قسم کا فعل سرزد ہوتے دیکھتے ہیں۔ اس خیال کے مطابق انسان میں تقلید کی کوئی مخصوص جبلت نہیں پائی جاتی بلکہ تمام جبلتیں تقلید کے ذریعہ سے نمو پاتی ہیں۔ اتنا تو ہم کو تسلیم ہے کہ حیوانات میں جو تقلید پائی جاتی ہے وہ پوشیدہ جبلتوں کا محض ایک مظہر ہے۔ تاہم یہ ثابت کرنے کے لئے کافی دلائل ہیں کہ انسان اور دیگر غولی (Gregarious) حیوانات میں تقلید کا واضح اور مخصوص میلان ہے۔ انسان کو ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی وہی کرے جو اور لوگ کرتے ہیں۔ یہ میلان ایک اجتماعی نقطہ نظر سے تمام

انسانی جبلتوں سے زیادہ مفید ہے۔ جماعتوں کو دشمنوں سے مقابلہ کرتے وقت ایک ہی طریقہ پر عمل کرنے میں یہ میلان بہت بڑی مدد دیتا ہے۔ تقلید کا یہ مخصوص میلان اگر غولی حیوانات اور بالخصوص انسان میں بہت قوی ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔

انسان میں تقلید سے قریبی تعلق رکھنے والا ایک اور میلان ہے جس کو اثر پذیری (Suggestibility) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ تقلید اور اثر پذیری جبلت اجتماعی کی بنیادی عناصر ہیں۔ اسی میلان کی وجہ سے انسان مجامع اور جماعتوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس نظریہ اجتماع پر ہم آگے بحث کریں گے یہاں صرف اس بات کو واضح کر دینا تھا کہ افراد کے باہمی تعامل و تاثر میں تقلید اور اثر پذیری کو بہت کچھ دخل ہے۔

اکتساب یا تحصیل کی جبلت بھی انسان کا ایک خلقی میلان ہے۔ یہ جبلت ابتداءً اگرچہ فراہمی غذا کی جبلت سے نمو پاتی ہے لیکن اس کا دائرۂ عمل اس قدر وسیع ہے کہ ہر قسم کی اشیاء کو جمع اور محفوظ رکھنا اسی کے تحت آجاتا ہے۔ حیوانی دنیا میں بھی اس جبلت کے بیسیوں شواہد دستیاب ہو سکتے ہیں۔ بندروں میں یہ دیکھا گیا کہ وہ ایسی چیزوں کو جمع و محفوظ کرتے ہیں جن سے اون کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا بعض نیم وحشی انسانوں میں یہ جبلت بہت کم نمو پاتی ہے اور یہی اونکی اجتماعی پستی کی دلیل ہے۔ ابتدائی انسان میں جوں جوں یہ جبلت نمو پانے لگی بہت کچھ سرمایہ فراہم ہونے لگا جو جماعات انسانی کی ترقی کے لئے نہایت ضروری تھا۔ مکڈوگل اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان میں غلہ کو فراہم کرنے اور محفوظ رکھنے کا میلان تمدنی ترقی کا پہلا زینہ تھا۔ منطقہ معتدلہ میں اگر لوگ ناموافق موسموں کے لئے پیشتر ہی سے غلہ محفوظ نہ رکھ لیں تو اون کو بھوکوں مرنا پڑ گیا۔ علاوہ ازیں ایسی جماعتیں یا ایسے خاندان جن میں آلات حرب یا جواہرات وغیرہ جمع کئے جاتے ہیں اون کو دوسرے افراد یا جماعتوں سے مسابقت کے وقت فوقیت حاصل رہتی ہے۔ غرض یہ کہ ابتدائی تمدنی حالات نے انسان میں جلب و اکتساب کی زبردست جبلتوں کو نمو دیا۔ اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کی یہ جبلتیں موجودہ جبلت اجتماعی کے اکثر اہم مظاہر کا سنگ بنیاد ہیں۔

اکتساب کی جبلّت گو کہ افراد کے باہمی اختلاط کا براہِ راست ذریعہ نہیں لیکن یہ ہمارے تمدّن کے ایک ایسے اہم ترین ادارے کی بنیاد ہے جس کو خانگی جائداد کہتے ہیں۔ افراد کے اکثر تعلقات پر غور کرتے وقت اس ادارے کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اس خیال میں ایک صداقت مضمر ہے کہ جلبِ منفعت کی جبلّت ہمارے تمدّن میں بہت بڑی حد تک غالب ہے۔ اشتراکیین کا یہ خیال ایک بڑی حد تک صحیح ہے کہ موجودہ اجتماعی تنظیم اس جبلّت کو اور زبردست بنا رہی ہے جو جماعت کے لئے بہ حیثیت مجموعی نقصان رساں ہے۔ عہدِ حاضر کے تمدّن و مہذب جماعتوں میں یہ جبلّت بہ نسبت اور جبلّتوں کے زیادہ پرورش پا رہی ہے۔

انانیت اور اتباع کی جبلّتوں پر بالعموم بہت کم توجہ کیجاتی ہے لیکن حیات اجتماعی میں ان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انسان میں ایک طرف تو اپنے آپ کو دوسروں سے بالا و برتر ظاہر کرنے اور جماعتوں کی قیادت حاصل کرنے کے زبردست میلانات پائے جاتے ہیں جنہیں خود نمائی کا میلان بھی شامل ہے دوسری طرف انہی افراد میں اپنے آپ کو اپنے بالادستوں کے ماتحت رکھنے اور کسی قائد کی اتباع کرنے کا میلان پایا جاتا ہے۔ اس جبلّت سے کسی جماعت کے افراد میں عجیب و غریب روابط و تعلقات پیدا ہوتے ہیں انسان اپنے سیاسی میلانات کی وجہ سے ایک طرف تو اپنے بالادستوں کی اطاعت کرتا یا کسی قائد کی اتباع کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے آپ کو بالا و برتر رکھنا چاہتا ہے۔ کسی قائد کی پیروی حیاتِ اجتماعی کا جزو بن گئی ہے حتّٰی کہ ان جماعتوں میں بھی جنہیں سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہے معمر یا ایسے لوگوں کو فوقیت حاصل رہتی ہے جو جنگ کے موقعوں پر اپنی ذاتی صفات کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انسانی جماعتوں کی تنظیم کے لئے قائدین کا وجود ناگزیر ہے۔ بعض افراد جب اپنی کوششوں میں کامیاب ہوتے ہیں تو یہ کامیابی ان کی انانیت کے نشو و نما کا محرک بنجاتی ہے اور وہ اجتماعی تنظیم کے لئے ایسی جماعتوں کو منتخب کرتے ہیں جن کے افراد میں قائدین کی اطاعت کرنے کا زبردست میلان پایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جماعت کے چند افراد میں قوت و اقتدار کی خواہش ہوتی ہے جس کو انانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور دوسرے افراد میں ذی اقتدار اشخاص یا قائدین کی پیروی کرنے کا میلان ہوتا ہے۔ اجتماعی تنظیم کے لئے ان دونوں میلانات کا

وجود لازمی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قطع نظر اجتماعی یا سیاسی زندگی کے انانیت یا خود نمائی کی جبلّت ہماری روزمرہ زندگی کے معمولی واقعات میں بھی ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ ہر ایک فرد میں یہ میلان موجود ہے کہ اپنی قوت و اقتدار کو کسی نہ کسی صورت سے ظاہر کرے۔ جماعت کا ایک خاصہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے قائدین و رہنماؤں کی تقلید کرتی ہے لیکن خود قائدین جماعت کے دوسرے افراد کی تقلید کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو عوام سے متمائز رکھنا چاہتے ہیں۔ قائدین اور ذی اقتدار لوگوں کے اسی امتیاز کی وجہ سے جماعت میں مختلف رواج اور فیشن پیدا ہوتے ہیں۔ گویا فیشن کے موجد جماعت کے وہ افراد ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو عوام سے بالا و برتر رکھنے کی کوشش کرتے اور اپنے امتیاز کو نمایاں کرنے کے لئے خاص خاص قسم کے ملبوسات اختیار کرتے ہیں۔ فیشن کی یہیں سے ابتداء ہوتی ہے۔

انانیت سے قریبی تعلّق رکھنے والی ایک اور جبلّت ہے جس کو خود نمائی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ جبلّت انسان کی طرح حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے۔ اسکو ہم انسان اور حیوان میں اونکی حیات معاشقہ (Courtship) کے دوران میں نمایاں طور پر محسوس کرسکتے ہیں گویا جبلّت شہوانی سے اسکو ایک طرح کا گہرا تعلق ہے۔ خود نمائی کے میلانات انسان میں زندگی کے ہر موقع پر اور ہر زمانہ میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ تقاریب، معاشرتی جلسے، جلوس وغیرہ کو خود نمائی کی جبلّت ہی سے منسوب کرنا چاہئے۔ جب کسی جماعت میں دولت کی افراط ہوتی ہے تو یہ میلان مختلف صورتیں اختیار کرلیتا ہے مثلاً دوسروں کی دل گشی یا اون میں رشک پیدا کرنے کیلئے دولت پانی کی طرح بہادی جاتی ہے

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ انانیت و خود نمائی کی یہ عجیب و غریب جبلتیں مہذّب جماعتوں کی زندگی کا ایک بنیادی عنصر نظر آتی ہیں۔ خود نمائی کا میلان موجودہ جماعتوں میں بہ نسبت نیم وحشی انسانوں کے زیادہ لطیف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے پھر بھی یہ مہذب انسان میں اتنا ہی زبردست ہے جتنا کہ ابتدائی انسان میں تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مساوات اور جمہوریت کی تعلیم سے خود نمائی کا میلان دبایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ حصول اقتدار و انانیت کا میلان اب بھی اوسی طرح زبردست ہے

جس طرح کہ پہلے تھا۔ مساوات کا جذبہ درحقیقت صرف اُن لوگوں میں پایا جاتا ہے جو حیاتِ اجتماعی میں بہت پست درجہ رکھتے ہیں اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو اون لوگوں کے ہم پلہ کرلیں جن کو جماعت میں خوش قسمتی سے بلند رتبہ حاصل ہے۔ ایسے انسان دوست (Philanthropic) افراد بہت کم ملینگے جن میں مساوات اور اخوانیت کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔

اس کے برعکس اپنے بالادستوں کی اطاعت یا قائدین کی اتباع کا میلان فطرت انسان میں اب بھی زبردست نظر آتا ہے۔ مختلف اجتماعی مظاہر سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اس جبلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک حد تک خوف کا مظہر ہے اور ایک لحاظ سے تقلید کا میلان ہے۔ تاہم اتباع فطرت انسانی کا ایک متمائز میلان ہے جس کا اظہار زندگی کے اکثر مواقع پر ہوتا رہتا ہے اسکے سوا قائدین اور اُنکے پیرو یعنی حاکم و محکوم، بالادست اور ماتحت میں اختلاط پیدا کرنیکا یہی ایک ذریعہ ہے۔ بہرحال انسانی جماعتوں کا یہ عالمگیر میلان ہے کہ اپنے قائدین کی اتباع اور حکام و مشاہیر کا احترام کریں۔ اس جبلت میں جب اختلال پیدا ہوتا ہے تو وہ خوشامد و چاپلوسی کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اتباع کا میلان جبلتِ غولی (Gregarious Instinct) سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ حیاتِ اجتماعی میں اس جبلت کا وجود اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر خود خاندان وجود میں نہیں آسکتا۔ مملکت کا وجود بھی اس جبلت پر مبنی ہوتا ہے۔

علمائے نفسیات نے یہ تسلیم کیا ہے کہ انسان میں تعمیر کا ایک خلقی میلان ہے یہ میلان ابتداءً آشیاں سازی کی کوششوں سے نمو پاتا ہے۔ نوع انسان کے ابتدائی دور میں جب کبھی انسان کو حیوانات سے مقابلہ کرنا پڑتا تو وہ اپنی حفاظت اور حملہ آور کو ہلاک کرنے کے لئے آلات تیار کرتا تھا۔ جس کسی نسل میں آلات و ہتھیار بنانے کی قابلیت زیادہ ہوتی وہ دشمن کا مقابلہ کامیابی سے کرسکتی تھی اور یہی نسل تنازع و پیکار میں برقرار رہتی۔ نوع انسان کی ابتدائی زندگی کے انہی واقعات نے جبلت تعمیر کے نشوونما میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ انسان کے مادی تمدن کی ترقی میں اس کا بہت بڑا عنصر شامل رہا ہے۔ دورِ حجری سے لیکر عہد حاضر کے فن تعمیر کے اعلیٰ مظاہر میں بھی اس کے شواہد دستیاب ہوسکتے ہیں۔

کھیل اور تفریح کا میلان بھی انسان میں جبلّی طور پر پایا جاتا ہے۔ بعض کھیلوں مثلاً فٹبال، ہاکی وغیرہ سے جبلّت نزاعی کی تحریک ہوتی ہے۔ جن کھیلوں کے نتائج اتفاق پر مبنی ہوتے ہیں اون سے قمار بازی نشو ونما پاتی ہے۔ اسپورٹس، فٹبال، ہاکی، گھوڑہ بازی غرضکہ اس قبیل کے تمام کھیل جنمیں تنازع وپیکار کا عنصر غالب رہتا ہے اور جو موجودہ تہذیب یافتہ جماعتوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہیں وہ انسان کی ابتدائی جبلّتوں ہی پر مبنی ہیں۔ چونکہ کھیل اور تفریح جبلّت ہی پر مبنی ہوتے ہیں اسلئے ان کے متعلق بعض اخلاقی مسائل معرض وجود میں آجاتے ہیں۔ بقول ارسطو کے کھیل اور تفریح نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل میں بہت بڑی حدتک موید ہوتے ہیں۔

جبلتیں مختلف افراد میں مختلف ہوتی ہیں۔ تمام عضوی اجسام تغیر پذیر ہیں اور نظام عصبی بھی جس کو ایک نسل دوسری نسل سے بذریعہ توریث حاصل کرتی ہے تغیر پذیر ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فطرت انسانی ہر جگہ یکساں ہے لیکن اس یکسانیت کے ساتھ افراد کے اختلافات کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔ بعض افراد میں ایک جبلّت کمزور ہوتی ہے اور کوئی دوسری جبلّت زبردست۔ یہاں ایک اہم عملی مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص میں ایک جبلت مثلاً اخوانیت کمزور ہے تو اوس میں اس جبلت کو کس طرح ابھارا جائے۔ یا کسی شخص میں جبلّت نزاعی زبردست ہے تو اوسکو کس طرح دبایا جائے۔ تعلیم وتربیت اور اجتماعی اصلاح میں ان اختلافات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

مردوں اور عورتوں میں بھی جبلّتوں کی قوت کا اختلاف ہوتا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ صنف لطیف میں ہمدردی کی جبلّت زبردست اور جبلّت نزاعی کمزور ہوتی ہے۔ بادی النظر میں اس اختلاف کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ماحول کے اثرات مختلف جنسوں (Sexes) پر مختلف پڑے ہیں لیکن زیادہ صحیح خیال یہ ہے کہ خود جنسوں (مرد اور عورت) کی عضوی ساخت ہی مختلف ہے۔ ذکور میں توانائی زیادہ ہوتی ہے اور اُن میں جدوجہد اور پیکار و تنازع کا میلان زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن صنف اناث میں توانائی کو محفوظ رکھنے کا میلان ہوتا ہے اور اسی لئے وہ منفعل (Passive) ہوتی ہے۔ جنسوں کے جبلّی اختلافات کی وجہ سے نظام جماعت میں ان کے فرائض بھی مختلف ہوتے ہیں

جنسوں کی جبلّتوں کا یہ اختلاف جماعت کے ربط و اتحاد کا ایک زبردست سنگِ بنیاد ہے۔ خود عمل تناسل تقسیم عمل کو متلزم ہے۔ ہر ایک جنس کو عمل زوجیت میں ایک خاص وظیفہ انجام دینا پڑتا ہے۔ جنسوں کے اس باہمی تطابق سے ایک مشترکہ زندگی نمو پاتی ہے۔ مرد اور عورت میں ایک عام فرق یہ ہوتا ہے کہ عورت بہ نسبت مرد کے زیادہ تر جبلّت اور جذبات کی رہنمائی میں عمل کرتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر جبلّت کا عنصر عورت کے کردار میں زیادہ غالب ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے عورت حیاتِ اجتماعی میں اپنے ماحول سے زیادہ تطابق پیدا کر سکتی ہے۔ لہٰذا عورت بہ نسبت مرد کے زیادہ اجتماع الطبع ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ مختلف نسلوں میں جبلی افعال کسی قدر مختلف ہوتے ہیں۔ تمام نفسیاتی اختبارات (Experiments) اسی نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ انسان کی مختلف جماعتیں مختلف جغرافی حالات اور طبعی ماحول کے زیر اثر نمو پاتی ہیں۔ ایک حبشی اور ایک انگریز کی اساسی ذہنی خصوصیات یکساں ہوتی ہیں۔ لیکن ایک ہی نہج پر ان دونوں سے جو ردِّ عمل سرزد ہوتا ہے وہ بدیہی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ اس ردِّ عمل کے اختلاف سے بڑے بڑے نسلی مسائل معرض بحث میں آجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے دو مختلف نسلیں ایک ہی ماحول سے تطابق پیدا کرنے میں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست متحدہ امریکہ میں حبشیوں کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر حبشیوں تک علم کی روشنی پہونچائی جائے تو وہ امریکہ کے موجودہ تمدّن سے مطابقت پیدا کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں کیونکہ تعلیم و تربیت سے جبلّی افعال میں تغیر ممکن ہے۔

انسان کا تمدّن ابھی اس قدر قدیم نہیں ہوا ہے کہ انسان کی جبلّتوں میں کوئی عظیم الشان تغیر پیدا کر سکے۔ ماحول کے اثر سے ایک طویل عرصہ کے بعد انسان کے جبلّی ردِّ عمل میں کسی قدر تغیر واقع ہو سکتا ہے۔ تہذیب و تمدّن نے بلاشبہ خفیف سا تغیر پیدا کیا ہے۔ مثلاً حصول علم کی خواہش بہ نسبت ایک غیر متمدن کے ایک متمدّن انسان میں زیادہ قوی ہوتی ہے۔ ان تغیرات سے قطع نظر یہ غالباً صحیح ہے کہ انسان کی موجودہ جبلّتیں زمانہ وحشت اور بربریت کے لئے زیادہ موزوں ہیں نہ کہ عہدِ تہذیب و تمدّن کے لئے۔ پس انسانی جبلّتیں

تہذیب کے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے ناکافی ہیں۔ اگر ہم ان پیچیدہ متمدن جماعت سے نکل کر جنگلوں میں وحشیانہ زندگی بسر کرنا چاہیں تو یہ جبلتیں ہماری رہنمائی بہت اچھی طرح کر سکتی ہیں۔ اسی لئے متمدن جماعتوں میں تعلیم و تربیت کی ضرورت زیادہ شدید ہوتی ہے۔ وحشی اور بربری جماعتوں میں جبلت اور رواجی تقلید جماعت میں توازن پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ لیکن مہذب اور شائستہ جماعتوں میں جبلتوں کو اکثر دبانا پڑتا ہے اور اون کی کافی تادیب و تربیت کرنی پڑتی ہے۔ بہرحال اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ جبلتیں اور اُن کے متلازم (Correlative) جذبات حالات حاضرہ میں اچھے رہنما نہیں بن سکتے۔ ہماری کل جبلتوں کو عقل کے تابع رکھنا ضروری ہے۔ اعلیٰ درجہ کا اخلاقی کردار محض جبلت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کا دارومدار غور و تامل پر ہے۔ جو لوگ جبلت اور اوسکے متلازم جذبات کو جماعتوں کا اعلےٰ رہنما خیال کرتے ہیں وہ درحقیقت جماعتوں کو وحشت و بربریت کی طرف لیجا رہے ہیں۔ فرد کیطرح جماعت بھی اوسی وقت ترقی کر سکتی ہے جبکہ اجتماعی جبلتوں کو عقل کے تابع رکھا جائے

ہم نے اوپر یہ بالوضاحت دکھانے کی کوشش کی ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے جبلی افعال حیات اجتماعی کی بنیاد ہیں۔ یہ ایسا مواد خام ہے جس سے حیاتِ اجتماعی نمو پاتی ہے۔ حیات اجتماعی کے تمام اعلیٰ و ادنیٰ مظاہر میں کوئی نہ کوئی جبلت عمل پیرا رہتی ہے۔ تمام اجتماعی افعال کا مبداء و منفذ یہی جبلتیں ہیں۔ انسانی جبلتیں ہی وہ قوتیں ہیں جو حیاتِ اجتماعی اور اُس کے مختلف اداروں کو تشکیل دیتی ہیں۔ ان جبلتوں کو عقل کے تابع رکھنا تاکہ جماعتیں ترقی کر سکیں ایک عملی مسئلہ ہے جس کا تعلق زیادہ تر عمرانیات اور سیاسیات سے ہے۔

فریبِ ہستی

از جناب قاضی غلام احمد شریف صاحب آرام سابق طالبعلم کلیہ

ارمان ہائے دل کے مقابل ہی جانِ زار
دستِ جفا سے دامنِ حسرت ہی تار تار

دنیائے کشمکش کی کوئی انتہا بھی ہے
منزل گہ سکوں کہیں تیرا پتہ بھی ہے!

جب دل ہی دل میں اپنے تمنّا ہے کوئی
تا چند رنج دورئے مقصد سہے کوئی

جانِ حزیں کو وقفِ مصیبت ہی جان لیں
تدبیر پر اڑیں کہ مقدّر کو مان لیں!

نومید یاں ہیں روز یہ مدِّ نظر ہے وصل
پھل لائے یا نہ لائے کسی دوستی کا نخل

ناکامیاں ہیں اور تمنّائے جستجو
وہ سخت جاں ہوس ہی کہ چھوڑی نہ آرزو

لگ جائے ہاتھ جس کے درِ گنجِ بیکسی
بارِ وجود بھی ہے محبّت کا بوجھ بھی

پھر وہ غلام کیوں ہو کسی احتیاج کا!
انسان غم کا بندہ ہی یا تخت و تاج کا!

دُرِّ خوشی ہے گم سرِ گردابِ زندگی
تدبیر ہے اسیر مقدّر کے جال میں
اُمید ہے حرارتِ سیمابِ زندگی
پوشیدہ ہے سکونِ غمِ لازوال میں

ہم مست تھے کہ کنجِ عدم ہم کو تھا بہشت
لائی ہیں خود نمائیاں کیوں بامِ دید پر
باتوں میں غم کی بھول گئے ساری سرگذشت
پھر اب خوشی کو یاد کریں کس اُمید پر

حُسنِ ادا فریب کی صورت سرابِ دہر
دورِ حیات میں بھی ہے کچھ آسماں کی چال
سربستہ کیا معمّہ ہے یہ انقلابِ دہر
کھلتا نہیں ہے زیست کی نیرنگیوں کا حال

کیا ہو سکوکِ ہستیٔ ناکام کا گلہ
اس کے سبب کہیں کے بھی یارب نہیں رہے
آرام ماسوا سے نہ پائے گا توصلہ
کیوں آستانِ یار پہ تیری جبیں رہے

مَوالیٰ

از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی۔ مددگار پروفیسر تاریخ

لفظ موالی کا خاص مفہوم کہ اس سے تاریخ اسلام میں غیر عرب مسلمان مراد لئے جاتے ہیں بہت بعد کو پیدا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس لفظ کے معنوں میں بیحد مدوجزر ہوتا رہا۔ اصل میں اسکے معنی ایک رشتہ دار سے بڑھکر نہ تھے۔ کلام پاک میں "موالیکم" صرف اخوانکم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے بعد ایک قدم اور آگے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موالی کے دو رخ ہیں۔ ایک "مولی الولاۃ" جو از روئے پیدائش اور دوسرا "مولی الیمین" یعنی حلیف جو از روئے حلف رکن قبیلہ ہوتا تھا۔ لیکن یہ تفریق "صریح" کے مقابلہ میں اور زیادہ گہری ہوگئی۔ "صریح" وہ عرب قرار پایا جس کی رگوں میں خالص عربی خون ہوتا تھا۔ ورنہ وہ مولی نامزد ہوتا تھا۔ یہ فرق صرف زرویت سے پہچانا جاتا تھا کیونکہ صریح کا زرویت مولی سے کہیں اونچا ہوتا تھا ورنہ دوسرے پہلوؤں سے دیکھیں تو صریح اور مولی میں کوئی فرق نہ تھا۔ مالِ غنیمت میں یہ برابر کے حصہ دار ہوتے تھے مولی کے سرپرست کا یہ فرض سمجھا جاتا تھا کہ اس کے خون کا انتقام لے۔ اگر حلیف برسرپیکار ہو تو اوس کے معرکوں میں اوس کا ہاتھ بٹائے۔ نیز حلیف کو اپنے سرپرست کے ورثہ پانے کا استحقاق تھا۔ عربوں کی پرانی کہاوت "مولی القوم من انفسھم" سے اسکا مفہوم اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ خواہ قبیلہ سے پیدائشی تعلق ہو یا خود ساختہ موالی قبیلہ کے اراکین شمار ہوتے تھے اور قبیلہ کے ساتھ اونکا چولا دامن کا ساتھ تھا لیکن

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گو یہ حلفا غیر قبیلہ ہوتے تھے تاہم غیر عرب نہ ہوتے تھے اس طرح اُن کا قبیلہ کے اصلی اراکین کے ساتھ شیر و شکر ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے لیکن اسلام کی اشاعت کے بعد موالی کے مفہوم میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا یعنی وہ پرانا حلیف والا مفہوم مٹ گیا۔ بلکہ اسکی جگہ وہ غیر عرب مسلمان سمجھے جانے لگے جو اسلام کے عالمگیر اثر سے جوق جوق امنڈ آئے اور اسلام کے برادرانہ اصول کے برتے پر عربوں کی صف میں کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن عربوں کا دیرینہ قومی رکھ رکھاؤ اس پیشقدمی کو کب روا رکھتا تھا۔ اوّل تو یہ لوگ غیر عرب تھے دوسرے اسیرانِ جنگ اسلئے ان کی حیثیت پرانے حلفاء کی سی نہیں ہوسکتی تھی بلکہ جب یہ پابہ زنجیر کوفہ آئے اور مسلمان ہوئے تو اُن کے مالکوں نے ان کی غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالیں۔ اور ان کو عرب قبائل کے موالی قرار دیا گو یہ نام تو وہی پرانا تھا لیکن اسکا مفہوم اسطرح خوشگوار نہ تھا جس طرح ایام جاہلیت میں کیونکہ اسوقت ان کی دوسری حیثیت تھی گو یہ آزاد تھے اور عربوں کی ملک نہ تھے تاہم دوسرے رُخ سے دیکھا جائے تو ان کے سابق آقاؤں کی سرپرستی ہنوز برقرار تھی۔ ان عرب سرپرستوں کے زیر سایہ ان کی حفاظت ہوتی تھی یہ لوگ اپنے سرپرستوں کے تمام ذیلی خدمات انجام دیتے تھے جتنے ذیلی پیشے ہوتے تھے وہ سب انہیں سے انجام پاتے تھے نیز صلح و جنگ میں انکو اپنے سرپرستوں کے ہمراہ رکاب رہنا پڑتا تھا چنانچہ جب مختار ابن ابوعبید کی بغاوت میں موالی نے حصہ لیا اور اپنے سرپرستوں سے روگردان ہوگئے تو ان سرپرستوں کو اس واقعہ سے روحانی تکلیف ہوئی کہ افسوس مختار نے ہمارے خداداد مال کو ہم سے چھین لیا۔ اور اُن کو عربوں کی صف میں کھڑا کر کے مال غنیمت میں برابر کا حصہ دار بنا دیا[1]۔ غرض زمانہ اسلام کے موالی اپنے میں پرانا خوشگوار پن نہ رکھتے تھے بلکہ یہاں ایک قسم کی تلخی تھی جس نے بڑھتے بڑھتے "حمرا" کے بہت ہی ترش لفظ کا اضافہ کیا جس سے بعد کو یہ غیر عرب مسلمان مخاطب کئے جانے لگے۔ گو یہ لفظ رنگ کے لحاظ سے عرب اور عجم دونوں پر منطبق ہوتا تھا۔ اور سفید اقوام کیلئے "ہجین" کا لفظ مستعمل تھا جس کے تحت رومی اور ثقالبہ وغیرہ آتے تھے تاہم بعد کو

---

[1] ابن اثیر مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۹۷ — اخبار الطوال لدینوری لیڈن یورپ صفحہ ۳۰۶

کثرتِ استعمال سے حمرا کا لفظ صرف اُن عجمیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا[1] جو اسلام کے دائرہ میں آجاتے تھے ورنہ "وہ" اعلاج "کہلاتے تھے سب سے پہلے مختار نے یہ لفظ استعمال کیا اور اس دن استعمال کیا جبکہ اسنے شام کے مقابلہ کے لئے حضرت ابراہیم بن اشترؓ کے ماتحت موالی کی ایک بڑی فوج روانہ کی چنانچہ حضرت ابراہیم سے کہا کہ تمھاری فوج کا بڑا حصہ "حمرا" پر مشتمل ہے۔ اسکے بعد یہ لفظ عام طور پر ایرانی مسلمانوں کے لئے مروّج ہوگیا۔ اسکے علاوہ اور الفاظ مثلاً "اسحاقیہ" وغیرہ بھی استعمال کئے جاتے تھے جن کے استعمال سے ایرانیوں کی قومی پستی کا اظہار مقصود تھا اور اپنے کو اسمٰعیلیہ کہہ کے عرب قوم کا افتخار جتایا جاتا تھا[2]

ویسے تو زمانہ نبوت میں حضرت بلالؓ۔ حضرت سلیمانؓ حضرت صہیبؓ کے جامہ میں موالی موجود تھے اور خلافت راشدہ کے دور میں بھی انکا اضافہ ہوتا رہا لیکن یہ اس قدر خال خال تھے کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے کیونکہ اسوقت ان کی درآمد سپہ سالاروں کی فاتحانہ پیشقدمی کا نتیجہ ہوتی تھی مثلاً عین تمر کے مشہور "غلامان چہلگانہ" بطور مثال پیش کئے جاسکتے ہیں جو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں حجاز آئے اور مسلمان ہوئے[3]۔ اسی طرح خلافت فاروقیؓ میں ان کا اضافہ ہوا — بایں ہمہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں عربوں کے مقابلہ میں اُن کی صرف ایک اور پانچ کی نسبت تھی لیکن اموی دور کے آغاز کے ساتھ اُن کے ٹڈی دل امنڈ آنے لگے اول تو فتوحات کا ایک ذریعہ تھا جو موالی کے درآمد کی بڑی شاہراہ تھی مگر اسپر طرہ یہ ہوا کہ خلیفہ کے ہاں صوبہ داروں کے جانب سے سفید و سیاہ غلاموں کے سوغات آنے لگے۔ اور اسی شکل میں زرِ گان بھی کبھی کبھی ادا ہونے لگا خلیفہ ان تحائف کا کچھ حصہ اپنے پاس رکھتا اور کچھ اپنے دوست احباب اور درباریوں میں تقسیم کرتا تھا۔ یہ دوست و احباب ان تحائف سے اپنے ملاقاتیوں کی دل افزائی کرتے تھے۔ اسطرح یہ غلام تمام ملک کے طول و عرض میں پتنگوں کیطرح پھیلنے لگے۔ جب یہ لوگ کسی کارنمایاں کے صلہ میں آزاد ہوتے تو موالی کی صف میں ادن کو جگہ ملتی[4]۔ چنانچہ

---

[1] الکامل للمبرد یورپ ۳۰۳ ——— [2] عقد الفرید مطبوعہ مصر ۱۹ ——— [3] جرجی زیدان ص ۵۲

[4] خدا بخش تحریک شعوبیہ ص ۵ (Essays Indian and Islamic) [5] جرجی زیدان ص ۱۳۳

اموی عملداری میں غیر عرب مسلمانوں کی روز افزوں کثرت ہونے لگی یہاں تک کہ مختار کی فوج میں آزاد شہریوں کی تعداد موالی سے آدھی تھی ۷۱ھ میں جو جنگ ہوئی اسمیں چھ ہزار مختاری مرے۔ منجملہ انکے صرف (۱۰۰) آزاد شہری تھے اور باقی موالی[1]۔ دینوری کہتا ہے کہ شام اور الجزیرہ کے معرکہ کے لئے مختار نے حضرت ابراہیم بن اشترؓ کے ماتحت بیس ہزار "حمرا" روانہ کئے[2]۔ اسی مورخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب ایرانی تھے کیونکہ اس قوم میں سوائے فارسی بولی کے عربی حرف سنائی نہیں دیتا تھا[3]۔ نیز مختار کے مرنے کے بعد اسکے جو قلعہ بند ہمراہی مارے گئے ان میں چھ ہزار عرب اور چار ہزار عجمی تھے[4]۔ صفاینان کو جو فوج سب سے پہلے روانہ کی گئی اس کی گنتی پانچ ہزار کیجاتی ہے جس کا پانچواں حصہ ایرانیو کا تھا جو مسلمان ہوکر عربوں کی جد و جہد میں شریک ہو گئے تھے[5]۔ نیز ابو مخنف کہتا ہے کہ دیر جماجم کے کیمپ میں دس ہزار عرب تھے تو دس ہزار موالی بھی تھے۔ ان چیدہ چیدہ بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ موالی بڑھتے بڑھتے خلیفہ عبدالملک کے عہد میں عربوں کے ہم پلہ ہو گئے تھے۔

موالی کا مرکز

اگرچہ موالی کے جم غفیر میں مختلف قومیتوں کے نمائندے مثلاً ایرانی۔ ترکی۔ حبشی۔ رومی۔ نبطی اور بربر تھے مگر ان سب میں از روئے کثرت و قابلیت ایرانی موالی کا پلہ کہیں بھاری تھا۔ اسی قوم میں زندگی اور کشاکش زیست کے ولولے تھے۔ سیواسطے ہم دیکھتے ہیں کہ سیاست نے اور قومیتوں کو تو خارج از بحث کر دیا اور اپنا روئے سخن تمامتر ایرانیوں کی طرف ہی رکھا یہی گروہ ہمیشہ حکومت کے سامنے رہتا تھا جس کی گتھی سلجھانا حکومت اپنا فرض سمجھتی تھی۔ یہی بات ہے کہ تاریخ اسلام میں اور قومیتوں کے تو صرف دھندلے نشانات ملتے ہیں لیکن ایران اور عراق کے ذکر خیر سے تمام صفحات رنگے ہوئے ہیں۔ عراق کے سوا ایرانیوں کا دوسرا مرکز نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں بصرہ اور کوفہ کی چھاؤنیاں تھیں جو حضرت فاروق اعظمؓ کے فوجی انتظام کے

---

[1] جرجی زیدان ص ۱۱۵ — [2] اخبار الطوال مطبوعہ یورپ ص ۳۰۱ — [3] اخبار الطوال ص ۳۰۲
[4] اخبار الطوال ص ۳۱۵ — [5] فتوح البلدان بلاذری ص ۴۰۰

عرب سپاہیوں سے پُر تھیں۔ ضرورت پر عرب سپاہی مشرقی معرکوں میں حصہ لیتے تھے اور واپس ہوتے ہوئے سیکڑوں اسیرانِ جنگ اپنے ہمراہ لاتے تھے۔ یہ غلام مسلمان ہوکر آزاد ہوتے اور موالی ہوکر عرب قبائل کے اجزاء ہو جاتے تھے۔ نیز اسلام کی کشش دیہی آبادی کو شہروں میں کھینچ لاتی تھی اور کثرت سے دیہات کے باشندے مسلمان ہوکر دیہات سے بصرہ اور کوفہ کے شہروں میں منتقل ہوتے تھے چنانچہ حجاج نے اپنی پالیسی کے تحت بہت سوں کو اُلٹے پیر واپس کر دیا[1]۔ تاہم اونکی اس قدر درآمد تھی کہ عراق ایرانی موالی کا مرکز بن گیا لیکن عراق کی سرگزشت خراسان کا نام لئے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے۔ عراق اور خراسان کے ایسے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں کہ دونوں کی ایک ہی تاریخ ہے ایسا سمجھنا چاہئے کہ موالی کا ایک وسیع مرکز ہے جس کا ایک حصہ عراق اور دوسرا حصہ خراسان ہے۔ جس طرح ایران کی فتح اور اسکی حفاظت کے لئے عراق میں بصرہ اور کوفہ کی چھاونیاں قائم کی گئی تھیں اسیطرح حضرت معاویہؓ کے عہد میں زیاد نے ترکستان کی فتوحات کیلئے خراسان کو عربوں کی چھاونی بنا دیا۔ اس غرض کے لئے کوئی پندرہ ہزار عرب خاندان کوفہ اور بصرہ سے خراسان میں منتقل کئے گئے[2]۔ ان عرب خاندانوں نے ترکستانی ضروریات کیلئے بہت بڑا قلعہ بنالیا۔ ایرانیوں کے لئے تو خراسان جنم بھوم ہی تھا عراق میں وہ بصورت ضرورت آباد ہو گئے تھے۔ لیکن خراسان میں اُن کی جڑیں گڑ ہی ہوی تھیں۔ اسپر اضافہ یہ ہوا کہ جب سے زیاد اور حجاج کی گورنری کا غلغلہ بلند ہوا موالی پر دنیا تاریک ہوگئی۔ ان کے اُبھرنے کے لئے کوئی موقع نہ رہا۔ ایسی صورت میں انکا عراق سے بھاگنا ضروری تھا۔ اس شاندار ہجرت کا آغاز زیاد کے عہد سے شروع ہو چکا تھا مگر حجاج کے عہد میں یہ ہلچل بہت تیز ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیشمار آبادی نے عراق کو خیرباد کہہ دیا۔ پہلے تو یہ لوگ حجاز کے دامن میں پناہ گزیں ہونے لگے مگر یہاں انکا پناہ لینا کیا تھا خود گورنری پر اثر پڑا۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ جنہوں نے ان لوگوں کو پناہ دی تھی حجاز سے معزول کر دئے گئے اور انکی جگہ حجاج کے ہم مشرب عثمان اور خالد بن عبداللہ کا تقرر

---

[1] ابن الاثیر مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۱۹۲ [2] Arab Conquest in Central Asia by Gibb, p. 17

کیا گیا[1]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایک کر کے تمام عراقی حجاز سے نکالے گئے اسکے بعد ان موالی کے لئے سوائے خراسان کے دوسرا ٹھکانا نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمین عراق کا تمام مواد خراسان میں منتقل ہو گیا۔ چنانچہ عباسی دعوے کے تمام حامل یہی کوفہ کے تاجر تھے جو عرب سپاہی یہاں تھے وہ بھی ایرانی آب و ہوا کے زیر اثر آگئے تھے۔ بول چال وضع قطع میں بالکل ایرانی سپوت معلوم ہوتے تھے غرض اس بجہت آبادی نے خراسان کو ہر حیثیت سے عراق کا نمونہ بنا دیا۔ جس وقت فاتح ترکستان قتیبہ بن مسلم خراسان کا گورنر ہو کر آیا خراسان کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ قتیبہ کی پالیسی میں تالیف قلوب مضمر تھی۔ اس نے ایرانیوں کی دلجوئی کر کے ان کے دل مٹھی میں لے لئے۔ اور عربوں کے ساتھ ان خراسانیوں سے اپنے مشرقی معرکوں میں کام لیا لیکن ان مراعات سے ایرانیوں کے قومی احساس اور ولولوں میں بہت اضافہ ہو گیا[2]۔ عراق کی طرف وہ خوب ہاتھ پیر پھیلانے لگے۔ پہلے ہی سے خراسان اور عراق کا چولا دامن کا ساتھ تھا۔ یعنی عراق میں جو ہلچل ہوتی تھی خراسان میں اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی اور عراق کے ہر طلب پر خراسان سے صدائے لبیک بلند ہوتی تھی لیکن اب خراسان میں اتنا دم خم تھا کہ اس نے پائمال کوفہ کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر دیا اور حجاج کی آہنی حکومت میں کوفہ جو کام ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا اوس کی تکمیل کر دی۔

مذکورۂ بالا مضمون اس مقالہ کا ایک باب ہے جس کو صاحب موصوف نے ۱۳۳۴ف میں امتحان ایم۔ اے کے لئے پیش کیا تھا۔ مجلہ

---

[1] ابن الاثیر مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۲۳۶ — [2] گب صفحہ ۳۰۰۔

حُسن کی دیوی[1]

از سیّد محمّد اکبر وفا قانی

نفیس ملبوس مرمریں میں کھڑی ہوی اک حسین شئے ہے
دلوں کے حق میں سکوں مجسّم نظر کے حق میں لطیف مے ہے
یہ حُسن کاری کی جان شاعر کے دل سے پیدا ہوی ہے گویا
حسین خالق کی آرزو شکل آذری میں چھپی ہے گویا
شباب کا جوش کم سنی کی شرارتوں سے نکھر گیا ہے
جو زلف بل کھا کے رک گئی ہے تو محرمِ ناز الجھ گیا ہے
وہ بانکا سج دھج وہ تیکھی چتون ادائے دلکش ہے شکل پیاری
کہ اپنی حالت میں مست کوئی کھڑی ہے ایتھنز[2] کی کنواری
غضب ہے اتنا حسین منظر اور ایسے پتھر کی سادگی میں
ہزار رنگوں کا اک مرقع چھپا ہے مرمر کی سادگی میں

---

[1] یہ نظم وینس آف میلاس (Venus of melos) یعنی حُسن کی دیوی کے مجسمہ کی تصویر دیکھکر لکھی گئی۔

[2] Athens

اردو کا رواج ٹیپو سلطان کی فوج میں

از جناب محمد حمید اللہ صاحب متعلم بی۔اے

کتبخانۂ دفتر ہند (India Office Library) میں ۲۶۳۸ تا ۲۶۵۹ ایک کتاب کے اکیس نسخے مکمل اور نامکمل دونوں قسم کے ہیں۔ جسکا نام "فتح المجاہدین" ہے۔ اسکے بعض نسخے ان کتبخانوں میں بھی محفوظ ہیں جیسا کہ انکی فہرستوں سے ظاہر ہے:-

Bodleian no. 1903; R[illegible]u Supplement p 260;
W. Pertsch Berlin Cat. [illegible] 134-35.

اتفاق سے اس کا ایک نسخہ حیدرآباد میں[1] بھی دستیاب ہوا جسکے تفصیلی معائنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب فوجی اصول و قواعد پر مشتمل ہے۔ فوجی احکام فارسی میں اور جنگی اشعار "اردو" میں مندرج ہیں۔

مولفِ کتاب کا نام زین العابدین ہے دفتر ہند کے نسخے میں "موسوی" کا لفظ بھی زاید ہے[2] اور وہ بہت عرصے تک مدراس اور بالاگھاٹ میں قیام کرنے کے بعد[3] آخر کار ٹیپو سلطان کا مصاحب

---

[1] دارالکتب خلیلیہ ۱۰۵۲ کٹل منڈی حیدرآباد دکن۔ [2] فہرست مخطوطات فارسی دفتر ہند ۲۶۳۸

[3] اسکی ایک اور تصنیف موید المجاہدین بھی کتبخانہ دفتر ہند میں موجود ہے جس کے دو نسخے ہیں ۲۶۱۹ و ۲۶۲۰

اس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ ۱۷۱۱ء میں تیموری سلطنت بعض نوکروں کی "نمک حرامی" کے باعث اس قدر ضعیف ہوگئی تھی کہ اہل مغرب نے جو سواحل ہند کے کوٹھی دار اور تجارت کے بہانے سے ہمیشہ کمین میں رہتے تھے بعض غداروں کو وسیلہ بناکر "ملک گیری" اور "ملک ستانی" شروع کی اور تمام مملکت بنگالہ اور کرناٹک کا کچھ حصہ اور بندرگاہ سورت اپنے قبضہ میں کرلیا۔ اور حالت یہاں تک ناگفتہ بہ ہوگئی کہ رعایا لوٹی جانے لگی اور مسلمان قیدی چین و افریقہ میں غلام بناکر فروخت کئے جانے لگے۔

اسکے بعد وہ ٹیپو سلطان کی تخت نشینی کو اس ظلم و ستم اور خرابی کا علاج بتاکر بیان کرتا ہے کہ یورپین کی جنگ میں برتری اور غلبے کا اصلی راز ان کے توپ و تفنگ میں ہے اسلئے بادشاہ نے توپ خانہ اور طریقہ حملہ اور "سپہ آرائی" میں نظام قائم کیا جن کی وجہ سے انھیں فتح یابی حاصل ہوتی رہی۔ پہلے یورپی فوج کی تعریف اور پھر اپنے بادشاہ کے انتظام کی تعریف سے پتہ چلتا ہے کہ یورپی قواعد ہی کو مناسب ترمیم کے بعد رائج کرلیا گیا تھا۔

دیباچے کے آخر میں لکھتا ہے کہ ۱۹۷۰ء میں راست شاہی حکم پہنچا کہ وہ سلطنت کے فوجی قواعد کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرے تاکہ یہ "علم شریف و ہنر لطیف" جو ہندوستان میں نایاب و مفقود ہے رواج پاکر اسلامی فوجوں کی فتح کا باعث ہو اسکا آخری جملہ اس سلسلہ میں شروع ہوتا ہے "اولاً پارہ از مسائل آں و برخے از ضروریاتِ دین در مقدمۂ کتاب ذکر کردہ بہ تحریر قواعد دیگر پردازد"۔

اسکے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے مگر انڈیا آفس کے مکمل نسخے ۲۰۳۸ء کے متعلق فہرست کی تشریح سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری کتاب مختصر اور خلاصہ ہے چنانچہ لندن کے نسخے میں پہلا باب "دربیانِ شمائل (مسائل Read) عقائد و نماز وغیرہ و شمائل (مسائل) منع تمباکو و نمک حرامی و ترکہ وجہاد وغیرہ ہے[1]"۔ مگر پیشِ نظر نسخے میں تمباکو کی ممانعت کا تذکرہ موجود نہیں ہے۔ اس کے سوا

---

[1] بین الاوسطین عبارت فہرست انڈیا آفس سے منقول ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نسخہ بھی اصلی نہیں بلکہ نقل اور غلط نقل ہے ملاحظہ ہو "شمائل"۔

انڈیا آفس کا نسخہ ۲۰۵۹ جو صرف اقتباس ہے اس میں پہلے دو صفحے ایک حساب میں ہیں جسے گرشری کہتے ہیں اس کی عبارت یوں شروع ہوتی ہے "چو تعدادِ حروفِ کلماتِ شہادتین بیست و چہار می شود لہٰذا مقدارِ بیست و چہار عرض الخ۔ وآخری بارہ ورق حسابی جدولوں پر مشتمل ہیں۔ اس باب میں اولاً اسلام و ایمان کی تعریف احادیث کے ذریعے کی گئی ہے اس کے بعد اسلامی معتقدات یعنی خدا رسول فرشتے قیامت پیغمبراں قضا و قدر وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ پھر مسائل وضو اور مسائل نماز دو عنوانوں کے تحت ان امور کے متعلق ایک مجمل بیان تحریر کرتا ہے۔ مسائل جہاد اس باب کا آخری عنوان ہے اسمیں قرانی آیتیں، احادیث نبوی اور (غالباً) ذاتی خیالات مقدس جنگ یعنی جہاد کے متعلق نقل کرتا ہے ان کے مطالعے سے اس زمانے کی اسلامی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جب کہ ان کے پاس حکومت تھی اور ان پر ایسا بادشاہ حکمرانی کرتا تھا جو توسیع مملکت کا شائق اور جنگ کا دھنی تھا۔ قرآن و حدیث شریف کو جیسا کہ ہر بلیغ عبارت میں ہوتا ہے، مولف کتاب بھی تاویل و توضیح کے ذریعے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد چند سیاسی جرائم کا تذکرہ کرتا ہے کہ سازش اور خیانت وغیرہ وغیرہ کی کیا سزا ہے پھر شرعی جرائم اور گناہوں کا اور آخر میں کسی بادشاہ کی نااہلیت اور وفاداری سلطنت کے مسائل پر اس باب کو ختم کرتا ہے (یہ ۴۵ صفحوں میں آیا ہے ہر صفحے میں دس سطریں ہیں خط بہت جلی ہے۔ تقطیع چھوٹی ہے)

انڈیا آفس کے نسخے میں دوسرا باب "در بیانِ فالنامۂ اذنِ علی و اسمائے نومقری برائے تقسیم حساب و لفظ وزن و تعداد مقری الخ" ہے مگر پیش نظر نسخے میں یہ باب سرے سے غائب ہے۔

باب سوم تدابیر حرب کے بیان میں ہے۔ اور باب اول کے بمقابل بہت مختصر ہے چنانچہ صرف ۱۴ صفحوں میں آیا ہے مگر اس سے زیادہ اہم اور دلچسپ ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان کے اصولِ جنگ کیا تھے فوج کو کس طرح آراستہ کرنا چاہئے، جنگل یا میدان یا پہاڑ یا چشمہ مقامِ جنگ ہوں تو آراستگی میں کیا تفاوت ہوتا ہے، توپ و بندوق سے کس طرح مناسب کام لیا جاسکتا ہے۔

"جنگ صعب" اور "جنگ قزاقی" کب اور کس طرح کرنی چاہیئے۔ شب خون دشمن کی فوج کے میدان میں خیمہ زن ہونے کے وقت کرنا کیوں مفید ہے اور اس کا طریقہ کیا ہے؛ دشمن کی فوج زیادہ ہو تو کس طرح مقابلہ و مقام کرنا چاہیئے اور کم ہو تو کن باتوں سے خبردار رہنا ضروری ہے؛ سوارہ فوج کہاں رہے اور فوج کی کس طرح تقسیم ہو؛ کوچ کا طریقہ اور اس کی ضروریات اور قابل لحاظ باتیں؛ افسر اعلیٰ موقع و محل کا خود معائنہ کرکے اس علم سے جنگ میں کسطرح فوج کی رہنمائی کرے؛ ہوا کے رخ کا جنگ کے وقت لحاظ؛ افسر اعلےٰ کے قتل پر اس کی فوری جانشینی اور بلا تاثر جنگ کا جاری رکھنا؛ قلعہ بند ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیئے؛ پسپائی اور واپسی؛ سپاہ کی تعداد میں کمی و زیادتی اور دشمن کی تعداد کے لحاظ سے جنگ شروع کرنے کا وقت؛ جاسوسی یا جنگ کی ابتدا خود نہ کرنی چاہیئے؛ قلعہ شکنی میں اولاً کن حصوں پر گولہ باری ہو وغیرہ۔

باب چہارم "حکم نامہ بنام سرنجشی و متصدیان تعلقہ کچہری حضور" میں ہے۔ انڈیا آفس کے پہلے نسخے میں "وغیرھا" زاید ہے اور ۲۴۶ میں "بنام سپہ دار وغیرھا" ہے۔ اس باب میں اولاً نمک حرامی کے اقسام بتاکر ممانعت کی گئی ہے کہ حکام ان سے باز رہیں اور اپنے ماتحتوں پر بھی نگرانی رکھیں۔ چنانچہ سپاہیوں کا "چہرا" یعنے حلیہ لکھنے اور ماہ بماہ تنخواہ تقسیم کرنے، پریڈ اور قواعد کے ذریعے سپاہ کو مستعد رکھنے اور سامان حرب و ضرب کی نگہداشت اور اسکے ہمیار رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ سامان حرب و ضرب توپ اور گولہ بارود کے علاوہ بندوق اور "قطار وطرنک وغیرہ" کی نگرانی ہو اور ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی مرمت سرکاری کارخانے میں فوراً کرائیں۔

فوجی اصطلاحات میں فارسی الفاظ کے رواج کا حکم، اور "امر و نہی ایزدی و احکام حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کا جو ترجمہ عربی سے کرایا گیا ہے اس پر عمل و رواج کا خیال رکھیں۔ اور خلاف ورزی پر فوراً سزا دیں۔

اس کے بعد سام (پریڈ یا قواعد) کا ذکر ہے جس کے ابتدائی حصے کی نقل غیر دلچسپ نہ ہوگی۔

ہوشدار

استاد دمک
صفین یک یک راست پشت گرد
چپ پشت گرد
دہ و پنج گام رد

وغیرہ وغیرہ ۔ بدستور بزن راست گرد چپ گرد صفین ملحق رو (یعنی متفرق ہوجاؤ)
جلد قدم آہستہ قدم قدم بزن باش برابر راست بین اور اسی قسم کی چند اصطلاحات ہیں جو غالباً فرانسیسی یا انگریزی کا ترجمہ ہیں ۔ ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ بعض ترکی الفاظ بھی مروج ہیں مثلاً قاشلق، جوق ۔ بعض الفاظ مثلاً دمک، قشون، تیپ، چمان، کا مفہوم پوری قواعد کا گہرا مطالعہ کرنے پر کوئی فوجی قواعد داں سمجھ سکتا ہے ۔

ہر قسم کی فوج کے لئے علیحدہ علیحدہ قواعد تھے قواعد چلیپا رنگروٹوں کے لئے ہے قواعد غیر اوقات مقرری گردش، گشت، جنگ دو بازو (جن کی تین قسمیں ہیں) جنگ دو طرف، قواعد توپ (جس میں پرکن اور سرکن اچھے الفاظ ہیں) قواعد چہار توپ، قواعد نیزہ، قواعد شمشیر، اور باب قدم میں پورے احکام پریڈ موجود ہیں مگر ان سے اس وقت زیادہ بحث غیر ضروری ہے ۔

اس کے آگے یزک دار، دفعدار، جمعدار، سرخیل، جوقدار، رسالہ دار، سپہ دار، بخشی و منصدی لکھے گئے ہیں جن میں ان کے فرائض کی تشریح کرکے قصور اور سزا کی مقدار کا بھی تذکرہ ہوا ہے سب سے چھوٹا عہدہ یزک دار اور سب سے بڑا سپہ دار ہے اور درجہ بدرجہ ترقی مل سکتی ہے ۔ اور قاعدۂ تبدیل یزک (پہرہ) اور قاعدۂ کیوان اول اور قاعدۂ تبدیل منقلا (گارڈ) اور قاعدۂ چاشت و شان (یعنی صبح و شام) کی پوری تفصیل ہے پھر ایک دلچسپ عنوان ہے جو پورا پورا نقل کیا جاتا ہے یہ محافظ و رہگزروں کے متعلق ہے ۔

"قاعدۂ سوال و جواب یزک دار و مردم رہگذر"

سوال کیست؟

جواب سرکار!

سوال کے سرکار؟

جواب حیدری سرکار!

سوال کے جوق

جواب فلاں جوق (فلاں کی جگہ نام لینا چاہیئے)

تعطیل اور جنگ کے وقت حفاظت و نگرانی، اور رخصت کے احکام اور سزا کے بعد یہ باب ختم ہوتا ہے۔

۵ واں باب تفویض خدمات میں ہے یعنی ترقی و تقرر۔ اس سلسلے میں بیان ہوا ہے کہ ہمیشہ ترقی ایک دم نہ دینی چاہیئے بلکہ یزک دار کو دفعدار، پھر جمعدار، پھر سرخیل، پھر جوقدار، پھر رسالہ دار، پھر سپہ دار پھر سپہ سالار یعنی دو تین سپہ داروں کا حاکم بنانا چاہیئے۔ لائق سرخیلوں کو بیساقچی اور بیساقچی گری کے بعد جوقدار بنانا مناسب ہے اور کوئی شخص خواہ کتنا ہی عمدہ مدبر شجاع کیوں نہ ہو اسکو یکدم بڑے عہدے پر ترقی نہ دینی چاہیئے بلکہ درجہ بدرجہ لیکن جلد جلد ترقی دیجا سکتی ہے۔

رخوت (یونی فارم) سلام، رخصت (اختتام پریڈ) کے بعد "سرکردن توپ ہائے خوشی" کا بیان ہے کہ عید رمضان، ذیحجہ، اور اپنی جماعت کی فتح پر گیارہ توپ، شاہی فتح پر ایک سو ایک دفعہ! غروب آفتاب کی دروازے بند ہونے کے وقت کی اور طلوع آفتاب اور دروازے کھولنے کی اطلاع میں ایک ایک توپ چلائی جاتی تھی۔ ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ اپنے سے صرف ایک درجہ کم یا زائد کے عہدہ دار کے ساتھ ملکر کھانا کھا سکتا تھا۔ اس سے زیادہ پر تنبیہ کیجاتی تھی۔

اس کے بعد ایک انڈکس ہے جس میں انگریزی یا فرانسیسی فوج کے مروجہ اصطلاحات کا ترجمہ جو سلطانی فوج میں بطور مرادف استعمال کیا جاتا تھا، مندرج ہے جس سے بہت مفید معلومات ہوتی ہیں۔ نستعلیق حروف جو ذیل میں ہیں اصل میں سیاہ ہیں اور نسخ یعنی عربی سرخی سے تحریر ہیں:-

اسمائے صاحب خدمات وغیرہ

قشون	ٹکری
سپہ دار	سردار ٹکری
رسالہ دار	کمندان
جوقدار	صوبدار
سرخیل	جمعدار
جمعدار	حوالدار
دفعدار	نایک
یزک دار	سپاہی
یساقچی	اجیٹن (مراد اجٹنٹ)
سریساقچی	جنرل اجیٹن
سام گاہ	پریٹ (مراد پریڈ)
منشور	وردی
منقلا	کاٹ (مراد گارڈ)
رسالہ	بٹالم (مراد بٹالین)
جوق	کمپنی
یزک	پھرہ
نشان	پرول (یعنی واچ ورڈ)
منقلای پیش	میکاڈ (وین گارڈ)
منقلای عقب	ریرگارڈ

کیوان	رونڈ
کیوان اوّل	گرائنڈ رونڈ
کیوان دوم	رجیٹ رونڈ
کیوان سیوم	پٹ رونڈ
سام	کمان (کمانڈ) یعنی قواعد یا پریڈ
ثریا	فیل (غالباً فائل)
کہکشاں	لام (غالباً لائن)
نجم	کوت (کوارٹر گارڈ)
نوآموز	الیٹ بٹن؟
چاشت	(۵ گھڑی دن نکلنا) تنان (۲ گھڑی رہی شام)
معلم دفعدار	دیل نایک
معلم جمعدار	دیل حوالدار
طنبور	——
نے	——
سنج	جھانج
طنبورچی	——
نے نواز	——
سنجی	غالباً سنج چی۔

دارالشفا برائے مجروح و بیمار

نان پروشی (وظیفہ معذورانِ جنگ)

انڈیا آفس کے نسخے میں ۶ و، ۷ ویں بابوں میں توپ خانہ، سوارہ فوج، اور پیادہ فوج کے

احکام درج ہیں۔ مگر ہمارے پیش نظر نسخے میں ان کے لئے مستقل باب تو نہیں البتہ ۵ ویں باب میں ضمناً ان کا تذکرہ اِدھر اُدھر آگیا ہے۔ ان کے سوا اُس میں آخری دو صفحے (جو ۱۴۸ ویں ورق پر ختم ہوتے ہیں) سانپ کے زہر کا علاج لکھنے میں صرف ہوئے ہیں۔ یہاں پر بڑا نسخہ ختم ہو جاتا ہے جو حقیقت میں اصلی نہیں بلکہ ایک نقل ہے جیسا کہ املا کی غلطیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اور بھی نسخے ہیں انہیں سے ۲،۵۵ اور ۲،۵۹ کے آخر میں "ریختہ غزلیں" ہیں۔ ان کے متعلق فہرست میں جو انگریزی نوٹ ہے اُس کا اقتباس درج اور ترجمہ کیا جاتا ہے :—

No. 2755 incomplete.

.....Beyond this the copy is a mere labyrinth; on fol. 73b-77b there appears Rekhta Ghazals for the various times of the day, with reference to soldiers' duties; on ff. 78-90 miscellaneous matters' referring to the same, written by other hands in almost illegible Shikista.

نسخہ ۲،۵۵ نامکمل۔

..... اسکے سوا یہ نسخہ محض ایک معمہ ہے! ورق ۳، ب سے ۷۷، ب تک چند اردو غزلیں نظر آتی ہیں جو دن کے مختلف اوقات سے متعلق ہیں اور ان میں سپاہیوں کے فرائض کا بھی تذکرہ ہے۔ اوراق ۷۸ سے ۹۰ تک میں انھیں کے متعلق مختلف اُمور بالکل غیر واضح شکستہ خط میں ہیں جو ایک نئے ہاتھ کی تحریر ہے۔

No. 2756 incomplete.

.....On fol. 59b sq. some Rekhta verses. There is obviously a large lacuna on fol. 34b where suddenly quite a new handwriting commences.

۲،۵۶ نامکمل

ورق ۵۹ ب مربع میں چند اردو اشعار ہیں۔ اور ورق ۳۴ ب پر بظاہر ایک بڑی جگہ سادہ ہے جس کے بعد سے یک بیک ایک نیا خط شروع ہوتا ہے۔

یہ اشعار ہمارے نسخے میں انڈکس کے بعد ورق ۴، ب سے شروع ہوتے ہیں۔ ان کی نقل سے پہلے ایک بات بیان کرنی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ یہ اشعار اصلی ہیں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ بعد میں اضافہ کئے گئے اسکے کئی وجوہ ہیں۔ اول تو یہ کہ انڈیا آفس کا مکمل نسخہ اصلی نسخہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک نقل ہے اور اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ اصل سے نقل ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں اردو اشعار کے ہونے سے یہ ضروری نہیں کہ وہ اصلی نسخے میں بھی نہ تھے۔ جن دو نسخوں میں اردو اشعار ہیں ان کے دیکھنے کا اگرچہ موقع نہیں ملا لیکن انڈیا آفس کی فہرست میں اڈیٹر نے جو عبارت لکھی ہے اور جو اوپر نقل کی گئی ہے اس پر غور کرنا چاہئے۔ ۲۷۵۵ میں یہ نہیں بیان ہوا ہے کہ اردو اشعار الگ خط کے ہیں بلکہ انکے بعد کچھ اور باتیں جو اسی قسم کی ہیں دوسرے ہاتھ کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے نسخے میں اگرچہ یہ بیان ہوا ہے کہ ۴۳ ویں ورق سے خط بدل گیا اور اس طرح ضمناً اردو اشعار کے خط کا بھی ابتدائی حصے سے مختلف ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ اردو اشعار ۵۹ ویں ورق پر ہیں اور نیا خط ۴۳ ویں ورق سے شروع ہوتا ہے۔ اگر اردو اشعار بعد کے سمجھے جائیں تو اس تمام حصہ کو بھرتی کا سمجھنا چاہئے جو نئے خط کی ابتداء سے ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کے کاتب کو اصل کتاب کا کوئی مکمل نسخہ نہیں ملا۔ پہلے جتنا حصہ ملا نقل کر لیا۔ اسکے بعد اس کے کسی جانشین کو جب اس کتاب کا کچھ اور حصہ ملا جو اس کے پاس کی کتاب میں نہ تھا تو اسنے احتیاط تھوڑی جگہ سادہ چھوڑ کر باقی حصہ نقل کر لیا۔

اسکے برخلاف ہمارا نسخہ اصل شاہی نسخے کی نقل معلوم ہوتا ہے کیونکہ پہلے صفحہ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے اوپر ایک مہر کی نقل ہے جو اس طرح ہے:-

۱۲۱۵
ٹیپو سلطان

اس مہر کے برابر ۱۲۱۵ لکھا ہوا ہے جن کا منشاء معمہ[1] ہے۔ اس کے سوا اصل کتاب کی

---

[1] ٹیپو سلطان نے سنین کے متعلق طرح طرح کی جدتیں دکھائی تھیں۔ ان پر مولانا حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے اپنے مضمون "سکہ جات ٹیپو سلطان" میں (جو اسی اشاعت میں درج ہے) کافی روشنی ڈالی ہے۔ "مجلہ"

تصنیف ۱۱۹۷ھ کی ہے اور ہمارا نسخہ ۱۲۰۱ھ میں نقل کرایا گیا ہے (جو اصل نسخے کی تصنیف شروع ہونے کے صرف چار برس بعد کا ہے) چنانچہ ابتدائی صفحہ پر کتاب کے نام کے نیچے یہ عبارت ہے:—

"در میلا پور[1] معرفت دلیر جنگ بہادر بتاریخ ۱۰ ربیع الاول ۱۲۰۱ ہجری نویسانیدہ شد"

اس صفحہ پر تین مہریں ہیں جو مٹی ہوئی ہیں مگر خوردبین سے واضح ہوتا ہے کہ ایک پر [بہا ۱۲۶۰ در کتاب عماد الدولہ] ہے جو ویسے بھی ذرا سے غور سے پڑھا جاتا ہے دوسری پر [الوہا خان عبد] نظر آتا ہے سنہ میں پڑھ (۶۶) سا پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا تیسری سب سے اہم مہر مجھ سے پڑھی نہ جا سکی۔ اندر بھی ٹیپو سلطان والی مہر کے بازو ایک اور اسی قسم کی مہر ہے جس کے پڑھنے کیلئے ایک اچھی خوردبین کی ضرورت ہے — مگر یہ بیرونی باتیں ہیں۔

اندرونی ثبوت میں چند باتیں قابل ذکر ہیں۔

اولاً اردو اشعار کی زبان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ٹیپو سلطانی عہد سے زیادہ بعد کی نہیں جیسا کہ ناظرین بھی جب اسی عہد کے اردو اشعار کا مطالعہ کریں گے تو واضح ہو جائیگا۔ (ملاحظہ ہو اردوئے قدیم از حکیم سید شمس اللہ قادری)

دوسرے یہ غزلیں اسی خط میں ہیں جس میں باقی کتاب تحریر ہوئی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اردو غزلوں کے آخر میں "نام ہای دوازدہ ماہے" کی سرخی سے یہ بارہ مہینے ہیں "احمدی، بہاری، جعفری، دارائی، ہاشمی، واصلی، زبرجدی، حیدری، طلوعی، یوسفی، ایزدی، یاضی" اسی عہد کی بعض کتابوں کے آخر میں جن کا تذکرہ فہرست کتبخانہ انڈیا آفس میں نظر سے گزرا ٹیپو سلطان کا نام اور اس کے بعد حکم کی تاریخ میں یہی مہینے لکھے ہوئے ہیں اقتصادی ضروریات سے شمسی مہینوں کے رواج کی ضرورت تھی اور مسیحی مہینوں کی بجائے یہ مہینے منظور کئے گئے۔ (اسی سلسلے میں حیدرآباد کے فصلی مہینوں کے متعلق اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ حیدرآباد میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔)

---

[1] میلاپور مدراس میں ایک محلے کا نام ہے اور یہ کتاب مدراس ہی سے حیدرآباد آئی ہے۔

چونکہ یہ آخری باب انھیں اشعار کے بعد ہے اور اسی ورق پر ہے جس پر کئی ایک غزلیں ہیں اسلئے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ جب یہ مہینے سلطانی سلطنت میں مروج تھے تو ان فوجی غزلوں کے رواج کو بعید از قیاس نہیں سمجھا جاسکتا خصوصاً ہمارا نسخہ ٹیپو سلطان کی وفات سے کوئی چودہ سال قبل نقل ہوا ہے۔ فارسی کی بجائے اُردو اشعار کی غالباً یہ وجہ ہے کہ اُس زمانہ میں سرکاری زبان فارسی تھی لیکن ملک میں اُردو خوب مروج تھی اور سپاہیوں میں سے اکثر کی مادری زبان تھی۔

فوجی گانوں میں جو بحریں سب سے زیادہ مستعمل تھیں وہ یہاں نقل کیجاتی ہیں۔

غزل۔ وقت آہستہ قدم۔ پشتو۔

ملکِ ہندوستان میں دیں کا وہی سلطان ہے — غرق جس کے آبِ خنجر میں فرنگستان ہے
کیا ہی نسبت جاہ و حشمت میں سکندر سے تجھے — بارگاہِ قدر کا دارا تیسرا دربان ہے
ہے وہی انسانِ کامل جس میں ہو معنی کی بُو — نقشِ دیبائی وگرنہ صورتِ انسان ہے

مذکورۂ بالا غزل غالباً آہستہ روی کے وقت بجائی جاتی تھی اور مندرجۂ ذیل تیز روی کے وقت :—

غزل۔ وقتِ جلد قدم۔ ہندول

بجا ہے کہئے اُسی کو شہ خواص و عام — کہ جس کے رعب سے لرزاں ہے آفتاب مدام
لقب ہوا اُسے سلطانِ دیں اسی خاطر — کہ ہے مروجِ شرع اور حامیٔ اسلام
جہاد یہاں تئیں رائج کہ عہد میں جس کے — نہ دیکھی تیغ کبھو خواب میں بھی روئے نیام

غالباً نیزوں سے لڑائی کے وقت بجائی جاتی تھی :—

غزل۔ وقتِ ضربِ سنان۔ جنگلہ

یا الٰہی رہے تا حشر وہ سلطانِ جہاں — جس کے ہے عدل سیں سرسبز گلستانِ جہاں

سر نوشت آیۂ فتح است عَلَم کے جس کے — کیوں نہ دیں باج اُسے جملۂ شاہانِ جہاں
حیدری رسم کو اجیا کرے عالم جو کوئی — ہے بجا کہئے اگر اُس کے تئیں جانِ جہاں

صبح سویری یہ غزل بجتی تھی:۔

فرنگ و زنگ تری تیغ سے کیوں نہ لرزاں ہو — کہ جسکے خوفِ دم سیں برق ہر دم پا بہ داماں ہو
دعا کرتا ہے ہر یک مور جس وادی سیں تو گزرے — کہ یارب یہ جہاں داور زمانہ کا سلیماں ہو
لبِ ہر ذرہ سیں یہ لفظ نکلے ہے بصد آہیں — فلک پر مہر ہے جب تک زمیں پر تُو سلطاں ہو

مذکورۂ ذیل کی غزل فوج کے بدلنے کے موقع پر بجائی جاتی تھی:۔

غزل وقتِ تبدیلِ منقلا پنج گھڑی روز ماندہ ۔ توری ۔

بُلبل ثنا کرے ہے جب گُل کی گلستاں میں — میں خُلق کا تیرے وصف کہتا پھروں جہاں میں
گر یادِ خُلق تیرا گزرے چمن کے دل پر — ہر خار بار لاوے صد دستہ گل خزاں میں
طاقِ بلندِ نیساں ہے جائے نامِ کسریٰ — شہرا ہوا تیرا عدل از بسکہ اب جہاں میں

یہ رُباعی صبح میں بجائی جاتی تھی:۔

رُباعی وقتِ نشان سہ پاس روز گزشتہ ۔ سارنگ

روشن ہے تیرے سیں اب چہ ماہیں وچہ زنگ ای مہر جمال
انگشت نما ہے تیغ تیری در شہر فرنگ مانند ہلال
او دے تیرے عدل سیں یہ صورت جگے میں بے زنگ گذاف
پالے جگ ہے بغل میں اپنے آئینہ کو سنگِ فرزند مثال

غزل وقتِ نشاں یعنی دو گھڑی روز باقی ماند ۔ کوری

خلق تیرا کرے جو عطاری — آوے یوسف پے خریداری

ہجر کی رات دیدۂ عاشق — بخت میں تیرے سب کی بیداری
اوٹ گیا اب جہاں میں نام خراب — ہے تیرے عدل کی یہ معماری

غزل وقتِ تو پے شب کہ یک پاس گذشتہ می زنند ۔ کلیان

ازل سے ہو جو مستے بظلِ الٰہی — اسی سے سیکھے فریدوں رسم جہاں بانی
رہے نہ یوں بر خورشید میں قبای فلک — جو چست ہے تیرے جامہ پو خلعتِ شاہی
الاہی جب تئیں قائم ہے آسمان و زمین — مطیع حکم ہو اس کا ز ماہ تا ماہی

خوشی اور مسرت کے وقت یہ اشعار بجائے جاتے تھے ۔

غزل ۔ در وقتِ سرور و فرحت ۔ پوربی

نہ دیکھے خواب میں روئے زوال ای ظلِ سبحانی — اگر خورشید سیکھے تجھ سے آئینِ جہاں بانی
مجسم ہو تیرا اگر حسن خلق اے آیۂ رحمت — نکالے یک گریباں سے تجھ سر تا ماہِ کنعانی
الٰہی یہ شہ انجم حشم گردش میں گردوں کے — نہ ہو خورشید کے مانند گاہے جبیں بہ پیشانی

کسی کو بطور سزا تشہیر کرایا جاتا تو اس کے ساتھ یہ ڈھنڈورا پیٹا ۔

غزل ۔ در وقتِ تشہیر مردِ گنہگار ۔ یمن

ذات میں تیرے ہے قائم عدل ای جمجاہ بس — حکم میں تیرے ہے نکلا عدل کے دل کا ہوس
عدل کے شحنہ سے تیرے اے شہ بیدار بخت — خواب شیریں خوش کیا ہے خامۂ چشم عسس
کہ عدو پاوے اماں تجھ تیغ سیں کاٹے ہی جب — زندگی اپنی کے رونا لہی میں مثل جرس

غزل ۔ وقتِ تشہیر زنِ گنہگار ۔ دھناسری

بہرام ہراساں ہے تیرے خنجر میں بر چرخِ دو رنگ — چمکے ہے درخش تیرے گردو فر میں اصفدر جنگ

تجھ تیغ کا اب گرچہ درکشورِ ہند ہی موج میں لنگ نو نیزہ گذر گیا ہے پانی سر میں در ملکِ فرنگ

کوچ کے لئے سپاہیوں کو جمع کرنے کی آواز میں یہ بجتا تھا:۔

غزل۔ در وقت طنبورِ اوّل کوچ۔ شام کلیان

ہے تیرا بندۂ فرمان نہ تنہا بہرام حلقہ در گوش پے ہے چرخ مہ نو سے مدام

مشتری دام کرے اُس سے سعادت دیم کوکبِ بخت کا تیرے جو ہو کیوان غلام

ابلق چرخ تیرے حکم پہ کیونکر نہ پھرے کہ ازل سے تیرے کف میں ہے زمانہ کا زمام

غزل۔ در وقت طنبورِ دوم کوچ۔ للت

تاباں ہے برجِ اوج میں وہ آفتاب آج خورشید جس کی شرم سے ہے آب آب آج

ہو نشہ باب آتشِ فردا اگر عدو شمشیر سے تیرے پے یک قطرۂ آب آج

رائج ہے طبع میں تیری از بسکہ راستی زُلفِ پری رُخاں میں اٹھا پیچ و تاب آج

تیسری آواز پر دو مخمس بجتے تھے:۔

ہے عَلَم داروں میں تیرے چرخِ اطلس خام ایک نیزداران کی تیرے سیں ہے بہرام ایک

بزمِ ہمت کا تیرے ہے مہرِ زریں جام ایک ہفت مدِ بحر ہے تیرا مدالعلام ایک

الغرض عالم میں ہے تو داورِ ایام ایک

پنجۂ ہمت تیرا جب سیں سخا آئیں ہوا کوہ کے دامن سیں دامن آز کا سگیں ہوا

عدل کا شہرہ تیرا از چین تا ماچین ہوا جلوہ آرا ہند کا ایسا جو ماہِ دین ہوا

کیا عجب گر بعد ازاں ہووے جو صبح و شام ایک

منتشر سپاہیوں کو جمع کرنے پر:۔

غزل جہتِ اجتماعِ مردمِ متفرق کھماج

اے آفتاب! جلوہ دہِ آسمانِ عدل — شاداب ہے تیرے سے اب گلستانِ عدل
پے لکنت دروغ کہے ہے یہ حرف راست — بہتر تیرے سیں کون ہو شاہِ جہانِ عدل
حبّو وصف تیری ذات کا ہرگز سنے نہ کوئی — گویا بیانِ قال سیں گر ہو زبانِ عدل

واضح رہے کہ بعض مصرع موزوں نہیں معلوم ہوتے۔ اصل کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہے لیکن کسی اور نسخے کی غیر موجودگی کے باعث مقابلہ نہیں کیا جاسکا۔

[مشکل قدیم الفاظ بہت کم ہیں۔ "سیں" "سے" کی جگہ ہر مقام پر مستعمل ہوا ہے۔ مصرع دوم آخری غزل کے سوا جہاں "سے" ہی اصل میں بھی لکھا ہوا ہے۔ اس کے سوا "تجھ" "تیرے" کے معنی میں اور "تئیں" "تک" کے لئے رائج ہے۔ "گ" پر مرکز اصل میں نہیں ہے لیکن سہولت کے لئے اس مضمون میں لگا دیا گیا ہے اور چار اعراب بھی بڑھا دئے گئے ہیں۔ آسانی کے لئے بعض الفاظ کے نیچے معنے کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہر غزل ایک خاص طرز میں بجائی جاتی تھی جس کے نام بھی اصل میں لکھے ہوئے ملے ان کی تشریح اس لئے ضروری نہیں کہ اس کا وقت فارسی میں بازو ہی موجود ہے]

یہ مختصر کیفیت ہے جو فتح المجاہدین کے مطالعے کے بعد مرتب کی گئی۔

رات سے خطاب

از محمد جلال الدین اشک

اپنے رخِ ملیح سے ہو شرمائے دہر بن — بحرِ حباب خیز پر محوِ خرامِ ناز ہو
انجمنِ وجود میں چیز جو ہے وہ تیری ہے — بربطِ عیش ہو کہ یا سنجِ والم کا ساز ہو

دم سے ترے جہان میں دورِ سکونِ عام ہے — پردۂ کائنات میں لیلیٰ شب نہاں ہو
شاعرِ دردمند کی دولتِ بیمثال تو — تو نہ اگر ہو دہر میں جذبۂ دل عیاں نہ ہو

تیرے ہی دم سے اشکِ خوں مصرعِ تر بنے مرے — تیری ہی روشنائی سے نوکِ قلم ہوئی رواں
تو ہی تھی میری غمگسار بحر میں کائنات کے — تیرے ہی دم سے زندگی میری ہوئی ہے جاوداں

چادرِ مشکِ فام سے ڈھانک لے اپنے جسم کو — انجمِ بے شمار کو لے کے پھر اس طرح ٹانک لے
دار و رسنِ بہشتی پالا قلزمِ بے قرار کو — پردۂ غرب کو ہٹا ایک نظر تو جھانک لے

رودکی کا اصلی اور فرضی کلام

مترجمہ جناب سید محمد صاحب قادری ایم اے (عثمانیہ)

فارسی شاعر کے ابوالآبا رودکی کے کلام کی نسبت مدرسۂ علوم مشرقیہ لندن کے صدر سر ڈینی سن راس نے جو تحقیقی مقالات[1] لکھے ہیں ان کا ملخص ترجمہ اردو دان اصحاب کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

آج رودکی کی منظومات کے کوئی اصلی کلیات موجود نہیں۔ مندرجۂ ذیل مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ رودکی کا کس قدر کلام محفوظ ہے اور کس قدر مختلف گلدستوں اور بیاضوں میں اس کے نام سے غلط طور پر منسوب کیا گیا ہے۔ رودکی اگرچہ جدید یا اسلامی فارسی شاعری کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے اور منظوم کلیلہ و دمنہ کا مصنف ہے مگر اس کا کلام بہت جلد ناپید ہوگیا۔ یہ سچ ہے کہ اسدی کوچک نے اپنی "لغاتِ فرس" میں دوسرے شاعروں کے مقابلہ میں رودکی کے زیادہ اشعار نقل کئے ہیں اور دیگر فارسی فرہنگوں میں اس کی چیدہ چیدہ ابیات بہت ملتی ہیں مگر سولھویں صدی عیسوی کے تذکرہ نویس اس کے کلام کا بہ مشکل دستیاب ہونا ظاہر کرتے ہیں۔

رودکی کے حالات زندگی اکثر تذکروں اور انگریزی میں بھی متعدد مصنفوں نے بیان کئے ہیں۔ انگریزی میں اس کا تازہ ترین تذکرہ پروفیسر ولیمس جیاکسن کی کتاب "ابتدائی فارسی شاعری" مطبوعہ نیویارک ۱۹۲۲ء (Early Persian Poetry, by A. V, W. Jackson) میں درج ہے۔

[1] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اکتوبر ۱۹۲۴ و اپریل ۱۹۲۶ء۔

اسکی زندگی کے حالات بالکل مختصر ہیں اور ہم صحت کے ساتھ جانتے ہیں کہ وہ نصر بن احمد سامانی والی ماوراءالنہر (۹۱۳ء تا ۹۴۳ء) کا درباری شاعر تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش و وفات کا صحیح طور پر علم نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھا۔ اسکی چنداں ضرورت نہیں کہ دیگر فارسی شعرا نے اسکی شاعرانہ عظمت و واہمیت کی جو تعریفیں کی ہیں یہاں ان کا اعادہ کیا جائے۔ یہ مختلف تذکروں میں موجود ہیں اور اس کے سوانح نگاروں نے بیان کردی ہیں۔ البتہ مندرجۂ ذیل ابیات حال ہی میں شایع ہوئی ہیں اس لحاظ سے قابل بیان ہیں۔ کتاب راحت الصدور[1] کے صفحہ (۶۲) پر لکھا ہے۔

لولا جریر والفرزدق لم یدم ذکر جمیل من بنی مروان
وبری ثناء الرودکی مخلداً من کل ما جمعت بنو سامان

(اگر جریر اور فرزدق نہ ہوتے تو کبھی بھی بنی مروان کا ذکر جمیل باقی نہ رہتا۔ آل سامان نے جو کچھ بھی جمع کیا اس میں سے صرف رودکی کی مدح ہی باقی رہ گئی)

رودکی کے سوانح حیات کا ایک اور ماخذ یہاں نقل کردینا مناسب ہے کیونکہ اس طرف اتنی توجہ نہیں کیگئی جتنی کہ چاہیئے تھی۔ سمعانی کی کتاب الانساب[2] میں لکھا ہے۔

الرودکی بضم الراء وسکون الواو وفتح الدال المعجمۃ وفی آخرھا الکاف۔ ھذہ النسبۃ الی رودک وھی ناحیۃ بسمرقند وبھا قریۃ یقال لھا بنج وھذہ القریۃ قطب رودک وھی علی فرسخین من سمرقند والمشھور منھا الشاعر المفلج القول بالفارسیۃ السایر دیوانہ فی بلاد العجم ابو عبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمن ابن آدم الرودکی الشاعر السمرقندی،

---

[1] راحت الصدور و آیات السرور للراوندی مصححہ ڈاکٹر محمد اقبال۔ سلسلہ جدید یادگار گب جلد دوم ۱۹۲۱ء (یہ سلجوقہ بزرگ کی مستند تاریخ ہے جو تیرویں صدی عیسوی کے آغاز میں پایۂ تکمیل کو پہنچی)

[2] عکسی طبع سلسلہ یادگار گب جلد ہشتم صفحہ ۲۶۲

کان حسن الشعر متین القول۔ قیل اوّل من قال الشعر الجید بالفارسیۃ ھو۔ وقال ابوسعید الادریسی الحافظ ابوعبداللہ الرودکی کان مقدماً فی الشعر بالفارسیۃ فی زمانہ علی اقرانہ۔ (یروی عن اسمٰعیل بن محمد بن اسلم القاضی السمرقندی حکایۃ حکاھا عنہ ابوعبداللہ بن ابی حمزہ السمرقندی۔ لا اعلم لہ حدیثاً مسنداً وبعد ان رایت لہ روایۃ لم استحسن ترک ذکرہ) قال وکان ابوالفضل البلعمی وزیر اسمٰعیل بن احمد والی خراسان یقول لیس للرودکی فی العرب والعجم نظیر۔ ومات برودک سنہ ۳۲۹۔

رودکی سمرقند کے ضلع رودک سے منسوب ہے۔ ضلع رودک میں ایک گاؤں بنج نامی رودک کا قطب یعنے مرکز تھا اِس مقام کا سب سے زیادہ مشہور شخص وہ خوش بیان ایرانی شاعر ہے جس کا دیوان ایران میں عام طور پر رائج ہے اور جس کا نام ابوعبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمٰن بن آدم رودکی سمرقندی ہے۔ وہ خوشگو اور پختہ کار شاعر تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے فارسی میں عمدہ اشعار لکھے۔ ابوسعد الادریسی حافظ کا بیان ہے کہ ابوعبداللہ رودکی کو فارسی شاعری میں اپنے تمام معاصرین پر فوقیت حاصل تھی۔ (اسمٰعیل بن محمد بن اسلم قاضی سمرقندی سے مروی ہے کہ ابوعبداللہ بن ابوحمزہ سمرقندی کو رودکی سے ایک روایت ملی تھی۔ ہمیں کوئی معتبر حدیث رودکی سے منسوب نہیں ملی مگر اس خیال سے کہ اسکے نام سے روایت کیگئی ہے۔ اس لئے میں نے اس کا ذکر نہ کرنا مناسب نہیں خیال کیا)۔ ابوالفضل بلعمی وزیر اسمٰعیل بن احمد والی خراسان کہا کرتا تھا "رودکی کی اقصای عرب و عجم میں کوئی نظیر نہیں اسنے رودک میں سنہ ۳۲۹ھ میں وفات پائی"[1]

منقولہ بالا بیان میں جو حصہ قوسین میں دیا گیا ہے اُس کو آقا میرزا محمد قزوینی نے اپنے حواشی چہار مقالہ[2] میں کس خاص سبب سے نقل نہیں کیا اس کا علم نہو سکا۔ یہاں سیاق عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے

---

[1] مشہور تذکروں میں رودکی کی وفات سنہ ۳۳۰ھ اور سنہ ۳۴۳ھ کے درمیان بتائی گئی ہے۔

[2] سلسلہ یادگار اوقاف گب جلد یازدہم۔ صہ ۱۲۵

روایت کا لفظ حدیث سے متعلق ہے مگر عربی میں روایۃ کا لفظ راوی (حدیث بیان کرنے والا) اور راویۃ (اشعار کو یاد رکھنے والا) دونوں کا حاصل مصدر ہے۔ فارسی میں راوی کا لفظ شاعری سے متعلق ہے ظاہر ہے کہ سمعانی نے اپنی کتاب میں صرف محدثین و راویان حدیث کے حالات بیان کئے ہیں اور اس کا بہت کم امکان ہوسکتا ہے کہ اس نے رودکی کے حال میں راوی کا لفظ شاعر کی نظمیں یاد رکھنے اور دہرانے والے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ نظامی عروضی اپنی کتاب کے مقالہ دوم حکایت ۲۰ میں لکھتا ہے کہ فردوسی کا راوی[1] ایک شخص ابو دلف تھا اور فارسی فرہنگوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رودکی کے راوی کا نام مج یا ماج تھا۔ باوجود اسکے رودکی کی مثنوی کلیلہ و دمنہ کے ناپید ہو جانے کی وجہ بتلانا بہت مشکل ہے۔ مثنوی رودکی کے متفرق اشعار کا جو اتفاق سے دستبرد زمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں آگے ذکر کیا جائیگا۔ یہاں شاہنامہ فردوسی سے جس میں بلاشبہ اس گم شدہ مثنوی کا سب سے قدیم حوالہ ہے، چند متعلقہ ابیات نقل کئے جاتے ہیں۔

کلیلہ بہ تازی شد از پہلوی — بدنیساں کہ اکنوں ہمی بشنوی
بہ تازی ہمی بود تا گاہ نصر — بدانگہ کہ شد در جہاں شاہ نصر
گرانمایہ بو الفضل دستور اوی — کہ اندر سخن بود گنجور اوی
بفرمود تا پارسی دری — بگفتند و کوتاہ شد داوری
وزاں پس بدو رسم و رائے آمدش — برو بر خرد رہنمائے آمدش
ہمی خواستی آشکار و نہاں — کزو یادگاری بود در جہاں
گزارندہ را پیش بنشاندند — ہمہ نامہ بر رودکی خواندند
بہ پیوست گویا پراگندہ را — بہ سفت ایں چنیں در آگندہ را

۱۸۷۳ء میں ڈاکٹر ایتھے (Dr. Ethé) نے "رودکی شاعر آل سامان" کے عنوان سے

---

[1] علاوہ راوی کے علی دیلم فردوسی کا ایک نساخ بھی تھا دیکھو Das Iranishe Nationalepos by Nöldeke ۲

ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں اس نے رودکی کے متعلق تمام حوالے جو بڑی جانفشانی کے بعد (۲۶) سے زیادہ مختلف کتابوں سے دستیاب ہوئے معہ ترجمہ کے نقل کئے ہیں۔ رودکی کے متعلق تمام مابعد یورپی مصنفین نے اسی مضمون پر اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھی ہے اور عام طور پر (۵۲) اقتباسات جن میں (۸) رباعیاں ہیں، رودکی کا اصلی کلام قرار دئے گئے۔

ڈاکٹر ایتھے کا سب سے قدیم ماخذ عوفی کا تذکرہ "لباب الالباب" ہے جو ۱۲۲۰ء میں تمام ہوا۔ ڈاکٹر ایتھے کا مضمون شائع ہونے کے بعد رودکی کے متعلق بہت کچھ مواد دستیاب ہوا جس سے ہم اصل حقیقت سے زیادہ قریب ہوتے جارہے ہیں۔ اس خصوص میں "لغات فرس" مولفہ اسدی کوچک (۱۰۶۰ء) اور "معجم شمس قیس"[1] مولفہ ۱۲۱۰ء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک تیسرا اور نہایت اہم ذریعہ معلومات بیہقی کی "تاریخ مسعود غزنوی" ہے۔ ڈاکٹر ایتھے اس آخر الذکر ماخذ سے بخوبی واقف تھا مگر اس نے اسکا ذکر نہیں کیا حالانکہ اس میں کلام رودکی کے چار اقتباس موجود ہیں اور وہ اپنی قدامت اور زمانہ تالیف (۱۰۵۰ء) کے باعث "لغات فرس" کے برابر مستند و معتبر ہے۔

تاریخ بیہقی کے اقتباسات جو اس مضمون میں آگے درج کئے گئے ہیں وہ قصاید رودکی کے نہایت اہم جواہر پارے ہیں۔ اسدی کوچک نے قصاید کے صرف متفرق اور چیدہ اشعار نقل کئے ہیں۔ اسکے علاوہ ایک پوری رباعی اور مثنوی کلیلہ و دمنہ کے (۱۶) شعر بھی محفوظ کردئے ہیں۔ شمس قیس نے بھی بیہقی کی طرح رودکی کے (۱۸) اقتباسوں میں کئی ایک مسلسل شعر دئے ہیں جن کی تعداد (۲۹) ہے۔

ڈاکٹر ایتھے کا مضمون شائع ہونے کے بعد کوئی (۴۰) نظموں کا ایک قلمی مجموعہ دیوان رودکی کے نام سے یورپ میں دریافت ہوا۔ یہ دراصل رودکی کے ایک سو سال بعد کے ایک شاعر قطران کی نظموں کا مجموعہ نکلا۔ اسکی (۴۰) نظموں میں سے (۵) کے سوائے باقی تمام نظمیں دیوان قطران کے

---

[1] المعجم فی معائیر اشعار العجم مصححہ میرزا محمد قزوینی و پروفیسر براون سلسلہ یادگار گب جلد دہم ۱۹۰۹ء۔

کسی نہ کسی قلمی نسخے میں پائی گئیں۔ مضمون ہذا میں اس دیوان کو "فرضی دیوان رودکی" کے نام سے یاد کیا جائیگا۔ اگرچہ بظاہر یہ مجموعہ ڈاکٹر ایتھے کی نظر سے نہیں گزرا مگر اس کو "جدید ادبیات ایران" پر مقالہ لکھتے وقت "مجمع الفصحا" سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اکثر نظمیں جو رودکی کے نام سے منسوب ہیں دراصل قطران کی ہیں۔

"فرضی دیوان رودکی" کے دو نسخے Or. 7894 & Or. 3246 برٹش میوزیم میں ہیں اور ایک سر ڈنیسن کے قبضہ میں ہے۔ یہ تینوں نسخے ہر ایک بات میں ایک دوسرے کے مطابق ہیں اور برٹش میوزیم کے ایک نسخہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخہ کا متن ایک قلمی نسخہ سے جو سپہ سالار کی مسجد واقع طہران میں تھا، منقول ہے۔

راقم السطور کے پاس جو نسخہ ہے وہ دوسرے دو نسخوں کی طرح غالباً انیسویں صدی کے نصف کا مکتوبہ ہے اس میں جملہ (۴۰) نظمیں ہیں جن میں دو رباعیاں ہیں۔ ان کے مصنف کے بارہ میں راقم کو شبہات پہلے پہل اسطرح پیدا ہوئے کہ اس مجموعہ کا قصیدہ بالکل وہی نکلا جو شیفر (Schefer) نے اپنی کتاب (Chrestomathie Persane) کی جلد دوم میں قطران کے نام سے شائع کیا ہے۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے نسخہ میں وہ مرثیہ بھی ہے جو قطران نے ۱۰۴۲ء کے زلزلہ تبریز پر لکھا تھا اور جس کو شیفر نے بھی شائع کیا ہے صرف اس ایک مرثیہ کا اس مجموعہ میں پایا جانا یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ نسخہ غلط طور پر رودکی سے منسوب ہے۔

قطران کا مکمل دیوان مختلف نسخوں کی صورت میں محفوظ ہے اس لئے تذکروں وغیرہ سے اسکے کلام کا نمونہ نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ سرسری طور پر یہ بتا دینا کافی ہے کہ شمس قیس اور عوفی نے اسکے کلام کا نمونہ دیا ہے مگر نہ اسدی نے اپنی لغت میں اس کا ذکر کیا نہ نظامی عروضی نے "چہار مقالہ" میں اسکو بضمن شعرائے مشہور بیان کیا ہے۔ سب سے قدیم لغت جس میں قطران کا حوالہ ہے وہ "رسالہ حسین وفائی" ہے جس میں لفظ تیر کے لئے اسکا ایک شعر سنداً پیش کیا گیا ہے۔ اگر گیارہویں صدی میں بھی قطران کی شہرت شمالی ایران میں ہوتی تو یہ ناممکن ہے کہ اسدی اس سے ناواقف ہو حالانکہ اس نے اپنی تصنیف "گرشاسپ نامہ" قطران کے ایک مربی ابودلف والی ارّان کے نام

معنون کی ہے۔

عوفی اور دولت شاہ کے منقولہ مونہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قطران خاص طور پر تخمیسات اور ذو قافیہ کے کثرت استعمال کے لئے مشہور تھا مگر اس کے سارے دیوان کی تنقیح کیجائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے نسبتاً بہت کم نظموں میں ان صنایع کا استعمال کیا ہے۔ اس کے قصاید بہ حیثیت مجموعی اچھے اسلوب کے نمونے ہیں۔ اور اس واقعہ سے بھی کہ اس کے اکثر قصیدے رودکی جیسے بڑے استاد کے نام سے منسوب اور تسلیم کرلئے گئے اس کے قصاید کی بلند پایگی ثابت ہوتی ہے۔

قطران کی سوانحعمری کے معتبر ماخذ تقی کاشی کا تذکرہ "خلاصتہ الاشعار" اور رضا قلی خاں کا تذکرہ "مجمع الفصحا" ہیں۔ موجودہ تحقیقات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم چیز اسکے مربیوں کے نام ہیں۔ انہی کے خلط مبحث سے اس کے قصاید رودکی سے منسوب ہو گئے۔

قلت گنجایش سے فی الوقت قطران کے مربیوں کے تفصیلی مطالعہ سے قطع نظر کر کے صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ تقی کاشی نے قطران کی تاریخ وفات ۴۴۵ھ اور رضا قلی خاں نے ۴۶۵ھ بتائی ہے دوسرے مستقل ذرایعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قطران ۴۳۴ھ میں تبریز میں اس زبردست زلزلہ کے وقت موجود تھا جس پر اس نے مرثیہ لکھا ہے اور پھر وہ ۴۳۸ھ (۱۰۴۶ء) میں مشہور سیاح اور شاعر ناصر خسرو سے تبریز ہی میں ملا ہے۔

رضا قلی خاں نے مجمع الفصحا جلد اول صفحہ ۲۶۶ میں لکھا ہے کہ قطران کے مربی ابو نصر ملکان عضد الدولہ، ابو منصور ہستودان، فضلون، اور شاہ ملکان تھے اور تقی کاشی کا بیان ہے کہ اس کے مربی ابو منصور المعمری (والی آذربائیجان منجانب خلیفہ قایم باللہ) امیر ابو خلیل جعفر، ابو الہیجا منوچہر وغیرہ تھے۔ ان سب کے نام قطران کے قصاید میں پائے جاتے ہیں مگر تعجب ہے کہ تقی کاشی نے ابو نصر کا ذکر نہیں کیا اور رضا قلی خاں نے جو تقی کاشی کے تذکرہ سے واقف تھا ابو خلیل جعفر کا نام نہیں دیا حالانکہ دیوان قطران میں کئی قصیدے اسکی مدح میں بھی ہیں۔

بعض ایرانی تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ قصاید قطران کے رودکی سے منسوب ہوجانے کا سبب

رودکی کے ممدوح نصر بن احمد سامانی اور قطران کے ممدوح ابونصر میں التباس ہے۔ ابونصر کی مدح کے اکثر قصاید غلطی سے نصر بن احمد کی مدح میں سمجھے گئے[1]۔ یہ نظر یہ برٹش میوزیم کے مختلف مخطوطات کے حواشی[2] میں بھی موجود ہے جس کو بہ خوفِ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ راقم کا یہ خیال ہے کہ اگر ایسا التباس پیدا ہوا تو وہ اتفاقی طور پر نہیں بلکہ قصداً پیدا کرایا گیا ہے اور غالباً ایران کے کسی مولف نے اس خیال سے کہ رودکی کا بہت ہی کم کلام باقی ہے اسلئے ایک نسبتاً کم مشہور شاعر قطران کا دیوان لیکر اس کے بہترین قصاید جن میں ابونصر کا نام تھا منتخب کرکے اور ان کو رودکی کے چند ایسے قصاید کے ساتھ جن میں ابونصر کا نام نہیں خلط ملط کرکے ایک دیوان رودکی مرتب کر ڈالا۔ اس کا کچھ حصہ یا سب کا سب طہران کے "فرضی دیوان رودکی" میں شریک کرلیا گیا۔ اس دیوان میں (۱۶) قصاید ایسے ہیں جن میں ممدوح کا نام موجود ہے اور ان میں سے تین کے سوا باقی (۱۳) قصیدوں میں صاف طور پر ابونصر کا نام موجود ہے۔ اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ارادتاً یہ خلط مبحث پیدا کرلیا گیا ہے۔

طہران کے مطبوعہ دیوان رودکی میں جس کا ذکر آگے کیا جائیگا اس سے بھی ایک درجہ تجاوز کرکے اکثر قصیدوں کے عنوان میں "ابونصر بن احمد سامانی" کا فرضی نام بھی لکھدیا گیا ہے "فرضی دیوان رودکی" میں (۱۳) ابونصر کی مدح میں ہیں۔ اس شخص کا پورا نام امیر ابونصر محمد بن مسعود بن ملان بن وہسودان تھا پروفیسر براؤن کا مملوکہ دیوان قطران صرف انتخاب ہے اور عام دیوان کی ترتیب پر نہیں ہے۔ اس میں (۲۰۳) قصاید (۱۲) رباعیات اور مثنوی کا ایک اقتباس ہے۔ دیگر مختلف قصاید میں (۲۰) سے زیادہ ممدوحین کا ذکر ہے۔ (۴۶) قصیدوں میں "ابونصر" کا نام ہے۔ (۱۲) میں ابومنصور (مسعود وہسودان بن محمد بن ملان بن وہسودان الروّادی الازدی) اور (۲۲) میں ابوالمظفر جعفر

---

[1] رضا قلی خاں تو یہ بھی لکھتا ہے کہ اس خلط مبحث سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ رودکی نے خود کو قطران سے بھی تخلص کیا ہے۔

[2] یہ حواشی بہمن ابن عبداللہ میرزا ابن فتح علیشاہ نامی ایک فاضل نے لکھے ہیں وہ زیادہ تر بہاء الدولہ کے لقب سے بہت مشہور ہے ملاحظہ ہو ضمیمہ مخطوطات فارسی برٹش میوزم مرتبہ ریو صفحہ ۱۳۵

بطور ممدوح مذکور ہیں۔

راقم الحروف نے کلام رودکی کی تحقیقات شروع کی تھی کہ برٹش میوزیم میں ایک نایاب تذکرہ جس کا نام "میخانہ" ہے دریافت ہوا۔ اس کا مصنف حسن رازی بن لطف اللہ طہرانی ہے۔ اس نے ۱۰۴۷ھ میں یہ تصنیف تمام کی ہے۔ رودکی کے حالات میں بیان کرتا ہے کہ دیوان رودکی کے تمام اصلی اور معتبر نسخے بے پتہ ہیں۔ اپنی تصنیف کے آغاز میں (۱۰۲۵ھ) میں اس نے مختلف کتبخانوں میں رودکی کے پانچ چھ ہزار شعر دیکھے مگر ظاہر ہے کہ یہ حکیم فطران کے اشعار ہیں اور دونوں کے ممدوحین ہم نام ہونے کی وجہ سے یہ خلط مبحث پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے آگے وہ لکھتا ہے "بندہ حسن رازی نے دیوان رودکی کے (۲۰) نسخوں کی تنقیح کی اور دیوان فطران کے ایک نسخہ سے جو قدیم خط میں لکھا تھا ان کا مقابلہ کرنے کے بعد صرف چند قصیدے ایسے نکلے جو رودکی کے اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ میں نے نقل کر لئے ہیں"۔ اپنے تذکرہ میں چھ قصیدے اور نیز رباعیاں انتخاب کی ہیں۔ اکثر صورتوں میں ان کتبخانوں کے نام بھی لکھدئے ہیں جہاں یہ نظمیں ملی۔ راقم الحروف نے اس کے منتخبہ قصاید کو دوسرے نسخوں میں بھی پایا ہے مگر ایک قصیدہ جو اس نے "تین سو سال قبل" (یعنے آٹھویں صدی ہجری) کے کسی نسخہ سے نقل کیا ہے کہیں نہ مل سکا۔ اسکا مطلع یہ ہے۔

آمد بہار خرم با رنگ و بوی طیب　　با صد ہزار نزہت و آرایش عجیب

اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کو اعتماد الدولہ کے کتب خانہ واقع آگرہ میں بھی رودکی کا کلام دستیاب ہوا تھا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "فرضی دیوان رودکی" کی نظموں کے مطلعے نقل کردئے جائیں ان کے ساتھ ہر نظم میں تعداد ابیات اور ممدوح کا ذکر بھی جہاں کہیں ہو کر دیا جاتا ہے۔

۱ــــ ممدوح بو نصر مشکان (۳۹) ابیات۔

تا دل من با ہوای نیکواں گشت آشنا　　در سر شک دیدہ گرداں شد چو مردم آشنا

۲ــــ (۷) ابیات۔

چو بگشاید نگار من دو بادامِ و دو مرجان را بدیں نازاں کند دل را بداں ریحانِ جان را

بعض تذکروں میں یہ غزل دوسرے شعر سے شروع کیگئی ہے ؎

من و جاناں بجان و دل فروشیم بازاری کہ جان و دل مرا دوست و من جان دادہ جاناں را

۳ (۲۰) ابیات

خدایگانا جاں منا بجاں دوستت کہ جاں بشد ز تنم تا جدا نشد م زدرت

۴ (۱۴) ابیات

تاز آمدن دوست بر من خبر آمد گوئی سرم از ناز بخورشید بر آمد

۵ (۷) ابیات

اسپ طرب و عیش تو اے شاہ بزیں باد جان و تن خصماں تو پیوستہ حزیں باد

۶ (۹) ابیات

خدایگان جہاں را طبیب دارو داد موافق آمد از بہر آں کہ نیکو داد

۷ ممدوح بو نصر محمد (۴۷) ابیات

یک بار بود عید بیک سال بیک بار ہموارہ مرا عید ز دیدار تو ہموار

۸ ممدوح ابو نصر (۲۳) ابیات

شنبہ شادی و اوّل مہ آذر زخمہ برافکن بعود و عود برآور

۹ ممدوح ابو منصور مسعود (۱۸) ابیات

افتخار دہر ابو منصور مسعود آنکہ ہست بندگانش را بمیراں صد ہزاراں افتخار

قطران کے ایک مخطوط دیوان میں بجائے افتخار کے اختیار ہے۔ دراصل یہ قطران کے ایک قصیدہ کی سترہویں بیت ہے۔ اور یہ قصیدہ دیوان قطران کے تینوں مخطوط نسخوں میں ہے۔ مطلع یہ ہے۔

شد ز فرّماہ فروردیں جہاں فردوس وار باغہا دیبا سلب شد شاخہا مرجاں نوار

۱۰ ممدوح میر ابو نصر محمد (۲۹) ابیات۔

از غم ہجر طراز ہمہ خوبان طراز زرد و باریکم و لرزانم چوں تار طراز

۱۱ ممدوح میر ابو نصر بن مسعود بن ملان (۱۲) ابیات۔

صبر من کوتاہ گشت از عشق آں زلف دراز کو تجھے با گل بسر است و گہے با گل بہ راز

قطران کے ایک مخطوط دیوان میں بجائے مسعود کے سعد لکھا ہے اور دوسرا مصرع یوں ہے

۱۲ (۸) ابیات

آیا چراغ شہاں جہاں امیر اجل بدست مایۂ فیروزی تیغ اجل

۱۳ ممدوح (محمد ملان) (۲۹) ابیات

بود محال ترا داشتن امید محال بہ عالمے کہ نباشد ہمیشہ بر یک حال

یہ اس زلزلہ پر مرثیہ ہے جس نے ۴۳۴ھ (۱۰۴۲ء) میں تبریز کو برباد کر دیا تھا۔ ممدوح کے نام والا شعر "فرضی دیوان رودکی" میں تو نہیں ہے مگر طہران کے مطبوعہ اور دیوان قطران میں اسطرح موجود ہے۔

چراغ شاہاں ملان کہ پیش تیغ و کفش یکیست شیر و شگال و یکیست زر و سفال

اس زلزلہ کے وقت ابو منصور بن محمد ملان تبریز کا گورنر تھا۔ "فرضی دیوان رودکی" میں آخری شعر یہ ہے ؎

بداں ہمال ہمی دادمی بعلم جواب وزاں نگار ہمی کردمی بہ بوسہ سوال

مگر شیفر کے ہاں (۴۶) ابیات ہیں اور آخری بیت یہ ہے ؎

خدائے تیغ ترا در ازل بہ زال نمود زبیم تیغت آزادہ خنک شد سر زال

۱۴ (۸) ابیات۔

اے بہ ہنگام سخا ابر کف و دریا دل مشتری خوار ز دیدار تو و ماہ خجل

۱۵ (۱۴) ابیات۔

اے آنکہ ز تو بود بر اندام جہاں دام چوں بست ترا دست جہاں دام بر اندام

۱۶۔ ممدوح میر ابو نصر شاہ ملکان (۳۴) ابیات

تا بہ پوشید ز لؤلوئے یمیں باغ سمن بگل سرخ و بیاقوت بیاراست چمن

۱۷۔ ممدوح شاہ ابو منصور (۳۰) ابیات۔

بے نشاں آمد لباں و بے کماں آمد میاں ایں زتنگی بے نشاں آں از نزادی بے کماں

۱۸۔ ممدوح میر ابو نصر (۴۰) ابیات

من آں کشیدم و آں دیدم از غم ہجراں کہ ہیچ آدمی نیست دیدہ از ہجراں

مصرعہ ثانی کے آخر میں ڈاکٹر اتھے کے ہاں از دوران اور طہران کے مطبوعہ نسخہ میں در دوران ہے۔ اس قصیدہ کے دو شعروں میں ابو منصور و مسعود ان اور اس کے بیٹے ابو نصر کے ہاتھوں امیر مغاں کی شکست کا ذکر ہے۔

۱۹۔ (۵) ابیات

اے جانِ من از آرزوے روے تو پژماں بنماے یکے روے و بخشاے بریں جاں

بعض مخطوطات میں پژماں کی جگہ رنجاں ہے اور بعض میں بے جاں جیسا کہ علامہ شبلی نے بھی شعر العجم جلد اول ص ۳۵ میں لکھا ہے۔

۲۰۔ ممدوح میر ابو نصر (۳۳) ابیات

منم غلام خداوند زلف غالیہ گوں کہ ہست چوں تن من زلف او نواں و نگوں

۲۱۔ ممدوح بو نصر (۱۸) ابیات

شد برگ زاں زرد چو زر از مہ آباں گشت آب رزاں سرخ چو یاقوت تاباں

ممدوح کا نام ان اشعار میں ہے ؎

جان و دل من ہست سزاوار مر او را چوں ملک جہاں ہست سزاوار بملاں

خورشید ہمہ میراں بو نصر کہ بسپرد یزداں بوے و دشمن او نصرت و خذلاں

۲۲ (۱۹) ابیات

مرغِ نیساں بشنیخوں کرد گونی بر سرِ کانوں کہ گردوں گشت از و پر گرد و صحرا گشت از و پر خوں

۲۳ (۴) ابیات

سرنگوں ماندہ است جانم زاں او و زلف سرنگوں لالہ گوں گشت آبِ چشمم زاں لباں لالہ گوں

۲۴ ممدوح ابوجعفر احمد بن محمد (۸۲) ابیات

مادرِ مے را بکرد باید قرباں بچۂ او را گرفت و کرد بزنداں

۲۵ (۹) ابیات۔ ممکن ہے کہ یہ منظم امیر فضلوں حکیم گنجہ کے نام معنون ہے۔ حکیم مذکور رومیوں پر حملہ کرتے ہوئے قید ہو گیا تھا۔ ابو منصور کی سعی سے رہائی نصیب ہوئی۔

اے بندو بلا دیدہ از بند بجستہ مژدہ نہ شدہ آمدہ در شہر خجستہ

۲۶ (۸) ابیات

اے نیزۂ تو گوے و دل دشمن انگلہ خصم تو رہست و حسام تو بنگلہ

رضا قلی خاں نے تشریح کی ہے کہ "انگلہ حلقۂ ایست کہ تکمہ و گوئے را دراں کنند و او را ماد کے گویند"۔

۲۷ (۹) ابیات

اے جاں بدسگالاں جفت گذار کردہ اے طبع نیکو خواہاں انباز ناز کردہ

۲۸ (۴۱) ابیات

بار خدایا بسی عذاب کشیدی اندہ و تیمار گونہ گونہ بدیدی

کسی ممدوح کا نام صریح طور پر نہیں دیا گیا ہے مگر مندرجۂ ذیل ابیات میں کسی سلجوقی مربی کیطرف تاریخی اشارہ ہے۔

زانکہ بہ رفتی بہ روم با سپہ و گنج زانکہ بسی رنج نیک و بد کشیدی

با سلامت بجائے خویش بماندیم تو بسعادت بجائے خویش رسیدی

۲۹ (۷) ابیات ۔ ممدوح کا نام نہیں مگر آخری شعر بجید بیساختہ ہے اسلئے وہ بھی درج کیا جاتا ہے ۔

اے ہمہ از رادی واز راستی — جان و دل از راستی از استی
از امرا جملہ تو را خواستم — کز شعرا جملہ مرا خواستی

۳۰ ممدوح ابونصر (۴۴) ابیات

ندانی درد ہجرا ے بت مرا زاں زار گردانی — وگر زارم نگردانی بہ داغ ہجر گردانی

مندرجۂ ذیل شعر میں کوئی شخصی حوالہ ہے ۔

یکے دہقاں بدم شاہا شدم شاعر ز نادانی — مرا از شاعری کردن تو کردی باز دہقانی

۳۱ (۱۰) ابیات

اے برہمہ شاہان جہاں یافتہ شاہی — مے خور کہ بد اندیش چناں شد کہ تو خواہی

۳۲ (۱۰) ابیات

بر ہر سرے سری تو از ہر بہی بہی — از ہر مہے مہی تو و بر ہر شہی شہی

۳۳ ممدوح ابونصر ملان (۴۱) ابیات

بتے را کہ بودم بدو روزگارے — جدا دارد از من بد آمرزگارے

۳۴ ممدوح ابونصر (۳۲) ابیات

مرا بنالہ و زاری ہمی بیازاری — جفائے تو بکشم تا مرا نیازاری

یہ قصیدہ مندرجہ ذیل ابیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عید الضحیٰ کی تہنیت میں کہا گیا ہے ۔

خجستہ باد ترا عید گوسفند کشاں — کہ تو ہمیشہ درخت خجستہ بنگاری
کنوں کہاں و مہاں گاو گوسفند کشند — رضائے ایزد جویند از آں نہ خونخواری
تو گاو و بے گنہ و گوسفند با برہ را — بہل بکش عدو خصم باگنہ کاری

دیوان قطران کے ایک قلمی نسخہ میں مطلع کا مصرع اول یوں ہے چرا بنالہ و زاری ہمی بیازاری

۳۵ ممدوح ابو نصر بن مسعود بن ملان (۳۶) ابیات

ایا سروی کہ سنبل را ز سوسن سایباں کردی ز بوئے سوسن و سنبل جہاں پر مشک و باں کردی

۳۶ (۴) بیت

دل تنگ مدار اے ملک از کار خدائی آرام و طرب را بدہ از طبع جدائی

۳۷ (۴) بیت

اے ز تو ذرہ کند خورشیدے کرمت بستہ درِ نومیدے

ایک مخطوط دیوان قطران کے حاشیہ پر غالباً بہاء الدولہ کے قلم سے لکھا ہوا ہے کہ "یہ اشعار مثنوی ظہوری کے ہیں مگر ان کو قطران اور رودکی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ سخن سنج جانتے ہیں کہ یہ اشعار و خیالات ہرگز ان استادوں کے نہیں ہو سکتے"۔

۳۸ (۶) بیت

بوے جوے مولیاں آید ہمی بوے یار مہرباں آید ہمی

دولت شاہ کا بیان ہے کہ یہ ایک طویل قصیدہ کا ایک جزو ہے عام طور پر صرف تین اور ابیات منقول ہیں اسکی تفصیل آگے آئیگی۔

۳۹ رباعی

با آنکہ دلم از غم ہجرت خونست شادی بہ غم تو ام ز غم افزوں است
اندیشہ کنم ہر شب و گویم یارب ہجرانش چنیں است وصالش چوں است

۴۰ رباعی

چشمم ز غمت بر عقیقے کہ بسفت بر چہرہ ہزار گل آزارم بشگفت
رازے کہ دلم ز جاں ہمیداشت نہفت اشکم بزبان حال باخلق بگفت

اگرچہ طہران کا مطبوعہ دیوان رودکی جو ۱۳۱۵ھ میں شایع ہوا ہے "فرضی دیوان رودکی" سے بھی کم قابل اعتماد ہے، اس کے مندرجات کا ضروری ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس میں

"فرضی دیوان رودکی" کی (۴۰) نظموں کے علاوہ (۳۴) اضافی نظمیں ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے طہران کا مطبوعہ نسخہ دیکھا ہے اور "شعرالعجم" میں رودکی پر بسیط مضمون لکھتے وقت یہ ان کے پیش نظر تھا۔ اس مطبوعہ نسخہ میں (۱۱۴) صفحات کا متن اور (۱۱) صفحات کا مقدمہ ہے۔ اس کو ابراہیم بن محمد بن علی آملی نے جو صدرالکتاب کے لقب سے مشہور ہے، مرتب کرکے شہزادہ فریدوں میرزا کے نام معنون کیا ہے۔ اس کے مندرجات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ "فرضی دیوان رودکی" کی مندرجہ تمام نظمیں۔

۲۔ ایتھے کی نقل کردہ (۱۵) نظمیں جو "فرضی دیوان رودکی" میں شامل نہیں ہیں۔

۳۔ بیہقی کی مقتبسہ چار نظمیں۔ ان میں صرف تیسری کو تمام و کمال نقل کیا گیا ہے۔ پہلی کی صرف تین ابیات، دوسری کی صرف دو اور چوتھی کی سات ابیات موجود ہیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ مرتب نے یہ اشعار براہِ راست بیہقی سے نہیں بلکہ تذکروں کے واسطہ سے نقل کی ہیں۔

۴۔ ایک لغز۔ یہ ڈاکٹر ایتھے کے ہاں نہیں البتہ عوفی نے "لباب الالباب" میں نقل کیا ہے ؎

آں چیست؟ برآں طبق ہمی تابد چوں ملحم زیر شعر عنابی
سافش مثل چوں ساعد حورا پالش مثل چو پائے مرغابی

۵۔ آٹھ چھوٹی چھوٹی نظمیں جو رودکی کے نام سے متاخرین کی بیاضوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے تین کو علامہ شبلی نے بھی نقل کیا ہے۔

اس نسخہ کا مقدمہ ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ اکثر نظموں کے عنوان میں ممدوحین کے نام بالکل غلط سلط لکھ دئے گئے۔ مثال کے طور پر "فرضی دیوان رودکی" کے چند قصیدوں کے ممدوحین سے ان کا مقابلہ کیجئے۔

۵ــــ امیر ابونصر محمد سامانی۔

۶ــــ سلطان ابونصر محمد ابن احمد سامانی

۱۱ــــ امیر نصر بن مسعود ابن ملکان السامانی ۔ ۱۳ موعظت کا عنوان ہے ۔ یہ درحقیقت قطران کا تبریز کے زلزلہ والا مرثیہ ہے

۲۲ــــ امیر ابوالفتح سامانی ۔

ذیل میں ان چند نظموں کا ذکر کیا جاتا ہے جو ڈاکٹر ایتھے نے جمع کی ہیں مگر "فرضی دیوان رودکی" میں نہیں پائی جاتیں ۔

۲ــــ جو ایتھے نے بوڈلین لائبریری کے نسخہ سے نقل کی ہے اس کا مطلع یہ ہے ۔

بہ ابروان چو کمان و بہ زلفگان چو کمند لبانت سادہ عقیق و رخانت سادہ پرند

اسکے بارہویں شعر میں ممدوح کا نام ہے ۔

بلند رای بلندی فزای ابونصراں کہ پست پیشہ بار ایش آسمان بلند

اسکا دوسرا مصرع یوں ہونا چاہئے ع کہ پست باشد بار ایش آسمان بلند ۔ یہ قصیدہ طہران کے مطبوعہ نسخہ اور دیوان قطران کے قلمی نسخے میں بھی موجود ہے ۔ صرف ابیات کی تعداد میں تفاوت ہے ۔

۵ــــ یہ نظم کہیں اور نہیں ملی ۔ معلوم نہیں کہ اس نے کہاں سے لی ہے ۔

۶ــــ یہ قصیدہ مطبوعہ دیوان رودکی میں بھی ہے ۔ اس میں (۱۵) ابیات ہیں مگر ایتھے کے ہاں (۲۵) شعر ہیں ۔ یہ قصیدہ "ہفت اقلیم" سے لیا گیا ہے اور رودکی کا اصلی کلام سمجھا جا سکتا ہے ۔ اسکا مطلع یہ ہے ۔

مرا بسود و فرو رنجیت ہرچہ دندان بود نبود دنداں لاجرم چراغ تاباں بود

اس قصیدہ میں ایک اہم شعر وہ ہے جس میں رودکی کے راوی کا نام آیا ہے ؎

تو رودکی را اے مج کنوں ہمی بینی بداں زمانہ ندیدی کہ زمیں خیسان بود

طہران کے مطبوعہ نسخہ میں یہ بیت نہیں ہے ۔ ایتھے نے مج کو مغ پڑھا ہے ۔ یہ مج یا ماج ہی اور یہی رودکی کے راوی کا نام ہے ۔ اسکی تائید میں کئی ابیات پیش کیجا سکتی ہیں ۔

اے مج کنوں تو شعر من از بر کن و بخواں از من دل و سگالش و ز تو تن و زباں

فرہنگوں میں شمس فخری[1] کا یہ شعر بھی اس کی تائید میں موجود ہے ؎

---

[1] شمس فخری اصفہانی نے ۴۳۲ھ میں ایک لغت مرتب کی تھی ۔ دوران تالیف میں اسنے الفاظ کے استعمال کی مثالیں دینے کیلئے خود بھی کئی شعر انشا کئے ۔

تا مدحت او گفتی و خواندی ز شرف او استاد سخن رودکی را وی او مج

۸ــ ڈاکٹر ایتھے کا بیان ہے کہ اس نظم کی دو بیتیں عوفی کے تذکرہ میں ہیں مگر مطبوعہ نسخہ میں نہیں پائی جاتیں

۱۰ــ مطبوعہ دیوان رودکی میں اسکی (۲۷) ابیات ہیں۔ قلمی دیوان قطران میں بھی موجود ہے اس کا ممدوح ابو منصور ہے۔

۱۵ــ ایتھے نے (۳) ابیات دی ہیں۔ مخطوط دیوان قطران میں (۳۲) ابیات ہیں۔

۱۶ــ یہ مرثیہ بلاشبہ قابل اعتماد ہے کیونکہ بیہقی نے بھی اس کو لیا ہے۔ ایتھے نے صرف (۵) ابیات دی ہیں جو "ہفت اقلیم" سے ماخوذ ہیں۔ مطبوعہ دیوان رودکی میں (۷) ابیات ہیں۔ علامہ شبلی شعر العجم جلد اوّل صـ۳۵ پر لکھتے ہیں کہ یہ مرثیہ ایک وزیر کے لڑکے کی وفات پر لکھا گیا۔ "مجمع الفصحا" میں بیان کیا گیا ہے کہ شاہد بلخی اور مرادی نے بھی اس نوجوان کی وفات پر مرثیے لکھے تھے۔ بیہقی کے ہاں اسکے صرف بارہ شعر ہیں۔

۱۸ــ اس کا مطلع یہ ہے۔

شاد زی با سیاہ چشمان شاد کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد

یہ تذکرہ عوفی اور مطبوعہ دیوان رودکی میں موجود ہے۔

۳۰ــ اسمیں صرف دو بیت ہیں جو دولت شاہ سے لی گئی ہیں۔ ایتھے نے بے آفت لکھا ہے وہ بے آلت ہونا چاہئے اور اس طرح اسکا آخری لفظ گرزماں "قدیم لغت" بمعنے بہشت ہونا چاہئے۔

۳۱ و ۳۲ــ ان کے متعلق ایتھے کا بیان ہے کہ تذکرہ عوفی میں ہیں مگر مطبوعہ نسخہ میں انکا پتہ نہیں۔

۵۱ــ یہ نظم ایتھے کے ہاں ایسی ہے جو "لغات فرس" میں بھی پائی جاتی ہے۔ ایتھے نے قوامس کی لغت سے لیا ہے اور اس نے "لغات حلیمی" سے۔

۵۲ــ ایتھے کے نقل کردہ اشعار میں صرف یہی نظم ایسی ہے جو شمس قیس نے بھی لکھا ہے۔ اسکا مطلع صحیح طور پر یوں ہونا چاہئے۔

ہر کہ ناخت از گذشت روزگار نیز ناموزد ز ہیچ آموزگار

اسدی نے "کلیلہ و دمنہ" کے جو (۱۶) ابیات محفوظ کر دئے ہیں ان میں اب مزید (۶) کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں برٹش میوزیم میں ایک قلمی نسخہ[1] داخل ہوا ہے۔ یہ ۶۷۱ھ کا مرتبہ ہے اور چار مختصر فارسی اخلاقی رسالوں کا مجموعہ ہے۔ آخری رسالہ "تحفۃ الملوک" کے نام سے موسوم ہے۔ اسمیں کلیلہ و دمنہ رودکی کے مندرجہ ذیل اشعار پائے جاتے ہیں۔ یہ اشعار بھی بحر رمل میں ہیں اور نسخہ بھی بہت ہی قدیم ہے اس بنا پر ہم ان کو رودکی کا اصلی کلام قرار دے سکتے ہیں۔

۱ تا جہاں بود از سر آدم فراز — کس نبود از راہ دانش بے نیاز
مرد ماں نخرد اندر ہر زماں — راہ دانش را بہر گونہ زباں
کرد کردند و گرامی داشتند — تا بسنگ اندر ہمی بنگاشتند
دانش اندر دل چراغ روشن ست — وز ہمہ بد بر تن تو جوشن ست

---

۲ آنک را دانم کہ او یم دشمن است — وز روان پاک بدخواہ من است
ہم بہر کہ دوستی جوید ش من — ہم سخن با ہستگی گوید ش من

بیہقی کے ہاں رودکی کا حسب ذیل کلام ملتا ہے۔ ص ۲۱۹

بہ سرائے سپنج مہماں را — دل نہادن ہمیشگی نہ رواست
زیر خاک اندرونت باید خفت — گرچہ اکنونت خواب بر دیباست
باکساں بودنت چہ سود کند — کہ بگور اندروں شدن تنہاست
یار تو زیر خاک مور و مگس — بدل آنکہ گیسوت پیراست
آنکہ زلفین و گیسوت پیراست — گرچہ دینار یادرمش بہاست
چوں ترا دید زرد گونہ شدہ — سرد گردد دلش نہ نامیناست

ص ۲۸۷

مہتراں ہمہ جہاں مردند — مرگ را سر ہمہ فسردہ کردند

[1] Or. 7869

زیر خاک اندروں شدند آناں — کہ ہمہ کوششہا برآورند
از ہزاراں ہزار نعمت و ناز — نہ بآخر جز از کفن بردند
بود از نعمت آنچہ پوشیدند — و آنچہ دادند و آنچہ راخوردند

صـ ۴۵۲

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز — نہ بآخر بمرد باید باز
ہم بہ چیزے گذشتہ باید بود — ایں رسن را اگرچہ ہست دراز
خواہی اندر عنا و شدت زی — خواہی اندر اماں بنعمت و ناز
خواہی اندک ترا جہان پذیر — خواہی از رے بگیر تا بہ طراز
ایں ہمہ باد دیو بر جالست — خواب را حکم نے مگر کہ مجاز
ایں ہمہ روز مرگ یکسانند — نشناسی ز یکدگر شاں باز

صـ ۵۱،

اے آنکہ غمگین و سوگواری — واندر نہاں سر شک ہمی باری
از بہر آں کجا ببرم خامش — ترسم ز سخت و اندہ دشواری
رفت آنکہ رفت و آمد آنکہ آمد — بود انچہ بود خیرہ چہ غم داری
ہموار کردہ خواہی گیتی را — گیتی است کہ کے پذیرد ہمواری
مستی مکن کہ نشنود او مستی — زاری مکن کہ نشنود او زاری
شو تا قیامت آید زاری کن — کے رفتہ را بزاری باز آری
آزار بیش مبنی زیں گردوں — گو تو بہر بہانہ بنیاں آری
گوئی کو گماشتہ است بلائی او — بر ہر کہ تو بر او دل بگماری
ابرے پدید نی و کسو فے نی — بگرفت ماہ و گشت جہاں تاری
فرماں کنی و یا کنی ترسم — بر خویشتن خطر ندہی یاری

یا بشکنی سپاہ غماں بر دل — آں بہ کہ می بیاری و بگساری
اندر بلائے سخت پدید آید — فضل و بزرگواری و سالاری

ص ۶۲

ایں جہاں پاک خواب کرداراست — آں شناسد دلش کہ بیداراست
نیکی او بجائے گاہ بداست — شادی او بجائے تیمار است
چہ نشینی بدیں جہاں ہموار — کہ ہمہ کار او نہ ہموار است
دانش او نہ خوب و چہرش خوب — زشت کردار و خوب دیداراست

فرخی نے اپنے ایک قصیدہ میں رودکی کا ایک شعر درج کرلیا ہے اور اپنے ممدوح سے مخاطب ہوکر کہتا ہے ؎

یک بیت شعر یاد کنم ز انکہ رودکی — گرچہ ترا نگفت سزاوار آں توئی
"جز برتری ندانی گوئی کہ آتشی — جز راستی نجوئی گوئی ترازوئی"

رودکی کا ایک نہایت طویل قصیدہ جو "مادرمے" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے، اکثر تذکروں وغیرہ میں اس سے منسوب اور "قصیدہ مادرمے" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ "فرضی دیوان رودکی" میں بھی پایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ایک بیان اسکی شان نزول کی بابت بھی دیا ہے۔ رضاقلی خاں نے اپنی تصنیف "مجمع الفصحا" کے اصلی مسودہ میں اس کو رودکی کا قصیدہ بتایا ہے مگر مطبوعہ نسخہ میں اس نے صاف طور پر لکھدیا ہے "پس از تحقیق یقین شد ایں قصیدہ از قطران است" معلوم نہیں کہ اس نے کس بنا پر اسکو رودکی کے کلام سے خارج کردیا۔ مگر میرزا محمد قزوینی کی تحقیقات نے اصل حقیقت منکشف کردی۔ تاریخ ادبیات ایران میں اس انکشاف کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ صرف یہی ایک قصیدہ "فارسی شاعری کے ابوالآباء" رودکی کی طویل ترین نظم ہے۔ اس انکشاف کا سہرا میرزا محمد قزوینی کے سر ہے۔

یہ قصیدہ تمام و کمال ایک نایاب تاریخی کتاب موسوم بہ "تاریخ سیستان" میں محفوظ ہے۔ اسکی جملہ ابیات (۱۴۹) ہیں۔ طہران میں میرزا صاحب کے ایک فاضل دوست عباس خاں اقبال کے ہاں اس کا

ایک نسخہ برآمد ہوا۔ انہوں نے میرزا صاحب کی خواہش پر اس کی نقل میرزا صاحب کو روانہ کی۔ بظاہر اس تاریخ کا کوئی اور نسخہ محفوظ نہیں۔ برٹش میوزیم میں ایک تاریخ "احیاء الملوک" اسی موضوع پر ہے مگر وہ اس سے بالکل جدا ہے۔ "تاریخ سیستان" (۳۴۸) صفحات کے دو مستقل اور علیحدہ علیحدہ حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصّہ اول میں قدیم زمانہ سے لیکر چار سو صدی ہجری (یعنے سلطان محمود غزنوی کے عہد کے وسط) کی تفصیلی تاریخ مندرج ہے۔ اسکا اسلوب بیان نہایت پرانا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے ابتدائی زمانہ کی تالیف ہے۔ حصّہ دوم میں کسی قدر جدید اسلوب میں مختصر حالات سات سو ہجری تک کے درج ہیں۔

اس نسخہ کی دریافت کی بدولت رودکی کے "قصیدہ مادرمے" کے ممدوح کا مسئلہ بالکل صاف ہوگیا۔ اس کتاب کے حصّہ اول میں بتایا گیا ہے کہ وہ امیر ابوجعفر احمد بن محمد ابن خلف ابن اللیث ہے جو محرم ۳۱۱ھ میں سیستان کا امیر مقرر کیا گیا تھا میرزا محمد فرماتے ہیں کہ یہ بلاشک وشبہ خلف ابن احمد کا جو بدیع الزماں ہمدانی' ابوالفتح بستی وغیرہ کا ممدوح ہے' باپ ہے (ملاحظہ ہو چہار مقالہ ص۱۶۲) "تاریخ سیستان" میں امیر جعفر کی حکومت کا تفصیلی حال لکھنے کے بعد اس قصیدہ کے متعلق یہ حکایت درج کی ہے۔

نصر بن احمد امیر خراسان کے دربار میں ابوجعفر کی جرأت و دلیری کا ذکر کیا گیا۔ امیر کو ابوجعفر کی شجاعت و دانشمندی پر سخت تعجب ہوا۔ سپہ سالار ماکان کا امیر سے بدظن ہوگیا تھا اسلئے طرب منعقد نہ تھی۔ نصر بن احمد نے ابوجعفر کو یاد کیا اور چونکہ وہ ماوراءالنہر میں تھا' اس کا جام صحت نوش کرنا قرار پایا۔ امیر نے جام صحت تجویز کیا اور تمام امرائے خراسان نے جو اس جلسہ میں شریک تھے شراب پی۔ اس موقع پر ایک پیالہ شراب سربمہر کرکے دو پارہ لعل' دس زریں پارچوں' دس ترکی کنیزوں کے ساتھ جو قیمتی زیور سواری اور ملبوسات سے آراستہ تھے' ابوجعفر کے پاس تحفۃً بھیجا گیا۔ رودکی نے اس موقع پر ایک فی البدیہہ قصیدہ لکھا جس میں اس موقع کا ذکر ہے۔ امیر کے حکم سے قصیدہ بھی اس تحفہ کے ساتھ ارسال کردیا گیا۔ ابوجعفر امیر سیستان نے اسکے صلہ میں رودکی کو دس ہزار دینار بھیجے اور تحفہ لانے والے کو خلعت و انعامات سے نہال کردیا۔ "تاریخ سیستان"

کا مصنف لکھتا ہے کہ رودکی نے فی البدیہہ قصیدہ کہکر امیر خراسان اور اُس کے امرا و اعیان کے سامنے پڑھا تو سب نے پسند کیا اور جو کوئی اُس قصیدہ کو پڑھیگا گویا ابوجعفر کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے آجائیگی کیونکہ اس میں اُس کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔" فرضی دیوان رودکی" کے قلمی نسخوں میں قصیدہ سے پہلے یہ عبارت مندرج ہے۔

"در مدح ابوجعفر محمد بن احمد گوید در آں وقت کہ والی ماوراالنہر بودہ در خراسان پیالۂ شراب بیاد او خوردہ و پیالۂ دیگر سر بہر جہت او فرستادہ و نوشتہ بود کہ پیالہ بیاد تو خوردیم و پیالہ جہت یاد بود فرستادیم۔ حکیم ایں قصیدہ را بدیہہ گفتہ و فرستادہ ہزار تومان جائزہ یافت"۔

رودکی نے اس قصیدہ کے چھتیسویں شعر میں ابوجعفر احمد بن محمد کو مخاطب کیا ہے۔

قصیدۂ مادرِ مے

مادرِ مے را بکرد باید قربان — بچۂ اورا گرفت و کرد بزندان
بچۂ اورا ز و گرفت ندانی — تا ش نکوبی بسخت و زو نکشی جان
جز کہ نباشد حلال دور بکردن — بچہ کو چکد ز شیر مادر و پستان
تا نخورد شیر ہفت مہ بتمامی — از مِ ر اُردی بہشت تابن آبان
آنگہ شاید ز روے دیں ورہ داد — بچہ بزندان تنگ و مادر قربان
چوں بسیاری بحبس بچہ اورا — ہفت شبانروز خیرہ ماند و حیران
باز چو آید بہوش و حال ببیند — جوشش برآرد بنالد از دل سوزان
گاہ ز بر زیر گردد از غم و گہ باز — زیر و زبر ہمچناں ز اندہ جوشان
زیر بر آتش کجا بخواہی پالود — جوش لیکن ز غم نجوشد چندان

باز بکر دار اشتری که بود مست — کفک برآرد ز خم زانده شیطان؟
مرد حرس کفکهاش پاک بگیرد — تا بشود تیز گیش و گرد درخشان
آخر کار ام گیرد و بخدد تیر — ورش کند استوار مرد نگهبان
چون بنشیند تمام و صافی گردد — گونه یاقوت سرخ گیرد و مرجان
چند از و سرخ چون عقیق یمانی — چند از و لعل چونگین بدخشان
ورش ببوئی گمان بری که گل سرخ — بوئے بدو داد (و) مشک و عنبر یابان
هم بخم اندر همی گداز د چونین — تا بگه نوبهار و نیمهٔ نیسان
آنگه اگر نیمه شب درش بگشائی — چشمهٔ خورشید را ببینی تابان
زفت شود راد مرد و سست دلاور — گه بچشند ز وے (و) زرد روے گلستان
در بلور اندرش ببینے گوئی — گوهر سرخ است بکف موسی عمران
وانگه بشادی یکے قدح بخورد ز وے — رنج نبیند از آن فراز و نه احزان
اندره ساله راز طبع رماند — شادی نو آ (و) رد ببرد غمان
بامے گر چونیں که سال خورده بود چند — جام نکرده فراز پنجهٔ خلقان
مجلس یابد بساختن ملکانه — از گل و از یاسمین و خیری ایوان
نعمت فردوس گسترده (ز) هر سو — ساخته کاری که کس نسازد چونان
جامهٔ زرّین و فرشهائے نوآئین — شهره ریاحین و تخمهائے فراوان
بربط عیسی و فرشهائے فوادی؟ — چنگ مدک نرونائے چابک جانان؟
یکصف میران و ملهمی بنشسته — یکصف حرّاں و پیر صالح دهقان؟
خسرو بر تخت پیشگاه نشسته — شاه ملوک جهاں امیر خراسان
ترک هزاراں پائے پیش صف اندر — هر یک چوں ماه بر دو هفته درخشان
هر یک بر سر بساک مورّد نهاده — روشن می سرخ و زلف جعد شکن یحان

باده دهنده بتی بدیع ز خوبان — بچهٔ خاتون ترک و بچهٔ خاقان
چونک بگیرد نبید چند بشادی — شاه جهان شادمان و خرم و خندان
از کف ترکی سیاه چشم پری روی — قامت چون سرو و زلف گانش چوگان
زان می خوشبوی ساغری بستاند — یاد کند روی شهریار ستان
خود بخورد نوش و او لیاش همیدون — گوید هر یک چو می بگیرد شادان
شادی بوجعفر احمد بن محمد — آن مه آزادگان و مفخر ایران
آن ملک عدل و آفتاب زمانه — زنده بدو داد و روشنائی کیهان
آنک نبود از نژاد آدم چون او — نیز نباشد اگر نگوئی بهتان
حجت یکتا خدای و سایه اویست — طاعت او کرده واجب آیت فرقان
خلق همه از خاک و آب و آتش و بادند — وین ملک از آفتاب گوهر ساسان
فرّه بدو یافت ملک تیره و تاری — عدل بدو گشت پیر گیتی ویران
گر تو فصیحی همه مناقب او گوی — ور تو دبیری همه مدایح او خوان
ور تو حکیمی دراه حکمت جوئی — سیرت او گیر و خوب مذهب او دان
آنک بدو بنگری بحکمت گوئی — اینک سقراط و هم فلاطن یونان
ور تو فقیهی وسوی شرع گرائی — شافعی اینکت و بوحنیفه و سفیان
گر بگشاید زفان بعلم و بحکمت — گوش کن اینکت بعلم و حکمت لقمان
مرد ادب را خرد فزاید و حکمت — مرد خرد را ادب فزاید و ایمان
ور تو بخواهی فرشتهٔ که به بینی — اینک اویست آشکار رضوان
خوب نگه کن بدان لطافت و آزوی — تا تو به بینی بریں که گفتم برهان
پاکی اخلاق او و پاک نژادی — با نیت نیک و با مکارم و احسان
ور سخن او رسد بگوش تو یک راه — سعد شود مر ترا نحوست کیوان

دُرش به صدر اندرون نشسته ببینی — جرم بگوئی که زنده گشت سلیمان
سام سواری که تا ستاره بتابد — اسپ نبیند چنو سوار بمیدان
باز بروز نبرد و کین و حمیت — گرش ببینی میان مغفر و خفتان
خوار نمایدت زنده پیل بدانگاه — ورچه بود مست و شیر گشته و غرّان
دُرش بدیدی سفند یارگه رزم — پیش سنانش جهان دریدی ارزان؟
گرچه بهنگام حلم کوه تن اوی — کوه نشانیست کس نه بیند جنبان؟
دشمن اگر آزدهاست پیش سنانش — گردد چون موم پیش آتش سوزان
ور به نبرد آیدش ستارهٔ بهرام — توشهٔ شمشیر او شود بگروگان
باز بدانگه که می بدست بگیرد — ابر بهاری چنو نبارد باران
ابر بهاری جز آب تیره نبارد — او همه دیبا به تخت و زر بایان
باد و کف او زبس عطا که ببخشد — خوار نماید حدیث قصهٔ طوفان
لاجرم از جود و از سخاوت اویست — نرخ گرفته مدیح و صارمش ارزان
شاعر زی او رود فقیر و تهی دست — باز بسیار باز گردد و خسلان
مرد سخن را از و نواختن و بر — مرد ادب را از و وظیفهٔ دیوان
باز بهنگام عدل و داد ز خلق — نیست بگیتی چنوی نیک مسلمان
داد بیابد ضعیف همچو قوی زوی — جور نبینی بنزد او و نه عدوان
نعمت او گسترده بر همه گیتی — آنچ کس از نعمتش نبینی عریان
بسته گردون ازو بیابد راحت — خستهٔ گیتی ازو بیابد درمان
بارسن عفو آن مبارک خسرو — حلقهٔ تنگ است هرچ دشت بیابان
پوزش بپذیرد و گناه ببخشد — خشم نراند بعفو کوشد و غفران
آن ملک نیمروز خسرو پیروز — دولت او یوز و دشمن آهو نالان

عمرو بن اللیث زنده گشت بدو باز — با حشم خویش و آن زمانهٔ ایشان
رستم را نام اگرچ سخت بزرگست — زنده بدو ایست نام رستم دستان
رودکیا بر نور و مدح همه خلق — مدحت او گوئی و مهر دولت بستان
ورچ بکوشی بجهد خویش و بگوئی — ورچ کنی تیز فهم خویش بسوهان
ورچ دو صد تابعه فریشته داری — نیز پری باز و هرچ جنّی و شیطان
گفت ندانی سزاش خیز و فرازار — آنک بگفتی چنانک گفتی نتوان
اینک مدحی چنانک طاقت من بود — لفظ همه خوب و هم بمعنی آسان
جز بسزاوار میر گفت ندانم ؟ — ورچ جریرم بشعر و طائی وحسان
مدح امیرے که مدح اوست جهانرا — زینت و هم روے و فرّ و نزهت سامان
سخت شکوهم که عجز من بنماید — ورچ صریعم ابا فصاحت سحبان
بر دحسی مدح عرضه کرد زمانی ؟ — ورچ بود چیره بر مدایح شاهان
مدح همه خلق را کرانه پدیدست — مدحت او را کرانه نے و نه پایان
نیست شگفتی که رودکی بچنین جائے — خیره شود بے رواں و ماند حیران
ورنه مرا بوعمر دلاور کردی — وانگه دستوری گزیدهٔ عدنان
زهره کجا بودمی بمدح امیری — کز پے او آفرید گیتی یزدان
وز کم ضعیفی و بے ندیم نه بودی ؟ — وانک نه بود از امیر مشرق فخان
خود بدویدی بسان سگ متربّب — خدمت او را گرفته جامه بدندان
مدح رسول است عذر من برساند — تا بشناسد درست میر سخندان
عذر رهی خویش و ناتوانی و پیری — کو بتن خویش از آن نیامد مهمان
دولت میرم همیشه باد برافزون — دولت اعدائے او همیشه بنقصان
سرش بسیده بماه بر ببلندی — وان سعادی بزیر ماهی پنهان

طلعتت تابندہ تر ز طلعت خورشید نعمتت پایندہ تر ز جودی و تہلان

بالآخر مندرجہ نظمیں اور اقتباسات کے متعلق صحت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ رودکی کا اصلی کلام ہے۔

(۱) "لغات فرس" کے تمام اقتباسات منسوب بہ رودکی۔

(۲) بیہقی کی نقل کردہ چار نظمیں۔

(۳) کلیلہ ودمنہ کی وہ چھ ابیات جو "تحفۃ الملوک" میں مندرج ہیں۔

(۴) وہ (۲۹) ابیات جو شمس قیس نے "المعجم فی معاییر الاشعار العجم" میں رودکی کے نام سے لکھی ہیں۔

(۵) قصیدۂ "جوئے مولیان"

(۶) مجموعہ ایتھے کی نظم ۶

(۷) لباب الالباب عوفی کے (۱۱) اقتباسات جو رودکی کے نام سے بیان ہوئے ہیں۔

(۸) قصیدۂ مادر مے۔

شباب

از جناب میر حسن الدین صاحب

یادگارِ طفلی ہے تیری ہستی بے تاب
جسم زندگی میں تو ایک دیدۂ بے خواب

خلد سے نکل آیا ذوق آگہی میں تو
ڈھونڈ اب سکونِ دل سوزِ زندگی میں تو

ایک شورشِ محشر تیری بزمِ دل میں ہے
برق کی تپش پنہاں تیرے آب و گل میں ہے

پیرِ عقل سے تجھ کو شوق رہنما تیرا
عاقبت کا تو دشمن عیش مدعا تیرا

شک تیری نظروں میں موجۂ تبسم ہے
درد کی صدا گویا شورشِ ترنم ہے

آنکھ ہے کہاں تیری آشنائے کیف و کم
سیمیائی جلوے ہیں کیا حقیقت محکم ؟

ہر قدم پہ ہے لغزش ہے نگہ میں بے تابی
سر پہ اک نشہ طاری دل میں کیف سیمابی

ہے ابھی تہی دامن حسن کے گلستاں میں
کوئی گل نہیں جچتا کیا نگاہ حیراں میں

رنگ ہی ابھی غالب تجھ پہ عہدِ طفلی کا
حسن تیرے ہاتوں میں اک کھلونا ہی گویا

اے فریب خوردہ تو پیکرِ تلون ہے
تیری جبہ سائی بھی شاید اک تفنن ہے

اک گریز پا نظر تو ہے زندگانی کا
پھر بھی کیا سہانا ہے خواب اس جوانی کا

ڈہریہ اور خدا[1]

از جناب محمد ابراہیم صاحب بی۔ اے ایم۔ بیس سی سابق متعلم کلیہ

کل ہی کا ذکر ہے کہ میں ایک اخبار میں رابرٹ بلاچفرڈ کی ایک تحریر کو پڑھکر سخت متحیر ہوا جس میں اس نے اس امر کو نہایت عمدگی سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عالم ارواح سے گفت و شنید ممکن ہے۔ یہیں کوئی شبہ نہیں کہ بہت سے وسیع الخیال حضرات اس معمہ کو حل کرنے اور اس راز کی تہ تک پہنچنے میں منہمک ہیں، مگر غور کیا جائے تو نظریۂ مذکورۂ بالا میں کوئی ایسی غیر معمولی حیرتناک بات نہیں۔

لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ میرے حافظہ نے مجھے کوئی گزشتہ بیس سال کی یاد دلادی اور وہ سماں اچھی طرح میری نظروں کے سامنے پھر گیا جبکہ میں لندن کے ایک کتب فروش کی دوکان کے سامنے کھڑا ہوا تھا، جس کے پاس اسی مصنف یعنے رابرٹ بلاچفرڈ کی متعدد تصنیفات فردوسِ نظر بنی ہوئی تھیں، میں نے ان میں سے تین کتابیں خریدیں اور بغیر دم لئے ان کو پڑھ ڈالا، جب میں نے آخری کتاب ختم کی تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں ایک تباہ شدہ ایمان کے ویرانہ میں بیٹھا ہوا ہوں اسلئے کہ دنیا کے شائد ہی کسی مصنف نے اس اختصار، اس نفاست اور اس بلاغت سے وجودِ خداوندی کی تردید کی ہو۔ مگر ہزار شکر ہے کہ باوجود اس زبردست تصادم روحانی کے میرے ایمان متزلزل

---

[1] یہ مضمون ایک انگریزی رسالہ "خیالات" سے ماخوذ ہے۔

سنبھالا لیا اور اس میں وہی استقلال اولین پیدا ہوا اور مجھے نہایت مسرت ہے کہ آج انھیں کتابوں کا مصنف یعنے خود رابرٹ بلاچفرڈ بھی منکر نہیں رہا۔

چمکیلے سورج والے کیلیفورنیا کی ایک شاداب وادی میں ایک بلند قامت نہایت خوبصورت سفید بالوں والی عورت جسکی عمر اسوقت ۸۰ سال کی ہے' اشاعت مذہب میں جانکاہ کوشش کر رہی ہے وہ اس پیام کی حامل ہے کہ ہم اصل مدعائے زندگی سے نابلد ہیں اسلئے زندگی کے صحیح اصول اور سیدھے راستے دکھانا اس کا اور اسکے پیروؤں کا نصب العین ہے۔ یہی کیا زمانہ کی الٹ پھیر ہے' اس بانی تھیاسیوفسٹ کے واقعات معلوم کرنے کے بعد مجھے وہ انگلا زمانہ یکایک یاد آگیا جبکہ چارلس برڈلا جیسا پکا دہریہ اور پارلیمنٹ کا آتش بیان مقرر تمام انگلینڈ کا دورہ محض اسلئے کرتا رہا کہ خدا کے وجود کی سرے سے تردید و تکذیب کرے۔ اس زمانہ میں جبکہ وہ نہایت زور و شور اور بے باکی سے اپنے خیالات کی اشاعت کر رہا تھا اس کی پرجوش شریک کار یہی حضرت مسز اینی بیسنٹ تھیں' سالہا سال تک نہ صرف یہ دشمن مذہب رہ چکی ہے بلکہ اس نے مذہب کی عمارت کو متزلزل کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور آج وہی اینی بیسنٹ ہے جسکی روحانی قوت کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہے۔

زمانۂ موجودہ میں آپ کو بہت سی ایسی مثالیں ملینگی جن میں دنیا کے زبردست اور مشہور دہریوں کے خیالات نے تعجب انگیز پلٹا کھایا ہے' آخر ایسی کیا بات ہے کہ وجود خداوندی کے سخت ترین دشمن بھی کم از کم روح کے غیر فانی ہونے کو تسلیم کر ہی لیتے ہیں؟

بڑے بڑے فلسفیوں نے بھی اس ابدی اعتقاد کو اس طرح سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان ایمان لے آتا ہے محض اسلئے کہ وہ ایمان لانا چاہتا ہے اور اسلئے کہ حیات و ممات کے خیال نے اسکو نہایت خوفزدہ اور متفکر بنا رکھا ہے۔ دوسرے مشہور مفکر مثلاً جرمنی کا شہرہ آفاق فلسفی ہیگل نے کہا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب توہمات کا ایک نظر فریب سرچشمہ ہیں جس سے بنی نوع انسان کے عقائد کی نہر کا جاری ہونا لازمی ہے۔

روس سے ایک سبق آج تو وہاں بالشویک لوگوں کا یہ ایک قانونی خیال ہے کہ تمام مذاہب

ایک نشہ آور شراب ہیں۔ ان کے مدارس میں نونہالوں کو "پدر فردوس" کے وجود سے انکار کرنا سکھلایا جاتا ہے۔ مذہب اور اخلاق کو صفحۂ دہر سے مٹانے کی جو کوشش روسی انقلاب پسند کر رہے ہیں اور جو کامیابی ان کو حاصل ہوئی ہے وہ ذیل کے ایک نوخیز روسی طالب علم کے قصہ سے واضح ہے۔ اس طرح مثال بچے کو اس قانونی دہریت کے توہینی الفاظ یاد دلائے گئے، بچے نے زبانی یاد کر لئے، استاد نے دریافت کیا کیوں اب تو تم اسکو اچھی طرح سمجھ گئے ہو نا؟ بھولے، معصوم بچے نے گویا اسی کی تردید کرتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں، خدا کا شکر ہے۔ کیوں اب تو مجھے کھیل میں شریک ہونے کی اجازت ہے"۔

ٹامس پین جیسے شاید چند ہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے زمانہ میں اپنی شخصیت کا سکہ اس طرح بٹھایا کہ جسکی حد نہیں۔ پین ایک انقلاب پسند اور غضب کا مضمون نگار تھا، مذہب پر بھی اسکی یورش ایسی ہی زوردار رہی ہے جیسی کہ حکومت پر۔ سالہا سال تک وہ تقریر اور تحریر سے فنائیت انسان کے سے بے ثمر نظریہ کا اور نیز اس خیال کا کہ یہ دنیا فضائے لامتناہی میں سے بلا کسی رہبری کے گزر رہی ہے اعلان کرتا رہا۔

مگر انجام کار؟ صحت تباہ شدہ، فلاکت زدہ، دوست احباب سے علیحدہ۔ ایسے شخص نے جو اپنے انوکھے طریقہائے زندگی کی وجہ امتیاز حاصل کر چکا تھا، بالآخر ایمان لے ہی آیا۔

پین جب ایک جانگسل بیماری کا شکار ہو کر بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا اسکی عیادت کے لئے میری راسکو نامی ایک خاتون جسکے چہرہ سے پژمردگی عیاں تھی آئی۔ پین سے اس نے استفسار کیا کہ کبھی تم نے دہریت کے متعلق میری تحریریں بھی پڑھی ہیں؟ میری راس کو نے جواب دیا کہ جب میں بالکل نوعمر تھی مجھے "زمانۂ دلائل" نامی کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا مگر جس قدر میں زیادہ پڑھتی رہی میرے دل کی سیاہی میں بھی گہرائی بڑھتی رہی جھنجھلا کر آخر اس کتاب کو میں نے آگ کے حوالہ کیا۔

کاش کہ ساری دنیا ایسا ہی کرتی پین نے حسرت آمیز آہ بھر کر کہا، شیطان نے اپنے خیالات کی اشاعت کا اگر کوئی ذریعہ بنایا تھا تو وہ میری تحریریں تھیں۔

بعد میں جب یہ عالم نزع میں پہنچا تو وہ ایک دل ہلا دینے والی آواز سے چلا اٹھا "او خدا او میرے مالک و مولا رحم! رحم!! مجھ پہ رحم کر!!!"

رابرٹ انگرسل جیسے امریکہ کے مشہور کرنل ڈہریہ نے زمانہ پیری میں اپنے خیالات بالکل بدل دیئے حالانکہ وہ زندگی تمام اپنی آتش بیانی اور زود اثر تقریروں سے عیسائیت اور دنیا کے دیگر قدیم مذاہب پر تند حملے کرتا رہا، اس نے ہزارہا نیک نفس اور صاف باطن لوگوں کے ایمان کو تہ و بالا کر دیا۔ مگر انجام کار وہ دہریہ تو نہیں رہا مگر لادریہ Agnostic بنا جو اوّل الذکر سے بالکل ہی جداگانہ شئے ہے اسلئے کہ دہریہ ایک بیوقوف کیطرح یہ کہتا ہے کہ خدا کا سرے سے وجود ہی نہیں برخلاف اسکے لادریہ یہ کہتا ہے کہ ہم اس کے وجود کا ثبوت نہیں دیسکتے۔

فرانس کا مشہور مضمون نگار والٹیر جیسا شاید ہی کوئی شخص پیدا ہوا ہو جس نے مذہب کی اس تند و مد کے ساتھ مخالفت کی ہو اور ہزارہا بنی نوع انسان کے کشتیٔ ایمان کو بھنور میں ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ اس کے باوجود موت کے چند دنوں پیشتر اس کے قلم سے یہ جملہ نکلا کہ "اگر بالفرض خدا موجود نہ بھی ہو تو ہمیں ایک خدا کی سخت ضرورت ہے"۔

دہریت جسکی زد میں عموماً نوجوان ہی بکثرت آجاتے ہیں، صرف خون کی پر زور گردش کا نتیجہ ہے۔ ٹینیسن کا بیان ہے کہ بہ نسبت مذبذب عقیدے کے پُرخلوص شک میں ایمان کی زیادہ جھلک نمایاں ہوتی ہے۔

جو سب سے زیادہ جاہل ہوتے ہیں وہی سب سے زیادہ اندھے مقلد ہوتے ہیں، عقلمندوں ہی کی زبان سے نیازمندانہ الفاظ نکلا کرتے ہیں۔ فرانس کا مشہور ادیب اناطول فرانس زندگی بھر مذہب کا مضحکہ اڑاتا رہا۔ لیکن وہ بھی خدا کے وجود، روح کی ابدیت اور عیسائیت کی صداقت سے گریز نہ کرسکا، جب وہ مرگیا تو اس کی تجہیز و تکفین انہی رومن طریقوں پر کی گئی جن پر اس کا استباغ کیا گیا تھا۔

نظریۂ ارتقا اور مذہب جس وقت ڈارون نے اپنا نظریہ ارتقا، یعنے انسان کی زندگی کا نہایت

حقیر مدارج سے ترقی کر کے موجودہ صورت تک پہنچا، پیش کیا تو مذہبی ملاؤں نے کفر کا فتویٰ جاری کیا، مگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو یہ اُنکی غلطی تھی۔ ڈارون خود ایک پکا مذہبی آدمی تھا اس نے اپنی زندگی مطالعۂ قدرت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اس کے کارناموں سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ دہریت ان سے پھوٹ نکلی ہے اسکے برخلاف ان سے مذہب کے تخیل میں ایک وسعت اور نزاکت پیدا ہوگئی ہے یہ خصوصیت صرف ڈارون کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ مملکت سائنس میں عموماً ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

امریکہ کے مشہور و معروف موجد اڈیسن کی سی ہستیاں دنیا میں چند ہی ہونگی جنہوں نے اپنے ہی زمانۂ حیات میں اپنی غیر معمولی شخصیت اور اختراعی دماغ کا سکہ جمایا ہو اس کے حیرت انگیز انکشافات و ایجادات اب روزمرہ کی تمدنی زندگی کا جزو لاینفک بنی ہوئی ہیں۔ آج سے تین سال قبل اس سائنس دان نے ایک نہایت سنجیدہ اور فہمیدہ مضمون ایک رسالہ میں شائع کرایا تھا جس میں اس نے اس بات کی اچھی طرح وضاحت کی تھی کہ کیوں اس نے روح کے غیر فانی ہونے کو تسلیم کرنے سے صریح انکار کر دیا تھا۔ اس نے خود کے غیر معتقد ہونے کا صاف الفاظ میں اقرار کیا اور اپنی دانست میں ــــ مگر اس زمانہ میں ــــ تمام مذاہب کی سراب نما فطرت کو ثابت بھی کر دیا لیکن کل ہی کی بات ہے کہ اسی اڈیسن نے جس کی ۸۰ ویں سالگرہ منائی گئی ہے، خود کو ایک خطرناک غلطی کا مرتکب ہونا تسلیم کیا ہے۔ تین سال کے مسلسل روحانی تجربات اور مشاہدوں نے نہ صرف اسکو ارواح کے غیر فانی ہونیکا معتقد بنا دیا ہے بلکہ وہ اس بات کا بھی قائل ہوگیا ہے کہ ارواح سے گفت و شنید کا بلاشک و شبہ امکان ہے۔ اڈیسن کے عقائد اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ سائنس کو مذہب سے کوئی بیر نہیں ہو سکتا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی شخص ایسا بھی گزرا ہے جس کو عالم نزع میں بھی ایک بزرگ اور برتر ہستی کے موجود ہونے کا شک و شبہ رہا ہو؟ علم کے اس بے کنار سمندر میں انسان ایک حقیر تنکا ہے جو اسکے تلاطم کے ساتھ ادھر ادھر رواں دواں ہے مگر چونکہ یہ ایک خیالی پتلا ہے اس لئے زمانۂ شباب میں ساتوں افلاک پر اپنے خیالی گھوڑے دوڑایا کرتا ہے، اپنی لگاتار جدوجہد میں ایک نہ ایک دن جب وہ

اس "عظیم الشان ہستی" کا قرب حاصل کرتا ہے یا دور ہی سے ایک جھلک دیکھ پاتا ہے تو اسوقت اس کو اپنے ذلیل، حقیر، کمزور اور بے یار و مددگار ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں کڑے کڑ دہر یہ بھی حسرت و یاس بھری آواز میں اپنی لڑکھڑاتی زبان سے وہی الفاظ نکالتا ہے جو ٹامس بین کی زبان سے نکلے تھے اور پھر نہایت ہی متانت و حلم کے ساتھ ایک نامعلوم بحر بے کنار میں ایک قطرہ کی طرح ملجاتا ہے۔

سکہ جات ٹیپو سلطان

از مولانا حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب

ٹیپو سلطان کے سکوں کا ذکر سب سے پہلے ایڈورڈ مور نے کیا ہے۔ اسکی کتاب ٹیپو سلطان کی زندگی میں اوس کی وفات سے پانچ سال پہلے ۱۷۹۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ اسکے تقریباً تیس سال بعد مارسڈن نے اپنی مشہور کتاب "سکوکاتِ مشرقیہ" تصنیف کی ہے۔ اس کی دوسری جلد میں ٹیپو سلطان کے سکوں کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ تاہم یہ دونوں کتابیں اس موضوع کے متعلق تفتیش ابتدائی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہاکس، تھرسٹن اور کپتان ٹفنل نے ٹیپو سلطان کے سکوں کی خوب چھان بین کی ہے۔ اور اپنی تصنیفات میں ان کی نسبت اس قدر شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے کہ اون پر کسی نئی بات کا اضافہ کرنا غیر ممکن ہے۔ ان تمام تحریرات کو پیش نظر رکھ کر ہمارے دوست ڈاکٹر ٹیلر نے ایک رسالہ "سکہ جات ٹیپو سلطان" کی نسبت لکھا ہے جو ۱۹۱۴ء میں نیومس میٹک سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے۔ تاہم اس میں ضروری اور کارآمد مباحث مذکور ہیں۔ اس رسالہ کی اشاعت کے چند سال بعد ڈاکٹر ہنڈرسن نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے سکوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ اور اسکی ابتداء میں ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ ہم نے اپنے اس مضمون کو اخیر کی دونوں کتابوں سے اخذ کر کے مرتب کیا ہے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ موسم سرما میں ہم نے مدراس کا سفر کیا تو وہاں کے سنٹرل میوزیم میں ٹیپو سلطان کے کئی سو سکے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور اس عینی مشاہدہ کے بدولت مضمون کی تدوین اور سکوں کی ترتیب میں بیحد سہولت ہوئی۔

سکہ جات ٹیپو سلطان کے متعلق اس مضمون میں جس قدر مباحث مذکور ہیں انکی تقسیم ذیل کے چار عنوانوں پر کی گئی ہے

(۱) دار الضرب۔ جہاں سکے مضروب ہوئے ہیں۔
(۲) سنہ و تاریخ۔ جو سکوں پر مسکوک ہے۔
(۳) سکوں کے اقسام اور اُن کے نام۔
(۴) سکوں کے نقوش۔

ٹیپو سلطان کے دار الضرب

ٹیپو سلطان نے اپنے سکے حسب ذیل مقامات پر مضروب کرائے تھے۔

بنگلور۔ اسکا اصلی نام بنگلورو ہے دوار سمندر کے راجہ ویرا بلال دیوا نے اس کو آباد کیا تھا۔ ۱۷۵۸ء میں حیدر علی نے فتح کیا۔ ٹیپو سلطان کی وفات کے بعد ۱۷۹۱ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے اُسے میسور کے قدیم راجگان و دیار کے حوالہ کر دیا۔

پٹن۔ اسکا اصلی نام سری رنگا پٹنا ہے جس کے معنی ہیں سری رنگا (ناتھ) کا شہر۔ انگریز اس کو اپنے تلفظ میں سرنگا پٹم کہتے ہیں دریائے کاویری کے کنارے آباد ہے۔ اور انگریزوں کی تاریخ میں خاص شہرت رکھتا ہے کیونکہ اسی جگہ لارڈ کارنوالس نے ۱۷۹۲ء میں ٹیپو سلطان سے شرائط صلح طے کی تھیں۔ اور اسی جگہ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ٹیپو سلطان شہید ہوا تھا۔

خالق آباد۔ مٹر ہاکس نے کہا ہے کہ یہ نام چندگھول کا ہے جو سرنگاپٹم کے قریب واقع ہے۔ لیکن کرمانی نے اپنی تاریخ نشان حیدری میں وندگل کا نام خالق آباد بتایا ہے۔ اور ڈاکٹر ہنڈرسن کی تحقیقات کے بموجب وندگل ضلع مدورا میں واقع ہے۔

خورشید سواد۔ دہاڑواڑ کا نام ہے۔ مورا اور مارسڈن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

دہاڑواڑ۔ اس کو دہارراؤ نے ۱۴۰۳ء میں آباد کیا تھا۔ مرہٹوں سے ۱۷۶۶ء میں حیدر علی نے فتح کیا اور ۱۷۹۱ء میں انگریزوں کے تسلط میں آیا۔

سلام آباد۔ سانتیا منگلم کا نام ہے جو ضلع کمباتور میں بہارتی ندی کے کنارے آباد ہے۔ ۱۷۹۰ء میں اس مقام پر ٹیپو سلطان اور انگریزی افواج کے مابین ایک عظیم الشان معرکہ ہوا تھا۔ کپتان لٹفنل نے اسکا نام اسلام آباد لکھا ہے۔

ظفر آباد۔ کورم کنڈہ کا نام ہے جو ضلع کڑپا میں واقع ہے اس قلعے کو ۱۷۶۸ء میں حیدر علی نے فتح کیا تھا۔ ٹیپو سلطان کی وفات کے بعد اس پر سرکار نظام کا قبضہ ہوا لیکن ۱۸۰۰ء میں جدید معاہدہ کی رو سے جب سرکار نظام نے ضلع کڑپا انگریزوں کے حوالہ کر دیا تو یہ مقام بھی برٹش عملداری میں شامل ہوگیا۔

ٹیپو سلطان نے کورم کنڈہ کے علاوہ مرکارہ کا نام بھی ظفر آباد رکھا تھا۔ مرکارہ ریاست کورگ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ کرمانی بیان کرتا ہے کہ ۱۷۹۰ء میں ٹیپو سلطان نے اس مقام کو راجہ کورگ کے حوالہ کر دیا۔ ۱۷۹۰ء سے پہلے جن سکوں پر ظفر آباد کا نام پایا جاتا ہے وہ مرکارہ میں مضروب ہوئے ہیں سنین مابعد کے سکے کورم کنڈہ کے ہیں۔

امپیریل گزیٹر میں مرکارہ کا نام جعفر آباد لکھا ہے لیکن صحیح نام ظفر آباد ہے اور تلفظ کے مسخ ہوجانے سے جعفر آباد مشہور ہوگیا ہے۔

فرخ باب حصار۔ کرمانی نے فرخ باب حصار لکھا ہے لیکن سکوں پر باب (ی اب) کی بجائے باب (ب ا ب) مسکوک ہے۔ ٹیپو سلطان نے یہ نام چینل ورک کا رکھا تھا اور اس کا لقب دار السلطنت تھا۔

فرخی ۔ یہ مقام بی پور ندی کے جنوبی کنارے کالیکوٹ سے سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ۱۷۸۸ء میں اسکو ٹیپو سلطان نے آباد کیا تھا۔ اسی کو نیا کالیکوٹ کہتے ہیں۔

فیض حصار ۔ گوٹی کا نام ہے۔ جو ضلع انتاپور میں واقع ہے۔ اس کو حیدر علی نے ۱۷۷۵ء میں فتح کیا تھا۔

کالیکوٹ ۔ مالابار کا مشہور شہر ہے قدیم زمانہ میں راجگان سامری کا صدر مقام تھا ۱۷۶۳ء میں حیدر علی نے اس کو فتح کیا تھا۔ کرمانی نے اس کا نام (اسلام آباد) لکھا ہے۔

نظر بار ۔ میسور کا لقب ہے۔

نگر ۔ شیموگا سے جانب مغرب پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ساتویں صدی میں کیلادی راجاؤں نے اس کو اپنا دار السلطنت بنایا تھا۔ اور اس زمانہ میں اسے بیدرور یا بیدنور کہتے تھے۔ ۱۷۶۳ء میں حیدر علی نے اسکو فتح کر کے اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ اور حیدر نگر اس کا نام رکھا تھا۔

بے نظیر ۔ اس دار الضرب کا حال ابھی تک تحقیق نہیں ہوا ہے۔ بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ نام دھولی ہونور کا ہے یہ قصبہ دریائے تنگا اور بھدرا کے مقام اتصال پر واقع ہے۔ یہاں سے دونوں دریا باہم ملکر تنگ بھدرا کہلاتے ہیں۔

مدراس اور بنگلور کے عجائب خانوں میں ٹیپو سلطان کے جس قدر سکے موجود ہیں اونکی تفصیل یہ ہے۔

	سونا	چاندی	تانبہ	میزان
مدراس میوزیم	۲۱	۱۳	۷۱	۱۰۵
بنگلور میوزیم	۴۲	۲۵	۱۱۷	۱۸۴
میزان	۶۳	۳۸	۱۸۸	۲۸۹

مقام ضرب کے لحاظ سے ان کا گوشوارہ یہ ہے

		سونا	چاندی	تانبہ	میزان
پٹن	= سرنگاپٹم	۲۶	۳۷	۹۱	۱۵۴
گجر	= بیدنور	۱۸	۰	۲۵	۴۳
بنگلور	= ۰	۰	۰	۱۷	۱۷
فرخی	= ۰	۵	۰	۱۰	۱۵
فیض حصار	= گوٹی	۰	۰	۱۵	۱۵
کالیکوٹ	= ۰	۷	۰	۶	۱۳
فرخ باب حصار	= چنتیل درگ	۰	۰	۱۳	۱۳
خورشید سواد	= دھارواڑ	۳	۱	۱	۵
خالق آباد	= ڈنڈیگل	۱	۰	۲	۳
نظر بار	= میسور	۰	۰	۳	۳
سلام آباد	= سالیتا منگلم	۰	۰	۳	۳
دھارواڑ	= ۰	۲	۰	۰	۲
خضر آباد	= کورم کنڈہ	۰	۰	۱	۱
بیٹ منظیر	= ہولی ہونور	۱	۰	۰	۱
بلدنام دارالضرب	-	۱	۰	۰	۱
میزان		۶۴	۳۸	۱۸۷	۲۸۹

سکّوں کی سنہ و تاریخ

ٹیپو سلطان نے سکّوں پر جو سنہ و تاریخ درج کرائے ہیں اونکی بنیاد جمل پر رکھی گئی ہے۔ اسلئے اصل مباحث کو بیان کرنے سے پہلے جمل کے اون دو قاعدوں کے متعلق چند الفاظ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کا نام ابجد اور ابتث ہے۔

ابجد کا قاعدہ عبرانی سے ماخوذ ہے۔ عبرانی زبان کے حروف ہجا بائیس ہیں۔ ابجد کے نو اکائیاں نو دہائیاں اور ابتداء کے چار سینکڑے جن کی تعداد بائیس ہے۔ عبرانی حروف ہجا کی ترتیب سے مطابقت رکھتی ہیں۔

عربی زبان میں عبرانی سے چھ حروف زائد ہیں ث۔ خ۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ غ اور ان سے اخیر کے پانچ سینکڑے اور ایکہزار کے اعداد حاصل کئے جاتے ہیں۔

ابتث کا قاعدہ ابجد سے مختلف ہے اور اسکی ترتیب عربی حروف ہجا کے مطابق سلسلہ وار مقرر ہے۔ ذیل میں ہم ان دونوں کے اعداد مزید صراحت کے لئے درج کرتے ہیں۔

ابجد کے حروف و اعداد

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی	ک
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰
ل	م	ن	س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت
۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰
ث	خ	ذ	ض	ظ	غ					
۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰					

ابتث کے حروف اعداد

ا	ب	ت	ث	ج	ح	خ	د	ز	ر	ز
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰
س	ش	ص	ض	ط	ظ	ع	غ	ف	ق	ک
۳۰	۴۰	۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰
		ل	م	ن	و	ہ	ی			
		۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰			

دکن کے ہندوؤں میں قدیم زمانہ سے ایک سنہ رائج ہے جسے ٹامل زبان میں "برہیتی مانم" کہتے ہیں اس کی بنیاد مشتری کے پانچ دوروں پر رکھی گئی ہے۔ جو ساٹھ شمسی سال کے مطابق ہیں ہر دور کے لئے ٹامل اور تلنگی میں جدا جدا نام مقرر ہیں۔ لیکن ٹیپو سلطان نے ان ناموں کے عوض ہر سال کے لئے جدید نام مقرر کئے تھے اور ابجد یا ابتث کے قاعدہ سے اون کی ترتیب ایسی رکھی تھی کہ اون سے ہر سال کے دور کا عدد ظاہر ہوتا تھا۔

ٹیپو سلطان اپنے والد حیدر علی کی وفات کے بعد، ۷ دسمبر ۱۷۸۲ء کو برسر حکومت ہوا تھا۔ پس اوس کا پہلا سال جلوس ۱۷۸۳ء یا ۴۸۸۴ کالی یوگا کے مطابق ہے۔ تلنگی تقویم کی رو سے مشتری کا پہلا دور کالی یوگا سنہ کے آغاز سے بارہ سال پہلے شروع ہوا اس اعتبار سے ۱۷۸۳ء تک سنہ دوری کے اکیاسی ساٹھ سالہ دور گزرے ہیں۔ جو چار ہزار آٹھ سو ساٹھ سنین شمسی کے مساوی ہیں۔ ۱۷۸۳ء سے بیاسیواں دور شروع ہوتا ہے۔ اور اس دور کا چھتیسواں سال ۱۷۸۲ء کے مطابق ہے پس ٹیپو سلطان کا پہلا سال جلوس جو ۱۷۸۳ء میں واقع ہوا ہے ۳۷ سنہ دوری کے مطابق ہے۔

اس سینتیسویں سال کا نام اگرچہ سنسکرت میں سبھاکرت تھا لیکن ٹیپو سلطان نے اسکا

نام۔ زکی۔ رکھا جسکے عدد ابجد کی رو سے (ز = ۷ ۔ ک = ۲۰ ۔ ی = ۱۰) ۳۷ ہوتے ہیں۔ اسیطرح دوسرے تیسرے اور چوتھے سال کے حسب ذیل نام مقرر کئے۔

سنہ جلوس (۲) سنہ دوری (۳۸) ازل = ۱ + ۷ + ۳۰ = ۳۸

〃 (۳) 〃 (۳۹) جلو = ۳ + ۳۰ + ۶ = ۳۹

〃 (۴) 〃 (۴۰) دلو = ۴ + ۳۰ + ۶ = ۴۰

جلوس کے پانچویں سال ٹیپو سلطان نے سنین دوری کے اسماء کا سابقہ قاعدہ تبدیل کر دیا۔ اور ابجد کی بجائے ابتث کے رو سے نئے نام وضع کئے جو ٹیپو سلطان کی وفات تک جاری رہے۔ ان ناموں کی تفصیل یہ ہے۔

سنہ جلوس (۵) سنہ دوری (۴۱) شا = ۴۰ + ۱ = ۴۱

〃 (۶) 〃 (۴۲) سارا = ۳۰ + ۱ + ۱۰ + ۱ = ۴۲

〃 (۷) 〃 (۴۳) سراب = ۳۰ + ۱۰ + ۱ + ۲ = ۴۳

〃 (۸) 〃 (۴۴) شتا = ۴۰ + ۳ + ۱ = ۴۴

〃 (۹) 〃 (۴۵) زبرجد = ۲۰ + ۲ + ۱۰ + ۵ + ۸ = ۴۵

〃 (۱۰) 〃 (۴۶) سحر = ۳۰ + ۶ + ۱۰ = ۴۶

〃 (۱۱) 〃 (۴۷) ساحر = ۳۰ + ۱ + ۶ + ۱۰ = ۴۷

〃 (۱۲) 〃 (۴۸) راسخ = ۱۰ + ۱ + ۳۰ + ۷ = ۴۸

〃 (۱۳) 〃 (۴۹) شاد = ۴۰ − ۱ − ۸ = ۴۹

〃 (۱۴) 〃 (۵۰) حراست = ۶ + ۱۰ + ۱ + ۳۰ + ۳ = ۵۰

〃 (۱۵) 〃 (۵۱) ساز = ۳۰ + ۱ + ۲۰ = ۵۱

〃 (۱۶) 〃 (۵۲) شاداب = ۴۰ + ۱ + ۸ + ۱ + ۲ = ۵۲

〃 (۱۷) 〃 (۵۳) بارش = ۲ + ۱ + ۲۰ + ۱۰ + ۴۰ = ۵۳

جلوس کے پہلے چار سال تک ٹیپو سلطان کے سکّوں پر سنہ جلوس کے ساتھ سنہ ہجری بھی مسکوک ہوا کرتا تھا۔ لیکن پانچویں سال اسجد کے بجائے جب ابتث کے اسماء کا استعمال شروع ہوا تو سنہ ہجری کے عوض سنہ مولودی مسکوک ہونے لگا۔ اس سنہ کو ٹیپو سلطان نے وضع کیا تھا۔ اور اس کی ابتدا حضرت رسالت مآب صلعم کے یوم ولادت سے کیگئی تھی جو ۵۷۱ء میں واقع ہوئی ہے۔ سنہ ہجری کا حساب قمری ہے برخلاف اس کے ٹیپو سلطان نے جدید سن کیلئے شمسی سال اختیار کیا۔

ٹیپو سلطان نے جلوس کے چودھویں سال ایک اور جدّت کی تانبے کے سکّوں پر سنین کے شمار کیلئے عربی کے حروف تہجا مقرر کئے پہلے سال کے لئے حرف الف دوسرے سال ب تیسرے سال ت اور چوتھے سال ث ثبت کرائے۔

ذیل میں ہم ایک جدول درج کرتے ہیں جس سے ٹیپو سلطان کے وضع کردہ سنین اور انکی مطابقت ظاہر ہوتی ہے۔

۷ دسمبر ۱۷۸۲ء مطابق یکم محرم ۱۱۹۷ھ کو حیدر علی نے انتقال کیا

سال جلوس	سال دوری	سال مولودی	سال ہجری	سال حروفی	سال عیسوی	سال دوری کے نام	
سنہ ۱	سنہ ۳۷	.	۱۱۹۷ھ سنہ ۱۱۹۸ھ	.	۱۷۸۲ء سنہ ۱۷۸۳ء	زکی	بقاعدہ ابجد
سنہ ۲	سنہ ۳۸	.	۱۱۹۸ھ سنہ ۱۱۹۹ھ	.	۱۷۸۳ء سنہ ۱۷۸۴ء	ازل	
سنہ ۳	سنہ ۳۹	.	۱۱۹۹ھ سنہ ۱۲۰۰ھ	.	۱۷۸۴ء سنہ ۱۷۸۵ء	جلو	
سنہ ۴	سنہ ۴۰	.	۱۲۰۰ھ سنہ ۱۲۰۱ھ	.	۱۷۸۵ء سنہ ۱۷۸۶ء	دلو	
سنہ ۵	سنہ ۴۱	۱۲۱۵م سنہ ۱۲۱۶م	.	.	۱۷۸۶ء سنہ ۱۷۸۷ء	شا	بقاعدہ ابتث
سنہ ۶	سنہ ۴۲	۱۲۱۶م سنہ ۱۲۱۷م	.	.	۱۷۸۷ء سنہ ۱۷۸۸ء	سارا	
سنہ ۷	سنہ ۴۳	۱۲۱۷م سنہ ۱۲۱۸م	.	.	۱۷۸۸ء سنہ ۱۷۸۹ء	سراب	

سال مجلس	سال دوری	سال مولودی	سال ہجری	سال عربی	سال عیسوی	سال دور کے نام
۸ سنہ	۴۴ سنہ	۱۲۱۸ء سنہ ۱۲۱۹ء	.	.	۱۷۸۹ء سنہ ۱۷۹۰ء	شتا
۹ سنہ	۴۵ سنہ	۱۲۱۹ء سنہ ۱۲۲۰ء	.	.	۱۷۹۰ء سنہ ۱۷۹۱ء	زبرجد
۱۰ سنہ	۴۶ سنہ	۱۲۲۰ء سنہ ۱۲۲۱ء	.	.	۱۷۹۱ء سنہ ۱۷۹۲ء	سحر
۱۱ سنہ	۴۷ سنہ	۱۲۲۱ء سنہ ۱۲۲۲ء	.	.	۱۷۹۲ء سنہ ۱۷۹۳ء	ساحر
۱۲ سنہ	۴۸ سنہ	۱۲۲۲ء سنہ ۱۲۲۳ء	.	.	۱۷۹۳ء سنہ ۱۷۹۴ء	راسخ
۱۳ سنہ	۴۹ سنہ	۱۲۲۳ء سنہ ۱۲۲۴ء	.	.	۱۷۹۴ء سنہ ۱۷۹۵ء	شاد
۱۴ سنہ	۵۰ سنہ	۱۲۲۴ء سنہ ۱۲۲۵ء	.	الف	۱۷۹۵ء سنہ ۱۷۹۶ء	حراست
۱۵ سنہ	۵۱ سنہ	۱۲۲۵ء سنہ ۱۲۲۶ء	.	ب	۱۷۹۶ء سنہ ۱۷۹۷ء	ساز
۱۶ سنہ	۵۲ سنہ	۱۲۲۶ء سنہ ۱۲۲۷ء	.	ت	۱۷۹۷ء سنہ ۱۷۹۸ء	شاداب
۱۷ سنہ	۵۳ سنہ	۱۲۲۷ء سنہ ۱۲۲۸ء	.	ث	۱۷۹۸ء سنہ ۱۷۹۹ء	بارش

بقاعدہ ابتدا

۴ مئی ۱۷۹۹ء م ۲۸ ذی القعدہ ۱۲۱۳ھ کو ٹیپو سلطان نے انتقال کیا۔

ٹیپو سلطان کے سکوں پر سنہ ہجری کے جو اعداد منقوش ہیں وہ بائیں جانب سے سیدھے جانب لکھے گئے ہیں مثلاً ۱۱۹۰ھ ۔ ۱۱۹۹ھ ۔ ۱۲۰۰ھ پانچویں سال کے چند سکوں پر سنہ مولودی لکھنے کیلئے بھی یہی طرز استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ۱۲۱۵ھ مولودی ۱۲۱۶ھ مولودی لیکن اسی سال کے اخیر زمانہ میں کتابت کا یہ طریقہ بالکل اولٹ دیا گیا۔ اور اعداد سیدھے جانب سے بائیں جانب لکھے جانے لگے مثلاً ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۱۶ھ لکھنا ہوتا تو اوسے اس طرح لکھا گیا ہے ۵۱۲۱ھ ۶۱۲۱ھ دس کا عدد (۱۰) لکھنے کے عوض اسطرح (۰۱) لکھنا مقرر کیا گیا۔

ٹیپو سلطان نے بارہ مہینوں کے نام بھی ابجد و ابتث کی رو سے وضع کئے تھے پہلے دس مہینوں میں ابتدائی حروف کا گیارہویں اور بارہویں مہینے کے لئے پہلے اور دوسرے حرف کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ جو نام قاعدہ ابجد پر مقرر تھے اون میں پہلے اکائی اور اسکے بعد دہائی رکھی گئی تھی مثلاً ا + ی = ۱۱۔ ب ی = ۱۲۔ ابتث کے ناموں میں اسکے خلاف پہلے دہائی اور اوس کے بعد اکائی کا لحاظ کیا گیا تھا مثلاً ز اور ا = ۱۱ ر اور ب = ۱۰ + ۲ = ۱۲

بارہ مہینوں کے دونوں سلسلہ ذیل میں درج ہیں

بتاعدہ ابجد

۱	پہلا مہینہ	احمدی	ا	۱
۲	دوسرا مہینہ	بہاری	ب	۲
۳	تیسرا مہینہ	جعفری	ج	۳
۴	چوتھا مہینہ	دارائی	د	۴
۵	پانچواں مہینہ	ہاشمی	ہ	۵
۶	چھٹا مہینہ	واسعی	و	۶
۷	ساتواں مہینہ	زبرجدی	ز	۷
۸	آٹھواں مہینہ	حیدری	ح	۸
۹	نواں مہینہ	طلوعی	ط	۹
۱۰	دسواں مہینہ	یوسفی	ی	۱۰
۱۱	گیارہواں مہینہ	ایزدی	ا۔ ی = ۱ + ۱۰ =	۱۱
۱۲	بارہواں مہینہ	بیاضی	ب۔ ی = ۲ + ۱۰ =	۱۲

بقاعدۂ ابتث

پہلا مہینہ	احمدی	ا	۱
دوسرا ″	بہاری	ب	۲
تیسرا ″	نقی	ت	۳
چوتھا ″	ثمری	ث	۴
پانچواں ″	جعفری	ج	۵
چھٹا ″	حیدری	ح	۶
ساتواں ″	خسروی	خ	۷
آٹھواں ″	دینی	د	۸
نواں ″	ذاکری	ذ	۹
دسواں ″	رحمانی	ر	۱۰
گیارھواں ″	رازی	ر = ا + ۱۰ + ا =	۱۱
بارھواں ″	ربانی	ر = ب + ۱۰۰ + ۲ =	۱۲

ٹیپو سلطان کے بڑے سکّوں پر جو سنہ جلوسی کے بعد مضروب ہوئے ہیں سنہ جلوس کے ساتھ تاریخ جلوس بھی ثبت ہے۔

تاریخ جلوس سال سنح سیوم بہاری

ابتث کی رو سے سنہ دوری کے سینتیسویں سال کا نام سنح ہے بہاری دوسرے مہینہ کا نام ہے پس اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ ٹیپو سلطان سینتیسویں سال کے دوسرے مہینہ کی تیسری تاریخ تخت نشین ہوا۔

مارسڈن کا بیان ہے کہ سنہ دوری یوم اعتدال لیل و نہار سے شروع ہوتا ہے۔ اس بنیاد پر عیسوی سال کی بیس مارچ اس کی پہلی تاریخ قرار پاتی ہے۔ اور تیسری تاریخ دوسرا مہینہ سینتیس سال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۲۰ مارچ ۱۷۸۳ء کے تینتیس یوم بعد ۴ مئی ۱۷۸۳ء کو ٹیپو سلطان برسر حکومت ہوا۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس واقعہ کے سولہ سال بعد عین اسی تاریخ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم میں انگریزوں کے حملہ کی مدافعت کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

سکّوں کے نام

ٹیپو سلطان نے جو سکّے رائج کئے تھے باعتبار وزن اور قیمت کے اون کی مختلف قسمیں تھیں اور ہر ایک کیلئے جُدا جُدا نام مقرر کئے تھے جو اُن سکّوں پر بھی مضروب رہا کرتے تھے۔ لیکن یہ نام بازار میں مشہور نہ ہو سکے اور عوام الناس نے طلائی سکّوں کا نام سلطانی ہون اور نقرئی کا سلطانی روپیہ رکھدیا تھا۔

ٹیپو سلطان نے طلائی سکّوں کے نام خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے نام پر رکھے تھے۔ نقرئی سکّوں کو ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کے نام سے منسوب کیا تھا۔ تانبے کے سکّے تاریخوں کے نام سے نامزد تھے۔

سونے کے سکّے

(۱) اَحمدی۔ مہر یا اشرفی۔ وزن (۲۱۱) گرین۔ یہ نام جناب رسالتمآب صلعم کے اسم گرامی سے منسوب ہے۔

(۲) صِدّیقی۔ نصف مہر۔ وزن۔ (۱۰۶) گرین۔ یہ نام خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لقب سے منسوب ہے۔

(۳) فَارُوقی۔ ربع مہر۔ وزن (۵۱) گرین۔ یہ نام خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے لقب سے منسوب ہے عوام الناس اسکو پگوڈا یا پیگوڈا کہا کرتے ہیں۔ اسکی قیمت ۳½ روپیہ کلدار کے مساوی ہے

(۴) فَلَمَ۔ وزن (۵) گرین پیگوڈا کا دسواں یا ہر کا چالیسواں حصہ تھا فَلَم ایک دکھنی لفظ فلم کی بگڑی ہوی صورت ہے۔ اور فلّم سنکرت زبان کے لفظ پانا سے نکلا ہے اور وہ ایسے تانبے کے ٹکڑے کی نسبت استعمال ہوتا ہے جس سے قلیل اوزان کے تولنے کا کام لیتے ہیں۔

چاندی کے سکّے

(۱) حیدری۔ ڈبل روپیہ۔ یہ نام جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کے لقب سے منسوب ہے۔

(۲) اِمامی۔ روپیہ۔ یہ نام آیمہ معصومین علیہ السّلام سے منسوب ہے۔

(۳) عابدی۔ نصف روپیہ یا آٹھ آنہ۔ یہ نام حضرت امام علی زین العابدینؑ کے نام سے منسوب ہے۔ جو آیمہ اثنا عشرؑ میں چوتھے امام ہیں۔

(۴) باقری۔ روپیہ کا چہارم حصّہ یا چار آنہ۔ یہ نام حضرت امام محمّد الباقرؑ کے نام سے منسوب ہے جو سلسلہ آیمہ اثنا عشرؑ میں پانچویں امام ہیں۔

(۵) جعفری۔ روپیہ کا ہشتم حصّہ یا دو آنہ۔ یہ نام حضرت امام جعفر صادقؑ صادق کے نام سے منسوب ہے جو سلسلہ آیمہ اثنا عشر میں چھٹے امام ہیں۔

(۶) کاظمی۔ روپیہ کا سولہواں حصّہ یا ایک آنہ۔ یہ نام امام موسیٰ کاظمؑ سے منسوب ہے جو سلسلہ اثنا عشر میں ساتویں امام ہیں۔

(۷) خضری۔ نیم آنہ۔ یہ سکہ حضرت خضر علیہ السّلام سے منسوب ہے۔ جو مسلمانوں کے علوم تقدیسیات میں ایک غیر معمولی شخصیت رکھتے ہیں۔

تانبے کے سکّے

(۱) مشتری۔ ڈبل پیسہ ۴ کاس کے مساوی ہے ۱۲۲۲ھ مولودی سے اس کا نام مشتری

قرار پایا ہے اس سے پہلے جس قدر سکے مضروب ہوئے ہیں۔ اونکا نام عثمانی تھا جو امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خلیفہ سیوم سے منسوب ہے۔

(۲) زہرہ۔ پیسہ (۲۰) کاس کے مساوی ہے پٹن کے سکوں پر زہرہ اور نگر کے سکوں پر زہرا مسکوک ہے۔

(۳) بہرام۔ پیسہ کا آدھا حصہ دار کاس کے مساوی ہے۔ فارسی میں مریخ کو بہرام کہتے ہیں

(۴) اختر۔ پیسہ کا چوتھا۔ ۵ کاس کے مساوی ہے۔ اختر فارسی میں ستارہ کو کہتے ہیں

(۵) قطب۔ پیسہ کا آٹھواں حصہ ۲½ کاس کے مساوی ہے یہ سکہ قطب تارہ سے منسوب ہے۔

دبل پیسہ (۲۴۰) گرین کا ہوا کرتا تھا۔ اسی اعتبار سے باقی سکوں کا وزن معین کر لینا چاہیے، ½ ¼ ⅛ ۱/۱۶

سکہ جات
سونے کے سکے

(۱) احمدی۔ مہر۔ وزن ۲۱۱ گرین۔ دار الضرب پٹن

سنین { ۹۱۲۱ھ سال شتا ۴۴ شہ جلوس۔ ۹۱۲۱ھ سال زبرجد ۴۵ شہ جلوس۔

رخ اول	رخ دوم
محمد	ہو
احمد	السلطان الو
دین دجہاں	حید
استح	العادل تاریخ جلوس سال سنخ۔
روشن زفتح حیدر احمد ضرب	
پٹن سال شتا ۹۱۲۱ھ	سیوم بہاری شہ جلو

۱۲۱۵ھ مولودی کے سکے پر سال شستا کے عوض سال زبرجد مسکوک ہے۔

(۲) **صدیقی** ۔ نصف مہر ۔ وزن ۔ ۱۰۶ گرین

دارالضرب ۔ پٹن ۔ نگر ۔

سنین { ۱۲۱۶ھ ۔ سال سارا ۴۲ سنہ ۶ جلوس
۱۲۱۷ھ ۔ سال سراب ۴۳ سنہ ۷ جلوس
۱۲۱۸ھ ۔ سال شستا ۴۴ سنہ ۸ جلوس

رخ اول و دوم مانند نمبر (۱)

(۳) **فاروقی** ۔ مہر کا چوتھا حصہ ۔ پاگوڈا ۔ نقش اول

وزن ۱۵ گرین

دارالضرب ۔ نگر

سنین ۔ ۱۱۹۸ھ ہجری سنہ ۲ جلوس

رخ اول

ہون

السلطا

ے

۱۱۹۸ ابجر

العادل سنہ

رخ دوم

ح نگر

(۴) **فاروقی** ۔ نقش دوم

دارالضرب ۔ پٹن ۔ نگر ۔ دہاروار

سنین { ۱۲۱۵م ۔ سنہ ۵ جلوس
۱۲۱۶م ۔ سنہ ۶ جلوس

رخ اوّل	رخ دوم
ہو محمد	
السلطان	ح
العا	دھاروار
دل ۱۲۱۵ھ	

پٹن کے سکہ پر دار الضرب کا نام اس طرح لکھا گیا ہے پٹن ح

(۵) **فاروقی** — نقش سوم

دار الضرب ۔ پٹن ۔ خورشید سواد ۔ نگر

سنین { ۱۲۱۶م سنہ ۶ جلوس
۱۲۲۱م سنہ ۱۱ جلوس

رخ اوّل	رخ دوم
ہو محمد	
السلطان	فاروقی
حید	نگر سنہ ۶
الوحید العادل ۱۲۱۶ھ	

خورشید سواد کے سکہ کا رُخ دوم اس طرح کا ہے ۔

فاروق
شید
خور سواد
سنہ

پٹن کے سکہ کا رُخ دوم اس طرح پر ہے ۔

فاروقی

پٹن سنہ ۶

(۶) فنم - وزن ۲/۵ گرین -

دار الضرب - پٹن - نگر - کلیکوٹ - فرخی - خالق آباد -

سنین
- سنہ ۱۱۹۸ ہجری سنہ ۲ جلوس
- سنہ ۱۲۰۰ ہجری سنہ ۳ جلوس
- سنہ ۱۲۱۵ مولودی سنہ ۵ جلوس
- سنہ ۱۲۲۲ مولودی سنہ ۱۲ جلوس

رخ اوّل

ح

رخ دوم

سنہ ۱۱۹۸

صر پٹن

پٹن کے بعض فنم کا رخ دوم اس طرح ہے -

سنہ ۱۱۹۸

صر پٹن

ب

کالیکوٹ کے فنم کا رخ دوم اس طرح پر ہے -

سنہ ۱۱۹۸

ت

کلیکو

خالق آباد کے فنم کا رخ دوم اس طرح پر ہے -

خالق آباد
ضرب ۱۲۱۰ھ

چاندی کے سکّے

(۷) حیدری ۔ ڈبل روپیہ ۔ وزن ۳۵۰ گرین ۔
دار الضرب ۔ پٹن ۔ کلیکوٹ ۔ نگر ۔
سنین
۱۱۹۸ھ ہجری ۔ سال ازل (۳۸ھ) ۲ھ جلوس
۱۱۹۹ھ ہجری ۔ سال جلو (۳۹ھ) ۳ھ جلوس
۱۲۰۰ھ ہجری ۔ سال ولو (۴۰ھ) ۴ھ جلوس
۱۲۱۰ھ مولودی ۔ سال ثنا د (۴۱ھ) ۵ھ جلوس

رخ اوّل

مو
السلطان
حیدر
الواثق العادل سیوم بہادر

سال ولو ۴ھ جلوس

رخ دوم

احمد
دین و جہاں
است
ح
روشن ز فتح حیدر ضرب نگر

سال ولو ۱۲۰۰ھ ہجر

(۸) حیدری ۔ نقش دوم ۔
دار الضرب ۔ کلیکوٹ ۔

سنین - ۱۲۱۵ھ مولودی - سال شاد (۴۱ھ) - ۱ھ جلوس

رخ اول

ہو

السلطان

حیدر

الواثق بست و چہارم احمد

رخ دوم

احمد

دین درجہاں

است

روشن زفتح حیدر ضرب کلیکوٹ

سال شاد ۱۲۱۵ھ

سال شاد ۱ھ جلوس

(۹) حیدری - نقش سوم -

دار الضرب - پٹن -

سنین

۱۲۱۶ھ مولودی سال سارا (۴۲ھ) ۲ھ جلوس

۱۲۱۷ھ مولودی سال سراب (۴۳ھ) ۳ھ جلوس

۱۲۱۸ھ مولودی سال شتا (۴۴ھ) ۴ھ جلوس

۱۲۱۹ھ مولودی سال زبرجد (۴۵ھ) ۵ھ جلوس

رخ اول

ہو

السلطان الواثق

حیدر

العادل تاریخ جلوس سال سنج

سیوم بہاری ۶ھ جلو

رخ دوم

محمد

احمد

دین درجہاں

است

روشن زفتح حیدر حیدر ضرب

پٹن سال سارا ۱۲۱۶ھ

(۱۰) امامی ۔ روپیہ ۔ وزن ۴، اگرین
دار الضرب ۔ پٹن ۔
سنین ۔ سنہ ۱۲۰۰ ہجری
رخ اول و دوم مانند نمبر (۷)

(۱۱) امامی ۔ نقش دوم ۔
دار الضرب ۔ پٹن ۔ خورشید سواد ۔
سنہ ۱۲۱۶ مولودی سال سارا ۔ (سنہ ۴۲) ۔ سنہ ۶ جلوس
سنہ ۱۲۱۷ " سال سراب ۔ (سنہ ۴۳) ۔ سنہ ۷ "
سنہ ۱۲۱۸ " سال شتا ۔ (سنہ ۴۴) ۔ سنہ ۸ "
سنہ ۱۲۱۹ " سال زبرجد ۔ (سنہ ۴۵) ۔ سنہ ۹ "
سنہ ۱۲۲۱ " سال سخر ۔ (سنہ ۴۶) ۔ سنہ ۱۰ "
سنہ ۱۲۲۳ " سال شاد ۔ (سنہ ۴۷) ۔ سنہ ۱۳ "
رخ اول و دوم مانند نمبر (۹)
دار الضرب خورشید سواد کے سکہ کا رخ دوم اسطرح ہے ۔

محمد
احمد
دین و جہان
است
ح
روشن ز فتح حیدر ا ما ضرب
مے
شید سواد سال سراب
خور سنہ ۱۲۱۷

(۱۲) عابدی ۔ نصف روپیہ ۔ آٹھ آنہ ۔ وزن ۔ ۱۸۰ گرین ۔

دارالضرب ۔ پٹن ۔

سنین ۵۱۲۱ھ مولودی ۔ سال شنا (۴۱ھ) ۵ھ جلوس

۶۱۲۱ھ ″ سال سارا (۴۲ھ) ۶ھ ″

۷۱۲۱ھ ″ سال سراب (۴۳ھ) ۷ھ ″

۸۱۲۱ھ ″ سال شتا (۴۴ھ) ۸ھ ″

۹۱۲۱ھ ″ سال زرجد (۴۵ھ) ۹ھ ″

۱۲۲۱ھ ″ سال سنخ (۴۸ھ) ۱۲ھ ″

رخ اوّل	رخ دوم
ہوالو	محمد
السلطان	دین احمد
حید	دہجہان
تاریخ سال سنخ	است
العادل جلوس سے	ح
سیوم بہاری ۵ھ	روشن زفتح حید رعابد ضرب پٹن سال شنا ۵۱۲۱ھ

(۱۳) باقری ۔ چہار آنہ ۔ ۴۱ ۔ گرین ۔

دارالضرب ۔ پٹن ۔

سنین ۔ ۶۱۲۱ھ ۔ ۷۱۲۱ھ ۔ ۸۱۲۱ھ ۔ ۱۲۲۱ھ ۔ ۲۲۲۱ھ ۔ ۴۲۲۱ھ

رخ اوّل	رخ دوم

محمد
ہوالسلطان
حید
الوالعادل ۱۲۲۱ھ

سنہ
باقر
ح پٹن

(۱۴) جعفری ۔ دو آنہ ۔ ۱۹ ۔ گرین ۔
دارالضرب ۔ پٹن ۔
سنین ۔ ۱۲۲۱ھ ۔ ۲۲۲۱ھ ۔ ۳۲۲۱ھ ۔ ۵۳۲۱ھ ۔

رخ اوّل
۱۲۲۱ھ محمد
ب
ضرب پٹن

رخ دوم
جعفر
سنہ ۱۱ جلوس

(۱۵) کاظمی ۔ ایک آنہ ۔ وزن ۱۰ر گرین ۔
دارالضرب ۔ پٹن ۔
سنین ۔ ۱۲۲۱ھ ۔ ۳۲۲۱ھ ۔ ۴۲۲۱ھ ۔ ۵۲۲۱ھ ۔

رخ اول
مانند نمبر ۱۴

رخ دوم
کاظمی
سنہ ۱۱ جلوس

(۱۶) خضری ۔ نیم آنہ ۔ وزن ۵ ۔ گرین ۔
دارالضرب ۔ دارالسلطنت
سنین ۔ ۲۲۲۱ھ ۔

رخ اوّل
السلطنت
دارالضرب

رخ دوم
۲۱
خضر

تانبے کے سکّے

ٹیپو سلطان کے تانبے کے سکے نقوش کے اعتبار سے دو قسم کے ہیں۔

(۱) وہ سکے جو ۱۲۲۳ھ مولودی سے پہلے مضروب ہوئے ہیں۔

(۲) وہ سکے جن کو سلطان نے اپنی حکومت کے اخیر چار سال میں ۱۲۲۴ھ مولودی سے ۱۲۲۷ھ تک مضروب کرائے ہیں۔

قسم اوّل میں وہ سکے شامل ہیں۔ جن پر ۱۱۹۷ھ سے ۱۲۰۰ھ تک سال ہجری اور ۱۲۱۵ھ سے ۱۲۲۳ھ تک سال مولودی ثبت ہے۔ ان سکّوں پر ایک جانب ہاتھی کی مورت بنی ہوئی ہے۔ اوسکے اوپر تاریخ۔ دوسری جانب سکہ کا نام اور مقام ضرب کندہ ہے۔ چنانچہ ذیل میں دو ڈبل پیسوں کے رخ دوم بطور نمونہ درج ہیں۔

عثمانی ٹپن
ضرب
دارالسلطنت

مشتری ٹپن
ضرب
دارالسلطنت

دوسرے قسم کے سکّوں پر جو سال مولودی کے ۱۲۲۴ھ۔ ۱۲۲۵ھ۔ ۱۲۲۶ھ و ۱۲۲۷ھ میں مضروب ہوئے ہیں ایک جانب ہاتھی کی مورت۔ اور اوسکے اوپر علی الترتیب ا یا ب یا ت یاث نقش ہے دوسری جانب سکہ کا نام اسکے نیچے ضرب کا مقام اور تاریخ مسکوک ہے۔

پہلے زمانہ میں دکن کے بعض ہندو حکمران خاندانوں نے اپنے لئے گج پتی کا لقب اختیار

کیا تھا جس کے معنی ہیں "ہاتھیوں کا مالک" لیکن بعد میں اسکے معنی اس قدر وسیع ہو گئے کہ عوام الناس ہر بڑے راجہ کو اس لقب سے موسوم کرنے لگے اور یہ لفظ راجہ اور مہاراجہ کا مترادف بن گیا۔

جنوب میں کرشنا کے نیچے کنگنی خاندان ایک مشہور حکمران خاندان گزرا ہے۔ یہ خاندان اوس علاقہ میں برسر حکومت تھا جہاں کے کوہستانوں میں کثرت سے ہاتھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے اس کا لقب "گج پتی" مشہور ہو گیا تھا۔ اور اس خاندان کے راجہ اپنے سکوں پر بطور علامت امتیاز کے ہاتھی مورت کندہ کرایا کرتے تھے۔ ٹیپو سلطان کی حکومت چونکہ اوسی علاقہ میں واقع تھی جہاں ہاتھی پیدا ہوتے ہیں اس لئے اس نے بھی کنگنی راجاؤں کی پیروی میں اپنے سکوں پر ہاتھی کی مورت نقش کرائی تھی۔

ٹیپو سلطان نے اپنے سکوں پر جو عبارتیں نقش کرائی ہیں اونمیں سے بعض خاص خاص جملوں کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

ہو السلطان العادل

ہو السلطان الوحید العادل

دین احمد در جہان روشن ز فتح حیدرست

تاریخ جلوس سال سنح سیوم بہاری

سونے چاندی اور نیز تانبے کے اکثر سکوں پر عبارت کے وسط میں "ح" کندہ ہے۔ اس سے سلطان کے والد امیر حیدر علیخاں کی جانب اشارہ ہے۔

کتابیات

(BIBLIOGRAPHY)

E. MOOR, Narrative of the Operations of Captain Little's

Detachment,

W. MARSDEN, Numismata Orientalia, London, 1825.

H. P. HAWKES, Brief Sketch of the Gold, Silver and Copper Coinage of Mysore, Banglore, 1856.

E. THURSTON, Catalogue of Mysore Coins in the Government Museum Madras.

R. A. TUFNELL, Catalogue of the Coins of Mysore in the Government Museum Banglore, 1889.

R. P. JACKSON, Coin-Collecting in Mysore, London 1910.

G. P. TAYLOR, the Coins of Tipu Sultan, Oxford, 1914.

E. HENDERSON, The Coins of Haidar ali and Tipu Sultan, Madras 1920.

رخصتِ شباب

از جناب محمد حبیب اللہ صاحب رشدی ایم۔اے۔ عثمانیہ

کھیل رہی تھی زندگی تری طفولیت میں کیا
عالمِ آب و گل ترا جلوۂ برق تاب تھا

تیرا تخیل آفریں خواب بہت طویل تھا
طائرِ گلشنِ ارم خوب ہی تو اڑا کیا

دستِ شباب نے ترے کاٹ دی جو بال و پر
تڑپا کیا بہت مگر ضبط سے صبر آگیا

بیکسیٔ حیات میں عشق نے لی خبر تری
نے کی صدائے مست نے حکمِ قضا سنا دیا

حسن کی سبز چاندنی سایہ تھی اک رخِ جب کا
باغِ ارم کو چھوڑ کر باغِ جہاں بھی خوب تھا

منزلِ عشق طے ہوئی ختم ترا شباب ہے
عقل کا عہدِ دور بیں تجھکو ہے اب بلا رہا

سر سے اُتار شاہِ عشق اب تو یہ تاجِ گوہریں
بندۂ خاکسار بن، چھوڑ دے تختِ مرمریں

طلسمی دروازہ[1]

(افسانہ)

از

مولوی احمد عارف صاحب

ڈینس ڈی بولیو کی عمر ابھی بیس یا بائیس سال سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ اپنے آپ کو معمر آدمیوں میں شمار کرنے کے علاوہ ایک پکا سوار بھی سمجھنے لگا تھا۔ اس وحشت آفرین زمانۂ جنگ میں نوعمر لڑکے عموماً اپنے وقت سے پہلے تربیت پانے لگے تھے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی برخوردار کسی گھمسان لڑائی میں شریک ہو کر اور دس پانچ دھاوے کر کے کسی آدمی کو قتل کر دیں اور رزم و بزم کی دو چار چالوں سے واقفیت پیدا کرنے کے بعد اکڑ اکڑ کر چلنے لگیں تو یہ بات ان کے لئے قطعاً قابل معافی ہے۔ ڈینس نے اپنے گھوڑے کو احتیاط سے تھان پر باندھ دیا۔ اور نہایت اطمینان سے رات کا کھانا زہر مار کیا اور خوشی خوشی شام کے جھٹپٹے میں، کسی سے ملاقات کرنے کی غرض سے چل کھڑا ہوا۔ نوجوان کے حق میں یہ حرکت کچھ عقلمندی پر مبنی نہ تھی۔ اسکے لئے یہی بہتر تھا کہ وہ یا تو آگ تاپتا یا مزے کی نیند سو جاتا۔ کیونکہ تمام شہر انگلستان اور برگنڈی کی فوجوں سے بھرپور تھا۔ اگرچہ ڈینس کے پاس اجازت نامہ موجود تھا لیکن وہ ایسے خطرہ میں کچھ کام نہیں آسکتا تھا

---

[1] یہ ابرٹ لوئی اسٹیونسن کے ایک افسانے "سر ڈی میلٹ وائٹ" کا ملخص ترجمہ ہے۔

ستمبر ۱۴۲۹ء کا زمانہ تھا اور موسم اپنے شباب پر، سائیں سائیں کرنی والی پُرزور ہوا قطراتِ آب سے لدی ہوئی تمام شہر میں اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھی اور درختوں کے پڑے جھڑے پتے گلیوں میں اپنے پریشان رقص کا تماشا دکھاتے تھے۔ کہیں کہیں ایک آدھ کھڑکی بھی روشنی سے معمور نظر آتی تھی کھانا کھانے والے فوجیوں کی خوش مذاقیوں کی آوازیں رہ رہ کر آتیں اور دوش ہوا پر سوار غائب ہو جاتیں۔ اب رات تیزی سے غالب آنے لگی اور تیراک بادلوں کے مقابلہ میں مینار کی چوٹی پر لہرانے والے انگلستان کا جھنڈا لحظہ بہ لحظہ مدھم ہونے لگا۔ اسکی حیثیت ایک سیاہ نشان سے زیادہ نہ تھی جیسے کوئی ابابیل پرشور اور منتشر بادلوں سے بھرے ہوئے آسمان کے نیچے اڑ رہی ہو۔ رات چھاگئی تو شہر کے نیچے وادی میں درختوں کے جھنڈوں پر ہوا کے چیخ پکار اور شور و غل کا نظارہ دیدنی تھا۔

ڈینس ڈی بولیو نے جلد پہنچکر آخر اپنے دوست کا دروازہ کھٹکھٹا ہی دیا۔ اگرچہ اس نے تھوڑی دیر ٹھہر کر جلد لوٹنے کا تہیہ کیا تھا لیکن اس کے خوشگوار خیر مقدم نے اسے بڑی دیر تک ٹھہر جانے پر مجبور کیا اور جب بالآخر وہ خدا حافظ کہہ کے چلنے لگا ہے تو آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ اس عرصہ میں ہوا تھم گئی تھی اور رات کی سیاہی قبر کی تاریکی کو مات کر رہی تھی۔ نہ تو کوئی تارا ہی چمکتا تھا اور نہ شامیانۂ ابر سے کوئی شعاعِ قمر ہی جھلکتی نظر آتی تھی۔ ڈینس شیٹیو لیان ڈن کی پرپیچ گلیوں سے بہت کم واقف تھا۔ دن کے وقت ہی اسکو اپنا راستہ تلاش کرنے میں دقت واقع ہوتی تھی، اور اب اس بھیانک تاریکی میں بالکل بھٹک گیا۔ البتہ اسکو ایک چیز یاد تھی اور وہ پہاڑی پر چڑھنا تھا، کیونکہ اس کے دوست کا مکان شیٹیو لیان ڈن کی انتہا میں واقع ہوا تھا تو اسکی ابتداء میں بڑی گرجا کے مینار کے نیچے سرائے۔ غرض اس علامت کے بل بوتے پر وہ کبھی تو کھلے مقام پر اطمینان کا سانس لیتا ہوا اور کبھی تنگ و تاریک مقامات میں دیواروں کو ٹٹول ٹٹول کر ٹھوکریں کھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک نامعلوم شہر میں کسی کا انتہائی اندھیرے کے نرغہ میں گھر جانا، سچ یہ ہے کہ عجیب پریشان کن اور پُراسرار مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ رات کا سکون و سناٹا اپنی ممکنہ قوتوں سے ڈرا رہا تھا۔ جب ٹٹولنے والے ہاتھ کسی کھڑکی کی نہایت سرد سیخوں سے مس کرتے تو وہ اسیطرح چمک جاتا جیسے اس نے کسی مینڈک کو چھو لیا ہے۔ زمین کی غیر معمولی ناہمواری سے اس کا کلیجہ منہ کو آرہا تھا۔ اس ہیبت ناک تاریکی نے اسکے دل میں

شبخوں یا راستہ میں حائل ہونے والے گہرے غار کا خوف پیدا کر دیا تھا۔ جہاں کہیں فضا کچھ صاف تھی تو مکانات مہیب اور نہایت عجیب حالتیں نظر آتے تھے گویا وہ اسکو اپنے اصلی راستے سے دور کر رہے ہیں اور ڈینس کے لئے جسے فطرت بچائے ہوئے اپنی سرائے کا پتہ لگانا تھا، راستہ کی تکلیف کے ساتھ ساتھ حقیقی خطرہ بھی تھا، اس لئے وہ ہر موڑ پر ٹھہر ٹھہر کر دیکھتا بھالتا بڑی جرأت و احتیاط کے ساتھ چلنے لگا۔

وہ کچھ عرصہ تک ایک تنگ گلی میں جہاں وہ دونوں طرف ہاتھ سے دیوار کو چھو سکتا تھا، آہستہ آہستہ چلتا رہا اور آگے جانے کے بعد وہ گلی کشادہ اور ڈھلوان ہوگئی۔ ظاہر تھا کہ یہ راستہ اسکی سرائے کا نہ تھا، لیکن کسی قدر زیادہ روشنی کی اُمید نے اسے آگے کیطرف جانچ پڑتال کرنے کی ترغیب دی۔ سرپتہ گلی ایک بالاخانہ کے برآمدہ کے پاس ختم ہوگئی تھی، اور اونچے مکانات کے درمیان سے اور ٹوٹی ہوئی فصیل کے باہر کئی سو فیٹ گہری اور تنگ و تاریک وادی نظر آتی تھی۔ ڈینس نے جھانک کر دیکھا تو اسے ہوا سے ہلتے ہوئے درخت اور کچھ روشنی نظر آئی جہاں ایک پشتہ سے آگے دریا کا پانی لہریں مارتا بہا جا رہا تھا۔ اب جو ہوا تھم کر کسیقدر آسمان روشن ہوا تو مہیب بادلوں اور سیاہ پہاڑیوں کے خاکے نمایاں ہوگئے۔ اس غیر متوقع دھندلکے میں اسے اپنی بائیں جانب ایک مکان نظر آیا جو غیر معمولی شان و شوکت کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ آستانہ برجوں اور کلسوں کے کئی بام ہائے بلند سے مزین تھا۔ گرجا گول محراب اپنے کناروں کے محفوظ پشت کے ساتھ نمایاں طور پر اصل مکان سے باہر کی طرف نکل آیا تھا۔ اگر ایک طرف گرجا کے دریچوں کے پیچ پردوں میں سے بیشمار موم بتیوں کی روشنی جگمگا رہی تھی تو دوسری طرف باہر سے مکان کے در و دیوار اور چھت رات کی گہری تاریکی میں غرق ہو گئے تھے صاف معلوم ہوتا تھا کہ قرب و جوار کے کسی بڑے خاندان کا یہ ایک ہوٹل ہے۔ اس عمارت نے ڈینس کو اپنے بورجز والے خاص مکان کی یاد دلادی تو وہ کھڑے ہو کر اس کو بغور دیکھنے لگا اور ذہن ہی ذہن میں صنعت عمارت کے کمال کا جائزہ لیکر ان میں رہنے والے دو خاندانوں کے بارے میں بھی خیال آرائی کرنے لگا۔

اب اسے کوئی راستہ سوائے اس کے جہاں سے وہ آیا تھا، نظر نہیں آتا تھا۔ وہ صرف الٹے پاؤں واپس ہو سکتا تھا لیکن اپنے مقام کے متعلق کچھ علامتیں اسنے حاصل کر لی تھیں اور اس ذریعہ سے

شاہراہ عام پر پہنچکر بہت جلد اپنی سرائے کو دوبارہ پا جانے کی اُمید اسے بندھ گئی تھی۔ وہ اس بات کا خیال کر رہا تھا لیکن اُن حادثات کا اس کو علم نہیں تھا جو آج کی یادگار رات کو اسے مبتلائے مصیبت کر کے زندگی بھر کی دُوسری تمام راتوں سے ممیز کرنے والے تھے۔ زور زور سے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں گلی میں گونجتی ہوئی اس نے سنیں۔ یہ ایک مسلح فوجی دستہ تھا جو مشعلوں کے ساتھ رات کی گشت میں مصروف تھا۔ ڈینس کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ لوگ شراب پیکر خوب سرشار ہیں اس لئے ان سے اجازت نامہ کی دیکھ بھال یا مردانہ آداب جنگ کی کوئی توقع نہیں کیجا سکتی۔ اور اُن سے یہ بعید بھی نہیں کہ وہ ڈینس کو کُتّے کیطرح مار کر پھینک دیں۔ الغرض یہ منظر ڈینس کے لئے بدحواس کرنے کے علاوہ حوصلہ شکن بھی تھا۔ ڈینس نے اُلٹے پاؤں واپس ہونے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا پاؤں ایک پتھر سے ٹپٹا اور وہ دھڑام سے چیختا ہوا دیوار پر جا گرا۔ فرانسیسی اور انگریزی زبان میں "کون جا رہا ہے" کی دو تین آوازیں بلند ہوئیں۔ ڈینس نے اسکا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اور تیزی کے ساتھ گلی میں بھاگنے لگا۔ اور ایک مکان کے برآمدہ میں داخل ہوتے ہوئے اس نے رُک کر دیکھا کہ اُن لوگوں نے اپنی رفتار تیز کر دی ہے اور شور و غل کرتے ہتیاروں کو بجاتے اور مشعلوں کی مدد سے اِدھر اُدھر گلی میں ڈھونڈتے ہوئے اُس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

ڈینس نے چوطرف ایک نظر ڈالنے کے بعد دہلیز کو بغور دیکھا۔ اس نے خیال کیا کہ یہی ایک ایسا مقام ہے جہاں اُن کی نظر نہیں پڑ سکتی یا اگر یہ نہو تو کم از کم مصالحت یا مدافعت کے لئے یہ مقام نہایت موزوں ہے۔ یہ خیال کر کے اسی نے تلوار کھینچ لی اور اپنی پشت کو دروازہ سے چسپاں کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دروازہ اس کے وزن سے پیچھے کی طرف کھلنے لگا۔ اگرچہ ڈینس فوراً ہی پلٹ کر کھڑا ہو گیا لیکن دروازہ اسیطرح قلابوں کی آواز کے بغیر آہستہ آہستہ کھلتا رہا، یہانتک کہ وہ پوری طرح کھل کر ٹھہر گیا جس کے اندر سوائے تاریکی کے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ جب کسی شخص کو اتفاقی حادثہ میں کوئی عجیب بات پیش آتی ہے تو بجائے اسکے کہ وہ کیسے" اور "کیوں" کے سوالات سے اس گورکھ دھندے کو سلجھائے، اپنی ذاتی سہولت کو سب سے پہلے پیش نظر رکھتا ہے۔ ڈینس نے بھی یہی کیا یعنی وہ فوراً دروازہ کے اندر داخل ہو گیا اور اپنی پناہ گاہ کو زیادہ محفوظ بنانے کی خاطر کیقدر اُسنے دروازہ کو بھیڑنے کے لئے

ہاتھ ہی لگایا تھا کہ وہ پوری طرح بند ہوگیا۔ شاید کسی نامعلوم سبب سے یا اسکی انگلیوں سے کسی اسپرنگ کے چھو جانے کی بناء پر دروازہ کے وزنی پٹ ایک ہیبت ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ خود بخود بند ہوگئے۔

اس عرصہ میں یہ فوجی دستہ گشت کرتا ہوا برآمدہ میں آگیا اور چھپنے والے پر آوازے کستے اور گالی گلوچ دیتے ہوئے بلانے کی کوشش کی۔ اور ایک مرتبہ تو اُن لوگوں نے اپنے نیزے کی نوکوں کو اس دروازہ کی سطح پر گھمایا جس کے پیچھے ڈینس کھڑا ہوا تھا۔ لیکن وہ ایسے سُرور میں تھے کہ انھیں زیادہ دیکھ بھال یا توقف کی فرصت نہ تھی۔ چنانچہ ایک پیچیدہ راستہ سے جسے ڈینس نے نہیں دیکھا تھا، وہ گزرتے ہوئے نظروں سے اوجھل گئے۔

اب ڈینس کی جان میں جان آئی۔ اس مصیبت سے نجات پانے پر اسنے خدا کا شکر ادا کیا اُسکے بعد دروازہ کھولنے کی کوشش میں وہ اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا۔ لیکن دروازہ کی اندرونی سطح بالکل صاف تھی، نہ تو دستہ ہی تھا اور نہ کسی قسم کا کوئی ابھار۔ اس نے اپنی انگلیوں کے ناخنوں کو دروازہ کے کنارہ پر رکھکر اسکو کھینچنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس نے اس کو ہلایا لیکن وہ چٹان سے زیادہ مضبوط تھا۔ ڈینس نے غصہ سے تیوری چڑھائی اور غبار دل ایک بے آواز سیٹی کی شکل میں باہر نکلنے لگا۔ دروازہ کو یہ کیا روگ لگ گیا؟ وہ حیران تھا کہ آخر یہ پہلے کس طرح کھلا؟ اسکے اندر داخل ہوتے ہی نہایت آسانی کے ساتھ قفلی طور پر وہ کیسے بند ہوگیا؟ یہ کوئی راز تھا یا فریب، اس نوجوان کی فہم سے بالاتر۔ وہ ایک پھندا نظر آنے لگا، مگر ایسی گلی میں اور ایسے عالیشان مکان کے برآمدہ میں اسکا کسی کو گمان نہیں ہوسکتا۔ بہرحال پھندا ہو یا نہ ہو ارادہ کے ساتھ یا غیر ارادی طور پر ڈینس نہایت خوبی کے ساتھ دام میں گرفتار تھا۔ اور کوئی صورت اسے باہر آنے کی نظر نہیں آتی تھی۔ اب تاریکی اسے دوبھر معلوم ہونے لگی۔ اس نے چوطرف اپنے کان لگا دئے۔ باہر بالکل سکوت تھا لیکن اندر قریب ہی ایک کمزور سسکی، ایک آہِ ناتواں اسکے کانوں سے ٹکرائی۔ لیکن جب اس نے ایک پوشیدہ درز سے دیکھا کہ کچھ آدمی بالکل ساکت و صامت نہایت ہوشیاری سے آواز تنفس کو تک روکے کھڑے ہیں تو اسکے احساسات کو صدمہ پہنچا۔ اور ساتھ ہی وہ اپنی جان بچانے کے لئے آمادہ ہوگیا پھر یکایک اس نے مکان کے اندرونی حصہ میں کچھ فاصلہ پر ایک روشنی دیکھی کہ ایک سیدھا تار شعاع جو بند دروازہ

زمین کی طرف پھیلتا جاتا تھا، ایک دروازہ کے قطع شدہ پردہ میں سے گزر رہا ہے۔ ڈینس کی نظر میں سوائے رہائی کے خیال کے کوئی اور بات نہ تھی۔ وہ اگرچہ زمین پر کھڑا ہوا تھا لیکن اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دلدل میں پھنسا ہوا ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ وہ زمین کو گھور رہا تھا اور اپنے ماحول سے قائم ہونے والے منطقی استدلالات کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر چند سیڑھیاں نمایاں ہوئیں جو روشن دروازہ کی طرف رہنمائی کرتی تھیں۔ غور کرتے کرتے اس نے ایک نہایت دھیمی سوئی کیطرح کی ایک دوسری روشنی کا گمان کیا جو پالش کردہ لکڑی کی کنگر پر سے بخوبی منعکس ہو رہی تھی۔ پھر جب اس نے اپنی تنہائی کا خیال کیا تو اسکا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا اور ایک ناقابل برداشت خواہش کسی نہ کسی حرکت کے کرنے کی اسکی روح میں سما گئی۔ اس نے خیال کیا کہ وہ اب کسی بڑے خطرہ میں مبتلا ہے۔ قدرتاً اُسے سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ وہ سیڑھیوں پر چڑھ جائے پردہ اٹھائے اور فوراً اپنی مصیبت سے دوچار ہو۔ وہ جو کچھ محسوس کر رہا تھا، اسکا ساتھ دینا اسے لازمی تھا۔ اب وہ زیادہ دیر تک تاریکی میں نہیں رہ سکتا تھا۔ بالآخر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دئے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ اسکا پاؤں سب سے پہلی سیڑھی سے ٹکرایا۔ اسکے بعد وہ جلدی جلدی سیڑھیوں پر چڑھا اور کچھ دیر اپنے حواس درست کرکے پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہوگیا۔

اب اس نے آپ کو ایک وسیع کمرہ میں پایا جو چکدار پتھر کے فرش سے مزین تھا۔ اسکے تینوں جانب تین دروازے تھے جن پر ریشمی گلکاری کے پردے پڑے تھے۔ چوتھی جانب دو بڑے دریچے اور ایک پتھر کا بنا ہوا دودکش تھا جن پر سیلیٹ رائمٹس کے خاندان کی فوجی نشانیاں کندہ تھیں۔ ڈینس نے اسکی شناخت کرکے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ نہایت شریف ہاتھوں میں گرفتار ہے روشنی سے تمام کمرہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا، لیکن اسمیں سوائے ایک وزنی میز اور چار کرسیوں کے فرنیچر بالکل نہ تھا اور انگیٹھی نے تو آگ کی شکل ہی نہ دیکھی تھی اور مختصر سا پرال زمین پر بچھا ہوا تھا۔ جسے بچھے ہوئے بھی عرصہ گزر گیا تھا۔

جیسے ہی ڈینس اندر داخل ہوا اپنے روبرو اور دودکش کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو سموری قبا پہنے ہوئے ایک اونچی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔ وہ پاؤں پر پاؤں ڈالے اور ہاتھ سے ہاتھ جوڑے ہوئے تھا اور اسکے قریب ہی دیوار سے پیوستہ ایک تپائی پر انگوری شراب کا ایک جام بلورین رکھا تھا

اسکے چہرہ پر مردانگی کے بڑے گہرے آثار نمایاں تھے۔ پوری طرح مردانگی نہیں بلکہ اسمیں بیل، بھیڑ، اور سور کی سی مردانگی کے آثار کی آمیزش تھی۔ کچھ مذبذب، کچھ خوشامدانہ، کچھ لالچ بھری، کچھ وحشیانہ اور کچھ خطرناک، اوپر کا ہونٹ اسطرح پھولا ہوا تھا جیسے دانت کے درد یا گھونسے کی زد سے سوج گیا ہو۔ چھوٹی روشن آنکھیں چوٹی دار ابرو اور تبسم اپنی صورت وہئیت میں عجب مضحکہ انگیز خباثت کا اظہار کرتے تھے۔ مقدس لوگوں کی طرح اس کے وضعدار بال سر کے اطراف سے لٹک کر ایک ہی گھونگر کے ساتھ اسکے گلوبند پر آگرے تھے۔ اسکی داڑھی اور مونچھیں دلفریب تقدس کے گلابی رنگ میں رنگین تھیں۔ ملٹ رائٹس کی عمر نے انتہائی حزم و احتیاط کی وجہ سے اسکے ہاتھ پر ضعیفی کا کوئی اثر نہیں چھوڑا تھا۔ اسی لئے وہ اپنی خوبی میں شہرتِ خاص رکھتے تھے۔ اور ان نازک اور گداز ہاتھوں کو دیکھنے کے بعد کسی بات کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اسکی انگلیاں گویا موم بتیاں تھیں جنھیں کسی نازنین کی ہوس انگیز انگلیوں سے مشابہ سمجھئے۔ انگوٹھے کا سرا دوسری انگلی سے ملجانے کی وجہ سے ہاتھ سوجا ہوا نظر آتا تھا، اور از حد سفید ناخن بڑی خوبی سے تراشے گئے تھے۔ یہ کس درجہ دہشتناک بات تھی کہ اس قسم کے ہاتھوں والا آدمی بڑی پاک طینتی کے ساتھ مقدس ولی کی طرح ان ہاتھوں کو اپنی گود میں جوڑے رکھے۔ اس طرح کا آدمی جس کے چہرے پر دلوں میں غیر معمولی ہیبت پیدا کرنے والے آثار نمایاں ہوں، بڑے صبر و تحمل کے ساتھ چپ چاپ ٹکٹکی باندھے بیٹھا کسی کو دیکھ رہا ہو۔ گویا وہ ایک دیوتا ہے یا اس کا مجسمہ۔ اس کی نگاہوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ، طنز اور فریب سے خالی نہیں۔

یہ تھا حلیہ امین سر ڈی میلٹ رائٹ کا۔

یہ دونوں ایک دوسرے کو دو چار سکنڈ تک خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے، پھر سر ڈی میلٹ رائٹ نے کہا اندر تشریف لائیے۔ میں شام ہی سے آپ کے انتظار میں ہوں"۔

وہ اٹھا تو نہیں لیکن ادائے الفاظ کے ساتھ اسکے چہرہ پر مسکراہٹ نمودار تھی اور ساتھ ہی خلق و مروت سے معمور ایک ہلکی سی جنبش سر۔ کچھ تو تبسم کی وجہ سے اور کچھ اسکی عجیب آواز کے اثر سے ڈینس کے تن بدن میں نفرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اور محض اسی انتشار میں جواب کے لئے اُسے الفاظ مشکل مل سکے۔ اس نے کہا۔

جناب عالی! مجھے اس حادثہ میں خود ایک حادثہ نظر آرہا ہے۔ میں وہ شخص نہیں ہوں جسے آپ سمجھ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی سے ملنے کے مشتاق تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنی مرضی کے خلاف اس دخل در معقولات کا سبب ہوگیا ہوں جو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔"

"خیر، خیر اب تو آپ یہاں موجود ہیں۔ عزیز من آپ تشریف رکھئے، پورے اطمینان اور بے تکلفی کے ساتھ ہم اپنی باتوں کو ابھی طے کرینگے۔"

بڈھے نے بڑی بے پروائی سے یہ جواب دیا تو ڈینس کو یقین ہوا کہ غلط فہمی کی وجہ سے بات ابھی تک الجھن میں ہے۔ اسلئے اس نے بعجلت اپنے سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

"آپ کا دروازہ ....."

"میرے دروازہ کے متعلق؟ ..... وہ ہماری ہوشیاری کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے ایک مہمان نواز خیال آرائی ہے۔ جیسا کہ آپ کا بیان ہے آپ مجھ سے ملاقات کرنے کے خواہشمند نہ تھے۔ ہم جیسے بوڑھے مجبور مہمانوں کے آرزومند رہتے ہیں لیکن جب ان کی تشریف آوری ہماری عزت کو صدمہ پہنچاتی ہے تو ہم اس پر غالب آنے کی کوشش میں ہاتھ پیر مارنے لگتے ہیں۔ آپکی تشریف آوری بغیر دعوت کے ہوی لیکن میری جانب سے اپنی خوشآمدید کا یقین کیجئے۔"

"ڈینس نے کہا" مولانا! آپ اپنی غلطی پر اصرار کئے جارہے ہیں۔ آپ کے اور میرے درمیان تو کوئی سوال اٹھ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ میں اس ملک میں بالکل اجنبی ہوں۔ میرا نام ڈینس ڈی بولیو ہے۔ اگر آپ مجھے اسوقت اپنے مکان میں دیکھ رہے ہیں تو یہ صرف ....."

بڈھے نے قطع کلام کرکے ہنستے ہوئے کہا "میرے نوجوان دوست! مجھے امید ہے کہ آپ اس بحث پر مجھے اپنے خاص خیالات کے اظہار کی اجازت دینگے۔ غالباً وہ اس وقت آپ کے خیالات سے بالکل مختلف ہوں گے۔ لیکن وقت پر معلوم ہو جائیگا کہ ہم دونوں میں کون درست ہے۔"

ڈینس کو اب بالکل یقین ہوگیا کہ اسے ایک دیوانہ سے پالا پڑا ہے۔ وہ اپنے کو سکڑائے ہوئے

نتیجہ کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسطرح کچھ وقفہ گزرا، اور اس عرصہ میں اپنے سامنے پس پردہ آہستہ آہستہ پریشان آوازیں اس نے سنیں جیسے کوئی مصروف دعا ہو۔ کبھی ایک آدمی کا گمان ہوتا تھا تو کبھی دو کا۔ آواز کی شدت سے اضطراب اور روحانی تکلیف کا پتہ چلتا تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ یہ مقام جس کے دروازہ پر گلکار پردہ پڑا ہوا تھا۔ دراصل گرجا تھا جو اسے باہر سے نظر آیا تھا۔

اس عرصہ میں بڑے حضرت مسکراہٹ کے ساتھ ڈینس کو سر سے پیر تک دیکھتے رہے اور وقتاً فوقتاً اس انداز سے ہنکارے بھرتے رہے جیسے ایک بڑے اطمینان کا اظہار فرما رہے ہیں۔ ڈینس نے دیکھا کہ اب واقعہ کوئی اور ہی رنگ لا رہا ہے اسلئے بطور اختتام حجت بڑی سنجیدگی سے وہ یوں گویا ہوا "پانی اب سر سے اونچا ہوگیا"

بڈھے پر اب ہنسی کا عالم طاری ہوگیا۔ اگرچہ اسکی یہ ہنسی بہت رکی اور دبی ہوئی تھی مگر اسقدر سخت اور طویل تھی کہ اس کے اثر سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ڈینس فوراً کھڑا ہوگیا اور بڑی طنز کے ساتھ ٹوپی پہن کر کہنے لگا۔

"مولانا! اگر آپ اپنے حواس میں ہیں تو سنئے، آپ نے میری دل آزاری میں کوئی تسمہ نگا نہیں رکھا، یا آپ حواس باختہ ہیں تو ایسے پاگلوں کے ساتھ سر کھپانے کے بجائے میں اپنے لئے بہترین شغل تلاش کرسکتا ہوں۔ ابتدا ہی سے آپ نے مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش کی اور میری ایک نہ مانی۔ اب خدا کی خدائی میں کوئی طاقت نہیں جو تھوڑی دیر کے لئے بھی مجھے ٹھہرا سکے اگر میں کسی اچھے طریقہ سے اپنا راستہ نہیں پاسکوں گا تو اس تلوار سے دروازہ کے پرزے اڑا دونگا"

سر ڈی میلٹ رائٹ نے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا دیا اور انگلیوں سے ڈینس کیطرف اشارہ کرکے کہا "بیٹھ جاؤ، میرے پیارے بھتیجے"۔

ڈینس نے دہرایا "بھتیجا! تم جھوٹ بکتے ہو" یہ کہکر اس نے اپنا ہاتھ اسکے چہرہ سے لگا دیا۔

یکایک بڈھے نے ایک سخت آواز میں للکارا جیسے کوئی کتا بھونکتا ہو "بیٹھ جاؤ"

بدمعاش کہیں کے ۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جب میں نے دروازہ سے متعلق کوئی حکمت کی تھی تو اسکو اسی پر ختم کر دیا ؟ اگر اپنے ہاتھ پاؤں بیکار کرنے کو ترجیح دیتے ہو تو جاؤ باہر نکلنے کی کوشش کرو ۔ تمھیں ہڈی پسلی ٹوٹنے تک فرصت ہے ۔ اور اگر ایک نوجوان بچھیرے کی طرح آزاد رہنے کو پسند کرتے ہو تو امن سے اپنی جگہ بیٹھ کر ایک ضعیف آدمی سے مصروفِ گفتگو ہو جاؤ ۔ اللہ تمھاری مدد کرے ۔" ڈینس نے کہا "کیا آپ کے نزدیک میں قیدی ہوں ؟"

بڈھے نے جواب دیا "میں اصلیت کا اظہار کر چکا ۔ اب اس کا نتیجہ تم ہی پر چھوڑتا ہوں ۔"

ڈینس پھر بیٹھ گیا ۔ گو بظاہر وہ اب مطمئن نظر آتا تھا لیکن دل ہی دل میں کبھی غصہ سے آگ ہو جاتا تھا تو کبھی خوف سے بالکل سرد ۔ اپنی دانست میں وہ اب اپنے اس خیال کو باطل سمجھنے لگا تھا کہ ایک دیوانہ سے سابقہ پڑا ہے ۔ اگر ضعیف آدمی صحیح الدماغ تھا تو آخر وہ چاہتا کیا تھا ؟ کونسی پیچیدہ اور مصیبت ناک مہم درپیش تھی ؟

وہ ان ناخوشگوار خیالات میں گھرا ہی ہوا تھا کہ گرجا کے دروازہ کا پردہ اٹھا اور ایک طویل القامت پادری اپنا لباس پہنے سامنے آیا اور کچھ دیر تک ڈینس کو بغور دیکھنے کے بعد میلیٹ مارٹ سے آہستہ آہستہ کچھ باتیں کہیں ۔

بڈھے نے پوچھا "وہ اب کس حالت میں ہے"

پادری نے کہا "وہ تو راضی بہ رضا ہے ۔"

بڈھے نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "وہ تو ناراض ہے ، اللہ فضل کرے ایک قبول صورت لڑکا ۔ کوئی رذیل نہیں ۔ اور وہ بھی اسکا انتخاب کردہ ۔ آپ ہی فرمائیے ۔ وہ لونڈی اس سے بڑھ کر چاہتی کیا ہے ؟"

پادری نے کہا "نوجوان نازنین کے لئے یہ وقت مسمم ہونے کے علاوہ کس قدر حیا آزما بھی ہے ۔ اسکو ناچ کے وقت ہی اس کا لحاظ آنا چاہئے تھا ۔ اللہ بہتر جانتا ہے ، یہ میرا انتخاب کردہ تو ہے نہیں ۔ پھر وہ ڈینس سے مخاطب ہو کر پوچھا "کیا میں اپنی بھتیجی کو آپ کی خدمت میں

پیش کرسکتا ہوں ۔ وہ مجھ سے زیادہ بے صبری کے ساتھ آپ کا انتظار کرتی رہی ہے۔" ڈینس نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنا سر ہلاتے ہوئے اظہار رضامندی کیا اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ میلٹ رائٹ پادری کے ہاتھ کا سہارا لیکر اس کے ساتھ گرجا کے دروازہ کی طرف چلنے لگا۔ پادری نے پردہ کو ہٹایا اور تینوں اندر داخل ہوئے۔ قربانگاہ کے سامنے کے زینہ پر ایک دوشیزہ دلہنوں کے زرق برق پوشاک میں ملبوس سربسجدہ تھی۔ ڈینس نے جب اس کے لباس کو دیکھا تو اوس پر اوس پڑ گئی اور جب اس نے واقعات خلاف توقع دیکھے تو بڑی کشمکش میں مبتلا ہوگیا۔ سراسیمگی کے عالم میں وہ یہی کہتا رہا "ایسا نہیں ہوسکتا ۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔"

میلٹ رائٹ نے بڑی سریلی آواز میں کہا "بلانشی! میری پیاری بچی تمھاری ملاقات کے لئے میں ایک دوست کو بلا لایا ہوں ۔ پلٹو اور مصافحہ کے واسطے ہاتھ بڑھاؤ ۔ کوئی شک نہیں خدا پرست ہونا ایک نیکی ہے لیکن عزیز من با اخلاق ہونا اس سے زیادہ ضروری ہے۔"

دوشیزہ کھڑی ہوکر نووارد کی طرف پلٹی ۔ شرم اور ماندگی اس کے گدرائے ہوئے جسم کی رگ رگ سے ٹپکی پڑتی تھی ۔ وہ اپنے سر کو جھکائے فرش کی طرف دیکھتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی ۔ اس عرصہ میں اسکی نظر ڈینس کے پاؤں پر پڑی ۔ وہ ایک قیمتی اور نفیس جوتا پہنے ہوئے تھا۔ اسقدر نفیس کہ ایام سفر میں جاذب نظر ہونے کے علاوہ اس کے لئے باعث فخر بھی تھا ۔ وہ چلتے چلتے رکی جیسے اس زرد جوتے کے نظارے نے اسے بیدار کردیا ہے، اور ساتھ ہی اس نے پہننے والے کی صورت کو دیکھا ۔ آنکھیں چار ہوئیں شرم و حیا نظروں میں جھلک کر خوف سے تبدیل ہوگئی ۔ اور دونوں ہاتھوں میں اپنے چہرہ کو چھپاکر ایک دل ہلا دینے والی چیخ کے ساتھ وہ زمین پر گر پڑی ۔ وہ چلا اٹھی "یہ وہ شخص نہیں ہے، چچا جان، یہ وہ شخص نہیں" میلٹ رائٹ نے ایک خوش آئند لہجہ میں کہا "یقیناً نہ ہوگا ۔ مجھے اسی کی توقع تھی ۔ تمھیں اس شخص کا نام تک یاد نہیں۔"

لڑکی نے کہا "میں سچ کہتی ہوں ۔ اس شخص کو میں نے اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا ۔ اور نہ آگے دیکھوں گی" پھر ڈینس کی طرف پلٹ کر بولی "کیوں جناب، آپ ہی فرمائیے، کبھی میں نے آپ کو یا آپ نے

مجھے اس منحوس گھڑی سے پیشتر دیکھا ہے؟"

نوجوان نے کہا" اگر مجھسے پوچھتے ہو تو حضرت! یہ عزت مجھے کبھی حاصل نہیں ہوئی یہ پہلا وقت ہے کہ آپ کی بھتیجی صاحبہ کے دیدار سے مشرف ہوا ہوں"۔

بڈھے نے اپنے کندھوں کو سکڑائے ہوئے اور منہ بناتے ہوئے کہا" میں اسکو سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ پہلے مشرف نہ تھے تو اب ہو جاؤ۔ اپنی شادی سے پیشتر میں خود اپنی مرحومہ بیوی سے بہت کم واقف تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایسی اتفاقی شادیاں زندگی کی آئندہ کشمکش میں محبت و یکجہتی کے اکثر عمدہ نتائج پیدا کرتی ہیں اب اس امر کا لحاظ کر کے کہ دلہا کی رائے کو اس خصوص میں ایک اہمیت حاصل ہے شادی کی رسم شروع ہونے سے پیشتر اُسے دو گھنٹہ کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس آخری وقت میں غور کرلے یہ کہکر وہ پادری کے ساتھ دروازہ کی طرف پلٹا۔

لڑکی یکایک کھڑی ہو کر بولی" چچا جان، آپ کیوں اس قدر سرگرمی دکھا رہے ہیں۔ میں خدا کے سامنے بھی کہوں گی کہ ایسی جبریہ شادی سے میرے نزدیک خودکشی اچھی۔ ایسی شادیاں اللہ نے حرام کی ہیں۔ آپ اپنی داڑھی کو کیوں سیاہ کر رہے ہیں؟ چچا جان۔ للہ مجھپر رحم کرو۔ دنیا میں کوئی بھی عورت نہیں جو ایسی شادی کو موت پر ترجیح نہ دیتی ہو۔ کیا آپ مجھپر اعتماد نہیں کرتے؟ کیا آپ ابتک اسی خیال میں ہیں کہ یہ ــــــ غصہ اور حقارت کے لہجہ میں ڈینس کی طرف اشارہ کر کے" یہ وہی آدمی ہے" یہ کہتے کہتے وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

بڈھے نے دہلیز میں رُک کر کہا" میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ مجھے اسپر یقین ہے۔ لیکن بلانشی، اس بارے میں میں اپنے خیال کا اظہار کر دینا چاہتا ہوں۔ سنو، تم نے میرے خاندان کو ذلیل کیا اور میری اس شہرت و نام آوری کو خاک میں ملا دیا جنکو میں نے خواہ جنگ کا زمانہ ہو یا امن کا ساٹھ ستر برس کی مدت میں حاصل کیا تھا تم کتنی بڑی مجرم ہو کہ میرے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ میرے سامنے آتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی! اگر تمھارا باپ زندہ ہوتا تو تمھیں آخ کر دیتا۔ تمھیں گھر کے باہر کرتا۔ اس کا دل پتھر کا تھا۔ بیگم صاحبہ خدا کا شکر ادا کرو تم ایک رحم دل آدمی کے ہاتھ میں ہو۔ میرا وقت

یہ فرض ہے کہ تمھیں بلا تامل بیاہ دوں ۔ نیک نیتی کے ساتھ تمھارے لئے میں نے اسی کو فراہم کیا جو تمھارا منظور نظر ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوں ۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو خدا گواہ ہے کہ مجھے اسکی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں ۔ ایسی صورت میں میں تم سے سفارش کرتا ہوں کہ ہماری نوجوان سے حسن اخلاق کا برتاؤ کرو ۔ میری رائے میں تمھارا دوسرا دولہا ننانوے اس شخص سے زیادہ خوبصورت نہ ہو" ۔ یہ کہکر وہ پادری کے ساتھ باہر نکل گیا ۔ صرف دولہا دلہن پردہ کے اندر رہ گئے ۔

نازنین ڈونیس کی طرف پلٹی اور خشم گیں نگاہوں سے دیکھکر بولی "کیوں جناب آخر ان خرافات کا کیا مطلب ہے ؟"

اللہ بہتر جانتا ہے ۔ اس مکان میں جو صرف پاگلوں سے آباد ہے، میں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا ہوں ۔ اس سے زیادہ نہیں جانتا اور نہ کچھ سمجھ میں آتا ہے ۔"

"عرض یہ ہے کہ آپ تشریف کیسے لائے ؟" ۔

اس نے مختصراً اپنی تمام داستان بیان کی اور کہا "مجھے امید ہے کہ آپ پر جو گذری ہے اسکے کہنے میں آپ میری تقلید کرینگی ۔ آپ کے نزدیک اس چیستاں کا کیا جواب ہے ۔ للہ بتائیے کہ اس کا انجام کیا ہوگا ؟" ۔

وہ تھوڑی دیر تک خاموش کھڑی رہی ایک طرح کی حرارت سے اسکی آنکھوں میں سوزش ہو رہا تھا ۔ دونوں ہاتھ سے اپنے سر کو پکڑ کر کراہتی ہوئی بولی "آہ، میرے سر میں یہ کیسا درد ہو رہا ہے! اس بیکس دل کا کیا حال کہوں! لیکن آپکا میری داستان سننا واجبی ہے ۔ میرا نام بلانشی ڈی میلٹ رائٹ ہے ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، ایک عرصہ دراز سے میں یتیم و بیسیر رہی ہوں ۔ میں سچ کہتی ہوں ۔ اپنی تمام زندگی میں میں کبھی خوش نہیں رہی ۔ تین مہینے ہوئے، روزانہ ایک نوجوان کپتان گرجا میں میرے بازو کھڑا رہا کرتا تھا ۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے ۔ جس قدر چاہو مجھپر الزام لگاؤ میری آرزو تھی کہ کوئی مجھسے محبت کرے ۔ جب اسنے مجھے ایک خط دیا تو اسے گھر پر لاکر میں نے بڑی مسرت سے پڑھا اسکے بعد اس نے اور بھی کئی خطوط لکھے ۔ وہ غریب مجھسے بات چیت کرنے کا اس قدر مشتاق تھا

ایک مرتبہ اس نے مجھسے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کسی شام میں اپنے مکان کا دروازہ کھلا رکھوں تاکہ ہم شیرٹھیوں پر ہی کچھ بات چیت کرسکیں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میرے چچا مجھ پر کس درجہ بھروسہ کرتے ہیں وہ ایک سسکی بھر کر ایک لمحہ تک ٹھہر گئی اور پھر کہنے لگی "میرا چچا بڑا سخت آدمی ہے اور ساتھ ہی بڑا تیز فہم جنگ میں اس نے بڑے کارنمایاں انجام دئے تھے اور دربار کے بڑے آدمیوں میں ہونے کے علاوہ زمانہ قدیم میں ملکہ ایسابیو اسپر بڑا اعتماد کرتی تھی۔ اس کو مجھ پر کس طرح شبہ ہوا یہ میں نہیں کہہ سکتی، لیکن اس سے کوئی بات چھپائے رکھنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ اور آج صبح جیسے ہی ہم نماز پڑھ کر آئے، اس نے میرے ہاتھ سے زبردستی وہ چھوٹا سا خط چھین لیا اور میرے ساتھ اسے چلتے چلتے پڑھتا رہا اور جب ختم کرچکا تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ واپس دیدیا۔ اسمیں دروازہ کھلا رکھنے کی دوسری درخواست درج تھی، اور یہی ہماری تباہی کا سبب ہوا۔ میرے چچا نے مجھے شام تک کمرے میں سختی کے ساتھ روک رکھا اور اسکے بعد مجھے لباس پہننے کا حکم دیا جسے آپ دیکھ رہے ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے ایک نوجوان لڑکی کا کیسا مذاق اڑ رہا ہے۔ میں سمجھتی ہوں میرے چچا جب کپتان کا نام مجھ سے معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تو انہوں نے یہ پھندا تیار کرایا اور یہ خدا کا غضب ہے کہ اسمیں آپ آپھنسے۔ میں بہت پریشان تھی۔ کیونکہ میں کیسے کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایسی سخت شرط کے ساتھ مجھ سے بیاہ کرنے کے لئے آمادہ بھی ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ سے ابتدا ہی سے مذاق کررہا ہو یا ممکن ہے کہ میں اسکی نظر میں ایک معمولی عورت نظر آئی ہوں۔ بہرحال ایسی شرمناک سزا کی تو مجھے کبھی اُمید نہ تھی۔ یہ بات میرے خیال میں بھی نہیں تھی کہ ایک لڑکی کو اللہ تعالیٰ ایک نوجوان کے روبرو اس حد تک ذلیل و خوار کرسکتا ہے۔ اب میں سب کچھ کہہ چکی اُمید ہے کہ آپ مجھے حقیر نہ خیال فرمائینگے"۔

ڈینس نے عزت آمیز محبت کے رنگ میں اس سے کہا "بیگم صاحبہ آپ نے اظہار اعتماد کرکے مجھے عزت بخشی ہے۔ اب اسکا ثبوت میرے ذمہ ہے کہ میں اس عزت کا مستحق تھا۔ کیا حضرت میلٹ رائٹ قریب ہی ہیں"۔

اسنے جواب دیا "میرے خیال میں وہ باہر برآمدہ میں بیٹھے کچھ لکھتے ہوں گے"۔ ڈینس نے اسکی طرف بانکپن سے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے پوچھا "کیا میں وہاں تک آپکو پہنچا سکتا ہوں"۔

اس نے آمادگی ظاہر کی اور دونوں گرجا سے باہر چلے۔ بلانشی بہت مضمحل اور شرم سے لدی ہوئی تھی تو ڈینس اپنے فرض کے احساس سے جھومتا اور اکڑتا ہوا لڑکپن کے اس یقین کے ساتھ چلا جاتا تھا کہ اس فرض کو میں عزت سے انجام دونگا۔ میلٹ رائٹ انھیں دیکھکر ان سے ملنے کے لئے طنز یہ سلام کے ساتھ اٹھ کھڑا ہو۔

ڈینس نے بڑے ہی وقار کے ساتھ کہا "حضرت' اس شادی کے بارے میں آپ سے کچھ کہنا ہے۔ مجھے فوراً کہنے کی اجازت دیجئے۔ اس نوجوان نازنین کی مرضی کے خلاف جبر کرنے میں میں شریک نہیں ہوں۔ اگر یہ پیغام مجھے آزادی کے ساتھ دیا جاتا تو اسکو بڑے فخر سے قبول کرتا کیونکہ وہ جس قدر حسین ہے اسی قدر نیک بھی ہے۔ لیکن فی الحال مجھے اس اعزاز سے معاف ہی رکھئے"۔

بلانشی اپنی آنکھوں میں شکر گذاری کے آنسو لئے ہوئے ڈینس کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن بڈھے کے چہرہ پر تبسم نمایاں ہوتا جاتا تھا۔ یہانتک کہ مسکراہٹ ڈینس کے لئے زہرخند بن گئی

اس نے کہا "ڈینس' جو موقع میں نے تمھیں دیا ہے' اسپر تم نے کچھ بھی غور نہیں کیا مہربانی کرکے ذرا اس دریچہ تک میرے ساتھ تشریف لے چلئے" یہ کہکر وہ ایک بڑے دریچہ کے طرف اسے لیگیا جو اس رات کھلا تھا۔ پھر اس نے کہا "وہ دیکھو اوپر کی اوس صنعت میں ایک لوہے کا کڑا نظر آرہا ہے جس میں ایک مضبوط رسی لٹک رہی ہے۔ اب میرے الفاظ کو بغور سنو' اگر تمھارا رجحان میری بھتیجی پر قابو پانے کے قابل نہوا تو یاد رکھئے' طلوع آفتاب سے بیشتر تم اس پھانسی پر لٹکا دئے جاؤ گے' عملاً اس طرح کی زیادتی میرے لئے بڑے افسوس کی بات ہوگی۔ کیونکہ میں کچھ تمھاری موت کا طالب نہیں ہوں بلکہ اپنی بھتیجی کی زندگی کو ٹھکانے لگانے کا خواہاں۔ اگر تم اپنی ضد پر قائم رہے تو یہ انجام ظاہر ہے' تمھارا خاندان' ڈینس ڈی بولیو' نہایت اعلیٰ ہے۔ اور اگر تم خاندان چارلی میاگنی کے مورث ہو تو یہ فرض کرکے بھی کہ میری بھتیجی پیارس کی سڑک سے بھی زیادہ معمولی ہے اور میرے گھر کے پرنالہ سے بھی زیادہ بدصورت ہے تمھیں ایک میلٹ رائٹ کے تعلق کو بغیر سزا کے تسلیم کرلینا چاہئے۔ اب نہ تو میری بھتیجی اور نہ تم اور نہ میرے خاص احساسات اس معاملہ میں مجھے اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔ میرے گھر کا اعزاز گھٹا دیا گیا جسکے مجرم میرے نزدیک

صرف تم ہو۔ تاہم اسوقت تم خود گویا ایک راز ہو۔ اسلئے میں اگر تم سے یہ کہوں کہ اس دہمبہ کو دھوڈالو تو تمہیں تعجب نہیں کرنا چاہئے۔ اور اگر ایسا نہیں کروگے تو تمھارا خون تمھاری ہی گردن پر ہوگا۔ میرے دریچہ کے نیچے تمھارے جسم کا ہوا میں ٹھوکریں کھاتے رہنا میرے لئے کسی بڑی تشفی کا باعث نہیں ہوسکتا۔ لیکن جب پوری چیز ہاتھ نہیں آسکتی تو آدھی کو ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ میں اپنی ذلت کو نہیں مٹا سکتا مگر اس طریقہ سے افواہ بدنامی تو مسدود ہو جائیگی"۔

تھوڑے سے وقفہ کے بعد ڈینس نے کہا "اس قسم کے جھگڑوں کو طے کرنے کے اور بھی طریقے ہیں۔ آپ تلوار کے دھنی ہیں اور سنا ہے کہ جناب نے اسے بڑے امتیاز سے استعمال بھی کیا ہے"۔

سرڈی میلٹ رائٹ نے پادری کو اشارہ کیا، اس نے خاموشی کے ساتھ لمبے لمبے قدم ڈالتے ہوئے کمرے سے گزر کر تیسرے دروازہ پر سے پردہ ہٹایا تو ڈینس نے مسلح آدمیوں سے معمور ایک دھندلی سی گلی دیکھی، اور یہ دیکھتے ہی پھر پردہ پڑگیا۔

میلٹ رائٹ نے کہا "اگر میں کسی قدر بھی جوان ہوتا تو تمہیں یہ عزت دیکر مسرور کرتا لیکن اب میں بیحد بوڑھا ہوں۔ بوڑھوں کے رگ اور پٹھے ان کے وفادار جانثار ہیں اور میں اپنی اس طاقت کو کام میں لاسکتا ہوں۔ انسان اپنی ضعیفی میں اگرچہ اس قسم کی طاقت کو برداشت کرنا گوارا نہیں کرسکتا لیکن تھوڑے سے صبر کے بعد یہ بات عادت میں داخل ہوجاتی ہے۔ دو گھنٹوں میں سے جو کچھ وقت باقی رہ گیا اسکے لئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم اور نازنین اسوقت تنہائی کے طلبگار ہو رہے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ بمسرت تمام تمھیں تنہائی میں غور کرنے کا موقع دیتا ہوں۔ پھر برآمدہ میں جاؤ اور سوچو۔ ڈینس کے چہرہ پر دہشت کے آثار نمایاں دیکھکر اس نے اسکا ہاتھ پکڑکے کہا "اطمینان رکھو۔ اگر تمھارا خیال پھانسی کے خلاف بغاوت کرنا ہے تو دریچہ سے پھینکے جانے اور جانثاروں کے ہتیاروں کا لقمہ بننے تک تمھارے لئے دو گھنٹہ کی کافی مہلت موجود ہے۔ زندگی کے دو گھنٹے ہمیشہ کے دو گھنٹے ہیں۔ اس قلیل وقت میں بڑے بڑے انقلابات ہوسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں میں اپنی بھتیجی کی شکل سے تاڑ رہا ہوں کہ وہ تمھیں کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ تم اس نازنین سے بدخلقی کرکے اپنی آخری گھڑیوں کو برباد

نہیں کروگے" ڈینس نے بلانشی کی طرف دیکھا تو وہ منت بھری نگاہوں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

سمجھوتے کے آثار دیکھکر بڈھے کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی مسکراتے ہوئے بڑی نرمی سے بولا" ڈینس ڈی بولیو! اگر تم اپنی شرافت کی قسم کھاکر وعدہ کرو کہ بغیر کسی قسم کی خطرناک کوشش کے دو گھنٹہ کے اختتام پر میرا انتظار کرو تو میں ان جان نثاروں کو واپس کئے دیتا ہوں اور انتہائی رازداری کے ساتھ نازنین سے بات چیت کا موقع بھی عطا کرتا ہوں"۔

ڈینس نے پھر دوشیزہ پر نظر ڈالی تو ایسا معلوم ہوا گویا اس سے درخواست کر رہی ہے کہ بڈھے کی بات پر رضامند ہوجائے اس نے کہا" میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں"۔

میلٹ رائٹ نے گردن جھکائی اور لنگڑاتا ہوا اور کھانسی کی اس سمع خراش آواز کے ساتھ جس نے پہلے بھی ڈینس کو دق کیا تھا' اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کمرے سے چلا گیا۔

جیسے ہی وہ دونوں تنہا ہوئے' بلانشی ہاتھ پھیلائے ہوئے ڈینس کیطرف بڑھی اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور اسکی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے پکار کر کہا۔

"تمھیں مرنا نہیں چاہئے۔ کسی صورت تمھیں مجھ سے شادی کرلینی چاہئے"۔ ڈینس نے کہا" بی بی شاید آپ یہ خیال کر رہی ہیں کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں"۔ "نہیں' نہیں' میں آپ کو بزدل نہیں سمجھتی یہ صرف میرے لئے ہے' کیونکہ میں ایک معمولی سی بات پر تمھارے اس دلخراش انجام کو برداشت نہیں کرسکتی ڈینس نے کہا" بیگم صاحبہ مجھے خوف ہے کہ آپ ان حالات کو بالکل معمولی سمجھ رہی ہیں۔ یہ آپکی عالی حوصلگی ہے' لیکن میں اسے اپنی خودداری کے خلاف سمجھتا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں آپ کے شریفانہ جذبات مجھپر مائل بہ کرم کیا ہوئے' آپ وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوگئیں جو صرف دوسروں کا حق ہے"۔

یہ الفاظ ختم کرکے وہ ایک لمحاظ کے ساتھ فرش کی طرف دیکھنے لگا تاکہ وہ اسکی پریشانی کو نہ دیکھ سکے۔ بلانشی تھوڑی دیر تک خاموش کھڑی رہی' پھر دفعتاً وہاں سے چلکر اپنے چچا کی کرسی پر جاگری اور سسکیاں بھرنے لگی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا اسکی نظریں بار بار نازنین ہی پر پڑتی تھیں۔ وہ سامنے کیطرف

جھکی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ اسکے ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر میں غم کی رہ رہ کر اٹھنے والی ہچکیوں کے ساتھ وہ لرز رہی تھی۔ وہ سرخی مائل رنگ اور سر کے بہترین بالوں کے ساتھ ایسی گداز اور ایسی حسین تھی کہ ڈینس اس کو دنیا کی تمام عورتوں سے خوبصورت خیال کر رہا تھا۔ اسکے ہاتھ کے پنجے بالکل اسکے چچا کی طرح تھے اور پورے بازوؤں کے ساتھ تو انکی نرمی اور دلفریبی علانیہ ظاہر ہو رہی تھی۔ غصہ، رحم اور معصومیت سے معمور نگاہوں کو ڈینس ابھی بھولا نہ تھا۔ اس کمال حسن کو دیکھتے دیکھتے ڈینس کو اپنی موت مہیب نظر آنے لگی۔ اور مسلسل گریہ وزاری کو دیکھکر اس پر انتہائی ندامت مسلط ہوگئی۔ اب وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ کون بہادر ہے جو ایسی دنیا کو لات مارنے کے لئے تیار ہو جائے جسمیں اسقدر حسین دیوی بستی ہے۔ ان آخری گھڑیوں میں اس بے رسم گفتگو کے بعد سے ابتک کوئی چالیس ہی منٹ گزرے تھے کہ یکایک دریچوں کے نیچے وادی میں سے ایک مدھم بانگ انھیں سنائی دی۔ جس طرح تاریکی میں روشنی آتی ہے اسیطرح یہ مضطرب کرنیوالی آواز اس پرسکوت ماحول میں آئی اور ان مستوں کو بیدار کر گئی۔

بلانشی نے اوپر دیکھکر کہا "ہائے، کیا میں تمھاری کچھ مدد نہیں کر سکتی؟" ڈینس نے بڑی توجہ سے جواب دیا۔ "بیگم صاحبہ، اگر میرے کہنے سے آپ کو کچھ برا معلوم ہوا ہے تو یقین کیجئے، میں نے اپنے لئے نہیں بلکہ آپ ہی کے فائدہ کی خاطر کہا ہے۔"

بلانشی نے آنسو بھری نگاہوں میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ ڈینس نے کہا "میں آپ کی مظلوم حالت کو خوب محسوس کر رہا ہوں۔ دنیا کا سلوک آپ کے ساتھ بڑا ہی بے رحم ہے، اور آپ کے چچا انسانیت کے لئے ذلت ہیں بیگم صاحبہ، سچ مانئے، فرانس بھر میں آپ کو کوئی ایسا شخص نظر نہیں آئیگا جو میری جگہ رہ کر خوشی کے ساتھ آپ کی جان نثاری کی خدمت انجام دے سکے۔" وہ کانپتے ہوئے کہنے لگی "میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم بڑے بہادر اور صاحب حوصلہ ہو۔ لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میں بھی کچھ آپ کی خدمت کر سکتی ہوں یا نہیں — اب یا اسکے بعد۔"

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یقیناً آپ کر سکتی ہیں ایک بن بلایا مہمان سمجھنے کے بجائے مجھے اپنا دوست تصور فرمائے۔ ہم کس ناگفتہ بہ حالت میں ایک دوسرے کے سامنے ہیں، اسے بالکل

بھلا دیجئے ۔ اور کوشش کیجئے کہ میری زندگی کی یہ آخری گھڑیاں خوشی کے ساتھ گزر جائیں ۔ بس اسیطرح آپ میری ممکنہ خدمت انجام دیسکتی ہیں ۔"

"تم بڑے بہادر ہو (غم کی ایک گہری سانس لیکر)..... بڑے بہادر..... لیکن اس سے مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے ۔ اگر تمھاری مرضی ہی ہے تو مجھے اپنے نزدیک بلاؤ ' کچھ کہنا ہے تو مجھسے بولو تمھاری بات سننے والے دوستوں میں ' میں ہی ہونگی ۔ آہ ! موسیو ڈی بولیو..... آہ ! موسیو ڈی بولیو میں کس طرح تم سے آنکھ میں آنکھ ملاؤں ؟" یہ کہکر وہ گر پڑی اور ایک نئے احساس غم کے ساتھ پھر رونے لگی ۔

ڈینس نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر کہا "بیگم صاحبہ ! میری زندگی کے آخری لمحوں میں مجھے ایسے نظارے سے معذور رکھئے جو باوجود جان پر کھیل جانے کے میرے بس سے باہر ہے" "میں بیحد خود غرض ہوں" بلانشی نے جواب میں کہا "موسیو ڈی بولیو تمھاری خاطر میں آئندہ سے زیادہ اچھی بننے کی کوشش کرونگی ۔ لیکن خدارا کوئی خدمت میرے لئے سوچھ نکالئے جسکو میں آپ کے بعد انجام دوں ۔ کیا آپ کے کوئی ایسے رفیق اور عزیز نہیں جن کو میں آپکا آخری سلام پہنچا سکوں ؟ سوچئے ! سنگین سے سنگین ذمہ داری کا بوجھ مجھ پر رکھئے میں آپ کے لئے خوشی سے برداشت کرونگی ۔ آپکے بیش بہا احسانات کے بدلے میں جو کچھ بھی کیا جائے تھوڑا ہے ۔ کچھ تو بتلائیے کہ میں ایسے محسن کی خدمت گزاری بجا لاسکوں ۔ اور پھر دل کھول کر اپنی قسمت پر آنسو بہاؤں ۔"

نوجوان نے سنجیدگی سے کہا "سنو ! میری والدہ نے دوسری شادی کی ہے اور اس کے زیر پرورش چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ۔ میرا بھائی میری جاگیروں کا وارث بنیگا ۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ چیز اسکے لئے میری موت کا ایک زبردست دلاسا بنجائیگی ۔ اہل طریقت کے بیان کے مطابق زندگی کیا ہے ؟ اِدھر اُدھر دوڑنے والا ایک مختصر سا بخار ۔ جب کسی شخص کو زندگی کا راستہ پاک صاف نظر آتا ہے ' اور وہ تمام سنسار کو اپنے سامنے کھلم کھلا دیکھتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی ایک اہم شخصیت تصور کرنے لگتا ہے ۔ اس کا گھوڑا اسے دیکھکر ہنہناتا ہے ۔ وہ فوج کے سامنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے بگل بجنے

جاتا ہے تو نوجوان لڑکیاں کھڑکیوں میں سے اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگتی ہیں۔ بڑے صاحب اعزاز بعض وقت خط و کتابت سے اور بعض وقت اُسکے مُنہ پر عزت و توقیر کے پھول برساتے ہیں اور اعتماد اور قوی توقعات سے اسکا دامن بھر دیتے ہیں۔ اور کچھ عرصہ کے لئے اُس کا سر بھی پھرنے لگ جاتا ہے تو یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ لیکن جیسے ہی وہ مرجاتا ہے تو خواہ وہ ہرکیولس اور سلیمان ہی کی طرح بہادر اور عقلمند کیوں نہ ہو، لوگ اسے بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ ابھی دس برس نہیں گزرے، میرا باپ کئی سورماؤں کے ساتھ ایک بڑی خوفناک لڑائی میں مارا گیا۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ تو وہ لڑائی کا نام تک اب لوگوں کو یاد نہیں۔ بی صاحبہ، اگر قریب ہو کر دیکھو تو موت ایک غبار آلود اور تاریک گوشہ نظر آئیگی جہاں آدمی قیامت تک مقید ہو جاتا ہے۔ اگرچہ تو میرے بالکل تھوڑے دوست ہیں لیکن میں جب مرچکوں گا تو میرا ایک بھی دوست نہ ہوگا"۔

بلانشی نے کہا" آہ موسیو ڈی بوبیو، تم بلانشی ڈی میلٹ رائٹ کو بھول رہے ہو"۔

"بی صاحبہ، یہ آپکی نیک طینتی ہے کہ بخوشی مجھ پر احسان کرنے کیلئے آمادہ ہوگئیں ہو حالانکہ میں اس قابل نہیں"۔

"آپ اگر یہ خیال فرمائیں تو سخت غلطی ہوگی کہ میں اپنی ذاتی غرض کی خاطر اسقدر آسانی سے متاثر ہوگئی ہوں۔ وہ تو صرف آپ ہیں۔ ایک مجسمہ شرافت جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں آپ میں وہ جوہر دیکھ رہی ہوں جو ہر ادنیٰ کو اعلےٰ بنادے"۔

"بہرحال میں اس وقت ایک چوہے دان میں مر رہا ہوں اور میری چیخ پکار چوہے کی آواز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی"۔

ایک طرح کے درد کی کسک کے آثار اس کے چہرہ پر نمایاں ہوئے اور کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہوگئی۔ پھر یکایک اسکی آنکھیں چمکنے لگیں اور مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

"میں اپنے سورما کو بسکی کے ساتھ اپنی ذات کے متعلق غور و فکر کرنے کا کبھی موقع نہیں دیسکتی اگر کوئی شخص کسی دوسری ہستی کے لئے اپنی جان دے رہا ہے تو وہ حور و غلماں اور فرشتوں کے ساتھ بہشت میں اس سے ضرور ملیگا۔ تمھاری پھانسی کا تو کوئی ایسا سبب نہیں ہے۔ کیونکہ..... عرض یہ ہے کہ....

کیا آپ مجھے حسین سمجھتے ہیں" یہ کہتے کہتے اُس کا چہرہ انتہائی سُرخی کے ساتھ تمتما اٹھا۔ "بیشک، بیگم صاحبہ، میں آپ کو بہت حسین سمجھتا ہوں"۔

"یہ سُن کر مجھے خوشی ہوئی، لیکن کیا آپ فرانس کے ایسے آدمیوں کا تصور کر سکتے ہیں جنھیں کوئی حسین نازنین اپنی شادی کا پیغام اپنی ہی زبان سے دے اور وہ اُس کے منہ پر انکار کر جائیں؟ اور میں یہ جانتی ہوں کہ تم لوگ ایسی کامیابی کو شاید حقارت سے دیکھیں، لیکن یقین جانو، محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس میں اُس کے ظاہری معنوں سے بلند اور برتر حقیقت پنہاں ہے۔ اور عورتوں کی نگاہ میں اُس سے قیمتی اور کوئی جذبہ نہیں ہو سکتا"۔

"آپ نہایت خوب آدمی ہیں، لیکن مجھے یاد ہے کہ آپ کی یہ عنایت رحم و کرم کی غرض سے تھی نہ کہ محبت و الفت کے لئے"۔

"موسیو ڈی بولیو، نہیں، یہ بات قطعی نہیں ہے۔ اب آپ مجھے سنیئے۔ میں جانتی ہوں کہ آپکو مجھسے کسقدر نفرت کرنا چاہیئے اور میں یہ بھی محسوس کرتی ہوں کہ آپ حق بہ جانب ہیں۔ ہر چند میں اس قابل نہیں ہوں کہ مجھ جیسی حقیر ذرہ برابر بھی جگہ آپکے بہادر دل میں پا سکے قہر تو یہ ہے کہ آپ آج صبح مجھ بدنصیب کی وجہ ناحق جان سے جا رہے ہیں۔ جسوقت سے میرے چچا کے خلاف میری طرفداری میں آپ نے حصہ لینا شروع کیا اسی وقت سے آپ کی عزت میری نظر میں بڑھ گئی اور میں بہ دل و جان آپ کو چاہنے لگی۔ اور یہی وجہ تھی کہ میں نے آپ کو شادی کا پیغام دیا اگر آپ کو اس امر کا اندازہ ہوتا کہ کس طرح آپ مجھے نظر آ رہے تھے تو مجھ سے نفرت کرنے کے بجائے مجھ پر رحم کرتے۔ اب جبکہ میں نے نہ کہنے کی باتیں آپ سے کہدی ہیں تو یہ بھی یاد رکھیئے کہ آپ کے اُن جذبات و احساسات کو جو میرے متعلق ہیں، میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ اگر میں شریف عورت ہوں تو باور فرمایئے کہ میں آپ کو راضی کرنے کے لئے بار بار اصرار کر کے آپکو تکلیف نہیں دونگی۔ میں اپنی جگہ خود بہت غیور و خوددار ہوں۔ اگر آپ اپنا ارادہ بدل بھی دیں تو میں مقدس مریم کے آگے کہہ سکتی ہوں کہ آپ سے شادی نہیں کرونگی"۔

ڈینس مسکرا کر بولا "آپ کی مختصر محبت آپ کے فخر پر شرما رہی ہے" اس نے جواب نہیں دیا

حالانکہ وہ اپنے پاس اُس کا جواب رکھتی تھی ڈینس نے ایک آہ کھینچ کر کہا "یہاں دریچہ میں آؤ اور دیکھو صبح طلوع ہو رہی ہے"۔

اب ڈینس اسکا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور عرصہ تک پکڑے رہا جیسے یہ فعل غیر ارادی طور پر سرزد ہوا ہے۔ بلانشی نے کہا "واقعی دن نکل آیا؟ رات اسی قدر تھی! افسوس! میرا چچا آئے گا تو ہم اس سے کیا کہینگے؟" ڈینس نے اپنے ہاتھوں سے اُس کی انگلیوں کو دبا کر کہا "آپ ہی بتائیے" وہ خاموش ہو رہی۔

ڈینس بڑے جوش سے کہنے لگا "بلانشی، تم نے دیکھا میں موت سے ڈرتا ہوں؟ تمھیں اچھی طرح سے جان لینا چاہئے کہ میں خوشی کے ساتھ دریچہ کے باہر کی فضا میں دیوانہ وار کود سکتا ہوں۔ لیکن اگر واقعی تمھیں مجھ سے محبت ہے تو مجھے محض بے سمجھی سے اپنی جان ضائع نہ کرنے دو کیونکہ میں ساری دنیا کے مقابلہ میں صرف تمھیں سے محبت کرتا ہوں۔ اگرچہ میں مسرت کے ساتھ جان دونگا لیکن زندہ رہ کر تمھاری خدمت گزاری میں اپنی زندگی بسر کر دینا میرے نزدیک بہشت کی ساری خوشیوں اور نعمتوں کے برابر ہے"۔

یہ گفتگو ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مکان کے اندرونی حصہ میں ایک گھنٹہ زور زور سے بجنے لگا۔ ہتیاروں کی کھنکھناہٹ سے پتہ چلا کہ جان نثاروں کی جماعت اپنے مقام پر واپس آرہی ہے۔ اور دو گھنٹوں کی مدت قریب الختم ہے۔

"یہ آواز آخر آپ نے سن ہی لی" بلانشی نے یہ کہکر اپنے چہرہ کو اسکی طرف جھکا دیا اسکی آنکھوں سے شراب اور ہونٹوں سے رس ٹپکا پڑتا تھا۔

"جان من، یہ میں نے نہیں سنا" ڈینس نے جواب دیا اور اُس کے نرم و نازک جسم کو اپنے ہاتھوں میں لیکر اسکے شگفتہ چہرہ کو لگاتار بوسوں سے ڈھانک لیا۔ ساتھ ہی پیچھے سے میٹھی میٹھی اور خوشگوار آواز پہلے ہنسی کی آئی، اس کے بعد اپنے نئے بھتیجے داماد کو ڈی میلٹ رائٹ کی صدائے مبارکباد پہنچی۔

سورما

از جناب ابو الکلام محمد بدر الدین صاحب بدر متعلم ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (جامعہ عثمانیہ)

پشت پر ڈھال ہے اور زیبِ کمر تیز کٹار
ایک ناگن ہے ترے ہاتھ میں ننگی تلوار
وہ جیالا ترا گھوڑا ترے کس بل پہ نثار
کوئی دیکھے ترے اس رنگِ جوانی کا نکھار
تو ہے رہبر تجھے رن میں مزا آتا ہے ایک دلہا ہے کہ مقتل میں چلا آتا ہے

خون چھلکا کرے جس میں وہ ہے ساغر تیرا
موت کے منہ میں چمکتا رہا خنجر تیرا
شوقِ شہرت میں مگر چھوٹ گیا گھر تیرا
حسن والوں کے لئے وقف ہوا سر تیرا
نیم بسمل ہے شہیدِ نگہِ ناز ہے تو سچ تو یہ ہے کہ فقط عاشقِ جانباز ہے تو

عشق نے بھیجا ہے میداں میں تجھے دیکے علم
حسن کے در سے بڑھاتا ہوا آتا ہے قدم
جھونکے اُس سمت کے رکھتے ہیں تجھے تازہ دم
تیرے خنجر میں عیاں ابروئے خمدار کا خم
تیرے قاتل کی نگاہوں کی ادا تیر میں ہے آگ جو دل میں لگی ہے وہی شمشیر میں ہے

دے اماں جانوں کی یارب کہ ہلی موت کی ڈور
سایۂ تیغ کے دل ہیں کہ گھٹا ہے گھنگھور
جا پڑا تو تو اٹھا فوج مقابل سے شور
اک ترے دم سے لڑائی کے وہ طوفاں کا زور
زخم کھاتے ہی وہ بل کھا کے بگڑنا تیرا جوش و مستی میں غضب جھومتے لڑنا تیرا

یک بیک خیر منانے لگے تیری ملکوت
تیرے گر کر وہ تڑپنے پہ ہے لشکر مبہوت
بڑھکے آتی ہیں شعاعیں کہ اٹھائیں تابوت
چھا گیا رزم کے بازار پہ دم بھر کا سکوت
ہیں نگونسار علم محو ہوا چرخِ کہن فاتحہ پڑھنے لگی تیرے لئے خاکِ وطن

وفات نامہ

مولانا سید وحید الدین سلیم

پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ

یہ حقیقت بھی کس قدر دلخراش ہے کہ کل تک جس ہستی نے بیسیوں موضوع پر قلم اٹھایا، آج اس کے ماتم کے لئے ہم کو قلم اٹھانا پڑ رہا ہے۔ اور ایک نہیں سینکڑوں ماتم گساریوں کا وہ بے حس موضوع بنی ہوئی ہے۔ وہ سماں بھی عجب جانگسل تھا جب کہ کالج میں مولانا کے اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کرنے کی خبر پہونچی۔ ہر شخص مولانا کی حسرت ناک موت پر افسوس کر رہا تھا۔ اور آپ کے انتقال سے اردو کے مفاد کو جو صدمہ پہنچا، اس پر تاسف۔ ۲۵ راگست ۱۹۲۸ء کو مولانا کی وفات حسرت آیات پر آنسو بہانے کے لئے طلبا اور اساتذۂ کلیہ کے بڑے ہال میں جمع ہوئے۔ اور یہ تعزیت نامہ مرتب ہوا۔

مولوی وحید الدین صاحب سلیم مرحوم نے مسلسل چھ ماہ کی علالت کے بعد بتاریخ ۲۹ رجولائی ۱۹۲۸ء بمقام ملیح آباد انتقال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ مولوی صاحب مرحوم نے تمام عمر اردو زبان کی خدمت میں بسر کی۔ اردو کی ساخت اور وضع اصطلاحات میں ان کو جو خداداد بصیرت اور مہارت حاصل تھی اور اس سے مختلف علوم و فنون کو جو فائدہ پہونچا وہ آیندہ ارتقاء اردو کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ جامعہ عثمانیہ کے

قیام کے وقت سے ۱۹۲۰ء تک مسلسل دس سال مولوی صاحب مرحوم اول
بہ حیثیت مددگار پروفیسر اور بعد کو بحیثیت پروفیسر اُردو ادب کی تعلیم میں مصروف
رہے، جس کی بدولت ایم۔ اے کی جماعت تک اُردو کی تعلیم جاری ہوگئی۔
مرحوم کی وفات سے اُردو ادب اور بالخصوص جامعہ کو جو نقصان پہنچا اسکی
تلافی کچھ آسان نہیں ہے۔ تمام اساتذہ وطلبہ کو سخت صدمہ ہے اور وہ مرحوم
کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہوئے تمام پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی
کا اظہار کرتے ہیں۔

گذشتہ تین چوتھائی صدی کے، کیسے کیسے انقلابات ہوں گے جو مولانا نے دیکھے، کیسی کیسی صحبتیں ہوں گی جن کے نقشے ان کے ذہن میں محفوظ تھے! کبھی آنریبل سرسید احمد خاں کا ساتھ ہے تو کسی وقت شبلی سے سرگرم گفتار یا حالی کے مشاعروں میں شریک!

افسوس زمانے نے نہ چاہا کہ باقیاتِ صالحات کا یہ جوہر فرد ہم خستہ جانوں کے درمیان کچھ اور دن رہے!

مولانائے مرحوم ان چند بزرگ ہستیوں میں سے تھے، جنہوں نے اپنی آپ مدد کی، اور ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کئے۔ عربی اور فارسی میں دستگاہ پیدا کرنے کے بعد، آپ نے طب کی طرف توجہ کی، اور عرصہ تک مطب کرتے رہے۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز، اس وقت سے ہوتا ہے، جبکہ آپ کا تعلق سرسید احمد خاں سے ہوا۔ سرسید کی وہ عملی ہستی تھی کہ جس کے اثر میں آنے کے بعد ذرہ بھی آفتاب بن کر چمکتا تھا۔ مولانا سلیم تو ذہانت، طباعی اور حاضر دماغی کی مجسم مثال تھے۔

سرسید احمد خاں کے ادبی مددگار کی حیثیت سے مولانا نے علم وعمل کا جو سرمایہ جمع کیا تھا، اس کا ثبوت بعد میں کئی طرح ملا۔ سرسید ہی کے زمانے میں علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی ادارت آپ کے تفویض تھی۔ سرسید سے رشتہ تعلق منقطع ہونے کے بعد سے آخری عمر تک آپکی علمی مساعی پیہم جاری رہیں۔ "معارف" "زمیندار" اور "مسلم گزٹ" جیسے معتبر اخباروں کی آپ نے ادارت کی۔ اور پرجوش جو سیاسی، علمی

اور ادبی مضامین لکھے، وہ اپنی جگہ شاندار ہیں۔

آخری فریضہ ادارت سے سبکدوش ہونے کے باوجود مولانا سربرآوردہ اخبارات اور رسائل کے ذریعہ اپنے خیالات عوام تک پہنچاتے رہے۔

"وضع اصطلاحات" کی صورت میں آپ نے جو قابل قدر تصنیف چھوڑی ہے، وہ اصول کے اعتبار سے معرکۃ الآرا اور موضوع کے لحاظ سے اردو میں اولیت کا فخر رکھتی ہے۔ وضع اصطلاحات کے دشوار گذار راستوں پر چلنے والوں کے لئے، اس کتاب کے قالب میں جو راہنما اردو علمی دنیا کے ہاتھ لگا ہے، وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ لسانیات اور تاریخ ادب اردو میں یہ کتاب ہمیشہ یادگار رہیگی۔

ادیب کی حیثیت سے آپکی عظمت مسلم ہے۔ شاعری میں بھی آپ کا کچھ کم رتبہ نہ تھا۔ آپ کے بہترین اشعار میں بلا کا جوش پنہاں ہے۔

مولانا کی عمر کا آخری حصہ اردو زبان کے سب سے بڑے مرکز اور محرک، جامعہ عثمانیہ کی خدمات میں صرف ہوا۔ جامعہ نے آپ کی جس قدر عزت کی، اس کے آپ ہر طرح مستحق تھے۔ جامعہ اور دارالترجمہ میں آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ اردو علوم وفنون کی اساسی خدمات کہلانے کی مستحق ہیں۔

مولانا کا مغتنم وجود تو اب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کے کارنامے ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ کرتے رہینگے۔ آپکی زندگی کا مہتم بالشان ماحصل ایک جملہ میں صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ آپ نے ایک حقیقی طالب علم کی زندگی بسر کی اور ایک طالب علم کی حیثیت سے دنیا سے رخصت ہوئے۔

عبدالقادر سروری
ایم۔اے، ایل ایل بی

نوحۂ سلیم

جناب سلیم مجھسے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ :—
آپ کے کلام میں جو بجلیاں کوندتی ہیں اون کو دیکھنے، اور سمجھنے والے صرف دو شخص ہو سکتے ہیں :

ایک مولانا حالی،
دوسرا وحید الدین سلیم،

مولانا حالی تو مرگئے، مگر وحید الدین ابھی زندہ ہے،
افسوس آج وحید الدین بھی مرگئے، اور بقول مرحوم میرے دونوں قدرشناسوں میں اب ایک بھی باقی نہیں، ابھی مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم کو روئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ یہ دوسرا سانحہ پیش آیا۔
اردو ادب کے چشم و چراغ جن کو چن چن کر ملک نے جمع کیا تھا ایک ایک کرکے رخصت ہوتے جارہے ہیں،

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

جناب سلیم کے تھوڑے بہت اوصاف جو میری نظر میں تھے ذیل کی مختصر سی نظم میں بیان کرکے حضرت رب العزت سے اونکی مغفرت کا خواستگار ہوں۔

ہوگیا دُنیا سے رخصت آہ وحید الدین سلیم
برقِ تجلّی اوسکی زباں طورِ علم ادب کا کلیم

جامعہ کی رونق اُس سے اُردو کا تھا پروفیسر
سینہ بے کینہ اوس کا علمِ قدیم کا اک دفتر

ظاہر و باطن بالکل ایک دلمیں جو بات، وہی منہ پر
حق گو، حق جو، حق آگاہ کم ہوتے ہیں ایسے بشر

سید احمد خاں کا دوست نبض شناس زمانہ تھا
نام تھا اوسکا وحید الدین اپنے فن میں یگانہ تھا

علم و ہنر کا متوالا بادۂ اُردو کا ساقی
اگلے زمانے والوں میں ایک یہی تھا اب باقی

افسوس آخر اے امجد وہ بھی ہم سے چھوٹ گیا
اب تو سطحی دنیا سے بالکل ہی جی ٹوٹ گیا

ہم میں کیونکر رہ سکتا بندۂ خاص ربِ قدیر
کیوں نہ پسندِ حق ہوتا قلبِ سلیم پاک ضمیر

فرد وحید زمانہ تھا نام سلیم اور طبع سلیم
کیا عجب اپنی رحمت سے بخش دے اوسکو ربِ کریم

چھوڑ کے سب کو تیرے پاس آیا تیرا بندہ سلیم
اپنی رحمت سے اوسکو
بخش دے اب ربِ کریم

امجد

تنقید و تبصرہ

ذیل کے ابتدائی تین تبصرے (ماثرِ دکن، تاریخ فلسفہ اسلام اور تذکرۂ بابر) مولانا حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے تحریر فرمائے ہیں جس کے لئے ہم صاحب موصوف کے ممنون ہیں۔

مجلّہ

ماثرِ دکن

مرتبہ مولوی سیّد علی اصغر بلگرامی مددگار معتمد سررشتہ عدالت وکوتوالی و اُمور عامہ سرکار عالی۔ مطبوعہ گورنمنٹ پریس حیدرآباد ۱۹۲۷ء۔ صفحات ۲۲۶۔ تصاویر عکسی (۵۸) مجلد۔ قیمت پانچ روپیہ یا آٹھ شلنگ

حیدرآباد اور اس کے اطراف واکناف میں جس قدر آثار و عمارات اور مساجد و مقابر ہیں اونکی مبسوط و مفصل گائیڈ ہے۔ فاضل مولّف نے مضامین کے لحاظ سے اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصّہ حیدرآباد اور اوس کے مضافات کے متعلّق ہے۔ دوسرے حصّہ میں گول کنڈہ اور قطب شاہی مقابر کے حالات ہیں۔ اسکے بعد ایک ضمیمہ اضافہ کیا گیا ہے جسمیں دکن کی اجمالی تاریخ اور سلاطین قطب شاہیہ کا کسی قدر مفصل تذکرہ مرقوم ہے۔

بحیثیت مجموعی اس کتاب کے دونوں ابواب میں حیدرآباد اور گول کنڈہ کے (۶۰) عمارات کا بیان ہے۔ اور ہر عمارت کی نسبت اوس کے محل وقوع، تاریخ تعمیر، کتبے، عام حالات اور اسی نوعیت کے بعض دیگر ضروری امور کا صراحت کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

۱۹۲۲ء میں مولانا یزدانی ناظم آثار قدیمہ ممالک محروسہ سرکار عالی یورپ اور بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے لئے روانہ ہوئے تو اون کی جگہ دو سال کے لئے مولف کتاب کا منصرمانہ تقرر عمل میں آیا۔ اس زمانہ میں فاضل مولف کو ملک کے آثار و عمارات دیکھنے کا خوب موقع ملا اور اس مشاہدہ کے بعد اونہوں نے حیدرآباد گولکنڈہ کے آثار و عمارات پر مآثر دکن کے نام سے اُردو زبان میں ایک کتاب مرتب کی اور اُسے ۱۹۲۴ء میں چھپوا کر شائع کیا۔ یہ کتاب اگرچہ مختصر تھی۔ لیکن اپنے موضوع اور نوعیت کے لحاظ سے پہلی کتاب تھی۔ اس لئے ملک نے اس کی خوب قدر کی اور مشاہیر ملک نے اسکی نسبت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا۔

حیدرآباد کے آثار و عمارات پر انگریزی زبان میں کوئی مفید و کارآمد کتاب موجود نہ تھی سیاحانِ یورپ کی رہنمائی کے لئے ایسی کتاب کی شدید ضرورت تھی۔ فاضل مولف کو جب اس امر کا احساس ہوا تو مآثر دکن کو انگریزی میں منتقل کرایا۔ لیکن واضح رہے کہ صرف ترجمہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اوس میں ایک ثلث سے زیادہ مضامین اضافہ کئے اور اس طرح پر اسے اردو ایڈیشن سے بہت زیادہ مفید و کارآمد بنادیا۔

یہ کتاب اگرچہ گائیڈ کی حیثیت سے مرتب کی گئی ہے لیکن اس میں آثار و عمارات کی نسبت معلومات کا جو بیش قیمت ذخیرہ جمع ہے اوسکی وجہ سے اسکی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور تاریخی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو آثار حیدرآباد کے بارے میں ایک معتبر و مستند تاریخ کا درجہ رکھتی ہے اسکی یہ وقعت اور اہمیت اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ فاضل مولف نے اس میں وہ تمام کتبات جمع کردئے ہیں جو حیدرآباد و گول کنڈہ اور اُس کے اطراف واکناف میں مختلف عمارات و آئینہ پر کندہ ہیں۔ اس کتاب میں جس قدر کتبات جمع ہیں اون کی تعداد (۹۵) ہیں ان میں (۷۰)

کتبے عہد قطب شاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی (۲۵) کتبوں کا تعلق عہد آصف جاہی سے ہے۔

حیدرآباد کے کتبات جمع کرنے کی کوشش قریباً بیس سال سے جاری ہے۔ ۱۹۰۷ء میں ہم نے (۴۰) متفرق کتبے جمع کئے تھے۔ اسی زمانہ میں میجر ہیگ نے جو اس وقت حیدرآباد کے اسسٹنٹ رزیڈنٹ تھے۔ حیدرآباد و گول کنڈہ کے (۲۴) کتبوں کو جمع کر کے انگریزی ترجمہ کے ساتھ ۱۹۰۸ء کے اے پی گرافیا انڈو مسیلے میکا میں چھپوایا۔ اس کے قریباً آٹھ سال بعد مولانا یزدانی نے صرف قطب شاہی عہد کے (۳۶) کتبے فراہم کئے۔ اور انہیں بہت سے تاریخی فوائد کے ساتھ رسالۂ مذکور کی تین اشاعتوں میں (جو ۱۳-۱۹۱۴ء ۱۵-۱۹۱۶ء اور ۱۷-۱۹۱۸ء کے متعلق ہیں) شائع کیا۔ اس کتاب میں (۳۶) تو وہی ہیں جن کو مولانا یزدانی نے شائع کیا ہے بقیہ کے لئے جن کی تعداد (۵۹) ہے فاضل مولف نے اپنی ذاتی کوشش سے فراہم کئے ہیں۔

فاضل مولف نے ان کتبات کے پڑھنے اور صحت کے ساتھ شائع کرنے میں غیر معمولی محنت و کوشش سے کام لیا ہے۔ میجر ہیگ اور مولانا یزدانی کی اشاعتوں میں قرات کی جو غلطیاں رہ گئی تھیں اونکی بھی بہ عمدگی تمام تصحیح کر دی ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب کے دونوں ایڈیشنوں میں ایسے مقامات پر جگہ جگہ اشارات کئے ہیں۔

فاضل مولف نے قطب شاہی عہد کے جو کتبات شائع کئے ہیں اون میں دو کتبے غیر معمولی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ اور ان سے قطب شاہی دور کے دو جلیل القدر امراء نواب خیرات خاں اور ملا نظام الدین احمد داماد سلطان عبداللہ قطب شاہ کے سنین وفات کا انکشاف ہوتا ہے۔ آخر الذکر کتبے کو مولانا یزدانی نے بھی اپنی ۲۴-۱۹۲۵ء کی رپورٹ میں شائع کیا ہے۔ لیکن اس کے پہلے پہل دریافت اور شائع کرنے کا سہرا فاضل مولف کے سر ہے۔

اردو ایڈیشن میں تین چار غلطیاں تھیں۔ فاضل مولف نے اس میں اون کی بھی اصلاح کر دی ہے۔ چنانچہ اردو ایڈیشن کے صفحہ (۷۷) پر سلطان قلی قطب شاہ بانی سلطنت قطب شاہیہ کی نسبت لکھا ہے کہ محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں ایران سے دکن میں آیا اور اسی بادشاہ نے اوسے قطب الملک کا خطاب دیکر

تلنگانہ کا گورنر مقرر کیا۔ یہ بیان اگرچہ فرشتہ کی روایت کے موافق ہے۔ لیکن اس بارے میں خود فرشتہ سے غلطی ہوگئی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ واقعات محمود شاہ بہمنی کے عہد میں ہوئے ہیں۔ اور اسی کے موافق انگریزی ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردی گئی ہے۔ باوجود اہتمام کے انگلش ایڈیشن میں ایک غلطی باقی رہ گئی ہے۔ اردو کا صفحہ (۷۰) اور انگریزی کا صفحہ (۱۰۶) دیکھئے۔ اوس میں تحریر ہے۔

میر ابوالقاسم میر عالم بہادر مدار المہام نواب سکندر جاہ بہادر نے کونوال گوڑہ کے قریب عیسیٰ ندی پر جو سائفل کے نام سے مشہور ہے۔ بصرفہ ساٹھ ہزار روپیہ سعید الدولہ و میر محمد علیخاں پسران خلیل اللہ خاں پسر میر عالم بہادر کے اہتمام سے ایک کتوہ تیار کرایا

صحیح یہ ہے کہ خلیل اللہ خاں اور میر محمد علیخاں دونوں بھائی تھے۔ ان کے والد کا نام سعید الدولہ تھا۔ (نگارستان آصفی صفحہ ۵۳-۵۴) ان کو میر عالم بہادر سے کوئی نسبی تعلق نہ تھا۔ میر عالم کے صرف ایک فرزند تھے۔ جن کا نام میر دوران تھا۔ اور اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۲۱۶ھ میں تعمیر کتوہ سے پانچ سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اور ان کو کوئی اولاد نہ تھی (نگارستان آصفی صفحہ ۳۹)

سلطان محمد قطب شاہ نے کنز اللغات کے ایک قلمی نسخہ میں اپنے قلم خاص سے نام کے ساتھ اپنا سلسلہ نسب بھی لکھدیا ہے۔ فاضل مولف نے اس نسب نامہ کو شائع کرکے اون تمام اختلافات و ابہامات کو دور کردیا ہے جو نسب سلاطین قطب شاہیہ کے متعلق مدت مدید سے تاریخوں میں چلے آرہے ہیں مثلاً مورخ فرشتہ نے ان کو ترکان بہارلو سے بتایا ہے۔ خافی خاں نے بھی اسی قول کی پیروی کی ہے۔ امین رازی نے ترکمہ ہمدان سے ان کا سلسلہ ملایا ہے۔ کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ کی نسبت رسالہ اردو میں جو مضمون شائع ہوا ہے۔ اوس کا تاریخی حصہ مولانا یزدانی نے تحریر کیا ہے۔ اوس میں نسب سلاطین قطب شاہیہ کی نسبت تحریر کرتے ہیں۔

یہ قبیلہ تاریخ میں آق قونیلو کے نام سے مشہور ہے۔ ترکی میں قونیلو مینڈھے کو کہتے ہیں۔ آق سیاہ رنگ کیواسطے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس خاندان کے فوجی جھنڈے پر سیاہ مینڈھے کی تصویر تھی اسلئے یہ لقب مشہور ہوگیا۔ دکن کی قطب شاہی سلطنت کا بانی اسی خاندان سے تھا۔

نسب سلاطین قطب شاہیہ کی نسبت سلطان محمد قطب شاہ کی تحریر سے زیادہ باوثوق بیان کسی مورخ کا نہیں ہوسکتا اور اس سے ان تمام بیانات کے خلاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ سلاطین قطب شاہیہ امیر قرا یوسف کی اولاد سے ہیں۔ قرا یوسف آذربائیجان اور عراق عجم کا مشہور فرماں روا گذرا ہے اور اس نے کئی سال تک امیر تیمور سے معرکہ آرائیاں کی ہیں۔ اس کا قبیلہ جیسا کہ مورخ خوندمیر نے صراحت کی ہے قراقویون لی کے لقب سے مشہور رہے۔ آٹھویں صدی میں ترکوں کے دو قبیلے جھیل وان کے نیچے بود و باش رکھتے تھے۔ انہیں سے ایک قبیلہ نے جس کا لقب قراقویون لی تھا۔ پہلے پہل عروج حاصل کیا۔ اس کے بعد دوسرے قبیلہ کو جس کا لقب آق قویون لی تھا ترقی شروع ہوئی۔ ان دونوں نے چونکہ ایک ہی ملک میں قسمت آزمائی شروع کی اس لئے دونوں ایک دوسرے کے حریف مقابل بن گئے یہانتک کہ جب آق قویون لی نے زور پکڑا تو بزور شمشیر قراقویون لی کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ اس پرآشوب زمانہ میں سلطان قلی جو قراقویون لی شہزادوں سے تھا ایران سے بھاگ کر دکن میں آیا اور سلطان محمود شاہ بہمنی کے متوسلین میں شامل ہوگیا۔

ان قبیلوں کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ قویون لی مینڈھے کو کہتے ہیں۔ قرا سیاہ کے اور آق سپید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قراقویون لی کے علم پر سیاہ مینڈھے اور آق قویون لی کے علم پر سپید مینڈھے کی تصویر ہوا کرتی تھی جس کے باعث ان القاب کی شہرت ہوئی ہے۔

کتاب میں (اٹھاون ۵۸) تصاویر ہیں۔ انہیں (۴۶) کتبوں کے عکس ہیں (۷) عمارات کے اور (۸) قطب شاہی سلاطین اور امرا کی تصاویر ہیں۔ آخر الذکر ذخیرہ نہایت نایاب ہے۔ اسکو مولانا یزدانی نے دوران سفر میں سررشتہ آثار قدیمہ کے لئے برٹش میوزیم سے حاصل کیا تھا۔ فاضل مولف نے سررشتہ مذکور سے حاصل کرکے شامل کتاب کیا ہے۔

کتاب معتبر و مستند ذرائع سے ترتیب دیگئی ہے۔ اسکے مضامین ۲۶ کتابوں سے ماخوذ ہیں جنکی فہرست کتاب کی ابتدا میں لگی ہوئی ہے۔

کتاب نہایت عمدہ کاغذ پر خاص اہتمام سے چھپی ہے۔ تصاویر بھی نفیس و دلکش ہیں۔

جلد بھی عمدہ بنائی گئی ہے غرض کہ اس میں وہ تمام خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اہل یورپ کی ناشرات میں عموماً ہوا کرتی ہیں۔

تاریخ فلسفۂ اسلام مصنفہ ڈاکٹر۔ دو۔ بوئر۔ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی مطبوعہ نیشنل یونیورسٹی پریس دہلی ۱۹۳۷ء صفحات (۱۵۸) قیمت دو روپیہ۔

فلسفہ اسلام پر مستشرقین مغرب نے جو کتابیں لکھی ہیں اون میں دو۔ بوئر کی کتاب ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو نہ صرف مغرب بلکہ مشرق میں بھی قبول عام حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ کئی سال پہلے ترکی اور عربی میں اس کے ترجمے بھی ہو گئے۔ مولوی ظفر علیخاں بی۔ اے جس زمانہ میں حیدرآباد سے دکن ریویو نکالا کرتے تھے انھیں اس کتاب کے اردو میں ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس کے ابتدائی اجزاء ترجمہ کرکے رسالہ مذکور میں شائع بھی کئے۔ لیکن اس کے تکمیل پانے کی نوبت نہیں آئی اور اس ترجمہ کے شائع ہونے تک اس نوعیت کی کتاب سے ادب اردو خالی رہا۔

اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ فلسفہ اسلام کی تاریخ تحریر کی گئی ہے۔ اور ابتداء سے قرون وسطیٰ تک اوسمیں جو ترقیاں اور تبدیلیاں ہوئی ہیں اون کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے مسلمانوں نے یونان و ایران کے علوم فلسفہ کو حاصل کرنے کے لئے جو کوشش کی ہے۔ اوسکا حال پہلے باب میں لکھا ہے۔ اسلامی علوم کے خیالات دوسرے باب میں بیان کئے ہیں۔ اسکے بعد اصل مباحث شروع ہوتے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے باب میں فلسفہ یونان کے مشرق میں رواج پانے کا حال مذکور ہے۔ پانچویں اور چھٹے باب میں فلسفہ یونان کے مشرق میں انحطاط اور مغرب میں رواج پانے کا حال تحریر کیا ہے۔ ساتویں باب پر جس میں اس کو لیٹک فلاسفی یعنی فلسفہ مدرسیت کا ذکر ہے کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

ان ابواب میں موقع بہ موقع فلاسفہ اسلام کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ بالخصوص۔ کندی فارابی۔ ابن مسکویہ۔ ابن سینا۔ ابن ہیثم۔ غزالی۔ ابن باجہ۔ ابن طفیل۔ ابن رشد اور

ابن خلدون کے حالات اور اون کے فلسفیانہ خیالات کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں۔

کتاب بہت مختصر ہے۔ اکثر مسایل تشنہ اور محتاج صراحت رہ گئے ہیں۔ اسکے باوجود اردو ادب کے لئے بیش قیمت ہے۔ کیونکہ اس موضوع پر اردو میں ابتک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔

کتاب میں بعض ناموں کی املا غلط چھپ گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۴۸ پر ابو العلا المری لکھا ہے حالانکہ صحیح المعری ہے۔ اسیطرح صفحہ (۱۲۵) پر البجاری تحریر ہے۔ حالانکہ صحیح ابہری ہے اور یہ منسوب ہے ابھر سے جو ماوراالنہر کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ اسی قسم کی بعض اور بھی غلطیاں ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مترجم نے ان کے صحیح کرنے کی کوشش نہیں کی امید ہے کہ طبع ثانی میں ان کی اصلاح کردی جائیگی۔

ترجمہ عام فہم اور زبان صاف وسلیس ہے۔ اور مترجم نے مطالب کے ادا کرنے میں کافی کامیابی حاصل کی ہے۔

تذکرۂ بابر

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی کی سوانح عمری۔ مصنفہ مولانا محمد حبیب الرحمن خانصاحب شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر صدر الصدور امور مذہبی سرکار عالی۔ مطبوعہ شمس الاسلام پریس حیدرآباد ۱۳۴۵ھ۔ صفحات ۶۰۔ قیمت ۶۔

آج سے چالیس سال پہلے اردو میں جو رسالے نکلا کرتے تھے۔ اُن میں مرحوم سرسید کے "تہذیب الاخلاق" اور حیدرآباد کے "رسالہ حسن" کو غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ آخر الذکر رسالہ نوعیت مضامین کے اعتبار سے یورپ کے باوقعت رسالوں کا ہمپایہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس میں جو مضامین شائع ہوا کرتے تھے اون سے ممتاز اور بلند پایہ مضامین پر ایک اشرفی انعام ملا کرتی تھی۔ تذکرۂ بابر آج سے سینتیس ۳۷ سال پہلے رسالہ حسن کے انعامی مضامین میں شائع ہوا تھا۔ اسکے بعد پنجاب کے بعض پبلیشروں نے بصورت کتاب چھاپ کر شائع کیا۔ اب نواب صاحب کی تصحیح اور نظر ثانی کے بعد نہایت اہتمام کے ساتھ خوش خط اور نفیس کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔ نواب صاحب کی طرز تحریر میں ایک خاص ادیبانہ شان ہوا کرتی ہے۔ یہ رسالہ بھی اسی طرز خاص اور مخصوص انداز پر لکھا گیا ہے۔ تاریخی واقعات تزک بابری

ایک قدیم قلمی نسخے اور تاریخ فرشتہ سے ماخوذ ہیں۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے۔ لیکن بابر کی زندگی کے تمام ضروری اور اہم واقعات اسمیں آگئے ہیں۔ تاریخ کا تسلسل ابتدا سے آخر تک برابر قائم ہے۔ جو حضرات تھوڑے وقت میں بابر کے سوانحات زندگی سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اون کے لئے یہ کتاب کارآمد اور دلیل راہ بن سکتی ہے۔

تنقیدی مقالات از مولوی ابوالحسنات سید غلام محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم اے تقطیع چھوٹی۔ کاغذ لکھائی اور چھپائی معمولی۔ صفحات ۲۶۸۔ قیمت ۴ ہے۔ ناشر۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

مجتبیٰ زور صاحب سے اُردو ادبی دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ اپنی ناقدانہ قابلیت اور مضمون نگاری سے اُنہوں نے کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ طلبۂ کلیہ میں صاحب موصوف غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے کلیہ کے طرز تعلیم اور تنقیدی تربیت سے فائدہ اٹھاکر نئے انداز تنقید نگاری کو اُردو میں رائج کیا۔ زیر تنقید کتاب دراصل موصوف کے ان مختلف مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو "روح تنقید" کے اصولوں کی روشنی میں لکھے گئے۔ سب سے پہلا مضمون "ادبیات اردو اور تنقید نگاری" ہے جس میں اصول تنقید کی وسعت پر خوبی کے ساتھ بحث کی ہے اور عملی طور پر تنقید کرنے کے طریق بھی بتلائے ہیں۔ ٹامس گرے اور ہوریس اسمتھ یہ دو مضامین انگریزی محفل ادب سے متعلق ہیں۔ پہلا مضمون مشہور ماہر تنقید آرنلڈ کے مضمون کا ترجمہ ہے۔ دوسرے میں ہوریس کے ظاہر و باطن پر انگریزی ناقدین کی مختلف معلومات کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ اور اس کی نثر و نظم کے ترجمے بھی پیش کئے ہیں۔ "طبقات ناصری اور اس کا مصنف" اور "فارسی نثر کا آغاز اور ابوعلی بلعمی" فارسی ادب سے وابستہ ہیں۔ یہ مضامین بڑی محنت و تلاش کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ جنکا اکثر حصہ مستشرقین یورپ کی تحقیقی کاوشوں سے ماخوذ ہے۔ باقی تمام مضامین میں اُردو کے بعض مشہور صاحبان قلم پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی تفصیل یہ ہے (۱) میر کی مثنویاں (۲) میر تقی میر اور خارجی حالات کی ترجمانی (۳) غالب کی ذہنیت (۴) حالی اور نثر اُردو (۵) میر انیس کی شاعری (۶) میر حسن اور سحر البیان

(۱) کیفی حیدرآبادی پہلے چھ مضمون قبل ازیں مختلف رسائل کے ذریعہ خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں ان میں قابل مصنف نے تفصیل اور تدقیق سے اردو مصنفین اور اُن کے کارناموں سے بحث کی ہے۔ اور ایک بڑی حد تک کوششوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہوتا آیا ہے ہر ابتدائی کام میں بحث و تنقید کی بہت گنجایش باقی رہتی ہے۔ ان مضامین میں بھی کئی پہلو خاص توجہ اور نظر ثانی کے محتاج ہیں مثال کے طور پر غالب کی ذہنیت والے مضمون ہی کو لیجئے جس میں صاحب مضمون نے رشک کو غالب کی ذہنی خصوصیت قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس کے پہلے بھی دو ایک حضرات نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا لیکن اس مضمون کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مکرم دوست نے اس خصوصیت کے نمایاں کرنے میں پورا زور صرف کر ڈالا۔ اور مختلف الموضوع اشعار کو کسی نہ کسی ڈھب سے عنوان رشک کے تحت لا بٹھایا ہے۔

آخری مضمون میں حضرت کیفی کی شخصیت اور شاعری پر عقیدتمندانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیفی دکن کے ایک باکمال شاعر تھے اور اُن کا فیضان صحبت بھی بڑا مشہور ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو فیض و اثر اور شعر و سخن کا اوتار بنا دیا جائے۔

سرسری طور پر ہمیں یہ باتیں بیان کر دینی پڑیں۔ لیکن ان سے اصل مجموعہ کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں واقع ہو سکتی۔ زور صاحب کی طالب العلمانہ کوششوں کا یہ مرقع اردو ادب کے لئے نہایت مفید اور قابل قدر ہے۔

اردو کے اسالیب بیان از مولوی سید غلام محی الدین صاحب قادری زور ایم۔ اے۔ چھوٹی تقطیع طباعت معمولی۔ صفحات ۲۰۴۔ قیمت ۴ھ۔ ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

یہ دراصل اس طویل مضمون کی کتابی صورت ہے جو آج سے تقریباً دو سال قبل رسالہ سہیل علیگڈھ میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اس کو قابل مصنف نے ذیل کی ۹ فصلوں میں تقسیم کیا ہے (۱) اردو زبان میں نثر کے ابتدائی کارنامے (۲) دسویں صدی ہجری کے بعد دکن میں نثر کی نشو و نما (۳) شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی مراحل (۴) فورٹ ولیم کالج کی نثری کوششیں (۵) غدر اور اس کے

قریبی زمانہ میں نثر کی حالت (۶) سرسید کی کوششوں کا اثر (۷) موجودہ انشاپردازوں کی نثر اور اس کے اسالیب بیان (۸) اردو نثر کے رجحانات (۹) اردو کا مستقبل۔

اردو کے مستقبل اور اس کے موجودہ رجحانات کے متعلق مصنف نے بہت سی کارآمد باتیں بتائی ہیں۔ زمانہ غدر اور اس سے قبل کے لٹریچر اور اس کی خصوصیات کو ممکن الحصول مواد سے کام لیکر ربط و تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سرسید اور ان کے اثر کے تحت جن چیزوں کو مصنف نے چھیڑا ہے انہیں خیال کی صفائی اور رائے کی پختگی خوب نمایاں ہے۔ لیکن اس کے بعد ہی بیان میں الجھن اور انتشار پیدا ہوجاتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاف سیدھے طریقہ پر مصنفین کی خصوصیات کو الگ الگ نہیں بیان کرسکے کبھی انگریزی مصنفین کے تشابہ اور تمثیل سے اپنی رائے کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی تشبیہ و استعارہ کے مخلوط طرز بیان میں گم ہوجاتے ہیں تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لئے نمونہ کے طور پر صرف چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں:—

"مولانا ابوالکلام کی انشاپردازی جس گہرے رنگ میں ڈوبی ہوی ہوتی ہے اسی رنگ میں مگر بیقدرے ابھیکی تحریریں علامہ عبداللہ العمادی۔ مولانا تاجور۔ نواب حیدر یار جنگ طباطبائی، حافظ اسلم جیراجپوری اور مولوی عبدالماجد فلسفی کے قلم سے نکلتی ہیں۔ اگرچہ ان میں حضرت نیاز کی عبارتوں کا سا بانکپن نہیں پایا جاتا۔ تاہم بالکل سادہ بھی نہیں ہوتیں۔ خصوصاً علامہ عمادی اور مولانا تاجور کا قلم رنگ برنگ کے بیل بوٹے اتارتا جاتا ہے ان کا قلم نقاش ہے عبدالماجد کی طرح مصور نہیں۔ عبدالماجد کی تحریریں عکسی تصویریں ہوتی ہیں جن میں کسی چیز کا عکس بعینہ محفوظ ہوجاتا ہے۔ برخلاف اس کے عمادی اور تاجور پرانی طرز کے نقاش ہیں جن کی رنگ آمیزیاں یقیناً دلچسپ، قابل قدر اور بے نظیر ہوتی ہیں۔ "فلسفی شاہ" کی تحریروں میں اگرچہ عربی فارسی کا فقدان نہیں لیکن عمادی اور تاجور کی عبارتوں کی طرح ان میں جگہ جگہ مولدیت نمایاں نہیں ہوتی"

(صفحہ ۱۱۱)

مختلف مراتب اور مدارج کی شخصیتوں کو ایک ہی زنجیر میں جکڑ لینا ستم ظریفی ہے پھر حضرت نیاز کے بانکپن کی داد ظلم نہیں تو کیا ہے۔ اس تنقیدی بحران میں تمام مصنفین ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔

"سرسید، شبلی، نیاز یا حسن نظامی جیسی غیر معمولی قلب و دماغ رکھنے والی ہستی جب زبان استعمال کرتی ہے تو اوس کو مطیع ہو کر استعمال نہیں کرتی بلکہ اس پر قابض ہو کر..... (صفحہ)

یہاں بھی پھر وہی واقعہ پیش آیا۔ سرسید اور شبلی کی بزم میں نیاز اور حسن نظامی کو کیا دخل؟ ع ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔

حسن نظامی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں کوئی غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ان کی طبیعت میں جدت اور مشاہدہ میں بلا کی تیزی ہے۔ طرز بیان صاف ستھرا اور دلنشین پایا ہے۔ بے چارے نیاز کو وہ اگر ہاتھ ہی نہ لگاتے تو زیادہ بہتر تھا۔ ان کے طرز انشاء نے نئی نسل کے مذاق کے بگاڑنے میں کافی سے زیادہ حصہ لیا ہے۔ ایک اور موقع پر ہمارے دوست، ان کا مقابلہ ابوالکلام آزاد سے کچھ اس انداز سے کر بیٹھتے ہیں کہ نیاز کی شخصیت مقابلتہً چمک اٹھتی ہے۔ ابوالکلام باوجود اپنی کمزوریوں کے ایک ممتاز اسٹائل کے مالک ہیں۔ نیاز نے کچھ ان سے خوشہ چینی کی اور کچھ ٹیگور کی شانتی بھری تحریر سے فائدہ اٹھایا۔ لیکن کسی ایک کو بھی مستقل طور پر وہ اپنا نہ بنا سکے۔ بعض تحریریں ان کی ایسی ضرور ہیں جو عاشقانہ جوش و کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہیں لیکن وہ کبھی ایک مرکز پر نہیں رہتے اس لئے ان کی انشا پردازی میں یہ عنصر غالب نہ آسکا۔ بہر حال ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ابوالکلام آزاد سے نیاز کا مقابلہ کرنا ایک عجیب ہی قسم کی جسارت ہے۔

یم۔ مہدی حسن مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"جان رسکن کی طرح مہدی حسن کی تحریریں لطافت خیال اور نزاکت الفاظ کی گلدستہ ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ رسکن کو زمانہ نے دل کی امنگیں

پوری کر سکنے کا زیادہ موقع نہ دیا اور مہدی حسن کی جواں مرگی نے ان کے ساتھ جتنی اُمیدیں وابستہ تھیں ان سب کو ملیامیٹ کر دیا..... سرسیّد اور حالی کے خوانِ یغما پر بالعموم تمام کھانے روزانہ کی طرح صاف ستھرے ہوتے ہیں لیکن انسان تنوع پسند ہوتا ہے۔ وہ ایک ہی قسم کی چیزیں کھاتے کھاتے اکتا جاتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں تغیر و تبدل ہو مگر پلاؤ اور کباب کا نہیں کہ جی بھر کھا ہی نہیں سکتے اور اگر کھالیں تو عذابِ جان ہو جائے۔ مولانا شبلی اس گر سے واقف تھے چنانچہ ان کی تحریریں تکلف اور آورد کے بعد بھی ذیر ہضم نہیں ہونے پاتیں۔ اور یہی حال مہدی حسن کا ہے..... سرسید، محسن الملک، حالی، شبلی، آزاد، نذیر احمد ۔ وہ انشا پرداز جن کی نشو و نما قدیم طرزِ تعلیم کے گہوارہ میں ہوئی ..... جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو جگہ جگہ انگریزی الفاظ انکے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں۔ لیکن مہدی حسن کی عبارتیں پڑھتے جایئے آپ کو شاید کہیں کہیں کوئی انگریزی لفظ ملجائے تو ملجائے..... یہی وہ کنجی ہے جس کی مدد سے کوئی شخص مہدی کی خوش مذاقی، پرخلوص ادبی خدمات اور اعلیٰ درجہ کی انشا پردازی کے رازہائے سربستہ تک پہنچ سکتا ہے" (صفحہ ۱۱۴)

اس قسم کا طرزِ بیان ادبی تنقید میں بجائے لطف کے ثقالت پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس سے اصل مضمون و مفہوم پر بھی ایک قسم کا پردہ سا پڑ جاتا ہے مرحوم کی تحریروں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی الفاظ اگرچہ انہوں نے کم استعمال کئے ہیں لیکن انگریزی ادب کا اثر ان کی طبیعت پر چھایا ہوا ہے۔ جملوں کی ترکیب، اظہار کے طریقے یہانتک کہ سوچنے کا ڈھنگ خالص انگریزی طرز پر مبنی ہے۔ مشرق کی شاید ایک ہی چیز ان کے حصہ میں آئی تھی اور وہ ذوق حسن پرستی ہے۔ یہ چیز ان کی طبیعت میں رچ گئی تھی اور اسی نے ان کی انشا میں دلفریبی اور "بانکپن" پیدا کر دیا۔

تنشیطِ ادب، رئیس التذکرہ، قاصر النظر، قوت آخذہ، اختراع فائقہ جیسی ترکیبیں

ہمارے دوست کے خیال میں پختہ ترکیبیں ہیں۔ آگے چلکر یہ بھی فرماتے ہیں کہ "وہ (مہدی حسن) اگر زندہ ہوتے تو بہت جلد ایک رسکن ایک آسکر وائلڈ اور ایک اسٹی ون سن لے کارناموں کی متحدہ نظیر پیش کر سکتے"۔

اندیشہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ اور ادعائی رایوں سے جنمیں تناسب اور احتیاط کی کمی ہے فن تنقید کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

ایک جگہ مولوی وحید الدین سلیم (مرحوم) کو حالی کا اور نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمان خاں شیروانی کو شبلی کا متبع قرار دیتے ہیں۔ مولوی سلیم پرانی محفل کے غالباً آخری شخص تھے جو آخر دم تک سرسید کی طرز تحریر کے پابند رہے۔ اور اس پر وہ خود بھی فخر کیا کرتے تھے۔ شیروانی صاحب کے اسٹائل کو شبلی کے اسٹائل سے بہت کم تعلق ہے۔ وہ اپنا ایک خاص طرز رکھتے ہیں جو سادگی اور گھلاوٹ میں مشہور ہے۔

کتاب میں ایسے کئی بیانات ہیں جن سے ہمیں اصولی اختلاف ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اسوقت ان پر تفصیلی ریویو نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ یہ اختلافات چونکہ زیادہ تر ذوق کے اختلاف پر مبنی ہیں اس لئے ہم ان پر زیادہ زور بھی دینا مناسب نہیں سمجھتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضامین (جو اب کتاب کی شکل میں آگئے ہیں) مصنف نے روانروی اور عجلت میں لکھے۔ دوسری اشاعت تک یقین ہے کہ مصنف کا انداز نگاہ بہت کچھ بدل جائیگا۔ اسکی طرف خود اپنے دیباچہ میں انہوں نے اشارہ بھی کر دیا ہے۔ "بہت ممکن ہے کہ بعض حضرات کے نقطہ نظر سے کسی کے متعلق رائے دینے کے باعث مجھ سے ناانصافی سرزد ہوئی ہو لیکن میں بہ حالت موجودہ اپنے ذوق ادب اور بساط مطالعہ سے مجبور رہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود میں آگے چلکر کسی کی ادبی قوتوں کے متعلق رائے بدل دوں"۔

موجودہ صورت میں بھی اس کتاب کے علم دوست حضرات کئی طرح سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مبادئ فلسفہ از مولوی میر حسن الدین صاحب بی۔ اے، ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ۔ طباعت وکتابت معمولی۔ تقطیع چھوٹی۔ صفحات ۴۰۶ قیمت عمر

ناشر:۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب اے۔ ایس۔ راپوپورٹ پی۔ ایچ ڈی کی پرائمر آف فلاسفی کا ملخص ترجمہ ہے میر حسن الدین صاحب کے فلسفیانہ ذوق سے ارباب علم ایک حد تک واقف ہو چلے ہیں۔ موصوف فلسفہ مغرب کو بے تکلفی اور سلیقہ کے ساتھ اردو میں منتقل کرنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں فلسفہ کے عام مباحث کو رواں اور عام فہم عبارت میں ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اسکے کل دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ فلسفہ اور اوسکی اصناف اور دوسرا مسائل و مذاہب فلسفہ پر مشتمل ہے۔ پھر ہر حصہ مختلف ذیلی ابواب پر مشتمل ہے۔

آرام طلب اور "سہل رو" افراد عام طور پر فلسفہ کی خشکی سے بڑے نالاں رہتے ہیں لیکن تعقل سے دشمنی اچھی نہیں۔ ہماری تہذیب، فکر اور اس کے کرشموں کی بے انتہا ممنون ہے۔ پھر فکر انسانی کی تاریخ بجائے خود ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اگر کوئی شخص فلسفیوں یا ماہرین فلسفہ کے زمرہ میں داخل نہ بھی ہونا چاہے تو اس کی عام دماغی تربیت اور ذہنی سنوار کے لئے فلسفہ کا مطالعہ ایک ضروری چیز ہے۔ اس نقطہ نظر سے یہ کتاب اردو ادب میں ایک ضروری اضافہ ہے۔ جو لوگ سلیس زبان میں فلسفہ کی ماہیت، اسکی نشو و نما اور مسائل کا سرسری خاکہ معلوم کرنا چاہیں اُن کے لئے یہ کتاب ایک اچھے رہبر کا کام دیسکتی ہے۔

اسوۂ حسنہ از جناب احمد عبداللہ المدنی صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) چھوٹی تقطیع۔ ۲۰ صفحے قیمت ۰ ر۔ ناشر:۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کی مجلس میلاد کی جانب سے آنحضرت صلعم کی سیرت مبارک سے متعلق ہر سال مضمون نگاری کے پانچ انعامی مقابلے مقرر ہوا کرتے ہیں پچیس پچیس کے چار انعام ابتدائی جماعتوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ ایک عام انعام ہوتا ہے جس پر کلیہ کا ہر متعلم بلالحاظ جماعت طبع آزمائی کرسکتا ہے۔ زیر نظر رسالہ اسی قسم کا عام انعامی مضمون ہے جس پر مضمون نگار کو سو روپیہ کا انعام ملا تھا۔ یہ مضمون اس زمانہ میں لکھا گیا تھا جب کہ صاحب مضمون الف۔ اے کی

جماعت میں تعلیم پا رہے تھے۔ اس لحاظ سے یہ رسالہ بسا غنیمت اور قابل تعریف ہے۔ اس میں آنحضرت کی پاکیزہ شخصیت اور اسوۂ حسنہ کے بعض اہم پہلوؤں پر خطیبانہ طرز میں اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ واقعات اور حالاتِ زندگی سیرت کی مستند کتابوں سے ماخوذ ہیں لیکن ان کا زیادہ حصہ، جیسا کہ خود مضمون نگار صاحب کا بیان ہے، علامہ شبلی کی سیرت النبی سے لیا گیا ہے۔

مصنوعی بیوی مترجمہ جناب محمد عباس حسین صاحب لطفی متعلم کلیہ۔ چھوٹی تقطیع۔ ۱۸۱ صفحات قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ احمد حسین جعفر علے تاجر کتب چارمینار حیدرآباد دکن

یہ کتاب آر۔ ہیج۔ پول کے ناول "ہز میک بی لیو وائف" کا ترجمہ ہے۔ قصہ بہ حیثیت مجموعی بُرا نہیں۔ اس میں گریٹرکس نامی کردار دلچسپ اور مطالعہ کے قابل ہے۔ ہونہار مصنف نے اُردو میں اچھا ترجمہ کیا ہے۔ اربابِ ادب نے اگر خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی تو عجب نہیں کہ لطفی صاحب کو اعلیٰ قسم کے مغربی ناولوں کے ترجمہ کا خیال پیدا ہو۔ اُردو کا دامن اس صنف ادب سے جس طرح خالی ہے وہ کسی علم دوست سے پوشیدہ نہیں۔

شیب و شباب براؤننگ کی نظم ربیع بن عذرا کا (چھوٹی تقطیع پر ۲۴ صفحات کا) منظوم ترجمہ۔ از مولوی محمد امیر صاحب اورنگ آبادی بی۔ اے، بی ٹی۔ مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ۔ لکھائی چھپائی دلکش اور دلفریب۔ قیمت ۶ر۔ ملنے کے پتے:۔ ۱ محمد امیر صاحب متصل دیوان دیوڑھی اورنگ آباد ۲ دفتر نظام گرٹ توپ کا سانچہ حیدرآباد ۳ عبدالغفور صاحب بی اے نظامت منزل۔ کنگ کوٹھی روڈ حیدرآباد۔

ربیع بن عذرا براؤننگ کی ایک مشہور نظم ہے جس میں عالم پیری پر گہری نظر ڈالی گئی ہے بڑھاپا عام طور پر زندگی کا ایک ڈراؤنا منظر سمجھا جاتا ہے۔ اور لوگ اس منزل حیات میں قدم رکھتے ہوئے گھبرا سے جاتے ہیں۔ براؤننگ اس کی عظمت و بزرگی پر بڑے اچھے انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ تکمیل حیاتِ انسانی کی ایک ضروری اور دلاویز کڑی ہے۔ اس ضمن میں سرمستانِ شباب کے ولولے اور زندگی کے کئی نازک پہلو بھی اس کے آغوشِ خیال میں آجاتے ہیں۔

اس نظم کو پڑھکر انسان کے دل میں اُمید و آرزو کی کرن پیدا ہوتی ہے اور روحانی اقتدار و سربلندی کی ایک ہلکی سی تڑپ بھی محسوس ہونے لگتی ہے۔ شاعری کی نزاکت' ظاہر ہے کہ اس موضوع کی گرانباری کو مشکل سے برداشت کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ براؤننگ میں جابجا غالب کا سا طرز سخن جھلکنے لگتا ہے۔

خیال اور بیان کی ان دشواریوں کے مدنظر ترجمہ کا کام سخت دشوار ہو جاتا ہے۔

عرصہ ہوا کہ ہمارے لائق دوست مولوی سید وقار احمد صاحب ایم۔ اے' ال ال۔ بی نے اسکا ترجمہ نثر میں کیا تھا۔ اب کلیہ کے ایک قدیم صاحب ذوق فارغ التحصیل مولوی محمد امیر صاحب نے اس نظم کا منظوم ترجمہ شائع کیا ہے۔ جس کو دیکھکر جی خوش ہوگیا۔ لکھائی چھپائی کی دیدہ زیبی کے علاوہ ترجمہ بھی شگفتہ اور لطیف ہے اس کا شمار اُردو کے کامیاب منظوم ترجموں میں ہوسکتا ہے۔ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے مختلف مقامات سے بعض اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

میری طرح تمھیں بھی بڑھاپا نصیب ہو — آئے تمھاری عمر میں بھی شام زندگی
حاصل تمھاری زیست کا آغاز میں نہیں — تم کو ابھی ہے دیکھنا انجام زندگی
کل تک اڑائے بادۂ گلرنگ کے مزے — پینا ہے آج دردِ مئے جام زندگی

دورِ شباب کے ہیں مزے یاد آج تک — گم تھے مرے حواس خدا کے کمال میں
تیرِ نگہاں جہانکی لبھاتی تھیں دل مرا — کھویا ہوا سا رہتا تھا حسن و جمال میں
جو گوش ہوش نے سنا' دیکھا جو آنکھ نے — ہیں قید اب تلک مرے دامِ خیال میں

اے ربِّ ذوالجلال! تری حمد کیا کروں — خالق ہے' بے نیاز ہے اور ہے کریم تو
دیکھی تھیں میں نے عہدِ جوانی میں قدرتیں — اب دیکھتا ہوں لطف و کرم تیرا چار سو
دھو ڈال اپنے ہاتھ سے ہستی کا آئینہ — ہے تیرے موقلم کی مجھے کب سے جستجو

اہل جہاں کو صرف نمایش سے ہے غرض — مقصد کی رفعتوں پہ کسی کی نہیں نظر
پر وا نہیں جو حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں — اور پورے ہو سکے نہ تخیل بلند تر
مشکور ہو سکیں نہ اگر کوششیں تو کیا! — غم کیا ہے! اگر نہ مل سکا مقصود کا گہر
پر حق کی رحمتوں سے نہیں نا امید میں — وہ میرے قول اور عمل سے ہے باخبر
اس کو پسند ہے مری نازک خیالیاں — اس کی نظر میں کام مرا ہے عزیز تر

بھرتا ہوں اب میں بادۂ ہستی سے جامِ گل — لاتا ہوں تیرے پاس کہ کر لے قبول تو
اے ساقیٔ ازل یہ تری ہی شراب ہے — پیدا ہے موج موج سے تیرا ہی رنگ و بو
گر تو لگا دے اپنا لبِ سرمدی اسے — تکمیلِ زندگی کی نکل جائے آرزو

نظم میں دو چار حصے ایسے بھی آگئے ہیں جن میں ناصحانہ رنگ بہت غالب آگیا ہے اور عام لطافت قائم نہیں رہ سکی۔ بعض مصرعوں میں بندش اور چستگی کے لحاظ سے بھی خامی نظر آتی ہے۔ یہ ہمیں اسلئے کہنا پڑا کہ ایک اچھی نظم میں اس قسم کی چیزیں زیادہ کھٹکتی ہیں۔ دو ایک موقعوں پر اصل نظم کے خیال سے بھی مترجم ذرا دور جا پڑے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے نظم کا بہت اچھا اثر مترتب ہوتا ہے۔

ہمیں یہ سنکر خوشی ہوی کہ ہمارے کرم فرما عنقریب ٹیگور کی مشہور و معروف "شانتی نکیتن" میں اردو لٹریچر کی خدمت پر فائز ہونے والے ہیں۔ وہاں کے لطیف ماحول اور روحانی فضا میں توقع ہے ان کی شاعرانہ قوتیں زیادہ وسعت سے کار فرما ہونگی۔

سید معین الدین قریشی

مدیر

کلیہ کی خبریں

سید محمد اکبر وفا قانی ۔ مدیر

مجلہ کا نیا سال مجلہ عثمانیہ نے اپنی زندگی کا پہلا سال ختم کر لیا ۔ اس قلیل مدت میں جو وقار اس نے ادبی دنیا میں قائم کیا اور جو علمی خدمات اس نے ملک اور مادر کلیہ کی انجام دیں ان کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں ۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کی دماغی کاوشوں کا یہ مرقع جن حوصلہ افزا نظروں سے دیکھا گیا اور علم و ادب کے مشاہیر نے جس فراخدلی سے اسکو سراہا وہ روشن ہے ۔ ابھی مجلہ اپنی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے ۔ فی الحال ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا کارنامہ ماضی شاندار اور دل خوش کن رہا ۔ آئندہ اس معیار کو برقرار رکھنا ہمارا فرض اور اس کی ترقی ہماری تمنا ہوگی ۔

مجلس نگرانی و ادارت اس میقات میں جناب پروفیسر اسپیٹ صاحب کے ولایت جانے کی وجہ سے ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب حصۂ انگریزی کی نگرانی فرمائینگے ۔ ہمارے مشفق دوست اور قابل مدیر جناب سید معین الدین صاحب قریشی اس شمارہ کے بعد سے بوجہ فراغت تعلیم ادارت مجلہ سے جدا ہو رہے ہیں ۔ جب ہم آپکی دو سالہ کارگزاریوں پر غور کرتے ہیں اور آپکی خداداد قابلیتوں پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں اس نقصان کا اندازہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ جو آپکی جدائی کی وجہ سے پہونچ رہا ہے ۔ آپ بحیثیت نائب صدر انجمن اتحاد مجلہ کے وجود میں لانے کے باعث ہوئے اور بحیثیت مدیر شعبہ اردو آپنے اسکو اس کے موجودہ اعلیٰ معیار تک پہونچایا ۔ آپکی انتھک محنت پر خلوص کارگزاری اور قابلیت نے مجلہ عثمانیہ کو ترقی دینے میں جو حصہ لیا ہے وہ ہمارے لئے

چراغِ ہدایت ہے ہم آپ کے کارناموں کو کبھی بھول نہیں سکتے اور دُعا کرتے ہیں کہ عملی دنیا میں خدا آپ کو اپنی قابلیتوں کے استعمال کرنے کا اس سے زیادہ موقع دے اور ملک و ملّت کے لئے اس سے بڑے اور اعلیٰ خدمات انجام دیسکیں۔

گوشوارہ آمد و خرچ مجلّہ عثمانیہ جلد اوّل

ابواب آمدنی	وصول شدہ						واجب الوصول						جملہ					
	سکہ عثمانیہ			سکہ کلدار			سکہ عثمانیہ			سکہ کلدار			سکہ عثمانیہ			سکہ کلدار		
	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی	روپیہ	آنہ	پائی
چندہ از طلبہ کلیہ جامعہ عثمانیہ ۳۵ تا ۳۶ ف	۱۳۳۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۳۳۲	۰	۰	۰	۰	۰
" " واساتذہ " ۳۶ تا ۳۷ ف	۲۰۱۸	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۰۱۸	۰	۰	۰	۰	۰
" " دیگر خریداران جلد اول	۶۸۰	۷	۰	۱۱۰+	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۶۸۰	۷	۰	۱۱۰	۰	۰
" " " " دوم	۱۴۶	۸	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۴۶	۸	۰	۰	۰	۰
واجب الوصول از عام خریداران	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۴۶۶	۵	۰	۲۵	۹	۰	۴۶۶	۵	۰	۲۵	۹	۰
چندہ، ۹ رسالے وصول طلب از محکمہ تعلیمات	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۱۶۴	۰	۰	۰	۰	۰	۱۱۶۴	۰	۰	۰	۰	۰
چندہ وصول طلب از طلبہ قدیم در انگلستان امریکہ و جرمنی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۹۶	۱۰	۰	۰	۰	۰	۹۶	۱۰	۰
جملہ	۴۱۷۶	۱۵	۰	۱۱۰	۰	۰	۱۶۳۰	۵	۰	۱۲۲	۳	۰	۵۸۰۷	۴	۰	۲۳۲	۳	۰
ابواب خرچ جلد اول							**واجب الادا**											
خریدی کاغذ برائے طباعت ۳۲۰۰ رسالہ جات	۱۳۶۲	۱	۸	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۳۶۲	۱	۸	۰	۰	۰
اخراجات طباعت و کتابت جلد اول	۹۷۵	۲	۸	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۹۷۵	۲	۸	۰	۰	۰
اخراجات ڈاک " "	۲۵۲	۶	۸	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۵۲	۶	۸	۰	۰	۰
انتظامی الونس	۲۳۶	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۳۶	۰	۰	۰	۰	۰
صادر	۹۰	۴	۱۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۹۰	۴	۱۰	۰	۰	۰
اخراجات متفرق	۲۱۶	۱۴	۵	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۲۱۶	۱۴	۵	۰	۰	۰
رقم واجب الادا در المطبع شکر عالی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۴۱۸	۱۲	۱۱	۰	۰	۰	۱۴۱۸	۱۲	۱۱	۰	۰	۰
اخراجات جلد دوم	۱۵۷	۴	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۵۷	۴	۰	۰	۰	۰
جملہ	۳۲۹۰	۲	۳	۰	۰	۰	۱۴۱۸	۱۲	۱۱	۰	۰	۰	۴۷۰۸	۱۵	۲	۰	۰	۰
میزان	۸۸۶*	۱۲	۹	۱۱۰	۰	۰	۲۱۱	۸	۱	۱۲۲	۳	۰	۱۰۹۸	۴	۱۰	۲۳۲	۳	۰

+ جلد دوم کے بقایہ چندہ کی رقم کلدار اسی میں شامل ہے۔

* نزد خازن مبلغ سکہ عثمانیہ ۳۰۴ - ۱۲ - ۹ - و سکہ کلدار ۱۱۰۔

جمع بدفتر کلیہ سکہ عثمانیہ ۵۸۲ - شد منجانب محمد نظام الدین خان صاحب مجلد ۲۲ شہریور ۱۳۱۰

آج بتاریخ ۲۴ شہریور ۱۳۱۰ ہم نے حسابات مجلہ عثمانیہ کی تنقیح کی اور حسابات کو صحیح پایا۔

شد محمد تحظ

پروفیسر حمید احمد خان

پروفیسر کشن چند

انتخاباتِ مدیرین جناب سید معین الدین صاحب قریشی کے بجائے شعبۂ اُردو کی ادارت پر حسبِ تصفیہ مجلس انتظامی مجلہ جناب محمد جلال الدین صاحب اشک کام کریں گے۔ اور انکی جگہ پر جناب خواجہ محمد معین الدین صاحب سابق منتظم مجلہ نائب مدیر رہینگے۔ اور جناب حمید اللہ صاحب منتظم کے فرائض انجام دینگے۔ ہم ان حضرات کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

نواب مسعود جنگ بہادر کا ودائی جلسہ نواب مسعود جنگ بہادر کے وداعی جلسے جس گرمجوشی سے مختلف تعلیمی اداروں نے منعقد کیے اس سے عام طور پر لوگ واقف ہیں۔ اس خصوص میں ہمارے ارکانِ جامعہ کی انجمن نے بھی ایک جلسۂ چائے نوشی ترتیب دیا۔ اور اس طرح تعلیمات کی ایک ہر دلعزیز شخصیت کو وداع کیا۔ اس سلسلہ میں یہ خبر نہایت مسرت سے سُنی جائیگی کہ نواب صاحب کو انکے گوناگوں خدمات جو جامعہ کے لئے خصوصاً اور حیدرآباد کی تعلیمی ترقی کے لئے عموماً آپ نے انجام دی ہیں ان کے صلہ میں مجلس رفقاء جامعہ نے ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری دینے کی سفارش کی ہے۔

اساتذۂ کلیہ میں اضافہ اس سال کلیہ کے اسٹاف میں جناب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی (برلن) بحیثیت مددگار پروفیسر عمرانیات Sociology وزبانِ المانی German مقرر کئے گئے ہیں۔ صاحب موصوف ہمارے کلیہ کے قدیم طالب علم ہیں۔ ہم ڈاکٹر صاحب کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہیں۔ پروفیسر اسپیٹ صاحب کی رخصت کے زمانہ میں عارضی طور پر مسٹر ملکارجن راؤ صاحب کا بحیثیت مددگار پروفیسر انگریزی تقرر ہوا ہے۔ اور مولانا وحید الدین صاحب سلیم مرحوم کے سلسلہ میں حسب ذیل منصرمانہ تقررات عمل میں آئے ہیں:۔ بجائے مولوی سلیم صاحب۔ جناب سید سجاد صاحب مددگار پروفیسر۔ بجائے سید سجاد صاحب۔ جناب قاری سید کلیم اللہ صاحب اور بجائے قاری صاحب ہمارے کلیہ کے قابل فرزند جناب عبدالقادر صاحب سروری ایم۔ اے، ال ال۔ بی۔

یہ امر نہایت مسرت بخش ہے کہ جماعت ہائے۔ ایم۔ ایس سی کے افتتاح کی اسکیم میں ہمارے قابل دوست ڈاکٹر سید حسین صاحب کا پروفیسری کیمسٹری کی خدمت پر تقرر ہوا ہے۔ صاحب موصوف جامعہ کے سب سے پہلے امتحان بی۔ اے میں تمام اُمیدواروں میں اول آئے تھے اس بناء پر انھیں (دو اور طالبعلموں کے ساتھ)

جامعہ کی جانب سے یورپین وظیفہ تعلیمی عطا ہوا تھا۔ موصوف حال ہی میں بلدہ وارد ہوئے اور کام شروع کر دیا ہے آپ جامعہ کے سب سے پہلے گریجویٹ ہیں جنہوں نے یورپ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری باامتیاز تمام حاصل کی۔

موتمر مستشرقین میں جامعہ کی نیابت جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب بی لٹ، پی۔ ایچ۔ ڈی کو امسال منجانب جامعہ عثمانیہ آکسفورڈ کی موتمر مستشرقین میں جامعہ کی نیابت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اب انگلستان پہنچ گئے ہیں۔

برادران کلیہ بلاد یورپ میں اس سے قبل ہم نے ڈاکٹر سید حسین صاحب و ڈاکٹر ولی الدین صاحب کو انکی نمایاں کامیابیوں پر مبارک باد دی تھی اس سال مولوی فاضل میر سید علی نجف صاحب ایم۔ اے، ال ال بی (عثمانیہ) کو جامعہ آکسفورڈ سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری قانون اسلام کے متعلق ملی ہے۔ ہم آپ کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ میر صاحب موصوف اب خاص طور پر بی۔ سی۔ ایل کی تعلیم میں مصروف ہیں۔ جناب رضی الدین صاحب صدیقی بی۔ اے عثمانیہ ریاضیات میں سینیر آپٹیمس کے درجہ میں 'ٹرائی پس' کے امتحان (حصہ دوم) میں کامیاب ہوئے ہیں۔ صاحب موصوف نے صرف دو سال میں یہ امتیاز حاصل کیا جو قابل تعریف ہے۔ سنا جاتا ہے کہ آپ کا ارادہ ہے جرمنی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے کام کریں۔ ہم آپ کی روایتی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

برادران کلیہ دیگر ہندوستانی جامعات میں امسال علیگڈھ میں کلیہ کے جو طلبہ تکمیل تعلیم کے لئے گئے تھے ان میں سے عموماً سبھوں نے اپنے اپنے شعبوں میں کامیابی حاصل کر لی۔ معاشیات کے امتحان ایم۔ اے میں جناب احمد عبدالعزیز صاحب نے بدرجہ دوم اور یحییٰ عثمانی صاحب نے بدرجہ سوم کامیابی حاصل کی۔ انگریزی ادب میں ہمارے دوست مجلہ کے شعبہ انگریزی کے سابق مدیر جناب سید فضل حق صاحب نے ایم۔ اے کا امتحان کامیاب کیا اور حسب ذیل حضرات نے بی۔ ٹی کی ڈگری حاصل کی۔

۱۔ جناب محمود علی بیگ صاحب۔ بی۔ اے عثمانیہ۔

۲۔ جناب شیخ علی حسین صاحب۔ بی۔ اے عثمانیہ۔

۳۔ جناب عبدالقادر صاحب بی۔ اے۔ عثمانیہ
۴۔ جناب سید اسداللہ رضوی صاحب بی۔ اے۔ عثمانیہ۔
۵۔ جناب مسعود حسن خانصاحب بی۔ اے۔ عثمانیہ۔
۶۔ جناب عبدالجبار صاحب سبحانی بی۔ اے۔ عثمانیہ صاحب

جامعہ ڈھاکہ میں اس سال ہمارے ہاں کے طالب علم جناب سید محمد یونس وفاقانی بی۔ اے (عثمانیہ) نے طبیعیات میں اعلیٰ نمبروں سے بدرجہ دوم (ہائی سکنڈ کلاس) ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری لی۔ اور عملی امتحان میں جامعہ کے تمام طلبہ میں اول رہے۔

تقررات طلبہ اس سال محکمہ صنعت وحرفت میں ایک مددگار ناظم کی جگہ خالی ہوئی تھی جس کے امتحانی مقابلہ میں جناب علی محمد خانصاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) اول رہے اور صاحب موصوف کا تقرر عمل میں آیا۔ خانصاحب موصوف ہمارے کلیہ کے خاص خوبیوں کے طالب علم ہیں۔ آپ کا ادبی مذاق اور ساتھ ساتھ کھیل تفریح کے کاموں سے دلچسپی ایسی چیز ہے جو شاذ ہی نظر آتی ہے۔ آپ ہماری کرکٹ ٹیم کے مشہور کپتان رہے ہیں۔ اس خاص کھیل کی ترقی کا سہرا آپ ہی کے سر رہا۔ خاندانی لحاظ سے آپ نواب فخر الملک بہادر کے داماد ہیں۔ طبقۂ امرا میں اس قسم کے تعلیمی شوق اور عملی جدوجہد کی مثال شاذ ہے۔ ہم صاحب موصوف کی کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ہماری انجمن اتحاد کے نائب صدر جناب خواجہ محمد احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) اس سال دفتر آثار قدیمہ کے ریسرچ اسکالر مقرر ہوئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ خدمت مہتمی پر مامور کئے گئے ہیں ہم موصوف کو انکی کامیابیوں پر مبارکباد دیتے ہیں۔

انتخاب سول سروس ابتدائی مراحل کے طے کرنے میں ہمارے بعض قابل طالب علموں کے رک جانیکے باوجود امتحانی مقابلہ میں اس سال ہمارے کلیہ کے دو طالب علم کامیاب ہوئے۔

جناب ابوالنصر فتح اللہ صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) اور جناب ناگیشری پرشاد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) نیز سالانہ امتحان میں سال حال ہمارے تینوں طالب علم کامیاب رہے۔ بالخصوص جناب ظہیر الدین صاحب تمام طلبہ میں اول رہے اور طلائی تمغہ کے مستحق قرار دیئے گئے۔ آپ ہماری انجمن طلبائے قدیم کے سرگرم معتمد بھی ہیں۔

ہم آپ کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

ایشیائی وظائف سال حال ہمارے کلیہ کے حسب ذیل طلبہ کو ایشیائی وظائف عطا کئے گئے۔

۱۔ جناب علی الدین احمد صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) کو۔ علاج حیوانات کی تعلیم کے لئے۔

۲۔ جناب محمد علیخاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ)۔ طبیعیات میں ریسرچ کی تعلیم پانے کے لئے۔

آخرالذکر صاحب رائل کالج آف سائنس (لندن) میں شریک ہیں اور جامعہ لندن میں بی۔ ایس سی آنرز کی تعلیم پا رہے ہیں۔

نتائج امتحانات امتحانات کے نتائج میں سال حال جماعت بی ایل۔ بی۔ سال اول و دوم کا نتیجہ نہایت شاندار رہا۔ باوجود طاعون اور دوسری رکاوٹوں کے جو دوران سال تعلیم میں پیش آئیں۔ یہ نتیجہ ہر حیثیت سے جناب صدر صاحب کی دلچسپی و انتظام فاضل اساتذہ کی محنت و شفقت اور طلبہ کی فرض شناسی کی بین دلیل ہے۔ یہاں پر ہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری جامعہ کے شعبۂ قانون کا معیار کسی حیثیت سے ہندوستان کی دوسری جامعات سے کم نہیں ہے۔ اور جو ممتحنین کی (جو قریب قریب سب باہر کے ہیں) رائیں طلبہ کی عام قابلیت اور قانون دانی کے متعلق آئی ہیں، وہ یقیناً جس کسی تعلیمی ادارہ کے متعلق ہوں قابل فخر و ناز ہیں۔ اس کامیابی پر جو اس شعبہ کی روایات میں داخل ہے صدر و پروفیسر صاحبان شعبۂ قانون کی خدمت میں ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ امتحانات ایم۔ اے شعبۂ دینیات و السنہ کا نتیجہ بھی نہایت اطمینان بخش رہا۔

کھیل کھیل میں چند دنوں سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے کلیہ کی عام دلچسپی اور سرگرمی سست پڑتی جا رہی ہے۔ اسکی وجہ یہ تو ہرگز نہیں ہے کہ ان طلبہ کی جو کھیل میں حصہ لے سکتے ہیں ہمارے پاس کمی ہے۔ کھیل کی زمین کلیہ سے بہت دور ہونے سے اور کچھ طاعون کی پریشانیوں کی وجہ سے شاید یہ صورت پیش آئی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے نوجوان ساتھی بہتر سے بہتر ٹیم تیار کر کے اپنی پرانی روایتی شہرت کو از سر نو قائم کریں گے۔ اس سال ٹینس جونیر کورٹ باغ عامہ میں جناب قادر علیخاں صاحب نے فائینل کی بازی جیتی ہم ان کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

وفات حسرت آیات آخر میں ہم مختصراً ایک نہایت دلخراش اور اندوہگیں خبر لکھ رہے ہیں جس کی تفصیل "وفات نامہ" اور مولانا امجد کے نوحہ سلیم میں آچکی ہے۔ ہمارے کلیہ کے مایۂ ناز استاد اور اردو کے مجتہد وحید الدین صاحب سلیم مرحوم کا اس دنیا سے رخصت ہونا نہ صرف جامعۂ عثمانیہ بلکہ دنیائے اردو کے لئے ایک نقصان عظیم ہے۔ مولانا نے جو خدمات زبان اردو کی بہ حیثیت ایک سنجیدہ کار صحیفہ نگار ادا کیں اور دار الترجمہ میں جو کام اصطلاحات کی تیاری میں انجام دیا وہ ہمیشہ زندہ رہیگا۔ کلیہ کے پروفیسر کی حیثیت سے آپکی فرض شناسی اور ادائی خدمات میں وارفتگی اپنی آپ مثال ہے۔ مولانا سلیم مرحوم کی یاد طلبہ اور کلیہ کے دل سے کبھی محو ہونیوالی نہیں۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اللہ ہی باقی ہوس۔

For this reason I have determined to learn much about the saints, the reformers, the generals, the scholars, not those who are much talked about but those who really are so and thus drink in the silent and deep effect of their virtues unawares. I can build up my character in this way alone and never by reading *Jude the Obscure*.

I have nothing to say about the exact sciences where in spite of yourself you will find two and two always make four. You cannot deny, you cannot doubt, all you can do is sometimes to speculate and even then you cannot help being exact. There is something indeed very seriously harmful in these sciences. They cultivate in us a scepticism and aridity of outlook to an exaggerated extent.

The essays! There is much good in them. From a purely educational point of view an essay is the most valuable document of all. It is condensed wisdom so long as I read it wisely: because the writer has a very limited space in which to pack his thoughts. In an essay thoughts run much faster than language, and this gives it its intrinsic value. Further, it is much more economical to read it than anything else.

Now, to take up a new idea, let me confess I have never read during the last five years any newspaper or literary magazine without, so to speak, a certain misgiving. But the good advice of my several friends has totally changed my views and I have decided to take newspaper doses, homeopathic-wise, once a week just to assure myself whether the world is likely to hold together any longer.

So far I have placed before you a long list of what I have read and what I never even wish to read. But that is not all. It is my belief that the individuals of an obscure nation always read and read with pleasure all that is worthless and harmful, whereas, on the contrary, a citizen of an active and prosperous nation reads only that which is good and helpful to him in the long run.

Lastly, let me assert that I must read less but think and feel much, so that the Bacons and Ruskins and Carlyles may not push me back and establish with me an alliance which is derogatory to myself. Bacon should be my guest and not my dictator. Therefore, all external knowledge, so long as it remains with me like a decent guest, is good and helpful in my advance to the kingdom of what is called—originality.

H. GHULAM MUHAMMAD

I was simple enough to lodge in my memory the honourable Beowulfs and Cynewulfs, the Caedmons and Drydens with due reverence and hospitality. But I find now that the Johnsons with their circles are having harsh conferences in the coffee-houses of my brain and sometimes becoming so ill natured as to ask the Maxwells and Faradays themselves with their train of Cos O S and sin O S to occupy the dark corners, of the club. But this is not a very grave mishap, because, when, for a short time, I do not meddle with these gentlemen, the loudness of their colloquy abates until at last these are dead men again. This naturally must be so. Even twenty men cannot make a horse drink water. He must feel thirsty and then alone is water attractive.

Be that as it may, I am fond of reading histories and biographies, for I find much good in them. But in this case too my selection is restricted; I never even wish to touch histories which teach me diplomacy, craftiness and treachery but only such as have a wholesome effect on me, and which show how sublime humanity is. I want to know only the glory of the past, and leave its wickedness and evil to those who may find any pleasure in them. For this reason I never waste my time in reading an account of the donwfall of a certain empire because I believe no good can come of it. I wish to know all about a nation either at its zenith or struggling to elevate itself to sublimity, for such nations alone possess the virtues which you and I may sigh to own. So much may be said of biographies but there is one thing more. Why should I read the life of Johnson—that ordinary common mortal? The world is full of such persons, the average men. But should we read his life because Boswell is a literary giant and hypnotises us with his prodigal artistic feats? Surely not, why should I read a book to know about Johnsons—that is average men—when so many of them are around me and meet me in every street and town? It is far better to see them rather than their portraits. But Scott's life appeals to me. He is a hero. His industry, his liveliness, his impetuosity, his speculative nature, his firm determination, his love for his children and animals, in fact, his many virtues cannot fail to touch a responsive chord in us while we read him. He is not an average man and therefore is rare. All Lincolns, all Peters, all Babers and Akbars have a great charm for me. They do not teach me but excite me and make me feel. I have a great desire to make a special study of the heroes of Islam who within thirty years achieved such marvels that history cannot show any parallel. I wish to have virtuous men around me because even the slightest association with a villain is likely to violate the sanctity of an average man's heart.

all righteous men. How far this is right may be ascertained by reading a few pages from Thomas Hardy's *Jude the Obscure* a novel of 'Character and Environment,' say page thirty to page seventy. At any rate, in my case at least, novel reading not only proved fruitless but was a little injurious too. There would not be much harm however if women after finishing their household works, were to read a novel for an hour or two just to wash away the bad effect of dust and smoke from their person. But men, especially young, should never invite weakness and moroseness by indulging themselves in such ignoble sedentary pleasures, when they can very well afford to spend as much time in physical exercise.

My aim in reading is not to gain knowledge, not to make myself a so-called well informed man, not to make my brain a storehouse for facts and figures, but to attain the kingdom of culture by a rational development of my various faculties. To this end I read the plays of Shakespeare but do not wish to know which theory is right—the Baconian or the other. It is enough for me to know at present that the author of these plays was a wise man and not devil in disguise. What blessing on earth will it confer upon me to know that Shakespeare had some complications with a certain dark lady and Johnson's father suffered from this or that complaint, and that Goldsmith had to play on the flute in order to beg or win his subsistence! I was never more foolish than when, late in the night, I sat upright, rubbing my eyes to keep them wide open, the electric lamp glowing above me and the human candle burning within me, repeating to myself, "Chaucer died in the year 1700—Chaucer died in the year 1700 and Chaucer dying fifty times a minute" as if his death were something very ponderous to me, or murmuring these dreamy vague words that the style of (a first class chatter-box of his time, no doubt) is lucid, pure, brilliant, has elasticity, solidarity, majesty, and is full of wit, fire, passion and imagination and a dozen more such abstract qualities. Many a time I determined to learn by heart thirty or forty such high-sounding words and, while correctly describing the style of the man, pour them out on the paper—not all of them I mean, because I must use my common sense there or else I might make the rest of the famous writers angry with me, but half a dozen, if selected two in every decade, is quite a sufficient number. Many, many precious months of hard labour have I spent in pouring over the lives (meagre in most cases) of the garrulous persons of a foreign clime and in remembering the one-way-pronounced and the other-way-spelt names and the dates of deaths and births and the list of futile books and papers mainly written I suppose, to trouble me—living in the very heart of India in this year 1928.

thought from him and judge it in the light of your own experiences. If he says something which is quite agreeable and sane, you must never think him a dunce but hail him as your friend, but if he irritates you from the beginning to the end, you must thank him and admire him because he is an active writer, after all, who leads you to look at the other side of things.

But you must pay no reverence whatever to a writer who is quite passive, that is, one who neither irritates you nor agrees with you. In this connection there is one more salient point which must not be left untouched and that is, how to read a book economically? In a great number of books I have read (and I read many) I have observed there is not much that is wholesome enough to be lodged in our memories. A happy thought occurs to an author and he begins to juggle with it, presumably with a view to making it more attractive and emphatic.

Take as a good example Goldsmith's *Vicar of Wakefield*, in which the author wishes earnestly to impress upon his reader that a poor person should never try to cope with the rich as it is in the long run a dangerous thing; and for this he has written whole volume. Leaving aside what the most accredited critics have to say about this book I can safely affirm that, from a purely educational point of view, reading such a book (especially when the reader happens to be an Indian) is not only not economical but a degrading action, as he is then reading the work of a man who thinks him to be a dunce. The best way therefore to read such a book is to read only the headings of its various chapters. It is both economical and quite becoming to your dignity and self-respect.

Having said so much about reading I now wish to say a few words about the proper choice of a book. Well! when your brain has been developed a little it is far better if you deny the assistance even of the wisest and the most cultured, and follow the impulse of your own preceptor who resides in your breast and who has a vigilant watch over all your deeds. I have now come to that point in this present composition where I should leave all my dogmatic assertions, however wise they may appear to me, and engage myself merely in recording a few of my own impressions. I never read a book simply for the sake of amusement; hence fiction and light literature have no value with me. Consequently, I read few novels and scarcely any stories. People may find an army of advantages in doing so, for instance they may acquire a profound insight into the human mind and, what is wonderful, may build up their character and make themselves

mere presumption to believe that knowledge is external and the teacher an agent to thrust it into us as if he were a hypodermic syringe and knowledge the mysterious liquid employed. Let the professor then directly proceed to peel off the skin, and, the operation being over let him stop. But if he goes on further to squeeze out the juice as well, he is (is he not ?) doing a real mischief. For this reason we must be careful in the choice of professors. Let the best men of the age alone be made professors and let all those not possessing the highest quality of culture be allowed to take care of the several futile human transactions for the professorial occupation which is undoubtedly the noblest of all, though it may not be a very romantic one.

In the case of books, magazines and such cognate things this principle is applicable in a tenfold degree. We must read books. It is indispensable. But what kind of books, and to what extent we are required to read them is a grave problem which should be solved before we touch any book. But if we are not in a position to discriminate between a good book and a bad one (which owing to an overwhelming bulk of the printed stuff is certainly the case with every student in his earlier career) let us never be ashamed to allow our judgment to be swayed by the judgment of those who are far above us.

The selection of a book having been made you must try to think the author a typical fool which is not by any means a very difficult task if you are a strong man ; and even if you are a weak person you can at least pretend to do so and this affectation, if practised for a considerable time, may change into very nearly a real one.

Then alone, if I may be allowed to assert it, are you an improvable reader, although Stevenson does not seem to agree with me. You must never for a moment bear with the author and if you find him saying anything which cannot tally with your own views, throw the book away in a state of indignation, and when after a time your anger subsides take it up politely and consider the whole matter once more. This habit of contradicting an author at each step must be strongly cultivated in us from the very time we begin to read any book for the sake of ideas, so that we may save ourselves from imbibing the slavish mentality which makes us liable to all sorts of influences from within as well as from without and deflavours the sweet aroma of our nature itself. The author had his own experiences, whims and idiosyncrasies (which he has so earnestly put down in the pages you are reading) and you have your own ; hence it is more rational to take a happy

of scholars if only he has a mind to do so. It is by the universal influence of the press that—East is no more East nor West—West, but the two are continually tending towards each other—no matter whether as friends or otherwise. And above all, it is the press alone that has enabled me write this present something and thus add a little to the so-called literary stuff already dominating this press-ridden world. These considerations no doubt, led me to believe that reading, after all, has much good in it and that I was quite unjust when I conceived an aversion for the press and its myrmidons.

But I did not stop there, I reconsidered the whole matter with great circumspection in the light of what real education and culture mean. It is my firm belief that education is not an external thing: it is within us and not outside of us. It is a part of ourselves. *Every man is born a scholar and will die an idiot if he reads too much.*

I am the viceroy of God on earth, as scripture informs me. "God is mindful of me," the pious Hebrew will never for a moment hesitate to believe that. I do not readily remember it but this much is certain: He taught me every thing that I needed, and when he sent me to this pleasant world to govern the elements of Nature; I was a perfect scholar and the mystery of the chaos around me was not yet a dark enigma.

Shall we then abolish all the educational institutions, batter down the magnificent college-buildings and turn off the most polished gentlemen, I mean the Professors, to find their subsistence elsewhere? Surely not! It would be foolish to do that. As I said we have a store of education within us, but then like all natural things it is wrapped under some proper covering; your trees have their bark, the essence of your mango is enclosed, every thing natural has its sheath. You cannot refresh yourself with the juice of an orange unless you peel off its rind. Likewise, this latent something in man—call it education—cannot show its splendour unless you remove the covering so that it may.

"Be through his lips to unawakened earth

"The trumpet of a Prophecy! "and" drive his living thoughts over the universe to quicken a new birth!"

Our great educational institutions therefore must never be abolished; it is there alone that we get these coverings peeled off. Our professors, let any one think what he may, are truly the heavenly shears to cut off this sheath. It is a

Why to read ? How to read ? and What to read

I MAY not, in any way, be taken as grumbling foolishly when I confess that the store of energy in me is not infinite. And I always find that this latent energy is incessantly changing itself into a kinetic one to do some good or evil and then to fly away from me to rejoin the inexhaustible ocean of energies whence it came. While, on the other hand, the press is becoming more powerful everyday and in addition to millions and millions of books which it has turned out as if they were so many bricks, it has undertaken lately, I presume, to leave no spot on earth habitable or sometimes perhaps inhabitable, unspoilt, by sending armies of newspapers, magazines and what not to spread throughout the world more tyranny and mischief than any Timour or Ivan could conceive. Even now as I am writing, there is a fine looking fellow three inches by four lying complacently enough on the floor and yet staring at me fiercely as if it were possible for it to scare me out of my wits and thus check me from uttering any blasphemous things against the press or its brotherhood. This impertinence, however, made me very angry and consequently I rose from my seat, took the fellow up in my hands and asked him why he was so impertinent. This fellow, to be sure, like his kind, was cunning enough to change his attitude, and when he found that no amount of staring could prevail on me, he suddenly altered his method and took to a new stratagem which lay in flattering and persuading me. His object was to teach me the creed of the press, mine was to hate the press and its colleagues. He said to me politely enough, " Friend, be not angry with me, for I am only the missionary of truth and knowledge. I open the window of your soul ; I make you man in fact."

I was bewildered. By degrees however I began to question and analyse his most enlightened statements, which, seemed to be sane enough. I thought it was mainly due to the press that education has become so common and so cheap that even the poorest can afford to enlist himself in the roll

preaches that every man will have his ' measure for measure !' The pantheism of a Shankarite, and the Vedanta of a Sufi suggest that all is God and therefore. All is well that ends well', because every thing ends in God, so, this end it is that is the Keynote of the life-philosophy. The different titles of Shakespeare's plays then may be grouped together thus :—" Life is neither a Tempest nor a Mid-Summer Night's Dream. It is more often a " Comedy of Errors." You may find it " As you Like it " or " Make much Ado " about nothing and declare " Love's Labours Lost." But experience will show you that 'All is well that ends well ' and every man will have his ' Measure for measure. '

But in this scientific age man has found that life has greater comforts only by scientific improvements. If we measure values by the standard of happiness the contribution of science is undoubtedly great. The world has improved immensely and the general standard of material comfort too has arisen enormously. Phyiseal suffering has been considerably reduced. Despite the appearance of new diseases, life is made healthier. Ever since the war there has been greater kindliness and a higher sense of social duty. But even in the West, there are some thinkers who characterise this view of life as ' sceptical and materialistic.' As against this, they present the spiritual view of life. The universe, they argue, is the struggle of the finite to reach the Infinite. They say ' seek the Eternal' and ' prepare yourself for a fuller and freer life, ' The pilgrim is asked to make every action a consecration and the whole life a dedication to God.

G. A. CHANDAVARKAR

At times human life seems to be full of contradictions. The world is looked upon by some to be ' an unsubstantial faery place.' It is unreal and a huge dream. A pessimist sees miseries, privations, tribulations, diseases and death more than its blessings and in a moment of despair cries out "Can the good God be the author of all these miseries ?" Is not this world a bubble ? Thus argues the weeping philosopher. This view may for our purpose be termed as ' *The tempest* ' view. Life is an ocean wherein blows the tempest, mighty enough to drown the mightier empires and civilisations.

II. *The Epicurean's View* : (*The Mid-Summer Night's Dream*). On the other hand the epicurean like the *Charvaka's* of ancient India looks to another side. ' *Eat, Drink and be Merry* is his motto. Enjoy the blessings of life as far as possible. Fly below the sensuous plane because every thing will end in death. Shakespeare's *Via Media* :

The truth seems to lie somewhere in the middle. If life is full of miseries and disappointments, it is more due to our own errors of omission and commission. What a *Comedy* of our own errors is this life ! We can make it ' *As we Like it.*' How often have we not repeated that one error has led to another error and felt that " Life is a comedy of Errors !" What then do these three titles of Shakespear's plays teach us ! 'Life is neither a Tempest nor a Mid-Summer Night's Dream. It is more often a ' Comedy of Errors'.

III. *The View of Despair* :

If there are sturdy theists who look up to God as the be-all and end-all of life,there are irreconcilable atheists and agnostics. They let alone God but are ever busy-bodies. They make 'Much Ado About Nothing !' They care more for pelf and power and burn incense at the shrine of the Goddess of Fame. More of words and less of deeds is their motto. They start associations and court fame. But ultimately when no solid work is turned out and friends desert them, despair dogs their footsteps and they declare 'Love's Labour is lost.' How ungrateful and unreasonable the world seems to be ! Have we rendered only ' thankless tasks ? 'We took the world ' As we like it' and made much ado about nothing. Only to find, also, ' Love's Labour ' is ' all lost !' We at times ' tamed the shrew ' but even ' the merry wives ' could not bring us solace.

IV. " All is Well that Ends Well !"

But this despondent philosophy or counsel of despair is not the correct view. It may make us more cynical. Consolation should come to us from some other source. If the end of life is well, all is well with it. The Karma theory of Hindu philosophy

Shakespeare's Plays and Views of Life.

Shakespeare, the prince of English poets and dramatists, was never a philosopher in the sense in which Plato and Aristotle were. To draw out any metaphysical theory or a philosophic doctrine from his wonderful tragedies and comedies is, therefore a vain attempt. Equally futile is the endeavour to read any definite moral lesson from his numerous dramas. To say that Shakespeare is neither a philosopher nor a moralist does not in the least detract from his greatness as a profound student of human nature. 'As his eye in a fine frenzy rolled and glanced from earth to heaven and from heaven to earth, and as imagination bodied forth the forms of things unknown, his mighty pen turned them to shape and gave to airy nothing a local habitation and a name.' This wonderful process of poetical composition coupled with the pictorial quality of his vivid imagination has been the source of wonder and consolation to philosophers, statesmen, and divines alike. It is Walter Raleigh who compares his poetry to a 'wedding cake' meant not to eat but to dream upon.

It was Ben Jonson who spoke of him as the 'Soul of the age' and said 'He was not of an age but for all time!' To us it seems, even the *titles*, let alone the *characters*, of his dramas are worthy of embodying a unique philosophy of life.

In several ages and climes philosophers and thinkers have been propounding different views of life. Strenuous attempts have been made from Socrates down to Tagore to solve the riddle of life. Though there can be no finality in its solution, the views themselves are very significant.

Broadly speaking there are two or three views which may be classified thus :—

1. *The pessimistic view* : (*The Tempest* :)

How vivid is his expression of the feeling when the Divine Music enters the soul !

"The holy breath of the music runs from sky to sky. The holy stream of thy music breaks through all stony obstacles and rushes on."

His conception of the Lord is varied. Sometimes He is the infinite lute-player, sometimes the Divine Singer, sometimes a lover, whom he approaches with affection. He does not conceive of him as

One undivided, indivisible Soul
And a great divinely destined goal

which conveys to us the conception of nothing more than merely a vague Entity living far from us. But Tagore is a greater philosopher. He has lived with his Lord in his conception for years together. He has developed in him an affection, an endearment and he throws off all the masques of formalities and addreses him

"I ask for a moment's indulgence to sit by thy side. The works that I have in hand, I will finish afterwards."

Tagore is like Shekkar in his romance ' Victory ' as distinguished from most other poets, whose highest perfection is dull knowledge, dull wisdom and whose brightest attainment is a masterly use of words. But for Tagore's poetry words are of no use. They are far too inferior.

" His song sometimes seemed to come from the heart of the South wind, and sometimes from the straying clouds of the hill tops. It came with a message of tryst from the land of sunrise and it floated from the verge of sunset with its sigh of sorrows. The stars seemed to be the stops of the instrument that flooded the dreams of the night with melody. The music seemed to burst all at once from all sides, from fields and groves, from the shady lanes and the lonely roads, from the melting blue of the sky, from the skimmering green of the grass. They knew neither its meaning nor could they find words to give utterance to the desire of their hearts. Tears filled their eyes and their life seemed to long for a death that would be its consummation."

S. M. KIRMANI

(Nizam College.)

Young leaves grow green on the bunyan twigs
And red on the peeple tree
The honey birds pipe to the budding figs
And honey blooms call the bee.

But for Tagore these things have a meaning deeper than mere objective scenery. He begins to feel that

"Now it is time to sit quiet, face to face with thee, and to sing dedication of life in this silent and overflowing leisure."

Tagore is a mystic. He sees himself and his Lord in each and every thing. Every leaf, every stone carries to him the message of the Lord. He finds Him mirrored in flowers, in rolling music, in the innocence of a smiling child in the heights of heaven, in the depths of Hell; in the regions far from human society and even in the midst of society.

"When I try to approach thee, my obeisance cannot reach down to the depths, where thy feet rest among the poorest, and lowliest and lost. Pride can never approach to where thou walkest in the clothes of the humble among the poorest, and lowliest and lost."

Like the great Persian poets, he searches for God, and like them, he realises that God is the name of that Entity, which is free from all forms of formality.

"Leave this chanting and singing and telling of beads! Whom dost thou worship in this lonely dark corner of a temple with doors all shut? Open thine eyes and see thy God is not before thee!"

He finds Him there where the tiller is tilling the hard ground and where the path maker is breaking stones.

Thus his conception of the Lord is that of the Omnipotent. Hence, finding himself surrounded on every side by Him he is all ecstasy. He feels then a music reverberant in his soul. He loses his form. He becomes song himself.

"All that is harsh and dissonant in my life melts into one sweet harmony and my adoration spreads wings like a glad bird on its flight across the sea."

And he realises that song, which Philip Sidney only termed the divine striker of the senses, as something even higher than that, with nobler functions to perform. It is the communion between Man and God.

"I touch by the edge of the far spreading wing of my song thy feet which I could never aspire to reach."

He knows full well that it is only as a singer that he comes before the Lord.

of idleness and joy. Springing thus out of joy, it passes through the world like a river spreading its influence of joy through the country, and ending, as it began, in joy. Thus it is both the mother and daughter of joy. Poetry springs from the fullness of feeling in the heart. This fullness makes it something higher than the world, something ethereal, as Shelley puts it

> Divine it was,—a light, a love
> A spirit which like wind doth blow
> As it listeth to and fro
> A dew rained down from God above;
> A power that comes and goes like dream,
> Heaven's light on Earth—Truth's brightest beam.

Thus the poetry of Tagore fulfills the true function of Art, which is to give us joy. The daily world which we move in often disgusts us, and we grow weary. " The heavy troubles, the bewildering care, that ground us down who live and earn our bread fail to satisfy that innermost Spirit, whose craving is for something higher, something apart from mere matter. It wants something, which according to Philip Sidney 'would lead and draw us to as high a perfection as our degenerate souls, made worse by their claying lodgings can be capable of.' The daily desire at once puts out the light from the lamp it touches with its breath. It is unholy. It is on such occasions that we feel a sweet pain arising in our heart, and you 'keep gazing on the far away gloom of the sky' and the 'heart wanders wailing with the restless wind.' It needs consolation. It is thirsty. It needs the wine of spiritual liberty to quench it, to complete the joy it has begun to feel. And here it is, at this stage, that Tagore's poetry appeals to us. It is the rhythm of life that expresses itself in the rhythm of his poetry. His poetry thus leads us, and stimulates us to nobler aims so unconsciously that we are scarcely aware of it.

Now, let us analyse and see what it is that gives birth to his poetry—and what is its medium of expression and what it points to—

" To-day the summer has come at my window with its sighs and murmurs, and the bees are playing their minstrelsy at the court of the flowering grove."

On such occasions the poet feels in him an inward joy as he watches the beautiful flowers bursting into bloom and the bird singing in ecstasy. It would be interesting at this stage to compare the interest exhibited by another Indian lark on the same occasion of the coming spring. She sings her simple song:

Tagore.

(Studied Through Gitanjali.)

BACON defined poetry as a part of learning which refers to imagination, and being not tied to the laws of matter, may at pleasure join that which Nature hath severed, and so makes unlawful matches and divorces.' But according to a German philosopher there is nothing that nature severs from. Thus, what Bacon called the separation from Nature is only a higher form of Nature—as he himself explains afterwards the delicate line of difference he draws between the natural and the unnatural. He says that poetry 'serveth and comforteth to magnanimity, morality, and delectation and therefore it was ever thought to have some participation of divineness, because it doth raise and erect the mind from the shows of things to the desires of the mind.'

This is just the spirit which breathes through the poetry of Sir Rabindranath Tagore. You see him soaring like an eagle above common humanity— for this is his prayer to the Lord : to give him strength to raise his mind high above daily trifles. As you roam with the mystic through the mysterious lands of pleasures and pain, as you wait through the long hours of the rainy April, as you try to reach the Lord's feet, you are all joy, you forget the environments and burst out :

" I want thee, only thee—let my heart repeat without end. All desires that distract me, day and night are false and empty to the core."

Thus, his poetry, like true art, lifts us up and sets us free from desire. It takes our minds off trivialities of life, into a region where, hatred, meanness and selfishness do not dwell. The spiritual poet, like a true artist, sets free those latent faculties in us which themselves were yearning for freedom and expression but could find no words, ay—they could not understand what the meaning of the vague feeling was. Art is born of pleasure. Its beginning is in the ideal fairy regions

refute this view. The canals are not so regularly straight as they were supposed. On the other hand, they show curvature in their structure. That they are natural is now the common belief of many astronomers. According to them, they are not the work of any intelligent hands but owe their origin to the vapour-laden winds that blow from the North and South poles and pour their water in the equatorial regions. The bluish greenish patches are the result. They are nothing but broad strips of vegetation and the channels themselves, through which this effect is brought out, are, of course, too small for our telescope to see. But the vegetation that grows very extensively along their sides is what we see as fine gossamer lines, the canals.

These canals have been observed to change with the seasons. In summer, the melting of the polar snows is accompanied by an increase in their number; in spring they show up very prominently; and with the advent of autumn, they fade away nearly into nothingness. This seasonal wax and wane proclaims their real nature as vegetable.

The *Marticoli* have a day of the same duration as ours but their year, and therefore their seasons, are twice as long. Due to the lowness of gravity, an elephant from here would jump there as a gazelle—a sight which will not inspire our poets with any sentimental effusion but which, none the less is common there.

Mars has been blessed with two moons but their total light is very much less than that of our moon. One curious fact about them is, that the nearer moon, Phobos, as it is named rises in the west, and sets in the east twice in the night. The other moon, Beimos, takes four months to revolve round the planet and behaves in its rising and setting as our moon does.

It is rather amusing to imagine what the Martian astronomers think of our earth. The atmosphere of our earth being much more dense, will prevent them from observing our planet so minutely as we have done theirs; and they must naturally conclude that there exists no life on earth!

S. Ali Akbar

(*IV year*)

water vapour and the telescope brings into light the white patches on the North and South poles. These polar caps (as the white polar regions are usually designated) come out very prominently in winter, the Northern extending over 60″ circumference, and dwindle down in Summer. This peculiar action suggests similarity with snow.

It has been remarked that the polar caps may consist of carbonic acid gas which solidifies under pressure as is quite compatible with the atmospheric conditions of Mars. But carbonic acid gas solidifies under low pressures without assuming the intermediary stage of liquid. On the contrary water vapour does not do so. This fact combined with the phenomenon of the blue belt that surrounds the polar caps as they melt in summer testifies to the presence of liquid. From this, one thing is apparent that the polar caps must consist of snow.

The greatest difficulty with regard to habitability of Mars comes with the temperature. Mars, being much more distant from the sun than the earth, receives less heat and light. In fact, its whole solar heat amounts to half that received by the earth. Now the earth's temperature on the whole is about 60 degrees. Therefore it was thought that Mars must be too terribly cold to support any animal life at all.

But recent observations have wholly contradicted this view. In its latest visit to our neighbourhood, in October 1926, the planet was given much attention. Dr. W. W. Coblentz of the W. S. Bureau of standards and Mr. C. O. Lainpland at the Lowel observatory, measured the temperature and placed its value at 70 degrees and above. This value satisfactorily accounts for the required heat for melting the polar snows which would have been inadmissible if the old theory were tenable.

From these few facts, we can suppose very reasonably that life exists on Mars, at least there is nothing to hinder its further evolution.

Now the whole question rests upon this interesting point; whether life is also intelligent and in such an advanced stage as ours. We can only assign one reason to account for the possibility of intelligence and that reason is the very smallness of the planet's mass compared with the earth's, which accelerates its growth. Due to this fact only, Mars must have long since passed through that stage which the earth is in now. This also applies to life on it which should be, necessarily, in a more advanced stage.

Professor Lirock argued ingeniously from the symmetry and regularity of the canals (it was supposed so then) that they must be artificial. But more improved observations entirely

The presence of air on it is evidenced by the fact that occasionally some black markings, *viz.*, clouds and dust storms flit across its surface, quite detached from it. The spectra of the air disclose a very important fact in favour of the life-theory. Its atmosphere contains a greater percentage of oxygen than ours. It may be argued that the extremely rarified condition of Martian air would not admit of any life. But here, if we turn our attention to Earth, we find the high peaks of the mountains actually teeming with life. It is not the question of life and death there but it is the question of habit. Mr. Merrian the W. S. Genement Zoologist in the course of his researches on rocky mountain peaks, came across deer and other animals, sojourning at high elevations.

Not only is it possible for life to exist in a tenuous atmosphere under low pressures, but it is found to flourish even under enormous pressures. It was thought previously that *fauna and flora* cannot exist at the bottom of the sea, for this very scientific reason that light cannot penetrate to such depths. Now the chlorophyl of plants, which is the basis of all life, depends, for its formation, on light. Therefore vegetation must necessarily be non-existent.

It was thought that the aquatic animals live on organic food such as plants. Even if they eat their kith and kin as some fish do, it was argued, the whole stock of such food would dwindle down in a short time and the feeders would have been starved to death. This being so, the aquatic animals have perforce to be vegetarian in their diving proclivities. Therefore, the absence of vegetation precludes the possibility of animal life at such great depths.

Besides, the fact that the high pressure (nearly 3 or 4 tons per square inch) to which animals are subjected, and which should squeeze life out of them, was also in favour of this theory. But when deep sea dredges were invented and let down, they came up with life of every kind except vegetable.

I have gone into the above details merely to show the adaptability of nature to adverse circumstances. In this case the animals were provided with phosphorescent lights and their skins were slightly modified so as to bear such enormous pressures. Indeed, these modifications were made with such finesse in their structure that a cursory glance cannot make them out.

Next comes the presence of water in the Martian world. The spectrum of its atmosphere shows some faint traces of

Life On Mars.

THERE has been of recent years great speculation with regard to the existence of life on Mars. Some have gone so far as to try to establish wireless communication with its inhabitants. Many observatories have been built specially with a view to study Mars and its surface markings. Among these may be cited the Flagstaff observatory which has done pioneer work in this field of research.

The conditions on Mars are such as to foster life and we know of no other planet in our solar system that can be likened to the Earth. Indeed, one may picture Martian scenery in terms of the terrestrial minus the terrain. The other members of the solar system are either too much advanced, (such as Mercury and Venus) or too little advanced (such as Jupiter and Saturn) for life of any kind to exist on them.

The appearance that Mars presents to us when viewed through a telescope is singularly flat. There are no such mountains or cracles and rills on its surface, as our satellite the moon presents to us. When the atmospheric conditions are favourable, a high power telescope may catch the disk with its network of fine gossamer lines. Of these we shall say presently.

It was at one time thought from its ruddy colour that the planet possessed a very dense atmosphere. But the fact that gravity on the planet is only 38 per cent. that on the Earth, combined with many other observations, goes to prove the tenuity of air there. In reality, its atmosphere is much less dense than the air at the top of our highest mountains.

Now, let us see what are the requisite conditions for life to sprout on a planet. Three things given, air, water and moderate temperature, life will as certainly take form as to-morrow's sun will rise. These are the only things essential for the formation of the life molecule, the protoplasm.

Applying these conditions to Mars, we have necessarily to acknowledge the existence of life on it.

for every offence as a " hur " or free man is, but subject to only half the punishment of free members of the commonwealth of Islam. The lenity shown to people in bondage manifests an exceptional consideration and feeling for slaves[1].

No record has been preserved of the decided criminal cases of the time of Khulafa-i-Ráshidín, or Banu Umayya or Abbasiya, and reported cases of these ages are not found at the foremost libraries of the world such as British Museum, the National Library of Paris, German Public Library, Al Azhar Library of Cairo, or Iqbàl Library of Constantinople. Little record of the decided criminal cases of the Mughal Dynastic rule in India is preserved at India Office Library.

Ever since the completion of " Fiqh" Muhammadan jurisprudence the world and circumstances have been changing. The progressive nations have always felt that their existing laws are behind the necessities of the people, as Sir Henry Maine remarks[2]. The idea that in Muhammadan theory of law the door of effort for legislation is barred, is widely maintained, yet Egypt foremost among the Muslim communities recast its system of criminal law and modified on French Criminal Code in 1883. The " Fatwa " or *responsa prudentum* of the doctors of Egypt is in favour of further promulgation and legislation in matters coming under Muhammadan Law. Turkey by innovation, codification and legislation introduced in 1918. In Persia and Afghanistan also the criminal rules have been changed. The Commission for Indian legal reforms of 1883 found that the rules of Muhammadan criminal law and evidence were practically unenforceable, and cannot square the circumstances, *viz.*, mutilation for theft, or incapacity of unbelievers to be witness, or inability of English Magistrates to administer Muhammadan Criminal Law, were the difficulties for the consideration of the Government[3]. Consequently Muhammadan Criminal Law was superseded by coming in force of the Indian Penal Code, 1860.

Except Jazírat-ul-'Arab Muhammadan Criminal Law is not in force in any Muslim state, because of its immutable character.

(1) Charles Hamilton's Hedaya, Vol. II, Books VII and VIII.
(2) Ancient Law by Sir Henry Maine, Vol. II.
(3) Application of European Law to Natives of India by Sir C. Ilbert, K.C.I.E., J. Comparative Legislation. Vol. I, p. 212.

'ABDU'L-WAHID,
(*An old boy in England*).

(2) Retaliation, a perfect equity, that is "eye for eye," and "limb for limb." In the case of fracture *lex talionis* is not applicable, however, in all cases of trespass to person, the Qadi is authorised to impose a fine. The fine for manslaughter consists of one hundred camels or ten thousand dirms[1] or thousand dinars[2].

(3) Amputation or act of cutting off a limb or part of body was prescribed for thefts, and highway robberies called "Quttá'u't-taríq[3]."

(4) There are specific offences, the committal of which requires religious expiation, such as in the case of "Khutla-Khata," *i.e.*, manslaughter. The "Qátil" or murderer has to pay Diyat, also termed as "Khùn baha," *i. e.*, the fine imposed as the value of the blood.

(5) The expiation consists in emancipation of a slave, or slaves, fasting for two months, contribution of alms: see page 9, emancipation and fast are enjoined by Quran.

(6) Flogging is for infants or persons of under age, but this punishment can be altered to a fine; as Imám Abú Yúsúf holds.

There is no mention of punishment by imprisonment in Hìdaya. Mr. Hamilton in his translation does not even allude to the idea of conviction or imprisonment though the whole chapter on Jínáyat runs from 270 to 448 pages. Sir Abdu'r-Rahím's work also is silent. A historical inquiry in this matter brings to the conclusion that the captives of war were imprisoned (though not in the modern sense of the word) till they were ransomed. In the battle of Hunayn, six thousand captives were taken who were ransomed: as the hadith ordains "free a slave and ransom a captive." I am of opinion that in pre-Islamic days, and even after Muhammad the spirit of freedom did not necessitate to adapt imprisonment as a mode of punishment; except in the case of war prisoners. Nevertheless "Hirz," *i. e.*, custody was a system in the time of Omayyad and Abbaside dynasties.

We have seen that all crimes either against person or property are spiritual; and the severity of punishment for each specific crime, but it is to be noticed that an extraordinary indulgence is shown to captives and slaves. They are liable

(1) Of Greek origin, a silver coin: Quran, Surah XII, 20. "And they sold him (Josep) for a mean price, 'dirham' counted out and they parted with him cheaply."

(2) Taken from Greek word Envapior; a gold coin: Quran, Surah II, 66. "And some of them if thou entrust them with a "dinar, he will not give back."

(3) Quran by Sale, London ed., S. VI, p. 108. paragraph 2.

Hidaya deals all crimes under the heading of Janayat or offences against person. It is to quote *Hidaya*, *Jinayat* in the language of the law is a term expressive of " any prohibited act committed either upon the person or property.[1] " In some specific offences the punishment is provided either by the Quràn or *hadith*. The crimes are punished by the rules of faith, and not by State or Sovereign : for instance, in the case of wilful murder Quran lays down ; " Whoever slayeth a believer his reward is hell." " It is incumbent on you to execute retaliation." The doctrine of retaliation is not applicable in the case of murder of a Musta'min, *i.e.*, one who is not a subject of the Muslim Commonwealth ; and is forced in the case of murder of a Zimmi by a Muslim.

Competency and intention with the exceptions of mistake, and self-defence are the basis of criminal responsibility. If homicide is not intentional, *Had*, *i.e.*, capital punishment is not enforceable, and the offence can be compounded : otherwise if one is a wilful murderer, he is deprived of inheritance and liable to *lex talionis*, as Muhmamad's verdict is, " There is no inheritance to the murderer."

"*Shubh-i-Qatl-i-'amad*," *i.e.*, manslaughter : the offence is compoundable, with the payment of heavy sum ; which is the right of the relatives of the murdered. The fine was paid either by the offender, or by his Akilas, the people of his kin. It is to be paid within three years ; so it is decided by Ijmá'-i-Ummat, the consensus of the Muslim jurists.

The modes of punishment are :—

(1) *Had.*
(2) Retaliation.
(3) Amputation.
(4) *Diyat* or fine.
(5) *Kaffara*, *i.e.*, expiation.
(6) Flogging.

(1) *Had* which is incumbent in case of wilful murder, is either executed by stoning to death or flogging eighty strokes. In the latter form the criminal was not necessarily put to death. He may bear the punishment and still survive. Except Quran is silent, the Qadi is authorised to use his discretion, and judge the severity of the offence. " *Had* " can be dispensed with compensation in the absence of intention or murder of a Musta'min by a Muslim. It was also inflicted for apostasy, " Zina " or fornication, and for defamation, in which it was called " *Had Qadhf.*"

(1) Charles Hamilton translation of Hidàya, London ed., M. Dec, XCI. (*i.e.*, 1791) Vol. IV, Book XLIX, page 270,

private law. The term tort in English law, which is derived from Latin " tortus," and French " tort," does not come in use till 1250[1], is defined by the best authority on the subject, Addison, as a breach of duty, ensuing in the infringement of one's absolute, privileged or public right, resulting in specific damages. Since then contract and tort became two distinct causes of action in English legal history. The doctrine of tort has developed recently. The characteristic and the peculiar meaning which the word tort connotes has no synonym in Arabic. Justice Sir Abdu'r-Rahìm writes that the line between tort and crime is very narrow. I do not know whether the Arabic word *Ta'zir* conveys the meaning of tort, at the same time when it means punishment, as he thinks. It would be a logical fallacy to give construction to the word *Ta'zir* as to mean both a crime and a tort. Even in English the conceptions of crime and tort have got different notions. He has assumed the presence of tort in Mohamadan Law and lays down that the criterion to ascertain whether a wrong is a tort or crime, is to find out if it is against an individual or public. If it is against an individual the remedy is tort[2]. It is not necessary that the tort should necessarily always be a private one : it can equally be a public, *e.g.*, a public nuisance, blasphemy, sedition and apostasy. The best source on this subject of civil wrongs is Quran, which does not distinguish between contracts and torts[3]. I am of opinion that Sir Abdu'r-Rahím's view is based on a hypothesis, which is unknown to Mohamadan Law. Pure Muslim law has only two branches, *viz.*, civil and criminal.

The definition of crime in Muslim law differs widely from that of English. As the Caliph is not only the worldly sovereign or ruler, but the representative of the Muslim Commonwealth, whose office is based on Ijmá'-i-Ummat[4]; he has no prerogative, power and privileges other than what an individual has. The infringement of any legal duty or committal of an offence according to Mohamadan Law is not the breach of King's peace, or an act or omission against the State, but against religion. Charles Hamilton in his translation of

(1-*a*) Addison's Law of Tort 8 ed., p. I. 44. A New English Dictionary Oxford Ed. (1926) Vol. X. p. 167. The Century Dictionary, Vol. XIII p. 6394, Chambers Encyclopædia, Vol. X, p. 250 : Encyclopædia of the Laws of England, 2nd ed. (1911) and Encyclopædia Britannica, 1911 ed. Vol. 27, p. 64.

(2) Mohammadan Jurisprudence by Sir A. Rahim, Chap. IX, p. 351.

(3) Muquddama ibn Khaldún

(4) Quran tranlated by George Sale. London ed., Chapter-p. 78 and Section VI. The institution of Quran in Civil affairs, p. 103.

the presence of her husband, did so under the connivance or coercion of the husband : the authority being R. v. Mary Baines[1]. The reforms, in this branch of law in the 18th century, urged codification ; the importance of trial by jury ; statutory enactment for Venue ; study of the psychology of crimes ; discrimination between classes of criminals ; the improvement of criminal proceedings and prisons ; and the fair vinculum between quality of crime and severity of punishment.

Criminology has two aspects (1) the psychology of crimes ; (2) and the consequential punishment ; which specially differs according to the nature of the crimes, *e.g.*, capital punishment, imprisonment, deportation, extradition, confiscation of property, fine, flogging and cognizance for a period of year or years. The punishment is based on these principles :— (*a*) Revenge (*b*) Retribution also called vindication, in order not only to admonish the criminal, but also to the world. (*c*) Utility, which is to improve the morals and mentality of the criminal.

Though punishment is based principally on the principle of revenge, yet it does not follow that the person injured can avenge himself. In the legal terminology the person wronged has the right to have revenged the act or omission forbidden by law : but cannot take the law into his own hands. He is to proceed the King's tribunals either by himself or by the State officer called prosecutor, as all offences are against the King's peace. In all felonies, which cannot be compromised, if can be, but not without the permission of the court, the Crown is the party of the criminal proceedings. Jeremy Bentham holds that the fountain of justice, equity, legislation and peace is the supreme body in the State is the King[2]. The sovereignty of the Parliament is the rule of the English constitution : yet the ultimate power of sanction rests with the King only, who is not bound to accede to any bill or act of Parliament : the authority on this subject is the proclamation case (1610). In the ship money's case it is laid down that the King possesses absolute prerogative, which neither common law nor statutory law can ever take away. Law is his trustee servant : hence " lex is King."

Criminology in " Fiqh " or Muslim jurisprudence falls under Municipal Law, and the law of contract under the

(1) 69. L. J. Q. B. 681.

(2) Introduction to the Principles of Morality and Legislation by Jeremy Bentham.

The incidents of a crime is, that it must be punishable and capable of precise definition. Naturally it involves intent, knowledge and foresight. It is not sufficient that the act is legally a crime, unless the offender is competent. Infancy, insanity, drunkenness, mere juristic persons, *e.g.*, a corporation, duress, ignorance of fact, necessity, accident, honest and reasonable mistake. The King by virtue of his prerogative, ambassadors and the act of the State are the exceptions. In these cases the offender is not held responsible : not because crime is not constituted : but for the reason that the law assumes such persons devoid of " mens rea," hence incapable of committing an offence. Every man is innocent unless this presumption is rebutted.

Will or intention must be distinguished from Motive. The first is the expression of the act or omission and the latter is the psychology of the human mind. Motive is immaterial in determining a wrong ; because a good motive does not make an offender innocent for an actionable wrong *per se*. There is no criterion in the deduction of intention, but it depends on the circumstances of each individual case.

The offences are divided into two main heads (*a*) indictable offences, which are tried by the jury, *e.g.*, treason, felony and misdemeanours. (*b*) Petty offences which are summarily dealt by the Justice of the Peace. Further they can be arranged in order ; (I) Offences against the State (2) person (3) and property. All indictable offences are the breach of the King's peace and not against an individual : therefore can only be forgiven by the Crown. Historical inquiry affords evidence that with the growth of civilisation they were divided against the State ; and (2) individual. This distinction of crimes has given clue for the study of the development of criminal law[1].

The speculative theory of the sociologists such as Professor Lombaroso of Italy, who in his work *L'uomo delinquente* propagates the cause of instinctive criminals, and lays strees on the doctrine of free-will.

In common law insanity was an absolute defence, but since 1883, if the offender is proved to be sane at the time of the commission of the crime, he is sent to the lunatic asylum ; the offences of minors or children above seven and under twenty-one years of age are regulated by Juvenile Offenders Act ; and the theory of *femme sole* has changed the legal presumption, that a married woman if she committed a crime in

(1) Ancient Law by Maine, 1906, p. 381.

constructive treason, the clergyman was sentenced, but not to the capital punishment. The importance of this case and the zealous efforts of Bacon and James I. raised legal controversies of high emergency in English constitution[1].

The English criminal law has undergone two stages (1) in the time of Anglo-Saxons the idea of King's peace was unknown, and he had no prerogative to deal with criminal offences, as the offences were not against the State but against an individual or a family. The common methods of the primitive age were (*a*) ordeal or (*b*) trial by battle, which were denounced by the Council of Lent. The King's court had no authority to decide penal offences, as the idea was that God alone can try a man[2]. The theory of Crown as a "body politic," its perfectibility and perpetuity was not developed till the Middle Ages. Bracton writing in the thirteenth century demurs from absolute monarchy and places even God below the law. (2) But it is certain, as Professor Maitland writes, that the King acquired jurisdiction in criminal matters as a bye-end with the origin, and growth of jury system in England[3]. Since 1066 offence became against the State; yet before the period of Reformation in many penal offences, only the ecclesiastical courts had jurisdiction.

The doctrine of the subject's duty towards the Crown is based on the constitutional absolute privilege of the King by virtue of the prerogative; even intention is *a fortiori* punishable. The statute of Treason Felony 1848 Sect. 3, lays down that mere intent to commit treason is punishable with life imprisonment. Marrying an alien woman, abandonment of allegiance or naturalization in an alien country especially in the time of war; as held in re R. V. Lych (1903) are sufficient manifestations of intention of treason: hence the law assumes criminal responsibility[4]. Where the writ of Habeas Corpus of 1679 and its subsequent amendments of 1816 and 1862 guarantees and upholds the freedom of the subjects, the Naturalization Acts of 1844, 1870 and 1922 demands loyalty and fealty of them in return for the safety and peace afforded within the empire by the King.

(1) Cobbet's complete collection of State Trials Vol. II, p. 269 : Croke's Report. Charles I. p. 125 : Dictionary of National Biography by Paston and Percy 1895 ed., pp. 131 to 133 : Sir Francis Bacon's Life and Letters, Vol. V., p. 90.

(2) History of English Law by Pollock and Maitland, Vol. I., page 182.

(3) History of Trial by Jury by W. Forsyth 1852.

(4) The Laws of England by the Earl of Halsbury, Vol. VI. p. 846.

Comparative Criminology with reference to English and Muslim Law

A CRIME has as many aspects as human activities. The conception of a crime involves different notions from ethical and legal points of view, as there is a wide gulf between moral and legal rules[1]. In the words of Blackstone. Crimes and misdemeanours are a breach and violation of public right and duties owing to the whole "community." It has also to be distinguished from civil wrong, which is *executor de son tort*, where the remedy is not penal, but civil.

It is possible that an act of omission may be a civil wrong *delicta* or a breach of contract, and a penal offence. The scope of tort, and its remedies are different from those of crime[2] of tort and Historical research on the origin of crime leads us to the action of trespass, just as from the XII Tables the whole fabric of Roman Law is derived; so criminal law originated in the Writ of Trespass *vi et armis* (1250 A.D.). In a penal offence the essence of the wrong is *Mens rea.* No crime is punishable without proving that the offender had a guilty mind. *Actus non facit reum nisi mens sit rea, i.e.,* the act itself creates no guilt in the absence of a guilty mind. The authority on this point is re Queen V. Tolson. 23. Q.B.D. 168 : however, there is statutory provision, by which merey an " overt act," is punishable without proof of *mens rea.*

The Treason Act of 1351 Edward III. Chapter II. 1795, and 1848, extends the scope to compass, imagine, conspire, desire, attempt and intent; applying the doctrine of constructive treason, generally known as judge-made law. But to constitute the crime it is laid down in re Edmund Peachman the Rector of Hinton St. George, Somerset case, where diverse passages were found in his sermon, which were not actually preached but only set down in writing. Held that it was a

(1) Man. V. Owen. 9. B & C. 599-602.

(2) Holdsworth's History of English Law, Vol. III, Chap. II., pp. 276-411 : Pollock and Maitland, Vol. II, pp. 511-548 : and Short Legal History by Jenks, pp. 149, 805, 389.

And so, all the night-tide, I lie down by the side
Of my darling—my darling—my life and my bride,
In the sepulchre there by the sea,
In her tomb by the sounding sea.

Death with its awe and mystery has often been the theme of dirges in oriental poetry depicting dejection and despair.

But the melody of Annabel Lee, so beautiful and true, and so full of the lilt of melancholy and heart-rendering sadness ends in "a mood exalted at great expense."

The original has, as far as possible, been closely followed in the following translation, but the reader will not fail to notice that in the last four lines a little liberty is taken with the original conception in consonance with the Oriental subtlety of poetic thought and presentation.

"آنا بل"

سالہا سال گزرے ہیں اس بات کو * ایک دریا کنارے نگر میں
ایک کنیا تھی جس کو آنا بل کہو * سب سے پیاری تھی پیارے نگر میں
میری چاہیتی تھی اور بس چاہتی * تھی مجھی کو وہ سارے نگر میں
میں تو بچہ ہی تھا وہ بھی بچہ ہی تھی * اسی دریا کنارے نگر میں
آنا بل اور مجھ میں محبت نہ تھی * ایک سودا تھا دونوں کے سر میں
دیکھ سکتے بہشتی فرشتے نہ تھے * ہم کھٹکتے تھے انکی نظر میں
سالہا سال گزرے ہیں اس بات کو * اسی دریا کنارے نگر میں
کچھ ہوا یوں چلی-ٹھنڈی آخر ہوی * میری پیاری سندر لمحہ بھر میں
اس کے عالی نسب بھائی بند آئے سب * میت اسکی اٹھا لے نگر میں
قبر میں دفن کرنے جنازہ-چلے * چھوڑ کر مجھکو ویران گھر میں
جب فرشتے بھی جنت میں یوں خوش نہ * جیسے ہم دون تھے اپنے گھر میں
ہم کھٹکتے تھے انکی نظر میں
ہا! یہی وجہ تھی سب کو معلوم ہی ہے * ہے مشہور سارے نگر میں
کچھ ہوا یوں چلی ٹھنڈی آخر ہوی * میری پیاری سندر لمحہ بھر میں
پر محبت ہماری تھی بڑھکر محبت * سے بوڑھوں کی اپنے تر میں
یا جو ہو رہم سے فرزانہ تر میں
نہ بہشتی فرشتے نہ دیو زمیں ہی * نہ کوئی ہے اب بحر و بر میں
جدا کر سکے روح کو روح سے * ہے جو پیاری سندر میرے بر میں
چاندنی کھلتی ہے جب کبھی مہ لقا * خواب میں میرے آتی ہے برمن
اور تاروں میں تار اسی آنکھیں تری * پھرتی رہتی ہیں میری ظر میں
رات بھر میرے پہلو میں آ بیٹھنا
میری پیاری سندر تو بنی میں بنا
گو رتیری بڑائی ہے گھر میں
تری تربت ہے دل کے نگر میں

MAHJUR.

On January 30, 1847, Virginia in her twenty-sixth year breathed her last. After this great tragedy of his life, Poe developed a "madness" which he explains thus :—

"Men have called me mad, but the question is not yet settled whether madness is or is not the loftiest intelligence, whether much that is glorious, whether all that is profound, does not spring from disease of thought—from *moods* of mind exalted at the expense of the general intellect."

And in one of these moods the poet sang—

It was many and many a year ago;
In a kingdom by the sea,
That a maiden there lived whom you may know
By the name of ANNABEL LEE;
And this maiden she lived with no other thought
Than to love and be loved by me.
I was a child and she was a child,
In this kingdom by the sea;
But we loved with a love which was more than love—
I and my Annabel Lee;
With a love that the winged seraphs of heaven
Coveted her and me.
And this was the reason that, long ago,
In this kingdom by the sea,
A wind blew out of a cloud, chilling
My beautiful Annabel Lee;
So that her highborn kinsman came
And bore her away from me,
To shut her up in a sepulchre
In this kingdom by the sea.
The angels, not half so happy in heaven,
Went envying her and me—
Yes!—that was the reason (as all men know,
In this kingdom by the sea)
That the wind came out of the cloud by night,
Chilling and killing my Annabel Lee.
But our love it was stronger by far than the love
Of those who were older than we—
Of many far wiser than we—
And neither the angels in heaven above,
Nor the demons down under the sea,
Can ever dissever my soul from the soul
Of the beautiful Annabel Lee.
For the moon never beams without bringing me dreams
Of the beautiful Annabel Lee;
And the stars never rise but I feel the bright eyes
Of the beautiful Annabel Lee;

bliss over the Valley of the many-coloured grass. A change fell upon all things. Strange, brilliant flowers, star-shaped, burst out upon the trees where no flowers had been known before. The tints of the green carpet deepened; and when, one by one, the white daisies shrank away, there sprang up in place of them ten by ten of the ruby-coloured asphodel. And life arose in our paths; for the tall flamingo, hitherto unseen, with all gay glowing birds, flaunted his scarlet plumage before us. The golden and silver fish haunted the river, out of the bosom of which issued, little by little, a murmur that swelled, at length, into a lulling melody more divine than that of the harp of Aeolus, sweeter than all save the voice of Eleonora. And now, too, a luminous cloud, which we had long watched in the regions of Hesper, floated out thence, all gorgeous in crimson and gold, and settling in peace above us, sank, day by day, lower and lower, until its edges rested upon the tops of the mountains, turning all their dimness into magnificence, and shutting us up, as if for ever, within a magic prison-house of grandeur and of glory."

But beneath this smiling surface there lurked the grim shadow of death which he painfully recollects in one of his letters.

"Six years ago, a wife whom I loved as no man ever loved before, ruptured a blood-vessel in singing. Her life was despaired of. I took leave of her forever and underwent all the agonies of her death. She recovered partially, and I again hoped. At the end of the year the vessel broke again. I went through precisely the same scene. Then again—again—and even once again, at varying intervals. Each time I felt all the agonies of her death—and at each accession of the disorder I loved her more dearly and clung to her life with more desperate pertinacity. But I am constitutionally sensitive—nervous in a very unusual degree. I became insane, with long intervals of horrible sanity."

Poe's health broke down completely early in 1846, and to intensify his misery he witnessed in the following year the death-agony of his poor wife.

"There was no clothing on the bed, which was only straw, but a snow-white counterpane and sheets. The weather was cold, and the sick lady had the dreadful chills that accompany the hectic fever of consumption. She lay on the straw bed, wrapped in her husband's greatcoat, with a large tortoise-shell cat on her bosom. The wonderful cat seemed conscious of her great usefulness. The coat and the cat were the sufferer's only means of warmth, except as her husband held her hands, and her mother her feet."

Annabel Lee.

EDGAR Allan Poe married in 1835 or 1836 his own cousin Virginia, "fair, soft and graceful and girlish," the daughter of his maternal aunt, Mrs. Clemm.

In his allegory, *Eleonora*,—the poetic name he has given to his Virginia—Poe reveals the growth of love between himself and his bride:—

"She whom I loved in youth, and of whom I now pen calmly and distinctly these remembrances, was the sole daughter of the only sister of my mother long departed. Eleonora was the name of my cousin. We had always dwelled together, beneath a tropical sun, in the Valley of the many-coloured grass. No unguided footstep ever came upon that vale; for it lay far away up among a range of giant hills that hung beetling around it, shutting out the sunlight from its sweetest recesses. No path was trodden in its vicinity; and to reach our happy home there was need of putting back, with force, the foliage of many thousands of forest trees, and of crushing to death the glories of many millions of fragrant flowers. Thus it was, that we lived all alone, knowing nothing of the world without the valley,—I, and my cousin, and her mother.

* * * * *

"Hand in hand about this Valley, for fifteen years, roamed I with Eleonora before love entered within our hearts. It was one evening at the close of the third lustrum of her life, and of the fourth of my own, that we sat, locked in each other's embrace, beneath the serpent-like trees, and looked down within the waters of the River of Silence at our images therein. We spoke no words during the rest of that sweet day; and our words even upon the morrow were tremulous and few. We had drawn the god Eros from that wave, and now we felt that he had enkindled within us the fiery souls of our forefathers. The passions which had for centuries distinguished our race came thronging with the fancies for which they had been equally noted, and together breathed a delirious

Book II. *Dominant Tendencies of Business Organizations.*

Book III. *Monopolistic Tendencies ; their Relations to Public Well-being.*

The chief value of the book lies in the fact that, " It represents the fruits of Marshall's learning and ripe wisdom, on a host of different matters."

In August 1922 soon after his eightieth birthday, *Money, Credit and Commerce,* was finished, it was published in 1923. This volume contains his chief contributions to the theory of Money and Foreign Trade.

In the preface to this book, Marshall wrote " Although old age presses on me, I am not without hopes that some notions which I have formed as to the possibilities of social advance may yet be published." Thus we see that up till his last moments he remained a strong advocate of knowledge, a great well-wisher of society. His thirst for knowledge was never satiated, as wil be apparent from a very interesting story about him, which my friend Prof. Hosain Ali Mirza was telling me.

Our Professor when in England, went to listen to a lecture that was to be delivered by Prof. Pigou, a worthy pupil and a worthy successor of Marshall. While Mr. Mirza was sitting there with some of his friends, a very old gentleman in shabby dress came up and took his seat near them. The lecture began, it was incomprehensive to the so-called students of economics, but to their surprise this old rustic began to take notes. They were wondering what he could understand of it, when some one whispered that the rustic was no less a person than the great Alfred Marshall.

They were highly surprised to see a great man, in his eighties coming all the way long to hear what a pupil of his had to say. But the old gentleman would have thought all his labours repaid, if he could learn a single new thing from the fresh brains of his pupil.

Such was the thirst for knowledge of the great scholar, and such was his life and work.

Marshall passed away on July 13th, 1924.

ZAHIRU'D-DIN AHMAD
(*An old boy*).

Marshall's sitting-room could be thrown into one on the occasion of entertainments. The unvarying character of the surroundings.....upstairs the books and nests of drawers containing manuscript, downstairs the Michaelangelo figures from the Sistine chapel let into the furniture, and at the door the face of Sarah the maid, had a charm and fascination for those who paid visits to their master year after year, like the cell or oratory of a sage "

Occasionally there were parties given by the Marshalls in which not only distinguished economists of foreign countries were invited, but also his pupils. Thus the then students of economics, now economists of renown, were brought into contact with persons like Adolph Wagner and N. G. Pierson.

In early days Marshall used to ask labour leaders to spend a week end with him. In this way he came to know most of the leading co-operators and Trade Unionists of the past generation.

Besides his routine duties as a professor, Marshall had other activities from 1885—1908. He was summoned to give evidence before several Royal Commissions and Committees. As a general rule he gave two lectures in a week, and one lecture a week on special theoretical difficulties ; but as a rule he delivered about forty-five lectures in a year. The students who had any difficulties had free access to him at any time.

Marshall very seldom used any notes, but for his lectures on Economic History. His lectures although highly instructive, did in no way possess the systematic treatment of subjects, as is to be found in his books ; they were informal. His interest in the economic and currency problems of India had been first aroused during the time at Oxford, when it was his duty to lecture to the Indian Civil Service Probationers.

The strain of these and various other activities was too much for him, and he resigned his Professorship in 1908.

Meanwhile a lot of material had accumulated ; when he was released from the exacting routine work, he turned his attention towards it, and in 1919 appeared his *Industry and Trade*, which is " a great effort of will and determination on the part of one who had long passed the age, when most men rest from their labours."

This book is an historical survey and for the most part, it is descriptive, and therefore totally different from the *Principles*.

The volume is divided into three parts :—

Book I. *Some Origins of Present Problems of Industry and Trade.*

do not set beyond Book IV.....is apt to be, that they are perusing a clear, apt and human exposition of fairly obvious matters."

The immediate effect of the publication of this great book was that the science of economics was popularized, and the general public came to know about its true nature. The general feeling prevailing, was that it was a science dealing with wealth and the modes of its acquisition. This feeling was to a great extent dissipated, and the world came to know that the science is, " both a study of wealth, and a branch of the study of man." It is a study of mankind in the ordinary business of life ; it examines that part of the individual and social action which is most closely connected with the attainment, and with the use of the material requisites of well-being." Doubtless there was some controversy about the treatment of various subjects, and perhaps the controversy made his critics insensible to the book's intellectual stature. But now, since the publication of the book, sufficient time has elapsed and we are in a better position to judge its merits as well as its demerits and it is gratifying to say that after all, it has done a service to the economic thought, which cannot be overestimated.

Although what we have said above is true, yet it can in no way be denied that in order to give the book a delightful appearance, so that it may be easily read by an uninitiated reader, many difficulties have been rounded up and many arguments are concealed. The result being that " a student can read the *Principles*, be fascinated by its pervading charm, think that he comprehends it, and, yet a week later, know but little of it.....It needs much study and independent thought on the reader's own part, before he can know the half of what is contained in the concealed crevices of that rounded globe of knowledge, which is Marshall's *Principles*."

Now we proceed to examine Marshall's domestic life and especially his relations with his pupils.....perhaps this might furnish a good contrast to the similar relations that exist in our Indian universities.

In 1885 Marshall and Mrs. Marshall returned to Cambridge ; the restrictions upon the marriage of Fellows had been finally removed. He built a small house for himself, in which he lived for nearly forty years. " His study lined with books, and filled transversally with shelves, had space by the fire for two chairs. Here were held his innumerable *tete-a-tetes* with pupils, who would be furnished as the afternoon wore on with a cup of tea and a slice of cake on an adjacent stool or shelf. Larger gatherings took place downstairs, where the dining-room and Mrs.

4. It was Marshall, who developing the ideas of Jevons, put forth the idea of Consumer's Surplus, which was later worked upon by Prof. Pigou.

5. The idea of ' Elasticity ' is Marshall's own innovation, which greatly helped him in working out the advanced theory of Value and Distribution.

6. Marshall's analysis of Monopoly needs be mentioned here. Notwithstanding his socialistic tendencies he was a firm believer in competition.

So far with regards his striking ideas that are embodied in his *Principles*, but the book had greater influence in other ways. It shows the method Marshall employed in the study of economic phenomena.

" It is the business of economics, as of almost every other science, to collect facts and interpret them, and to draw inferences from them.....there is not any one method of investigation which can properly be called the method of economics, but every method must be made serviceable in its proper place, either singly or in combination with others.....there has always been and there probably always will be a need for the existence side by side of workers with different aptitudes and different aims, some of whom give their chief attention to the ascertainment of facts, while others give their chief attention to scientific analysis ; that is, taking to pieces complex facts, and studying the relations of the several parts to one another and to cognate facts. It is to be hoped that these two schools will always exist ; each doing its own work thoroughly and each making use of the work of the other. Thus best may we obtain sound generalizations from it for the future."

Now with regard to the way in which Marshall's *Principles* of *Economics* is written, J. M. Keynes says that it is " more unusual than the casual reader will notice. It is elaborately unsensational, and under-emphatic. Its rhetoric is of the simplest, most unadorned order. It flows in a steady, livid stream, with few passages which stop or perplex the intelligent reader, even though he know but little of economics. Claims to novelty or to originality on the part of the author are altogether absent. Passages imputing error to others are rare ; and it is explained that earlier writers of repute must be held to have meant what is right and reasonable, whatever, they may have said. The connexity and continuity of the economic elements,.....are the chief grounds of difficulty. But subject to this the chief impression which the book makes on the minds of uninitiated readers.....particularly those who

thought, and Marshall's *Principles* was destined to infuse life again into this science. It embodies the following striking contributions to the economic doctrine :—

1. Marshall has been called a neo-classic writer. His greatest service to economics, was to remove the haze of obscurity, that had accumulated round the theories and expositions of the classical economists. Their theories needed modification, and Marshall's was a befitting genius to accomplish this task. Ricardo was very vague, when he said, that Demand and the Cost of Production were the factors determining value. Marshall, laying special stress on the supply side, cleared up this vagueness by showing, that Supply no less than Demand and Cost of Production was the factor that determined value. In this way he settled, once for all, the controversy about value.

2. This general theory of economic equilibrium, *i.e.*, equilibrium of Supply and Demand, was effectively strengthened and developed by the introduction of two important conceptions .....*the Margin and Substitution.* " The notion of margin was extended beyond utility to describe the equilibrium point in given conditions of any economic factor, which can be regarded as capable of small variations about a given value, or in its functional relations to a given value. The notion of substitution was introduced to describe the process by which equilibrium is restored or brought about. In particular the idea of *Substitution at the Margin*, not only between alternative objects of consumption, but also between the factors of production, was extraordinarily fruitful in its results. "

The idea of National Dividend being the joint product of all the factors of production is peculiarly Marshall's own.

3. The idea about Time as a determining factor in economic analysis was introduced by Marshall. The conception of 'Long' and ' Short ' periods is his own, and one of his objects was to trace a continuous thread running through and connecting the applications of the general theory of equilibrium of demand and supply to different periods of time. The ideas of ' prime' and ' supplementary ' costs, and of ' internal ' and ' external' economics was introduced into economic terminology by Marshall.

The distinction between the long and the short period made the meaning of ' Normal ' value more precise. The doctrine of Normal Profit was given out to the world, with the aid of two characteristic conceptions, *i. e.*, Quasi-rent and the Representative Firm.

Alfred Marshall : His Contribution to Economic Thought

(*Continued from p.* 152. *Vol. I, No* 4.)

HAVING dealt with Marshall's contributions to the monetary theory of Economics, we now turn to examine some of his distinct contributions to the science of Economics in general. As has been mentioned above it was in 1877 that Marshall began to help his wife in the task of completing *Economics of Industry*. This little book in no way claims a prominent place in the literature belonging to the science of Economics, indeed in later years, Marshall himself grew unfriendly towards it, for he realized that a fragmentary treatment of subjects of vital importance was in no way commendable.

But the fact remains that notwithstanding all this, the little manual had a good and a friendly reception at the hands of competent judges, when it made its first appearance. And perhaps it was the best elementary text-book on the subject then available.

In 1881, Marshall went abroad for a change to recover his failing health, but his mind was concentrated on some important theories, which made their final appearance in the *Principles*. The next nine years were occupied in the formation and development of this monumental book, which underwent several changes, with regards its plan of dealing with the theories propounded therein. Marshall thought of some plan, then abandoned it, and took up another, and these changes were frequent before the book appeared in 1890.

Time was ripe, when the book was placed before the expectant readers. It had an immediate and complete success. The period that had elapsed since the publication of Mill's *Principles of Political Economy*, was a lull in the history of economic

realise the gravity of the situation and come round. He lighted a cigarette. It had a strange aroma. He thought it expedient to make it up presently. He went with measured strides towards the dining-room and peered into her room unnoticed through the window.

She sat there under the light of a rose-shaded bulb, which heightened the effect of her flushed face, and bare shoulders, the delicate pearl necklace was moving with the soft rise and fall of her bosom. 'The oceanic amplitude of her feeling, was mirrored in her sea-blue eyes.' The beautiful little girl was a mystery to him. His business-like intellect failed to gauge the depth of her being. The more she despised him, the greater was his love for her. He was like asensitiveiron needle in a powerful mangnetic field—restless. He gave her a long caressing look. He had changed his mind. He could not grieve her. He phoned to his solicitor. " Please inform Mr. Ramchand I've decided not to proceed with the project any further."

ITRAT HUSAYN, ZUBAIRI
(*IV Year*).

He was confident of his success. Like the lucky-go-sort hero of the modern fiction, he believed that every husband should win in the long run. It was simply a question of time and of tackling the problem in right earnest.

He found her in the garden sitting in an easy chair, on a table by her side was placed a glass of sharbat. She was reading 'The Murder of Delicia' by Marie Corelli. He approached her with the expression of a runaway school-boy on his face. She was absorbed in the book, seemingly unconscious of his presence. Under the soft twilight shade, her snowy neck, bare shoulders and dignified self-composure gave her an air of alluring strangeness. He sat down on the lawn and began to make knots of the blades of grass, thinking how to break the ice. His gaze rested on her face and the whole atmosphere seemed to sink into his senses. A wave of emotion passed over his face and tinted his cheek with soft pallor. Her strange silence this evening alarmed him. He had never seen that half-ironical, half-mocking, expression on her face. Every fibre of his being seemed charged with tense excitement. She rose to leave him.

" Did anybody call ?"

" Stephens."

" Came to talk of his never-ending love affairs ?" She was silent.

" I think" giving her a suspicious glance, " he said, he would never cease running after girls."

" You should mind your own business and leave Stephens alone."

" Why alone ! every street boy knows it."

" It is simply mean to talk of others in such a way."

" You are a splendid wife !" He lost his self-control. " I can no longer allow this state of affairs to exist.

" I am determined to stop it. You wont see so much of your friends, we are moving into the country soon." There was a sense of triumph in his tone.

The colour deepened in her eyes, an ironical smile played on her lips, " I don't care a whit for your sentimental day-dreams." She went with hurried steps to her room.

He remained seated. He pondered. Is it worth while to spend Rs. 20,000 to win her back? would'nt it be better to leave her to her friends and moon-spun ideas ?

But he gradually regained his self-composure. It was simply a passing phase. It would'nt last long She would

The dainty flower-pots, the fragrant air, the ruby twilight lines instead of giving him a pleasant sense of well-being filled his heart with strange foreboding of some impending crisis; but a weight was lifted from his heart. He felt relieved. The thought that he was to embark on a sentimental adventure was pleasing to him. The situation was full of happy potentialities but pregnant with poignant dangers, fatal enough to wreck his life.

Zahir was brought up in an English family on Western lines, but he had inherited from his father a strict sense of domestic discipline. Now when he was the head of the family, he was trying to give a practical turn to his ideas of domestic life. It was true he moved in English society and had an English wife; but he thought it should make no difference. That was wrong. The trouble was fomented. His wife would not be dictated to by him in choosing her friends. The rose-edged period of courting with its moonlight flirtations, Sunday picnics and evening visits to cinema and concert were a dream now. The honey-moon spent, two years back, in the green valleys of Kashmir was a merry-go-round. And now! Time changed. He realised that life was not so sweet as marriage bells. He soon found that his wife belonged to the post-war quasi-masculine set of girls who love open-air life, and despise their home and hearth—the worn-out domestic theories of grandmamma's days. She wants, a cycle of friends like a cycle of seasons. He could not put up with these ideas.

He felt that his presence did not animate her features with girlish buoyancy, her face was no longer lighted with a beaming smile when he approached her. Her time was spent among her friends; she had often refused to accompany him for an evening drive. This change in her was alarming to a man of Zahir's regulated habits.

He had found a way out of the difficulty. He had decided to build a house in the country and retire to it. He believed that thus cut off from her friends and the whirlwind of society, his chances of wooing her anew would be enhanced. He had prepared an elaborate plan of creating romantic surroundings for her to ease his task.

As he was driving through the crowded streets, these ideas were also passing through his mind. He reviewed the whole situation and decided to break the news to his wife when he reached home. He pictured her in the garden sitting cold, dignified, self-composed, and a wave of nervous sensation coursed through his heart. He was ill at ease when he entered his stately lodge.

The Sentimental Project

ZAHIR-UDDIN, the young mill-magnate, steered his car into the premises of the famous architect, Ramchand. Zahir was dressed in the latest Oxford fashion. From the pale-blue evening hat to the glazed patent leather shoe, everything bore testimony to his refined taste. He took a cigar from the tortoise-shell cigar case and began to ascend slowly the broad staircase leading to the office. He tried to smoke out the ideas crowding on his mind. His face assumed an expression of excitement mixed with slight irritation.

A brooding look came into his eyes, as he extended his hand to Ramchand whose furrowed face was wreathed into smile. Zahir sat on a chair beside the architect, twisted his legs (a familiar habit), screwed up his eyes, and said, " Have you seen the site ?" " I motored there in the morning," said Ramchand, " It has a splendid view with its rising hills and silver-streak of the river."

" I am glad you like it."

" Like it !" he said ecstatically " Isn't the word. The whole atmophere in the blue haze of the early morning appeared almost to be charged with soft ethereal waves. I adore it. "

" Splendid ! you wax eloquent ; but I want to make one point clear " the other said in a matter-of-fact tone, " I don't want this house to be constructed on conventional continental design. European art does not appeal to me. It has a tinge of their commercialised tastes. You prepare a plan on Indo-Persian style and we will go through it carefully."

Ramchander nodded.

" I think, I should go," he said taking his hat from the office table. " I've explained my legal view-point to my solicitor. He will call at your place to-morrow morning and sign the contract on my behalf, " and without waiting for reply he went out of the office.

He hath inaugurated his schemings with the juggling heavens[1]."

In this poem for the sake of humour or considering Khwája Imád to be a hypocrite, he wrote this verse:

اے کبک خوش خرام کہ خوش میروی بناز
غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

"O gracefully-moving partridge who walkest with so pretty an air,

Be not deceived because the cat of the ascetic hath said its prayers.[2]"

Probably this was the beginning of Sháh Shujá's dislike for him. Later on the relations were strained. Once Shujá' said to Khwája Sáhib, "None of your poems has a one-sided aspect, nor does it deal with one theme; in one verse Mysticism, in another drunken revelry, in the third talk of the beloved, so every verse takes a different colouring." Khwája Sáhib replied "Yes, despite these limitations my verses are popular and get spread all over the world; quite contrary to those poets' poems that never step out the city gates." Shujá' was greatly afflicted by this bold and impertinent answer.

It happend that in those days, Khwája Sáhib wrote a poem, the Maqta' (last verse) being.

گر مسلمانی همین است کہ واعظ دارد * وائے اگر در پس امروز بود فردائے

[3] "If Muhammadanism be that which Háfiz holds

Alas if there be a to-morrow after to-day."

When Sháh Shujá' heard this, he wanted to molest him on the ground that the verse indicated denial of, or at least scepticism about, resurrection. Khwája Sáhib was greatly distressed. It was a happy incident that in those days Zaynu'd-Dín Abú Bakr Táibádí, on his pilgrimage, happened to pass in Shìraz. He told him all that had happened. Mawláná Zaynu'd-Dín advised him to add one more verse to the poem above the maqta,' which would become the reported speech of another man. Khwàja Sàhib instantly added this verse:—

دی دوبتیم چہ خوش آمد کہ سحر گہ می گفت
با دف و بربط و نے مغبچۂ ترسائے

"How pleasant to me seemed this saying which at early morn

A Christian was reciting at the door of a tavern with tambourine and flute[4]."

(1, 2, 3, 4.) Prof. Browne's translation. Editor

It seems the broadmindedness of Sháh Shujá' made the drunkards bold for which Khwája Sáhib is very grateful to him. In the poems he composed in praise of Sháh Shujá' he reiterates vehemently :

قسم بحشمت و جاه و جلال شاه شجاع * کم نیست با کم ز بهر مال و جاه نزاع
ببین کم رقص کنان میرود بنالهٔ چنگ * کسے کم اذن نمی داد استماع سماع

" I swear by the pomp and rank and glory of Sháh Shujá'

That I have no quarrel with anyone on account of wealth and position.

See how he who (formerly) would not permit the hearing of music

Now goes dancing to the strains of the harp[1]."

In another poem he says :

چنگ در غلغله آمد کم کجا شد منکر * جام در قهقهه آمد کم کجا شد مناع
عمر خسرو طلب از نفع جهان می طلبی * کم وجود یست عطابخش و کریمے نفاع
مظهر لطف ازل روشنی چشم امل * جامع علم و عمل جان جهان شاه شجاع

"The harp began to clamour 'Where is the objector ?'

The cup began to laugh " Where is the forbidder ?"

Pray for the King's long life if thou seekest the world's welfare,

For he is a beneficent being and a generous benefactor,

The manifestation of Eternal Grace, the Light of the Eye of Hope,

The combiner of theory and practice, the light of the world, Shàh Shujà."

Although Khwàja Sàhib everywhere has uttered the name of Sháh Shujá'[2]"

In a panegyric tone, as he says in a poem :

خیال آب خضر بست وجام کے خسرو * جرعم نوشے سلطان ابرا لفوارس باشد

Still he was not sincere with him.

Khwája Imàd-i-Faqíh (Jurisconsult) was a celebrated man of parts, of whom the king had formed a great opinion. He had taught his cat in such a way that whenever he performed his prayers, she too in the same manner used to kneel and raise her head. Khwajá Sáhib in those days wrote a poem on him.

صوفی بم جلوه آمد و آغاز ناز کرد
بنیاد مکر با فلک حقه باز کرد

" The Súfí hath made display of his virtues and begun his blandishments ;

(1 & 2) Prof. Browne's translation.

All the revellers have abandoned the worship of wine
Save the city constable, who is drunk without wine[1]."

After the death of Amír Mubárizu'd-Dín, his son Sháh Shujá' ascended the throne. He was the commanding figure of this line and a great patron of arts and sciences.

He began to study at the age of seven, committed to memory the whole of the Qur'án when he was nine years of age, and learned *Sharh-i-Mufassal* under *Qadhi Adhud.* His memory was so retentive that he could remember six or seven Arabic verses, by hearing them once. His writings in Persian and Arabic are very popular among literary men. His patronage of learning and letters made his court the Mecca of the distinguished men of the time. He was also a poet. Taqíu'id-Dín Husayní has given many verses in his *Tadhkira.*

A quatrain runs. thus :

احوال بد م زخلق پنهان می کن
وا هوا ل جهان بر دلم آسان می کن
امر و ز خوشم بد ار و فر دا با من
انچه از کرم تو می سزد آن می کن

" O Lord, conceal my wretched condition from the people,
Render the miseries of life easy for me to bear.
Keep me happy to-day, and to-morrow with me
Do that which becomes thy grace."

It appears that he relaxed the restrictions concerning the taverns, prevalent before his reign, with a view to giving freedom in trade. There is a poem in the Díwán of Khwája Sáhib that demonstrates this circumstance.

سحر ز هاتف غیبم رسید مژ ده بگوش * که د ور شاه شجاع است می د لیر بنوش
شد آن که اهل نظر بر کنا ره میر فتند * هزار گو نه سخن بر دهان و لب خا موش
بیا با نگ چنگ بگو ئیم آن حکا یتها * که از شنیدن آن د یگ سینه میز د جوش
ر موز مملکت خو یش خسر وان د انند * گدا ئے گو شه نشینی تو حافظا مخر وش

"At early dawn good tidings reached my ear from the Unseen Voice :

'It is the Era of Sháh Shujá' : drink wine boldly !'
That time is gone when men of insight went apart
With a thousand words in the mouth but their lips silent.
To the sound of the harp we will tell those stories
At the hearing of which the cauldron of our bosoms boiled.
Princes (alone) know the secrets of their Kingdom ;
O Háfiz, thou art a beggarly recluse ; hold thy peace[2].!"

(1 & 2) Prof. Browne's translation.

Hide the goblet in the sleeve of the patch-work cloak,
For the time, like the eye of the decanter, pours forth blood.
Wash your dervish-cloak from the wine-stain with tears,
For it is the season of piety and the time of abstinence[1]."

There is another ode in the Díwán of Khwája Háfiz composed in these very days, which is a pathetic elegy on the taverns being closed up.

بود آیا که میکده ها بکشایند * گره از کار فروبستهٔ ما بگشایند
گیسوی چنگ ببرید بمرگ می ناب * تا همه مغبچگان جامه ز غم بدرایند
نامهٔ تعزیت دختر رز بنویسید * تا حریفان همه خون از مژه ها بگشایند
در میخانه ببستند خدایا مپسند * که در خانهٔ تزویر و ریا بگشایند
خرقه از بهر دل زاهد خودبین بستند * دلقوی دار که از بهر خدا بگشایند

" O will it be that they will reopen the doors of the taverns,
And will loosen the knots from our tangled affairs ?
Cut the tresses of the harp (in mourning) for the death of pure wine,
So that all the sons of the Magians may loosen their curled locks !
Write the letter of condolence for the (death of the) Daughter of the grape,
So that all the comrades may let loose blood (stained tears) from their eyelashes.
That they have closed the doors of the wine-taverns ; O God, suffer not
That they should open the doors of the house of deceit and hypocrisy !
If they have closed them for the sake of the heart of the self-righteous zealot
Be of good heart, for they will reopen them for God's sake[2] !"

Sháh Shujá', son of Amír Mubárizu'd-Dín, of whom we shall speak immediately, on this occasion wrote a quatrain, and really a beautiful one.

در مجلس دهر سازمستی پست است
نه چنگ بقا نزن و نه دف بر دست است
رندان همه ترک مے پرستی کردند
جز محتسب شهر کسے مے نه مست است

" In the assembly of the time the concomitants of wine-bibbing are laid low ;
Neither is the hand on the harp, nor the tambourine in the hand.

(1 & 2) Prof. Browne's translation.

Thirdly, one like that just judge Asílu'l-Millat wa'd-Dín,
Than whom Heaven remembers no better judge.
Again one like that accomplished judge *Adhud* (*u'd-Din al-Iji*[1]).
Who dedicated his explanation of the *Mawaqif* to the king.
Again one so generous as Hájji Qiwám[2], whose heart is as the Ocean,
Who, like Hátim, invited all men to partake of his bounty.
These departed, leaving none like unto themselves:
May God most great and Glorious forgive them all!"

He felt the shock of the death of his friend, Sháh Abú Isháq for a considerable time. Even in the odes involuntarily, as it were, the name of Abú Isháq comes to the end of his pen.

ر ا ستی خا تم فیر و ز ۱ بوا سحا قی
خو ش د رخشید ولے دولت مستعجل بود

"In truth the turquoise ring of Abú Isháq flashed prosperity."

After Abú Isháq Mubárizud-Dín Muhammad b. Muzaffar became the ruler of Shíráz and Fàrs. He was really a native of Khurásán. When sultan Abú Isháq died and tribal kingdoms began to be formed, he in 471 A. H. raised an army and attacked the surrounding villages. At first he took possession of Yazd, and later on, the boundaries of his kingdom became very extensive.

Muhammad *b.* Muzaffar was very ascetic in character. No sooner had he ascended the throne than he caused all taverns to be closed. Everywhere he appointed Muhtasibs (constables). In the *Tadhkira* of Taqíu'd-Dín Husayní, it is written that Khwája Háfiz composed this ode referring to these severe measures

اگرچہ بادہ فرح بخش و بادگلبر یزاست * بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است
د ر آ ستین مرقع پیا لہ پنہا ن کن * کہ ہمچو چشم صراحی ز مانہ خونر یزاست
ز رنگ بادہ بشوئید خرقہا از اشک * کہ موسم ورع و روزگا ر پرہیزا ست

"Though wine gives delight and the wind distils the perfume of the rose,
Drink not wine to the strains of the harp, for the constable is alert.

(1) 'Adhudu'd-Dín 'Abdúr-Rahman b. Ahmad al-Iji composed a number of works on theology, ethics, philosophy, etc., amongst which the *Mawaqif fi 'Ilmi'l-Kalam* (on which al-Jurjání, mentioned in the preceding note, wrote a commentary) is the most celebrated. He died in 756/1355. See Brocklemann, *Gesch. d. Arab. Litt.*, 11, pp. 208-9

(2) Hájji Qiwám is celebrated by Háfiz, in other poems, as in the well known verse.

د ر یا ئے اخضر فلک و کشتی ہلا ل * ہستند غرق نعمت حا جی قوام ما

He died according to the *Fars-nama* in 758/1352.

spring. From the balcony he beheld the forces scattered all round. "Well, what is this?" he asked. He was told that it was Sháh Muzaffar's host. He smiled. "What a great fool he is to waste the spring in such fashion." and came downstairs, after he had recited :—

بیا تا یک امشب تماشا کنیم
چو فردا شود کار فردا کنیم

"Come, let us make merry just for this one night,
And let us deal to-morrow with to-morrow's business.[1]"

At last Shíráz was taken by Muzaffar (Mubárízud-Dín Muhammad *b.* Muzaffar) and Abú Isháq put to death. It was a terrible blow to Khwája Sáhib. He wrote a *Qita*, mentioning the leading personalities of that period.

بر عهد سلطنت شاه شیخ ابو اسحق * بر پنج شخص عجب ملک فارس بود آباد
نخست بادشهی همچو او ولایت بخش * که گوئی فضل بر بود او بر عدل و بخشش و داد
دوم بقیهٔ ابدال شیخ امین الدین * که بود داخل اقطاب و مجمع اوتاد
سوم چو قاضئی عادل اصیل ملت و دین * که قاضئی بر ازو آسمان ندارد یاد
دگر چو قاضی فاضل عضد که در تصنیف * بنائے شرح مواقف بنام شاه نهاد
دگر کریم چو حاجی قوام در یادل * که او بجود چو حاتم همی صلا در داد
نظیر خویش نم بگزاشتند و بگزشتند * خدائے عز و جل جمله را بیامرزاد

[2]"During the period of Sháh Shaykh Abú Isháq's rule

The Kingdom of Fárs throve wondrously through five persons.

First, a king like him, a giver of governments,

Who, thou would'st say, snatched pre-eminence by justice, bounty and equity.

Secondly, that Remnant of the Abdál,[3]Shaykh Amín-u'd-Dín,

Who was numbered amongst the 'Poles' and was the meeting-place of the *Awtad*.

(1) Prof. Browne's Translation.

(2) Prof. Browne's translation. His explanatory notes that are given below this *Qita* are very valuable and I should like to reproduce them here for the benefit of the readers. See Prof. Browne's L. H. of Persia : Vol. 3, page 276. (3) "The 'Abdál ("Substitutes") Aqtáb ("Poles"), and Awtád (literally, "Tent-pegs") are three classes of the *Rijalul-Ghayb*, or "Men of the Unseen World," who are supposed by the Súfís to watch over the order of the world, and the welfare of mankind. Their number and functions are discussed in the 'Definitions' (Ta'rífát) of ash-sharíf al-Jurjáni who was appointed by Sháh Shujá' to a professorship in Shíráz and must have been acquainted with Háfiz. He died in 816/1413.

gave him '*a specimen hemistich*[1]' for writing another ode He, to their astonishment, composed a brilliant ode. This happy circumstance became the talk of the town.

The account of all these facts is given by 'Abdu'n-Nabí in his *May-khana*. Graceful religious beliefs and superstitions have exaggerated or mutilated the real facts; still, it should be admitted that a few of the above-mentioned facts are worthy of credence.

When the poetry and excellence of the Khwája Sáhib attained wide fame, many a king and noble, remote and distant from his country, wrote to him and invited him. In the period in which Khwája Háfiz lived, several dynasties rose to power and fell again in Shíráz. Happily the rulers of these dynasties were great patrons of the poets and learned men of the time, and themselves well-versed in different arts and sciences.

In the reign of Gházán Khán, the grandson of Chingíz Khán Muhammad Sháh Suhujá' Injú was appointed governor of Fárs and Shíráz. Abú Isháq, son of Muhammad Sháh, was the ruler of Shíráz at the time of Khwája Háfiz. He was a man of parts and learning, a poet himself, friend and patron of poets. At the same time he was a luxurious and pleasure-loving prince. The affairs of state, being neglected, called for sound control. Yet merry-making and pleasure-seeking were the characteristic features of the age. Shíráz became the garden of Eden. The intoxicated odes of Khwàja Hàfiz reflect the influence of this period.

Abú Isháq's voluptuousness became intolerable, and Muhammad Muzaffar led his army against him. The forces surrounded the outskirts of the fort, yet there was none who would dare to inform Abú Isháq of the impending danger. Amínud-Dín, a great favourite of his, induced him to ascend the balcony to enjoy the splended spectacle of the town, rendered so charming and attractive by the blossoming

(1) طرح مصرع = Specimen Hemistich. In Mushá'iras, generally a previous announcement is made to the effect that poets who want to meet and recite in the Mushá'ira (poets-gathering) should compose their odes according to طرح مصرع = It consists of a hemistich which falls under a particular رد یف ' قا فیہ ' بحر (metre and rhyme). At night the poets, when the Shama is placed before them, according to the tradition of the 'poets-gathering' not to compose any ode falling out of the specified hemistich, recite their respective poems and when any of their distich is brought home, full justice is done to them by loud echoing shouts of "Wáh! Wáh!" (Well done).

(2) Shiblí probably means Mubárizu'd-Dín Muhammad b. Muzaffar, as he states later on, the first of the Muzaffarí Dynasty. See Prof. Browne's 'A History of Persian Literature under Tartar Dominion.' Pages 168-5.

reached the age of maturity this man's company became unwholesome for him. So they parted. The Khwája Sáhib took to making yeast. He used to wake up at the dead of night and engage himself in kneading dough till morning. Close to this house was a school where boys of the locality went to read. He often found the opportunity to go there, when in his heart the curiosity to learn was greatly excited. Later on, his yearning for knowledge had increased to such a degree that he got himself admitted into the school. Out of the stipulated wages he got from his trade, one-third he gave to his mother, one-third to his teacher and the rest he spent in charity. Here he learned the Qur'án by heart and obtained an ordinary respectable education. In these days poetry was the breath of everybody's nostrils. In the locality there was a cloth merchant, gifted with poetic talent and a sound sense of poetic judgment. People with similar bent of mind flocked together at his shop and enjoyed themselves, their favourite topic being poetry. Under the influence of this happy group, he began to compose poems. His nature was late to flower and hence his small success. He became the common butt of the people and his ridiculous versification streamed far and wide, so that people invited him often for their edification and took great pleasure in raising good-humoured laughter at his poems. This state of affairs continued for two years until he began to realise that the derision of the people was outgrowing its limits. One day his feelings were greatly wounded. At the shrine of Bábá Kúhí, he burst into hysterical sobs. That night he saw in his dream that he was visited by a saint who gave him a morsel to eat and told him that henceforth the doors of all learning were open to him. He inquired the name of the saint. He came to know it was Jánáb-i-Amír[1], let peace be on him! He got up from his bed next morning and wrote the ode beginning with the line :

د وش وقت سحرا ز غصہ نجا تم د ا ہ ند

و ند را ں ظلمت شب آ ب حیا تم د ا ہ ند

"Last night, at early dawn they saved me from grief,

And in the darkness of night, they gave me the water of life."

He entered the city and the people, as usual, asked him to recite his verses. He chanted before them this very ode which amazed them greatly and led them to believe that some one had composed it for him. In order to test him, they

(1) Refers to Hadhrat 'Alí, the fourth Orthodox Caliph.

Hafiz

Translated from Shibli's Sh'ir'ul-'Azam.

NO circumstance could be more deplorable in the history of poetry than one which concerns Háfiz, the facts of whose life are so little known as to gratify the thirst of men of taste. If a poet of such eminence and rank had been born in Europe, there would have been numerous and detailed notices, revealing a full knowledge of every part and character of his picture of life. If, whatever has been written by our biographers is assimilated into one whole, no aspect of his life comes into relief. All memoirs are copied from one another with variation of expression. Among all these 'Abdu'n-Nabí in his *May-khana*, composed in Jahángír's reign, in 1036 A. H. has supplied valuable material concerning the poet's early life. A few facts are found, here and there, in the *Habibu's-Siyar*. There are others in the works of Háfiz himself. Arranging all these I shall try to draw a picture of his life, but in the real sense it will never be a picture —but a rough sketch; to speak the truth a few abrupt lines.

Parentage of Hafiz:—The grandfather of Khwája Sáhib was a native of the suburbs of Isfahán. In the time of the Atábeks of Shíráz (Fárs), he migrated from Isfahán to Shíráz where he settled down permanently. Bahá'u'd-Dín, the father of Khwája Sáhib, here began to carry on trade and was so successful in his business that he was reckoned among the rich men of the time. Bahá'u'd-Dín passed away leaving three sons. The Khwája inherited a large fortune from his father; but, through bad house-keeping, this was soon lost. The sons could not conform to their fallen circumstances and so each went his own way. The Khwája Sáhib, being a youngster, stayed behind in Shíráz with his mother. Penury and hunger at home compelled the poor mother to deliver her child to a certain man, on the agreement that the boy would wait upon him and in turn be given a home. He unluckily, happened to be a man of loose character. When the Khwája

Kamuri and I kept watch over her through the night, and for a long time we heard the men outside by their great fire discussing the creature whom Rokumatsu described so clearly to them. They were unanimous at last that it was one of that strange race of wrestlers bred in the towns and villages which could be seen from that mountain shoulder. There men are all abnormal in stature, build, features and habits, and from time to time one is thrown up by breeding who is quite unfitted for even the roughest human society owing to the violence of his passions. Such men when they do not bring death or imprisonment upon themselves, sometimes escape into those mountain glens, alone, for there is none who will follow them.

Just before daybreak, as I was drowsing and the others were all asleep she suddenly sat up with a cry and looked at me with eyes that were so sad, for there was no understanding in them, only a wild light. She began to cough ; some blood ran out of her lips and she fell back and never moved again.

We made a bier and wrapped her in our camping rugs, and bore her round the mountain and down the rugged path to the hot springs at Yumoto. This took us two days, as we had much difficult snow to cross.

There we rested, and the next day carried her to her last home beneath the great trees at the forest shrine where I first heard her voice, the cry of despair none heeded. And there you will find her grave, which you will know by a cross of white marble on which is carved the one word MARY.

E. E. SPEIGHT

But she gave a terrified glance at me, the glance of a mad woman, and darted out of the shelter, a sorry figure hung with rags, and disappeared behind the big rock.

"Run after her." I shouted to Rokumatsu, "she's afraid of me."

He bounded up the slope and I turned back to where the creature had fallen.

He was lying doubled up, writhing and growling, a man certainly, to judge by the proportion of the parts of his body, but repulsive beyond words in the inhuman development of the bull neck and the cruel features. As he lay there, he turned his face up, and the sight of those ghastly eyes and teeth and that pit where the nose should have been, made me stand on my guard. He seemed to be waking out of a swoon, and I realised that he was probably more stunned by his fall than disabled by the bullet. He raised himself on his hands, but evidently felt pain, as he began again that sickening snarling. I raised my gun and he sank quietly back. Then he leaped up like a kangaroo and bounded off through the wilderness of rocks. With a wild leap he was over the precipice. There was nothing more to fear.

All this had happened much more quickly than it takes to tell it, and I had no sooner turned from watching that monstrosity out of sight than I saw Rokumatsu with a quiet bundle in his arms coming from behind the great rock.

I ran up and saw that it was a young girl barely clad, with her body covered with bruises and cuts. She had fainted and her head had fallen back showing a face so pitiful that even Rokumatsu, rough mountain lad as he was, had tears in his eyes.

I looked into the shelter and saw a horrid pile of bones of animals smashed to get at the marrow and the feathers of birds lying about everywhere, as when a hawk has finished with a thrush. There was nothing of human use.

We carried her down to the spring and bathed her face till she opened her eyes, and then we had no further doubt, for she closed them again faintly murmuring: "Aa! Kurushii! Ah! I can't bear it!"

We bound her on to the sturdy back of Rokumatsu as they do children and by three o'clock were back in camp, where Kamuri could hardly believe his eyes. He ran off to signal the news, and before dark four of the twelve watchmen were with us. Meanwhile we had got her to take some warm soup and a restorative draught, and she was sleeping heavily.

luncheon box back in the knapsack and we stood up, cautiously peering about. Rokumatsu, with his fine profile was like a deer-hound snuffing the wind. There was no sign of smoke nor footpath.

We moved along, taking care to come out of cover of the rocks as little as possible, and expecting at every turn to catch sight of something startling. But all was desolate, save for the fluttering of mountain larks.

We reached a fairly open place where were nothing but rocks, most of them not more than breast high, and to cross this we had to duck. Suddenly there was a whistling in the air and a great stone crashed on a boulder between us, making sparks fly. I was so near that I could smell the gas released. I looked up hastily, and there under the shelter of a leaning rock some fifty yards or so, above us, we saw a rude lean-to shack covered with branches and leaves. In front of this was standing the most horrible figure in human shape I have ever set eyes upon. He was taller than any ordinary man except the bigger Swedes ; his huge limbs were a dirty brown, and long black hair was hanging about a face hideous with anger or madness. About his nakedness was only a bearskin belted but not close fitting, so that his hairy chest, like that of a gorilla, was uncovered.

He was gnashing his teeth and making a wolfish sound, and all at once it came into my mind that that was the very sound that had roused me from my sleep at the forest shrine. Even there, in the wind and sunshine, I trembled again.

Then at the dark hole of the lean-to behind him, we saw another face. In that high light we saw it so clearly..... the face of a girl pale and full of suffering. The gaze seemed to be wandering about the rocks, then fixed on us with a swift glance of surprise. A scream rang out, and the beast turned and raved at her so that she drew back into the shelter. Then that creature came down the slope yelling like a hyena straight for us, the more fearful for its human form. There was nothing else for it : we had no animal power to defend ourselves against him ; so I raised my rifle and gave him one through the right shoulder. He plunged on, spun round and came a cropper on the sharp stones of the slope, hissing like a rattlesnake.

" Drop that rock on him if he stirs !" I shouted to Rokumatsu, and ran round the rocks to the foot of the slope. Looking up, I saw the same frightened face hurrying out of the den.

"Mary !" I called, " come along ! You're quite safe now !"

no ravine or glen was inaccessible. When we lost him in woods below us, he would signal to us by the smoke of fires he made here and there, and I would reply by shots from my rifle, which often provided us with fresh game.

So we worked round the great mountain, looking over the Japan sea and its cities along the shore; across to Tateyama in the north and Fuji in the east; standing on that one of the three holy mountains of Japan we could often see the two others, especially across the white ocean of billowing clouds at daybreak. Besides them it was the smoke of far Asama that next attracted our attention.

One forenoon, we were encamped on the north-east shoulder just below the snowline, which was there at about 7,500 feet. Kamuri remained by the camp fire, arranging his specimens, whilst Rokumatsu and I went off for the day. We were on a fairly easy slope of the mountain overlooking the region called Hida, or Folds, from the succession of mountain ridges and valleys of which it is composed. We were only a couple of miles or so from the highest cascade in Japan, Shiraito or White Threads, a fall of over two thousand feet, and we hoped we might catch a glimpse of it. The sun was warm, even at that height, and the air mightily exhilarating. A few silver birches and maples were growing and there were tempting patches of soft grass such as we rarely find in Japan. At our left the mountain in precipices fell away into awful depths. We had climbed a lateral rise and had just come on to a level on which were strewn huge boulders, some of them as high as a three-storied house. At the foot of one of these, beside a spring of the purest of water, we had sat down to eat our lunch of rice, pheasant and salted plums.

Rokumatsu was grubbing in the ground in front of him, as I opened our luncheon box. Suddenly he turned and said in a tone of repressed excitement: "Sensei, look at this!"

He was holding up a narrow strip of something red, and his eyes were gleaming. He put it into my hand; it was a coarse kind of flannel.

"That is part of a woman's petticoat," he said.

I looked at him in amazement.

"Are you sure?" I asked.

"Quite," he said; "and look here!"

He was pointing at the water, and I clearly saw signs of human artifice, where stones had been laid to form a miniature pool large enough for an ousel's bath. I hastily slipped the

"But they would lose themselves," he replied. You remember how Mitsuoka and his two friends left here two years ago and passed through the very village you speak of, and were never seen again."

That I remembered so well and how their bones were found after the snows melted.

I went to the station with him at daybreak, and we parted very sadly.

He was back again within the week, looking thin and sunburnt. Day and night he had spent with two foresters, roaming the hills to the snowline.

But nothing was heard or found. Only in my heart was a new purpose. I had intended to spend the summer by running over to California to see my brother: but now I was drawn to match my insignificant power with that vast mountain bulk and all its wild ravines might hold.

It was now my resolve to spend the whole summer on that mountain, exploring the sides away from the home of Yuhara. I chose for my companions Kamuri, a pupil who had climbed all the main peaks of the Japanese Alps and liked nothing better than the chance I gave him, for he was a keen botanist, too, and the flora of Hakusan is unique in Japan,—and a youth named Rokumatsu the son of a charcoal burner at Futamata, a desolate village at the foot of the range. He was one of the finest mountaineers I have known in Japan, used to carrying heavy burdens up and down slippery tracks, and yet lithe as a coolie, with the keenest of eyes. The poor fellow was stabbed by a drunken Cossack in Vladivotok station a couple of years ago.

We took with us sleeping bags and a tent that would shelter us against those wild winds and rainstorms that come hurtling from Siberia over the Japan sea and dash themselves against that giant wall of mountains.

We booked the services of a dozen men through the whole summer, to keep up a line of communications with us and supply us with stores. A few of them had been in the army. So before we left we trained them in a simple system of signalling, and by that means we kept in touch with villages at the end of the roads even when we were twenty miles away, on the other side of the ridge. It was an experience worth a whole book, for every hour of the day brought us some unforgettable scene. And for me there was so much to learn from the speech and confidence of my companions, who never lost their eager interest. Kamuri revelled in the wonderful wealth of mountain flowers and mosses, and for Rokumatsu

So we said we would go home and get help. It was quite dark when we got in and mother was very anxious. Then I ran down to the village and a number of men came with lanterns and sickles. We searched the woods all night and all the next day, but no trace of Mary was to be seen, and no one could give any explanation. In a few days I had to come back here to school, but before I left I saw all the foresters and charcoal burners of that side of the mountain, and implored them to do all they could.

"My sister sent me letters every few days, but they were very sad ones. At last, one day in November I received a telegram, telling me to go home at once. I was in an agony all the way, and when I got to the house they put into my hands this piece of crumpled paper I have shown you. It had been found high up the mountain by a hunter, stuck on a branch of a pine tree, ten miles from the place where we lost Mary."

He was weeping silently. Now I understood why he had started so at what I told him of my dream.

"That is the last we heard of her," he said "unless, unless—"

Then all the horror of it came upon me. She was somewhere still alive, in the grasp of some creature less than human, and she had managed to escape and reach the only sanctuary she knew. But it was not open to her, and her cry had been in vain. We looked at each other aghast, her lover and I.

It was nearly a month since, and no one had stirred to her rescue.

"Can't the police or the military authorities help in any way?" I asked to break the awful silence.

"Ah, you don't know those mountains," he said, "even a whole division would be lost. And the only men who do know them have tried their best. But you have told me surely that she is still alive. I will go home by the first train in the morning and let them know all round the mountain."

"Yes, do," I said, "and I will go up on Saturday to the mining village at the head of the Saigawa and get my friend the headman to send the messages all round the foothills on this side, wherever there are signs of human habitation."

"Thank you! Please do," he said wistfully.

"You know," I added, "that if I told the boys in the college, they would half of them undertake rescue parties,"

School, where she could have learnt all she wished. Now I felt sure that she was lost beyond recall.

"The last time I saw Mary," he continued, "was on the fifth of September. The maples were beginning to turn, and we went out with my sister Fumi along the path leading to the mountain foot. You know that our shrine is one of the three gates of the mountain Hakusan, so there is traffic past our home during the season of climbing. That season had just ended, so our walk was very lonely. We had food with us for the day, and instead of following the main path we turned up a streamside, to visit a waterfall very few people knew. There we sat in the sun all the morning, the girls wading about from time to time; and we sang many songs.

There when the sun had sunk so that its beams shot level into our eyes we decided to go home.

When we had walked downstream a few hundred yards, Mary suddenly remembered that she had left a little packet of picture postcards behind a rock. She ran back to fetch them and we sat under a tree and waited for her. It was very pleasant there in the evening wood,—the titmice were calling merrily to each other, and there was a great peace.

"All at once we heard a scream of terror, and we both ran back as fast as we could. It was only one cry, but we knew it meant danger. We thought that perhaps she had been frightened by a monkey.

"But when we reached the waterfall she was nowhere to be seen. The picture postcards were scattered about as though some one had dashed them down."

Again he looked in his pocket-book, and took out a couple of mud-stained cards and laid them before me. One was a Scotch portrait by Raeburn, the other a Hungarian shepherd with his flock.

"There was nothing else," he said. "And there was no other path, no way out of the glen but up the cliffside. We looked behind every rock and called her name over and over again, but there was nothing to be heard but the seething sound of the falling waters. Only once we heard a very strange sound, like a locomotive's whistle it seemed. I have never heard such a sound before, and I don't know whether it was a deer or a bear.

"Darkness began to fall and we could do nothing. Fumi was crying and I could not leave her or let her go home alone. The woods had become so lonely; I think she was much afraid.

"I have one sister of my own, you know," he said, and I remembered the shy girl of fourteen or so I had caught glimpses of through a door-way now and then.

"She is very lonely now."

He remained silent for a few moments, his eyes cast down.

"She had a playmate last year, and they were very happy together.

"Her name was Michi but I called her Mary, because I loved her." And somehow the mention of that most beloved name in the world gave to his words and to himself something that I had never felt before in Japan, a feeling I can only suggest by the word sanctity.

"She came to our home because her parents had died and my sister Fumi was her best friend. Although my father and mother are poor people they decided to adopt her; so she became one of us; and as they liked her, they thought of her as my future wife.

"She was quicker than my sister, and very much interested in anything foreign. She would have liked to learn the piano, and to dance and to speak English, but such things are out of all question in our lonely village, you know!

"So you can imagine how happy we all were when I went home in the vacations. Then she would not rest until I had told her all the new things I had learnt. Not the things I liked best, local legends of my own country, but every thing that related to foreign countries, about the missionaries' homes and churches, about my teachers and what they told us in class and the books we read in English and German." Then he looked up at me smiling sadly. "I have often told her about you, sir, and she liked especially the story you told us of the Swans of Lir. You remember!"

Yes I remembered, but I had no idea that I had been the means of planting an old Irish legend deep in a mountain fastness of Japan.

"She wanted to go with me to the city to see some of the foreigners and just peep into their houses. But I told her I would ask you to come and see us in the spring, and that made her so happy."

As he uttered these words a great wave of sorrow overwhelmed me. All the silence of Japan is full of such things; instead of speaking of things in time, so many people draw apart and clothe themselves in melancholy. Had we but known of this child, it could have been so easy to get her into a good home with the ladies of the Canadian Mission

The next morning I slept late and woke to the song of birds and forest streams and to spears of bright sunlight flashing down through the trellis of the branches. The whole experience had gone clean out of my mind until his presence, or it may be his turn of thought, had brought it back so vividly.

Then I told him, all innocently. But I shall never forget the change of his face when I uttered these words I had heard in the night. *Anchan, hayaku-kurushii !* I thought he would fall from his chair in a fit. He was always pale, as I have said ; but now he became white ; he gasped, and held out his right hand as if feeling for support. I seized his hand and found it rigid. I lifted him and he was light to bear, and laid him on my settee, with cushions under his head.

But he would not lie. He sat up almost at once, and looked straigth through me as if at some terror behind or beyond me.

I could not bear it. I turned and opened the window, as the evening was close, warmer than the day had been. Heavy thunder-rain was falling.

" To-night you will stop here " I said, " we will telephone to your boarding-house."

He passd his hand over his brow and said wearily : *Taiso shitsurei itashimashita :* I have been very rude to you."

" No, no, " I said, " I have startled you. You must just drink these few drops, as medicine, and then rest."

He tasted the Benedictine, obediently, but only once.

" I am so sorry my dream has caused you pain," I said. " It was very thoughtless of me. You made me very happy there. It was only a nightmare I had forgotten at once."

" It was no nightmare," he said. " It was no dream."

And to my astonishment he opened his black pocket-book and took out a piece of brown crumpled paper and showed me on it, written in letters of blood in a childish trembling scrawl of *Kana* script, the very words : *Anchan, hayaku, kurushii !*

With the piteous appeal lying before me I myself fell strangely cold, as if I were suddenly plunged into tragedy beyond tears.

" What can this mean ? " I asked.

Then he began to tell me, speaking Japanese, a thing he had never done before with me, in broken tones, and from his first words my heart was strangely moved with a vague but deep sorrow.

the experience of their ancestors and those, too of the feudal ages seen again in their dreams.

I asked my friend, whose name, by the way, was Yuhara (naming the moor of the hot springs) to come and spend the evening with me, as I was so excited by the reading of these human documents, so touching, some of them, so weird, others. But I little imagined what that invitation would lead to.

After he had talked long and enlightened me about many of those all too brief visions my boys had taken such pains with, silence fell upon us, and all at once I was again lying alone in the upstairs room of that forest shrine, listening to the mountain winds in the great boughs of the high tree-roof.

And then there flashed into my mind something I had forgotten ever since it had occurred, as is often the way with experiences of the night.

That final evening my hostess had surprised me by a number of dishes one does not associate with the austere life of the priesthood. I was sure that they were specially prepared for me, though I had no chance of coming to know what their own fare was, as I was served alone in state, while the family had their meals in some chamber below, which I was not invited to enter. Because of the amount of meat and fish I had been constrained by courtesy to eat at that meal, instead of my usual simple supper, I lay awake long, with my imagination busy at work, conscious all the time of the surrounding forest and the awful lonely glens that lay between us and that wild summit of Hakusan, the white mountain, gleaming in the starlight nine thousand feet above our rest.

It must have been two o'clock before I fell asleep. The next thing I remember was waking, or having a terrifying dream. I was conscious of a snarling sound, that made me shudder, conscious too, of the near presence of something too dreadful for words. I tried to persuade myself that it was the heat of my body and the heavy quilts. I was drenched with perspiration, but too frightened to throw off the bed cloths or put out my arm to strike a light.

Then I distinctly heard a human voice, a girl's voice; some one was crying breathlessly, as in a torture of fright. "*Anchan, hayaku, kurushii.*" Brother, quick—I can't bear it—" Then followed the same snarling sound that had evidently roused me; there was a muffled moan and all was still.

I lay paralysed. Then by remembering to take long breaths I had slowly gained control of my limbs and muscles, and said to myself that it must have been my friend's sister crying downstairs in her sleep.

By daylight I found the place entrancing. The forest trees were ancient and magnificent of their kind, towering from the massy ruin-strewn ground like the masts of mighty ships, turning the sunlight to a dim green shadowiness. Above the dwelling house, reached by successions of old steps, stood the main buildings of the shrine, amid the traces of foundations of buildings which once gave abode to more than six thousand monks, my friend told me. Three hundred years ago the whole place had been destroyed by the Shogun Hideyoshi, who could brook no independence, all the buildings burnt and most of the monks killed. My friend's father was a descendant of one of the few who escaped, and the charge of the sanctuary, no longer a Buddhist monastary, but a Shinto shrine, had remained in his family. He took me into the isolated small square building of stone and timber which was the treasure-house of the shrine, and for the whole of a short day he opened boxes and scrolls and laid before me the precious offerings of great men through the past three centuries. There were paintings by Empresses and great artist-priests, gifts of bronze and lacquer by Shoguns and jealous feudal lords, and many relics of the heroic life of old Japan laid there in gratidude for who knows what good fortune.

And I wondered that such priceless things should be safe in a lonely mountain forest.

" O, no one would ever think of taking these," he had said to me.

And I sat there, feeling chill as the shadows fell, all ignorant of his thoughts.

There was a sadness over the forest and over their home which attributed to the long gloom of the winter they had gone through, a winter of snow roof-high on all that coast, in which the tracks of deer, wild boars and even bears were to be found down by the half buried railway lines.

After our return to the city and the busy life of the college, we did not meet outside the class-room for some time. Then one day I asked his class to write a composition for me on the subject *A Dream.* The result was very much more interesting than I had expected. Whether it was that the hour of writing was the first of the day, when the memory of dreams would be likely to be freshest, or because of the radiance of that May morning, the sea wind and the waving of willow boughs just outside the class-room, these young men were inspired, or shall I say, they were under some spell which led them to open their hearts. And some of them were certainly telling me of

even in May, I had looked with longing upon that snowy wonder, tinted with the gold of dawn or the rosy flush of sunset, so that it seemed like an incomparable lotus bloom, the very spirit of the earth itself.

My friend came out of a little shop with a lighted lantern, to which I by habit, at once objected, for I have always found that a light dangling before one darkens the landscape one wants to see.

"We shall need it soon," he said quietly.

Then I saw that he was leading me straight for the foot of that mountain mass behind which Hakusan lay, invisible from so near. In ten minutes we had entered the forest, and I was glad of the lantern. It had become pitch dark, and we were climbing a road paved with large stones difficult enough to keep a footing on even with that light.

"This long road was built 800 years ago by the priest who founded our temple," he said. "Every winter the frost displaces the stones, so it is no longer like a pavement."

I was elated at that wild approach. Soon we turned and stood before a low tower, faintly visible in the weak rays of our paper lantern, with a flight of steps and an avenue beyond, at the end of which I saw a light glimmering. He took off his hat and bowed in silence before the tower.

I saw ways leading in other directions.

Then he led me up the steps, along the avenue. He stopped once more to throw a ray of light upon a tree standing beside the portal of his home: "That is the tree of Enlightenment under which Shaka Sama sat in meditation," he said, speaking of Buddha.

We entered the dim building and were received with profound obeisance by his father, who wore the robes and quaint black bean-shaped head-gear of a Shinto priest, and by his mother, a subdued little woman who lookedworn-out by labour.

I spoke to them cherrily, but they never answered, and during the whole of my stay they never uttered a word to me directly, always through the son, whom they seemed to treat with unusual respect. I was his teacher, and moreover I was the first foreigner who had ever crossed their threshold: these things set me on a pedestal from which I tried in vain to step down. And they bestowed on me the care they would have shown to a high priest, giving me the finest quilts to sleep between, and venison and other rich food I least expected to find on the outskirts of a mountain village.

at any rate, anything superstitious, or incapable of clear intellectual presentation, is avoided or shelved.

So we are all baffled, however long we may live in the land, however confident we may feel of our insight.

This is a dull enough generalization I have given, but it may serve as a hint at least that in Japanese life there is much more of the bizarre, the romantic, the terrible, than is suggested by either the relics of the quaint life of past centuries or the superficial cosmopolitanism of to-day.

The painful tale I have to tell is one whose origin became known to me quite by accident. It centres about a friend who would scarcely be taken for a Japanese if you meet him in the streets of a western city. He is pale, aristocratic and intellectual in appearance, in dress and manners no way different from a cultivated European. And he is one of the three only out of several thousand pupils of mine who have ever obtained full marks in an examination.

During his college course the sheer interest of his English writings for me, and the attraction of his character, gradually drew us together. He had a quiet pride, which extended to his work, in which he was absolutely reliable. So it came about that we met from time to time, and would make little excursions together, on which I was deeply interested in the explanations he was always able and ready to give me of places, persons and customs. He had the historical sense, and it was astonishingly developed in the side of Buddhist research.

After a time he began to tell me, in his essays and his shorter compositions, about his home; and from what he said I came to have a keen desire to see his surroundings for myself.

The chance came at last, for seeing that I was really interested in the pictures he gave me of the mountainous region in which he lived, he kindly invited me to spend a few days there with him, in the spring vacation.

We had to travel from our city on the coast of the Japan sea for some three hours by train, and then on one of those long electric car lines which are a feature of Japanese civilization. At twilight we reached a station by a noisy mountain river, which we crossed by a swinging foot-bridge, to find ourselves in a long village of one straggling street. Ahead of us was the huge mass of which the ever white cone of Hakusan, nearly the height of the tallest Pyrenean peaks, crowns the whole range of desolate summits. Many a time from the swelter of the city, the stifling heat of the plain of Kaga which can begin

Mary: A Tale of Japan

JAPAN is a country full of hidden treasure, of hidden terror. What has been explored by foreigners of her civilization and natural features is but a scratching of the surface, a raking of autumn leaves. As for the people themselves, it is not for any outsider to generalize. The Japanese are the most taciturn of civilized peoples: when they do speak it is rarely to reveal. Missionaries and teachers may live the greater part of their lives in their midst and yet remain ignorant of a whole world of thought and feeling and experience. Now and then a stranger will come whose personality strikes a certain chord of sympathy in his Japanese associates, and he is thus led to divine things which are as safely hidden from others, and often from the Japanese themselves, as the lair of the fox or the cranny the snake sleeps in.

There is at least one reason why a great part of the multitudinous life-experiences of the Japanese remains in the dark chambers of unconsciousness for the people themselves. More than is the case with other civilized peoples their minds move along certain definite lines to the neglect of others. These lines have been as yet little revealed: we have no wealth of character drawing such as Tchekhov bequeathed to the world. Hence the Japanese are generally, and unjustly, criticised only from our western points of view. An American, a Swede or an Italian in Japan tries to work along the lines of his own experience and in so doing in nine cases out of ten he fails to get the response he listens for. On the other hand, the Japanese investigator, bound by the tradition of centuries to certain ways of approach and escape, as in an elaborate game of chess, misses what should be obvious to him.

Further, Japan is changing so fast and in such a direction that a great deal of the old life is becoming a matter of unconcern, if not of actual shame. We can hardly, for example, expect the modern educated Japanese, so punctilious and proud of his departure from the older forms, to write and talk of his own people as Maxim Gorki does of Russian life. Externally

waist. She continued in this high position till the death of Bū Sa'īd when she was killed shortly afterwards. This happened in the year 728.

In the biography of Bū Sa'īd, Ibn Hajar tells us, that this is the correct way in which the king himself wrote his name in correspondence with the Sultāns of Egypt, and not Abū Sa'īd as one might expect. In the biography of Bū Sa'īd no reference is made to the forcible marriage of Baghdād Khātūn, and it is only stated that he was a good Muslim and kept up a correspondence with the Sultan an-Nāsir of Egypt, but the biography of Jūpān shows us Bū Sa'īd in another light, proving that he could be faithless like his ancestors.

The strange name of the lady " Baghdād Khātūn " requires perhaps some explanation, because we have also another relation of her named " Dimashq Khātūn. " It was the custom of the Mongols to name their sons or daughters after towns they intended to conquer or had done so. The nomenclature of the Mongols requires close attention of the student of history, as serious errors are frequently made. In Persian histories figures generally the name of the Sultān Khudābandah (Servant of God), but the older Arabic chronicles give the name as a rule correctly خربندا Khurbandā, which in ancient Mongol means " *the third* " and has no connection with the word " Khudā " (God).

F. KRENKOW

wealth by every conceivable means. Men, women, youths and babes were slaughtered and hardly any of the inhabitants escaped, except such as had fled into the country. Exempt were the Christians, because for their safety special officials were appointed who guarded their houses, and a large number of Muslims took refuge with them and in this manner were spared from the massacre.

There were in Baghdād a large number of merchants who traded with Khurāsān and other parts of the Mongol dominion and had become attached to the Mongol generals; these had received special Firmāns. When Baghdād was besieged they went out and brought with them guards who protected their houses. A large number of citizens saved their lives through being their friends and taking asylum in their houses. The same was the case with the house of the Wazīr Mu'ayyid ad-Dīn ibn al-'Alqamī, who saved a large number in his house; likewise the house of the Sāhīb ad-Dīwān Ibn ad-Dāmīghānī and the house of the Sāhib al-Bāb (Gate-keeper) Ibn ad-Dawāmī, these were also spared. As for other places no one escaped unless he hid in wells or water-pipes (ﺁﺑﺎ). The greater part of the city was burned down, as also the Jāmi' of the Caliph and the buildings round it. Desolation was over the whole city, and in the market-squares and streets the dead lay like rubbish-heaps, the rain poured down upon the dead, horses trampled over them and they were mangled out of shape; it was an awful memory to those who witnessed it.

After this a general pardon was proclaimed and such as had escaped came out of their hiding-places, but their faces were haggard and they were like demented on account of the horrors which they had witnessed, so terrible that no tongue can tell. They were like dead men coming out of the graves on the day of resurrection, through fear, hunger and cold.

BIOGRAPHY OF BAGHDAD KHATUN

(*From the Durar al-Kaminah of Ibn Hajar.*)

Baghdād daughter of al-Nūīn Jūpān, wife of Bū Sa'īd. She was first the wife of Shaikh Hasan, but Bū Sa'īd was in love with her and her father was aware of it, but he prevented her from entering the Urdū (Mongol for Royal camp or court). When Jūpān fled (to Khurasan), his brother was killed and another brother escaped to Egypt, Bū Sa'īd took her forcibly from her husband and she got into high favour with him. It is said that in those lands there was no handsomer woman. Her word was command in all the dominions and she used to ride out accompanied by a suite of ladies, having a sword girded round her

as he naively states, his Mongol masters would have punished him with death, though his treachery worked in their favour.

As an argument that the Mongol rulers did not improve as time went on, I give a short translation of the life of a Mongol Princess translated from the Durar al-Kāminah of Ibn Hajar al-'Asqalānī. Ibn Hajar though not a contemporary had at his disposal excellent sources and, living far away, was in no danger of his life for writing the truth.

A CHAPTER FROM THE HISTORY OF IBN AL-FUTI

(*Lughat al-'Arab, Vol. 7, pp.* 404-406.)

Year 656 (1258). Then[1] some Amirs were appointed and he (Hulāgū) entered Baghdad accompanied by numerous attendants, among them was the Ustād ad-Dār Ibn al-Jawzī and they went to the uncles of the Caliph and his relations who were in the Dār as-Sakhr and the Dār ash-Shajarah ; all were called out one after another with their children and women-folk and taken to the cemetery of al-Khallāl, which was opposite the watch-tower, and killed. So they were slaughtered one and all. Then they killed Mujāhid ad-Dīn Aibak, the Dawīdār, and the Amīr of the Hājj Falak ad-Dīn Muhamamd ibn 'Alā' ad-Dīn at-Tabarsī, the chief Dawīdār, and Shihāb ad-Dīn Sulaimān Shāh ibn Burjum, Falak ad-Dīn Muhammad ibn Qairān az-Zāhirī, Qutb ad-Dīn Sanjar al-Bakalkī (he was Mongol agent at Baghdad and had several times made the pilgrimage with the people), 'Izz ad-Dīn Abqarā, who was also a Mongol agent, Muhyī-d-Dīn Ibn al-Jawzī his son Jamāl ad-Dīn 'Abd ar-Rahmān, his brothers Sharaf ad-Dīn 'Abd Allāh and Tāj ad-Dīn 'Abd al-Karīm, the Shaikh ash-Shuyūkh Sadr ad-Dīn 'Ali ibn an-Nayyār, the latter's nephew Sharaf ad-Dīn 'Abd Allāh, Bahā ad-Dīn Da'ūd ibn al Mukhtār, the Naqīb at-Tāhir Shams ad-Dīn 'Ali ibn al-Mukhtār, Sharaf ad-Dīn Muhammad ibn Tā'us and Taqiy ad-Dīn 'Abd ar-Rahman ibn at-Tabbāl, the steward of the Caliph.

The heads of the Dawīdar and his son, and that of Sulaiman Shāh were ordered to be taken to al-Mawsil, and they were taken thither and hung up outside the gates of the city.

On Monday the 5th of Safar command was given for a general slaughter among the people of Baghdād and there was no ceasing for forty days in murdering, plundering, torturing people with all manners of torture and the extortion of their

(1) After the murder of the Caliph.

The Mongol Conquest of Baghdad

IN the first number of " Islamic Culture " is an article on the Spirit of Asia in which the Mongol conquerors in my opinion are placed in an entirely wrong light. The fearful horrors of the conquest of Khurāsān are told in vivid colours, but alas with much unnecessary verbosity, by later Persian historians, who mostly were in the employ of the descendants of the original destroyers of civilization, and in consequence could not give a true picture, even if they had lived near enough to the times to do so. It has been, with very few laudable exceptions, the habit of Persian writers on history to pay more attention to style than to correctness of their statements, and we can congratulate ourselves when we possess the drier, but more matter-of-fact accounts by Arab writers.

The family of Ibn al-Jawzī in Baghdad produced several noteworthy historians, and it was known that a scion of this family Ibn al-Fūtī had composed a large history, of which he never found the time to make a final copy. Dhahabī in the Tadkirat al-Huffāz (ed. Hyderabad Vol. IV. 285) mentions this history, but it had been tracelessly lost. Fortunately Mr. Ya'qūb Na'ūm Sarkīs has been fortunate enough to discover a copy of this important work and has published extracts from it in the journal " Lughat al-Arab " appearing in Baghdādand it is from one of these extracts that I have translated, as literally as possible, the account of the sack of Baghdād which follows. The narrative speaks for itself. The unexplained part still remains, why the Christians were spared, and why the conquerors were equally severe upon the Shi'ah and Sunnī sections of the populace, considering that the chief adviser of Hulāgū, Nasīr ad-Dīn Tūsī, might have been expected to have used his influence in favour of the former. Dhahabī in his general history and elsewhere accuses the Wazīr al-'Alqamī as being primarily responsible for the fate of the Caliph, his family and the massacre of the populace. Against this we have the express statement of Ibn Tiqtiqa, who was acquainted with a son of the Wazīr, that his innocence is proved by the fact that he was allowed to live peacefully after the massacre, because,

any hesitation subscribed the amount needed for its establishment. It is with a feeling of pleasure that we acknowledge the spirit of co-operation that has been evinced by our fellow students in support of the Magazine. We shall strive our best to work out the policy once laid down :

" It professes to be an organ of the students. We hope that it will create and diffuse among them a literary taste. They will contribute to it and thus have a chance of developing their writing capacity."

The eagerness of students to contribute to the magazine and the number of articles published in the last issues predict with certainty a bright future for our journal.

In this connection we cannot forget our indebtedness to the President and Members of the Advisory Committe for the timely help they have rendered to us in surmounting all the initial difficulties, without which it would have been impossible for us to maintain the proper standard of our work.

Now when we are entering upon the second year of our life, we are confident that the help so generously given will be continued.

The following students have been selected for the Editorial staff for the current Magazine year.

English Section.

'Abdu'l-Jalil	*Editor.*
'Itrat Husain Zubairi ..	*Sub-Editor.*

Urdu Section.

Sayyid Mu'inuddin Qurayshi ..	*Editors.*
Sayyid Akbar Wafaqani ..	
M. Jalalud-Din Ashk ..	*Sub-Editor.*

Editorial.

NAWAB Dr. Sir Hydar Nawaz Jung Bahadur is one of those illustrious sons of India who have devoted themselves to the welfare of their motherland. His life is a long sustained piece of service and self-sacrifice.

His incessant labour in the cause of Muslim education in India, before coming to our state needs no mention. It has already passed into history. But his lifelong ideals of national education were to be realized in the shape of the Osmania University which is a landmark in the educational history of India.

It was his sincerity, devotion and attachment to the cause which piloted the university through its critical period of existence, when it was regarded as an experiment, and through which it has emerged triumphant and successful.

His exemplary discharge of the duties of his high office as the Finance Member of His Exalted Highness the Nizam's Government has demonstrated to all that, given opportunities, Indian genius can rise equal to the responsibilities of the highest office in the state. His illustrious public life of a quarter of a century will be a source of inspiration to the younger generation.

It has given satisfaction to all concerned that the British Government has recognized the services of the great educationist and astute statesman by conferring on him the honour of knighthood. We offer our sincere and hearty congratulations to the Nawab Sahib on this memorable occasion.

* * *

The Osmania College Magazine came into being in February 1927. Since then the reviews that have appeared in the Journal of the Royal Asiatic Society, Islamic Culture, Luzac's Oriental List, Moslem Chronicle and the Indian Daily Mail, and messages of welcome received from literary men of our country are very encouraging and indicative of high hopes in future.

This is a journal of our University students and an attempt has been made until now to keep the cost of this magazine within the resources of our fellow students who have without

CONTENTS

VOLUME II, NO. 1.

		PAGE
1.	EDITORIAL	1
2.	THE MONGOL CONQUEST OF BAGHDAD .. .. F. KRENKOW	3
3.	MARY : A TALE OF JAPAN .. .. .. PROF. E. E. SPEIGHT, B.A., (LONDON).	7
4.	HAFIZ : EDITOR.	21
5.	THE SENTIMENTAL PROJECT .. .. .. ITRAT HUSAIN ZUBAIRI (IV YEAR)	30
6.	ALFRED MARSHALL ; HIS CONTRIBUTION TO ECONOMIC THOUGHT ZAHIRU'D-DIN AHMAD, M. A., H. C. S., (OLD BOY)	34
7.	ANNABEL LEE .. .. (MAHJUR)	40
8.	COMPARATIVE CRIMINOLOGY WITH REFERENCE TO ENGLISH AND MUSLIM LAW .. .. A. F. M. ABDU'L-WAHID, M. A., LL. B. (OSMANIA) F. R. S. A., M. R. A. S., (OLD BOY)	44
9.	LIFE ON MARS .. .. SAYYID AKBAR 'ALI (IV YEAR)	52
10.	TAGORE, STUDIED THROUGH GITANJALI .. .. S. M. KIRMANI (NIZAM COLLEGE)	56
11.	SHAKESPEARE'S PLAYS AND VIEWS OF LIFE .. .. G. A. CHANDAVARKAR, M. A., M. R. A. S.	60
12.	WHY TO READ ? HOW TO READ ? AND WHAT TO READ .. H. GHULAM MUHAMMAD, B.A., (OSMANIA)	63





مجلۂ عثمانیہ

جلد دوم ۔ شمارۂ دوم آبان سنہ ۱۳۱۲ف

مجلس نگرانی

محمد عبدالرحمن خاں صدر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

اے آر سی ایس بی ایس سی (لندن) فیلو آف دی رائل اسٹرونامکل سوسائٹی (لندن)

محمد نظام الدین مولوی فاضل پی ایچ ڈی (کلنب) ای ای ایسیٹ بی اے (لندن)

پروفیسر فارسی و رفیق جامعۂ عثمانیہ — پروفیسر انگریزی کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

مدیر شعبۂ اردو

سید محمد اکبر وفا فانی — محمد جلال الدین اشک — خواجہ محمد معین الدین نائب مدیر

مدیر شعبۂ انگریزی

محمد عبدالجلیل — عترت حسین زیدی نائب مدیر

منظم اعزازی مجلۂ عثمانیہ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اطلاع

۱۔ طلبۂ کلیۂ جامعہ عثمانیہ کا یہ سہ ماہی علمی رسالہ حسب ذیل مہینوں کے آخری ہفتوں میں شایع ہوا کریگا
امرداد (جون) آبان (ستمبر) بہمن (دسمبر) اردی بہشت (مارچ)
سال تعلیمی اور مجلہ کا سال ایک ہوگا ۔

۲۔ رسالہ انگریزی اور اردو دو حصوں پر مشتمل ہوگا ۔ حصۂ اردو کے لئے تقریباً ۸ جزو اور حصۂ انگریزی کے لئے تقریباً ۴ جزو مختص کئے جائینگے ۔ رسالہ کا سالانہ حجم کم از کم ۸۰۰ صفحات ہوگا ۔

۳۔ مجلس نگرانی اشاعت کے متعلق ردّ و بدل کی مجاز ہوگی ۔
مضامین کا انتخاب مجلس ادارت کریگی ۔

۴۔ تمام مضامین منتظم نشریات متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں ۔

۵۔ خریداری اور دیگر امور کیلئے اعزازی منتظم رسالہ سے دفتر کے پتہ پر خط و کتابت کیجائے ۔

۶۔ چندہ کی تمام رقمیں اعزازی خازن مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں ۔

چندہ

۱	سرکار آصفیہ و برطانیہ سے ۔ سالانہ پیشگی	۵	طلبۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ سے ۔ سالانہ پیشگی
۲	ارباب جامعہ، اصحاب اقتدار اور ادارو سے	۶	ممالک بیرون ہند سے ۵ شلنگ
۳	عام خریداروں سے ۔	۷	بلاد یورپ کے طلبۂ قدیم سے ۱۰ شلنگ
۴	طلبۂ قدیم و اہلیہ انجمنوں اور مطابع خانوں سے	۸	فی رسالہ عا

بیرون ممالک سرکار عالی کیلئے چندہ سکہ کلدار ہوگا ۔ خرچ ڈاک و جبڑی اسکے علاوہ ہوگا ۔ برٹش انڈیا کے لئے اخراجات معہ رجسٹری جبہ کلدار ہوں گے ۔ ممالک محروسہ کے لئے ۱۲ ۔ چندہ سالانہ پیشگی لیا جائے گا ۔

مجلۂ عثمانیہ

فہرستِ مضامین جلد دوم شمارہ دوم

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	صوتیات	مولوی سید سجاد صاحب ایم۔اے پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ	۱
۲	نہضت غمگسار (نظم)	مولوی شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ ملیح آبادی ناظر ادبی دارالترجمہ کارپرداز	۱۰
۳	ذاتِ باری تصوری نقطۂ نظر سے	جناب میر حسن الدین صاحب بی اے، ال ال۔بی (عثمانیہ) وکیل ہائیکورٹ	۱۲
۴	"میں اور مزار" (نظم)	جناب مرزا نظام شاہ صاحب لبیبؔ تیموری دہلوی	۳۰
۵	مدائن صالح	مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی	۳۲
۶	غزل	عالیجناب علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر	۴۷
۷	〃	جناب عبدالقیوم صاحب باقیؔ متعلم ایم۔اے (فائنل) کلیہ جامعہ عثمانیہ	۴۸
۸	پرواز	جناب ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی متعلم ایم۔ایس۔سی 〃	۴۹
۹	موجِ مضطر (نظم)	محمد جلال الدین صاحب اشکؔ مدیر	۶۳
۱۰	ایکا نتھ	جناب شیخ چاند صاحب متعلم ال ال۔بی کلیہ جامعہ عثمانیہ	۶۴
۱۱	ریل گاڑی (نظم)	جناب ابوالکرم بدرالدین صاحب بلدرؔ متعلم ایم۔بی۔بی۔ایس 〃	۹۱

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۲	میر و سودا کے قصیدوں پر ایک نظر	جناب سید محمد صاحب قادری ایم۔اے (عثمانیہ)	۹۳
۱۳	ترغیب عمل (نظم)	جناب نبی الحسن صاحب شمیم متعلم بی۔اے کلیہ جامعہ عثمانیہ	۱۰۷
۱۴	مسئلہ بیکاری اور ہندوستان	جناب ظہیر الدین احمد صاحب ایم۔اے (علیگ) ایچ۔سی۔ایس	۱۰۸
۱۵	ساغر جہانگیر (نظم)	سید محمد اکبر وفا قانی۔ مدیر	۱۲۲
۱۶	حاسد۔ (افسانہ)	مولوی سید وزیر حسن صاحب	۱۲۴
۱۷	سالانہ رپورٹ کارگزاری مجلہ عثمانیہ	جناب سید معین الدین صاحب فرنسپی ایم۔اے (عثمانیہ) سابق مدیر مجلہ	۱۳۱
۱۸	کلیہ کی خبریں	محمد جلال الدین اشک	۱۳۷
۱۹	نقد و تبصرہ	سید محمد اکبر وفا قانی و جناب سید احمد علی صاحب بی۔اے، ال ال بی (عثمانیہ)	۱۴۷

لکھ رہا ہوں کیا نہیں ہوتی مجھے اسکی خبر — انگلیوں پر اک جلالی شان آتی ہے نظر

ہاتھ میں کرتا ہے جنبش یوں قلم بے اختیار — اک طرب آمیز دہشت دل کے چھو لیتی ہے تار

یوں فضا میں نقش ابھر آتے ہیں تھرّاتے ہوئے — جس طرح ساحر کے لب افسوں کو دہراتے ہوئے

کس قدر اسرار سے لبریز ہیں جلوے ترے — اے تحیّر خیز ناخن عقدہ تخئیل کے

شب کو تیری دید یہ انگیز قربت کا یقین — کھولتا ہے دل میں تفضّل آسماں بابِ زمیں

تو پری ہو یا فرشتہ روح ہو یا واہمہ — آ خدارا میرے آگے شکل انسانی میں آ

تا کہ میں وہ شہد بار الفاظ وہ شیریں فضا — پنکھڑی ہے وہ تبسم وہ صدا ہیں دلکشا

روح پرور حوصلے وہ نرم و نازک زمزمے — جو بطور داد پائے ہیں مرے اشعار نے

سر عقیدت سے جھکا کر اے تہنیتہ عمکسار
ڈال دوں گردن میں تیری گوندھ کر ان کی ہار

ذاتِ باری تصوّری نقطۂ نظر سے

جناب میر حسن الدین صاحب بی۔ اے (آل آل۔ بی (عثمانیہ)

یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے کہ فلسفہ خدا کا کیا تخیل پیش کرتا ہے۔ اس کا خدا شخصی (Personal) ہے یا غیر شخصی۔ فلسفہ کے مختلف مذاہب ہیں اور ہر مذہب کا نقطۂ نظر جدا ہے۔ ہم ذیل میں یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ تصوریت کا کیا تصور پیش کرتی ہے۔ اس کیلئے ناگزیر ہے کہ ہم پہلے نفس اور مادہ پر تصوری نقطۂ نظر سے غور کریں۔ اس کے بعد یہ دیکھیں کہ تصوریت شخصی خدا کے تخیل کی طرف ہماری کسطرح رہنمائی کرتی ہے۔

نفس اور مادہ ہر شخص کے ذہن میں جو عمدہ کائنات پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے یہ سوال بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے کہ کیا مادیت میں تمام دشواریوں کا حل موجود نہیں ہے؟ ہماری بحث اس بات سے شروع ہو تو بہتر ہے کہ آیا مادیت امکاناً صحیح ہو سکتی ہے۔ یہ جان لینا کہ کم از کم مادیت صحیح نہیں ہے گویا اشیاء کی انتہائی ماہیت کے متعلق کچھ اہم باتیں معلوم کر لینا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد مادیت کی دقیق النظری سے تجدید کرنا نہیں ہے۔ صحیح معنوں میں اس کا یہی مفہوم ہونا چاہیے کہ سوائے مادے کے کوئی شئے حقیقتاً موجود نہیں ہے۔ ہمارے احساسات، افکار، اور جذبات کا کسی نہ کسی مفہوم میں موجود ہونا

لہ اس مضمون کا مواد ڈاکٹر راشڈال کی کتاب "فلسفہ اور مذہب" سے ماخوذ ہے۔

فہم عامہ کے نزدیک اس قدر بدیہی ہے کہ اس سے مادیت کی حمایت دشوار ہو جاتی ہے اور یہ ایسا مسلک ہے جو اپنے دعوے میں خود اپنی تردید پوشیدہ رکھتا ہے۔ عملی اغراض کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مادیت کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ ہر قسم کے وجود کی انتہائی بنیاد مادہ ہے اور فکر، حس، وجدان وغیرہ مادی اعمال کے معلولات، یا ضمنی پیداوار، یا اسی کے متلازم (Concomitant) کیفیات ہیں۔

اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ صرف مادہ ہی ایسی چیز ہے جو موجود ہے یا جو کچھ موجود ہے اس کا انتہائی مبداء و منشا مادہ ہی ہے تو ہم کو یہ بھی بتلانا چاہئے کہ خود مادہ کیا ہے۔ ایک ایسے ذہن کے لئے جو غور و فکر کا عادی نہیں مادہ ایک ایسی چیز نظر آتا ہے جس کے وجود کے متعلق اوسکو قطعی یقین ہوتا ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر مادہ پر ایسے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے جس میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت ہو تو فکر، حس اور ارادہ محض فریب و التباس ثابت ہوں گے۔ برٹرینڈ رسل نے اپنے فلسفیانہ مضامین میں اس نقطۂ نظر کا نہایت پر لطف طریقہ سے مضحکہ اڑایا ہے۔ اس لحاظ سے مادہ ایک ناقابل انکار حقیقت، ایک قابل فہم و قابل احترام ہستی نظر آتا ہے یہ کہا جاتا ہے کہ اگر فکر، حس، وارادہ، الم و مسرت، امید و آرزو اور خیر و شر سے قطعی طور پر چھٹکارا نہیں ملتا تو یہ کم از کم نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں اور کائنات کے بنیادی کاروبار میں ان کو مداخلت کرنے نہ دینا چاہئے۔

اس نقطۂ نظر سے صرف مادہ ہی ایک ایسی حقیقت فرض کیجاتی ہے جس سے ہم براہ راست تعلق رکھتے ہیں جس کو ہم اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں دیکھتے اور چھوتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا ایک حیرت انگیز استبعاد (Paradox) ہوگا کہ مادیین کے مفہوم میں اب تک کسی شخص نے مادہ کو دیکھا ہے نہ چھوا۔ اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اوس تجربہ میں جس کو ایک عامی آدمی دیکھنے یا چھونے سے تعبیر کرتا ہے ہمیشہ کوئی دوسری چیز ضرور موجود ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ وہ شخص "میں نے مادہ کو چھوا ہے" کہنے میں حق بہ جانب تھا تو پھر بھی مادہ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ "میں" کا وجود ناگزیر ہے۔ وہ ہمیشہ اور ناگزیر طور پر جو کچھ جانتا ہے وہ مادہ + نفس" ہے کوئی شخص اس "میں یا انا" سے گریز نہیں کرسکتا، کوئی شخص اس "میں یا انا" کو نظر انداز کرکے،

جو مادہ کو جاننے والی ہستی ہے، مادہ کو دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے۔ وہ بلاشبہ یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ مادہ "اس" میں یا انا" سے علیحدہ موجود ہے۔ وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ اس کے دیکھنے یا چھونے سے قطع نظر مادہ میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو اوس کے شعور کے آگے پیش ہوتی ہیں۔ لیکن یہ محض استنتاج ہوگا نہ کہ بدیہی علم اور اس استنتاج کی صحت و معقولیت بھی بحث طلب ہوگی۔ مادہ کو ان صفات سے متصف کرنا کس حد تک جائز و معقول ہے؟ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صفات جن سے مادہ تشکیل پاتا ہے، جس حد تک ہم جانتے ہیں، کیا ایسی صفات ہیں جو مادہ کی ذات میں معقول اور قابل فہم طریقہ سے فرض کیجا سکتی ہیں یعنی ایسے مادہ میں جو ہمارے شعوری تجربہ (Conscious experience) سے علیحدہ اور مستقل وجود رکھتا ہے۔

جس حد تک ہم کو مادہ کا علم ہے اس میں ہم کو دو اجزاء نظر آتے ہیں۔ ایک تو چند صفات ہیں جن کا ہم کو احساسات کے توسط سے علم ہوتا ہے اور چند علائق (Relations) ہیں۔ ذرا سا غور کرنے پر یہ واضح ہو جائیگا کہ یہ کہنا مطلقاً بے معنے ہے کہ مادہ میں وہ صفات موجود ہیں جن کو ہم احساسات کے توسط سے جانتے ہیں۔ اور یہ صفات مادہ میں حسبۂ موجود رہینگی خواہ ہم ان کو محسوس کریں یا نہ کریں۔ ایسی دنیا میں جہاں آنکھیں ہوں نہ اذہان اس قول کے کیا معنے ہیں کہ اشیاء سرخ یا نیلی ہیں؟ اگر ہمارے کان ہی نہ ہوں تو ہمارے لئے کوئی ایسی شئے موجود ہی نہ ہوگی جس کو ہم آواز سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں لاک کی تحلیل ختم ہو جاتی ہے۔ اوس نے یہ تسلیم کر لیا کہ اشیاء کی صفات ثانویہ جیسے الوان، اصوات، ذائقہ وغیرہ درحقیقت خود اشیاء میں نہیں بلکہ نفس مدرک میں موجود ہیں۔ اشیاء میں جو کچھ موجود ہے وہ صرف ایک ایسی قوت ہے جو ہم میں ان احساسات کو پیدا کرتی ہے اور اشیاء کی یہ صفات ہو بہو وہی نہیں ہیں جو احساسات ہیں بہ الفاظ دیگر لاک نے یہ تسلیم کر لیا کہ احساسات کو پیدا کرنے کی قوت خود احساسات سے مختلف اور جداگانہ ہے۔ لیکن اشیاء کی صفات اولیہ جیسے صلابت (Solidity) شکل، حجم وغیرہ کے متعلق اوسکا خیال ہے کہ یہ صفات ہو بہو وہی ہیں جس طرح کہ نفس ان کو محسوس کرتا ہے۔ اگر کائنات

تمام اذہان غائب ہو جائیں تو سرخ و سبز اور سرد و گرم کا نام تک نہ رہیگا لیکن پھر بھی اشیاء صغیر و کبیر مدور و مربع جامد اور سیال ضرور رہینگی ۔ پھر بھی یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جس طرح صفات ثانویہ کے لئے نفس کا وجود ضروری تھا اس طرح صفات اولیہ کے لئے بھی نفس کا موجود ہونا لازمی ہے۔ مگر یہاں صورت حال زیادہ واضح نہیں ۔ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ صفات ثانویہ کی بہ نسبت صفات اولیہ بیّن اور واضح طور پر ایک ایسی چیز کو شامل ہیں جو محض احساس نہیں ہے یعنے یہ ایسی چیز ہے جو محض حواس کو نہیں بلکہ فکر کو مستلزم ہے۔ مثلاً صلابت سے ہمارا کیا مطلب ہے؟ ۔ جزواً ہمارا یہ مفہوم ہے کہ کسی شئے کو چھونے سے ہم کو لمسی اور عضلاتی احساسات حاصل ہوتے ہیں اور ہم میں ایسے احساسات بھی پیدا ہوتے ہیں جن کو ہم حرکت اور مزاحمت سے تعبیر کرتے ہیں ۔ صلابت کے اس مفہوم سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ زیر بحث صفت کو ہمارے ذہنی حیات (Fureeling) سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ رنگ اور آواز جیسی صفات ثانویہ کو ہے ۔ لیکن صلابت کے تصور میں اسکے سوا کچھ اور شئے بھی ضرور داخل ہے ۔ ہم اشیاء خارجی کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ وہ موجود فی المکان ہیں یعنے فضا کو گھیرتی ہیں ۔ مکانیت (Spaciality) کو ہماری ہی حیات میں تحلیل کر دینا کافی نہیں ۔ ہم کسی شئے سے جو احساسات لمس حاصل کرتے ہیں وہ ہم میں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے ہیں ۔ اگر ان احساسات میں ابتداہی سے نسبت مکانی نہ ہو تو خواہ ہم کتنا ہی غور و فکر کریں ان احساسات سے جو ہم میں یکے بعد دیگرے ترتیب زمانی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں ہم مکان کا کوئی تصور اخذ ہی نہیں کر سکتے ۔ مکانیت کی ماہیت ہی یہ ہے کہ اشیاء ایک دوسرے کے دوش بدوش اور ایک دوسرے کے باہر موجود ہوتی ہیں ۔ لیکن اس طرح ایک دوسرے کے دوش بدوش یا منفصل ہونا محض ایک طریقہ ہے جس سے اشیاء اپنے آپ کو نفس کے سامنے پیش کرتی ہیں ۔ مکان کی تشکیل علائق سے ہوتی ہے لیکن اگر ایسے نفس کو جو علاقہ یا نسبت پیدا کرتا ہے نظر انداز کر دیا جائے تو پھر علائق کا مفہوم ہی کیا رہ جاتا ہے ۔ اگر مکانیت ایسی صفت ہے جو ذات شئی میں داخل ہے تو ہر صورت میں اوس کا موجود ہونا ضروری ہوگا ۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ اس مکان کی چھت تو موجود

مگر فیاض ہی نہ ہو۔ تاہم ہر شخص اس خیال کو مہمل کہیگا۔ مکان کو شاغل ہونے کی یہ صفت جو مادہ کے تصور کا اساسی عنصر ہے درحقیقت اس علاقہ یا نسبت پر مبنی ہے جو مادہ کے مختلف اجزاء میں پائی جاتی ہے۔ کیا بغیر نفس کے علاقہ یا نسبت باقی رہ سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ ایک مہمل خیال ہے۔ نسبت یا علاقہ اوسوقت کچھ مفہوم رکھتا ہے جبکہ اس پر نفس کے حوالے سے غور کیا جائے۔ کیونکہ نفس ہی میں یہ قابلیت ہے کہ نسبت کے دونوں حدود کو ملائے۔ نقطہ الف اور نقطہ ب کی نسبت نہ خود الف میں ہے اور نہ ب میں بلکہ ان دونوں کے مابین۔ مابینیت (Betweenness) مکان کے کسی ایک یا کئی منفصل نقاط یا اشیاء موجود فی المکان میں موجود نہیں رہ سکتی بلکہ غیر ذی ہستی میں موجود رہ سکتی ہے جو ان نقاط کو متحد و متصل کر سکتی ہے۔ جہانتک ہم سمجھ سکتے ہیں بجز نفس کے کوئی اور ہستی اس کام کو انجام نہیں دے سکتی۔ یعنے نفس سے علیحدہ کوئی علاقہ یا نسبت باقی نہیں رہ سکتی اور ظاہر ہے کہ علاقہ یا نسبت سے علیحدہ مکان بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور نہ مکان سے علیحدہ مادہ ہی قائم رہ سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ نفس سے علیحدہ مادہ موجود نہیں رہ سکتا۔

سب سے پہلا مفکر جس نے یہ عظیم الشان نتیجہ اخذ کیا وہ بارکلے تھا قرون متوسطہ کے علمائے مدرسیت میں ایک گمنام شخص (Nicholas of Antecourt) گزرا ہے جسکو مورخین فلسفہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس نے بھی بارکلے کی پیش بینی کی تھی۔ بعض مشہور علمائے مدرسیت بھی اس خیال کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اسکے سوا افلاطون اور حتیٰ کہ ارسطو کی تعلیمات اور انکی شروح میں ایسے عناصر موجود ہیں جو اس خیال کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن حقیقی تصوریت جس میں مادہ کے مستقل و آزاد وجود کا ابطال کیا گیا ہے ہمیشہ بارکلے کے نام سے منسوب رہیگی۔

لے راشڈل نے اس گمنام مفکر پر اپنے خطبہ صدارت میں جو مجلس ارسطاطیس (Aristotellian society) میں پڑھا گیا تھا تفصیلی بحث کی ہے۔

ہم اپنے مفہوم کو زیادہ واضح کرنے کے لئے خود بارکلے کی کتاب مبادی علم انسانی (Principles of human knowledge) سے چند عبارتیں پیش کرتے ہیں جن میں اوسنے مادہ کی صفات اولیہ کی اوسی طرح تحلیل کی ہے جس طرح کہ لاک نے صفات ثانویہ کی کی تھی:۔

"لیکن اگر یہ ممکن بھی ہوتا کہ، اجسام کے تصورات ذہنی کے مقابل میں ٹھوس، متشکل، اور متحرک جواہر جسمی ذہن سے باہر موجود ہوتے تو بھی ہمارے لئے اس حقیقت کا علم کیونکر ممکن تھا؟ کیونکہ یا تو ہم اس کو حواس سے جانتے یا قیاس سے، حواس کا یہ حال ہے کہ ان کے ذریعہ ہم کو صرف اپنے احساسات، تصورات یا اون چیزوں کا علم ہوتا ہے جن کا براہ راست حواس سے ادراک ہوتا ہے۔ انہیں چیزوں کو تم جو کچھ چاہو کہہ لو، مگر حواس سے اس بات کا ہرگز سراغ نہیں چلتا کہ جن چیزوں کا ہم کو ادراک یا احساس ہوتا ہے اُن کے مانند غیر محسوس چیزیں ذہن سے باہر بھی موجود ہیں، یہ وہ حقیقت ہے جس کا خود مادیین کو اعتراف ہے۔ لہٰذا اگر خارجی اشیاء کا ہم کو سرے سے کچھ علم ہو سکتا ہے تو اوسکی صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ قیاساً انہی براہ راست اور اکات ذہنی سے ان تک پہنچیں۔

لیکن گفتگو یہ ہے کہ کونسی دلیل ہم کو اس پر آمادہ کر سکتی ہے کہ محض ان ادراکات ذہنی کی بناء پر ہم خارج از ذہن اجسام کے وجود کا یقین کریں جبکہ خود حامیان مادہ اسکے مدعی نہیں کہ ان موجودات خارجی اور ہمارے تصورات ذہنی کے مابین کوئی لزومی رابطہ ہے اب میں یہ کہتا ہوں کہ اتنا تو سب کو مسلّم ہے کہ ہمارے تمام تصورات ذہنی یونہی بے اس کے کہ ان کے مشابہ خارج میں چیزیں موجود ہوں، پیدا ہو سکتے ہیں، اور خواب، جنون، سرسام وغیرہ نے اس حقیقت کو بالکل ناقابل بحث بنا دیا ہے۔ لہٰذا یہ بالکل صاف ہے کہ تصورات ذہنی کی تخلیق کے لئے اجسام خارجی کا ماننا ضروری نہیں ہے، کیونکہ یہ مسلم ہے کہ وہ کبھی کبھی تو بے اجسام

خارجی کی معیت کے (خواب وغیرہ کی صورت میں) پیدا ہوتے ہی ہیں اور ہمیشہ بھی اسی طرح پیدا ہونا ممکن ہے۔"

(بند ۱۸)

"حاصل یہ کہ اگر خارج میں اجسام کا وجود ہو بھی، تو بھی یہ ناممکن ہے کہ ہم اون کو کبھی جان سکیں۔ اگر فی نفسہ نہ ہوں، تو بھی انہی دلائل کی بنا پر ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، جن کی بنا پر اسوقت کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کیلئے فرض کرو کہ ایک ایسا ذہن ہے، جو بلا اجسام خارجی کی مدد کے اسی قسم کا سلسلۂ احساسات یا تصورات رکھتا ہے، جیسا تم اور یہ تصورات اسی ترتیب و وضاحت کے ساتھ اُس ذہن میں مرتسم ہوتے ہیں جس طرح تمھارے ذہن میں۔ نفس کے اس فرض سے تو کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایسے فرض کردہ ذہن والا آدمی جو اجسام کے وجود کے یقین کے لئے تمام وہ دلائل نہیں رکھتا ہے، جو تم اسی امر کے یقین کے لئے کام میں لا سکتے ہو۔ کیونکہ وہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اسکے تصورات بیرونی اجسام کا عکس ہیں اور انہی کے عمل و تاثر سے پیدا ہوتے ہیں؟ اسمیں مطلق بحث و کلام کی گنجائش نہیں کہ معقول پسند آدمی کیلئے تنہا یہی ایک خیال اس بات کے لئے کافی ہے کہ اجسام کے وجود خارجی کے مضبوط ترین دلائل کو بھی اسکی نظر میں شبہ اور متزلزل کر دے۔"

(بند ۱۹)

کیا تم یہ کہو گے کہ اس صورت میں ہم کو کمرہ سے باہر نکلتے ہی یہ خیال کر لینا چاہئے کہ کمرہ کی میز اور کرسیاں غائب ہو گئیں؟ یہ سچ ہے کہ ہم عام طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میز اور

لے "مبادی علم انسانی" مترجمہ مولانا عبد الباری ندوی پروفیسر فلسفہ جامعۂ عثمانیہ۔

کرسیوں کو کوئی دیکھنے یا چھونے والا نہ بھی ہو تو بھی وہ حسب کمرہ میں موجود رہینگی۔ بارکلے کہتا ہے کہ صرف یہی معنے ہوئے کہ ہم یا کوئی اور شخص کمرہ میں واپس جائے تو وہ ان چیزوں کا ادراک کرے گا۔ اسکے سوا ان کو ایسی چیزیں سمجھنا جن کا ادراک چند شرائط کے تحت ہوسکتا ہے گویا نفس کے وجود پر دلالت کرنا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اشیاء نفس کے باہر وجود ہیں یہ خیال کرنا پڑیگا کہ اشیاء بے تصور یا خیال کئے موجود ہیں۔ اور یہ ایسا کام ہے جس کو اب تک کوئی شخص کامیابی سے انجام نہ دے سکا۔ اس اعتراض کا خود بارکلے نے یہ جواب دیا ہے:۔

"تم کہو گے کہ اس سے زیادہ میرے لئے کوئی چیز آسان ہے کہ مثلاً یہ تصور کروں کہ باغ میں درخت اور کمرہ میں کتابیں موجود ہیں گو ان کے احساس اور ادراک کے لئے وہاں قریب کوئی آدمی نہ ہو۔ میرا جواب یہ ہے کہ بے شک تم ایسا تصور کرسکتے ہو، اسمیں کوئی دشواری نہیں لیکن میں یہ التجا دریافت کرتا ہوں کہ اسکی حقیقت اس سے زائد کیا ہے کہ تم خود اپنے ذہن میں بعض تصورات قائم کرتے ہو جن کو کتابیں اور درخت کہتے ہو، اور ساتھ ہی تم اس تصور کو حذف کردیتے ہو، یا نہیں قائم کرتے کہ کوئی شخص انکا احساس کر رہا ہے؟ لیکن کیا تم خود اس اثناء میں انکا ادراک اور خیال نہیں کرتے رہے ہو۔ اور ساتھ ہی تم اس تصور کو حذف کردیتے ہو۔ اس سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ تم اپنے ذہن میں تخیل اور تصورات سازی کی قوت رکھتے ہو لیکن اس سے یہ نہیں نکلتا کہ تم اس امر کو ممکن تصور کرتے ہو کہ جو کچھ تم خیال کرتے ہو وہ ذہن سے باہر موجود ہوسکتا ہے۔ اس مطلوب کے حصول کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ تم یہ تصور کرو کہ وہ بے تصور یا خیال کئے موجود ہیں، جو ایک بین تناقض ہے۔ جب ہم اجسام کے وجود خارجی کے تصور پر اپنی انتہائی طاقت صرف کر رہے ہوتے ہیں، تو اس تمام وقت میں ہم صرف اپنے ہی تصورات کو سوچتے ہوتے ہیں لیکن چونکہ ذہن کی توجہ خود اپنی جانب نہیں رہتی اسلئے وہ

اس دھوکہ میں پڑجاتا ہے کہ اس کو موجود فی الخارج چیزوں کا تصور ہو رہا ہے، گو دراصل اس تمام وقت میں وہ تصورات خود اسی کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ اس دعوے کی سچائی اور حقیقت ذرا سے تامل سے ہر شخص پر آئینہ ہو سکتی ہے اور معلوم ہو سکتا ہے کہ جوہر جسمی کے وجود کے خلاف مزید دلائل کی بھرمار غیر ضروری ہے[1]۔"

(بند ۲۳)

اسمیں شک نہیں کہ بارکلے نے احساسات اور ذہنی علائق کے امتیاز کی اہمیت کو صحیح طور پر محسوس نہیں کیا۔ اوپر کی عبارت میں بارکلے تصور مکان کی تحلیل محض ذہنی حسیات میں کرتا ہے۔ اس غلطی کی اصلاح کانٹ اور اسکے بعد کے تصوریین (Idealists) نے کردی ہے بے شک ہم مکان یا جوہر کے تصور کی تحلیل محض حسیات میں نہیں کر سکتے۔ نہ صرف احساسات بلکہ علائق بھی نفس کے وجود کو مستلزم ہیں۔ اشیا محض احساسات کا مجموعہ نہیں۔ ہم ان اشیاء کو ایسے جواہر (substances) سمجھتے ہیں جو اعراض (Attributes) کے حامل ہیں۔ بارکلے کی طرح ان کو مجموعۂ احساسات کہنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ مجموعہ بھی ذات شئی میں اتنا ہی اہم عنصر ہے جتنا کہ خود احساسات ہیں۔ یہ مجموعہ اون چیزوں کو بھی شامل ہوگا جن کو کانٹ جوہر، کیفیت اور کمیت (Quantity) کے عقلی مقولات (Intellectual Categories) سے تعبیر کرتا ہے ہم جن اشیاء پر غور و فکر کرتے ہیں وہ ہمارے لئے معروض فکر (object of thought) ہیں۔ معروض کی اصطلاح سے ہم کوئی قابل فہم مفہوم نہیں نکال سکتے تاوقتیکہ وہ کسی موضوع (subject) کو مستلزم نہ ہو۔

اگر مادہ میں کوئی ایسی چیز ہے جو نفس کے وجود کو مستلزم ہے یا بغیر نفس کے خود مادہ کا تصور ہی ناقابل فہم ہے تو اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ مادہ کبھی بھی نفس کے باہر موجود نہیں رہا ہے۔

---

[1] "مبادی علم انسانی" مترجمہ مولانا عبدالباری ندوی پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ۔

یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ پھر اون اشیاء کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں جن کو نہ تو انسانی آنکھوں نے کبھی دیکھا ہے اور نہ ان کے بارے میں کبھی غور و تامل کیا گیا ہے؟ جب کوئی نیا سیارہ کسی ماہر فلکیات کی دوربین کے سامنے سے گزرتا ہے تو کیا ہم یہ فرض کرلیں کہ وہ پہلی مرتبہ معرض وجود میں آیا ہے اور سائنس یہ نتیجہ اخذ کرنے میں غلطی پر ہے کہ یہ سیارہ نہ صرف اس ماہر فلکیات کے مشاہدہ سے پہلے بلکہ اوس زمانہ سے موجود ہے جبکہ نہ تو ماہرین فلکیات کا وجود تھا اور نہ خود انسان و حیوان کا؟ کیا دنیائے ارضیات صرف اوسی وقت وجود میں آئی جبکہ کسی اٹھارویں صدی کے ماہر ارضیات نے پہلی مرتبہ یہ خیال کیا کہ دنیا کی عمر چھے ہزار سال سے زیادہ ہے؟ کیا تاریخ یا ضیبہ کے وہ تمام ادوار جبکہ زمین اور آفتاب محض ضیابتہ النجوم (Nebulae) کی حالت میں تھے محض ایک تخیل ہے یا ضیابتہ النجوم کا یہ مجموعہ اوسوقت وجود میں آیا جبکہ کانٹ اور لاپلیس نے پہلی مرتبہ یہ خیال کیا کہ اس کا وجود ہے؟ اس قیاس میں بیّن تناقض پایا جاتا ہے۔ اگر سائنس فریب و التباس کا مجموعہ نہیں ہے تو یقیناً یہ سیارہ نہ صرف ذہن انسانی سے جو اس کے وجود پر غور و فکر کرتا ہے بلکہ ذہن حیوانی سے بھی ہزارہا سال پہلے سے موجود ہے۔ تاہم ہم نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ فرض کرنا کہ مادہ بغیر نفس کے موجود ہے ایک مہمل سی بات ہے۔ پس ظاہر ہے کہ عالم ہمیشہ ہمارے جیسے اذہان کے لئے موجود نہیں رہا ہے۔ ہمارے اذہان گزشتنی ہیں۔ انکا ایک آغاز ہوتا ہے ان پر خواب طاری ہوتا ہے اور انکا خاتمہ بھی ہوجاتا ہے۔ ایک یا کئی اذہان ملکر کسی وقت بھی اون تمام چیزوں کو جان نہیں سکتے جو قابل علم ہیں۔ ہم عالم کی کسی طرح تخلیق نہیں کرتے بلکہ جزوًا جزوًا اور وہ بھی نہایت ناقص طریقے سے ہم کائنات کا انکشاف کرتے ہیں۔ کسی معقول طریقے سے یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ مادہ ذہن سے علیحدہ اور مستقل وجود رکھتا ہے پھر بھی یہ کہنا کہ وہ محض ہمارے جیسے اذہان کے لئے موجود ہے درست نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک شخص کائنات کے محض ایک جزو کو جانتا ہے اور ہم سب ملکر اس کل کو نہیں جانتے۔ اگر یہ کل فی الحقیقت موجود ہے تو ایک ایسا نفس ہونا چاہئے جو اس کل کو جانتا ہو۔ وجود عالم کے لئے جس نفس اعظم کا ہونا ناگزیر ہے وہ ایسا نفس ہے جس کو

ہم عام زبان میں خدا کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ سلسلۂ استدلال ہم کو ناگزیر طور پر اس تصور کی طرف لے جاتا ہے کہ جس حد تک کہ مادہ کے وجود کا تعلق ہے وہ نفس مدرک سے علیحدہ کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا۔ الفاظ دیگر مادہ نفس میں اور نفس ہی کیلئے موجود ہے۔ عالم اور ادنیٰ اذہان کے وجود سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے اور ہم کو یہ فرض کئے بغیر چارہ نہیں کہ ایک ایسا نفس بھی موجود ہے جو عالم کیر علم رکھتا ہے۔ یہ بلاشبہ ممکن ہے کہ ہم ایک ہمہ دان نفس (Omniscient) کے وجود سے انکار کرکے محدود اذہان ہی کے وجود کو ابدی فرض کریں اس مفروضہ سے ہم آگے چل کر بحث کرینگے۔ یہاں صرف اس قدر جتا دینا کافی ہے کہ یہ مفروضہ ہمارے معلومہ عالم کی توجیہ کیلئے ناکافی ہے۔ ایک بادی النظری خیال تو یہ ہے کہ تمام اذہان جو بداہتہً اپنا ایک آغاز رکھتے ہیں، اور بعض طبعی اعمال کے اتحاد سے بتدریج نمو پاتے ہیں اونکا مبداء و منفذ بھی خود یہی طبعی اعمال ہیں خواہ ان کی انتہائی علت کچھ ہی ہو۔ کائنات کے تمام قابل مشاہدہ مظاہر کے باہمی تعلق و ترتیب پر غور کرنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان مظاہر کی انتہائی حقیقت ضرور کوئی ہستیٔ واحد ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اوس حقیقت کی ماہیت کیا ہے۔ جو استدلال ہم نے پیش کیا ہے وہ اس خیال کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ یہ حقیقت واحد کوئی روحانی حقیقت ہے۔ اس سوال پر آگے چلکر بحث کیجائیگی کہ آیا یہی حقیقت واحد اس طبعی عالم کی علت ہے۔ ہم یہاں صرف یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عالم کی توجیہ ایک ایسے نفس کلی کو فرض کئے بغیر نہیں کیجا سکتی جس میں اور جس کے لئے یہ تمام مادی اشیاء موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

یہاں تک تو ہمنے خدا کے وجود کو ایسے سلسلۂ استدلال سے ثابت کرنیکی کوشش کی ہے جو اس خیال کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے کہ نفس شاعر (Concious mind) سے علیحدہ مادہ کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا۔ اذہان اور انکے تجربوں کے سوا کوئی شئے موجود نہیں ہے۔ یہ استدلال ان لوگوں کیلئے جو تصوریت سے ناآشنا ہیں بیحد مستبعد نظر آئیگا اور ممکن ہے کہ پہلی نظر میں بدیہی اور مستحکم اعتقاد نہ پیدا کرسکے جبتک کوئی شخص ایک کافی عرصہ تک کائنات پر تصوری نقطۂ نظر سے غور کرنیکا عادی نہو جائے وہ اس خیال کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ

تصوریت ہی فلسفہ کا ایک ایسا مکتب ہے جو وجود خدا کے متعلق واضح اور مستحکم استدلال پیش کرسکتا ہے۔ ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جب تک کوئی شخص پہلے تصوریہ (Idealist) نہ ہو لے وہ الٰہیہ (Theist) نہیں ہوسکتا۔ وجود خدا کے متعلق دوسری قسم کی جو دلائل پیش کیجاتی ہیں اون کی تحلیل بھی بالآخر تصوری استدلال میں ہوتی ہے اس کے سوا یہ دلائل ناقص غور و فکر کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان دلائل پر بھی ہم آیندہ بحث کرینگے۔ مادیت کے خلاف جو استدلال اوپر پیش کیا گیا ہے ہم اوسکو ایسی صورت میں منتقل کرنا چاہتے ہیں جو فہم عامہ Common sense کو بھی متاثر کرسکے اور جس کے سمجھنے کے لئے فلسفیانہ تفکر کی ضرورت نہو۔

فہم عامہ کی سطح فکر پر حقیقت کی دو قسمیں نظر آتی ہیں۔ نفس اور مادہ۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی اذہان و اجسام میں ایک گہرا تعلق ہے یعنے وحدت فطرت کی ضمیر میں داخل ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور رہیں کہ یہ سب کچھ کسی ایک ہی حقیقت کے مظاہر، پیداوار، معلولات یا پہلو ہیں۔ اشیاء کی گوناگونی و بوقلمونی کی تہ میں کوئی وحدت ضرور پوشیدہ ہے نفس اور مادہ جیسے دو مستقل حقائق کے اتصال سے جن پر کوئی قانون حکمران نہیں ہے کائنات وجود میں نہیں آسکتی۔ تمام اشیاء تمام مظاہر اور تمام حوادث ایک واحد بامعنے، اور منضبط کل کے اجزاء ہیں۔ نہ صرف فلسفہ بلکہ حکمیات بھی اس قیاس کو تسلیم کرتی ہے۔ کوئی شخص چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ محض ایک قیاس ہے اور اس لئے ایک بیجا ادعائیت (Dogmatism) ہے۔ لیکن ہم تو یہی کہینگے کہ یہی وہ مفروضہ ہے جسکی طرف ہمارا سارا علم رہنمائی کرتا ہے۔ بہرصورت تمام سنجیدہ مفکرین کے لئے بھی ایک مشترک نقطۂ اتصال ہے۔ اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس حقیقت واحد کی ماہیت کیا ہے۔ اگر یہ انتہائی حقیقت نفس نہیں ہے تو اسکو دو میں سے کوئی ایک چیز ضرور ہونی چاہئے۔ یا تو یہ مادہ ہوگی یا ایسی شئے ہوگی جو نفس ہے نہ مادہ بلکہ ان دونوں سے بالکل مختلف۔ وہ لوگ جو اس تصوری استدلال کا ساتھ نہیں دیسکتے کہ انتہائی حقیقت نفس ہے اس بات کو تو کم از کم تسلیم کرینگے کہ تصوریین نے کامیابی کے ساتھ یہ دکھادیا ہے کہ مادہ کا انتہائی حقیقت (Ultimate reality) قرار پانا ناممکن ہے۔ کیونکہ مادہ کے تمام خواص ایسے خواص ہیں جو ہماری حسیت یا فکر سے کوئی نہ کوئی علاقہ

ضرور رکھتے ہیں۔ اس کے سوا ہمارے شعور میں اور بے شعور مادہ میں جو نفس سے باہر موجود سمجھا جاتا ہے اسقدر تضاد ہے کہ یہ بات قیاس میں بھی نہیں آسکتی کہ نفس کو مادہ کی پیداوار یا صفت ہونی چاہئے اسپنوزا، ہیگل، ہربرٹ اسپنسر جیسے مفکرین نے بھی جو فطریت (Natalism) کے علمبردار ہیں اور عام معنوں میں مذہب کے خلاف سمجھے جاتے ہیں یہ اعتراف کیا ہے کہ مادہ کسی طرح انتہائی حقیقت نہیں ہوسکتا۔ اب سوال یہ ہے کہ کون نظریہ آسان، ممکن، اور معقول ہے آیا یہ کہ نفس ایک انتہائی حقیقت ہے یا کہ یہ انتہائی حقیقت نہ نفس ہے نہ مادہ بلکہ ایک ایسی شئی ہے جو ناقابل فہم اور ناقابل قیاس ہے۔ ہمارے نزدیک اس بات کو فرض کرنیکی کوئی معقول دلیل نہیں ہے کہ چونکہ فکر انسانی ناقص ہے اس لئے وہ ایسی شئی کو خیال میں نہیں لاسکتی جو نفس ہے نہ مادہ بلکہ ان دونوں سے مختلف۔ اسکے برعکس یہ تسلیم کرلینا زیادہ معقول نظر آتا ہے کہ اس نامعلوم شئے کے خیال میں نہ آنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ ایسی نامعلوم شئی موجود ہی نہیں ہے۔

ہم نامعلوم کو صرف معلوم کی تمثیل سے جان سکتے ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ جس کائنات کو ہم جانتے ہیں وہ اوس حقیقت کبریٰ کے صرف چند خصوصیات کو ظاہر کرے جس سے یہ ماخوذ یا جس کا یہ مظہر ہے لیکن یہ سمجھ میں آنا دشوار ہے کہ یہ کائنات اوس حقیقت کبریٰ کی کسی خصوصیت کو سرے سے ظاہر ہی نہ کرے۔ اگر ہم اپنے تجربہ کے کسی ایک حصہ سے یا تجربہ کے ایک حصہ کی تفصیلی خصوصیات سے اوس ماورائے تجربہ ہستی پر استدلال کرنا چاہیں۔ یا مثلاً ایک نابینا یہ استدلال کرے کہ کائنات بے رنگ ہے کیونکہ وہ کسی رنگ کو نہیں دیکھتا یا اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ دوسرے سیاروں میں اون رنگوں کے سوا جن کو ہم دیکھتے ہیں، اون احساسات کے سوا جن کو ہم محسوس کرتے ہیں اور اون ذہنی قوتوں کے سوا جو ہم رکھتے ہیں کوئی دوسرا رنگ، احساس، یا ذہنی قوت نہیں ہے تو یہ نتیجہ مشتبہ و مشکوک ہوگا۔ جو شخص مذہب تشبیہ (Anthropomorphism) کا حامی ہے (یعنے ایسا شخص جو خیال کرتا ہے کہ خدا یا ارباب (Gods) کے بھی انسانوں کی طرح ابدان ہونے چاہئیں) اوس پر یہ فقرہ چست کیا جاسکتا ہے کہ "اگر بیلوں میں قوت فکر ہوتی تو وہ ارباب کو اپنے ہی طرح

قیاس کرتے ہیں لیکن یہاں یہ صورتیں متوازی نہیں ہیں۔ ہم کو یہ خیال کرنے میں کوئی دشواری نہیں کہ دوسرے عوالم میں بھی ایسے رنگ موجود ہیں جن کو ہم نے کبھی دیکھا نہیں ہے یا ایسے احساسات ہیں جو ہمارے احساسات سے بالکل مختلف ہیں لیکن ہم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ کوئی ہستی ایسی بھی موجود ہے جو نفس ہے نہ مادہ بلکہ ان دونوں سے مختلف۔ جس عالم کو ہم جانتے ہیں اوسکی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں نفس اور مادہ کے مابین ایک گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس تعلق کی ماہیت کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ انتہائی حقیقت جو ہماری رسائی سے بالاتر ہے ایسی ہونی چاہئے جس میں نفسی خصوصیات ہوں یا اوسکو مادہ اور نفس دونوں سے مختلف ہونا چاہئے ان میں سے کونسی صورت زیادہ ممکن ہے؟ کیا ہم اس بات پر مصر ہوگے کہ منطقی طور پر ہمیں نفس اور مادہ دونوں کی خصوصیات کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس طرح کا انفصال صرف اوسی صورت میں خیال میں آسکتا جبکہ ہم مادہ کو تصوری مفہوم میں فکر یا نفس ہی کا تجربہ خیال کریں یا اسکو نفس کی تخلیق و پیداوار سمجھیں۔ اگر تم یہ خیال کرنا چاہوگے کہ انتہائی حقیقت مادہ اور نفس دونوں کی صفات کو شامل ہے تو پھر بھی ہم بتاکید کہہ سکتے ہیں کہ اس حقیقت کبریٰ کی نوعیت نفسی ہے نہ کہ مادی اور یہی مسلک ہم کو صداقت سے قریب تر کر دیتا ہے۔

مجھکو یقین نہیں کہ آیا ذہن انسانی حقیقت ربانی کو خیال میں لانے کے قابل ہے جو ہے تو ایک ہی لیکن نہ تو وہ نفس ہے نہ مادہ بلکہ وہ ایک ایسی شئے ہے جو دونوں کی ماہیت پر مشتمل ہے۔ جب اس قسم کے عقیدے کی تعلیم دی جاتی ہے تو انسان یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ حقیقت کبریٰ ایک بے شعور ہستی ہے جو کسی نہ کسی طرح نفس کو خلق کرتی یا اس کو نمود بخشتی ہے اس طرح سے وہ پھر اوس مادیت میں الجھ جاتا ہے جس کا وہ ابطال کر چکا ہے یا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ یہ حقیقت ایک نفس ہے جو مادہ کو خلق کرتا ہے اور مادہ جب پیدا ہو چکتا ہے تو وہ خود اس نفس سے مختلف ہو جاتا ہے۔ آخر الذکر خیال الٰہیت (Theism) کی ایسی شکل ہے جسکو ایسے لوگ تسلیم کر لیتے ہیں جو تصوریین نہیں ہیں۔ عملی اور مذہبی نقطۂ نظر سے اس خیال کی مخالفت میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

پھر بھی اس میں ثنویت Dualism موجود ہے جسکی فلسفیانہ دقتوں کو واضح کرنیکی کوشش کی گئی ہے۔ اس انتہائی حقیقت کو جو نفس اور مادہ دونوں کی صفات کو شامل ہے سمجھنے کا طریقہ صرف یہ ہوسکتا ہے کہ اس کو ایک ایسا نفس تسلیم کیا جائے جو عالم یا فطرت کا شعور رکھتا ہے اور یہ عالم اس نفس سے باہر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ جو لوگ اس تصوری استدلال کو نہیں سمجھ سکتے وہ اتنا تو ضرور محسوس کریں گے کہ مادیت اور لاادریت میں کیا دشواریاں ہیں کیونکہ یہ دونوں نظریات یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ انتہائی حقیقت مادی ہے لیکن اون کو اس سے انکار ہے کہ اسمیں نفسی صفات موجود ہیں۔ یہ استدلال زیادہ قابل فہم ہے کہ انتہائی حقیقت نفس ہے کیونکہ نفس سے مادہ کی توجیہ ہو جاتی ہے لیکن مادہ سے نفس کی توجیہ نہیں ہوسکتی اور یہ خیال کہ حقیقت نہ نفس ہے اور نہ مادہ ہمارے لئے ناقابل فہم اور بعید از قیاس ہے نفس سے علیحدہ مادہ کے وجود کے متعلق خواہ کچھ ہی خیال کیا جائے اتنا تو ہر شخص تسلیم کریگا کہ نفس سے علیحدہ مادہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ جب اخلاقی احکام پر غور کرتے ہیں تو ہم کو یہ معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ نفس ہی ایک ایسی اعلیٰ و برتر ہستی ہے جس کا ہم کو علم ہے اس قیاس میں ایک حد تک امکان نظر آتا ہے کہ اوس حقیقت میں جس سے تمام ہستیاں ماخوذ ہیں ایک ایسی قدر ہونی چاہئے جو تمام ماخوذ ہستیوں میں پائی جاتی ہے حقیقت کے صحیح تصور تک پہنچنے کا یہی ایک ممکن طریقہ ہے کہ حقیقت کو نفس کی تمثیل سے خیال میں لایا جائے۔

وجود خدا کے بارے میں ہم نے جو استدلال پیش کیا ہے وہ ابھی نامکمل ہے۔ ہم نے یہ واضح کرنیکی کوشش کی ہے کہ انتہائی حقیقت ایک ایسا نفس ہے جو مادہ کو جانتا یا مادہ کا شعور رکھتا ہے۔ تصور مُثل کا نقطۂ نظر بس یہی ہے کہ عالم خدا کے ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں رکھتا یا کم از کم ایسے ذہن کے بغیر وہ موجود نہیں رہ سکتا۔ اس رُوح اعظم اور عالم خارجی میں کیا علاقہ ہے اس پر سطور ذیل میں بحث کیجائیگی۔

عالمگیر علیت ہم نے اوپر یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ مادہ کا انتہائی حقیقت ہونا تو ایک طرف بغیر نفس کے اوس کا موجود ہونا بھی کسی معقول طریقہ سے خیال میں

نہیں آسکتا۔ بغیر ایسے نفس کو تسلیم کئے جس میں اور جس کے لئے تمام غیر ذہنی اشیاء موجود ہیں ہم کائنات کی توجیہ نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم نے ابھی نفس الٰہی اور عالم خارجی کے تعلق کو پوری طرح واضح نہیں کیا ہے اور نہ اس سے بحث کی ہے کہ ان نفس کلی میں اور اون محدود نفوس میں جو اس سے ماخوذ یا اس پر مبنی ہیں کیا علاقہ ہے؟ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ "جس طرح کائنات کے لئے خدا کا وجود ناگزیر ہے اسیطرح خدا کیلئے کائنات کا وجود بھی لازمی ہے"۔ اس بات کی زیادہ تصریح کی ضرورت نہیں کہ مذہبی نقطۂ نظر سے یہ خیال کسقدر غیر تشفی بخش ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ہم کو یہ خیال کرنا پڑیگا کہ گو خدا خیر برتر ہے لیکن جس عالم پر وہ فکر کرنے کے لئے مجبور ہے وہ مجموعۂ شر ہے۔ یہ خیال کہ خدا ایسا نفس ہے جو عالم پر ابدًا فکر کرتا ہے لیکن اوسمیں یہ قوت نہیں کہ عالم کی نوعیت کا تعین کر سکے ایسا خیال ہے جو ہماری اُمید و آرزو اور ہماری عبادت اور پرستش کو بے معنے کر دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے خدا کو خیر اور عالم کو شر تسلیم کرنا پڑیگا لیکن یہ خیال قابل تسلیم نہیں۔ ایک ہستی جس میں ارادہ ہی نہ ہو وہ اوسی طرح شر ہو سکتی ہے جس طرح کہ وہ خیر ہے گویا یہ ایسی ہستی ہوگی جسکی کوئی سیرت (Character) ہی نہیں ہے۔ کائنات کے متعلق ایسا تصور بہ نسبت خالص مادیت یا لاادریت کے عقلی نقطۂ نظر سے زیادہ قابل فہم ہو سکتا ہے لیکن اخلاقی اور مذہبی نقطہ نظر سے اگر اس کے نتائج کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو ہم نہیں سمجھ سکتے یہ مادیت سے کسی طرح بھی بہتر ہو سکتا ہے۔ اسکے سوا وہ اس احساس کو تشفی نہیں دیسکتا جو اکثر غور و فکر کرنیوالے محسوس کرتے ہیں کہ کائنات میں کسی نہ کسی قسم کی وحدت ہونی چاہئے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ خدا ایک ناقابل فہم طریقہ سے ایسے عالم سے تعلق کر لیتا ہے جس میں اوس کے اختیار کو کوئی دخل نہیں تو ہم کائنات کو کسی وحدت پر مبنی قرار دینے سے عاجز ہیں۔ یہاں بھی وہی قدیم ثنویت رونما ہوجاتی ہے۔ خدا اور کائنات اوسیطرح ایک دوسرے کے مقابل میں موجود ہیں۔ نہ تو کائنات سے خدا کی توجیہ ہو سکتی ہے اور نہ خدا سے کائنات کی۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی کائنات کا کوئی مقصد یا عقلی غایت (Rational end) بھی ہے۔ ہمیں اپنی عقل اور نیز اپنے مذہبی حسیات کو تشفی دینے کے لئے یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ کیا ہم یہ خیال کرنے میں

حق یہ جانب نہیں ہیں کہ خدا عالم کی علت اور اوسکا خالق ہے اور اوس پر غور و فکر بھی کرتا ہے۔

یہ بحث ہم کو مسئلہ علیت کی طرف لیجاتی ہے۔ ہم نے اوپر بارکلے کے استدلال کا جو خاکہ پیش کیا تھا وہ بالکل نامکمل تھا۔ بارکلے کو ایک لحاظ سے فلسفیانہ بت شکن کہا جاسکتا ہے۔ اوس نے قائم بالذات مادہ کے توہم کو مٹادیا۔ وہ اس خیال کے خلاف برسرپیکار رہا کہ طبعی مقدمہ (Physical antecedent) اور طبعی تالی (Physical consequent) کے مابین ایک پراسرار لزومی رابطہ ہے۔ اسی کے نقطہ نظر کو ہیوم نے بھی اختیار کیا تھا۔ بارکلے نے علم کو او (succession) تصورات میں تحلیل کیا۔ اوس نے یہ سمجھنے میں بے شک غلطی کی تھی کہ علم محض مرور حسیات کا نام ہے اوس نے علم کے ایک عنصر کو جو "ذہنی علائق" سے تعبیر کیا جاتا ہے نظر انداز کردیا تھا۔ بارکلے کی اس غلطی کی کانٹ نے تصحیح کی ہے اور اس حد تک جدید تصوریں کانٹ کے ممنون احسان ہیں۔ خود مرور تصورات کے وقوف میں یا اس ادراک میں کہ ایک شے دوسری شے کے بعد وقوع میں آتی ہے ایک ایسا عنصر پوشیدہ ہے جسکی توجیہ محض حس سے نہیں کی جاسکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم اپنے تجربوں کے مابین سوائے مرور کے کوئی اور علاقہ بھی دریافت کرسکتے ہیں۔ ہم آگ کو بالعموم کاغذ کے جلنے کی علت سمجھتے ہیں لیکن اس واقعہ کے متعلق ہم درحقیقت کیا جانتے ہیں۔ غور کرنے کے بعد ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جہاں تک ہمارے تجربہ کا تعلق ہے ہم بس اس قدر جانتے ہیں کہ کاغذ کو جب آگ پر رکھا جاتا ہے تو وہ جل جاتا ہے۔ اس صورت میں ہم ایک حادثہ کو دوسرے حادثہ کی علت سمجھتے ہیں اور جب کبھی ہم ایسا متنقل مرور (Invariable succession) معلوم نہیں کرسکتے ہم ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ کی علت نہیں سمجھتے۔

غالباً یہ کہا جائیگا کہ علت کی اگر یہی ماہیت ہے تو دن کی علت رات ہے۔ لیکن اگر ہمارے اس محدود تجربہ کا نقص ایک دوسرے وسیع تجربہ سے دور نہ ہوجاتا تو ہم کو یقیناً یہی کہنا پڑتا۔ ہمارے وسیع تجربہ نے یہ واضح کردیا ہے کہ اس قانون کے مقابل میں کہ رات کے بعد دن آتا ہے ہم کو یہ وسیع تعمیم (Generalisation) تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اشیاء کی روش ہمیشہ اور مستقل طور پر کسی متوہم کی موجودگی پر مبنی ہوتی ہے

نہ کسی ماقبل تاریکی پر۔ جن چیزوں کو ہم محض مرور سے تعبیر کرتے ہیں اور جن کو عام طور پر نتیجہ تعلیل سمجھتے ہیں ان میں فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض صورتوں میں نتیجہ تغیر پذیر ہوتا ہے اور بعض میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اس واقعہ کا خواہ ہم کتنی ہی دفعہ مشاہدہ کریں کہ سرخی کے احساس کے ساتھ عصب بصری میں ایک تصادم پیدا ہوتا ہے جو تموج اثیر کا نتیجہ ہے پھر بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات کیوں وقوع میں آتی ہے۔ ہم اس سے بھی وسیع تر تعمیم کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فطرت میں ہر حادثہ کے وقوع سے پہلے چند متعین و ملتف شرائط ہمیشہ اور مستقل طور پر موجود رہتی ہیں۔ اور یہی قانون ہے جو طبعی علوم کی واضح یا مضمر بنیاد ہے۔ جب ہم ایک بار اس قانون کو تسلیم کر لیتے ہیں تو صرف ایسی ایک مثال ہے کہ ا ب ج کے بعد د وقوع پذیر ہوتی ہے ہم کو یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کافی ہو جاتی ہے کہ ہم نے ایک قانون فطرت کو دریافت کر لیا ہے۔ دوسری دفعہ جب ا۔ ب اور ج وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ہم یقین کے ساتھ یہ پیش بینی کر سکتے ہیں کہ د بھی وقوع پذیر ہوگی۔ اس قسم کے تواتر کو ہم کتنی ہی دفعہ مشاہدہ کریں پھر بھی ہم نہیں جان سکتے کہ ا۔ ب۔ ج کے بعد د کیوں وقوع میں آتی ہے۔ ہم صرف یہی جانتے ہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور اس علم کی بنا پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ ہمیں صرف ایک اغلبیت ہے جس کو ہم عملی اغراض کیلئے یقین کا درجہ دیتے ہیں۔ کافی غور و تامل کے بعد بھی ہم یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ ایک خاص طول رکھنے والی اہتزاز کی موج سرخی کا احساس کیوں پیدا کرتی ہے اور سبزی کا کیوں نہیں، اس سے رنگ کا احساس کیوں پیدا ہوتا ہے آواز کا کیوں نہیں۔ یہاں ہم کو مرور کے سوا اور کوئی لزومی رابطہ نظر نہیں آتا۔

باقی آئندہ

میں اور مزار

جناب میرزا نظام شاہ صاحب لبیب تیموری دہلوی

اے خاک تیرہ خاطرِ مہماں عزیز رکھ

سوال — لختِ دلِ لبیب ہے تیری کنار میں
کس کس کے لختِ دل کو تھپک کر سلایئے

جواب — لاکھوں تڑپ رہے ہیں ہماری کنار میں
یہ تو وہ پھول تھا کہ بیک لغزشِ نسیم

سوال — انجان آ پڑا ترے گرد و غبار میں
اک پھول کو تو روتا ہے غافل! ہزارہا

جواب — گلزار دفن ہیں مرے گرد و غبار میں

یہ تو وہ شعلۂ نگہ پُر اُمید تھا

سُوال چھپکے ہیں جس کے اب بھی دلِ بیقرار میں

ہر شعلہ میری گود کا ہے آفتاب وقت

جواب برپا ہے جس کا حشر دلِ بیقرار میں

یہ تو وہ نازنین تھا کہ وقتِ خرامِ ناز

سُوال لوٹا اسے اجل نے ترے رہگزار میں

سب نازنین پتلے ہیں اک مشتِ خاک کے

جواب اور سب ہی لوٹے جاتے ہیں اس رہگزار میں

ہاتف

اے شمع، تو ابکہ ماتمِ پروانہ کیلئے روشن ہے زندگانی ناپائیدار میں

عبرت سے گھل نہ غم سے بھڑک اور نہ گریہ کر تاریکیاں بڑھا نہ شبِ انتظار میں

احساس گرد و پیش سے آزاد ہو کے دیکھ

مدفون ہے تو خود ہی تنِ پر غبار میں

مدائن صالح

از جناب مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی

چند سال قبل سیاحت عراق و حجاز و مصر و قدس و شام و بیروت کے دوران میں "ام القریٰ" اور "بطحیٰ" کے بعد جس مقام کے نقوش میرے قلب و دماغ پر بہت زیادہ مرتسم ہیں وہ "مدائن صالح" ہے اسلئے اس عجیب و غریب شہر کی نسبت جو کچھ میں نے دیکھا، سنا اور پڑھا اوسکو یہاں بالاختصار قلمبند کرتا ہوں۔ حدود حرم میں شامل ہونیکی وجہ سے غیر مسلم سیاحوں کا یہاں گذر ہر زمانہ میں دشوار رہا ہے۔ سب سے پہلا یورپین سیاح جس نے شمالی عرب کا سفر ۱۸۱۲ء میں حاجیوں کے بھیس میں کیا وہ برکھارٹ تھا اسکے بعد چارلس داوٹے نے ۱۸۷۶ء میں حاجیوں کے قافلہ کے ساتھ الحجر مدائن صالح اور خیبر میں جاکر مشاہدہ و تفتیش کی لیکن ان دونوں سیاحوں کے مشاہدات کا وہ سرمایہ جس سے مدائن صالح کے آثار باقیہ پر کچھ روشنی پڑسکے ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔

جنگ عظیم کے بعد یہ پہلا سال تھا کہ شام سے حجاز ریلوے پھر مدینہ جارہی ہے زایران مدینۃ الرسول اقطاع عالم سے دمشق میں انبوہ در انبوہ جمع ہوئے ہیں چنانچہ قفقاز کے سید میکائیل اور سیلان کے محمد دکا کے علاوہ داغستانی اور مغربی اشخاص بھی میرے ہمسفر ہیں۔ ۱۶ مئی ۱۹۲۴ء کو صبح کے سات بجے ہماری ریل تقریباً دو سو زائروں کو لیکر دمشق سے مدینہ منورہ روانہ ہوئی۔ دن کے گیارہ بجے درعا کا اسٹیشن آیا

یہاں پر فرانسیسی علاقہ ختم ہوجاتا ہے۔ حیفہ سے آئی ہوئی دوسری ریل جو انگریزوں کے زیر اہتمام ہے یہاں تیار تھی اور ہم سب ۴ بجے سوار ہوئے۔

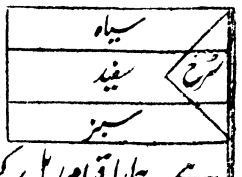
عمان

ساڑھے چار گھنٹہ کے بعد عمان پہنچے جس اسٹیشن ہم کو راستہ میں ملے اون میں ہم نے یہ دیکھا کہ دیواریں تو کھڑی ہیں لیکن عمارات کی چھتیں غائب ہیں اور اسٹیشن پر کسی متنفس کا وجود نہیں ہے یہ مقام حجاز اور شام کے وسط میں اور ای اردون (Trans Jordinia) یعنی مشرق اردون میں واقع ہے اور زیر سیادت انگلیس یہاں کی امارت شریف حسین کے چھوٹے فرزند امیر عبداللہ کے سپرد ہے جو ایک متوفق اور باحوصلہ شخص معلوم ہوتے ہیں ان کے خدام ہمیشہ زرق برق لباس میں ملبوس ہر وقت مسلح سے راستہ نظر آتے ہیں۔ اسٹیشن (محطہ) کے متصل ایک بلند ٹیلے پر انگریزی ہوائی جہازوں (طیارہ) کا مرکز (Aerodrome) ہے جہاں سولجروں کی قیام گاہ بھی ہے۔ قریۂ عمان (Amman) اسٹیشن سے تین میل دور ہے جو وقت ہماری ریل یہاں پہنچی ہے اوسوقت رات ہوچکی تھی۔ کوئی حمال یہاں نہ ملا اس لئے سامان لانے میں بڑی زحمت ہوئی دریافت سے معلوم ہوا کہ مزید مسافروں کے انتظار میں کئی روز یہاں قیام کرنا پڑیگا عمان میں ہوٹل موجود ہیں اور کرایہ کی موٹروں کی شب و روز آمد و رفت بھی ہے لیکن اسٹیشن سے فاصلہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہاں جاکر ٹھہرنا قافلہ سے علیحدگی کی وجہ سے خلاف احتیاط معلوم ہوا لہٰذا غرفۃ الانتظار (Waiting room) میں اور حاجیوں کے ساتھ قیام کیا گیا۔ دوسرے دن عمان کی سیر کو گیا راستہ میں رومیوں کے تسلط کی یادگار ایک ایمفی تھیٹر قابل دید ہے اسکی تعمیر پختہ اور پتھر سے ہوئی ہے لیکن حکومت کی عدم دلچسپی کے باعث خراب و خستہ حالت میں ہے اس کا طرز تعمیر قدیم رومن اور ہنوز مستحکم حالت میں ہے۔

دمشق میں ریل پر سوار ہوتے وقت ہم سے پاسپورٹ لے لئے گئے تھے جو یہاں کے "دارالقنصلیہ" میں جاکر ہم نے واپس حاصل کئے چار روز کی مدت میں اور حجاج دمشق سے آگئے تھے اسلئے مدینہ کا ٹکٹ پانچ پونڈ مصری میں ملا۔ ۱۹ مئی کو ۱۲ بجے دن کے یہاں سے روانہ ہوکر رات کے ۱۲½ بجے معان پر ریل جاکر ٹھہری

معان
Moan

یہاں امیر علی ولیعہد شریف حسین رہا کرتے ہیں اون سے ملاقات ہوی قہوہ و سگریٹ سے ہماری تواضع کیگئی یہ ہوشیار اور نیکدل معلوم ہوتے ہیں ایک وسیع کمرے میں گدے دار کونچوں پر نشست تھی متعدد حجاب و دربان مسلح استادہ تھے انکی قیامگاہ پر شرقی پھریرا لہرایا کرتا ہے جس کی شکل یہ ہے۔



بنگلے کے نیچے صبح و شام بجایا کرتے ہیں جو اس امر کی علامت ہے کہ امیر علی استقبت برآمد ہیں اور عام دربار ہے۔ ہمارا قیام ریل کے ڈبوں ہی میں ہے اور سامنے صحرائی لق و دق ہے اس میدان میں ایک ڈال کے مدور ستون نما پتھر (Monoliths) چھوٹے قد کے تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے چار و نطرف بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ پتھر نہایت مصفا ہیں اور چھوٹے گول گھر Stupa معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے یہ آثار حجر پر معلوم ہوتے ہیں جو ہبل اور لات و عزیٰ کے وجود سے بہت پہلے کے ہیں مقامی اشخاص کا بیان ہے کہ عہد قدیم میں انکی پرستش کیجاتی تھی۔ موسیو سدیو مشہور فرانسیسی محقق اپنی تاریخ عرب میں لکھتے ہیں کہ "عمان میں برہمنوں کے مذہب نے رواج پایا۔ عمان اور معان ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں اسلئے کوئی تعجب نہیں جو ان مدور پتھروں کا سلسلہ وہانک پایا جاتا ہو چونکہ ہندوستان کے مندروں کے پتھر سے انکی وضع ملتی جلتی ہے اس لئے موسیو سدیو کے اس قصور کی بنیاد یہی مدور پتھر معلوم ہوتے ہیں۔ پانچ دن کے انتظار کے بعد ہم اوسی ریل پر جس میں امیر علی سوار ہیں یہاں سے مدینہ روانہ ہوئے علاوہ حجاج کے تقریباً ۳۰ فوجی اشخاص ہماری ریل کے ساتھ ہیں غنیمت ہے کہ یہ سب ریل کے ڈبوں کی چھتوں پر فروکش ہیں اور وہیں سوتے بیٹھتے ہیں۔ اس عرصہ میں متعدد اسٹیشنوں پر سے ہماری ریل گزری لیکن سب ویران تھے اور خصوصیت کے ساتھ عمارتوں کی چھتیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ذات الحج اور العلی کے بعد منظر زیادہ پہاڑی ہوگیا یعنی ریت کم ہوگئی اور جبال زیادہ نظر آتے ہیں اسکے بعد منظم۔

حجر

دار الحمرار۔ اور الحجر تک مملکت ناقہ صالح کی سرحد ہے ریل سے جو منظر دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک برباد شدہ شہر کے کھنڈر ہیں جن میں انواع و اقسام کے احقاف (تودہای ریگ) اور عجیب و غریب سنگی ستون عظیم الجثہ نظر آتے ہیں اور چٹانوں میں جا بجا مساکن

ہوگئے ہیں۔ کئی میل تک سنگ سرخ کی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا ہے جن پر دور سے پتھر کے انسان اور جانوروں کی شکلیں نظر آتی ہیں۔ کسی ملک کے پہاڑوں پر موسمی تغیرات نے اتنا نفوذ نہ کیا ہوگا اور کسی قلمکار مصور کا تخیلہ اتنی اشکال بنانے پر ہرگز قادر نہیں ہوسکتا جس طرح کہ مصور قدرت نے یہاں کے پہاڑوں کو اشکال وصور مختلفہ میں ڈھال دیا ہے۔ بعض پہاڑوں میں سوراخدار غار اور چوکھٹ نما تنگ دروازے ریل سے نظر آتے ہیں ان وادیوں میں راستہ کا داک ہونیکی وجہ سے ریل کی رفتار ۱۲ کیلو فی گھنٹہ ہے۔

مدائن صالح

جب ہماری ریل مدائن صالح پر ٹھہری اور یہ اطمینان ہوا کہ انجن کی خرابی کی وجہ سے دوسرے روز صبح کو روانگی ہوگی تو اپنے بعض ہمراہیوں کو آمادہ کرکے ایک مختصر سی جماعت بنا کر ان قدیم یادگاروں کے معائنہ کیلئے ہم لوگ پیدل روانہ ہوئے یہ خیال بھی نہ تھا کہ کبھی مدائن صالح کے کھنڈروں کے دیکھنے کا اسطرح موقع میسر آئیگا پس اتفاقیہ طور پر ریل کے اس اسٹیشن پر رک جانے پر چونکہ غروب آفتاب کیلئے تقریباً پانچ گھنٹہ باقی تھے اسلئے یہ پورا وقت میں نے ان ماقبل تاریخ تمدن کی نشانیوں میں گذارا افسوس ہے کہ جو لوگ ہمارے ساتھ تھے ان میں کسی کو ان آثار باقیہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ سب سے پہلے میں نے بعض خاص خاص غاروں اور ان کتبات کی جو کسیقدر بلندی پر منقوش تھے کیمرہ سے تصویریں لیں اور اس بات کا افسوس رہا کہ چڑھ لینے کا کوئی سامان میرے ساتھ نہ تھا۔ مدائن صالح کی تمام تر عمارتیں پہاڑوں کے اندر سے کاٹ کر بنائی گئی ہیں اور بیرونی زیبائش ان میں مطلق نہیں ہے باہر کی چھوٹی کھڑکیوں سے جو بمشکل اتنی بڑی ہیں کہ ایک آدمی بیٹھکر اون کے اندر داخل ہوسکتا ہے۔ اندرونی وسعت و فراخی کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے چونکہ مشعل کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لئے شدید تاریکی کی وجہ سے اندرونی حدود اربعہ کا تعین دشوار تھا بہرحال چند غاروں کو غور کے ساتھ معائنہ کرنے سے یہ تو واضح ہوگیا کہ اونمیں کی

لہ ایک کیلو ڈیڑھ میل کے مساوی ہے ۱۲

قسم سے کوئی چیز ان میں موجود نہیں ہے اور نہ دیواروں پر اصنام کے کچھ نقش ونگار ہیں۔ یہ مقامات قوم عاد و ثمود کے مسکن تھے جنکی ہدایت کیلئے حضرت ہودؑ و حضرت صالح علی نبینا و علیہم السلام مبعوث ہوئے تھے۔ قوم عاد کے شہروں کو احقاف کہتے تھے اور ثمود کی سکونت علاقہ حجر میں تھی جو حجاز و شام کے درمیان وادی القریٰ میں واقع ہے۔ یہ لوگ پہاڑوں کی چٹانیں کھود کر ان میں سکونت رکھتے تھے۔ انہی کو "جبال الاکلیب" بھی کہتے تھے۔ یہ تمام پہاڑ اگرچہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں مگر سب ملحق و متصل معلوم ہوتے ہیں ان پتھروں کو پہاڑ کی جسامت کی مقدار کے مطابق کاٹ کر اندرونی حصوں میں گھر بنائے گئے ہیں ان میں نقش ونگار کے علامات تو پائے نہیں گئے البتہ ان میں مستحکم طاق و رواق ضرور بنے ہوئے ہیں اور انہی پہاڑوں کے درمیان وہ کنواں واقع ہے جہاں ناقۂ صالح کو قوم ثمود نے پانی پینے سے باز رکھکر اونٹنی کو بیچیں کاٹ ڈالی تھیں۔

عاد اولیٰ

شمالی عرب قدیم یادگاروں کا مخزن ہے اسی میں ارم ذات العماد اور حجر (Egra) جو قوم ثمود کا دار السلطنت تھا واقع ہے۔ امم سامیہ اولیٰ وہ قدیم سامی قبائل تھے جو عرب کے ابتدائی اور مستقل باشندے تھے اور جو عرب سے نکل کر بابل و مصر و شام میں پھیل گئے تھے ان میں عاد سب سے بڑا اور وسیع قبیلہ تھا ان کا سلسلہ نسب ارم بن سام بن نوح سے ملتا ہے۔ پہلے عاد ارم کہا جاتا تھا جب وہ مٹ گئے تو ثمود ارم کہا گیا جب وہ بھی برباد ہو گئے تو نمرود ارم ہو گیا۔ بابل۔ اسیریا۔ شام۔ کنعان اور فینی شیا کے قدیم کتبات کی زبان آرامی ہے چنانچہ ثمود کے کتبات بھی خط آرامی میں ہیں۔

قرآن مجید سے عاد کی حقیقت یہ ظاہر ہوتی ہے:۔

"اے عاد کے لوگو خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے قوم نوح کے بعد تم کو اپنی خلافت عطا کی" (اعراف ع ۹)

"تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے خدا نے اوس عاد ارم کے ساتھ کیا کیا۔ جو بڑی عمارتوں کے بانی تھے جنکی نظیر دنیا میں نہیں پیدا کی گئی" (فجر)

الغرض قوم نوح کی بربادی کے بعد عرب میں سب سے پہلی مقتدر جماعت عاد کی تھی جو بقول موسیو سدیو حضرت مسیح سے دو ہزار سال قبل مصر و بابل پر قابض تھے پس اگر یہ کہا جائے کہ قدیم امم سامیہ اور عاد مترادف الفاظ ہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا۔

عبرانی میں جو السنہ سامیہ کی سب سے قدیم زبان ہے عاد 7YY کے معنی بلند و مشہور کے ہیں اور ارم DZN کے معنی پہاڑ اور سنگ راہ نما کے ہیں۔ مورخین عرب کی تحقیق کے لحاظ سے عاد کا زمانہ حضرت مسیح سے تین ہزار سال پہلے قرار پاتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی عاد کو خلفائے قوم نوح کہا ہے اس لئے کہ نوح کے بعد عرب میں سام بن نوح یعنی امم سامیہ کی حکومت تھی پس بنو سام کی پہلی ترقی عاد سے شروع ہوئی یعنی امم سامیہ اولی یا عاد اولی ایک ہی چیز ہے۔ مصر و بابل کی تاریخ ۲۶۰۰ یا ۲۷۰۰ ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے لہٰذا بنو سام یعنی عاد کی حقیقی ترقی کا یہی عہد تھا۔ حضرت موسیٰ کے عہد سے پہلے یعنی ۱۵۰۰ قبل مسیح تک عاد کی تباہی ہو چکی تھی۔ وانہ اھلک عادن الاولی (اور اسی خدا نے عاد اولی کو برباد کر دیا) چنانچہ قرآن مجید میں بھی عاد کا ذکر حضرت موسیٰ و فرعون کے قصہ سے پہلے آیا ہے پس ان کی تباہی کے عہد اول کو عاد اولی اور عہد مابعد کو عاد ثانیہ کہنا چاہئے اور عاد کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۵۰۰ ق م تک قرار دیا جا سکتا ہے[1]۔

قوم عاد کا دعویٰ یہ تھا کہ

"آج ہم سے بڑا روی زمین پر کون ہے"۔ (حم سجدہ)

لیکن ان کے پیغمبر نے اس شیخی پر ان کی سرزنش کی اور فرمایا کہ

"عجب نہیں کہ خدا تم سے لیکر اپنی خلافت کسی دوسری قوم کو عطا کر دے"۔ (ہود)

عاد کے لوگ بڑی بڑی عمارتوں کے بانی تھے اسی لئے قرآن مجید اس قوم کو ذات العماد (ستونوں والے) یعنی بلند و بالا ایوانوں اور عمارتوں والے خطاب دیتا ہے۔

---

[1] ارض القرآن و اسوۃ الرسول ۱۲

"اے عاد والو تم ہر خوش قطع مقام میں بیفائدہ یادگار اور کاریگری کے مکان بناتے ہو شاید تم ہمیشہ دنیا میں رہوگے۔" (شعراء)

جب قوم عاد نے اپنی زور و قوت کے نشہ میں احکام الٰہی سے نافرمانی شروع کی تو آخری دعوت دینے کیلئے ان پر حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے انہوں نے خدا کی یہ آواز ان کو سنائی :۔

"ای میری قوم خدا کی پرستش کر اوس کے سوائے تیرے لئے کوئی دوسرا خدا نہیں۔ کیا ڈرتے نہیں۔ اوس قوم کا وہ بلند طبقہ جو کافر تھا بولا۔ اے ہودؑ ہم تم کو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں اور تم کو جھوٹ بولنے والوں میں پاتے ہیں۔ ہودؑ نے کہا اے میری قوم مجھ میں حماقت نہیں ہے۔ ہاں میں پروردگار عالم کی طرف سے رسول ہوں اپنی پروردگار کے پیغام تم کو پہنچاتا ہوں اور میں درحقیقت تمھارا خالص خیر خواہ ہوں۔ یاد کرو خدا کے اس احسان کو کہ اوس نے تم کو قوم نوح کے بعد خلافت عطا کی اور تم کو خلق میں وسعت دی پس خدا کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ فلاح پاؤ۔ انہوں نے جواب دیا۔ کیا تو اسلئے ہمارے پاس آیا ہے کہ ہم ایک خدا کو پوجیں اور جن کو ہمارے بزرگ پوجتے تھے اون کو چھوڑ دیں۔ جس عذاب کا تم دعویٰ کرتے ہو اگر سچے ہو تو لے آؤ (ہودؑ) نے کہا تمھارے پروردگار کا عذاب و غصہ تم پر آگیا۔ کیا تم مجھ سے ان چند ناموں میں جھگڑتے ہو جن کو تم نے اور تمھارے بزرگوں نے رکھ لیا ہے۔ خدا نے اس کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ عذاب کا انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔" (اعراف ع ۹)

"عاد کے بھائی ہودؑ کو یاد کرو۔ جب اوس نے اپنی قوم کو صحرائی ریگستان میں متنبہ کیا۔ خدا کی عبرتناک دھمکیاں اوس کے سامنے اور پیچھے تھیں۔ اوس نے کہا اس ایک خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجو۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم پر کوئی بڑا عذاب نہ آئے۔ انہوں نے کہا۔ اے ہود تو اس لئے ہمارے پاس آیا کہ ہم کو اپنے دیوتاؤں سے منحرف کردے جس عذاب کا تم دعویٰ کرتے ہو اگر سچ ہو تو لے آؤ۔ اس نے کہا اسکا علم خدا کے پاس ہے کہ عذاب کب آئیگا۔ جو پیغام لیکر میں بھیجا گیا ہوں وہ صرف تم کو پہنچاتا ہوں۔ لیکن میں تم کو نادان قوم خیال کرتا ہوں۔" (احقاف)

منکرین عاد نے کہا قوت و زور میں ہم سے کوئی بڑا ہے؟ اس کا جواب حضرت ہودؑ نے یہ دیا

اگر خدا کی اطاعت اختیار کروگے تو خدا تمھاری قوت کو اور قوت بخش دیگا ۔ لیکن وہ نہ سمجھے کہ جس خدا نے اون کو پیدا کیا وہ اون سے بھی زیادہ قوی ہے ۔

یوسیفوس جو پہلی صدی عیسوی کا ایک یہودی مورخ تھا اور اسکندریہ کے اوس مشہور کتاب خانہ کا مہتمم تھا جس میں بابل و مصر کی تمام قدیم تاریخیں موجود تھیں اوس نے ان تاریخوں کی امداد سے قوم عاد کے ظلم و ستم کی داستان مفتوح اقوام کی زبان سے یوں اپنی کتاب میں بیان کی ہے :—

"خدا ہم سے ناراض تھا ۔ ایک عجیب و غریب طریقہ سے اطراف مشرق سے شریر الخلقت لوگ چلے آئے وہ اس قدر قوی تھے کہ ہمارے ملک میں گھس پڑے اور بزور نہایت آسانی سے اوس کو مسخر کر لیا ۔ انہوں نے ہمارے سرداروں کو گرفتار اور ہمارے شہروں کو جلا دیا ۔ ہمارے دیوتاؤں کے مندر گرا دئے اور تمام باشندوں کے ساتھ وحشیانہ طریقہ سے سلوک کیا ۔ بعض کو ہتیاروں سے مار ڈالا اور اون کی بیوی بچوں کو غلام بنایا"

اب ہم اس قوم کی تباہی کے اسباب کو قرآن مجید میں تلاش کرتے ہیں جب عاد نے نہ مانا اور یہ کہا کہ :—

"خواہ تم وعظ و نصیحت کرو یا نہ کرو ہم ماننے والے نہیں ہیں ۔ یہ اگلے زمانے کی عداوت ہے ہم پر کوئی عذاب نہ آئے گا" (الشعراء)

تو حضرت ہودؑ نے خدا سے یوں شکایت کی :—

"میں خدا کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہنا ۔ جس کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں اس سے بالکل بری ہوں ۔ میں جو پیغام لیکر تمھارے پاس بھیجا گیا تھا وہ تم کو پہنچا چکا ۔ خدا تمھارے سوا کسی اور کو حکومت بخش دیگا ۔ تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے ۔ میرا پروردگار ہر چیز کا محافظ و نگہبان ہے" (ہود ع ۱۰)

اسکے بعد ہوا اور ریگ کے الٰہی عذاب نے اس قوم کو برباد کر دیا ۔

"جب اون کو بادصرصر کا عذاب ایک بادل کی صورت میں جس کا رخ اون کی وادیوں کی طرف تھا نظر آیا تو یہ بولے ۔ کہ ہم کو یہ سیراب کرنیوالا بادل ہے ۔ نہیں بلکہ یہ وہ ہے جس کی اے گنہگارو تم کو جلدی تھی ۔ یہ ہوا ہے جس میں دردناک عذاب ہے ۔ جو اپنے خدا کے حکم سے ہر شئی کو برباد کر دیتی ہے ۔

پھر وہ ایسے نیست و نابود کر دیئے گئے کہ اون کے گھروں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا"۔ (احقاف)

"لیکن عاد۔ تو وہ باد صرصر سے برباد کر دیئے گئے۔ خدا نے سات رات اور آٹھ دن تک اون پر جڑ کاٹنے والی ہوا کو مسلط کر دیا۔ تم اوس ہوا میں اوس قوم کو اس طرح افتادہ دیکھتے ہو جیسے وہ کسی کھوکھلی درخت کی جڑ تھی۔ کیا اب اون میں کا کوئی تم کو زندہ نظر آتا ہے"۔ (الحاقۃ)

"اور عاد کے حالات میں عبرتیں ہیں۔ جب ہم نے بیح عقیم (غیر نفع بخش ہوا) کو بھیجا جو ایسی تھی کہ جس شئے پر اسکا گذر ہو جاتا اوسکو بوسیدہ ہڈی کی طرح کر چھوڑتی۔ صبح کو سوای مکانات افتادہ کے اور کچھ نظر نہ آیا"۔ (احقاف)

ان ہلاک ہونیوالوں کو خداوند عالم نے قرآن مجید میں اس طرح یاد کیا ہے۔

"اور اس خدا نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا" (نجم)

پس یہ واقعہ عاد اولیٰ پر وادی احقاف یا ربع خالی میں گذرا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ

"ہم نے ہودؑ کو اور جو اون کے ساتھ ایمان لائے اپنی رحمت سے نجات دی" (اعراف ع ۹)

عاد ثانیہ ثمود

پس اس قوم کے نجات یافتہ لوگ صالحین عاد یا عاد ثانیہ کے نام سے موسوم ہوئے اور یہ عاد ثانیہ ثمود کہلائے۔ عاد جنوبی و مشرقی عرب پر اور ثمود مغربی و شمالی عرب پر قابض تھے جس کا نام وادی القریٰ تھا۔

"اور ثمود جو وادی (قریٰ) میں پتھر تراشا کرتے تھے" (فجر)

"اے قوم ثمود۔ یاد کرو جب کہ خدا نے تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا" (اعراف)

ثمر عربی میں آب قلیل کو کہتے ہیں جس سے واضح ہے کہ ان کے ملک میں پانی کی قلت تھی۔ قوم ثمود کا دار الحکومت حجر تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور جو شام سے حجاز کے اوس قدیم راستہ پر واقع ہے جس سے محمل شام ترکوں کے زمانہ میں مدینہ جایا کرتی تھی۔ اسی راستہ پر ثمود کا ایک دوسرا مقام فج الناقہ ہے لیکن اصل شہر حجر ہی تھا جس کو اب مدائن صالح[1] کہتے ہیں۔ قوم عاد نے تو

[1] سفر میں تبوک کو جاتے ہوئے آنحضرت صلعم کا اس شہر پر سے گذر ہوا تھا۔ حجر کے بعد المعظم اوس کے بعد تبوک کا اسٹیشن ہے

ریت کے تودوں میں اپنے مکان بنائے تھے لیکن ثمود دیار حجر (وادی القریٰ) میں پہاڑوں کی چٹانیں کھود کر گھر بنایا کرتے تھے۔ ان پر حضرت صالح مبعوث ہوئے۔ ابو الفدا نے تقویم البلدان میں الحجر کی حقیقت یوں لکھی ہے۔

"ابن حوقل کا بیان ہے کہ علاقۂ حجر پہاڑوں کے درمیان وادی القریٰ سے ایک دن کی راہ پر واقع ہے۔ مگر میں نے اوس کو پانچ دن کی راہ سے بھی زیادہ پایا یہی وہ مقام ہے جہاں قوم ثمود سکونت پذیر تھی اور یہی وہ قوم ہے جسکی نسبت خداوند عالم نے فرمایا کہ جو وادی میں پتھر تراشا کرتے تھے۔ ابن حوقل نے ان پہاڑوں اور ان چیزوں کو جو ان میں واقع ہیں دیکھا ہے۔ جیسا کہ ان کے متعلق خداوند عالم فرماتا ہے پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بناتے ہو۔ ان پہاڑوں کا نام الاثالیب ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں شام سے آنیوالے حاجیوں کا قافلہ اترتا ہے اور یہ مقام العلی سے مابین مکہ و شام نصف راہ پر واقع ہے"

قوم ثمود جو شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی اوسکو بھی عاد کی طرح فنِ تعمیر میں کمال حاصل تھا۔ پتھروں کو خالی کرنا۔ پہاڑوں کو اندر سے کاٹ کر مسکن بنانا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ ان یادگاروں پر جو اب تک باقی ہیں۔ آرامی اور ثمودی خطمیں کتبے منقوش ہیں لیکن ان میں کے اکثر آرامی کتبا ب بطلی اقوام کے ہیں جنہوں نے حضرت مسیحؑ کے قبل و بعد اسی مقام پر حکومت کی تھی قوم ثمود کا خاتمہ حضرت موسیٰؑ کے ظہور سے پہلے ہوگیا تھا اور یہ زمانہ تقریباً ۱۸۰۰ قبل مسیحؑ سے ۱۶۰۰ قبل مسیحؑ تک قرار دیا جا سکتا ہے۔ قوم ثمود نے بھی خدائی واحد کی پرستش ترک کرکے ستارہ پرستی اختیار کرلی تھی۔ جب حضرت صالحؑ نے حق کی طرف بلایا تو قوم ثمود نے اسکو قبول نہ کیا اور نشانی کی خواہش کی حضرت صالحؑ نے بحکم خدا پہاڑ میں سے ایک ناقہ پیدا کردیا اور کہا کہ یہ ناقہ ایک نشانی ہے۔ زمین میں اسکو

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ جہاں آنحضرت صلعم نے اقامت فرمائی تھی۔ خیبر جو اسلامی کارناموں میں مشہور ہے۔ مدینہ کی جانب مغرب یہاں سے دو روز کی راہ پر واقع ہے۔ اوسوقت یہ یہودیوں کی جنگی قوت کا مرکز تھا اور شہر میں یہاں پر جنگ عظیم ہوئی تھی۔ جناب امیر علی ابن ابی طالبؓ نے اسکی قلعہ کشائی کی تھی۔ میں نے خیبر جانیکی کوشش کی تھی لیکن راستہ غیر محفوظ ہونیکی وجہ سے وہاں کا عزم ملتوی کیا گیا ۱۲

چرنے دو چشمہ کا پانی ایک دن یہ پئے گی دوسرے روز تم پینا۔ اگر اس اونٹنی کو صدمہ پہنچا تو وہ خدا کے عذاب کا دن ہوگا۔ اس شہر کے مومنین نے حضرت صالحؑ کی دعوت پر لبیک کہا اور دوسری جماعت میں سے نو اشخاص نے حضرت صالحؑ کے قتل کی سازش کی اور انہوں نے ناقہ کی کونچوں کو پے کر دیا۔ جس پر عذاب الٰہی زلزلہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ (پس زلزلہ نے آکر اون کو پکڑ لیا اور وہ اپنی جگہ پر اوندھے رہ گئے) (اعراف ۱۰)

انہوں نے مخفی تدبیر کی تو خداوند عالم نے بھی مخفی تدبیر کی کی اونھیں کچھ خبر نہیں۔ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (یہ ہیں اون کے گھر اور مسکن جو اونکی گنہگاری کے باعث ویران پڑے ہیں۔ اس میں جاننے والوں کے لئے بڑی عبرت ہے) (نمل) قدیم کتب سماوی اگرچہ ان اذکار سے خالی ہیں لیکن قرآن مجید نے قوم ثمود کی بربادی کو پوری وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:۔

"ثمود کے پاس ہم نے اون کے بھائی صالح کو پیغمبر بنا کر بھیجا اوس نے کہا بھائیو خدا کو پوجو۔ اوسکے سوا تمھارا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ تمھارے پاس خدا کی دلیل آچکی۔ یہ اونٹنی تمھارے لئے خدا کی نشانی ہے اس کو خدا کی زمین میں چرنے دو۔ اس کو دق نہ کرو۔ ورنہ ایک دردناک عذاب تم پر آئے گا۔ (صالحؑ نے کہا) اور یاد کرو خدا کے اس احسان کو کہ اس نے عاد کے بعد تم کو خلافت بخشی اور ملک میں تم کو جگہ عنایت کی۔ جسکے میدانوں میں تم پہاڑوں کو کاٹ کر قصر و محل بناتے ہو۔ خدا کی عنایتوں کو یاد کرو اور ملک میں فساد نہ کرتے پھرو۔ اس قوم کے مغرور سرداروں نے اون کمزوروں سے جو ان کی قوم میں مومن تھے پوچھا۔ کیا تم سچ مچ یقین رکھتے ہو کہ صالح اپنے خدا کے طرف سے پیغمبر ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ بیشک صالح جو پیغام لیکر بھیجا گیا ہے اوس پر ہم کو ایمان ہے۔ مغروروں نے کہا تم جس ایمان لائے ہو ہم کو اوس سے انکار ہے اسکے بعد انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور صالح سے کہا۔ اے صالح اگر تم واقعاً پیغمبر ہو تو جس عذاب کے آنے کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو وہ لے آؤ پس زلزلہ نے آکر اون کو پکڑ لیا اور وہ اپنی جگہ پر اوندھے رہ گئے۔ صالح نے

ان کی جانب سے منہ پھیر لیا اور کہا بھائیو۔ میں اپنے خدا کا پیغام یقیناً پہنچا چکا اور تمھاری خیر خواہی کر چکا۔ لیکن تم اپنے خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے" (اعراف ۱۰)

"ثمود نے اپنی سرکشی سے تکذیب کی۔ جب انہوں نے اپنے بدبخت ترین آدمی کو بھیجا پیغمبر خدا نے کہا خدا کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کا خیال رہے۔ انہوں نے جھٹلایا اور اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالی خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر ہلاکی ڈالی اور ان کو برباد کر دیا اور ان کے انجام کا وہ خوف نہیں کرتا" (والضحیٰ) + [illegible] صحیح [illegible]

"جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے صالح کو اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی رحمت سے اس دن کی خواری سے نجات دی۔ بے شک تیرا پروردگار زبردست اور غالب ہے اور گنہگاروں کو چیخ نے آلیا۔ پس اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ گویا کہ وہ کبھی ان میں آباد ہی نہ تھے ہاں ثمود نے اپنے پروردگار کو نہ مانا۔ ہاں ثمود کیلئے ہلاکت ہو" (ہود)

"ثمود کی ہم نے رہنمائی کی۔ انہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی۔ تب رسوا کر دینے والے عذاب کی کڑک نے ان کے اعمال کے سبب ان کو آلیا اور ایمان والوں کو ہم نے نجات بخشی کہ وہ پرہیزگار تھے" (حم سجدہ)

قوم ثمود کی اس بربادی کا واقعہ تقریباً ۱۶۹۰ قبل مسیح میں گذرا۔ وہ گھر جن میں یہ عذاب الٰہی کے نزول کے بعد اوندھے پڑے رہ گئے ان میں سے بعض ہزار ہا فیٹ بلند ایسے تودے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہر تودہ کسی زمانہ میں بجائے خود ایک شکن ہوگا۔ ان میں کے بعض تودوں کی جسامت اتنی ہے کہ وہ ریل کے دس بیس ڈبوں کی لمبی قطار کو اپنے نیچے دبا لینے کے لئے کافی ہیں۔ ان تودوں کی ظاہری سطح بارش اور دھوپ کے اثرات سے ایسی ہوگئی ہے جیسے پیر ملنے کا جہانواں ہوتا ہے اور ان جبال میں جھیوٹے بڑے عجیب و غریب قسم کے گڑھے پڑے ہیں۔ قوم ثمود کے طریقہ ہلاکت کو خداوند عالم نے کڑک اور صدائے مہیب فرمایا ہے۔ بعض مبصرین نے اس سے زلزلہ مراد لیا ہے۔ پس یہ زلزلہ ہی نقش فنا ہوگا۔ اسی لئے جغرافیہ نویس ان سابق وحال لکھتے ہیں کہ

ثمود کے مقامات آتش فشاں مادہ سے لبریز ہیں۔ اسوقت تو جہانتک میں نے غور و تحقیق سے کام لیا یہاں کسی آتش گیر مادہ کے علامات کا وجود نہیں ہے۔ لیکن ان جبال کی ہیئت ترکیبی یہ ظاہر کرتی ہے کہ کسی سخت آتش فشاں مادہ نے ان کو جلا دیا ہے۔ ثمود کے یہ مساکن تقریباً ڈیڑھ سو میل کے دور میں پھیلے ہوئے ہیں اور اکثر غار ایسے ہیں جن میں اندر داخل ہونے کے راستے دکھائی دیتے ہیں۔ سب سے عجیب بات جو یہاں محسوس ہوئی وہ اس مقام کی وحشت و ہیبت ہے۔ دن کے وقت حد درجہ کی ویرانگی اور وحشت ان عمارات پر برس رہی تھی اور آگے قدم بڑھانے کی طرف طبیعت کسی طرح مایل نہیں ہوتی تھی یہاں کسی پرند۔ چرند یا کسی قسم کی آبادی کا سیکڑوں میل تک وجود نہ تھا۔ جو عرب ہمارے ساتھ تھے وہ اصرار کر رہے تھے کہ غروب سے قبل ہم کو اپنے مرکز پر واپس ہو جانا چاہیئے اسواسطے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں غضب الٰہی نازل ہو چکا ہے اور ایسے مقام پر کسی فلاح و سلامتی کی توقع نہیں کرنا چاہیئے۔ ان پہاڑوں کی نچلی سطح پر ریگ اس قدر جم گئی ہے کہ دور سے ان پر مٹی کے تودوں کا گمان ہوتا ہے حالانکہ ان کی ہیئت طبعی ایسے سنگ سے مرکب معلوم ہوتی ہے جس میں لوہے کی بھی آمیزش ہو۔ لیکن مرور دہور نے ان فولادی [illegible] کو بالکلیہ متلاشی اور بوسیدہ کر دیا ہے حتیٰ کہ کوئی ماہر معدنیات اگر یہاں سے لوہا حاصل کرنے [illegible] کرے تو وہ ایک لاحاصل ثابت ہوگی۔ بارش کے پہلو سے ان تودوں کی صورت کہیں تو [illegible] ہو گئی ہے اور بیشتر مقامات پر مستطیل وضع ہو گئی ہے۔ الغرض موسمی اثرات سے ان کی شکلیں ایسی ہو گئی ہیں کہ عظیم الجثہ ناقوں کی جبانی شکلوں کا ان پر دھوکہ ہوتا ہے اور ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ناقہ صالح کی تعزیت کے لئے پہلو بہ پہلو ہزارہا ناقے خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان تودہائے سنگ و خاک کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہر تودہ بجائے خود ایک ڈال سنگ کا معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اگلے زمانہ میں یہاں کے ہر تودے کا اندرونی حصہ رہائش کے طور پر استعمال ہوتا ہو لیکن باستثنائے چند کے جو مدائن صالح کے قرب و جوار میں واقع ہیں کسی میں آمد و رفت کے راستہ کی کوئی علامت اسوقت موجود نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو ہزارہا سال کی بارشوں اور باد سموم نے ان پہاڑوں کو

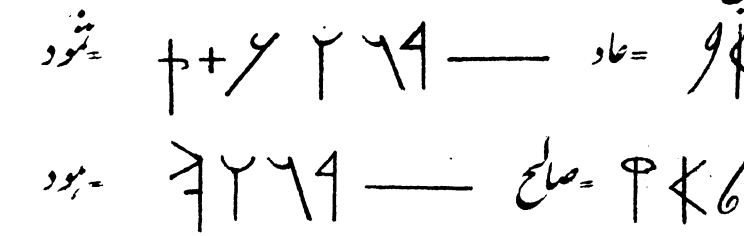
کاٹ کر جا بجا تودوں کی شکل میں ڈھال دیا ہے اور ان میں دَاخلہ کے منافذ بند کر دئے ہیں یا ممکن ہے کہ یہ بند تودے اکابر قوم ثمود کے مقبرے ہوں۔

میں نے منفذ کا لفظ اسلئے استعمال کیا ہے کہ درحقیقت مدائن صالح کے ان غاروں میں جن میں دَاخلہ کے دروازے موجود ہیں اندر جانے کے راستے اسقدر تنگ اور چھوٹے ہیں کہ اندرونی مہتم بالشان دالانوں اور ایوانوں سے ان کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ایک معمولی قد و قامت کا انسان کسی قدر تکلیف کے ساتھ ان راستوں کے ذریعہ سے اندر داخل ہوسکتا ہے اور اندرونی حصّوں میں تاریکی اس قدر زیادہ ہے کہ بغیر برقی مشعل کے راستہ سوجھائی نہیں دیتا ہے۔ یہاں کے غاروں اور مکانوں کی حالت یہ ہے کہ چوکھٹ اور سیڑھیاں اور پرکوہیں اور چھت نیچے ہوگئی ہے پہاڑ کی چوٹیوں پر جو عجیب و غریب منظر نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانوں۔ اونٹوں۔ گھوڑوں اور بکریوں کی شکلیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ جن کے سر نیچے اور ٹانگیں آسمان کی طرف ہیں۔ کسی شکل کا ہاتھ غائب ہے۔ کسی کے سر اور دھڑ کا پتہ نہیں ہے اور یہ تمام اشکال خالص پتھر کی ہیں۔ اسکی تصدیق قرآن مجید کی ان آیات سے ہوتی ہے جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔

"زلزلے نے ان کو آکر پکڑ لیا اور وہ اپنی جگہ پر اوندھے رہ گئے" (اعراف ۱۰)

ان عمارتوں پر کتبات بکثرت منقوش ہیں لیکن یہ زیادہ تر آرامی خطوط میں ہیں اور اس حیثیت سے ان کتبوں سے مفید نتائج حاصل نہیں ہوسکتے کیونکہ یہ زیادہ تر مذہبی نوعیت کے ہیں جن پر عام اشخاص۔ بادشاہوں اور دیوتاؤں کے بالکل غیر مانوس نام کندہ ہیں۔ اکثر کتبے عمارت کے بلند حصّوں پر منقوش ہیں اسلئے بغیر پاڑ بند ہوائے ہوئے ان کے چربے یا صحیح نقل حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ آفتاب غروب ہونے کے قریب تھا اور ہم شوق تحقیق میں اسقدر دور نکل آئے تھے کہ اس بھیانک وادی سے غروب کے پہلے اسٹیشن پر واپس جانیکا خیال بھی دامنگیر تھا اسلئے چند حروف کی نقل طرز تحریر کی یادداشت کی خاطر کرلیگئی چنانچہ ذیل میں اس خطہ کے چند الفاظ درج کرتا ہوں جس سے ناظرین اس امر کا اندازہ کرسکیں گے کہ ثمود کے کتبے کس خط میں

منقوش ہیں۔



بعض غار ایسے بھی ملے جن کے اندرونی حصوں میں انسانی بود و باش کے علامات پائے جاتے تھے دریافت سے معلوم ہوا کہ جب ان وادیوں میں بادیہ نشین عرب سرما کے شدت کی تاب نہیں لاسکتے ہیں تو ان غاروں میں جو اندر سے باوصف وسعت ہر طرف سے بند ہونیکی وجہ سے خوب گرم رہتے ہیں یہ لوگ جاڑوں کا موسم بسر کر دیتے ہیں۔ مدائن صالح کے اسٹیشن کے باہر اسوقت بھی اعراب کی ایک مختصری آبادی موجود ہے جن کے مکانات اینٹ یا پتھر کے نہایت پست بنے ہوئے ہیں۔

غزل

(۱)

از عالیجناب نواب ضیاء یار جنگ بہادر

رفتم بخاک و غیر سنجاکم کند گذر — اے وائے بر زمانہ و یارانِ بے خبر
عبرت کشانِ عالمِ آثار گشتہ اند — ورنہ ہمیں دلست بکام و ہمیں نظر
نیرنگ بیں کہ "صبر" حلاوت برآورد — تلخی دہد بکامِ جہان آب نیشکر
از برگِ گل گلاب و ز شاخش کشند عطر — وز گل حذر کنند ز اندیشۂ ضرر
بر حسن نیت است مدارِ صلاحِ کار — دل را مکن خراب درین است خیر و شر
زر آتشست و کار زر آتش توان گرفت — امانہ آنچنان کہ کند خاک بام و در
دولت بہر کہ نیست ہنر جائی دولت است — وآنرا کہ دولت است بود زیورش ہنر
غرقاب گریہ گشتم و از آہ سوختم — اے عشق بر ہلاک کہ بربستے کمر
یارب چہ بود در نگہش کاتشم گرفت — از دیدہ تا بسینہ و از سینہ تا جگر

ایماں مکن حوالۂ چشمِ بتاں ضیاؔ
دنیا دراز دست و متاعِ تو مختصر

(۲)

از جناب عبد القیوم خانصاحب **باقی** متعلم ایم۔اے (فائنل) کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

جانِ شیریں امیدِ لبِ یار آمد و رفت — چون حبابے کہ ز دریا بہ کنار آمد و رفت

آفرین باد بریں ہمتِ عاشق کز عشق — از ازل تا بہ ابد سینہ فگار آمد و رفت

تا شود باعثِ یک گردشِ چشمش از لطف — میکند جانِ حزیں بر سرِ دار آمد و رفت

عیش یکساعتِ خود ہم نکنم نذرِ فراق — شادم از طالعِ ناسازکہ یار آمد و رفت

وائے دیوانگیٔ شوق کہ شبنم بہ چمن — جلوۂ حسنِ ترا آئینہ دار آمد و رفت

حیف بر زیست کہ گاہی نشد از لطفِ نظر — اے خوشا مرگ کہ یارم بہ مزار آمد و رفت

یاد دارم کہ شبِ وصل نگارم **باقی**
جلوہ بود کہ چو لیل و نہار آمد و رفت

پرواز[1]

از جناب ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی متعلم ایم۔ ایس۔ سی کلیۂ جامعہ عثمانیہ

پرواز کے مسئلہ کا حل دورِ حاضرہ کی اس سائنٹیفک جدّوجہد کا نتیجہ ہے جس نے تمام دنیا کو ایک حیرت میں ڈال رکھا ہے' پرواز کا خیال انسانی دماغوں میں ایک زمانہ سے پرورش پاتا چلا آرہا ہے چنانچہ قدیم زمانہ کی کہانیوں میں اکثر جگہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ آئیکارس نامی ایک شخص تھا جو ہوا میں اُڑتا ہوا اوپر کی طرف چلا گیا اس کا خیال آسمان تک پہونچنے کا تھا لیکن راستے ہی میں آفتاب کی گرمی نے اس کے سفرِ زندگی کا خاتمہ کر دیا' بیسویں صدی تک خیالی گھوڑے اسی طرح ہوا میں دوڑائے گئے لیکن یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آج ہم ان تمام واقعات کو جن کی بنیاد محض تخیل پر قائم کیگئی تھی عملی صورت میں نمودار ہوتے دیکھ رہے ہیں' اگسٹ ۱۹۱۴ء کو جنگِ عظیم کی ابتدا ہوئی' یہ جنگ حیاتِ انسانی کے لئے جس قدر مضر ثابت ہوئی اس کا بیان تحصیلِ حاصل ہے تاہم ہم اتنا ضرور کہینگے کہ طیاروں کے ارتقا کے لئے یہ جنگ بہت مفید ثابت ہوئی' ضرورت ایجادات کی ماں ہے' چند محنتی اور ہوشیار سائنس دانوں نے طیاروں کو ایک عمدہ اور کارآمد صورت میں پیش کرنے کیلئے جان توڑ اور کامیاب کوششیں کیں جنکا

---

[1] یہ مضمون "The Outline of Seience" سے ماخوذ ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ کے اندر اندر اس نئی ہوائی سواری نے ارتقائی صورت اختیار کرلی اور جنگ میں بے حد مفید ثابت ہوئی، جنگ ختم ہوئی مگر سائنس دان برابر اسی کوشش میں لگے رہے کہ اسکو ممکنہ عمدہ صورت میں پیش کیا جائے چنانچہ تھوڑے عرصہ بعد ہم دیکھتے ہیں کہ الکاک، راس اسمتھ اور جان رنولڈ نے بحیرۂ اوقیانوس کو عبور کرلیا ہے اور پھر اس کے بعد ہی لوگ آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ تک بھی جا پہونچے ہیں۔

طیاروں کو سب سے پہلے رائٹ برادرس نے تیار کیا تھا، آرویل رائٹ نے ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو طیارہ میں بیٹھکر بارہ ثانیہ تک ہوا میں چکر لگائی تھی اس طیارہ میں ۱۶ اسپی طاقت کے انجن سے کام لیا گیا تھا اور اسکی رفتار فی گھنٹہ ۳۵ میل تھی، رائٹ برادرس نے ان کے ذریعہ میلوں مسافت طے کی ہے لیکن ۱۹۰۸ء تک ان کی ساخت میں کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوئی اگرچہ ولبار رائٹ نے اسی سال یورپ میں پرواز کے مختلف کرشمے دکھلائے اور انکی وضع میں حتی الوسع بہت سی تبدیلیاں کیں، رفتہ رفتہ انکی ساخت میں ترقی ہوتی گئی اور اب ہمارے پاس ۵۰۰ اسپی طاقت رکھنے والے انجنوں کے طیارے موجود ہیں جو فی گھنٹہ ۲۰۰ میل کی مسافت طے کرتے ہیں۔

تین عظیم الشان پروازیں

رائٹ برادرس کے زندہ جاوید کارناموں کے بیس سال بعد اس میدان میں بہت سے لوگوں نے اپنی جولانیاں دکھلائی ہیں یہانتک کہ بحیرۂ اوقیانوس کو بھی عبور کرلیا اور جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا تک بھی جا پہونچے ہوا بازوں میں الکاک اور براؤن کے نام قابل ذکر ہیں کیونکہ یہ دونوں نیوفونڈ لینڈ سے چلکر بحیرۂ اوقیانوس کو عبور کرتے ہوئے آئرلینڈ تک جا پہونچے ہیں، سمندر کے راستہ سے یہ فاصلہ چھ دن میں ختم ہوتا ہے مگر انہوں نے اسکو صرف سولہ گھنٹوں میں طے کرلیا۔ اسی طرح طیارہ R 34 نے نیویارک سے نارفولک تک کا سفر صرف تین دن میں ختم کیا ہے، تجارتی معاملات میں ایسا نہیں ہوتا، اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ طیارہ ایک خاص وزن کو سنبھال سکتا ہے، اگر کوئی طویل مسافت طے کرنی ہو تو لازمی طور پر زیادہ پٹرول کی ضرورت ہوگی، جب پٹرول کا وزن بڑھ جائیگا تو ظاہر ہے کہ اور اشیاء کو گھٹانا پڑیگا ہاں اگر طیارہ کو تھوڑے فاصلہ پر ٹھہراتے جائیں اور وقتاً فوقتاً پٹرول بھر لیا کریں تو ایسی صورت میں زیادہ سامان کا لیجانا ممکن ہے

ایسی صورتوں میں وقت واحد میں ۲۵۰ میل کا سفر معاشی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوا ہے۔

دوسرا شاندار سفر راس اسمتھ اور کیتھ اسمتھ کا ہے جنہوں نے انگلستان سے آسٹریلیا تک کا سفر کیا ہے یہ سفر تجارتی ہوائی سفر سے خاص تعلق رکھتا ہے کیونکہ اوقیانوسی پرواز کی طرح اسمیں کسی قسم کی کوئی بدنظمی نہیں ہوئی بلکہ یہ طیارہ مختلف مقامات پر نہایت پابندی کے ساتھ ٹھہرتا گیا اور آسٹریلیا پہونچ گیا۔ اس طیارہ میں چند سرکاری کاغذات بھی تھے جو نہایت احتیاط سے ٹھیک وقت پر پہونچا دئے گئے، باوجود ان تمام باتوں کے اس سفر میں بہت سی مشکلات پیش آئیں اسلئے کہ چوکیوں کا معقول انتظام نہ تھا، انگلستان سے نکلنے کے بعد یہ طیارہ فرانس، اٹلی، یونان، اور مصر سے ہوتا ہوا فلسطین عراق جا پہونچا اور خلیج فارس کو عبور کرکے ہندوستان آیا اور پھر قاہرہ سے کیپ ٹون جا پہونچا، اگرچہ مقامی عہدہ داروں نے اس سفر کو کامیاب بنانے کی حتی الوسع کافی کوشش کی اور کافی مدد پہنچائی تاہم سفر کا ایک ثلث حصہ بہت دشواری سے طے ہوا۔

تیسرا عظیم الشان سفر مان رنوالڈ اور براونڈ کا ہے، ان دونوں نے طیارہ میں بیٹھ کر انگلستان سے جنوبی افریقہ تک کا سفر کیا ہے، انگلستان سے مصر تک تو سفر نہایت خیریت سے ہوا لیکن اس کے بعد پھر چوکی کا سوال پیدا ہوگیا، انگلستان سے مصر اور پھر مصر سے ہندوستان تک جو چوکیاں قائم تھیں انکا انتظام اطمینان بخش تھا اس لئے کوئی دقت پیش نہ آئی لیکن اس کے بعد کے حصہ میں بہت سی مشکلات پیش آئیں کیونکہ اس حصہ میں نباتات کی نشو ونما کی قوت ایسی زبردست تھی کہ اگرچہ حبشیوں کے گروہ کے گروہ درختوں اور گھاس پھونس کو صاف کرکے زمین کو مسطح کرنے کے لئے لگائے جاتے تھے لیکن انکی محنت ہمیشہ رائگاں جاتی تھی اس لئے کہ یہ بیچارے حبشی ایک سرے کو صاف کرتے ہوئے جب دوسرے سرے تک جا پہونچتے تو پہلے حصہ میں پھر سے گھاس اگ آتی تھی، کافی محنت اٹھانے کے بعد کہیں اس کا انسداد ہوا لیکن اس کے علاوہ ایک اور دقت یہ تھی کہ اس حصہ میں دیمک بہت زیادہ ہوتی تھی اور منٹوں کے اندر اندر ۳ فٹ سے لیکر ۱۰ فٹ کی بلندی تک کا ایک ڈھیر لگا دیتی تھی جو اس قدر سخت اور مضبوط ہوتا تھا کہ اکثر صورتوں میں اس کو

اکھیڑنے کے لئے ڈائنامیٹ کی ضرورت لاحق ہوتی تھی، چونکہ ان لوگوں کے ساتھ اس قسم کی چیزیں موجود نہ تھیں اس لئے درختوں کے تنوں کی مدد سے ان کو کام لینا پڑا، طیران گاہوں - Aero Dromes کے درمیان اگر جنگل ہوں تو لنگر اندازی کے وقت بہت دقت پیش آتی ہے (بالخصوص مشین ناکارہ ہوجانے کی صورت میں) نیز وسطی افریقہ کی سطح مرتفع پر شدت گرمی کی وجہ سے مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مزدوری بچانے کی خاطر طیران گاہوں کو مختصر بنانے پر تیار کیا جاتا ہے لیکن حرارت اور لطیف ہوا کی وجہ سے طیاروں کو پرواز کرنے کے لئے کافی فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے، غرض رنولڈ اور برانڈ نے راستہ کی تمام دقتوں کا جوانمردانہ مقابلہ کرکے حد درجہ کامیابی کے ساتھ اپنا ہوائی سفر ختم کیا۔

ہوائی راستوں میں موسم کے اثرات

موجودہ زمانہ کے طیارے اپنی اعلےٰ خصوصیات کے اعتبار سے قدیم طیاروں کے مقابلہ میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، یہ طیارے ہوا میں ۲۴ ٹن کا بوجھ سنبھال سکتے ہیں، فی گھنٹہ ۲۰۰ میل کی رفتار سے پرواز کرتے ہیں اور بغیر ٹھیرے ہزار دیڑھ ہزار میل کا فاصلہ طے کرتے ہیں، انکی پرواز کے مقابلہ میں ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی، وہ اس سے بھی اوپر جا سکتے ہیں، آجکل طیارے تقریباً ۱½ میل اوپر ہوا میں جاتے اور ۳۰۰ میل کی رفتار سے اڑتے ہیں، یہ طیارے روزانہ یورپ کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں پہونچ جاتے ہیں اور ممالک متحدہ کو پار کرکے بحر اوقیانوس سے بحر منجمد تک چلے جاتے ہیں۔

پرواز میں موسمی حالات کو خاص اہمیت حاصل ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رود بار انگلستان کو عبور کرنیوالی کشتیاں ناخوشگوار موسم کی وجہ سے طوفان کا شکار ہوجاتی ہیں لیکن ایسے موسم میں طیارہ نہایت آسانی سے لندن سے نکلکر پیرس پہونچ جاتا ہے اور اسے ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے جب فضا کہر آلود ہوجاتی ہے تو کشتیاں اس سے متاثر نہیں ہوتیں مگر طیاروں کی پروازیں دقت واقع ہوتی ہے، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں

کہر سے پرواز میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کہر کے باعث فضا میں دھندلاپن پیدا ہو جاتا ہے اور نیچے کی چیزیں صاف طور پر دکھائی نہیں دیتیں، ایسی حالت میں اگر طیارہ کا انجن بگڑ جائے تو طیارہ چلانے والے اور مسافرین کی جان پر آبنتی ہے اس لئے کہ طیارہ چلانے والا ٹھیک طور پر یہ تبلا نہیں سکتا کہ طیران گاہ، ٹھیک فلاں مقام پر واقع ہے، وہ صرف شبہ اور گمان پر اپنے طیارہ کو نیچے اتارتا ہے، بعض صورتوں میں اس کا قیاس ٹھیک نکلتا ہے لیکن بسا اوقات ایسی صورتوں میں نقصان ہی پہونچتا رہا ہے۔

اس مشکل کو دور کرنے کے لئے لاسلکی پیغام رسانی سے بہت بڑی حد تک مدد لیجاتی ہے چنانچہ لندن اور پیرس کے درمیانی ہوائی راستہ میں طیارہ چلانے والوں کو لاسلکی کے ذریعہ موسمی حالات سے مطلع کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی طیران گاہوں کے نگران کاروں کو بھی اسکی اطلاع دیدیجاتی ہے آجکل کے زمانہ میں پرواز سے قبل طیارہ چلانے والا ہر جگہ سے اپنے راستہ کی موسمی حالت کی خبریں منگوالیتا ہے، باوجود اس کے بعض صورتوں میں ایسے مواقع پیش آتے ہیں جبکہ ان تمام معلومات سے زیادہ انسانی فہم و ذکاوت بے حد مفید ثابت ہوتی ہے، طیارہ چلانے والے کو ہمت، استقلال سمجھ اور اطمینان سے کام لینا پڑتا ہے، اسی سلسلہ میں یہاں ہم ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائیگا کہ کارآمد مادی چیزوں کے مقابلہ میں قدرت کا بہترین عطیہ (یعنی عقل سلیم) کس حد تک مفید ثابت ہوتا ہے، ۱۹۲۱ء موسم سرما کا زمانہ تھا، لندن سے پیرس تک ساری فضا، کہر آلود تھی، ہر جگہ اطلاعیں بھیجدی گئیں کہ فضا، کہر آلود ہے اور ایسی حالت میں ہوائی سفر نہایت خطرناک ہوگا لیکن تین من چلے ہوابازوں کو (جنہیں ایک فرانسیسی اور دو انگریز تھے) یہ سوجھی کہ ایسے نامناسب وقت میں ایک طویل ہوائی سفر کیا جائے۔ چنانچہ اسی وقت لی بورگے کے طیران گاہ سے تین طیارے نکلے۔ فضا، کہر آلود تھی، زمین کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی مگر یہ طیارے ہوا میں اڑے چلے جارہے تھے، فرانسیسی ہواباز کو پائے کے قریب زمین دھندلی نظر آنے لگی۔ ابھی سفر کا تہائی حصہ بھی ختم نہ ہوا تھا کہ اس نے اس مقام پر اتر جانا غنیمت سمجھا اور نیچے

اُتر آیا۔ دوسرا برطانوی ہوا باز بھی رودبار انگلستان کو پار کر کے لینے پر اُتر گیا، لیکن تیسرا ہوا باز پرواز کے شوق میں اوپر کیطرف اڑتا چلا گیا اور زمین سے ہزاروں فیٹ بلند ہوگیا۔ اس کا نام ماکن ٹاش تھا۔

فضا میں لنگر اندازی

ماکن ٹاش کمپاس سوئی کی مدد سے راستہ معلوم کرتا اور لاسلکی کے ذریعہ پیغامات اور اطلاعات وصول کرتے ہوئے ہوا میں اڑتا گیا یہانتک کہ وہ کرائیڈن کے طیران گاہ کے اوپر پہنچ گیا، اگرچہ اب بھی فضاء کہرآلود تھی مگر ماکن ٹاش یہ خیال کر کے کہ نیچے اترتے تک کہر چھٹ جائیگا اپنے طیارہ کو نیچے اُتارنے لگا۔ ارتفاع پیمانے ۳۰۰۰، ۲۰۰۰، ۱۰۰۰ فٹ کے نشان بتلائے لیکن کہر اسی طرح فضاء کو گھیرا ہوا تھا، اس نے طیاری میدان کا ٹھیک مقام معلوم کرنے کی بے حد کوشش کی لیکن سب بے سود ثابت ہوا، نیچے والوں نے طیران گاہ کی نشان دہی کرنے کے لئے ممکنہ کوششیں کیں، موٹروں کے ہارن کھولدئے، خالی بندوقیں سر کیں تاکہ اس آواز سے طیارہ میں بیٹھنے والوں کو کچھ اشارہ ملے لیکن سب یہ تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں ماکن ٹاش کو اب طیارے اور طیارے میں بیٹھنے والوں کی سلامتی کے متعلق سخت پریشانی پیدا ہوئی۔ ان کے خیال میں ایسی حالت میں طیارے کا کسی حادثے سے دوچار ہونا ناگزیر تھا۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب یکایک طیارہ کروڑگیری کی کچہری کے سامنے والے میدان میں صحیح وسلامت اتر آیا، اسکی اصلی وجہ ماکن ٹاش کی ہوشیاری نہیں اور سب سے بڑھ کر اس کا وہ استقلال تھا جسکی وجہ سے وہ صحیح وسلامت زمین پر اُتر آیا۔

لاسلکی اور سول پرواز

زمانہ حال کی ہوابازی میں لاسلکی ٹیلیگرافی اور ٹیلیفونی کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ سول جہاز ران اسوقت تک اپنا سفر شروع نہیں کرتے جب تک کہ انھیں لاسلکی کے ذریعہ موسمی حالات سے پوری پوری واقفیت نہ ہوجائے، ان کا سفر بہت ہی شاندار ہوتا ہے، اگر رات میں کسی مقام پر قیام کا ارادہ ہو تو مقام مذکور پر قبل از وقت اطلاع دیجاتی ہے کہ وہاں روشنی کا کافی انتظام رکھا جائے تاکہ طیارہ

اترتے وقت کسی قسم کی دقت کا سامنا کرنا نہ پڑے، جب فضاء کہر آلود ہوتی ہے تو سول جہازران ہر ہر قدم پر لاسلکی کے ذریعہ خبریں منگواتا ہے اور دوسرے طیارہ والوں سے وقتاً فوقتاً لاسلکی ٹیلیفون کے ذریعہ گفتگو بھی کرتا ہے، ان حالات کے تحت یہ کہنا بیجا نہوگا کہ لاسلکی پیغام رسانی اور پرواز میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

تجارتی طیاروں کی مسافت میں سب سے ضروری بات یہ ہے کہ وہ ایک تو کم خرچ ہوں اور دوسرے زیادہ بوجھ کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک تبدیل کرسکیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ طیارہ بوجھ کو اس وقت تک سنبھالا رہے جب تک کہ اسمیں بیٹھے اُتر آنے کی قابلیت موجود ہے، و نیز تجارتی طیاروں کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ بڑی بڑی بلندیوں پر پرواز کریں، ایک خاص بلندی اسکے لئے کافی ہے۔

اسوقت (۱۹۲۲ء) سب سے بڑا تجارتی طیارہ DH 84 ہے، اسمیں ۴۵۰ اسپی طاقت کا ایک نیپیر انجن کام کرتا ہے، اسمیں ۱۰ آدمی، ایک جہازران اور ایک ملازم بآسانی سفر کرسکتے ہیں، دوسرا طیارہ DH 29 ہے، یہ ایک مانوپلین ہے جس میں ۴۵۰ اسپی طاقت کا ایک Napier (نیپیر) انجن کام کرتا ہے، اسمیں بھی بارہ نشستوں کی گنجایش ہے، DH ساخت کے اور کئی ایک طیارے ہیں جن کی اسپی طاقت ایک ہی ہے لیکن بوجھ اٹھانے کی قابلیت مختلف۔ یہ اختلاف انکی ساخت کے اختلاف کی وجہ ہے۔

موجودہ زمانہ کے طیاروں میں فارمن گولیتھ Farman Goliath سب سے زیادہ مشہور طیارہ ہے اسمیں چودہ نشستوں کا انتظام ہے، اسمیں دو سامسن انجن کام کرتے ہیں جنکی اسپی طاقت ۲۶۰ ہے، آئے دن انکی ساخت اور قابلیت میں نمایاں ترقی ہورہی ہے اور ہر روز نئی نئی خوبیوں کے طیارے تیار ہورہے ہیں جنمیں اسّی آدمی بیٹھ کر سفر کرسکتے ہیں۔

ہوا میں راستہ معلوم کرنا

سول پروازمیں سب سے زیادہ اہم چیز ہوائی چوکیوں کا انتظام ہے، اسی لئے آجکل دس دس اور بیس بیس میل کے فاصلہ پر

چوکیاں بنائی گئی ہیں تاکہ طیارہ کو وقتاً فوقتاً نیچے اتر آنے میں آسانی ہو، پہلے کی طرح اب اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ طیران گاہ کی نشاندہی کے لئے ہوا میں غبارے اڑائے جائیں یا کھوج دیا (سرچ لائٹ) استادہ کئے جائیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ لاسلکی پیغام رسانی اور صحیح نقشوں کی مدد سے طیارہ چلانے والا آسانی سے اپنے راستہ کو پالیتا ہے۔

ہوا میں راستہ دریافت کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں، پہلا طریقہ یہ ہے کہ پرواز کرتے وقت طیارہ چلانے والے کو چاہئے کہ وقتاً فوقتاً وہ نیچے کی زمین کا اپنے نقشہ سے مقابلہ کرتا رہے یہ طریقہ بہت سادہ اور آسان ہے لیکن یہ صرف انہی صورتوں میں ممکن ہے جبکہ فضا کہر آلود نہ ہو اور زمین صاف طور پر دکھائی دیتی ہو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پرواز سے قبل کپاس سوئی کی صحیح کو ٹھیک طور پر معلوم کرکے بالکلیہ اسی کی بتلائی ہوئی سمت کی پابندی کیجائے تو منزل مقصود پر پہونچنا کچھ مشکل نہیں۔ اسمیں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ ہوا کی رو طیارہ کو اپنی سمت سے پلٹ دیتی ہے، جسکی وجہ سے طیارہ چلانے والے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے نقشہ سے بھی مدد لیا کرے تیسرا اور مروجہ طریقہ یہ ہے کہ طیارہ چلانے والا لاسلکی کے ذریعہ ارضی اسٹیشنوں سے سمت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہے اور اپنے نقشہ پر رہ رووں کی سمت کے خطوط کھینچے، جہاں یہ خطوط آپسمیں ایک دوسرے کو قطع کرتے ہیں وہ اس کا ٹھیک مقام ہوگا۔

طیارہ کیسے اڑتا ہے

طیارہ ہوا میں کیسے اڑتا ہے، اسکو سمجھنے کیلئے پتنگ کی مثال سامنے رکھو، پتنگ جب ہوا میں اڑتا ہے تو ہوا کا دباؤ یہ چاہتا ہے کہ اسکو اوپر کی طرف اڑا لیجائے لیکن ڈور اس کی مدافعت کرتی ہے اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پتنگ حالت تعادل میں رہتا ہے، اگر ڈور کو ڈھیلا چھوڑ دیا جائے تو وہ اور اوپر کی طرف جاتا ہے، طیارہ میں ڈور کی بجائے ایک ہوائی پیچ Air Screw ہوتا ہے، جس طرح پتنگ مرکز دباؤ کے بدل جانے کی وجہ سے غوطہ کھانے اور چکر مارنے لگتا ہے وہی حال طیارہ کا بھی ہے، جب مرکز دباؤ بدل جاتا ہے تو وہ بھی غوطہ کھانے اور چکر مارنے لگتا ہے

پرندوں کو بھی اکثر دفعہ انہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے' جس روز ہوا زوروں سے چلتی ہے کوئی اوپر کی طرف اڑ نہیں سکتے' اگر اڑتے بھی ہیں تو جھونک نہیں سنبھال سکتے۔ اسی طرح اترتے وقت بھی ان کو دقت ہوتی ہے چنانچہ ہم نے اکثر اوقات پرندوں کو ہوا میں جھکولے کھاتے دیکھا ہے۔

جہاں تک پرواز کا تعلق ہے طیاروں کے پنکھوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے' مختلف طیاروں میں متعدد پنکھے ہوتے ہیں' انکی تعداد کی بناء پر ان کو یک پنکھی' دو پنکھی اور سہ پنکھی طیارہ کہا جاتا ہے' یہ پنکھے سروں پر کسی قدر مڑے ہوئے ہوتے ہیں اور وہاں انکی موٹائی اور چوڑائی وسطی حصہ کی نسبت زیادہ ہوتی ہے' یہ پنکھے پرواز کی سمت کے بالکل متوازی نہیں ہوتے بلکہ کسی قدر مڑے ہوتے ہیں تاکہ ہوا اسکی نچلی سطح سے گزرنے پائے' ہوا کے زور سے پنکھوں کے اندرونی حصہ پر دباؤ پڑتا ہے اور اوپر کی طرف کھنچاؤ پیدا ہوتا ہے جس میں دو تہائی کھنچاؤ اور تہائی دباؤ ہوتا ہے' طیارہ کے بازوؤں کو ہوا سے متاثر کرنے کے لئے ایک موٹر استعمال کیا جاتا ہے جو بالکل معمولی موٹر کے انجن کے مماثل ہوتا ہے' یہ انجن ہوائی پیچ کو گھماتا ہے اور وہ بازو کو کھینچتا یا ڈھکیلتا ہے تاکہ طیارہ ہوا میں اڑ سکے۔

طیارہ چلانے والا کیا کرتا ہے؟

طیارہ چلانا بہت آسان کام ہے' طیارہ میں دو بیرم استعمال کئے جاتے ہیں ایک کو وہ ہاتھ سے کام میں لاتا ہے اور دوسرے کو پیر سے' اسکے علاوہ اور بہت سے سوئچ وغیرہ ہوتے ہیں جن سے وہ کام لیتا ہے

اندرونی طور پر احتراق پذیر ہوائی انجنوں کا ذکر ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان انجنوں کی خوبیاں اگرچہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں تاہم سب انجن Four stroke یا Otto cycle اصول پر چلائے جاتے ہیں' انجن کا عمل چار تعملات پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر ایک عمل میں فشارہ Piston کو ایک دھکا دیا جاتا ہے پہلا دھکا پٹرولیم گیس اور ہوا کے آمیزہ کو استوانہ میں پہونچاتا ہے' دوسرا گیس کو بھینچتا ہے کیونکہ فشارہ استوانہ کے اندر گھستا ہے' جب گیس کا دباؤ بہت زیادہ ہوجاتا ہے تو استوانہ کے اندر ایک برقی شرارہ داخل کیا جاتا ہے' بھینچی ہوئی گیس بھڑک اٹھتی ہے

اور اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ فشارہ کو استوانہ کے باہر کر دے، اسکی وجہ سے جو توانائی حاصل ہوتی ہے اس سے اڑن پنکھا Fly wheel مسلسل گردش کرنے لگتا ہے، فشارہ پر جو چوتھا عمل ہوتا ہے اس سے محترق گیس استوانے کے باہر نکل آتی ہے، پانچویں دھکے پر پھر وہی پچھلا عمل شروع ہو جاتا ہے، ان دھکوں کو ان کے عمل کے مطابق بالترتیب ان ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ امالی دھکا، پچکا دھکا، احتراق انگیز دھکا اور اخراج خالی کرنے کا دھکا۔ ہوائی انجن تین وضع کے ہوتے ہیں، مقامی، نیم گردشی اور گردشی استوانہ والے۔ موخرالذکر کو بالعموم گردشی انجن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہوا میں پرواز کرنا مقصود ہو تو طیارہ چلانے والا انجن کو کھول دیتا ہے جس سے طیارہ ایک خاص رفتار کے ساتھ زمین پر چلنے لگتا ہے، پھر وہ ضابطہ بیرم کو اپنی طرف کھینچتا ہے اس سے آلہ پرواز متحرک ہوتا ہے اور طیارہ ہوا میں آہستہ آہستہ اڑنے لگتا ہے، اس طرح سے جب طیارہ کافی بلندی پر پہونچ جاتا ہے تو ضابطہ بیرم کو ذرا سا سامنے ہٹا دینے سے وہ بالکل افق کے متوازی چلنے لگتا ہے، جب کسی مقام پر مڑنا مقصود ہوتا ہے تو طیارہ چلانے والا سکانی سلاخ کو اپنے پیر سے دباتا ہے اور پھر اسی وقت ضابطہ بیرم کو اسی سمت میں گھماتا ہے، اگر فقط سکان ہی کے ذریعہ موڑا جائے تو اتنی زیادہ سہولت کا امکان نہیں جتنا کہ سکانی سلاخ کے ساتھ ساتھ ضابطہ بیرم کو استعمال کرنے سے ہوتی ہے، جب موڑنے کا عمل ختم ہو جاتا ہے تو پھر وہی پچھلا عمل شروع کر دیا جاتا ہے جس سے طیارہ ہمواری کے ساتھ پرواز کرنے لگتا ہے، جب نیچے اترنا مقصود ہو تو طیارہ چلانے والا ضابطہ بیرم کو سامنے کی طرف ڈھکیلتا ہے، اس سے آلہ پرواز متحرک ہوتا ہے اور طیارہ نیچے کا رُخ کر کے زمین پر اتر آتا ہے، جب زمین پر پہونچنے میں کچھ فٹ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو طیارہ چلانے والا پھر اس کو افقی وضع میں لاتا ہے اور اب چونکہ انجن ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے اس لئے اسکی رفتار گھٹ جاتی ہے اور وہ آہستگی کے ساتھ زمین پر اتر آتا ہے اور تھوڑی دور زمین پر چل کر ٹھہر جاتا ہے۔

جس وقت طیارے زمین پر اترتے ہیں انکی رفتار انکی بناوٹ کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے، بعض تیس میل فی گھنٹہ اور بعض تقریباً سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اترتے ہیں، بالعموم انکی

اوسط رفتار پچاس پچپن میل فی گھنٹہ ہوا کرتی ہے۔

ہوا میں جنگ

تجارتی اور جنگی طیاروں کی ساخت ایکدوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے تجارتی طیاروں کی بہ نسبت جنگی طیارے بہت تیز رفتار ہوتے ہیں اسلئے کہ ضرورت کے وقت ان کو تیز رفتار سے کافی بلندی تک پرواز کرنا ہوتا ہے چنانچہ جنگ عظیم میں کئی ایک نازک موقعوں پر محض مشین کی خوبی کی وجہ سے کئی ایک طیارہ چلانے والوں نے اپنی جانیں بچائی ہیں۔

فوجی دستہ نمبر ۴۳ کے کیپٹن ایچ۔ ڈبلیو وولٹ نے اپنے مشین کی خوبیوں کی وجہ سے ایک دن میں دشمنوں کے چھ طیاروں کو فاش شکست دی، سٹیک ساڑے دس بجے جبکہ وہ اپنی جماعت کے ہمراہ ہوا میں پرواز کر رہا تھا ایک جرمن طیارہ سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا، وولٹ نے اسکو دھوکہ دیکر نیچے گرادیا لیکن اس اثنا میں دوسرے طیاروں نے اس پر یکدم حملہ شروع کر دیا یہ فوراً اوپر چلا گیا اور یکدم غوطہ مار کر ایک دوسرے طیارہ کو تباہ کر دیا، اسکے بعد اسی طرح چکر لگاتے، غوطہ مارتے اور اوپر جاتے ہوئے اس نے شام کے پانچ بجے تک دشمنوں کے کوئی تیرہ طیاروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس میں ایک تو مشین کی خوبی اور دوسرے طیارہ چلانے والے کی چالاکی اور وقت شناسی کی قابلیت قابل تعریف ہے۔

ایک دوسرا واقعہ مک لیاڈ کے ساتھ پیش آیا تھا، ایک دفعہ پانچہزار فیٹ کی بلندی پر جرمن طیاروں نے اس پر حملہ شروع کر دیا اور آن واحد میں اس کو چو طرف سے گھیر لیا، وہ حیران تھا کہ کیا کرے، اپنی ہشیاری سے اس نے ایسے چکر لگانا شروع کئے کہ دشمنوں کے تمام گولے دشمنوں ہی پر پڑے اور ان میں سے تین تو قطعی طور پر بیکار ہو گئے، اس نے اپنے مشاہد کو ہدایت کر دی کہ وہ برابر گولہ باری کرتا رہے اور خود ان کو دھوکا دینے میں مصروف ہو گیا، اگرچہ اسوقت تک مک لیاڈ کو پانچ زخم آ گئے تھے لیکن اس نے انکی کچھ پروا نہ کی اور چوتھے طیارہ کو بھی زمین پر گرا دیا، بدقسمتی سے دوسرے چار طیارے اس کے سر پر آ پہونچے اور گولہ باری شروع ہو گئی، ایک گولہ مک لیاڈ کے

طیارہ کے پٹرول کے خزانہ پر پڑا اور وہ پھوٹ گیا، اسکے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھکر بازو کے پنکھے پر کھڑا ہوگیا اور اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح ضابطہ پیرم کو اپنی طرف کھینچے، وہ اسی کوشش میں تھا کہ اس کا طیارہ زمین پر پہونچ گیا، اگرچہ اس صورت میں طیارہ برباد ہوگیا لیکن دشمنوں کے طیاروں کی کافی تعداد کو شکست دینے کے بعد! ان واقعات کے بیان سے ہمارا مطلب اس بات کو واضح کردینا ہے کہ جنگی طیارہ میں مشین کی خوبی کے علاوہ اسکے چلانے والے کی ہوشیاری، چالاکی اور دھوکہ دہی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

انسان اور طیارہ

جنگی طیارہ چلانے والے کی نفسیات کا مطالعہ ایک بہت دلچسپ چیز ہے، دوران جنگ میں اس بات کی کافی تحقیق کیگئی ہے کہ تنہا طیارہ چلانے والا بہت لاپرواہوتا ہے، جان پر کھیل جانا اسکے نزدیک بچوں کا کھیل ہے، اس قسم کے آدمی، تنہا، درجنوں طیاروں کو تباہ و برباد کردے سکتے ہیں اور ہوا میں اس طرح بازیاں لگاتے ہیں جس طرح دیوانے کتے گلیوں اور کوچوں میں بے خوف وخطر پھرا کرتے ہیں اور جو کوئی بھی راستہ میں ملجائے اس پر حملہ کر بیٹھتے ہیں۔

دو نشستی جنگی جہاز میں طیارہ چلانے والا کسی قدر احتیاط سے کام لیتا ہے کیونکہ اگر وہ اپنی جان کی پرواہ نہ بھی کرے تو بھی اس کے لئے اپنے ساتھی، مشاہد، کا خیال رکھنا ضروری ہے، اگر مشاہد بھی اس قسم کا آدمی ہو تو پھر کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے۔ اگرچہ ان لوگوں کی کافی حفاظت کیجاتی ہے اور موقعہ پر کافی امداد بھی بہم پہنچائی جاتی ہے مگر بالعموم تمام کام کو یہ اپنی چالاکی اور بہادری سے انجام دیتے ہیں۔

ہوائی جہاز

دنیا میں سب سے زیادہ ہوائی جہاز حکومت برطانیہ کے پاس ہیں، ان جہازوں میں رہائش کا معقول انتظام رہتا ہے وقت واحد میں پچاس سے زیادہ آدمی سفر کرسکتے ہیں، اٹھنے یا بیٹھنے اور رہنے سہنے کا پورا پورا انتظام رہتا ہے، اس قسم کے جہاز لندن سے آسٹریلیا تک کا سفر دو روز میں ختم کرتے ہیں، مالٹا، مصر

عدن، ہندوستان اور سنگاپور ان کے اسٹیشن ہیں، راہ نمائی کے لئے ستون کھڑا کر دئے جاتے ہیں اور اترنے کی جگہ پر سائبان بھی ڈالا جاتا ہے، یہ سائبان کوئی ۲۰ تین ۳۰ سو فٹ لانبا ہوتا ہے اور اسکو تیار کرنے کے لئے کم از کم ایک لاکھ پونڈ درکار ہیں اس کے علاوہ ان مقامات کا انتظام کرنے کے لئے متعدد آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اخراجات میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

لنگر اندازی کے لئے جو ستون تیار کئے جاتے ہیں ان کی لاگت تقریباً پچیس ۲۵ ہزار پونڈ آتی ہے، ان ستونوں کا سر اگر دشتی ہوتا ہے، جب ہوائی جہاز اسکے قریب آتا ہے تو گردشی گنبد کے ایک حصہ سے ایک رسا چھوڑ دیا جاتا ہے، ہوائی جہاز کے سامنے والے حصہ سے بھی اسی قسم کا ایک رسا نکلتا ہے، یہ دونوں ایک دوسرے سے ملجاتے ہیں اور جہاز کے پچھلے حصہ سے دھواں نکلنا شروع ہوتا ہے، ہوائی جہاز کا سامنے والا حصہ گردشی ستون کے کھلے ہوئے حصے میں داخل ہو جاتا ہے اور مسافر آسانی کے ساتھ چڑھ اتر سکتے ہیں، اس صورت میں ہوا کتنا ہی زور سے کیوں نہ چلے کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ہوائی جہاز کا مستقبل

ہوائی جہاز کا مستقبل نہایت شاندار ہے اسلئے کہ اس میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے، آئے دن نئی نئی وضعوں اور قابلیتوں کے طیارے اور ہوائی جہاز تیار ہو رہے ہیں نیز اس ہوائی سواری میں ان تمام آسایشوں کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے جنکے بغیر متمدن ممالک کے باشندوں کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے، رہایش اور خورد و نوش کا معقول انتظام رہتا ہے غرض آجکل کے ہوائی جہازوں میں گھر کی طرح آرام اور اطمینان میسر آسکتا ہے مگر اس کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے چنانچہ مالدار لوگ ہی اس لطف اور آرام سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں مگر قرینہ یہ بتلاتا ہے کہ مستقبل میں یہ سواری امیر اور غریب دونوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی اس لئے کہ یورپ اور امریکہ کے طیارہ بنانے والے رات دن اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح اس سواری کے اخراجات کو بھی ریل اور جہاز کے اخراجات کے قریب قریب لایا جائے تاکہ ان میں کسی قسم کا فرق باقی نہ رہے۔ اور امیر و غریب دونوں اس سے فائدہ اٹھا سکیں، ایک صدی کے اندر اندر اس بات کا عملی صورت میں پیش ہونا یقینی ہے!

ہوائی جہاز کا سب سے نمایاں فائدہ یہ ہے کہ اس میں حادثات کی بہت کم توقع ہے، موٹر، ریل اور جہاز کو ہر ہر قدم پر حادثہ کا خطرہ لگا ہوا ہے لیکن ہوائی جہاز کو سوائے خاص صورتوں کے کسی قسم کے حادثہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ بایں ہمہ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہوا میں پرواز کرنا بہت ہی خوفناک چیز ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے اس لئے کہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۴ء کی برطانوی رپورٹ حادثات کے دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ موٹر ریل اور جہاز وغیرہ سے اگر سو میں تین آدمی حادثہ کا شکار ہوئے ہیں تو ہوائی جہاز میں دس ہزار میں صرف تین آدمیوں کو کچھ نقصان پہونچا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز کس قدر آرام دہ اور اطمینان بخش سواری ہے نہ تو اس میں خود کی جان کا کوئی اندیشہ ہے اور نہ دوسرے کی۔ انگریزی زبان کے مشہور افسانہ نگار ایچ۔ جی ویلس نے اپنے مضمون "میری پہلی پرواز" میں ہوائی جہاز کے ارتقاء اور اسکی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے اس چیز پر کافی زور دیا ہے کہ ہوائی جہاز میں ان تمام خطرات کا کوئی امکان نہیں جو موٹر، ریل یا جہاز میں ہوتے ہیں۔

یوں تو ہوائی جہاز کے بیشمار فوائد ہیں جن کو اگر ہم بیان کرنا چاہیں تو ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی تاہم ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ معلومہ ذرائع نقل و حرکت میں ہوائی جہاز کو ممتاز حیثیت حاصل ہے، کم وقت میں طویل مسافت طے کرنا اسی کا حصہ ہے، سال و ماہ تو کجا چند دن کے اندر اندر ہم تمام دنیا کا گشت لگا سکتے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ کاروبار میں کس قدر آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں، اگرچہ اب تک ٹپہ رسانی کا کام ہوائی جہاز کے ذمہ نہیں کیا گیا ہے تاہم ہر ایک حکومت ہوائی جہازوں ہی سے سرکاری ٹپہ رسانی کا کام لیتی ہے، جب عام طور پر خطوط رسانی کا کام بھی ہوائی جہاز سے لیا جانے لگے گا تو ظاہر ہے کہ کاروبار میں کس قدر ترقی ہوگی اور ہم کس آسانی کے ساتھ دنیا کے ایک گوشہ میں بیٹھکر دوسرے خطہ والوں سے خط و کتابت کر سکینگے، یہ تمام باتیں جو کسی زمانہ میں خواب و خیال تصور کیجاتی تھیں آج ہمارے سامنے حقیقی اور عملی صورت میں پیش ہیں اور ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خوش آیند خواب کی تعبیر خواب سے بھی زیادہ دلچسپ اور دلفریب ثابت ہوگی!

موجِ مضطر

رودِ موسیٰ کو طغیانی میں دیکھکر

از محمد جلال الدین اشک

قلزمِ بیقرار کی ایک تو موجِ مضطرب — شاہدِ کائنات کا چین جبیں کہیں جسے

تیرا یہ غیظ یہ غضب ہیبتِ حق کا اک نشاں — کانپ رہا ہے آج وہ چرخِ بریں کہیں جسے

تیرے خرامِ ناز سے دشت و جبل میں شور ہے — تیری جبینِ پرشکن آئینۂ جلالِ حق

تیرا یہ پیچ و خم نہیں دامِ نگاہِ نکتہ بیں — دیکھ رہی جو تجھ میں ہے قوتِ لایزالِ حق

گوشۂ کوہسار میں تجھکو نہ کچھ سکوں ملا — فطرتِ بیقرار کو تیری قرار اب کہاں

زور پہ ہے جنوں ترا اشتوق بھی ہے فزوں ترا — جسمِ نزار اب کہاں پائے فگار اب کہاں

قلزمِ بیکنار تک جائیگی تو ضرور اب — تیرا یہ عزمِ مستقل تیری جبیں سے ہے عیاں

اس دلِ دردمند سے ہدیۂ دعا کا کر قبول — تجھکو یہ سازگار ہوں تیری جنوں خرامیاں

ایکناتھ

مرہٹی زبان کا ایک جلیل القدر شاعر

از جناب شیخ چاند صاحب معلم ایل ایل بی (کلیہ جامعہ عثمانیہ)

پٹن (ضلع اورنگ آباد) دکن کا ایک بہت قدیم شہر ہے۔ زمانۂ ماقبل تاریخ کی مذہبی روایات میں بھی کہیں کہیں اس کا نام اور تذکرہ ایک تحقیقات کرنے والے کی نظر سے ضرور گذرتا ہے۔ کسی زمانے میں لوگ اسے دکن کا بنارس کہتے تھے۔ آج کل بھی اسکی اہمیت میں اس لحاظ سے کہ یہ مہاراشٹر کی ایک مشہور اور متبرک زیارت گاہ ہے کچھ زیادہ کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

ہم نے اس مشہور اور قدیم شہر کے متعلق بہت سارے مستند اور تاریخی واقعات جمع کئے ہیں۔ جن کا ذکر اس موقع پر چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ مضمون ہذا کا مقصد ناظرین کو وہاں کے ایک سادھو شاعر (ایکناتھ) سے روشناس کرانا ہے جس نے کسی زمانہ میں اہل مہاراشٹرا کی اخلاقی بیماریوں اور روحانی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے بڑی جد وجہد کی تھی اور جس نے مرہٹی زبان (جو اسوقت تک صرف عوام کی زبان سمجھی جاتی تھی) کے علم ادب کو اپنے جواہر افکار سے مالامال کر دیا تھا۔

ایکناتھ مہاراشٹر کے ایک مشہور سادھو بھانودا س (جن کو بھکتوں کا سرتاج کہا جاتا ہے)

کی اولاد سے ہے یہ ۱۴۵۰ء کے مطابق ۱۵۴۰ء میں خاص پٹن کے شہر میں پیدا ہوا۔ ایکناتھ ابھی بچہ ہی تھا کہ والدین کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس طرح وہ اور کئی مشاہیر عالم کی طرح دنیا میں یتیم اور بے سہارا رہ گیا۔ خوش قسمتی سے اس کا دادا زندہ تھا دادی بھی بقید حیات تھی۔ ان دونوں نے ایکناتھ کو اپنے جوانمرگ عزیز بیٹے کی نشانی سمجھ کر بڑی محبت اور شفقت سے پالا۔ اسکی تعلیم اور تربیت نہایت توجہ سے کی۔ ایکناتھ کا دادا ایک جہاندیدہ آدمی تھا۔ اسکی دوربین نگاہوں نے ایکناتھ کی افتاد طبیعت کا اچھی طرح اندازہ لگا لیا تھا۔ ایکناتھ کا رجحان بچپن ہی سے سنجیدہ اور گمبھیر باتوں کی طرف بہت زیادہ تھا۔ ایکناتھ کی عمر جب چھ سال کی ہوئی تو منجھ کے رسوم ادا کئے گئے اور اس کے بعد ہی اسے سنسکرت کی تعلیم دینے کے لئے ایک پنڈت مقرر کیا گیا۔ ایکناتھ بچپن ہی سے ذہین تھا۔ اسکی ذہانت کو دیکھ کر بعض اوقات اس کا معلم حیران رہ جاتا تھا اس کے دادا اور دادی جب معلم کی زبانی اپنے کمسن پوتے کی تعریفیں سنتے تو جامہ میں پھولے نہ سماتے۔

زمانہ اپنی مشہور تیز رفتاری کے ساتھ گذرتا چلا گیا۔ ایکناتھ کی عمر بارہ سال کی ہوگئی۔ اب علم حاصل کرنے کا شوق اسکے دل میں حد کمال کو پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ پٹن میں اسکا علمی شوق پورا نہیں ہوسکتا۔ پس وہ ایک روز چپکے سے اپنے گھر والوں کو اطلاع کئے بغیر کہیں نکل گیا۔ اسکا دادا اور دادی ایکناتھ کے اس طرح گھر سے غائب ہوجانے سے سخت پریشان ہوئے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ علم کے شیدائوں کو فانی محبتوں سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ ایکناتھ علم کا شیدا تھا۔ اسکی تشنگی پٹن میں فرو نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ پٹن کو خیرباد کہہ کر سیدھا دولت آباد (دیوگری) گیا۔ دولت آباد احمد نگر کے نظام شاہیہ خاندان کی قلمرو میں داخل تھا اس وقت اس سلسلہ کا مشہور بادشاہ برہان نظام شاہ تخت سلطنت پر متمکن تھا۔ یہاں ایک مشہور سادھو جنار دھن نامی رہا کرتے تھے جنکی شہرت ایکناتھ نے پٹن میں سنی تھی۔ جنار دھن کے متعلق جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چالیس گاؤں کے دیسپانڈے کی اولاد سے تھے اور اس زمانہ میں جبکہ ایکناتھ دولت آباد آیا ہے وہاں صیغۂ حساب میں کسی خدمت پر مامور تھے۔ جنار دھن اپنے زمانے کے مشہور اہل قلم سے ہیں۔ انکی تصانیف کے کچھ حصے ابتک پائے جاتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی ایک

عام روایت کا تذکرہ کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا جس کے بموجب جنار دھن کو ایک خدا رسیدہ مسلمان[1] بزرگ کا مرید بتایا جاتا ہے۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا روایت کچھ زیادہ خلاف قیاس نہیں ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہ صداقت پر مبنی ہو۔ جنار دھن کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ہر جمعہ کو بلا ناغہ ایک خاص پہاڑ پر جایا کرتے تھے اور وہاں ان کے مرشد انھیں علم باطنی کے نکات سمجھایا کرتے تھے۔

ایکناتھ دولت آباد پہنچکر جنار دھن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ان کے سامنے اپنے علمی ذوق وشوق کا حال بیان کیا۔ جنار دھن اس کی باتوں سے بہت خوش ہوئے اور اسے اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دیدی۔ ایکناتھ مسلسل چھ سال تک ان کی خدمت میں رہا۔ اس طویل عرصہ میں اس نے ایسی سخت ریاضتیں کیں اور گیان دھیان میں کچھ ایسا محو رہا کہ بالآخر جنار دھن کو بھی اس کا قائل ہونا ہی پڑا۔ اب انہوں نے ایکناتھ سے کہا کہ کسی دن وہ اسے اپنے مرشد سے ملائیں گے۔ اس بات سے ایکناتھ کو بڑی مسرت ہوئی اور وہ بیچینی سے جمعہ کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ یہی ایک ایسا زور تھا جس میں جنار دھن اپنے مرشد سے ملا کرتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے انتظار کی گھڑیاں تمام ہوئیں اور جمعہ آیا۔ ایکناتھ علی الصبح جنار دھن کے پاس پہنچ گیا اور انہیں اپنا وعدہ یاد دلایا۔ جنار دھن نے اسے اپنے ساتھ لیا اور پہاڑ کی طرف روانہ ہوئے۔

مذہبی روایات میں ایکناتھ کی اس مسلمان بزرگ سے پہلی ملاقات کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنار دھن اور ایکناتھ جب پہاڑ پر پہونچے تو تھوڑی دیر بعد وہ بزرگ وہاں آئے۔ ان کے ساتھ ایک مقدس گائے بھی تھی۔ بزرگ نے جنار دھن کو اس کا دودھ دوہنے کا اشارہ کیا۔ عقیدتمند مرید کو کیا عذر ہوسکتا تھا۔ جنار دھن نے کمال عقیدت سے دودھ دوہکر برتن مرشد کے آگے رکھدیا۔ مرشد نے اس میں روٹی چوری اور کھانے میں مشغول ہوگئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ازراہ شفقت جنار دھن کو بھی اس کھانے میں شریک کیا۔ جب کھانا ختم ہوا تو خالی برتن

---

[1] ہیتی اس مسلمان بزرگ کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ حقیقت میں دتاتریہ (ایک دیوتا ہے) تھا۔

ایکناتھ کے حوالے کیا گیا تاکہ وہ اسے کسی چشمے پر لیجا کر دھو ڈالے۔ ایکناتھ اس عزت افزائی پر اپنے دل میں بہت خوش ہوا اور اسے ایک چشمے کے کنارے لیگیا۔ یہاں اس نے اس جھوٹے برتن میں تھوڑا سا پانی ملایا اور اسکو بڑی عقیدت سے پی گیا۔ مشہور ہے کہ اس برتن کو منہ لگانے کے قبل اسکی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے "مجھے یہ محبت بھرا جام پینے دو۔ آج مجھے ان تمام مصائب اور تکالیف سے نجات ملی ہے جو منزلِ مقصود تک پہنچنے میں انسان کو برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ میں نے نجات کا سیدھا راستہ پالیا ہے۔ آج تمام کائنات میں مجھ سے بڑھکر کوئی خوش نصیب نہیں ہے"[1]۔ اس واقعہ کے بعد جنار دھن نے اپنے مرشد سے ایکناتھ کی سفارش کی۔ انہوں نے کمال مہربانی سے اسے اپنے حلقۂ مریدین میں داخل کر لیا۔ اس خدا رسیدہ بزرگ کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کے ساتھ ہی ایکناتھ پر ایک عالمِ خود فراموشی طاری ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت سرمستی کے عالم میں اسکی زبان سے یہہ الفاظ نکلے۔

"تعریف کرتا ہوں میں جس ایک کی اس کو اپنے ظاہر اور باطن میں دیکھتا ہوں۔
وہ ایک خاص رنگ میں ہے۔ کسی رنگ میں بھی نہیں اور پھر ہر رنگ میں ہے۔ وہ
دنیا میں ہے۔ بیابان میں ہے اور نرنجن میں بھی ہے"[2]۔

ایکناتھ پر اب تصوف کا رنگ بہت گہرا چڑھ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ جپ تپ اور گیان دھیان میں مشغول رہنے لگا۔ وہ ایک سلیم الفطرت انسان تھا۔ اس نے بہت جلد اس حقیقت حقہ سے آگاہی حاصل کر لی کہ "صرف[3] یوگ اختیار کرنے سے خدا نہیں مل سکتا۔ بلکہ بھکتی (حسن عمل) بھی ضروری ہے"۔ عمل کی اہمیت کے متعلق ایکناتھ کے خیالات خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہیں۔ وہ جگہ جگہ شاعرانہ انداز میں عمل کی ضرورت اور اہمیت بیان کرتا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ لکھتا ہے

"تم نے مرشدِ کامل کی مہربانی سے روحانی علوم تو حاصل کر لئے۔ لیکن یاد رکھو! عمل سے

---

[1] بھکتی باب ۱۳۰ مصرع ۱۹۱-۱۹۳ [2] ایکناتھ چرتر۔ صفحہ ۵۲ پر ایکناتھ کا ایک ابھنگ درج ہے جس کا یہ ترجمہ ہے [3] و [4] بھکتی باب ۱۴ مصرع ۱۹-۲۳۔

کبھی کنارہ کشی نہ کرنا۔ یوگی اپنے احساسات اور جذبات کو کچل دیتے ہیں اور اس طرح وہ شہوت انگیز باتوں کو بھلا دینے میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن حسن عمل کے بغیر وہ خدا کا جلوہ ہرگز نہیں دیکھ سکتے اسمیں شک نہیں کہ وہ یوگ کے ذریعے حیرت انگیز روحانی قوتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن جب تک حسن عمل نہو وہ خدا کو نہیں پا سکتے"۔

ایک اور جگہ وہ عمل کی اہمیت پر اس طرح زور دیتا ہے۔

"وہ احساسات اور جذبات جن کو یوگی دباتے اور کچلتے ہیں ان کو بھگت ( ) خدا کی عبادت میں صرف کرتے ہیں۔ جذبات کو برانگیختہ کرنیوالی باتوں کو یوگی ترک کرتے ہیں لیکن بھگت ان کو خدا کی نذر کرتے ہیں۔ یوگی جسمانی تکالیف برداشت کرتے ہیں لیکن بھگت ایسا نہیں کرتے۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں خدا کی نذر کر کے دائمی نجات حاصل کرتے ہیں"۔

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ یوں ادا کرتا ہے۔

"علم عمل کے رحم سے پیدا ہوا۔ علم کی شان عمل سے ہے۔ عمل ہی تو ہے جس نے علم کو شان بخشی۔ عمل علم اور ویراگ (ترک دنیا) کی جڑ ہے عمل کے بغیر انسان ظلمات میں گھر جاتا ہے اگر جڑ ہی نہو تو پھل کیسے پیدا ہو سکتے ہیں"۔

ایکناتھ کو جنار دھن سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ سفر حضر میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ جنار دھن جب ناسک ترمبک گئے تو وہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ یہاں اسکی ملاقات مشہور پنڈت چندر بھٹ سے ہوئی جو اس زمانہ میں مذہبی علوم کا بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ جنار دھن کی ہدایتوں کے مطابق اس نے کئی طویل سفر کئے اور ملک ہند کی تمام مشہور زیارت گاہوں کی زیارت کیں ایکناتھ جن جن مشہور مقامات پر پہنچا ہے ان تمام کا اس مقام پر تفصیل سے ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ناظرین کو اس امر کا اندازہ ہو سکے کہ اس نے صداقت اور حقیقت کی تلاش میں کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔

وہ عرصے تک دولت آباد کے قریب کوہ سلابھا پر تپشیا میں مشغول رہا۔ اس نے

پورنا، پیوشنی، تاپتی نربدہ وغیرہ جیسے مقدس دریاؤں میں اشنان کیا۔ اوس نے اونتی کے مقام پر مہالیشور کا دلچسپ نظارا بھی دیکھا۔ منمڑا، گوکل، بندرابن بھی بڑے شوق سے گیا۔ ان مقامات پر کئی نامی گرامی پرہیزگاروں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ یہاں سے نکل کر وہ بنارس پہنچا۔ بنارس میں اسنے پورے پانچ دن گذارے۔ بنارس سے نکلا تو سیدھا پریاگ (الہ آباد) پہنچا۔ یہاں کے مشہور سنگم میں اشنان کر کے گیا، اجودھیا اور وہاں سے بدری ناتھ اور ہمالہ کی طرف جا نکلا۔ دریائے بھاگرتی کے منبع میں اشنان کر کے دوارکا آیا۔ وہاں سے پوربی گیا۔ دریائے گومتی میں اشنان کر کے نرسی مہتا کے وطن جوناگڑھ کی طرف جا نکلا۔ جوناگڑھ سے وہ پٹن کی طرف لوٹا۔ اور چھوٹی موٹی زیارت گاہوں کی زیارتیں کرتے ہوئے ۲۵ سال کی عمر میں خیر و عافیت پٹن پہنچ گیا۔ پٹن پہنچکر اس نے اپنے مرشد جنار دھن کے ایما کے مطابق دولت آباد آنے کا ارادہ نہ کیا۔ بلکہ یہیں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گیا۔

اس مقام پر ایک خاص واقعہ کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو نہ صرف تاریخی اہمیت کے لحاظ سے قابل ذکر ہے بلکہ اس سے ایکناتھ کے کیریکٹر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مہپتی لکھتا ہے کہ "ایکناتھ اپنے قیام دولت آباد کے زمانہ میں ایک دفعہ مسلمانوں کی طرف سے بحیثیت سپاہی کے ایک لڑائی میں شریک رہا تھا"۔ داخلی شہادت سے بھی مورخ مذکور کے بیان کی تائید ہوتی ہے چنانچہ ایکناتھ کی تصانیف میں عربی فارسی کے ایسے الفاظ اور اصطلاحات ملتے ہیں جن سے صرف اہل دفتر ہی واقف ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایکناتھ کو حکومت کے کاروبار سے کچھ تعلق نہ ہوتا تو وہ اس قسم کے الفاظ کے استعمال پر قادر نہ ہو سکتا۔

اب ذرا ایکناتھ کے دادا اور دادی کا حال سنئے۔ یہ دونوں عرصہ دراز تک اپنے عزیز پوتے کے حالات سے قطعاً بیخبر رہے۔ کئی سال کے بعد انھیں خبر لگی کہ ایکناتھ دولت آباد میں جنار دھن کے ہاں فروکش ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی یہ دونوں دولت آباد پہنچے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایکناتھ شمالی ہند کی زیارت گاہوں کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ دولت آباد میں جنار دھن سے انکی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ان کو بہت کچھ اطمینان دلایا کہ ایکناتھ کی آخری

زیارت گاہ پٹن ہے وہ وہاں ضرور آئیگا۔ لیکن انکی نہ ملاقات نہ ہوئی۔ آخر خبار دہن نے ایکناتھ کے نام ایک خط لکھکر ان کے حوالہ کیا اور ان سے کہا کہ پٹن جاکر اس کا انتظار کریں۔ جب وہ وہاں آجائے تو یہ خط اُسے دیدیں۔ یہ بیچارے مصیبت کے مارے پٹن واپس ہوئے اور ایکناتھ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ کئی دنوں کے بعد ایکناتھ اتفاق سے انہیں دریائے گوداوری کے کنارے اشنان کرتا ہوا نظر آیا۔ اگرچہ ایکناتھ کی صورت اور قد و قامت میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی تھی لیکن انہوں نے اسے پہچان لیا۔ اس طرح برسوں کے بچھڑے آخر مل ہی گئے۔ انہوں نے ایکناتھ کو جنار دہن کا خط دیا۔ خط دیکھ کر اس نے تہیہ کرلیا کہ مستقل طور پر پٹن ہی میں قیام کرے چنانچہ وہ زندگی بھر وہیں رہا۔ اس کا مندر ابتک پٹن میں زیارت گاہ خاص وعام ہے۔

ایکناتھ کے پٹن پہنچنے کے کچھ دنوں بعد اس کی شادی ایک سلیقہ شعار اور اطاعت گزار لڑکی سے کردی گئی۔ اس نیک بخت کا نام گرجا بائی تھا۔ اسکے کچھ حالات آئندہ سطور میں بیان کئے جائیں گے۔ یہاں اس بات کا اشارہ کردینا ضروری ہے کہ گرجا بائی حقیقی معنوں میں ایکناتھ کی شریک زندگی تھی۔ اس نے ان اعلیٰ مقاصد کی تکمیل میں جو ایکناتھ کے پیش نظر تھے اسکی ہر طرح مدد کی۔ ایکناتھ کے چند اعزہ بیجاپور میں رہا کرتے تھے۔ شادی کے موقع پر وہ پٹن آئے۔ ان لوگوں کے ساتھ یدہا نامی ایک شخص بھی تھا جسے آگے چلکر ایکناتھ سے ایسی عقیدت پیدا ہوگئی کہ وہ مدت العمر اسکی خدمت گزاری میں مصروف رہا۔

شادی کے بعد ایکناتھ کی زندگی بڑے آرام اور اطمینان سے گزرنے لگی۔ لیکن زمانے کو قرار کہاں۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے دادا دادی اسے داغ مفارقت دے گئے۔ ایکناتھ کو بڑا صدمہ ہوا۔ اس نے تجہیز و تکفین کے مقررہ رسوم (اگرچہ وہ ان کو چنداں ضروری نہیں خیال کرتا تھا) ادا کئے اور صبر شکر کرکے بیٹھ رہا۔ ابھی یہ صدمہ تازہ ہی تھا کہ اسے جنار دہن کے انتقال کی خبر ملی۔ ایکناتھ کو اپنے شفیق اور مہربان استاد کی دائمی مفارقت سے جو صدمہ پہنچا ہوگا اس کا اندازہ کرنا بہت دشوار ہے۔ اس کو وہی لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنہیں کبھی ایسا تلخ تجربہ حاصل ہوا ہو

پٹن میں ایکناتھ کی ساری عمر عبادت الٰہی میں گزری ۔ وہ خدا کا ایک عبادت گزار بندہ تھا ۔ اس نے ایسی سخت ریاضتیں کیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اسے گرد و نواح میں خاصی شہرت حاصل ہوگئی ۔ لیکن خدا کی عبادت کے ساتھ اس نے مخلوق کی خدمت کو بھی اپنا مقصدِ زندگی بنائے رکھا ۔ وہ عملیت کا شیدا تھا ۔ اسکے خیال میں ایسی عبادت جس کے ساتھ حسنِ عمل نہ ہو کوئی خاص وقعت نہیں رکھتی تھی ۔ ایکناتھ کی یہی وہ خصوصیت ہے جس سے اسے دوامی شہرت اور غیر معمولی عظمت حاصل ہوئی ۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں مذہب کی حالت بہت ابتر تھی ۔ برہمنوں نے اپنی خود غرضیوں سے اسکی صورت کو بالکل مسخ کر دیا تھا ۔ خدا اور بندے کے درمیان ایسے حجابات پڑ گئے تھے جن کو اٹھانے کی کسی معمولی آدمی کو جرأت نہ ہوتی تھی ۔ عوام میں سے کوئی شخص مذہب کے معمولی رسومات کو بھی بغیر برہمنوں کی امداد کے ادا نہ کر سکتا تھا ۔ سنسکرت جس میں مذہبی علوم مدفون تھے صرف برہمنوں کے لئے مخصوص تھی ۔ ان کے علاوہ اس زبان کو کوئی حاصل نہ کر سکتا تھا ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عوام مذہب کے ابتدائی اصولوں سے بھی بیخبر ہو گئے ۔ صرف چند مذہبی رسومات تو کسی نہ کسی طرح ادا کر لئے جاتے تھے لیکن مذہب کی اصلی رُوح سے کسی کو واقفیت نہ تھی ۔ یہ صورت حال ایکناتھ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے لئے ناقابل برداشت تھی ۔ اس نے بڑی اخلاقی جرأت سے کام لے کر تہیہ کیا کہ ان مذہبی حقائق کو جو صرف سنسکرت زبان کی کتابوں میں پوشیدہ تھے مرہٹی میں منتقل کرے ۔ ایکناتھ سے پہلے اس کام کو ذانیشور نے شروع کیا تھا ۔ لیکن اسے کوئی قابل لحاظ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی ۔ اب ایکناتھ نے اس کام کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا ۔ اسے بڑی بڑی دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ برہمن اپنی پراسرار عظمت کے طلسم کو ایکناتھ کے ہاتھوں ٹوٹتا ہوا دیکھ کر سخت برہم ہوئے ۔ یہ برہمی پٹن اور اس کے مضافات تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس کے اثرات بنارس تک پہنچے ۔ بنارس کے اکثر مذہبی عالم اور سادھو ایکناتھ کے جانی دشمن بن گئے ۔ اس عام مخالفت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ خود ایکناتھ کا عزیز بیٹا ہری پنڈت جو سنسکرت کا جید عالم سمجھا جاتا تھا اس سے اس بارے میں سخت ناراض ہوا اور یہ ناراضی اس حد تک بڑھی کہ بالآخر

اس نے ایکناتھ سے قطع تعلق کر لیا اور بنارس چلا گیا۔ لیکن ایکناتھ کے آہنی استقلال پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنے کام میں ہمہ تن مصروف رہا۔ اس سلسلے میں اسکی جد وجہد انتہائی تعریف اور ستائش کے لائق ہے۔ مرہٹی زبان اس کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی ایکناتھ نے سنسکرت کی کئی اہم کتابوں کا مرہٹی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمے مرہٹی شاعری کی ایک بیش بہا دولت ہیں۔ ان کی بدولت عوام کے قلوب زیور علم سے آراستہ ہونے لگے اور وہ مذہبی حقائق کو برہمنوں کی امداد کے بغیر اچھی طرح سمجھنے لگے۔ اس زمانہ میں وہ عوام کے سامنے اکثر اوقات کرتن (ایسا وعظ جو نظم میں کیا جائے) کرتا اور اس طرح ان کو مذہب کی روح سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع دیتا اس کے کرتن پٹن تک محدود نہیں رہے۔ بلکہ اس نے پنڈھرپور اور الندی وغیرہ کے دورے بھی کئے جن میں اسے عوام کو اپنے کرتن سنانے کا خوب موقع ملتا تھا۔ پنڈھرپور تو وہ اپنے پڑوادا بہانودس کی تقلید میں اکہاڑ کے مہینے میں ہر سال جایا کرتا تھا۔ جب ایکناتھ اپنے تبلیغی دوروں کے لئے نکلتا تو عوام کو بڑی سرعت سے اس کی خبر لگ جاتی اور وہ ہر منزل پر شام کے وقت ہزارہا کی تعداد میں اس کے گرد جمع ہو جاتے اور بڑے ذوق وشوق سے اس کے دلاویز کرتن سنتے جو صاف ستھری زبان اور دلکش لب ولہجے میں ہوا کرتے۔

ایکناتھ کو عوام سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر انسان کو خدا کا بندہ اور اپنا بھائی تصور کرتا تھا۔ ذات پات کے امتیازات کی اسکے پاس کوئی وقعت نہیں تھی۔ نیچ ذات کے ادنیٰ گنوار اور سنسکرت کے جید عالم میں اسے اس لحاظ سے کہ دونوں انسان ہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ اسکا برتاؤ ہر مذہب وملت کے آدمی کے ساتھ بالکل یکساں تھا۔ اس پاکیزہ اصول پر عمل کرنے کا نتیجہ تھا کہ ہندو، مسلمان، دھیڑ، چمار سب اسکی بزرگی کو تسلیم کرتے تھے اور اس سے بڑی محبت رکھتے تھے۔

اس مقام پر ایک دو دلچسپ واقعات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے ان سے اسکی سیرت پر خوب روشنی پڑتی ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ ایکناتھ گوداوری سے اشنان کرکے گھر واپس آرہا تھا۔ وہ جب شہر کے دروازہ کے قریب سے گزر رہا تھا تو پٹھومیر صاحب نامی کسی مسلمان بزرگ نے جو وہاں بیٹھے ہوئے تھے نادانستگی سے اس پر تھوک دیا۔ ایکناتھ کو بزرگ موصوف کی اس حرکت پر ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔ وہ سیدھا گوداوری گیا اور اشنان کرکے گھر لوٹا۔ مہیپتی جو قدیم مستند سوانح نگار ہے اس واقعہ کو بیان کرکے لکھتا ہے۔ "جب[1] اس بے خبر آدمی نے نادانستہ طور پر تھوکا تو ایکناتھ کو مطلق غصہ نہ آیا"۔ ایک جدید سوانح نگار پانگارکر کی کتاب میں یہی چھوٹا سا واقعہ عجیب وغریب انداز میں لکھا ہوا نظر آیا ملاحظہ ہو کہ پانگارکر صاحب نے مذکورۂ بالا واقعہ کو کس طرح توڑ مروڑ کر بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں

"پٹن[2] میں ایکناتھ کے گھر سے ندی کو جو راستہ جاتا تھا اس پر ایک سرائے واقع تھی اس سرا میں ایک مسلمان رہا کرتا تھا۔ اسکی عادت تھی کہ وہ ہر آنے جانیوالے ہندو کی خوب خبر لیا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ ایکناتھ کو بھی دق کیا کرتا تھا۔ اسکی عادت تھی کہ ایکناتھ جب اشنان کرکے گھر واپس ہوتے ہوئے اس سرا کے قریب سے گزرتا تو اس پر تھوک دیا کرتا۔ یہ حرکت اس مسلمان سے روزانہ ہوا کرتی تھی۔ بلکہ بعض مرتبہ تو وہ چار چار پانچ دفعہ یہی کام کرتا تھا۔ ایکناتھ کو اسکی ناشائستہ حرکتوں پر کبھی غصہ نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ گوداوری واپس جاتا اور پھر اشنان کرکے گھر لوٹتا۔ بعض دفعہ اسے چار چار پانچ پانچ دفعہ اشنان کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ یہ مسلمان ایکناتھ پر اکیسو آٹھ دفعہ تھوکا اور ایکناتھ اتنے ہی دفعہ گوداوری جاکر اشنان کرنے پر مجبور ہوا۔ اس دن ہزارہا لوگ اس واقعہ کو دیکھ رہے تھے اور اسکے ضبط وتحمل پر تعجب کر رہے تھے"۔

ہمیں اس امر کی تحقیق نہیں کہ مذکورۂ بالا سطور لکھنے کے ذمہ دار صرف پانگارکر صاحب ہی ہیں یا ان سے پیشتر کی اور متعصب مورخ نے یہ زہر اگلا ہے۔ لیکن صاحب موصوف نے دیانتداری

---

[1] ملاحظہ ہو بھگت لل امرتا باب ۲۲ مصرع ۱۱۳۔

[2] ایکناتھ چرتر از پانگارکر صفحہ ۱۱۲ تا ۱۱۳۔

لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب کے مرتب کرنے میں مہپتی سے بڑی مدد حاصل کی ہے۔ ہم اس امر کی توجیہ کرنے کنا قابل ہیں کہ آخر مہپتی کے بیان اور پانگار کر صاحب کے بیان میں ایسا عظیم الشان فرق کیسے پیدا ہوگیا۔ اس بات کا تصفیہ کہ ان دونوں بیانوں میں سے کونسا قابل تسلیم اور کونسا ناقابل تسلیم ہے ناظرین کے ذوق سلیم پر موقوف رکھا جاتا ہے۔ ایکناتھ کی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی دیکھ لینا چاہئے اس سے نہ صرف اسکی بلکہ اسکی بیوی گرجا بائی کی سیرت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ مرہٹی کی حمایت کی وجہ سے ملک کا ایک بہت بڑا طبقہ ایکناتھ کا مخالف ہوگیا تھا۔ ان مخالفین میں صرف سنسکرت کے جید عالم ہی نہیں تھے بلکہ بہت سارے اوباش اور عیاش لوگ ان کے ہمنوا ہوگئے تھے۔ پٹن میں ایک مشہور مٹھ[1] تھی۔ یہاں شہر کے بے فکرے جمع ہوکر تاش، چوسر یا نشہ بازی سے دل بہلایا کرتے تھے۔ ان کو ایکناتھ سے خدا واسطہ کا بیر تھا۔ وہ رات دن اسی فکر میں لگے رہتے کہ کسی طرح ایکناتھ کو زک دیں اور اسکا دل دکھائیں۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ کوئی غریب برہمن کسی دوسرے شہر سے اپنے لڑکے کی منجھ کی رسوم ادا کرنے پٹن آیا۔ اتفاقاً وہ مذکورہ بالا مٹھ کے قریب سے گذرا۔ ان اوباشوں نے جو وہاں جمع تھے اس کو نووارد سمجھ کر حالات دریافت کئے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ منجھ کے رسوم ادا کرنا چاہتا ہے اور اسے کچھ روپیوں کی ضرورت ہے تو دل میں بڑے خوش ہوئے کیونکہ اب انھیں ایک ایسا آدمی ملا جس کے توسط سے وہ ایکناتھ کو زک دیسکتے تھے۔ انہوں نے اس برہمن سے کہا "دیکھو بھائی یہاں ایک برہمن ایکناتھ نامی رہتا ہے کیسی ہی کوشش کیجائے لیکن اسے کبھی غصہ نہیں آتا۔ اگر تم اسے کسی طرح غصہ دلاؤ تو ہم تمھیں پورے دو سو روپیہ دینگے۔ اسطرح ہماری تمنا بھی پوری ہوجائیگی اور تمھارا کام بھی نکل جائیگا"۔ تنگدست برہمن نے جب دو سو روپیوں کا نام سنا تو لالچ نے اسے اندھا کر دیا۔ اس نے کہا "یہ ایسی کونسی مشکل بات ہے۔ میں آج ہی جاکر اسکو غصہ دلاتا ہوں"۔ یہ کہکر برہمن سیدھے ایکناتھ کے گھر پہونچا۔

---

[1] یہ مٹھ کیچیسر دٹا (غیبت کے چبوترہ) کے نام سے ابتک پٹن میں موجود ہے۔

ایکناتھ اتفاقاً گھر میں ہی تھا۔ برہمن ڈراتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوگیا اور اس نیت سے کہ ایکناتھ کو غصہ آجائے اس کے زانو پر جا بیٹھا۔ ایکناتھ برہمن کی اس عجیب و غریب حرکت سے حیران تو بہت ہوا لیکن اس نے اپنی شہرۂ آفاق بردباری سے کام لیکر کہا "مہاراج! میں آپکی اس پر خلوص محبت کا احسانمند ہوں۔ اور لوگ بھی مجھسے ملنے آیا کرتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی نے ایسا اظہار محبت نہیں کیا جیسا کہ آپ اسوقت کر رہے ہیں۔ برہمن نے دیکھا کہ اس کا پہلا وار خطا کر گیا۔ لیکن اس نے مستقل ارادہ کر لیا تھا کہ ایکناتھ کو غصہ دلائیگا۔ اب وہ موقع کی تاک میں چپکا بیٹھا رہا۔ یکایک اسکی نظر گرجا بائی پر پڑی جو اسوقت کھانا چننے کے لئے جھکی ہوئی تھی۔ برہمن کمال ہمیائی سے اچھل کر اس غریب کی پیٹھ پر جا بیٹھا۔ ایکناتھ اور بھی متعجب ہوا لیکن اس نے غیر معمولی حلم سے کام لے کر بیوی سے کہا۔ "دیکھنا کہیں مقدس برہمن گر نہ پڑے"۔ یہ سنکر اس شرم وحیا کی دیوی نے جواب دیا "آپ فکر نہ کیجئے۔ مجھے اپنے بیٹے ہری کو پیٹھ پر بٹھا کر کام کرنیکی عادت ہے۔ میں ان مہاراج کو اس سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہوں۔ ان کو ہرگز گرنے نہ دونگی"۔ یہ سنکر برہمن مہاراج بہت سٹ پٹائے۔ انہیں اپنی ناشائستہ حرکات پر بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ وہ بے اختیار ہو کر ایکناتھ کے قدموں پر گر پڑے اور اس سے معافی مانگتے ہوئے تمام حالات بیان کر دیئے۔ ایکناتھ نے یہ باتیں سن کر مسکراتے ہوئے کہا "مہاراج یہ بات تم نے پہلے ہی کیوں نہ بیان کر دی۔ مفت میں تم کو دو سو روپیہ ملجاتے"۔

ایکناتھ کی اولاد

ایکناتھ کے ایک لڑکے ہری پنڈت کا جو سنسکرت کا جید عالم تھا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اسکے علاوہ اس کو دو لڑکیاں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام گودا اور دوسری کا گنگا تھا۔ گودا کی شادی پٹن کے ایک برہمن چنتوپنت عرف وشنو میر سے ہوئی تھی۔ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام مکتیشور رکھا گیا۔ یہی مکتیشور آگے چلکر مرہٹی کا ایک بلند پایہ شاعر ہوا۔ اسکا کلام پاکیزہ الفاظ، دلنشیں اسالیب اور گہرے جذبات کیوجہ سے مقبول عام و خاص ہے۔ گودا کرناٹک میں بیاہی گئی تھی۔ اس سے پنڈاجی نامی ایک لڑکا ہوا۔ ایکناتھ کی آل سے تعلق رکھنے والے لوگ اتنک پائے جاتے ہیں۔

ایکناتھ کی موت (جل سمادھی)

سنہ ۱۵۹۹ء میں پھاگن کے مہینے کی پانچویں تاریک رات کو ایکناتھ نے حسب معمول کرتن کیا۔ شیرینی تقسیم کی۔ اسکے بعد لوگوں سے مخاطب ہوکر کہنے لگا "میرے عزیز دوستو! جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ کل میں تم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو جاؤنگا۔ میری یہ آخری التجا ہے کہ تم لوگ اشنان وغیرہ سے فارغ ہوکر مجھے ہمیشہ کیلئے خدا حافظ کہنے میرے ساتھ گوداوری تک چلو"۔ ایکناتھ کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا ہی تھا کہ مجمع سے آہ وزاری کی آوازیں آنے لگیں۔ اسکے دوست احباب اور معتقدین کو اس خبر وحشت اثر سے انتہائی ملال ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض لوگ تو اسی وقت شدت الم سے بیہوش ہوگئے۔ لیکن مرضی خداوندی میں کس کی پیش جاسکتی ہے۔ صبح آخر گریباں چاک کرتے ہوئے نمودار ہوئی۔ ایکناتھ بستر خواب سے اٹھا۔ اطمینان قلب سے اشنان کرکے پاک صاف کپڑے پہنے۔ اور خدا کے ناموں کو بلند آواز سے پکارتے ہوئے گوداوری کا راستہ لیا۔ اسکے پیچھے معتقدین اور مریدین کا انبوہ کثیر تھا۔ اس واقعہ کی اطلاع راتوں رات پٹن کے اطراف واکناف میں پہنچ گئی تھی۔ دیہات سے لوگ بہت بڑی تعداد میں آئے تاکہ اس برگزیدہ ہستی کو آخری سلام کرکے برکت حاصل کریں۔ ایکناتھ جب ان کے قریب سے گذرتا تھا تو وہ سب تعظیم کے لئے جھک جاتے تھے۔ اس پر عبیر، پھول اور تلسی کے ہار جیسی چیزیں پھینکی جاتی تھیں اور خدا کی تعریف کے گیت زور زور سے گائے جاتے تھے۔ اس کثیر مجمع میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اس وقت خون کے آنسو نہ رو رہا ہو۔ ایکناتھ کی پرخلوص محبت کا نقش سب کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسکی دائمی جدائی کے خیال سے بہت رنجیدہ تھے۔ ایکناتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کشتی تیرتھ کے قریب جو گوداوری کے کنارے واقع تھا پہنچا۔ عقیدتمند سوانح نگار مہیپتی کے بیان کے مطابق یہاں دیوتا اپنی اپنی آسمانی سواریوں پر اس کے خیر مقدم کے لئے آئے ہوئے تھے۔ وہ لکھتا ہے "ان دیوتاؤں نے ایکناتھ پر کثرت سے پھول برسائے چنانچہ لوگوں نے پھولوں کو آسمان سے گرتا ہوا دیکھا اور زور زور سے ہری کے ناموں کو جپنا شروع کیا اور تالیاں بجائیں" گوداوری کے کنارے پہنچکر ایکناتھ تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گیا اور وہاں اس نے لوگوں کو

مخاطب کر کے اپنا ایک ابھنگ سنایا۔ اس ابھنگ میں اسنے اپنی زندگی کا مقصد بیان کیا تھا۔ مشہور ہے کہ یہ ابھنگ اسی وقت اس ابھنگ کو ضبطِ تحریر میں لایا اور اس طرح وہ مرہٹی شاعری میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگیا۔ ابھنگ کو سنانے کے بعد اس نے تمام حاضرین کو سلام کیا اور کہا "بھائیو میں اب اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتا ہوں۔ مجھ پر مہربانی کی نظر رکھو"۔ یہ کہکر وہ سب کے سامنے تعظیم کے لئے جھک گیا۔ اسوقت مجمع سے ایسی گریہ وزاری ہوئی اور "ایکناتھ کی جے" کے نعرے ایسے زور سے لگائے گئے کہ گنبد گردوں بھی گونج اٹھا۔ اس کے بعد وہ پانی میں داخل ہوگیا۔ پانی جب اسکی ناف تک پہنچا تو ٹھہر گیا اور ہری کے ناموں کو جپنا شروع کیا۔ اسی حالت میں اسکی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ پانی سے اسکے تنِ مردہ کو نکالا گیا اور بڑی عزت اور احترام سے اسے مرگھٹ میں سپردِ آتش کیا گیا۔

کسی مقدس دریا کے پانی میں اتر کر اپنی روح کو قفسِ عنصری سے آزاد ہونیکا موقع جل سمادھی کہلاتا ہے۔ اس کا قدیم زمانہ میں رواج تھا۔ چنانچہ بعض اور سادھوؤں کے حالات میں بھی اس قسم کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ بظاہر ناف تک پانی میں جانے سے انسان کی صورت میں ہلاک نہیں ہوسکتا۔ شاید ان سادھوؤں کا یہ طریقہ ہو کہ پانی میں پہنچکر بیٹھ جایا کرتے ہوں اور اس طرح ان کی ہلاکت واقع ہوتی ہو۔

ایکناتھ اور مرہٹی زبان

ایکناتھ کا رتبہ مرہٹی کے شاعروں میں بہت ممتاز اور بلند ہے وہ ان شاعروں میں نہیں ہے جو تفریح طبع کی خاطر شاعری کے کوچہ میں گامزن ہوتے ہیں، اسکے نزدیک شاعری خدا کا ایک گراں بہا عطیہ ہے جو شاعر کے حصہ میں محض اس لئے آتی ہے کہ وہ اس کے وسیلہ عوام اور جہلا کی روحانی پستیوں اور اخلاقی کمزوریوں کو دور کرے شاعری کا یہی اعلیٰ وارفع نصب العین ایکناتھ کے پیشِ نظر رہا ہے۔ اور یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہوگا کہ اسنے اپنی زندگی بھر ایک لمحہ کیلئے بھی اس نصب العین سے انحراف نہیں کیا۔

ایکناتھ کے زمانہ میں مرہٹی ایک معمولی بولی کی حیثیت رکھتی تھی، اسمیں نہ تو علمی اور فلسفیانہ تصانیف کا ذخیرہ موجود تھا اور نہ وہ فلسفہ کے مضامین کی حامل ہوسکتی تھی۔ وہ محض عوام کی زبان تھی

جس میں کچھ لکھنا لائق پنڈت اور فاضل وید اپنی شان کے منافی سمجھتے تھے' لیکن ایکناتھ نے اپنی وسیع النظری اور دور بینی سے معلوم کر لیا تھا کہ اگر اسکو عوام کی اصلاح مقصود ہے تو مرہٹی زبان سے کام لینا ناگزیر ہوگا سنسکرت سے عوام قطعاً نابلد تھے اس کا دائرۂ عمل صرف چند فاضل برہمنوں تک محدود تھا جو مذہب کے جزو کل مسایل سے واقف تھے اور روحانی اطمینان اور دلی تسکین حاصل کر سکتے تھے' اور جن کو عوام کی روحانی پستی اور دماغی غلامی کی کوئی پرواہ نہ تھی' ایکناتھ نے اس خود غرضی کو گوارا نہیں کیا' اور مخالف و ناموافق حالات میں ایک بلند حوصلہ جواں ہمت مصلح کیطرح اٹھ کھڑا ہوا' اس ارادہ میں اسکو شدید مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' اسکو سخت ترین ایذائیں پہنچائی گئیں' فاضل پنڈتوں اور مقدس ویدانتیوں نے اس کو بارہ پتھر باہر کر دیا' اس کی ایسی تصانیف جو برسوں کی کد و کاوش اور دماغی جد و جہد کا ثمرہ تھیں کمال بیدادی سے دریا میں پھینک دی گئیں' لیکن کبھی اسکی پیشانی پر شکن نہ آئی' اس نے کبھی دوں ہمتی کا ثبوت نہیں دیا اور برابر اپنی دھن میں لگا رہا۔ اور سنسکرت کے جواہر پاروں کو مرہٹی میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اس کا بیٹا ہری پنڈت جو سنسکرت کا جید عالم تھا' اور پنڈتوں کیطرح اسکے طرز عمل سے سخت ناراض تھا' اور روٹھ کر بنارس چلا گیا تھا وہ اپنے باپ سے کہتا تھا "سنسکرت دیوتاؤں کی زبان ہے" تو ایکناتھ اس کو یوں جواب دیتا" اگر سنسکرت دیوتاؤں کی زبان ہے تو مرہٹی چوروں اور ڈاکوؤں کی نہیں ہے" ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایکناتھ کے نزدیک انسان اور مذہب کی اہمیت زبان سے کہیں زیادہ تھی' وہ زبان کو صرف اظہار خیال کا آلہ سمجھتا تھا۔ وہ زبان جس سے عوام قطعاً نابلد ہوں اور جس سے انکی اصلاح نہو سکتی ہو اس کے نزدیک وقعت کی ہرگز مستحق نہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ مذہب کی جگہ انسان کے دل میں ہے کتاب میں نہیں وہ مذہب زندہ ہے جس نے دلوں میں جگہ پالی ہے وہ زبان جو روحانی رموز سے مملو ہو اور انسانی دل میں ایک نکتہ بھی نہ پہنچا سکے تو اس لائق ہے کہ دنیا سے میٹ دی جائے۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ایکناتھ نے عوام کی خدمت کیلئے کیا کیا جتن کئے ہم یہاں اس خدمت کا ذکر کرینگے جس کو اس نے قلم کے وسیلہ انجام دیا۔ اس سلسلہ میں بخوبی اندازہ ہو سکے گا

ایکناتھ کے مرہٹی زبان پر کیا احسانات ہیں۔

ایکناتھ کی تصانیف

مہاراشٹر سرسوت (تاریخ ادب مرہٹی) میں ایسی کتابوں کی ایک طویل فہرست درج ہے جو ایکناتھ سے منسوب کیجاتی ہیں لیکن ان میں سے بعض ایسی ہیں جن کو اسکی مستقل تصانیف کے زمرے میں داخل کرنا غلطی ہے، کیونکہ وہ دراصل اسکی ضخیم تصانیف کے حصے یا ابواب ہیں، جن کو علیحدہ ناموں سے موسوم کر لیا گیا ہے۔ ایکناتھ کی حسب ذیل دس تصانیف ایسی ہیں جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسکی تراوش قلم کا نتیجہ ہیں۔

(۱) چتوشلوکی بھاگوت (۲) ابھنگ (۳) ہستامالک (۴) سوکاشٹک (۵) سوانتا سکھ (۶) آنند لہری (۷) الوبھوانند یا الوبھاو (۸) وکھمنی سویمورا (۹) بھاگوت (۱۰) بھاورت رامائن۔

ذیل میں ہم ہر کتاب کے متعلق چند سطریں سپرد قلم کرتے ہیں تاکہ ان کے حالات اور اہمیت کا کچھ اندازہ ہوسکے

چتوشلوکی بھاگوت

بھاگوت پوران کے دوسرے کھنڈ کے نویں باب پر شرح ہے سنسکرت میں ۴۴ بند ہیں لیکن شرح میں ۴۵ ملتے ہیں اس شرح کے خاتمہ پر ایکناتھ لکھتا ہے "غور سے سنو! میں تمھیں بتاؤں گا کہ کسطرح چتوشلوکی میری ملکیت میں آئی اور میں نے کیوں یہ شرح لکھی۔ گوداوری پر اس کے شمالی کنارے سولہ کوس دور کوہ چندراگیری پر سری جنار دھن معمول کے مطابق زیارت کے لئے گئے کوہ چندراگیری کی چوٹی بہت بلند ہے اسکے دامن میں چندراوتی ایک شہر ہے ایک ممتاز برہمن چندرا نامی وہاں رہتا تھا اس کے گھر ٹھیرنے کا ہم کو اتفاق ہوا وہ چتوشلوکی بھاگوت کی تشریح اور اسکی تعریف ہمیشہ بڑے شد و مد کے ساتھ کرتا تھا جنار دھن چندرا بھٹ کی تشریح سے بہت خوش ہوئے جوش مسرت میں نعرے لگائے اور مجھ سے اس فلسفیانہ تعلیمات کی کتاب کو لوگوں کی شرکت

مرہٹی میں منتقل کرنے کیلئے کہا میں سنسکرت نہیں جانتا تھا اسکے الفاظ اور مضامین سے واقف نہیں تھا لیکن ان کے سخت احکام کی برتری سے انکی خواہش پوری کرنے کے لئے اکسایا گیا" اپنے مرشد کے احکام کی بجاآوری میں جو کرشمے اور عجیب ترین چیزیں ظاہر ہوئیں اور شرح لکھنے میں اپنے انتہائی انہماک کی چند مثالیں دینے کے بعد ایکناتھ لکھتا ہے:۔

"علم و آگہی سے بھری ہوی جنیشلو کی بھاگوت میرے مرشد کے احکام کی عظمت، قدرت اور قوت کے ذریعہ پراکرت میں منتقل ہوی"۔

چتوشلوکی بھاگوت کا کالب لبا

چونکہ ایکناتھ کا کام شرح لکھنا تھا اس لئے وہ مضمون اور متن سے نہ ہٹ سکا، یہ ایک فلسفیانہ تصنیف ہے اور ہر لحاظ سے خالصتاً ویدانتی ہے اپنی تشریحات میں وہ کسی قدر آزادی سے کام لیتا ہے اور اس لئے مضمون سے دور معلوم ہوتا ہے۔ چند امور ہیں جن کی اہمیت جتانے کے لئے وہ ان پر مسلسل زور دیتا رہتا ہے۔

(۱) مرشد کی ضرورت، جس کے بغیر حقیقی معرفت کے رموز و اسرار معلوم نہیں ہو سکتے سچے مرشد اور سچے مرید کے خواص پر زور دیا گیا ہے۔

(۲) گروسیوا (مرشد کی دیانت دارانہ اطاعت) کی اہمیت جتائی گئی ہے، مرشد کامل درحقیقت خدا ہے جو جسم انسانی میں جلوہ گر ہے۔ اسکی تعظیم و تکریم اور اطاعت و خدمت بجالانی چاہئے۔

(۳) علم و آگہی، مذہبی احکام کی بجاآوری اور خدا کی طاعت سے جو فائدے نصیب ہو سکتے ہیں انکی بنیاد اور استحکام کے لئے زندگی کا اخلاقی پہلو دیانت داری سے سنوارنا چاہئے زندگی اور دل کی پاکیزگی اور خلوص کے بغیر تپ اور بھکتی جیسی چیزیں پوری نہیں ہو سکتی ہیں۔

(۴) راہ معرفت اور طریق عبادت کو ایکناتھ نجات کا راستہ مانتا ہے لیکن یہ راستے عوام کیلئے دشوار گزار ہیں ان راستوں سے منزل مقصود پر پہنچتے ہی قعر غرور میں گرنے کا اندیشہ لگا رہتا ہے بھکتی کا راستہ اس قسم کے خدشہ سے پاک ہے خلوص کی ضرورت ہے اسکے بعد خدا خود کمزوروں اور

گنہ گاروں کی مدد کرتا ہے اور سچا لیتا ہے اسمیں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ خداخود ویدانتی فلسفہ کے اصول نجات کے تینوں طریقوں دنیان مرگ (معرفت) کرم مرگ (طریقت) بھکتی مرگ (شریعت) کی تشریح کر رہا ہے اور خلوص اور پاکیزگی کو ناگزیر بتا رہا ہے۔

ابہنگ

ابہنگ ایک قسم کی نظم ہے جو عموماً پرمیشور کی تعریف میں کہی جاتی ہے۔ اس میں عام طور پر چار سے لیکر تیس تک مصرعے ہوتے ہیں ہر دو مصرعے ہموزن ہوتے ہیں ہر مصرع دو تین یا چار ارکان پر مشتمل ہوتا ہے مرہٹی میں یہ صنف بہت مقبول رہ چکی ہے' اسمیں جلیل القدر شعراء نے طبع آزمائی کی ہے ایکناتھ نے بھی اس کا کافی ذخیرہ چھوڑا ہے اس کے ابہنگوں کے دو مجموعے نہایت آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں ایک ۱۹۰۳ء کا تکارام تاتیا ایڈیشن ہے یہ ۲۵۴ ابہنگوں پر مشتمل ہے ان میں ۴۰ بھانوداس کے بھی شامل ہیں ایک جدید ایڈیشن تربک ہری اوٹے نے ۱۹۲۴ء میں نکالا ہے یہ ۴۰۰۱ ابہنگوں پر مشتمل ہے۔

دونوں مجموعوں میں غیر معمولی تفاوت ہے ہم ان قدیم مخطوطات سے ناواقف ہیں جن کی بنیاد ہے متن کے باب میں بھی چند تنقیدی سوالات پیدا ہو سکتے ہیں بعض ابہنگوں کے مصنف کے متعلق بھی شبہ ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر یہاں بحث کرنے کی گنجایش نہیں اوٹے ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے تمام حوالے اسی سے متعلق ہوں گے۔

۴۰۰۱ ابہنگوں کا خلاصہ

ابہنگوں کے مضامین میں بہت تنوع ہے ان میں سے اکثر پر گہرا مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے بقیہ بالخصوص پوجا پاٹ میلوں وغیرہ کے موقعوں کے لئے موزوں ہیں یہاں ان کا تفصیلی تجزیہ بے سود ہے بہ حیثیت مجموعی وہ فلسفیانہ مضامین کے حامل نہیں ہیں' البتہ وہ "خدا اور انسان کے تعلق" پر روشنی ڈالتے ہیں' خدا ہر نام اور ہر حلیہ میں انسان سے بہت قریب ہے اسکو بار بار "ماں اور باپ" کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے "اس کا رحم تمام مخلوقات کے لئے ہے" "ذات پات کا اس کے پاس کوئی لحاظ نہیں اسکے لئے امیر غریب سب برابر ہیں" "انسان کو اس رشتہ میں مکر سے پاک رہنا چاہیئے جو خدا کے ساتھ ہے"

"اس کو خدا سے حقیقی محبت رکھنی چاہیئے بغیر محبت کے خدا نہیں ملسکتا' مقدس مقاموں کی زیارت کو کیوں جاتے ہو پہلے دل میں خلوص کو جگہ ملنی چاہیئے۔ کیا زیارتوں سے دل خلوص سے متصف ہوسکتا ہے اس سے بہتر تو یہ ہے کہ کسی ویران یا سنسان جگہ چلے جائیں۔ اگر دل پر خلوص اور صاف ہے تو خدا خود گھر میں ہے۔ اگر تم کو اس کی ذات میں بھروسہ ہے تو اسکو وہاں دیکھ سکتے ہو جہاں تم بیٹھے ہو"۔ ان ابہنگوں میں ایکناتھ کی تان جگہ جگہ مرشد کامل کی ضرورت پر ٹوٹتی ہے۔ ایکناتھ کیلئے مرشد خدا کا ظہور ہے۔ مرشد برتر و اعلیٰ برہما ہے "نجات مرشد کی مہربانی سے حاصل ہوسکتی ہے اس کے ذریعہ تمام گناہ دھل سکتے ہیں اس زندگی میں حقیقی مسرت کا سرچشمہ مرشد کی مہربانی ہے۔ اے میری روح تو اسکی ذات میں کامل یقین کرلے۔

ان ابہنگوں میں جگہ جگہ مہاراشٹر کے دوسرے سادھوؤں اور بزرگوں (دنانیشور سے جنار دہن تک) کے حوالے ملتے ہیں۔ ۵۹ نام ہیں جن میں بعض مہاراشٹر کے باہر کے ہیں مثلاً کبیر روہی داس بعض کے ساتھ تاریخی نوٹ بھی درج ہیں جیسے دنانیشور اور نام دیو کے ساتھ۔ ایکناتھ کے یہ ابہنگ فکر طلب مطالعہ کے مستحق ہیں اور اگر یہ متحقق ہوجائے کہ یہ سب ایکناتھ ہی کی جنبش قلم کا نتیجہ ہیں تو اس سے اسکی زندگی اور سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔

ہست مالک[1]

یہ ایک خالص فلسفیانہ تصنیف ہے۔ یہ اصل میں سنسکرت زبان میں تھی اس پر ایکناتھ نے شرح لکھی ہے اس کتاب کی بنیاد ایک قصہ پر ہے جسکو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ کسی برہمن کے گھر ایک لڑکے نے جنم لیا' ایک معمولی بچہ کے خواص اس سے ظاہر نہیں ہوئے مثلاً جب وہ پیدا ہوا تو بالکل رویا نہیں' اسقدر خاموش اور ساکت تھا کہ پڑوسیوں نے اسے مردہ سمجھا پنگورے سے گر پڑنے اور کیڑے مکوڑوں سے ستائے جانے

---

[1] اس کے متعلق پروفیسری۔ بی کو ویل ایم۔ اے (کیمبرج) نے انڈین انٹی کیوری جلد نہم صفحہ ۲۵ پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔

وہ بے حس رہتا تھا' ماں کا دودھ پینا ترک کر دیا تھا' آٹھ سال کی عمر تک وہ بالکل گونگا تھا ماں باپ نے گیارہ طرح طرح سے کوشش کیں سب ناکام ثابت ہوئیں' اسی کوشش میں اسکو طعام سے محروم کر دیا گیا مگر سب بے سود' اس لڑکے نے کھانے پینے کی کبھی خواہش نہیں کی۔

ایک روز کا اتفاق ہے کہ شنکر اچاریہ اپنے پیغام کی دعوت دینے اس گھر پہنچے۔ اچاریہ نے لڑکے کو دیکھتے ہی پہچان لیا' اور چند سوالات کئے "تم کون ہو؟ کس سے تعلق رکھتے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ تمھارا کیا نام ہے؟ تمھاری ذات کیا ہے؟ کب آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو میرے دوستانہ سوالات کا جواب ایک دوست کی طرح دو" لڑکے نے جواب دیا "میں آدمی ہوں نہ خدا نہ کوئی اور جاندار میں نہ برہمن ہوں نہ چھتری نہ ویش نہ شدر میں خالص پرآتما ہوں" اچاریہ کے مزید سوالات پر لڑکے نے کم و بیش اسی قسم کے جوابات دئے "میں خالص آتما ہوں اور یہ کائنات میں جو تفریقیں نظر آتی ہیں وہ در اصل وہ صورتیں اور شکلیں ہیں جن میں مختلف ناموں کے ساتھ آتما کا ظہور ہوتا ہے۔ اسکی ٹھیک مثال یہ ہے جیسے ایک تالاب میں جسکی سطح ہو کے تیز و تند جھونکوں سے متلاطم ہو سورج کے مختلف عکس نظر آئیں"۔

یہ خالص فلسفیانہ تصنیف ہے اس کا مقصد آتما کی وحدت کے فلسفہ کو بیان کرنا اور اسکے اساسی تصور اور تعقل کو وضاحت سے بیان کرنا ہے تمام کائنات کا سرچشمہ ایک ہے اور یہ جو ظاہرا فرق نظر آتا ہے یہ درحقیقت کوئی فرق نہیں بلکہ ایک ہی شئے ہے جو ان تمام صورتوں میں جلوہ گر ہے ان رموز کے سمجھنے کے لئے مرشد کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ لیکن اس پر شد و مد سے اصرار نہیں کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ فلسفیانہ تصنیف ہے اس لئے عمل پر زور نہیں دیا گیا مثلاً نجات کے تینوں ذرائع کی بحث نہیں چھیڑی گئی۔ اس قدر ضخیم کتاب میں بھکتی کا لفظ نظر سے نہیں گزرا شرح میں جا بجا بھگوت گیتا اور اپنشدوں کے حوالوں اور اقتباسات سے روشن ہوتا ہے کہ ایکناتھ ان مقدس کتابوں کا بڑا سرگرم طالبعلم رہ چکا ہے۔

سوکاشٹک | یہ سنسکرت کے آٹھ شلوکوں کی شرح ہے اس میں آتما کو کائنات کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔

اس رمز کو سمجھانے کے لئے بہت سی مثالیں دی گئیں ایک جگہ آتما اور کائنات کو سمندر اور موجوں سے تشبیہ دی گئی ہے کائنات کی ہر چیز آتما ہے تو پھر شکل اور نام کے لحاظ سے اسکو کس طرح ایک سمجھا جا سکتا ہے اسکو طرح طرح سے واضح کیا گیا ہے ایک مثال یہ بھی ہے کہ سونا اصل شئے ہے لیکن مختلف زیوریں تبدیل ہونے سے مختلف نام اور شکلیں اختیار کر لیتا ہے عناصر خمسہ میں بظاہر تنوع اور تفاوت ہے لیکن اصل میں ایک ہیں، انسان کی روح جب آتما میں ملکر وحدت کو مان لیتی ہے تو اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دریا سمندر میں آکر ایک ہو جاتا ہے سمندر اور ندی کی شکلیں مختلف ہیں مگر پانی کی اصل ایک ہے اس مضمون کو واضح کرنے کے لئے ایکناتھ نے اپنی مشہور ہنرمندی سے تشبیہوں اور استعاروں سے خوب کام لیا ہے یہ تشبیہیں اور استعارے انسانی زندگی اور مناظر قدرت سے لئے گئے ہیں ایکناتھ نے اس کتاب میں اپنے پڑدادا کا بھی ذکر کیا ہے۔

سوتما سکھ (انبساطِ روح)

یہ ایک فلسفیانہ تصنیف ہے اس میں ایکناتھ مناجات کے بعد فلسفہ کے اصول و فروعات کی تشریح میں شروع کر دیتا ہے یہ تشریحیں فطرت اور انسانی تجربوں سے اخذ کی ہوئی تشبیہوں سے بیان کرتا ہے، اسکے بعد ایک گرو اور ستودہ صفات معلم کی ضرورت بتاتا ہے تاکہ اسکے فیض سے وہ رموز و نکات سمجھ میں آسکیں جن کو سمجھنے سے خود آدمی قاصر ہے گرو کی مہربانی ضروری ہے اسکی تعظیم و اطاعت کرنی چاہیئے اسکے طفیل میں جو نور ہمارے دل و دماغ میں پہنچتا ہے اس سے روحانی مسرت ہوتی ہے اسی لئے اس نظم کا نام سوتما سکھ (انبساط روح) رکھا گیا ہے۔ اس نظم میں کہیں بھکتی کا ذکر نہیں آیا یہاں تک کہ وہ لفظ بھی استعمال نہیں ہوا ہے۔ ایکناتھ اپنا تجربہ بیان کرتا ہے کہ کسطرح مرشد کامل کے طفیل میں اس کو آتما کا علم حاصل ہوا۔ اگر مرشد سے پر خلوص عقیدت ہو تو یہ علم ہر شخص حاصل کر سکتا ہے وہ کہتا ہے "میں نے دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی اور نہ قربانیاں کر کے بے رحمی کا ثبوت دیا نہ یوگ اختیار کیا اور نہ لگاتار خدا کے نام جپے اور نہ میں نے متبرک مقاموں کی زیارتوں پر اکتفا کیا۔ میرے لئے میرے ذی عظمت مرشد کی پیروی اور خدمت کافی ہے" آخر میں لکھتا ہے ممکن ہے کہ یہ کتاب بے تہہ

قارئین کو دقیق معلوم ہو لیکن اہل معنی کیلئے یہ سرمایہ مسرت ہے میں نے یہ کتاب روح کی بھلائی کیلئے لکھی ہے اسکے سننے سے خوشی کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں خدا کرے کہ اس کتاب کے امرت بھرے بول پڑھنے اور سننے والوں کو ہمیشہ راحت اور سکون بخشتے رہیں" سب سے آخر میں ایکناتھ اپنے پڑدادا بھانودا س کی ثنا قابلیتوں کی توصیف کرتا ہے اسکو انگور کی بیل (تاک) سے تشبیہ دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ اپنے پڑپوتے کی شکل میں نمودار ہوئی ہے جسکو پھل پھول لگ گئے ہیں تاکہ دیوتاؤں کو مسرت و شادمانی حاصل ہو۔

انند لہری

یہ ایک چھوٹی سی منظم ہے خاتمہ پر ایکناتھ اسکی وجہ تسمیہ اسطرح بیان کرتا ہے کہ "جب کوئی مرشد کامل کے ذریعہ نجات پاتا ہے تو اسکی روح کو مسرت ہوتی ہے اسی لئے اسکا نام انند لہری (مسرت کی موج) رکھا گیا" یہ بھی ویدانتی فلسفہ سے متعلق ہے لیکن اس میں بھگتی کا ذکر ہے اس کے ذریعہ نجات پانے سے بحث کیگئی ہے۔ گرو کی ضرورت بتائی گئی۔

نند بھاوا یا انوبھاوا یا انند انو

یہ ایک گرو اور چیلے کے مکالمہ پر مبنی ہے۔ مکالمہ کا انجام یہ ہے کہ چیلے کو چاہیئے کہ وہ اپنی ذات کو برہما کی ذات سے الگ نہ سمجھے اور جب یہ سمجھ لیا جائے تو ماننا ضروری ہے کہ تمام مخلوقات ایک ہیں یہ ۱۹۰۳ء میں کوی سنگرہ گرنتھ مالا کی مطبوعات کے سلسلہ میں چھپ چکی ہے۔

رکھمنی سویمورا

اسکی بنیاد بھگوت پوران کے دسویں کھنڈ اور انسٹھویں باب انزادھ پر ہے، ایک راجہ کی لڑکی کرشن کی خوبیوں اور دلکشیوں کا ذکر سنتی ہے اور غائبانہ اس پر عاشق ہوکر اسے شادی کے لئے انتخاب کرتی ہے اس واقعہ کو مرہٹی کے کئی شعراء نے اپنے اپنے سلیقہ کے موافق قلم بند کیا ہے ایکناتھ نے بھی بڑی خوبی سے لکھا ہے اس کتاب کے آخر میں ایک دلچسپ اور اہم تاریخی نوٹ درج ہے۔ خود ایکناتھ لکھتا ہے۔ "یہ کتاب ختم ہوئی بنارس کے عظیم الشان شہر واقع ساحل منی کرنک، میں رام کی سالگرہ کے موقع پر ماہ چیت نومی کے تیوہار کے وقت رکھمنی سویمورا پوری کی گئی"۔

ایکناتھی بھاگوت

بھاگوت پوران کے گیارہویں کھنڈ کے اکتیسویں باب پر ایکناتھ نے مرہٹی میں شرح لکھی ہے ایکناتھی بھاگوت اور رامائن، ایکناتھ کی تصانیف میں سب سے زیادہ اہم اور درخشاں کارنامے شمار ہوتے ہیں بھاگوت اس کا شہ کار ہے کتاب کے آخر میں وہ لکھتا ہے کہ "سنہ ۱۶۳۰ء بکرمی میں کارتک کے مبارک مہینے میں طلوع بدر کامل کے "دن" بروز دوشنبہ یہ شرح جنار دہن کے طفیل میں اختتام کو پہونچی ..... میرے وطن پرتشتان واقع ساحل گوداوری میں جو سنہ رائج ہے ہمیں تاریخ سینے ۱۴۹۵ء شکے سالباہن سری مکھ سنوت سر میں شرح ختم ہوئی"۔

کیشوسوامی نے ایکناتھ کی جو سوانحعمری لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے پانچ باب پٹن میں لکھے گئے اور بقیہ بنارس میں، یہ صرف کیشوسوامی کا بیان ہے دوسرے سوانح نگار اس باب میں خاموش ہیں۔

ایکناتھی بھاگو کا لب لباب

ایکناتھ نے شرح لکھی ہے اسی لئے وہ متن اور مضمون کی حدود سے باہر نہیں گیا، اصل کتاب کسی خاص موضوع پر بالالتزام مبنی نہیں ہے اسی لئے شرح میں بھی کوئی خاص مبحث نہیں پایا جاتا تاہم اس میں ویدانتی فلسفہ سے متعلق مکمن الفہم مسائل پائے جاتے ہیں، مذہب دینیات، معاشرتی تعلقات موت سزا جزا دوزخ جنت غرض انسانی زندگی کے مذہبی اخلاقی اور معاشرتی شعبوں کے متعلق ہر چیز ملتی ہے۔

ایکناتھی بھاگوت کا مطالعہ کرتے وقت یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اسکا لکھنے والا ویدوں اپنشدوں، مہابھارت، رامائن اور پورانوں کے ملہمات پر عقیدہ رکھتا تھا، اس کا فلسفہ ویدانتی تھا، وہ ہندوستان میں ذات پات کی معاشرتی تقسیم کا ایک حد تک قائل تھا اپنے زمانہ کے متعارف رسم و رواج کا وہ بڑی حد تک پابند تھا گو وہ بظاہر صنم پرست تھا مگر درحقیقت زبردست موحد تھا وحدانیت کا قایل ان معنوں میں کہ تمام کائنات خدائے عزوجل کا مظاہرہ ہے، تمام دیوتا اس کے اوتار ہیں تمام مخلوقات میں وہ جلوہ گر ہے۔

ایکناتھ کی بھاگوت کوئی نئے عقائد اور اصول پیش نہیں کرتی ہے۔ مگر وہ مرہٹی ادب میں ممتاز اور لاثانی اسلئے سمجھی جاتی ہے کہ اسمیں عام اخلاقی صداقتوں پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے ایکناتھ بے ریا علم خدا کی حقیقی و پرخلوص محبت کو نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا وہ تسلیم کرتا تھا کہ معاشرتی معاملات میں برہمن کا درجہ بلند ہے لیکن ساتھ ہی اس کا عقیدہ تھا کہ خدا کی بے خلوص محبت برہمن کو دوزخ میں لیجاتی اور شدر اپنی سچی عبادت کے سبب جنت میں جگہ پائیگا وہ ذات پات کے امتیاز کو تو بظاہر تسلیم کرتا ہے لیکن اپنے عقیدہ کی بناء پر کہ خدا ہر انسان میں ہے وہ ان بندشوں کو توڑ دیتا ہے چنانچہ ہم اس عقیدہ کی عملی مثالیں اس کی زندگی میں دیکھتے ہیں یہ کتاب اس قدر ضخیم اور مضامین میں اس قدر تنوع ہے کہ اس کا تفصیلی تجزیہ آسان نہیں تاہم یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اسکی بنیاد ویدانتی فلسفہ اور نجات کے تینوں طریقوں دنیان مرگ، کرم مرگ، بھکتی مرگ پر ہے لیکن اس کتاب کا مقصد ان کی تعلیم و تلقین نہیں ہے۔

خلوص بے ریائی خدا و انسان کے ساتھ حقیقی محبت، صداقت، ایمانداری پاکیزہ زندگی اخلاقی نظریے، شادی کا تقدس، خودغرضی، لالچ، مے خواری، اخلاقی خرابی برائیوں سے نفرت یہ سب چیزیں اس کتاب کے موضوع میں داخل ہیں۔

ایکناتھی بھاگوت کو لکشمن رام چندر پانڈکر نے ایڈٹ کیا ہے اور ۱۹۱۵ء میں نرنا ساگر پریس بمبئی نے طبع کر کے شائع کیا ہے، یہ بہت مفید ایڈیشن ہے، اسمیں مضامین کی فہرست، فٹ نوٹ مشکل الفاظ کی فرہنگ اختلاف نسخ سب کچھ درج ہے۔

بھاورتھ رامائن

مہیتی کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ والمیکی رامائن کا ترجمہ ایکناتھ کی آخری کوشش تھی، ایکناتھ ہر روز اس کے ایک حصہ کا ترجمہ کرتا تھا اور لوگوں کو سناتا تھا" پرہیزگاروں اور بھکتوں کو اس سے بڑی مسرت ہوتی تھی وہ بڑے اشتیاق سے سنتے تھے لوگوں پر سننے سے بیخودی طاری ہوجاتی تھی" ایکناتھ نے رامائن کے ۴۴ باب ختم کر دئے تھے اور بیدھا کھنڈ شروع کر دیا تھا لیکن اجل سر پر کھیلنے لگ گئی تھی، یہ آثار دیکھکر لوگوں کو

سخت صدمہ ہوا وہ چاہتے تھے کہ اس کے قلم سے رامائن مرہٹی میں منتقل ہو اور اسکے شیریں لبوں کی جنبش سے یہ امرت بھری داستان ان کے کانوں تک پہنچے، لیکن بدھا کھنڈ ابھی ختم نہوا تھا اور ارنیکھنڈ پورا باقی تھا کہ موت نے پیام سنایا اور ایکناتھ کو اپنا طاقتور قلم رکھدینا پڑا اس نے اسکی تکمیل کا ذمہ اپنے ایک چیلے گاوجی کو بنایا، لوگوں نے سنا تو گاوجی کی قابلیتوں پر شبہ کیا مگر ایکناتھ نے اپنی زندگی میں اس سے بقیہ ابواب میں سے ایک کا ترجمہ کرایا تھا لوگوں نے اسکو پسند کیا اور بقیہ ترجمہ کی خواہش کی اسطرح گاوجی نے باقی ابواب کا ترجمہ کیا ترجمہ سنسکرت کے متن کے ساتھ ساتھ چلتا ہے لیکن مختلف مناظر کے ذکر اور وضاحت میں ایکناتھ نے فصاحت و بلاغت کا اظہار بڑی خوبی سے کیا ہے اپنی شاعرانہ ہنرمندی سے ہندوستان کی مشہور رزمیہ نظم کو مرہٹی میں منتقل کرکے مطالعہ کے لائق بنادیا ہے۔

والمیک کی رامائن کے عموماً تین نسخے پائے جاتے ہیں جن کو محققین بمبی، بنگال اور مغربی نسخوں سے موسوم کرتے ہیں۔ تینوں میں اختلاف نسخ بہت کافی ہے، مسٹر ایبٹ کا بیان ہے کہ وہ نہ بمبئی کے نسخے کا ترجمہ ہے اور نہ بنگال کے، مغربی نسخہ بھی محققین کو حال ہی میں دستیاب ہوا ہے۔ پھر نہ معلوم یہ کس سنسکرت نسخہ کا ترجمہ ہے، ایکناتھ کی رامائن پنڈہرپور میں گنیش پریس کے اہتمام سے ۱۹۱۴ء میں چھپ چکی ہے۔

دنانیشوری کی تصحیح

مرہٹی کے جد اعلیٰ دنانیشور نے بھگوت گیتا کی مرہٹی میں شرح لکھی ہے یہ اس کا شہ کار ہے اور اسی کی بدولت اس کا نام مرہٹی ادب میں زندہ و دایم ہے کاتبوں کی غلط و غلط نقلوں نے اس کو بہت کچھ بدل دیا تھا اور وہ عوام کی فہم سے باہر ہونے لگی تھی ایکناتھ نے اس خطرہ کو محسوس کیا کہ شاید ایک روز اسکی حیثیت ہی کہیں نہ بدل جائے اسلئے تصحیح کا کام شروع کردیا تھا مرہٹی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ مولانا صاحب نامی کوئی بزرگ اس زمانہ میں تھے وہ ایک روز ایکناتھ کی گزرگاہ پر بیٹھ گئے اور مخمل کے ایک بڑے ٹکڑے میں ٹاٹ کے پیوند جوڑنے لگے ایکناتھ نے پوچھا یہ آپ کیا کر رہے ہیں تو انھوں نے جواب دیا "سنا ہے کہ ایکناتھ دنانیشوری کی تصحیح کر رہا ہے تو معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند

زیب دیتا ہے یا نہیں" کہا جاتا ہے کہ ایکناتھ پر اس کا بہت اثر ہوا اور اس نے یہ کام چھوڑ دیا لیکن ایک زبردست شہادت سے پتہ چلتا ہے کہ ایکناتھ نے ۱۵۸۵ء میں اسکی تصحیح کی اس روایت سے پھر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایکناتھ کو ان بزرگ نے صرف کتابت کی تصحیح کی اجازت دی ہو اور تصرف و تغلب یا تغیر و تبدل سے روکا ہو۔

دنا نیشوری کا ایک بہت قدیم نسخہ تنجور کے کتب خانہ میں ۱۵۱۵ شکی ۱۵۹۳ء کا لکھا ہوا ہے کاتب احمد نگر کا پرس رامنجا نامی کوئی شخص تھا یہ نسخہ ایکناتھ کی حیات میں لکھا گیا تھا اس لئے قابل وثوق ہے۔ اس نسخہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایکناتھ نے تصحیح کی ہے۔ ایکناتھ کے الفاظ بھی درج ہیں جس میں تصحیح کا ذکر ہے۔

ایکناتھ کا اثر

مرہٹی شاعروں اور سادھوں پر، ایکناتھ نے اپنی شاعری اور تعلیمات کا گہرا اثر چھوڑا ہے، اسکی تصانیف اوروں کے خیالات کے لئے سرچشمہ تھیں اور اسکی تعلیمات بعد کے سادھوں کے لئے مشعل ہدایت، اسکے احسانات اور خاص اثر کا ذکر ان شاعروں اور سادھوں نے کیا ہے۔ جیتی ادھا و اچد گھنا، سیو رام سوامی، رام و لبھ داس، بدھا و سونا، کھنڈے رائے، مکتیشور، واسو پنت، نکا رام، نلو با، کرشنا دیار نوا، سری دھر، دیو داس یکشور او دھوت، امرت رائے، اتما رام، رام داس، مو روپنت۔

ان میں مکتیشور اور نکا رام کے خاص طور پر تمام خیالات اور موضوعات کا سرچشمہ ایکناتھ کی تصانیف اور تعلیمات ہیں۔

عوام پر اثر:۔ ایکناتھ کے فیض اور اثر کا اندازہ پٹن کی جاترا کے موقع (مارچ) پر ہر سال ہو سکتا ہے، جب کم و بیش ایک لاکھ نفوس اپنی زراعت کے اہم کاروبار کو چھوڑ چھاڑ اور سال بھر کی جانکاہ محنت کا ثمرہ یعنی کٹی ہوئی فصل کو کاٹی حفاظت کے بغیر ایکناتھ کے مندر کی زیارت کو چلے آتے ہیں، اور وہ ایک لاکھ نفوس دن رات "بھانو داس ایکناتھ بھانو داس ایکناتھ" کی صدائیں بلند کرتے ہیں، ایکناتھ کی یادگار میں مہینہ میں دو بار، ماہانہ، سہ ماہی، شش ماہی نہ ماہی اور سالانہ میلے

بتدریج چہل پہل اور رونق کے ساتھ لگتے ہیں۔ سرکار آصفیہ سے ایکناتھ کے مندر کی حفاظت وغیرہ کے لئے ایک جاگیر عطا کی گئی ہے، کئی مواضعات ہیں۔ جاگیر ناتھ سمستان کہلاتی ہے۔

سطور بالا کے ماخذات :۔

بھکتنا لل امرتا۔ مسٹر ایبٹ کی "ایکناتھ" پانگار کی ایکناتھ چرتر، وغیرہ، ان کے علاوہ آٹھ نو کتابیں ایکناتھ پر لکھی گئی ہیں، ان سے بھی مسم نے کہیں کہیں مدد لی ہے۔ فقط

ریل گاڑی

از جناب ابوالکلام محمد بدرالدین صاحب متعلم ایم بی بی ایس جامعہ عثمانیہ

ہے اس کا تڑپتا ہوا دل شعلۂ مضطر — شوریدہ سر ایسی کہ قیامت لئے سر پر
یا ابر سیہ ہے کہ گرجتا چلا آتا ہے — یا ہے دل صد پارہ دھڑکتا ہوا جوہر دم
لو بانگ جرس سن کے ہوئی دھنگ نرالے — چپ چاپ تھی اب پیٹ سے پیر اس نے نکالے
منظور ہو الک سے اک جائے پہ رہنا — محور پہ چلی گھومنے چھوٹی سی یہ دنیا
مجنوں کی طرح صبح و مسا پھرتی ہے بن بن — کہسار پہ دیکھو تو ہی پھنکارتی ناگن
وہ کوہ سے اتری تو نرائی میں در آئی — کھیتوں سے وہ پل پر سے گذر کر ادھر آئی
جنگل میں گھسی اور کلیلیں لگی کرنے — میدان میں آئی تو سپاٹے لگی بھرنے
دم بھر میں گذر جائے پری دشت و جبل سے — رفتار بلا کی کہ سوا ایک اجل سے

یا خون کر دی گشت کسانوں کی رگوں میں
یا نبض کرے جست جوانوں کی رگوں میں

صرصر ہو مقابل تو ہوا اسکی بنائے
بادل بھی دواں ہو تو یہ سایہ میں نہ آئے

نازک کمر اسکی لچکتی رہے ہر دم
وہ زور ہی سینہ میں کہ کوہ کا دم خم

وہ شان دلاویز شجر اور حجر کی
گلکاریاں بھاتی ہیں اسے شام و سحر کی

یہ دشت یہ گلگشت یہ وادی یہ فضا کیا
اک چین ہی حصہ میں نہو وہ تو بھلا کیا

اس کشمکش دہر میں بھی شاد ہے کتنی
یہ طوق و سلاسل میں بھی آزاد ہے کتنی

دھن اسکی اک بار جو ہو جائے روانہ
پلٹے نہ یہ پھر چاہے پلٹ جائے زمانہ

ہر کام سلیقے سے جو کرتے ہیں جہاں میں
اک راہ مقرر سے گذرتے ہیں جہاں میں

یوں آہنی آثار عمل چھوڑ کے جاؤ
جو مٹ نہ سکیں نقش قدم ایسے بٹھاؤ

میر و سودا کے قصیدوں پر ایک نظر

از جناب سید محمد صاحب قادری ایم۔اے (عثمانیہ)

اُردو شاعری کی خوش قسمتی کہیئے یا بدقسمتی لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اُردو میں قصیدہ گوئی کو ہرگز وہ فروغ و عروج نصیب نہ ہو سکا جو فارسی میں اس کو حاصل ہوا۔ اُردو شاعری کے عروج و ترقی کے ساتھ ہندوستان میں طوائف الملوکی اور افراتفری کی گرم بازاری شروع ہوگئی۔ قصیدہ گوئی جسکی بنیاد مشرق میں صلہ و انعام پر تھی، بادشاہوں اور امیروں کو اطمینان و آسایش اور عیش و عشرت کے دن نصیب نہ ہونے سے اُردو زبان میں کافی وسعت و ترقی حاصل نہ کر سکی۔ قدیم شعرائے اُردو کے کلام سے قطع نظر جس کا بڑا حصہ محققین کی مساعی حسنہ کے باوجود ابھی تک تاریکی میں ہے، اُردو شاعری کے دور ترقی و عروج میں بھی قصیدہ گو شاعر خال خال تھے اور اسکی بڑی وجہ مربیوں اور ممدوحوں کا نہ ہونا ہے۔ بعد کے زمانہ میں بھی یہی حال رہا اور دو مستثنیٰ ہستیوں کو چھوڑ کر کسی ریختہ گو نے قصیدہ کو درجہ کمال تک نہیں پہنچایا۔

اُردو قصیدہ گوئی کے مسلمہ استاد عموماً سودا اور ذوق ہی سمجھے جاتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ان دونوں نے قصیدہ نگاری میں جو جگر کاوی اور موشگافی کی ہے، اُردو کے کسی اور شاعر نے شاید ہی کی ہو۔ بہادر شاہ ظفر شاہ کا زمانہ غدر سے پہلے کسی قدر اطمینان میں ضرور گذرا ہے۔

سلطنت مغلیہ کے تقریباً تمام صوبے ایک ایک کرکے انگریزوں، مرہٹوں اور دیگر صوبہ داروں کی عملداری میں جا چکے تھے۔ بادشاہ کو کمپنی سے وظیفہ ملتا تھا اور قلعہ معلے کی چار دیواری میں جہانبانی وحکومت رانی کے بکھیڑوں سے الگ تھلگ رہ کر شعر وشاعری کرنے اور محدود دائرہ میں چین کے ساتھ امیرانہ مشغلوں میں زندگی بسر کرنے کا موقع حاصل تھا۔ اتفاق سے ذوق سا قانع اور بہت ہی کم صلہ پر بلیغ قصیدہ لکھنے اور تھوڑے سے انعام پر بڑی بڑی تعریفیں کرنیوالا شاعر مل گیا تھا۔ غرض اس طرح سستے داموں ذوق کے عمدہ قصائد اردو میں زینت افروز سرمایہ بن گئے۔ ذوق کے برخلاف سودا اول تو فطرتاً قصیدہ گو پیدا ہوئے تھے۔ دوسرے قدردانوں کے موقع بے موقع انعاموں اور قدردانیوں نے انھیں قصیدہ گوئی کا شوق دلایا اور اقتضائے زمانے سے ان کے مدحیہ اور ہجویہ ہر قسم کے قصیدے کی عام طور پر خوب داد دی گئی اور اس طرح وقت بے وقت انکی حوصلہ افزائی ہوتی رہی جس سے بالآخر اردو میں ان کے قصاید کا بیش بہا دفتر فراہم ہوگیا اور اپنے گوناگوں محاسن کیوجہ سے بعد کے ہر عہد اور زمانہ میں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

سودا کی قصیدہ گوئی کسی ایک پہلو پر ختم نہیں ہوتی۔ چونکہ ان کو اس صنف سخن سے فطری لگاؤ تھا اس لئے مدح وہجا دونوں کے لئے اسی کو استعمال کیا۔ پھر ان کے قصاید محض اہل دول کی مدح یا قدح تک محدود نہیں بلکہ بزرگان دین اور ائمہ معصومین کی شان میں بھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی انعام یا صلہ کے لالچ میں نہیں لکھے گئے بلکہ قصیدہ گوئی کے فطری ذوق اور خوش اعتقادی کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ سودا نے قصیدہ گوئی میں واقعہ نگاری کا عنصر بھی شامل کرلیا اور اس کو بھی کمال کے درجہ تک پہنچا دیا۔ ان کے ایک قصیدہ میں جس کا مطلع یہ ہے۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر وجواں ہے دعویٰ نہ کرے یہ کہ میرے منہ میں زباں ہے

سوسائٹی کے ہر طبقہ اور درجہ کے لوگوں کے مشاغل، فکر معاش کے طریقے، پریشان حالی اور پراگندہ روزی کی تمام جزئیات بڑی حسن وخوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ اسیطرح ایک اور قصیدہ میں نواب شجاع الدولہ والی آودھ اور حافظ رحمت اللہ خاں روہیلہ کی جنگ کا سماں دکھایا ہے۔ اسمیں بھی

واقعہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے اور اپنے ممدوح نواب شجاع الدولہ کی تعریف کے ساتھ قصیدہ میں جنگ کی مختصر سی تاریخ لکھدی ہے۔

سودا کے معاصرین میں کئی شاعروں نے قصیدہ گوئی کی ہوگی لیکن ان میں سے کسی کو بھی وہ شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو سودا کے حصہ میں آئی اور اس وقت سودا ہی اردو کے سب سے بڑے قصیدہ گو کہے جاتے ہیں معاصرین سودا میں سے اکثروں کے قصیدے اس وقت ناپید ہیں بعض شاعروں کے مخطوط دیوانوں کی دستیابی سے کچھ قصیدے مزید برآمد ہوئے ہیں ابھی تک معاصرین سودا کے قصیدوں کا کوئی ایسا ذخیرہ فراہم نہ ہوسکا کہ اس دور میں قصیدہ گوئی کی ترقی اور مختلف قصیدہ گو شاعروں کے محاسن و معائب کو انفرادی طور پر اور نیز ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کر کے دیکھا جائے۔

اسوقت معاصرین سودا میں صرف میر تقی میر ایک ایسے شاعر ہیں جن کا کلام (گو وہ بہت کچھ غلط ہے) عام طور پر شائع ہے اور نول کشور پریس کی توجہ سے اس کے نسخے خاص و عام کی دسترس میں ہیں۔ میر تقی میر کو عام طور پر غزل گو شاعر تسلیم کیا گیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ غزل گوئی میں انکا مرتبہ اردو کے شاعروں میں بہت ہی بلند ہے۔ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے میر تقی میر کے کلام میں ان کے قصاید کو بہت ہی پست اور ناقابل توجہ بتایا ہے اور بعض نے صاف طور پر لکھدیا ہے کہ وہ اس میدان کے مرد نہیں تھے۔ اگرچہ یہ رائے عامہ صداقت سے خالی نہیں لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ میر تقی نے اس صنف سخن میں بھی مثنوی کی طرح اپنا کافی زور قلم دکھایا ہے اور گو وہ مثنوی میں بہت زیادہ کامیاب رہے لیکن قصیدہ گوئی کے میدان میں سودا تو کیا ان سے کم تر شاعروں سے بازی نہ لیجا سکے۔ اس کمزوری کے باوجود ان کے قصیدے اس درجہ پست اور معمولی نہیں کہ انھیں سرے سے نظر انداز کر دیا جائے۔

قصیدہ گوئی میں میر تقی کی ناکامی کے کئی اسباب ہیں۔ اول تو وہ فطرتاً افسردہ طبیعت عشق پسند اور مسکین مزاج واقع ہوئے تھے اور جیسا کہ تذکرہ جلوۂ خضر سے ثابت ہے "ستم رسیدۂ عشق

بھی تھے ۔ انکی طبیعت میں رجائیت کی بہ نسبت قنوطیت و افسردگی کا غلبہ تھا ۔ انکا سارا کلام انکی طبیعت کی افسردگی و حزن پسندی اور درد ناکی کی پکار پکار کر شہادت دیرہا ہے ۔ نہ صرف وہ غمگین اور افسردہ دل رہتے تھے بلکہ انھیں دوسروں کی درد بھری اور مصیبت ناک داستانوں کے سننے اور بیان کرنے میں مزہ آتا تھا ۔ انکی تقریباً تمام مثنویاں حزنیہ ہیں اور حزن و غم بھی حد درجہ کا ۔ اپنی طبیعت کو اس افتاد نے انھیں قصیدہ گوئی میں نام آوری حاصل کرنے اور اپنا کمال دکھانے سے محروم رکھا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر دربار داری کے بکھیڑوں سے دور رہنا پسند کرتے تھے ۔ انھیں امراء کی مصاحبت سے گھر کی چار دیواری میں بے مونس و غمخوار پڑے رہنا زیادہ اچھا معلوم ہوتا تھا ۔ وہ جس زور اور ذوق سے اپنے گھریلو اور پالتو جانوروں کا ذکر کرتے ہیں، کسی امیر کی مدح و ستایش نہیں کرتے ۔

دوسرے یہ کہ تمام اصناف سخن میں انھیں صرف غزل سے غیر معمولی دلبستگی تھی ۔ وہ قصیدہ اور مثنوی میں بھی جہاں کہیں موقع پاتے ہیں، غزل گوئی پر اتر آتے ہیں اور وہی حسن و عشق درد و محبت کی باتیں بیان کرنے لگتے ہیں ۔ آصف الدولہ کے واقعات سیر و شکار پر مثنوی لکھ رہے ہیں اور اس اہتمام سے کہ گویا یہ انکا ایسا ہی یادگار کارنامہ ہوگا جیسا کہ شاہنامہ فردوسی کا اور شاہجہاں نامہ کلیم کا ہے لیکن یہیں بھی جنگل کی بہار دیکھکر میر تقی کی وحشت جوش کرتی ہے اور وہ غزل سرائی کرنے لگتے ہیں ۔ غزل سے انکا یہ انتہائی لگاؤ قصیدہ گوئی میں زور و کمال پیدا کرنے میں مانع تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قصیدے غزلوں کی آمیزش سے اپنے اصلی محاسن اور ضروریات فن کی فراہمی سے محروم رہے ۔

تیسرے یہ کہ انکی زندگی ابتدا ہی سے خانگی مصیبتوں اور پریشانیوں سے معمور رہی نہایت کم عمری میں شفیق والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور بھائی کی سرد مہری بلکہ ایذا رسانی سے دربدر ہوگئے ۔ آگرہ سے دہلی اور پھر دہلی سے لکھنؤ جانا پڑا لیکن فراغت اور بے فکری، عروج و اقبال کہیں بھی نصیب نہ ہوسکے ۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کی فیاضی کی بدولت اس کا اچھا موقع تھا کہ

میر تقی ان کی مدح سرائی کرکے اور لکھنو کی مجالس شعر و شاعری میں سرگرم حصہ لیکر دوسرے شاعروں کی طرح دولت اور شہرت حاصل کرتے مگر ابتدائی صدمات زندگی نے انھیں اسقدر نازک مزاج بلکہ طبیعت کا چڑچڑا بنا دیا تھا کہ "گلوں کے خندہائے بیجا" کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے دربار کے سرد و گرم اور سوسائٹی کی مخالف طبع باتیں کس طرح سہی جا سکتی تھیں۔ بادشاہ کی طرف سے انعام و اکرام کے باوجود انھیں درباری شاعر بننا گوارا نہیں تھا۔ وہ اول تو مشاعروں میں بہت ہی کم شریک ہوتے اور اگر کہیں جاتے بھی تو عام شاعروں کی روش کے برخلاف شاذ و نادر کسی بہتر سے بہتر شعر پر بلند آہنگ داد و تحسین نہیں بلکہ خاموشی کے ساتھ سر کا اشارہ کرکے اپنی پسندیدگی ظاہر کرتے۔ وہ اپنے کلام کو "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" سمجھتے اور بہت کم لوگ انکی نظر میں جچتے تھے۔ طبیعت کی اس نزاکت نے بھی انھیں قصیدہ گوئی کے میدان میں گھوڑے دوڑانے نہیں دئے۔

سچ تھے یہ کہ میر تقی کی زبان دہلی کے روزمرہ اور محاوروں تک محدود تھی۔ اس میں علمیت و ادعا نہیں۔ ان کے کلام کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی زبان کا مزہ ہے اور یہ سلاست و صفائی شیرینی اور گھلاوٹ روزمرہ بول چال کی زبان کے استعمال پر منحصر ہے۔ قصیدہ کی زبان میں جس درجہ شوکت الفاظ، زور بیان، تشبیہ و استعارہ کی نزاکت، تخیلات کی بلند پروازی اور الفاظ کی درو بست اس زمانہ میں ضروری خیال کیجاتی تھی، میر تقی کے ہاں مفقود ہے۔ انکی لفظیات ان تمام دقیع لغات اور دھوم دھام کے الفاظ سے خالی ہے۔ جو انکے معاصر قصیدہ گو سودا یا متاخر قصیدہ گو شعرا کا مایہ ناز سرمایہ ہے۔ ان کے مختصر دفتر قصاید میں اگرچہ بعض الفاظ نہایت دقیق بلکہ مغلق اور مشکل استعمال ہوئے ہیں لیکن شاذ و نادر ہی میر تقی کی زبان پر کھلتے ہیں۔ اکثر صورتوں میں بے موقع نگینے اور بے جوڑ قافیے معلوم ہوتے ہیں۔

میر تقی کے مطبوعہ و مروجہ دیوان میں صرف چھ قصیدے درج ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض غیر مطبوعہ اور مخطوطہ دیوانوں میں کچھ اور قصیدے پائے جائیں لیکن اسوقت یہ ہماری دسترس سے باہر اور بحث سے خارج ہیں۔ ان چھ قصیدوں میں سے ایک قصیدہ شاہ عالم بادشاہ ہندوستان کی اور ایک

آصف الدولہ نواب وزیر اودھ کی مدح میں ہے۔ ایک حضرت امام حسینؑ کی تعریف میں ہے اور باقی تین حضرت علیؓ کی منقبت میں۔ میر تقی کے ان قصاید کا سودا کے مختلف قصائد سے جو انہی مضامین سے متعلق ہوں، مقابلہ کیا جائے تو بہت ہی دلچسپ چیز ہوگی مگر اس کو ہم کسی آیندہ فرصت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں اور فی الوقت دونوں کے ایک ایک قصیدہ کا جو بہ ہمہ وجوہ قابل تقابل ہیں، انتخاب کرکے ان پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں فارسی کا ایک مشہور قصیدہ گو شاعر عرفی بھی زیر بحث آجاتا ہے اور ضمناً اس کے قصیدہ کو بھی اس تقابل میں شریک کرلینا پڑتا ہے۔

فارسی کے قصیدہ گو شعراء میں عرفی کا جو بلند مرتبہ ہے، اسکے مدنظر اردو کے یہ دونوں استادانِ سخن (میر و سودا) اسکے قصیدہ پر قصیدہ کہتے ہیں۔ عرفی کا یہ قصیدہ میر ابوالفتح کی جو دربارِ اکبری کا ایک ممتاز رکن تھا، مدح میں انشا کیا گیا ہے اور عرفی کے معرکۃ الآرا قصاید میں سے ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے

چہرہ پردازِ جہاں رخت کشد چوں بہ حمل　　شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

عرفی نے اس قصیدہ میں الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، تشبیہ و استعارہ کی نزاکت، مضمون کی بلندی، زور اور مبالغہ غرض قصیدہ گوئی کے تقریباً تمام محاسن پیش کئے ہیں اور سچ یہ ہے کہ اسکے قصاید میں ہر لحاظ سے یہ قصیدہ لاجواب ہے۔ اسکی تشبیب میں اس نے موسم بہار کی تمثیلی کیفیت دکھائی ہے اور اس زور بیان کے ساتھ جو قصیدہ کے لئے لازمی اور اسکی اپنی خاص خصوصیت ہے۔ اسکی تشبیب کے چند شعر دیکھئے ؎

خون سودائی شب زائد و فاسد گردد　　لاجرم نشتر روزش بکشاید اکحل
روز چوں کرم پریشم ہمہ بر خویش تند　　ہر چہ شب رد کند از معدہ چو زنبور عسل
بعد ازیں ترجمہ روز شود صاحب گل　　بعد ازیں شب بہ نگیں ثبت کند عبد اُمل
وقت آنست کنوں کز اثر عیش و نشاط　　مے نگنجد بہ صراحی و صراحی بہ بغل
نا سیہ چوں چمن سبزہ دہد اماش　　ناقص از کارگہ آرند بہ باغ ار مکمل

عرق از شبنم گل داغ شود بر رخ حور — اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل
چمن آید بہ چمن بہر تماشائے جمال — بلبل آید بر بلبل بہ تمنائے غزل
گیرد از فیض ہوا طبع جواہر دارد — خصمت ار سودۂ الماس کند در مکحل
بسکہ ہر خار گلے کردہ عجب نیست اگر — یاسمیں بشگفد از نشتر زنبور عسل
حور گیسو بہ میاں بستہ در آید بہ چمن — تا لبالب کند از سنبل و گل جیب و بغل
بسکہ از سنبل و گل یافت صفا روئے زمیں — کز پئے بوسہ و لب را ہم آرد جدول
لیلیٰ از گوشۂ محمل بہ نمود دست جمال — یا بود لالہ کہ سر بر زدہ از گوشۂ تل

میر و سودا دونوں نے اسکی تقلید میں اسی زمین میں قصیدے لکھے اور دونوں کے یہ زیر بحث قصیدے حضرت علیؓ کی منقبت میں ہیں۔ دونوں نے تشبیب میں بہار کا سماں دکھایا ہے۔ میر تقی کے دوسرے تمام قصاید سلیس اور صاف ہیں اور اُسی زمانہ میں جو چیز زین قصیدہ گوئی کے لئے معیار کمال سمجھی جاتی تھیں، ان سے معرا ہیں۔ البتہ یہی ایک قصیدہ ایسا ہے جسکی زمین بھی شگفتہ اور مضمون بھی ادق ہے۔ ان کے سارے کمال قصیدہ گوئی کا مظہر یہی ایک قصیدہ ہے۔ اسکے برخلاف سودا کا کمال سخن اسی ایک قصیدہ پر منحصر نہیں۔ ان کے تقریباً تمام قصاید اسی شان و مرتبہ کے ہیں۔ اِس قصیدہ میں بھی انکا پورا زور کلام موجود ہے اور یہ انکی قصیدہ نگاری کے خصائص کا حامل ہے۔

دونوں کے قصیدوں کے مطلعے نہایت رفیع اور نفیس ہیں۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل — رنگِ گل جھمکے ہے ہر بات میں بیگی اوجھل

سودا کہتے ہیں ؎

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل — تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

دونوں شاعروں نے بہاریہ تشبیب لکھی ہے اور پورے شاعرانہ زور کے ساتھ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ممکن نہیں۔ دونوں نے تخیل اور مبالغہ میں کمال کیا ہے۔ سودا کہتے ہیں:

واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ — آب جو قطع لگا کرنے روش پر مخمل
بار سے آبِ رواں عکس ہجومِ گل کے — سوئے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بیکل
شاخ میں گل کے نزاکت یہ بہم پہنچتی ہے — شمع ساں گرمیِ نظارہ سے جاتی ہے پگل
جوشِ روئیدگیِ خاک سے کچھ دور نہیں — شاخ میں گاؤزباں کے بھی جو پھوٹے کونپل
دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک — دین میں قسمِ جہادات سے شاید ہے خلل
فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنے — کہیں دعویٰ خدائی نہ کریں لات و ہبل
در ایام کے پیش از مدد نامیہ سے — بچۂ مرغِ چمن تخم سے آتا ہے نکل
دانہ جس شور زمیں میں نہ پھلا و ہقاں سے — سبز واں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل
کشت کرنے میں ہر اک تخم سے از فیض ہوا — گرتے گرتے یہ زمیں برگ و بر آتا ہے نکل
برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے — گل کو دیکھو تو نگہ جائے ہے سنبل پہ پھسل

یہ ہے نمونہ سودا کے بلند پرواز تخیل اور مبالغہ آرائی کا۔ میر صاحب بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں۔ کہتے ہیں ؎

وقت وہ ہے کہ زبس شوق سے چشمِ بلبل — خوبیِ دلکشیِ گل و دیکھنے کو ہے احول
چشم رکھتا ہے تو چل فیض ہوا کو ٹک دیکھ — نرگس اگتی ہے جہاں بوئی تھی دہقانے
خونِ خمیازہ کشِ عاشقیِ پنجۂ گل — دونوں نکلے ہیں تہ خاک سے لب بستہ و بغل
برگِ گل فیض ہوا کرتا ہے ہر اخگر کو — آگ کی کہیں سلگا کے رکھے ہیں منقل

تخیل اور مبالغہ سے قطع نظر کرکے واقعیت اور منظر نگاری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ان دونوں کی تشبیب میں ایسے کئی شعر ہیں جنکی لطافت و تاثیر میں کلام میں بالخصوص سودا کے ہاں باوجود زورِ تخیل تشبیب کے وسیع ہونے کیوجہ سے سادہ اور لطیف تشبیہ کے اشعار زیادہ ہیں سودا

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک — دیکھکر باغِ جہاں میں کرمِ عزّ و جل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض — ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل

بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی — پوشش چھینٹ قلمکار بہر دشت و جبل
تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے ترگ — ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
آب جو گرد چمن لمعہ خورشید سے ہے — خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول
سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پہ — ساغر لعل میں جوں کیجے زمرد کو حمل
سنگ نے تنبۂ آئینہ کیا ہے پیدا — تیغ کہسار ہوئی لیک ہوا سے صیقل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیابانوں میں — پانوں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کیطرح — چشم بیمار گلستاں میں جھپکتی نہیں پل

میر ؎

جوش گل یہ ہے جہاں تک کرے ہے کام نظر — لالۂ زرکش گل سے ہیں بھرے دشت و جبل
لطف روئیدگی مت پوچھ کہ میں شبنم سے — سبزۂ غلطاں ہے لب جو پہ کہ خواب مخمل
سیر کر تازگی و خرمی و شادابی — خشک بھی شاخ نے اب سبز نکالی کونپل
نکلے ہے لالہ زبس چاک کر اب سینۂ تل — آتش گل سے جلا کرتا ہے سارا جنگل

میر تقی اپنی غزل پسندی سے تمہید میں بہار کا ذکر کرتے کرتے مطلع ثانی سے غزل شروع کر دیتے ہیں لیکن یہ غزل قصیدہ کی شان کی ہے اور اس میں سوز و گداز اور سادگی و شیرینی کی بجائے شوکت الفاظ، تشبیہ و استعارہ کی نزاکت پائی جاتی ہے۔ میر تقی کی یہ غزل، قصیدہ سے دور نہیں جا پڑتی۔ اس کے متفرق اشعار دیکھئے قصیدہ کی مناسبت ہر لفظ میں ملحوظ رکھی گئی ہے ؎

تیرگی اپنے ستارے کی ہے سب پر روشن — آفتاب آتا ہے یاں دن کو جلا کر مشعل
غنچۂ خام کو چوں پھونک سے کھولے ہے طفل — یوں بھی کر دیکھا یہ دل عقدہ ہی مالا نجیل
شیخ کے قد کی درازی کے تئیں حال میں دیکھ — یاد آتا ہے جوانوں کے تئیں رقص جمل
کودنے کو جو اٹھا سر پہ اٹھالی مجلس — دیکھئے بیٹھے جو یہ اونٹ تو بیٹھے کس کل

تخلیص میں قصیدہ گو شاعر کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ تمہید سے اصل مضمون یعنے مدح کیطرف

اس طرح گریز کرتا ہے کہ گویا بات سے بات پیدا ہوگئی اور سامع کا ذہن غیر محسوس طور پر مدح کے اشعار کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ میر تقی نے اس قصیدہ میں غزل کے سلسلہ میں دو تین شعر آسمان کی شکایت میں لکھے ہیں اور یہ کہتے ہوئے کہ

کیا ہے اندھیر فلک کی کہ نہیں ملتی داد — روز خورشید نکلتا ہے جلا کر مشعل
جو ہے سو دست بہ دل خاک بسر ہے اس سے — میں بھی نکلوں ہوں سدا منہ پہ لیے خاک کو مل

ممدوح (یعنے حضرت علیؓ) سے امداد کی درخواست کی ہے اور اس گریز کے ساتھ مدح شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف سودا نے شرح و بسط سے موسم بہار کی کیفیت بیان کر کے اسکا اپنی شاعری سے مقابلہ کیا ہے اور کس قدر فخر و تغلی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے کہ

نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے — ہے فضا اسکی تو دو چار ہی دن میں فیصل
اور میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام — رہیگا سبز یہ ہر مجمع و ہر دنگل
تا ابد طرز سخن کی ہے میرے رنگینی — جلوۂ رنگ چمن جاویگا اک آن میں ڈھل

ممدوح کی طرف یوں گریز کی ہے کہ یہ سارا فیض سخن اسی کی مداحی سے حاصل ہے۔

اگرچہ دونوں قصیدوں کی ممدوح ایک ہی ذات ہے لیکن میر تقی کا قصیدہ زیادہ طویل نہیں اور اسی وجہ سے ممدوح کی بعض صفات بیان کرنے میں انہیں بہت ہی اختصار سے کام لینا پڑا اور بعض چیزیں تو انہوں نے قطعاً چھوڑ دیں۔ سودا نے حضرت علیؓ کی عدالت و لصفت شعاری کی تعریف میں جو جدت اور قدرت دکھائی وہ میر تقی کے ہاں نہیں پائی جاتی سودا کہتے ہیں

ہیبت عدل یہ تیری ہے کہ ہر دشت میں شیر — واسطے در دسر آہو کے گھسے ہے صندل
سامنے بز کے یہ کیا دخل کہ نکلے آواز — گرگ کے پوست کو منڈھوا کے بجائیں جو دہل
مور و سنگ ہو شیشہ تو غضب سے کر دے — کوہ کو ہر دو کف دست میں ملکر خردل
ذکر و اذکار نرے حفظ کا گر آجاوے — کسی محفل میں بہ تقریب زباں پر یک پل
شعلۂ شمع کی گرمی سے یقیں ہے دل پر — شب سے تا صبح قیامت نہ سکے موم پگل

معدلت کیش تری ذات ہے ایسی شاہا — آنچ سے آگ کی نمک خس میں آجاوے جل
کرۂ نار تجھ آتش سے غضب کے جل کر — چشم لو لو فلک کیلئے ہووے کاجل
مرغ زرّین فلک عہد میں تیرے شاید — بوجھ کر دانہ گیا ہے کسی اختر کو نگل
تار تار اسکے جو یہ بال و پر آتے ہیں نظر — باز قدرت نے ترے پنجہ سے ڈالا ہے مسل

سودا کی اس تفصیل و بلند خیالی کے مقابلہ میں میر تقی کے ہاں ممدوح کی ساری معدلت کیشی و غضب وغیرہ کا بیان صرف اس شعر میں ختم ہو جاتا ہے۔

لقمۂ تظلم نہیں پہنچا عدالت میں تری — باز نگلی ہوئی چڑیا کے تئیں دے ہے اگل

اس پورے قصیدے میں میر تقی نے تشبیب کے علاوہ جس حصہ پر اپنا پورا زور سخن صرف کیا ہے وہ گھوڑے کی تعریف ہے۔ سودا نے بھی یہ مضمون لکھا اور خوب لکھا ہے مگر تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر تقی کا بیان ان کے بیان سے زیادہ لطیف اور دلچسپ ہے۔ گھوڑے کی برق رفتاری بیان کرنے کے لئے مصور کے خیال دوڑانے اور تصویر بنانے میں ناکام رہنے کا ذکر حقیقت میں بڑی لطافت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ میر ؎

کیا لکھوں اسپ سبکسیر کی اسکے تعریف — اوہم خامہ بھی لکھتے ہوئے جاتا ہے اچھل
عناں اُنکی اچک لیتی ہے اُسکا راکب — جلدی پویہ میں دکھلاوے ہی کیا کیا چھل بل
اس فلک سیر کا میدان مقرر ہیگا — نگ پو کے لئے اثنائے ابد اور ازل
قابو پانے کے لئے اسکے سوار اُس پہ سدا — کہتے ہیں مدعی اس اسپ کے تئیں مارے چل
راکب اسکا کرے ہے سنکے تبسم یہ بات — یعنے ان گیدیوں کے کچھ ہے دماغوں میں خلل
جان یہ ہے ترے گھوڑے میں تا روز جزا — گرد کو اس کے نہ پہونچے گی کبھو اسکی اجل
اک مصور نے اُسے دیکھ کے دوڑایا خیال — دیکھوں اس باد کی مجھ سے بھی سکے نکل نکل
سر و سینہ کو کمر تک تو بنایا رکھ ہاتھ — اڑگیا صفحۂ کاغذ پہ سے چھوتے ہی کفل

سودا نے بھی اس مضمون کو بڑے زور و شور سے بیان کیا ہے اور تخیل کی بلند پروازی

دکھانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا وہ اس کے باوجود اس لطافت اور حسن نہ پیدا کر سکے جو میر تقی کے مندرجہ بالا اشعار میں ہے۔ ممدوح کے گھوڑے اور توسن وہم کی مسابقت اور آخر الذکر کے پہلا ہی قدم اٹھانے میں اول الذکر کا اپنی دوڑ پوری کر لینا اچھا خیال ہے لیکن اس میں مصور کے تصویر بنانے کی کوشش اور صفحۂ کاغذ، کاغذی تصویر کے اڑ جانے کی لطافت کہاں۔ سودا کے دوسرے اشعار یقیناً اچھے اور بہت اچھے ہیں ؎

زیر راں ہے جو ترے رخش فلک سیر شہا ۔۔۔ ہے وہ محبوب جسے کہیئے نہایت اچپل
شکل کیا اوسکی بتاؤں کہ جسے شوخی سے ۔۔۔ دائرہ بیچ تصور کے نہیں پڑتی کل
اوسکی سرچوٹی کا میں حسن کہوں کیا جیکے ۔۔۔ زلف معشوق کا دیکھے سے نکلجاوے بل
یرغہ و کام سے ماہر ہے کچھ اسکی رفتار ۔۔۔ ہے چھلاوے کی طرح چال میں اسکے چھل بل
جست و خیز اسکی بیاں کیجئے گر پیش حکیم ۔۔۔ اعتقادات حکیمانہ میں آجائے خلل
قاش سے زین کی ذرہ جو اوچک جاتے عنان ۔۔۔ مارے جوں روئے زمیں پشت فلک کو کھنڈل
یلہ وہ ہاتھ سے شاطر کے اگر ہو جاوے ۔۔۔ پڑ سکے پیچھے نہ اسکے کوئی حرز اسکے کفل
میخ سے نعل کے اوسکے میں اگر دوں تشبیہ ۔۔۔ کرے دورے کو تمام اپنے بیک آن رحل
اسکی جلدی کا تو کیا ذکر ہے سبحان اللہ ۔۔۔ نسبت اوسکی فرس ایسا کہ جسے کہیئے اچل
توسن وہم کو دوڑائے ساتھ اسکے تو ہو ۔۔۔ بازگشت اسکا تمام اسکے بگام اول
خانۂ زین کب اسکا ہو کم از بیت اللہ ۔۔۔ تجھ سے معنی کی نشست اسمیں ہو جب روز ازل

میر تقی نے اپنے قصیدہ میں حسن خاتمہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ گھوڑے کی تعریف ختم کر کے صرف تین شعر کہے ہیں اور اسی پر قصیدہ تمام کر دیا ہے۔ یہاں پہنچکر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سارا زور بیان ختم ہو گیا ہے اور طبیعت رک رہی ہے۔ اس اختتامی حصہ کے ایک شعر میں اپنی پریشانی دوسرے میں انصاف کی درخواست اور تیسرے میں دعا ہے مگر ہر ایک مضمون ناتمام اور بے مزہ۔ انہوں نے قصیدہ جس شان سے شروع کیا تھا اسکا تقاضا یہی تھا کہ اسے خاتمہ تک اسی زور شور سے

لکھا جاتا مگر یہاں آکر اسکی ساری عظمت یکایک ختم ہوجاتی ہے اور پڑھنے والا اپنے دل پر اچھے نقوش تاثر مرتسم نہیں پاتا۔ اس کے برخلاف سودا نے خاتمہ میں وہی زور اور حسن و خوبی قائم رکھی ہے جو ابتدا سے ان کے قصیدہ میں پائی جاتی ہے۔ ممدوح کی ایک ایک صفت تفصیل و مبالغہ سے بیان کرنے کے بعد بھی اپنا عجز بیان ظاہر کرتے ہوئے دعا کرتے ہیں۔

طاقتِ طول سخن آگے بھی ٹک سودا کو بخش اے قوتِ بازوئے نبی و مرسل

ورپھر اس ارادہ کے ساتھ کہ۔

چاہتا ہے کرے آخر وہ دعائیہ پر نظم تجھ مدح کی بہتر ز کلامِ اوّل

"دعائیہ" کے اشعار لکھتے ہیں اور اسی دھوم دھام کے ساتھ جو "کلام اوّل" میں پائی جاتی ہے۔ انکے افتتاحی اشعار پڑھکر قاری ان کے زور بیان اور شوکت الفاظ کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انکا طویل دعائیہ ایک قطعہ بند ہے۔ اس میں مسلسل کئی اشعار میں انتہائی وقت کا اظہار کرکے اسوقت تک محبان علیؓ کی مرادیں بر آنے اور آپکے دشمنوں کو بے فیض رہنے کی دعا دی ہے۔ اس حصہ میں بھی تشبیہ و استعارہ مبالغہ اور تخیل کی رفعت اسی طرح ان کے پیش نظر ہے جس طرح تمہید اور اصل مدح میں تھی اس سے انکا سارا قصیدہ ربط و ہم آہنگی سے معمور اور ہر طرح مرصع بن گیا ہے۔

انہی قصیدوں میں میر و سودا کے ہاں بعض علیحدہ علیحدہ بیانات بھی ہیں جن کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تاہم وہ بالکل نظر انداز کردینے کے قابل نہیں۔ سودا کے ہاں ایک مقام حضرت علیؓ کی تلوار کے ذکر کا ہے۔ میر تقی نے اس کو بالکل چھوڑ دیا اور اسکی بجائے ممدوح کی طاقت اور حملہ کی قوت کا ذکر کیا ہے۔ سودا نے تلوار کی تعریف میں تخیل کی بلند پروازی دکھانے میں کمال کیا ہے اور میر تقی کے ہاں گھوڑے کے بیان میں جو لطف و خوبی ہے وہی سودا کے اس بیان میں ہے۔ نیز سودا نے اس ضمن میں ممدوح کی شجاعت اس انداز میں کی ہے کہ سارے قصیدہ میں اسکی جگہ خالی نہیں معلوم ہوتی اور کہیں علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی ؎

وصف تجھ تیغ دوسر کا کہوں کیا اے شیر دل محنوں کی جو میداں میں کرے ہے صیقل

اسکے قبضہ پہ جو ہو دست مبارک تیرا — نہ رہیں دین محمدؐ کے سوا اور ملل
کھینچ اُسے میانی سے گر تو کرے میداں میں جنبش — استقامت کا زمانہ کے قدم جائے نکل
عرض میں سے دو طرف ہو کے لگے بہنے طول — پڑے دریا میں جو وہ تفرقہ پرداز اگل
جمع کب رہ سکیں اعدا کے حواس خمسہ — دیکھ کر اسکو علم ہاتھ میں تیرے یک پل
توام اجرا جو موالید کے ہیں یک دیگر — منجمد رہنے میں ان کے وہیں آجائے خلل
نرم اور سخت مساوی ہے کسی پر آوے — خواہ بر روئے فرخواہ وہ بر پشت حمل
اسکو آسیب نہیں صورت شمشیر قضا — نہ جھڑے وہ نہ مرے اور نہ پڑے اسمیں بل

ترغیبِ عمل

(یہ نظم بزمِ طیلسانین کے جلسہ کرسی نشینی کے وقت پڑھی گئی تھی۔)

از سید احسن صاحب شمیم متعلم بی اے کلیہ جامعہ عثمانیہ۔

ساقیٔ گلعذار اٹھ جام شراب ناب دے
ذوقِ طرب اساس دے لذتِ بیحساب دے

آج تو ہیں تجلیاں صحنِ چمن میں نغمہ زن
پھول ہیں جام جسم نما اوس ہے بادہ کہن

آج کہ جب سرور خیز گردشِ کائنات ہے
ایسے میں بھی نہ ہم پئیں یہ بھی عجیب بات ہے

میری حیاتِ کامیاب زندگیٔ زبوں نہو
ایسی شراب تیز دے جس سے کبھی سکوں نہو

چشمِ حقیقت آشنا دیدۂ جستجو رہے
قلب کا صرف ہے یہی خانۂ آرزو رہے

ایسی ہو بیخودی مری جسپہ نثار ہوش ہوں
اہلِ خرد مری طرح اور بھی بادہ نوش ہوں

صانعِ کی ہو فقط تلاش صنعت کارسازیں
رک نہ سکے کہیں نگاہ جلوہ گہِ مجاز میں

قلب ہو ذوق آشنا رنج کی صورتیں نہوں
آئینہ خلوص ہو جسمیں کدورتیں نہوں

پورا ہو مقصدِ حیات میرے خدائے کارساز
زندگیٔ شمیم ہو کیفِ عمل کا سوز و ساز

مسئلہ بیکاری اور ہندوستان

از

جناب ظہیر الدین احمد صاحب ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی۔ پی۔ ایس سابق متعلم کلیہ

زمانہ حاضرہ کے پریشان کن مسائل کے منجملہ ایک اہم مسئلہ بیکاری کا ہے۔ یورپ میں اس مسئلہ کی وجہ سے صورت حال دن بدن نازک ہوتی جارہی ہے۔ وہاں ایک مدبر یا ایک حکومت کو جو پہلی فکر ہوتی ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ ملک کے اندر زیادہ سے زیادہ لوگ کام پر لگے رہیں۔ لیکن باوجود ان تمام کوششوں کے روزانہ ہم کو اخبارات میں مختلف ممالک کے اعداد و شمار دکھائی دیتے ہیں کہ انگلستان کے اندر اتنے لاکھ بلکہ کروڑ انسان بیکار ہیں، تو فرانس میں اوس سے زیادہ، اور دیگر ممالک میں علیٰ ہذا۔ اس کے معاشی نتائج بھی روزانہ ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کارخانوں میں آئے دن کی ہڑتالیں، مزدور پیشہ طبقوں میں ہلچل اور اصلداروں کے خلاف معاشی جنگ۔ لیکن تعجب انگیز بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس صورت حال کے ساتھ ساتھ ان ہی ممالک کی فراوانی دولت کا حال سنکر ہم قارون کے قصے بھول جاتے ہیں۔ ایک ہی ملک کے اندر لوگ اشیاء ضروریہ محتاج زندگی کے نہ ملنے سے بھوکوں مرتے ہیں اور پھر اسی ملک میں دولت کی یہ فراوانی بادی النظر میں ایک معمہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم ان حالات کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی چنانچہ ہمارے موضوع کے لئے اس صورت حال

کا مطالعہ کرنا ضروری ہے لیکن اس سے قبل ہم مسئلہ بیکاری کی اہمیت کے چند در چند اسباب پر غور کریں گے

اٹھارویں صدی کے معاشیین میں ایک طبقہ قنوطیئن کا پیدا ہوگیا تھا جنکی سرکردگی کا اعزاز مشہور ومعروف مالتھس (Malthus) کو حاصل ہے۔ اُس نے غور کیا کہ پیدائش دولت اور اضافہ آبادی میں کوئی تناسب نہیں ہے۔ یعنی آبادی کے اضافہ کے ساتھ انسانی زندگی کی ضروریات میں متناسب اضافہ نہیں ہوتا مقابلتہً آبادی بڑھتی رہیگی اور ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ انسان لاکھوں کی تعداد میں بھوکوں مرینگے۔ لہٰذا اُس نے ان موانعات کو جو اضافہ آبادی پر قدرت کے طرف سے عاید کئے گئے ہیں تسلیم کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو بھی ازراہ ہمدردی پند ونصیحت کی کہ وہ حتی الامکان زہد وتقویٰ اختیار کریں۔ اور انسانی آبادی کو بڑھانیوالی باتوں سے پرہیز کریں۔ مالتھس کے اس نظریہ کا جو زبردست اثر یورپ پر پڑا وہ اخلاقی اور معاشی نقطۂ نظر سے مفید ثابت نہیں ہوا۔ تاریخ سے بھی نظریۂ آبادی کی توثیق نہیں ہوتی چنانچہ آج دولت کی پیدائش کی رفتار دن دونی رات چوگنی ہے اور اکثر ممالک میں اضافہ آبادی مقابلتہً سُست رفتار ہے باوجود اس کے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مالتھس کا نظریہ غلط تھا۔ اب بھی ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اوس نے جو کچھ بھی خیالات دنیا کے سامنے پیش کئے وہ بالکل صحیح تھے جو اس کی دور اندیشی پر دلالت کرتے ہیں۔ دراصل کسی ملک کی آبادی کے بڑے حصہ کو بیکاری، اور فاقہ کشی کی آفت سے بچانے کے خیال سے یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ حالانکہ اس کے زمانہ میں مسئلہ بیکاری کا وجود بھی نہ تھا۔

ایک زمانہ تک واقعات سے اس نظریہ کی توثیق نہیں ہوئی۔ بلکہ تکذیب ہوتی رہی اوسکے وجوہ مختلف تھے۔ مالتھس کو کیا معلوم تھا کہ دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگا۔ جسکی وجہ سے وہ تمام حالات، وماحول جس سے متاثر ہوکر اوس نے یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ سب کے سب یک لخت تبدیل ہوجائیں گے۔ اوس نے اپنے زمانے میں ہوائی جہاز تو ایک طرف ریل کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ یہ عظیم الشان فیکٹریاں انگلستان میں موجود تھیں اور نہ زمانہ حاضرہ کی دیگر رنگا رنگیاں۔ اوسکے زمانہ میں انگلستان ابھی ایک زرعی ملک تھا اور وہاں کی صنعت وحرفت اوس وقت تک کارخانوں

کی محتاج نہ تھی۔

جرمنی کے مشہور محقق معاشیات، فریڈرک لسٹ (Feriedick List) نے ہر ملک کی معاشی ارتقائی تاریخ کو چار حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جہاں ابھی انسان کو تمدن اور معاشرہ سے زیادہ واسطہ نہیں ہوتا بلکہ شکار کے ذریعہ گذر اوقات کر لیا کرتا ہے۔ دوسرا دور ملک میں زراعت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ زراعت کو فروغ و ترقی ہوتی ہے۔ اس دور سے نکلکر ہم ایک تیسرے دور میں داخل ہوتے ہیں جبکہ ملک میں زراعت کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ صنعت و حرفت کا آغاز ہوتا ہے۔ چوتھا اور آخری دور وہ ہے جبکہ رفتہ رفتہ ملک میں زراعت مفقود ہوتی جاتی ہے اور صنعت و حرفت کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

مالتھس نے جس زمانہ میں اپنا نظریہ پیش کیا تھا اوسوقت انگلستان، ابھی بقول لسٹ تمدن کے تیسرے درجہ میں تھا۔ لیکن اوس کے بعد ہی انگلستان میں جب چوتھا اور آخری دور شروع ہوا تو اوس کا نظریہ منطبق نہ ہو سکا۔ مسئلہ بیکاری کی اہمیت کے آغاز پر غور کرنے کے لئے ہم کو ان حالات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے جنکی وجہ سے مالتھس کا یہ نظریہ غلط ثابت ہوا۔ انگلستان میں انقلاب صنائع کا واقع ہونا سب سے بڑا سبب ہے۔ اگرچہ ہم اس تبدیلی کو انقلاب کہتے ہیں۔ لیکن یہ صحیح معنی میں کوئی انقلاب نہیں ہے۔ اس لئے کہ لفظ 'انقلاب' کے ساتھ ہی جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی اچانک تبدیلی کا موجودہ صورت حال میں پیدا ہو جانا۔ اس لحاظ سے تو ہم انقلاب صنائع کو 'انقلاب' نہیں کہہ سکتے۔ لیکن فی الواقع پیدائش دولت کے طریقوں میں جو عظیم الشان تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں گو اچانک نہ سہی تاہم اُن کو صحیح طور پر انقلاب کہہ سکتے ہیں۔ اور اس کیفیت کے لئے اس سے بہتر اصطلاح کا تجویز کرنا دشوار ہے۔ اس انقلاب سے پیشتر پیدائش دولت میں انسانی محنت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی ہر شخص اپنی ضروریات مہیا کرنے کے لئے وہی چیز پیدا کیا کرتا جسکے لئے وہ موزوں تھا۔ اور اوس چیز کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کر کے اوس کے معاوضہ میں جو روپیہ ملتا اوس سے اپنی زندگی کی ضروریات حاصل کرتا۔ اس طریقہ سے ہر شخص انفرادی طور پر اپنے لئے دولت پیدا کیا کرتا تھا بہ الفاظ

دیگر ہر شخص پیدائش دولت میں آزاد تھا۔ ایک صناع کو پیدائش دولت میں جن آلات کی ضرورت ہوتی تھی وہ اس کے ذاتی ہوا کرتے تھے۔ بالعموم زمین بھی اوسی کی ہوتی تھی محنت ذاتی اصل وزمین ذاتی اس طرح تمام عاملین پیدائش کا وہ مالک ہوتا تھا۔ لیکن انقلاب صنایع کے بعد صورت حال دگرگوں ہوگئی۔ انسان کی ذاتی محنت کی اہمیت کم ہوگئی اور اس کے بجائے دوسری قسم کی محرکہ قوتیں پیدا ہوئیں۔ صنعت وحرفت میں وخانی قوت اور رفتہ رفتہ برقی قوت کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے طریقے رائج ہوئے غریب دستکار بڑی بڑی مشینوں کا مقابلہ نہیں کرسکے مجبوراً انھوں نے اپنے آبائی پیشوں کو چھوڑ کر اور اپنی انفرادی آزادی کو خیرباد کہکر بڑے بڑے کارخانوں میں کام کرنا شروع کیا۔ یہاں اون کی حیثیت تنخواہ یاب مزدوروں کی ہوگئی۔ کارخانہ دار آجر اور محنت کرنے والے مزدور۔ اس طرح سے دو طبقے وجود میں آئے۔

اس صنعت وحرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ انگلستان کو سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا اور مفتوحہ ممالک کو معاشی بازار بنانے میں کوئی دریغ نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صنعت وحرفت کی روز افزوں پیداوار کے فروخت کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوی بلکہ مصنوعات کی طلب روز افزوں بڑھتی گئی۔ لہذا ابتدا میں بیکاری کے مسئلہ کی اتنی اہمیت حاصل نہیں ہوئی جیسے کہ ہونی چاہیے تھی۔ مگر تقریباً اوسی وقت پیدا ہوئی جبکہ انگلستان کے لوگوں نے زراعت کو بالکل خیرباد کہا اور سب نے صنعت وحرفت کو اپنا پیشہ قرار دیا۔ اب سارا ملک اصلدار اور مزدور کے دو طبقوں میں منقسم ہوگیا۔ یہیں سے دونوں طبقوں میں باہمی منافرت اور معاشی جنگ یعنی (Class Struggle) کا آغاز ہوتا ہے۔ اصلدار بالعموم متمول اور مالدار ہونے کی وجہ سے سیاسی اقتدار کے بھی مالک تھے اور دوسری طرف مزدور بے بس ولاچار۔ اب ان دونوں کا مقابلہ ٹھیرا۔ اس مقابلہ کا نتیجہ ظاہر۔ اصل دار اپنی فوقیت سے ناجایز فائدہ اٹھانے لگے اور غریب مزدور اس معاشی جنگ میں ناکام رہے لیکن اس صورت حال کو پیدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اجتماعیت اور اشتراکیت کا نیا تخیل دنیا میں نمودار ہوا۔ کارل مارکس (Karl Marx) نے اپنی کتاب داس کیپٹیل

میں یہ نظریہ پیش کیا کہ دولت محض محنت کا نتیجہ ہے دوسرے عاملین پیدائش کی اہمیت بہت کم ہے اور اصلدار جو فائدہ اٹھاتا ہے اوسکی حیثیت محض غاصبانہ ہے اس نظریہ کے ساتھ ہی کاروباری دنیا میں ایک عظیم الشان ہلچل پیدا ہوگئی۔ جسکا نتیجہ مختلف فرقہ بندیاں اور نظریہ سازیاں ہیں جنکو کہیں سوشلزم سے ملقب کیا جاتا ہے کہیں بالشویزم سے اور کہیں فیبی زم سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان تمام طریقوں میں اگرچہ فروعی اختلاف ہیں لیکن اصل اصول ان سب کا ایک ہی ہے۔ کہ دنیا میں اصلداروں کی بڑھی ہوئی قوت اور ان کے اقتدار کو روکا جائے اور غریب مزدور کو اس کا حق برابر دلایا جائے۔

یہاں تک ہم نے اس امر کو ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ محنت کی اہمیت موجودہ زمانہ میں کیا ہے معلوم ہوا کہ مشنری کی دریافت اور ترقی سے جب انسانی محنت کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو ایک نیا تخیل نمودار ہوگیا کہ دنیا میں سوائے محنت کے کوئی اور عامل دولت پیدا نہیں کرتا۔ ان دونوں متضاد نظری تخیلات کا عملی اثر بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ آجر جب یہ دیکھتے ہیں کہ انسانی محنت سے زیادہ مشنری فائدہ مند ہے تو اصول بدل پر عمل پیرا ہوکر وہ مشنیری کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ الفاظ دیگر ایک کام جو ابتک دس آدمی کیا کرتے تھے اب صرف ایک بچہ مشینری کو حرکت دیکر انجام دیسکتا ہے گویا اس طرح سے ابتک جو دس آدمی کام پر لگے ہوئے تھے وہ ایک مشینری کے استعمال سے بیکار ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اون کے بیکار ہونے سے دولت کی پیدائش میں کوئی فرق نہیں پڑتا دولت پیدا ہوتی ہی رہتی ہے اور اصلدار یا آجر اس سے فائدہ اٹھاکر دن بدن مالدار ہوتے جاتے ہیں۔

اب ہمیں اس معمہ کے حل کرنے میں دشواری باقی نہیں رہتی کہ ترقی یافتہ ممالک میں دولت بکثرت پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان بھوکوں مرتے ہیں۔ یورپ میں لوگ بھوکے رہتے ہیں تو اسوجہ سے نہیں کہ وہاں افلاس ہے یا دولت پیدا نہیں کی جاتی بلکہ اس وجہ سے کہ دولت برابر تقسیم نہیں ہوتی لہٰذا وہاں کے مدبّر کو جو فکر لاحق ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کس قسم کے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے دولت صحیح طور پر تقسیم ہوسکے۔ پنانچہ اس مقصد کو پیش نظر رکھکر

مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ جنسے ہمیں یہاں چنداں بحث نہیں ہے۔

مذکورۂ بالا امور اور یورپ کی صورت حال اور مسئلہ بیکاری کی مختصر تاریخ کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ صنعت و حرفت کی ترقی کیساتھ ساتھ اہم ہوتا جاتا ہے۔ اب ہم ہندوستان کے حالات کو پیش نظر رکھکر اس امر کو دریافت کرنے کی کوشش کریں گے کہ آیا یہاں بھی اس کی اتنی ہی اہمیت ہے یا نہیں۔

ہندوستان معاشی ارتقار کے تیسرے دور میں ہے۔ اگرچہ بعض بڑے بڑے مقامات پر کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہیں اور صنعت و حرفت روبہ ترقی ہے لیکن ابھی یہ کہنا کہ ہندوستان ایک صنعتی ملک ہے ناممکن ہے۔ بلکہ مجموعی طور پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ہمارا ملک زرعی ملک ہے۔ یہاں کی آبادی کا ۷۹ فیصدی حصہ زراعت میں مصروف ہے اور اس بڑے حصہ آبادی کو جس قسم کی بیکاری یہاں نصیب ہے وہ کام نہ ملنے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ قدرت کی طرف سے ہے کاشتکار سال کے چھ مہینے بیکار رہتا ہے اس بیکاری کے معاشی نتائج اور اس کا کاشتکار کو عدم احساس، یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے۔ جس سے ہم کو یہاں کوئی سروکار نہیں۔ ہندوستان میں کارخانہ داروں کو جن مزدوروں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ بالعموم جاہل اور غریب ہوا کرتے ہیں۔ اون کو اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ اجرت خام اور اجرت صحیحہ کے بیّن فرق سے وہ بالکل ناآشنا ہیں۔

اس صورت حال سے کارخانہ داروں نے ابتداً خوب ہی فایدہ اٹھایا۔ دس گھنٹے اور بارہ گھنٹے کی تو قید نہ تھی اور نہ کوئی قانون تھا جسکی پابندی ہندوستان کے کارخانہ داروں پر لازم تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اون کو ناجائز فائدہ اوٹھانیکی عادت ہوگئی اور جب حکومت نے اپنی توجہ اس طرف مبذول کی اور قوانین کارخانجات وغیرہ منظور ہوئے تو کارخانہ داروں کو لازمی طور پر ناگوار معلوم ہوا یہیں سے ہندوستان میں بھی اصلداروں اور مزدوروں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ مگر اس قانون سازی سے مزدوروں کو کوئی غیر معمولی فائدہ

نہیں پہونچا۔ قانون خواہ کتنا ہی جامع ہو مزدوروں کے تمام حقوق کی نگہداشت نہیں کرسکتا۔ اسکے لئے خود مزدوروں میں اجتماعی احساس ہونا ضروری ہے اور اس احساس کا مظاہرہ تجارتی انجمنوں (Trade Unions) کی شکل میں ہوا کرتا ہے۔ ابھی ہمارے ملک میں یہ تحریک عالم طفولیت میں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب کبھی اصلداروں اور مزدوروں کی قوت کا باہمی مقابلہ ہوتا ہے تو بالعموم اصلدار بازی لیجاتے ہیں البتہ گذشتہ چند سال سے یہ صورت حال تبدل ہوگئی ہے۔

تحریک ترک موالات سے ملک کو کوئی عملی فائدہ ہوا یا نہیں۔ یہاں ہم اس بحث سے گریز کرتے ہیں مگر بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس تحریک سے ملک کو ایک بہت بڑا فائدہ ہوا۔ اور وہ یہ تھا کہ آزادی اور غلامی کے فرق کو ہر شخص محسوس کرنے لگا۔ کارخانے میں کام کرنے والے مزدور اس سے مستثنیٰ نہ تھے کارخانہ داروں کی زیادتیوں کو وہ بھی محسوس کرنے لگے اور اس معاشی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی فکر ہوئی چنانچہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مزدور بہ نسبت پہلے کے کارخانہ داروں کے ظلم و تعدی کو کم برداشت کرتے ہیں علاوہ ازیں یورپ کے ہڑتالوں کا بالعموم اور انگلستان کی حالیہ کوئلہ کی ہڑتال کا بالخصوص بہت زیادہ اثر ہندوستان پر پڑا۔ جب یہاں کے مزدوروں نے یورپ کے بھائیوں کی کامیابی کو دیکھا تو ان کے دلوں میں بھی امنگ پیدا ہوئی چنانچہ اس کے بعد ہی ہمارے ملک میں ہڑتال اور اسٹرائک کی گرم بازاری ہوئی۔ بعض وقت تو اخبارات محض ہڑتالوں کی خبروں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں مزدوروں کی یہ بیداری یقیناً قابل تحسین ہوتی۔ اگر ہندوستان میں بھی اس مسئلہ کی کوئی خاص اہمیت ہوتی یہاں چونکہ ہم کو بیکاری سے بحث ہے۔ اس لئے ہم دیکھینگے کہ اس کی ہمارے ملک میں کیا اہمیت ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غیر مہارت طلب محنت کی ہندوستان میں کمی نہیں رہا یہ امر کہ ان کی کارکردگی کیسی ہے یہ دوسرا سوال ہے۔ بالعموم غیر مہارت طلب محنت

کرنے والے مزدور برس کے کچھ مہینے کھیتوں پر کام کرتے ہیں اور بقیہ زمانہ کارخانوں میں کام کرتے ہیں چنانچہ بمبئی کے اکثر گرنیوں کے مالکوں کو یہی شکایت ہے کہ اون کے ہاں کے مزدور پوری دلجمعی سے کام نہیں کرتے بلکہ سال کے چند مہینے وہ اپنے وطن میں بسر کرتے ہیں جسکی وجہ سے اون کے کام میں ہرج واقع ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر مہارت طلب کام کرنے والے مزدور یہاں بہت بیکار رہتے ہیں۔ اولاً وہ کارخانوں میں تھوڑا بہت پیدا کرلیتے ہیں اور ان میں سے اکثر پھر کھیتوں پر کام کرکے مزید آمدنی حاصل کرتے ہیں۔ اور جو کچھ بھی اون کا معیار زندگی ہے اوس کے لحاظ سے یہ مجموعی آمدنی کفاف کرتی ہے۔ لہٰذا جہاں تک کہ مزدور کے کام پر لگے رہنے کا سوال ہے اوسکی اہمیت زائل ہوجاتی ہے۔

باوجود اسکے چند خودغرض اور ناعاقبت اندیش حضرات نے مزدوروں کو ورغلانے کیلئے اپنے آپ کو لیڈر مقرر کر رکھا ہے۔ اور وقت بیوقت ملک میں شورش پیدا کرنا اون کا مقصد ہے اور مزدوروں کو اصلداروں کے خلاف کھڑا کرنا اون کے لئے نہایت دلچسپ مشغلہ ہے اگر یہ طریق کار محض یوروپی ممالک کی اندھی تقلید ہے تو بالکل درست نہیں ہے۔ اسلئے کہ وہاں کے حالات اور ہمارے ملک کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں صنعت وحرفت ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور اندیشہ ہے کہ اس قسم کی وقت بیوقت کوششیں ملک کے لئے اور یہاں کی ترقی کے لئے مہلک ثابت ہونگی۔ اگر کسی ملک میں اس قسم کی کوششوں کی وجہ سے سیاسی آزادی حاصل ہوئی ہے تو اس کا باعث اوس ملک کے حالات اور وہاں کے باشندوں کی قربانیاں اور ایثار ہے جس کی ایک مثال بھی ہمارا ملک پیش نہیں کرسکتا اگر ہمارے ہندوستانی بھائیوں میں حقیقی ایثار کا مادہ ہوتا تو موجودہ صورت حال کبھی کی تبدّل ہوگئی ہوتی ضرورت ہے کہ پہلے ملک کے اندر اتحاد و یکسانیت کی فضا پیدا کی جائے۔ بغیر اس کے محض ان کوششوں سے باشندگان ملک کو شورش پسند بنانا بے سود ہے۔ انقلاب پسند طبائع ان تمام امور پر غور کریں اوسکے بعد باہر نکلکر پبلک کے سامنے اور بالخصوص مزدوروں کو بیداری پیدا کرنے کی ترغیب دیں۔ خیر یہ ایک

جلہ معترضہ تھا اس سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ہمیں مزدوروں کی تنظیم منظور نہیں بلکہ ہماری تو عین خواہش ہے کہ ہندوستان کے مزدور اپنے آپ کو منظم کریں - ہر وقت اپنے حقوق کی نگہداشت کرتے رہیں - اور ہمیشہ اپنے جائز مطالبات کو پیش کرنے کے لئے تیار رہیں

تجارتی انجمنوں کے فرائض مدافعانہ (Militant) اور برادرانہ (Fraternal) ہوتے ہیں - فرائض مدافعانہ کی تحت تجارتی انجمنیں اپنے مخالفین کے حملوں کی مدافعت کرتی ہیں اور برادرانہ فرائض کے تحت انجمنیں اپنے شرکاء کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانے کی کوشش کرتی ہیں - ہندوستان کی انجمنوں کے لئے موخرالذکر فرائض زیادہ اہمیت رکھتے ہیں - جب مزدوروں کی حالت درست ہوجائے گی تو اون میں خود بخود مدافعت کی طاقت پیدا ہوجائے گی لہٰذا یہاں پہلے مزدوروں کی تنظیم کی ضرورت ہے - اور یہ تنظیم اس مقصد کو پیش نظر رکھکر ہونی ضروری ہے -

غیر مہارت طلب محنت پر غور کرنے کے بعد اب ہم مہارت طلب محنت کی حالت پر غور کریں گے - مہارت طلب محنت کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ ایسی محنت جسکے انجام دینے کے لئے کسی خاص قسم کی تربیت کی ضرورت ہو - ہندوستان میں کارخانوں میں جو مہارت طلب محنت ہے ابتک بالعموم باہر سے حاصل کیجاتی ہے اور اسی طرح دفاتر میں بھی اعلیٰ عہدوں پر بیرونی ممالک کے باشندے متمکن نظر آتے ہیں اس صورت حال کا سب سے بڑا سبب یہاں کا طریق تعلیم ہے - ہندوستان میں گذشتہ پچاس سال سے جو طریق تعلیم رائج ہے اوس میں صنعت و حرفت کی تعلیم کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا - اور کیوں نہو جبکہ خود حکومت کا مسلک ہی یہ تھا کہ اس ملک کی صنعت و حرفت کا خاتمہ کیا جائے -

اس مقصد کے تحت ایک خاص قسم کا نظام تعلیم تیار کیا گیا - جس سے اس خاص قسم کی ذہنیت پیدا کرنا مقصود تھا - کہ ہر ایک ہندوستانی اپنے ملک کو اور خود اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں ذلیل و خوار سمجھے اور اوسمیں یہ حوصلہ نہ رہے کہ بیرونی ممالک کے

باشندوں کی طرح ترقی کرسکے۔ یہ طریق تعلیم اس خصوص میں نہایت کامیاب ثابت ہوا لیکن تاہم ہندوستان کے لوگ باہر بھی جانے لگے۔ وہاں کی آزاد فضا سے واپس آنے کے بعد ہندوستان کی تاریکی کا احساس لازمی تھا۔ اس کے علاوہ دیگر حالات مثلاً جنگ عظیم وغیرہ کے اثرات بھی مرتب ہوئے جو اس مسلک پر عمل کرنیوالی حکومت کے لئے مضر ثابت ہوئے لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں اب ہم دیکھیں گے کہ ہندوستان میں اس نظام تعلیم کی وجہ سے کیا اثرات پیدا ہوئے۔

سلطنت مغلیہ، بلکہ اوس سے بہت پیشتر ہی ہندوستان کی صنعت وحرفت اعلیٰ درجہ پر ترقی کرچکی تھی۔ سلاطین ہنود کی پالیسی یہ تھی کہ صنعت وحرفت کو فروغ دیا جائے۔ لہٰذا وہ صناعوں اور کاریگروں کی عزت کرتے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرتے تھے۔ مسلمان جب حکمراں ہوئے تو اونھوں نے بھی شاہان سلف کے مسلک کو جاری رکھا۔ ان کے زمانہ میں بھی کاریگروں کی خوب قدر ہوئی اور صنعت وحرفت کو انتہائے کمال تک پہونچانے میں ان بادشاہوں نے پوری کوشش کی۔ جس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ لیکن جب مسلمانوں کا زمانہ ختم ہوا تو کچھ تو تراج اور طوائف الملوکی کی وجہ سے اور کچھ حکومت کی پالیسی کے سبب سے یہاں کی صنعت وحرفت نیست ونابود ہوگئی پھر انگریز برسر اقتدار ہوئے جن کی حیثیت تاجرانہ تھی نہ کہ فاتحانہ۔ ایک تاجر کا نصب العین زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھکر انگریزوں نے اپنے ملک کی ساختہ مصنوعات کو فروغ دینے کے لئے ہندوستان کی مصنوعات کو تباہ کرنے میں اپنے سیاسی اقتدار کو پوری طور پر استعمال کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے صنعت وحرفت مفقود ہوگئی۔ اب وہ لوگ جنکا ذریعۂ معاش صنعت وحرفت تھا کیا کرسکتے تھے۔ اونکے لئے صرف دو صورتیں تھیں۔ کاشتکاری، یا ملازمت سرکاری۔ کاشتکاری وہ نہیں کرسکتے تھے کیونکہ ہندوستان میں دستکار، کاشتکاری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور اگر وہ بالفرض کرنا بھی چاہتے تو معاشری موانعات موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ملازمت میں کچھ

ایسا جادو تھا کہ لوگ اس کی طرف کھچے جاتے تھے۔ حکومت اور ایک فرضی شان کا دھوکہ تھا جسکو ہر شخص پسند کرنے لگا۔ اور یہ خیال پیدا ہوگیا کہ ملازمت کے بیس روپیہ ماہانہ، زراعت کے سو روپیہ سے اچھے ہیں۔ لہٰذا ہر شخص ملازمت کی طرف رجوع ہوا۔ حکومت انگریزوں کی تھی۔ دفتری زبان انگریزی ٹھیری اور ہندوستانیوں میں انگریزی داں حضرات کی قلت۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ تھوڑی بہت بھی انگریزی جانتے تھے اون کی خوب قدر ہونے لگی۔ اسوقت تک انگریزی داں لوگوں کی طلب زیادہ تھی۔ یہاں پر معاشی قانون طلب و رسد کام کرنے لگا۔ جب طلب زیادہ ہوئی تو رسد بھی بڑھنے لگی۔ یعنی والدین بھی اپنی اولاد کو اس خاص پیشے کے لئے زیادہ تعداد میں تیار کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلب سے رسد زیادہ ہوگئی اور جب یہ صورت حال پیدا ہوگئی تو ہر طرف پریشانی اور بیچینی بھی پھیلی۔ لیکن حکومت نے اس کی پروا نہیں کی۔ وہ اپنے تعلیمی مسلک پر قائم رہی۔ بیسیوں جامعات وجود میں آئیے اور سالانہ سینکڑوں کی تعداد میں گریجوایٹ نکلنے لگے۔ بدقسمتی سے اونھیں جس قسم کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا گیا تھا وہ ایسی تھی کہ جسکی رو سے وہ سوائے ملازمت کے کوئی اور کام نہیں کرسکتے تھے۔ اور ہر سرکاری دفاتر میں تمام جایدادیں پُر ہوگئیں تو سرکاری دفاتر کے دروازے ان کے لئے بند کردئے گئے۔ اب یہ سوال اہم ہوگیا کہ یہ تعلیم یافتہ طبقہ کرے تو کیا کرے۔ اور اس صورت حال کی اصلاح کسطرح ممکن ہے۔

پہلے ہم اس سوال سے بحث کریں گے کہ موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ جو روزگار نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہے وہ کس طرح اپنی حالت کو درست کرسکتا ہے۔ سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ تعلیم یافتہ حضرات اپنے دماغ سے اس خیال کو مٹادیں کہ نوکری ہی اون کا ذریعہ معاش ہوسکتا ہے اگر کسی دفتر میں اونہیں جگہ نہیں مل سکتی ہو تو اس دفتر کو معذور خیال کریں اور اسکو کوئی شکایت کا موقع نہ تصور کریں۔ بلکہ غور کریں کہ علاوہ ملازمت کے دنیا میں دوسرے پیشے بھی ہیں جنکو اختیار کرکے ایک خوددار تعلیم یافتہ انسان اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے مثلاً زراعت۔ اس میدان میں بہت زیادہ وسعت ہے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ زراعت میں تعلیم یافتہ لوگوں کی مانگ بہت

زیادہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ زراعت میں مصروف ہے لیکن وسعت رقبہ کے لحاظ سے بہت بڑا رقبہ جو قابل کاشت ہے وہ بیکار پڑا ہوا ہے۔ اسکو زیر کاشت لایا جاسکتا ہے۔ اور پھر زیر کاشت رقبہ سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے وہ بلحاظ دیگر ممالک کے بالکل قلیل ہے۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہاں کے کاشتکاروں میں فقدان تعلیم اور انکی قدامت پسندی ہے۔ جس شخص نے بھی حالیہ زرعی کمیشن کی رپورٹ پڑھی ہے وہ یقینی اس نتیجہ پر پہنچا ہوگا کہ یہاں ترقی کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ اور یہ ترقی اوسوقت تک ناممکن ہے جبتک کہ تعلیم یافتہ دماغ اس پیشہ کی طرف رجوع نہ ہوں۔ اگر زراعت کی اصلاح کرنی ہو تو پہلے کاشتکاروں کی جہالت اور فقدان تعلیم کو دور کرنا ضروری ہے۔ موجودہ کاشتکاروں کی تعلیم کا ایک مفید طریقہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ اس پیشہ کو اختیار کرے اپنے اعلیٰ معلومات کے ذریعہ جدید طریقہ ہائے زراعت کو رائج کرے اور اس طرح ان جاہل کاشتکاروں کے لئے ایک اچھی مثال قائم کرے۔ اس طریقے سے نہ صرف زراعت میں ترقی ہوگی بلکہ تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری کی شکایت بھی رفع ہوجائے گی۔ تاوقتیکہ تعلیم یافتہ طبقہ اس خصوص میں اولوالعزمی کے ساتھ کام نہ کرے یہاں کے کاشتکاروں کی قدامت پسندی اور ملک کا افلاس دور نہیں ہوسکتا تعلیم یافتہ حضرات کے وسیع معلومات دنیا کے حالات سے کامل وقفیت، اور فروختِ پیداوار کے جدید طریقوں کا علم یہ سب باتیں مدد و معاون ثابت ہونگی۔

زراعت کے بعد اسی قسم کا ایک اور پیشہ ہے جسکی ملک میں بہت زیادہ کمی محسوس ہو رہی ہے وہ ڈیری فارمنگ (Dairy Farming) ہے۔ یہ پیشہ بلحاظ اپنی دلچسپیوں کے اور بلحاظ آمدنی کے ملازمت سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اگر تعلیم یافتہ طبقہ اس طرف رجوع ہو تو یہ نہ صرف اون کی بیکاری کا ذمہ کریگا بلکہ ملک کی معاشی ترقی اور مرفہ الحالی کا باعث ہوگا۔

علاوہ ازیں تجارت میں تعلیم یافتہ حضرات بہت کچھ ترقی کرسکتے ہیں۔ ہندوستان

میں اصل کی کمی نہیں۔ ضرورت اچھے آجروں کی ہے۔ اس ملک میں اگر پچاس آدمی بھی اپنے آپ میں جے۔ ٹاٹا یا فضل بھائی کریم بھائی کی سی اہلیت کار پیدا کر لیں تو اون کو اصل فراہم کرنے میں قطعاً دشواری نہیں ہو سکتی۔ دولتمند حضرات کو اگر کاروبار کی کامیابی کا تیقن ہو جائے تو وہ اپنا روپیہ لگانے تیار رہتے ہیں اور یہ تعلیم یافتہ حضرات کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اہل ثابت کرنے کی کوشش کریں اور اس طرح ملک کی ترقی کا باعث ہوں۔

اس کے علاوہ ہم کو یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ جنگ عظیم سے حکومت ہند کو جو تلخ تجربہ ہوا اوس کا نتیجہ ملک کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ زمانہ جنگ میں ہندوستان کی صنعت و حرفت کی کمزوری کی وجہ سے حکومت کو بہت پریشانی لاحق ہوئی۔ حکومت نے اس کو محسوس کرتے ہوئے اختتام جنگ کے بعد ہی یہاں اپنی پالیسی کو بدل دیا۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء کی صنعتی کمیشن کا انعقاد اور پھر فسکل کمیشن کا تقرر یہ سب اس کا ثبوت ہیں۔ اب حکومت کو فکر ہے کہ ہندوستان میں صنعت و حرفت کو ترقی دی جائے۔ اس لحاظ سے وہ ہر طرح کی مدد کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس طرح یہاں تعلیم یافتہ حضرات کے لئے مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ صنعتی ملک بن سکتا ہے اور قدرتی ذرائع بھی بافراط موجود ہیں۔ لہذا تعلیم یافتہ حضرات ان چیزوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ معدنیات کو دریافت کر سکتے ہیں اور ان سے فایدہ اٹھا سکتے ہیں ان تمام امور پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ہمارے ملک میں علاوہ ملازمت کے دیگر بہت سے ذرائع موجود ہیں جن سے تعلیم یافتہ حضرات کی پریشانی اور بیکاری کا اندفاع ہو سکتا ہے۔ کوئی حکومت تعلیم یافتہ طبقے کے لئے خدمات فراہم کرنے کا ذمہ نہیں لے سکتی خود یورپ میں بھی حکومت اس کی ذمہ دار نہیں اور اس وجہ سے حکومت پر تخریبی تنقید کرنا نہایت بے سود ہے۔ یورپ میں تعلیم یافتہ طبقوں کا رجحان سرکاری ملازمت کی طرف نہ ہوتا ہے اسی وجہ سے وہاں سوائے خاص صورتوں کے نہ تعلیمی اعزازات یعنی ڈگریوں (Degrees) کی اتنی زیادہ وقعت نہیں ہوتی۔ اور نہ وہاں کے لوگوں کو ان کے حاصل کرنے کی ایسی حرص ہوا

اسکے برخلاف ہندوستانیوں میں خالص تعلیمی ڈگریاں حاصل کرنے کا زیادہ شوق پایا جاتا ہے بعض لوگ فنی تعلیم حاصل کرتے بھی ہیں تو انہیں کبھی اسکی خواہش نہیں ہوتی کہ ان مفید معلومات سے عملی طور پر کوئی کام لیں بلکہ خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ سرکاری محکمجات میں کوئی نوکری حاصل کرنے کا ذریعہ ثابت ہوں انگلستان میں اعلیٰ التعلیم جامعات صرف وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جنکی خواہش تعلیمات یا کسی اور ایسے صیغہ میں اپنی عمر صرف کرنا ہوتی ہے اور باقی لوگ وہی تعلیم حاصل کرتے ہیں جس سے وہ کوئی کام کرسکیں جسکے لئے وہ فطرتاً موزوں ہوں ہمارے ملک میں بھی یہ احساس پیدا کرنا ضروری ہے، بلکہ موجودہ صورت حال کی اصلاح کے لئے یہ احساس ایک ضروری چیز ہے۔ جب ڈگریاں حاصل کرنے کی حرص جاتی رہیگی تو آنیوالی نسلیں اپنے آپ کو صنعت و حرفت، تجارت و زراعت کے لئے تیار کرینگی۔ اور بہت جلد تعلیم یافتہ طبقہ کی بیکاری کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ لہٰذا یہاں کے نظام تعلیم کو جدید طور پر ڈھالنے کی ضرورت ہے تاکہ ایسی درسگاہیں ملک میں قائم ہوسکیں جہاں لوگ اس قسم کی تعلیم حاصل کرسکیں۔ تعلیم کا صحیح مقصد انسانی اخلاق کی درستی و فرض شناسی ہے ابتدائی تعلیم کا اگر ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جسکے تحت یہ باتیں پیدا ہوجائیں تو پھر آئندہ ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم طبعی مناسبت کے لحاظ سے ہر ایک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ جو لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اعزازات حاصل کرنے کے متمنی ہوں گے وہ اس خصوص میں کوشش کریں گے۔ اور جو لوگ صنعت و حرفت کے مختلف شعبہ جات کو اپنا میدان عمل بنانا چاہیں گے وہ اسکو اختیار کریں گے۔ اور اس صورت میں نہ صرف تعلیم یافتہ طبقہ کا بلکہ سارے ملک کا مستقبل نہایت امید افزا ہوجائیگا نقط

ساغرِ جہانگیر[1]

سید محمد اکبر وفاقانی۔ بی اے (عثمانیہ)

اے جہانگیر! اے حسین عاشق — کون ہے تجھ سا مہ جبیں عاشق
تیرا پیمانہ میرے سامنے ہے — ایک پری خانہ میرے سامنے ہے
تھی بہشتِ نظر تری محفل — روح شاعر تھی یا تیری منزل
گھر ترا تھا کہ حسن کا بازار — شعلہ رویوں کے بانکپن کی بہار
بنگیا تھا زمیں پہ باغِ جناں — جمع تھیں ایک جہانکی حوریں یہاں
ہند کی تھی کوئی حسین پری — آنکھ جسکی سیاہ جادو بھری
ترک و ایراں کی خوش ادائی تھی — عمر خیام کی رباعی تھی
جامِ مل اڑ رہے تھے آپس میں — لختِ دل جڑ رہے تھے آپس میں
باغ کی وہ روش و گل کاری — نسل تیمور کی طرحداری
حوض میں روح آب فوارے — پیش دالان کے وہ نظارے

---

[1] یہ نظم بزم تاریخ کے "تاریخی مشاعرہ" میں پڑھی گئی تھی صدر بزم کی اجازت سے اسکو یہاں شائع کیا جارہا ہے ۱۲ مجلہ

وہ صراحی میں کیف عشرت بند
دلِ عاشق میں جیسے حسرت بند

چنگ و بربط پہ شعر خوانی تھی
ہر صدا میں بھری جوانی تھی

بہروی تھی کبھی بہار کی چھیڑ
خلش زخم دل ستار کی چھیڑ

نازنینوں کا رقص تھا چھم چھم
جیسے جل پر پھوار ہو رم چھم

سب پہ طرفہ کسی کی آمد تھی
نور محفل تھا یا قیامت تھی

مست آنکھوں میں ایک تبسم تھا
یا تڑپتا ہوا ترنم تھا

ہاتھ میں ایک صراحی مے تھی
اور ہونٹوں پہ بے صدا لے تھی

ایک رنگین ایاغ تھامے ہوئے
یا دلوں کا چراغ تھامے ہوئے

حسن بیں آنکھ کو یہ دعوت تھی
نہ پئیں اب بھی تو قیامت تھی

اے جہانگیر تیری رنگینی
تھی بہار جناں کی گل چینی

رندیاں تجھ سا کون آئے گا
ہند کو پھر حسیں بنائے گا

اب بھی باقی ہے تیرا پیمانہ
دیکھ کر جس کو دل ہے دیوانہ

سامنے اس کے خون روتا ہی
یاد ماضی پہ جان کھوتا ہی

حاسد

از سید وزیر حسن صاحب

گلابی جاڑے کی ایک رات کا پچھلا پہر ہے۔ مرغ نے اذاں کی شروعات کر دی لیکن نقیب صبح بنکر ابھی اس کی آمد کی خبر نہیں دی۔ بلکہ چوکیدار کو چونکایا ہے کہ دیکھ! سویا اور کھویا۔ چوکیدار نے بھی ہڑبڑا کر "جاگتے رہو" کی بھاری للکار سے عالم خاموشی توڑ دیا۔

رات جاڑے کی ہے، اس لئے ابر و غبار سے پاک وصاف اور سہانی ہے۔ جس سے آسمان کی کامدانی کی ہوئی چھت گیری کی بہار دوبالا ہوگئی۔ پچھلی راتوں کا ہلال نما چاند بھی اتنا نیچا ہو آیا کہ ستارۂ صبح کو اونچا ہو کر دیکھنا پڑا۔

جے پور کے اسٹیشن پر میل کے آنے کی گڑبڑ شروع ہوئی، تو ویٹنگ روم میں اختر نے فرید کو جگایا۔

"لو بھئی فرید! خدا حافظ و ناصر"

فرید۔ (ہوشیار ہوتے ہوئے) کیوں؟

اختر۔ میل آگیا۔

اتنے میں میل کے پہنچنے کی گھنٹی ہونے لگی۔ قلی نے دو سوٹ کیس اور ایک ٹفن باسکٹ

لاکر باہر رکھا ہی تھا کہ میل بھی آتشیں آنکھیں دکھاتا ہوا زلزلہ خیز تیزی سے آکھڑا ہوا۔ جلدی جلدی سامان رکھا گیا۔ میل وقت کے گھوڑے پر سوار تھا، یہاں یوں تو پانچ چھ منٹ ٹھیرا کرتا تھا، لیکن اتفاق سے آج لیٹ تھا۔ تین ہی منٹ میں پر تولنے لگا۔ یہ دونوں گلے ملے اور اختر نے مشکل پٹڑی پر پیر رکھا ہوگا کہ گارڈ نے زفیل دیدی۔ بس اب کیا تھا، حرکت کے ساتھ ہی لحظہ بہ لحظہ جدائی بڑھنے لگی، حتےٰ کہ پلک جھپکاتے اختر ہی کیا، میل بھی نظروں سے غائب ہوگیا۔

....

کچھ دنوں بعد اختر کا خط آیا۔

اچھے فرید! سلام ودعا۔

بھئی، پہنچا تو تو ہم کہاں ہیں؟! مگر ایک شرط سے لفافہ کی مہر نہ دیکھنا!! یار، تم سے رخصت ہوکر بمبئی اور بمبئی سے بھی خاصی دور نکل گئے تھے کہ لاسلکی کے فوری احکام کی بنا پر روک لئے گئے۔ سنا ہے دول یورپ میں چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی ہے۔ راستہ صاف نہیں۔ جہاز کی جھڑتی ہوگی۔ اسلئے ہیلاس کے سندر پٹروس میں قید ہوں!

؎ گرفتارم بآں مشکیں سلاسل!!

فرید! یہ انوکھی گرفتاری میرے لئے تو کم سے کم اسوقت تخیل کا ایسا جادو بنگئی ہے کہ آناً فاناً میں اگلے زمانہ کی سیر کرکے ہنستا بھی ہوں اور رونے بھی لگتا ہوں! ہنسی اس لئے آتی ہے کہ انسان کی احمقانہ ضدوں پر غصہ آتا ہے! بھلا سوچو تو جن خوش عیش اجداد کی ندرت خیال ہیلاس کی لاثانی سندریاں ہوں۔ ان کی ناہنجار اولاد کے پھوہڑ مذاق کا اب یہ عالم ہوجائے کہ انسان کے خون سے ان کی پیاس بجھے! اور پھر خون بہانے میں جو سب سے زیادہ تیز اور استاد ہو وہی سب میں آن بان والا گنا جائے!

؎ بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا۔

رونے میں یاد شش بخیر! اپنے ایک حساس وطنی کا شریک ہوں۔ کہ اس جگہ اسکا خونِ دل بھی معنوی آنسو بن کے ٹپک چکا ہے!

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!!

اسوقت رات کا ایک بج چکا ہے، غیر معمولی گڑبڑ سے ابھی ابھی میری آنکھ کھل گئی۔ سنتا ہوں، کچھ جنگی جہاز آرہے ہیں۔ وہ آکر چلے جائیں، اور ہم بھی تیاس میں پورے اتریں تو پھر کہیں چلیں۔ آگے خدا جانے کہ کیا ہوگا۔ جی گھبرانے لگا تو میں نے کہا، لاؤ فرید سے ہی باتیں کروں دوست! جو کچھ ہے سو ہے۔ اس وقت کا سماں مزہ دے رہا ہے۔ کویل سی رات میں جگر جگر کرتے بے گنتی تاروں کی بہار ہے۔ سمندر کی سطح اس قدر خاموش اور پرسکون کہ ایک ایک تارا گن لو۔ جس سے خاکم بدہن! ہمارا ناچیز جہاز جگمگاتے آسمانوں میں کھڑا ہچکولے کھا رہا ہے!

سامنے بندرگاہ کی موہنی روشنی لال سبز بیسوں تارے کھل رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم دیتا ہے، جیسے ہرے اور لال تاروں کا یہ گنگا جمنی مخمیہ اُن دو آسمانوں کا مقام اتصال ہے! دائیں طرف روشنی گھر Light house کا جگنو ہے۔ جو دل کی پیہم حرکت کی سی جھلکیاں دکھائے جاتا ہے!

اچھا بھئی، اب نیند آنے لگی، خدا حافظ و ناصر۔ سب کو سلام و دعا کہدینا، مگر اوگنتی ہوئی نہیں! فقط

تمہارا مخلص
اختر

اختر کو ولایت جاکر تین چار سال ہوتے ہیں۔ اس اثنا میں انگریزی کی تعلیم کے ساتھ اس نے اردو کو بھی نہ بھلایا۔ البجادیلا کے مابدل صفحے اس بات کی کافی ضمانت ہیں۔ "اردو اور یورپ" "ہماری شاعری" "قاموس اردو" "علامہ اقبال کا نفسیاتی خاکہ" اور "لسان العصر کی چٹکیاں اور گدگدیاں" ــــ اختر کے ایسے پر فخر شہ پارے ہیں۔ جنہوں نے اسے سمائے شہرت کا

روشن تارا بنا دیا!

فرید اس شہرت کی گونج کو بہ حیثیت دوست سنتا، مگر ایک دشمن جانی کیطرح متاثر ہوتا یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ظالم نے ازل سے ہی طبیعت یہ پائی تھی۔ اسوقت بھی جب اختر کے والد کا انتقال ہوا اور فرید کی والدہ نے اسے اپنی سرپرستی میں لیا، تو فرید اندر ہی اندر اختر کی آؤبھگت ذہانت سے جلتا اور اس کے ادبی مشاغل کی کاٹ میں لگا رہتا تھا۔ ایک دن بڑا مزہ ہوا۔ اختر کے دوست نظیر اور وحید صبح ہی صبح ملنے آئے۔

نظیر ۔ بھئی اختر، ہمیں تو پہلے اپنا مضمون سناؤ؟ وحید بڑے مداح ہیں۔ ہم بھی تو آخر سنیں۔

وحید ۔ نظیر! سچ کہتا ہوں۔ سنو گے تو پھڑک جاؤ گے۔ عجب آرٹسٹک چیز ہے۔

فرید ۔ امیاں بیٹھے بھی رہو۔ تم تو کسی چیز کو سراہتے ہو تو فلک چہارم پر جا بٹھاتے ہو۔ مضمون نہ مضمون کی گت! وہ آرٹسٹک بھی بنگیا۔ میں کہتا ہوں ان باتوں سے تمھارا دماغ تو خراب ہوا ہی ہے۔ اختر بھی دماغ میں سڑے مرتے ہیں۔

وحید ۔ بھئی، خدا کے لئے آپ اپنی جامد بے حسی کو جہاں کی وہاں رہنے دیجئے!

فرید ۔ نہیں تو شاید، تم جیسے بے تکوں کی طرح ہر وقت آرٹ، آرٹ بکا کروں!

وحید ۔ امیاں، عقل کے دشمن! یاد رکھو، آرٹ کی پرستش تربیت ذات کی نشانی ہوا کرتی ہے! ایمان کی پوچھتے ہو تو یہ ایک فخر کی بات ہے کہ ہمارے دوستوں میں بفضلہ ایک ایسا بھی ہے۔ جو آرٹسٹک کری ایشن کا مالک ہے۔

نظیر ۔ وحید! تم بھی اچھے لے الجھے۔ فرید بچارا تو ادبی خواجہ سرا ہے۔ اس لئے ان باتوں سے بیگانہ اور قابل معافی ہے!

فرید ۔ ہشت!

وحید ۔ امیاں، سچ تو کہتے ہو۔ تو بھئی اختر! ان خواجہ سرا کو معاف کر دو اور مضمون نکال لو!

فرید ۔ (آپے سے باہر ہوکر) دیکھو اختر! جتائے دیتا ہوں۔ اسوقت اگر مضمون کی چاٹ چاٹیں

ہوئی تو اچھا نہ ہوگا ۔

اختر کسی طرح فرید سے کم نہ تھا ۔ چاہتا تو اس رکاکت پر اُسے اٹھا کر دے مارتا ۔ مگر بڑا لحاظ کا لڑکا تھا ۔ دوسرے قسمت کی کارستانیوں نے فی الوقت اسے پھپھی (فرید کی والدہ) کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس درجہ مجبور کر دیا تھا ۔ کہ فرید کی روا نا روا باتیں سنے بغیر مفر ہی نہ تھا ۔ کیونکہ جانتا تھا ، فرید کی اس برضدی کا جواب پھپھی صاحبہ کی نادانی کی بدولت نہ معلوم آیندہ کیا گل کھلائے ۔ اس خیال سے احباب کے اصرار کو اشارے سے روکا اور بات رفع دفع کر دی ۔

فرید ایسی باتوں سے بڑا خوش ہوتا ۔ کہ ہم بھی کچھ ہیں ۔ مگر احباب کی نظروں میں یہ روز بروز ذلیل ہوتا جاتا تھا ۔ اور بھی جو کوئی سنتا ، تھڑی تھڑی کرتا ۔ لیکن اس عقل کے پورے کو بھلا ان باتوں کا کہاں شعور ۔ یہ فخریہ ایسا کیا کرتا ۔ اور پھولے نہ سماتا ۔ ماں باپ کے لاڈ پیار اور بیجا اغماض نے بچپن ہی سے اسے اتنا بیلا بنا دیا تھا ۔ چاہے اب بھی انھیں اس بات کا احساس ہوا ہو تو نام کو نہیں ۔ فرید ڈاڑھی مونچھیں لیکر بھی ذرا ذرا سی بات پر الجھتا ۔ ناحق نا روا اس سے تو تو میں میں کیا کرتا ۔ اختر خون کے سے گھونٹ پیتا اور چپ ہو جاتا ۔ مگر پھپھی کو بھی شاباش ہے ، کیا مجال جو کبھی زبان ہلائی ہو ۔ اپنے چاہتے ، لاڈلے پوت کی بات تھی ، مسکرا مسکرا دیکھتیں ، اور چپ ہو جاتیں ۔ بلکہ ایک آدھ بات ایسی بھی کہہ بیٹھتیں کہ بجائے دلجوئی کے اختر کی اور رنجش بڑھ جاتی تھی ۔ اختر ساری اونچ نیچ سوچتا ۔ تو یہی بات سامنے آتی کہ لڑائی بھڑائی سے سوائے نقصان کے اور کچھ حاصل نہیں ۔ پڑھائی الگ برباد ہوگی ۔ ورنہ کا معقول روپیہ جو پھپھی صاحبہ نے دنیا دکھاوے بحفاظت رکھ چھوڑا ہے بن حلق ہڑپ ہو جائے گا ۔ اس لئے ساری باتیں سہتا اور ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا ۔

.....

اختر کو ہندوستان واپس آکر خیر سے دو برس ہو چکے ۔ یہاں اس کی شہرت کا سورج غیر معمولی سج دھج سے نکلا ۔ جس کی کرنوں نے دور دور روشنی پھیلا دی ۔ مختلف یونیورسٹیوں اور جا بجا سے بلاوے آئے ۔ لیکن احباب نے روکا اور سوچا ۔ اس علم کے تیلے سے نسبتاً زیادہ مفید کام لیا جائے تو

کام بنے۔ اسلئے انہوں نے باصرار کہا کہ اختر اپنی ادارت میں ایک روزانہ اخبار نکالے۔ جتنے روپیہ کی ضرورت ہوگی، وہ کہیں نہ کہیں سے مہیّا کردیں گے۔

جوہری کیا چاہے، موتی! یہ سنکر اختر کے دلکی کلی کھل گئی۔ اس کو تو سدا کی یہ عزیز تمنا تھی کہ ایڈیٹر بنے اور علم وادب کے خوش آب موتی رول رول کر لٹائے۔ بخوشی یہ تجویز منظور کر لی۔ اور الوقت پرچہ کا نام بھی رکھدیا۔ جو سب کو بھایا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہدیا۔ پرچہ کو کامیاب بنانے کیلئے ضرورت ہے جرنلزم سے کافی واقفیت ہو۔ مناسب ہوگا، میں سردست دلّی یونیورسٹی کی خدمات قبول کرلوں۔ اس چھ ماہے جرنلزم کی مبادیات و مہمّات پر غور کا موقع ملیگا، دوسرے اس عرصہ میں رقم بھی خاطر خواہ اکٹھی ہوجائیگی۔ اللہ نے چاہا تو اس کے بعد کام شروع کردیا جائیگا۔ تجویز مناسب تھی۔ سب نے آنکھ بند کرکے اتفاق کرلیا۔ اور لو صاحب، اختر اصل خیر سے پروفیسر بنگئے!

حسد انسان کے خبث باطن کی بدترین پرچھائیں ہے۔ جوں جوں ہر دلعزیزی نے اختر کو سمائے شہرت کی طرف ابھارا، فرید کی حاسدانہ خباثت اسپر دھوپ کی طرح چنگاری اور زیادہ شعلہ خیز بنتی گئی۔ یہ اوّل اوّل، مختلف طریقوں سے اختر پر خاک ڈالتا رہا۔ بہتیری کاٹ کی۔ لیکن جب کوئی چال پیش نہ گئی تو اپنی معصوم رفیق زندگی کو اس سے رسوا کرنے کی ناپاک سبیل نکالی۔ تاکہ یونہی اختر بدنام ہو اور اپنے پرائے اس لئے نفرت کریں۔ کہ فرید کے ہاں اختر کو کیونکر رکھا گیا، سمجھا گیا، اور اس نے ان کے ساتھ کیا کیا!

ایک دن خوش صفات عابدہ سے خواہ مخواہ اوندھی سیدھی پوچھ گچھ کرنے لگا۔ وہ بچاری مارے خوف وغصّہ کے کانپنے لگی۔ بہتیری قسمیں کھاتی ہے اور بمنّت کہتی جاتی ہے کہ اختر میرے بھائی نہیں! باپ کی جگہ ہیں۔ آج آپ کو کیا ہوگیا۔ یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔ لیکن فرید کی ایک ہیچ زمین پر تھی تو ایک آسمان پر۔ وہ اپنی مقصد برآری کیلئے یونہی بات کو بڑھاتا رہا!

فرید کی یہ چال واقعی لاجواب، لاعلاج اور شرارت کا انتہائی تخیل تھی۔ جس نے اختر کے مطلع شہرت کو یکبارگی دھندلا کردیا۔ لیکن سچ ہے، سچائی ایک قوت ہے۔ جو لازوال ہے۔ دنیا کی

خباثت چاہے جتنا اُسے مٹائے ۔ وہ دب ضرور جائیگی ۔ مگر مٹے گی نہیں ۔ بلکہ دب کر اندر ہی اندر وہ انجان طور پر اپنا کام کرتی ہے ۔ اور ایک وقت آتا ہے کہ خباثت کی تاریکی سے فجر کی نورانی دیوی کی طرح وہ نمودار ہوکر رہتی ہے ! ہوا بھی یہی، یعنی فرید کی ساری چالبازی شدہ شدہ کھل گئی ۔ اور نیک نہاد اختر جتنا بدنام ہوا تھا ۔ اس سے کہیں زیادہ نیک نام ہوا !

.....

چند دن بعد فرید کی بدطینتی نے دوسری راہ نکالی ۔ یعنی اختر کی دعوت کی اور چار بجے ہی سے اختر کو بلا لیا ۔ اختر آکر بیٹھا ہی تھا کہ فرید جلدی سے کمرہ میں گیا اور شربت کا گلاس بنا کر اشکنیا کی خاصی بڑی شیشی پوری پوری اسمیں الٹ دی ۔

"دیکھنا، یہ شربت تو اختر کو دیدو ؟"

یہ کہکر گلاس خوبصورت عابدہ کو دیا ۔ اور آپ چھپ کر کواڑ کی جھری میں سے تماشہ دیکھنے لگا ۔ عابدہ نے خوشی خوشی گلاس اختر کو دیدیا ۔ اور اس نے بمشکل ابھی گھونٹ دو گھونٹ ہی پیئے تھے کہ یکے بعد دیگرے ایکائیاں آئیں ۔ اور ساتھ ہی چہرے پہ نہتائیاں چھٹ گئیں !

"بہن ! اچھی، آج یہ کیسا شربت دیدیا، اُف ..... دل مڑا جاتا ہے" ۔

"بھائی ! کیسا کیا ۔ گڑھل کا شربت ہے ۔ ولایت جاکر آپ کو تو ناحق کا وہم ہوگیا ہے ۔ میں بھی تو دیکھوں، آخر اسمیں کیا بُرائی ہے ۔"

یہ کہکر فوراً عابدہ نے بھی وہی گلاس اٹھالیا ۔ فرید، ہائیں ہائیں کہتا ہوا ابھی کمرے سے نکلا نہ تھا کہ اس نے بھی دو مہلک گھونٹ اتار ہی لئے ! ۔

تھوڑی دیر کے بعد اختر و عابدہ کی دو بے حرکت معصوم لاشیں پاس پاس پلنگوں پر لٹائی گئیں ۔ منہ اور ناک سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں ۔ اور اُنکی پاک روحوں کو سم قاتل نے موت کی میٹھی لوری دیکر کبھی کا آغوش الٰہی میں سلا دیا تھا !!

کلیہ کی خبریں

حضور پرنور کا ورود مسعود

سفر دہلی سے اعلیحضرت کی کامیاب مراجعت فرمائی پر بلدۂ حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں غیر معمولی جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔ جابجا کمانیں بنائی گئیں۔ ہزارہا برقی چراغ روشن کئے گئے۔ دوکانوں اور مکانوں کو بڑی جانفشانی سے آراستہ کیا گیا۔ الغرض وفادار رعایا نے اپنے ہردلعزیز بادشاہ کے استقبال کو شاندار بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ برادرانِ کلیہ نے بھی اس تاریخی موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جس حیرت انگیز سرگرمی اور انہماک سے انہوں نے کالج کی عمارات اور اقامت خانوں کی آرایش اور زیبایش میں حصہ لیا وہ قابلِ صد مبارکباد ہے۔ انجمنِ اتحاد کی جانب سے آغا منزل اور رستم منزل کی درمیانی سڑک پر ایک عالیشان کمان بنوائی گئی تھی جس میں کثرت سے برقی چراغ لگائے گئے تھے۔ علاوہ ازیں کالج کی عمارتوں کو خوشنما جھنڈیوں اور پیرقوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ رات کے وقت "میدانِ علوم" بقعۂ نور نظر آتا تھا اور دن کے وقت بھی وہ نظر فریبی کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتا تھا تقریباً یہی حال اقامت خانوں کا بھی تھا۔ نظامت منزل، فرحت منزل، مسرت منزل اور ہند و ہوسٹل

یہ سارے اقامت خانے آرایش اور زیبائش کا ایک نظر فریب منظر پیش کرتے تھے۔

ہم برادران کلیہ کی خدمت میں اس سرگرمی اور انہماک اور جوش و خروش کے لئے جو انہوں نے حضور پرنور کے ورود مسعود کے موقع پر ظاہر کیا ہے پرخلوص مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور تمام حضرات اساتذہ اور بالخصوص پروفیسر وحید الرحمن صاحب اور پروفیسر عبدالحمید خانصاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے انتظامات میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیا۔

کلیہ کی انجمنوں میں جدید کابینوں کا انتخاب

سال تعلیمی کے آغاز کے ساتھ کلیہ کی مختلف انجمنوں میں جدید کابینوں کا انتخاب عمل میں آیا چنانچہ ذیل میں اسکی تفصیل درج ہے۔

انجمن اتحاد انجمن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ کے نائب صدر مولوی غلام معین الدین صاحب غازی بی اے ال ال بی متعلم ایم۔ اے (فائنل) اور معتمد احمد عبداللہ المدوہی صاحب بی اے، متعلم ال ال۔ بی منتخب ہوئے۔ دیگر عہدہ دار اور اراکین مجلس انتظامی کی فہرست حسب ذیل ہے:—

نائب خازن:— جناب این رام لال صاحب متعلم ال ال۔ بی (فائنل)

کتبخانہ دار:— ابوحامد غلام احمد صاحب متعلم سال دوم۔

رکن انتظامی:— جناب غوث داد خانصاحب متعلم سال چہارم۔

〃 〃 :— جناب مرزا شکور بیگ صاحب متعلم سال سوم۔

〃 〃 :— جناب اسرار حسن صاحب ہاشمی متعلم سال سوم

〃 〃 :— جناب نجم الدین صاحب انصاری متعلم سال دوم۔

〃 〃 :— جناب سعید بن عبود صاحب باطاہر متعلم سال اول۔

ہم جناب غلام معین الدین صاحب غازی نائب صدر اور ان کی کابینہ کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ سال رواں میں انجمن اتحاد ترقی کی جانب مستقل قدم اٹھائیگی۔

بزم قانون سال رواں کے لئے بزم قانون کے نائب صدر مولوی خواجہ محمد احمد صاحب بی اے

متعلم ال ال ۔ بی (فائنل) وسابق نائب صدر انجمن اتحاد اور معتمد جناب محمد حمید اللہ صاحب متعلم ال ال ۔ بی منتخب ہوئے ۔ ہم خواجہ محمد احمد صاحب اور ان کی کابینہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس توقع کا اظہار کرتے ہیں کہ بزم قانون کی سرگرمیاں حسب دستور جاری رہینگی ۔

بزم سائنس اس بزم کی کابینہ کا بھی جدید انتخاب عمل میں آیا ۔ حاجی غلام محمد صاحب متعلم ایم ۔ ایس ۔ سی ۔ اسکے نائب صدر اور مولوی عبدالوہاب صاحب متعلم سال چہارم معتمد منتخب ہوئے ۔ ہم اس جدید کابینہ کا بھی پرخلوص خیر مقدم کرتے ہیں ۔

بزم تاریخ بزم تاریخ کلیہ کی ذیلی انجمنوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ خوشی کی بات ہے کہ اس بزم کی کابینہ میں ہمارے دوست مولوی نبی الحسن صاحب شمیم متعلم سال چہارم نائب صدر اور خواجہ حمید احمد صاحب معتمد منتخب ہوئے ۔ ہم بزم تاریخ کی جدید کابینہ کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں ۔ ہمیں توقع ہے کہ بزم تاریخ کی روایتی سرگرمیاں سال رواں میں نہ صرف حسب دستور جاری رہینگی بلکہ ان میں خاصی ترقی ہوگی ۔

بیجاپور کا سفر تعلیمی کچھ دنوں پیشتر مسرت منزل کی جانب سے چند متعلمین کلیہ نے جن کی تعداد تقریباً چالیس تھی بیجاپور کا سفر کیا ۔ پروفیسر وحید الرحمن صاحب مودب مقیم بھی ہمراہ تھے ۔ یہ سفر نہایت دلچسپ اور کامیاب رہا ۔ طالبعلموں نے وہاں کے آثار قدیمہ کا بڑے شوق سے معائنہ کیا اور اثری معلومات کی فراہمی پر بھی کافی توجہ مبذول کی ۔ بیجاپور کے کلکٹر مسٹر نائک نے بڑے تپاک سے متعلمین کلیہ کا خیر مقدم کیا جس کے لئے ہم موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں ۔

بیدر کا سفر تعلیمی بیجاپور کے مذکورہ بالا سفر کے بعد ہی نظامت منزل کی جانب سے چند طالبعلموں نے جنکی تعداد تقریباً بیس بائیس تھی بیدر کا سفر کیا ۔ جناب مولوی محمد عبدالقادر صاحب سروری مددگار پروفیسر شعبۂ اردو طالبعلموں کے ساتھ تھے ۔ یہ سفر بھی بہت دلچسپ اور کامیاب ثابت ہوا ۔ ممالک محروسہ میں بیدر آثار قدیمہ کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس سفر سے متعلمین کلیہ کو اپنے ملک کے قدیم آثار سے واقفیت حاصل کرنے کا بہت اچھا موقع ملا ۔ خوشی کی بات ہے کہ اس موقع سے

انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس مقام پر اس امر کا ذکر کر دینا ضروری ہے کہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر اول تعلقدار بیدر نے متعلمین کلیہ کے ساتھ نہایت ہمدردانہ اور شفقت آمیز برتاؤ کیا۔ ہم صاحب معزی کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

سفر بجواڑہ و معائنہ سنگاریني

دسہرہ کی تعطیلات میں اقامت خانہ قدیم کے طلباء کی ایک جماعت معیت ڈاکٹر عبدالحق صاحب مودب مقیم بجواڑہ اور سنگاریني گئی تھی۔ بجواڑہ میں دریائے کرشنا اور مچھلی پٹن میں سمندر کی سیر کی۔ واپس ہوتے ہوئے بمقام سنگاریني کوئلے کی کانوں کا معائنہ کیا جو ہندوستان میں مشہور ہیں۔

تاریخی مشاعرہ

بزم تاریخ کی جانب سے نظامت منزل میں ایک مشاعرہ زیر صدارت پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب بتاریخ ۴ مروی ۳۸ف منعقد ہوا۔ یہ مشاعرہ عام مشاعروں کی مانند نہیں تھا۔ یعنی اس کے لئے نہ تو کوئی مصرع طرح دیا گیا تھا اور نہ کوئی خاص عنوان نظموں کے لئے بتادیا گیا تھا۔ بلکہ صرف اس امر کا اعلان کیا گیا تھا کہ شعرائے کلیہ کسی تاریخی موضوع پر نظمیں لکھیں بنگر کا مقام ہے کہ یہ مشاعرہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ اکثر شعرائے کلیہ نے اپنے جواہر افکار سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ ہم اس مشاعرہ کی کامیابی پر پروفیسر ہارون خاں شیروانی صاحب اور نائب صدر بزم تاریخ کو خاص طور پر مبارکباد دیتے ہیں

قاری کلیم اللہ صاحب

قاری کلیم اللہ صاحب ایم۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ) مددگار پروفیسر فارسی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ روانہ ہوئے۔ اور لندن کی جامعہ میں کام کر رہے ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ صاحب موصوف بہ عجلت ممکنہ ڈگری حاصل کر کے واپس تشریف لائینگے اور برادران کلیہ کو اپنی معلومات سے مستفید ہونے کا موقع عطا کرینگے۔

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

میر ولی الدین صاحب مادر جامعہ کے ان مایۂ ناز فرزندوں میں ہیں جنہیں انکی اعلےٰ قابلیتوں کی بنا پر یورپ کا وظیفۂ تعلیمی دیا گیا تھا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ صاحب موصوف نے دو سال کے اندر نہ صرف جامعۂ لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مدت معینہ میں بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ چند روز پیشتر وہ حیدرآباد آ گئے

ہمیں توقع ہے کہ ان کے تقرر کا معاملہ بہت جلد طے پا جائیگا اور انہیں مادر جامعہ کی خدمتگذاری کا جلد سے جلد موقع ملیگا ۔

معاشرتی جلسے

ہمیں اس امر سے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ برادران کلیہ میں اب معاشرتی جلسوں کی اہمیت کا اچھی طرح احساس پیدا ہوگیا ہے ۔ چنانچہ اس میقات میں فرحت منزل، نظامت منزل اور مسرت منزل میں اس قسم کا ایک ایک جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ انعقاد پذیر ہوا ۔ ہندو ہاسٹل میں اس دفعہ کرشن جی کی ولادت کے موقعہ پر کافی جشن منائے گئے ۔ دیگر اقامت خانہ جات کے طلبہ بھی اس تقریب میں شریک رہے ۔ اسی سلسلہ میں ایک منظر مہا بھارت کا پیش کیا گیا تھا جو ہماری جامعہ کے ایک ہونہار طالبعلم وکیل راو صاحب کا تیار کردہ تھا ۔

کلیہ میں تقرر

بڑی خوشی کی بات ہے کہ مولوی سید محمد یونس وفا قانی صاحب بی ۔ ایس ۔ سی (عثمانیہ) وایم ۔ ایس ۔ سی (ڈھاکہ) اور مسٹر بلند و سیتا رام راو صاحب بی ۔ ایس ۔ سی (عثمانیہ) و ایم ۔ ایس ۔ سی (ڈھاکہ) کا تقرر علی الترتیب طبیعیات اور کیمیا کی ڈیمانسٹریری پر عمل میں آیا یہ دونوں حضرات کلیہ کے لائق اور محنتی طلبا میں شمار ہوتے تھے ۔ چنانچہ انھیں بی ۔ ایس ۔ سی میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے کے صلے میں وظیفۂ تعلیمی دیا گیا تھا ۔ ہم ان دونوں کو ان کے تقرر پر دلی مبارکباد دیتے ہیں ۔

پروفیسر علی یار خانصاحب

جناب علی یار خانصاحب بی ۔ اے (آکسن) کو پروفیسر تاریخ یورپ کی خدمت پر (صماء تا الف) کے گریڈ میں ترقی دی گئی ۔ ہم صاحب موصوف کو اس ترقی کی مبارکباد دیتے ہیں ۔

منتظمی مجلہ (اعزازی)

مولوی محمد حمید اللہ صاحب بی اے سابق منتظم مجلہ نے گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے منتظمی مجلہ سے سبکدوشی حاصل کی ۔ ان کی جگہ مولوی شیخ چاند صاحب بی ۔ اے متعلم ال ال ۔ بی کا انتخاب عمل میں آیا ۔ ہم صاحب موصوف کو مبارکباد دیتے ہوئے اس توقع کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنے مفوضہ فرائض کو پوری دلچسپی سے انجام دینگے ۔

ایم ایس سی کلاس

بڑی خوشی کی بات ہے کہ گذشتہ ستمبر سے کیمیا اور طبیعیات کے مضامین کے لئے ایم۔ایس سی کی کلاسیں کھولدی گئی ہیں اور اب ان مضامین کی باقاعدہ تعلیم ہونے لگی ہے۔

موتمر مستشرقین

موتمر مستشرقین دوئلی کا، اردواں اجلاس بمقام آکسفورڈ بتاریخ ۲۰ اگست ۱۹۲۸ء منعقد ہوا۔ اس میں مختلف جامعات کے پروفیسر اور علمی انجمنوں کے نمائندے شریک تھے۔ شرکا، کی تعداد پانسو سے زیادہ تھی۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب پروفیسر عربی نے جامعہ عثمانیہ کی جانب سے اور مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ نے سرکار عالی کی جانب سے نمائندگی کی۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ اسلامیات میں "دیوان ابو تمام کے قلمی نسخے اور اس کی غیر مطبوعہ نظموں پر ایک تنقیدی نظر" کے عنوان کے تحت اور ناظم صاحب نے غارہائے ایلورہ کی فرسکو پینٹنگس (دیواری نقوش یا تصاویر) پر اپنا اپنا پر از معلومات مضمون حاضرین کے گوشگذار کیا۔ موخرالذکر تاریخ اور پینٹل آرٹ کے سکرٹری بھی بنائے گئے تھے۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے موتمر میں حسب ذیل تجویز پیش کی جو بالاتفاق منظور کی گئی۔

"اس کانفرنس کی رائے میں یہ امر مرغوب ہے کہ عربی کا ایک نہایت مبسوط تاریخی لغت زبان عربی میں تیار کیا جائے۔ اور مصری حکومت کی توجہ اسکی طرف مبذول کرائی جائے کیونکہ قاہرہ ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں مشرقی فضلا، اور مشہور مستشرقین جمع ہوکر کام کرسکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل تجویز بھی موتمر میں بالاتفاق منظور کی گئی:۔

"موتمر کی جانب سے حکومت اعلیحضرت نظام کی ان مساعی جمیلہ کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جو وہ تاریخی یادگاروں کی حفاظت کیلئے کر رہی ہے"۔

موتمر مستشرقین ہند

موتمر مستشرقین ہند کا پانچواں اجلاس لاہور میں ۱۹ نومبر ۱۹۲۸ء کو منعقد ہوا عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر شعبۂ اردو کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ انکا خطبۂ صدارت بڑے شوق و دلچسپی سے سنا گیا۔ اسی موتمر میں شرکت کے لئے جامعہ کی طرف سے حسب ذیل نمائندے بھیجے گئے تھے:۔

۱۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب ۲۔ ڈاکٹر نظام الدین صاحب ۳۔ پروفیسر سید سجاد صاحب

۴۔ پروفیسر سبارا ؤ صاحب

عربی اور فارسی کی شاخ میں علی الترتیب ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور ڈاکٹر نظام الدین صاحب نے اپنا اپنا مقالہ سنایا جن کو حاضرین نے بڑے شوق سے سماعت کیا۔ اس شاخ کے صدر ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے۔ موتمر کا اجلاس مسلسل چار روز تک ہوتا رہا۔ اسکے بعد بہت سے ممبر ٹکسیلہ کے کھنڈر کی سیر کے لئے روانہ ہوئے اور ۲۴ نومبر کو واپسی عمل میں آئی۔ ہمارے لئے یہ امر بڑی مسرت کا باعث ہے کہ کانفرنس کے جلسہ عام میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو آئندہ کانفرنس (جو دو سال کے بعد پٹنہ میں منعقد ہوگی) کی مجلس انتظامی کا رکن منتخب کیا گیا۔

شیخ فرید حسین صاحب مرحوم

نہایت رنج و ملال کے ساتھ یہ خبر لکھی جاتی ہے کہ گذشتہ ماہ میں شیخ فرید حسین صاحب کا بعارضۂ تپ دق بمقام بھوپال انتقال ہوا۔ مرحوم کلیہ کے ہونہار گریجوایٹ تھے۔ ہمیں انکی ذات سے بہت کچھ توقعات تھیں۔ مرحوم کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اکثر نوجوانوں کی طرح ملازمت کو اپنا مقصد زندگی نہیں بنایا بلکہ ذاتی جد وجہد سے کاروبار کا آغاز کیا۔ انہوں نے دکن کلاتھ ہوز کے نام سے ایک اعلیٰ درجہ کی دکان قائم کر لی تھی۔ ہم مرحوم کے والد مولوی شیخ احمد حسین صاحب وکیل ہائیکورٹ سے اس جانکاہ حادثے پر بہ کمال رنج و ملال اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔

ہارٹوگ کمیٹی کا معائنہ

ہارٹوگ کمیٹی سائمن کمیشن کی ذیلی تعلیمی کمیٹی ہے۔ اسکے صدر سر فلپ ہارٹوگ ہیں ۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو سر فلپ ہارٹوگ اور ان کے حسب ذیل رفقاء حیدرآباد آئے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بالقابہم سے ملاقات کی۔

۱۔ راجہ نرندر و ناتھ

۲۔ سر سلطان احمد

۳۔ مسٹر اسٹیتھم

رات میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بالقابہم نے اراکین کمیٹی کے اعزاز میں ایک ڈنر ترتیب دیا جس میں جامعہ عثمانیہ اور محکمہ تعلیمات کے اعلیٰ عہدہ دار بھی مدعو تھے۔

۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو اس کمیٹی نے بہ معیت نواب حیدر نواز جنگ بہادر دارالترجمہ اور کلیہ جامعہ عثمانیہ کا معائنہ کیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس معائنہ کا اثر اراکین کمیٹی پر بہت اچھا پڑا چنانچہ انہوں نے اپنی تقریروں میں اس کا اظہار کیا۔

دوپہر میں نواب ولی الدولہ بہادر نے سر فلپ ہارٹوگ اور ان کے رفقاء کو لنچ پر یونیورسٹی کلب میں مدعو کیا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا معائنہ

مسٹر لیانگلے وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی ۲۱ اکتوبر ۲۸ء کو حیدرآباد آئے اور اسی روز انہوں نے کلیہ جامعہ عثمانیہ کا معائنہ کیا۔ اس کے دوسرے روز دارالترجمہ کا معائنہ کیا۔ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر بھی ان کے ہمراہ تھے۔

مدراس یونیورسٹی انسپکشن کمیٹی

۲۴ نومبر کو مدراس یونیورسٹی انسپکشن کمیٹی نے بہ معیت مسٹر برنٹ پرنسپل نظام کالج کلیۂ جامعہ عثمانیہ کا معائنہ کیا۔ اس سے ایک دن قبل عثمانیہ یونیورسٹی ایسوسی ایشن نے اراکین کمیٹی اور نظام کالج کے پروفیسروں کو عصرانہ دیا۔ ممبران کمیٹی کے نام حسب ذیل ہیں:—

(۱) مسٹر رنگناوم پروفیسر انگلش لٹریچر و صدر کمیٹی۔
(۲) مسٹر راما نومی مینن وائس چانسلر مدراس یونیورسٹی
(۳) مسٹر ستیا مورتی بالٹیشن
(۴) مسٹر چنا تمبی پلے پرنسپل اور پروفیسر ریاضیات سینٹ جوزف کالج۔ (مدراس)
(۵) فادر ہونورے پروفیسر طبیعیات سینٹ جوزف کالج۔ ترچناپلی
(۶) پروفیسر ایریم اسمتھ پروفیسر کیمیا پریزیڈنسی کالج۔ مدراس
(۷) مسٹر نیلکنٹھ شاستری پرنسپل سری منکشی چدم برم
(۸) ڈاکٹر ہاگ پروفیسر فلاسفی کرسچین کالج۔ مدراس

۲۵ر نومبر مسٹر نگناوم صدر کمیٹی، ڈاکٹر ہاگ اور پروفیسر نلکینٹھ شاستری نے ریاضی اور تاریخ کے لکچر سماعت کئے اور بہت محظوظ ہوئے ۔ بعد ازاں صدر صاحب کلیہ نے انھیں دار الترجمہ کا معائنہ کرایا۔ شام میں نواب ذو القدر جنگ بہادر نے چاء نوشی کی دعوت کی جس میں کلیۂ جامعہ عثمانیہ اور نظام کالج کے اکثر پروفیسر مدعو تھے ۔

نقد و تبصرہ

خزینۂ تاریخ

بزم تاریخ کلیۂ جامعہ عثمانیہ کا پہلا مجموعۂ مضامین ۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر بزم تاریخ خانقاہ ہنود ۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ قیمت عہ ۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کی ذیلی کارگزار انجمنوں میں بزم تاریخ کا شمار سب سے پہلے کیا جائیگا ۔ یہ انجمن ۱۳۲۹ف میں طلبہ کی کوشش اور اساتذہ کی شفقت و ہمدردی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی ۔ اور (۹) سال سے برابر اپنے مفوضہ خدمت کو خاموشی سے انجام دیرہی ہے ۔ اس انجمن کا اولین مقصد بقول صدر بزم یہ تھا کہ "معلمین و متعلمین تاریخ میں آزادانہ طور پر اپنے مخصوص موضوعات پر تبادلہ آرا کرسکیں اور جس کے ذریعہ سے متعلمین تاریخ میں تاریخی تحفظ کا ذوق پیدا ہو" ۔ اپنے اس مقصد میں انجمن کہانتک کامیاب ہوی اسکا اندازہ اس بزم کی فہرست مضامین و تقاریر کے دیکھنے سے ہوسکتا ہے ۔ اس مکمل فہرست میں تین قسم کے مضمون نگار اور مقرر ہیں ۔ باہر کے علماء و مشاہیر کالج کے فاضل اساتذہ اور تیسرے طلباء ۔ باہر کے علماء و مشاہیر میں مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم ۔ ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر ۔ پروفیسر ہمنت راؤ صاحب نظام کالج ۔ جناب محمد مارماڈیوک پکتھال صاحب مدیر اسلامک کلچر مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین اور مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ شریک ہیں ۔ کالج کے پروفیسروں میں علاوہ تاریخ کے پروفیسروں کے پروفیسرین جی ویلنکر اور پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے نام دکھائی دیتے ہیں باقی مضامین سب طلباء ہی کے ہیں ۔ مضامین

تاریخ عالم کے مختلف پہلوؤں پر ہیں اور ساتھ ہی علوم عمرانی پر بھی بعض مضامین ہیں چونکہ مکمل فہرست کے جملہ مضامین اس خزینہ میں نہیں ہیں اس لئے ہم فی الحال پیش نظر کتاب کے مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالینگے۔ یوں تو اس کتاب کے اکثر و بیشتر مضامین نہایت محنت و عرق ریزی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں تاہم بخوفِ طوالت ہم یہاں صرف چند مضامین پر روشنی ڈالینگے۔

"ابن خلدون کے خیالات عمرانیات پر" ابن خلدون موجودہ فنِ تاریخ کا سب میں پہلا رہنما مانا جاتا ہے۔ اپنے زمانہ کے ماحول کے متعلق اس کے خیالات سند ہیں۔ پیش نظر مضمون اپنی جامعیت اور ضرورت کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ ہے۔

دوسرا مضمون "فلسفۂ تاریخ" پر ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس بزم میں سب مضامین لکھکر نہیں سنائے جاتے بلکہ بعض موضوعات پر تقاریر بھی ہوتی ہیں جو بعد میں مجموعہ کی خاطر مرتب کئے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض مضامین تشنہ نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو مضمون تقریر سے لیا گیا ہو اس میں وقت کے لحاظ سے اختصار اور جامعیت ضرور ہوگی۔ اس سے مضمون کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوسکتی۔ فلسفۂ تاریخ پر قابل پروفیسر صاحب نے ارسطو سے لیکر ابن خلدون تک نہایت اختصار سے مختلف دور کے بڑے مفکروں کا ذکر کیا ہے تاکہ طالبعلم کے دماغ میں ایک ابتدائی خاکہ اس مضمون کا کھنچ سکے۔ اور اپنے اس مقصد میں یہ مضمون ہر متعلم سیاسیات کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

طلباء کے مضامین میں بھی بعض خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہیں "مغفرت مآب" حضرت آصف جاہ اول" یہ ایک ضروری اور نہایت پُر مغز مضمون ہے اس موضوع پر مواد کی جو کمی ہے اسکا لحاظ کرتے ہوئے مضمون نگار کی کوشش ہر لحاظ سے قابل داد ہے۔ آصف جاہ اول دکن میں نہ صرف ریاست آصفیہ کے بانی کی حیثیت سے ایک بڑی شخصیت رکھتے ہیں بلکہ ہندوستان کے بڑے مدبروں میں ان کا شمار ہے اور تاریخ دکن میں ان کے متعلق کافی مواد کا نہونا اسکا ایک نقص گنا جاسکتا ہے۔

دوسرا مضمون "شہری زندگی کا ارتقاء" ہے اس مضمون کے مصنف کلیہ کے ایک مایۂ ناز طالبعلم ہیں۔ عمرانی حیثیت سے یہ مضمون بیحد قابل قدر ہے۔ اس مضمون میں ازمنۂ قدیم کے

یونان اٹلی اور ہندوستان سے لے کر قرون وسطیٰ کے یورپ اور ہندوستان کا ارتقا بتلایا گیا ہے اور مغرب و مشرق کے شہروں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔

تیسرا مضمون "زمانہ وسطیٰ میں ہندوستان میں اتحاد باہمی کی کوشش" یہ ایک انعامی مضمون ہے۔ مضمون نگار نے ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کے ہندو مسلم اتحاد کو مذہبی بزرگوں کی کوشش کا نتیجہ ثابت کیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ چھوٹا سا مجموعہ بزم تاریخ کی کاوشوں کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے۔ اور ہر حیثیت سے یہ بزم قابل مبارکباد ہے کتاب مطبع انجمن ترقی اردو کے ٹائپ میں چھپی ہے لیکن شروع سے آخر تک مختلف غلطیوں کو دیکھکر خیال ہوتا ہے کہ شاید اردو زبان کی کتابیں ٹائپ کی ایجاد کے بعد بھی اپنے غلط ناموں کی فہرستوں سے محفوظ نہیں ہو سکتی ہیں امید ہے کہ آئندہ مجموعہ اس سے بہتر اہتمام سے چھپیگا۔

تحفۂ خادم خلق

اشاعت نمبر (۱) مصنفۂ جناب سید دن شاہ صاحب۔ خادم خلق۔ گجرات پنجاب قیمت علاوہ محصول ڈاک عصر

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ مذہبی مضامین پر مشتمل ہے اور مصنف کے بیان کے مطابق تحفۂ خادم خلق کی پہلی کڑی ہے۔ اس کا مقصد مذہبی تعلیم اور ہدایت ہے۔ کتاب مختلف مضامین پر مشتمل ہے جس میں مذہبی مضامین، علم کلام کی بعض مشہور بحثیں اور تصوف کے درس ہیں ساتھ ہی معاشرت کے بعض اصول پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب میں نظم و نثر دونوں ہیں اور یہ کسی باقاعدہ مضمون کے بجائے خلوص عمل کا تحفہ معلوم ہوتی ہے تاہم جو کوشش بھی عام اہل مذہب کے فلاح کے لئے کیجائے مبارک ہے۔

انشائے جدید

مولفۂ مولوی محمد علیخانصاحب اثر رام پوری۔ پتہ مطبع حیدر برقی پریس دہلی۔ قیمت کا اندراج نہیں ہے۔

فارسی جدید جو آجکل ایران میں رائج ہے اور فارسی قدیم جس سے اہل ہند عموماً واقف ہوتے ہیں ان میں بین فرق ہے اس لئے آجکل درس و تدریس میں اہل ایران کی جدید زبان

کا داخل نصاب کرنا ضروری ہوگیا ہے عموماً طلبہ فارسی پڑھنے میں قدیم درسی کتب اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور تحریر و تقریر کے مواقع پر ہندوستانی خیالات پر فارسی الفاظ کا جامہ پہنا دیتے ہیں جو ایک تیسرے طرز کی فارسی زبان ہوتی ہے اسلئے اسکی ضرورت ہے کہ طلباء کو ابتداء ہی سے اسکی مشق کرائی جائے کہ وہ جو نئی زبان سیکھتے ہیں اسی کے محاورے اور طرز ادا کے لحاظ سے اس کو برتیں۔

انشائے جدید اسی قسم کی کوشش کا نمونہ ہے اسمیں جدید فارسی کے ذریعہ خط لکھنے کا طریقہ نسبتاً بہت اچھے طرز سے پیش کیا گیا ہے۔ کتاب (۱۶) ابواب پر مشتمل ہے جس میں خط نویسی کے لوازمات القاب و آداب کے طریقے اور مختلف مدارج کے لوگوں کو خط لکھنے کے ڈھب بتائے گئے ہیں۔ سب سے اچھی چیز جو اس کتاب میں پائی جاتی ہے وہ نمونہ ہائے خطوط ہیں جو ایک ہی مضمون کے ہندوستانی فارسی اور جدید ایرانی فارسی کو بالمقابل پیش کرتے ہیں اس سے طالبعلم کو معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ کس طرح فارسی کو غلط استعمال کرتا ہے اور صحیح خطوط کی رہبری میں ان غلطیوں سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے۔ علاوہ خطوط کے اور مختلف ضروری معلومات جو مراسلت میں ہر شخص کے لئے ضروری ہیں اس کتاب میں فراہم کئے گئے ہیں آخری باب سکہ جات و اوزان طہران پر مشتمل ہے جو تجارتی کاروبار کے لئے بہت مفید ہے بہرحال یہ کتاب فارسی زبان کے سیکھنے والوں کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوگی لکھائی چھپائی معقول ہے۔

مُتقنّ

قانونی ہفتہ وار رسالہ۔ لکھائی چھپائی بہتر دیدہ زیب ملنے کا پتہ منیجر متقن نام پلی نمبر مکان (۵۰۰) چندہ ۶ سالانہ

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے کلیہ کے فارغ التحصیل مختلف میدان عمل میں اپنی زندگی اور کارکردگی کا ثبوت دیرہے ہیں۔ متقن بھی ہمارے کلیہ کے مشہور اور قابل طلباء کا امید افزا نقشۂ اولین ہے۔ جناب سید محمد احسن صاحب بی۔اے، ال ال۔بی وکیل ہائیکورٹ، جناب حسن الدین صاحب بی۔اے، ال ال۔بی وکیل ہائیکورٹ اور جناب عبدالرحمن صاحب رئیس کے متحدہ ادارت میں یہ چیز یقیناً روز افزوں ترقی کرسکتی ہے۔ تینوں حضرات اپنی علمی جدّوجہد اور عملی سلیقہ کی وجہ سے ملک میں پہلے ہی سے شہرت حاصل کرچکے ہیں۔

ہمارے پیش نظر اسوقت اسکے دو نمبر ہیں اور ان دونوں کو ملاکر ہم یہاں نقد و نظر کرینگے رسالہ تین اجزاء پر مشتمل ہے پہلا جز عام قانونی مضامین کا ہے دوسرا حیدرآباد دکن کے جدید نظائر کا ذخیرہ ہے تیسرا نظائر ہند کے ترجموں پر مشتمل ہے۔ نظائر کا اہتمام کرنے کے لئے گو پیشتر ہی سے حیدرآباد میں اور بھی رسائل موجود ہیں لیکن جلد سے جلد اور کم مدت میں اس عملی چیز کا فراہم کردینا وکالت پیشہ طبقہ کیلئے بہت مفید ہے لیکن اگر یہی خوبی کسی رسالہ میں ہو تو وہ صرف عملی سہولت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھ سکتی اس رسالہ کی اصلی علمی خوبی اسکے پہلے حصہ سے متعلق ہے جسپر مختصراً چند نمایاں چیزوں کا یہاں بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے

قانون کی اہمیت اور وسعت دونوں لحاظ سے اسکی ضرورت ہے کہ اسکی ایسی نشر و اشاعت کیجائے جس سے وکلاء اور اہل ملک دونوں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاسکیں اس لحاظ سے مقننین نے اپنے مضامین کی نوعیت ایک حدتک ضرورت اور اردو کی خدمت کے لحاظ سے رکھی ہے اسمیں بعض مضامین قانون کے علمی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں جس میں علاوہ اور مضمونوں کے اقتدار اعلےٰ کے جیسے اہم اور دقیق مسئلہ پر بھی ایک پرمغز اور مفصل مضمون دیکھ کر اس رسالہ کے مستقبل کے متعلق اچھی امید بندھتی ہے۔ دوسرے قسم کے مضامین زیادہ تر عملی قانون سے متعلق ہیں جو ایسے رسالہ کیلئے بیحد ضروری ہیں جسکا تعلق پیشہ قانون و وکالت سے ہو۔ عدالتوں کے کام میں اسی وقت آسانی اور خوبی پیدا ہوتی ہے جب کہ قانون پیشہ حضرات مقدمات کو واضح کرنے میں عملی تجربہ اور فہم و فراست کے ساتھ ساتھ اساسی قانون کو اچھی طرح برت سکیں۔

بہرحال مختلف وجوہ سے یہ رسالہ حیدرآباد کی علمی کاوشوں کا ایک ہونہار نمونہ ہے ہم مقننین کے قابل مدیرین کو ان کی اس کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں ہمیں امید ہے کہ کلیہ کے طلبہ قانون اسکے علمی حصہ پر نہ صرف اپنی معلومات کی حدتک توجہ مبذول کرینگے بلکہ عملی طریقہ سے قانون کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھ کر اسکی قلمی امداد فرمائینگے ساتھ ہی یہ توقع بھی بیجا نہوگی کہ اہل ملک اور خاص طور پر قانون داں اور وکالت پیشہ حضرات اس کارآمد اور کارگزار رسالہ کی ہر طرح ہمت افزائی کرینگے۔

از سید محمد اکبر وفا قانی مدیر

صفیہ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر

مصنفہ مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی سابق مدیر الجمعیت۔ قیمت ۸ر
ملنے کا پتہ حفیظ الرحمن صاحب خلف مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کوچہ چیلاں دہلی یا مکتبہ برہان حیدرآباد

دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے سیاسی تعلقات پر انگریزی زبان میں متعدد کتابیں ابتک لکھی جاچکی ہیں انکے زیادہ تر لکھنے والے خود انگریز ہیں ان میں سے بعض نہایت ذمہ دار خدمات پر رہ چکے ہیں مثلاً فریزر، گریل وغیرہ اس مضمون پر ابتک ہماری دانست میں اردو میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی لیکن اس کمی کو مولوی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے پورا کردیا اردو داں طبقہ کی طرف سے ہم کو مولوی صاحب موصوف کا شکرگذار ہونا چاہیے۔

زیر نقد کتاب میں قابل مصنف "خود انگریزی ذرائع اور زیادہ تر معتبر و مستند سرکاری ریکارڈ کے حوالہ سے" دونوں حکومتوں کے سیاسی تعلقات پر دلچسپ پیرایہ میں اچھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کو قابل مصنف نے تقریباً بتیس عنوانوں پر تقسیم کیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے ہم اس عہد کو تین حصوں میں اس طرح تقسیم کرسکتے ہیں۔

(۱) ۱۷۴۸ء سے ۱۸۰۰ء تک (۲) ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک (۳) ۱۸۵۷ء سے عہد حاضر تک

پہلے دور کی خصوصیت یہ ہے کہ جنوبی ہند کی حکومتوں میں توازن قائم رکھا جائے۔ سیاسی حیثیت سے دونوں حکومتوں میں مساویانہ تعلقات پائے جاتے ہیں چنانچہ آصفجاہ ثانی کے عہد تک دونوں حکومتوں میں سفارتی تعلقات قائم تھے ایسٹ انڈیا کمپنی کا رزیڈنٹ حیدرآباد میں اور دولت آصفیہ کا ایلچی کلکتہ میں رہتا تھا مگر انیسویں صدی کی ابتدا اور نواب نظام علیخاں کے انتقال کے ساتھ ہی سیاسی مرتبہ میں کمی آنے لگی۔ پہلے تو ایلچی کی خدمت مسدود کی گئی اور رزیڈنٹ کے اندر دونوں عہدے جمع ہوگئے۔ اسکے بعد انگریزی حکومت کی طرف سے ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع ہوئی جو رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ خط و کتابت میں بھی قدیم آداب و القاب کو نظر انداز کردیا گیا۔ انیسویں صدی کے شروع سے ۱۸۵۷ء کے غدر تک انگریزوں کی پالیسی یہ رہی کہ سلطنت کو مستحکم بنیاد پر

قائم کیا جائے ۔ نئے علاقے الحاق کئے جائیں اور دیسی ریاستوں کو کمزور کر کے حکومت برطانیہ کی حفاظت (Protection) میں لیا جائے ۔

تیسرے دور میں جہاں تک معاہدات کا تعلق ہے کوئی تغیر نہیں ہوتا لیکن عملاً گزشتہ دور کی حکمت عملی اور کمزور کرنے والی کوششوں سے استفادہ کیا جاتا ہے یہاں تک کہ حکومت برطانیہ کا ادعا اور حیثیت دولت عالیہ (Paramount Power) کی ہو جاتی ہے ۔ ریاستیں اندرونی معاملات میں ایک حد تک آزاد رہتی ہیں اس معاملہ میں حکومت کی پالیسی وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے کبھی مداخلت کو جائز رکھا جاتا ہے اور کبھی اس سے احتراز کیا جاتا ہے ۔ اس کتاب میں بھی یہ تینوں دور صاف نمایاں ہیں ۔

دولت آصفیہ کی تاریخ حقیقت میں نہ صرف دور مغلیہ کے آخری عہد کی تاریخ ہے بلکہ قریب قریب سارے ہندوستان کی تاریخ ۔ اس کے لئے ایک مفصل اور بسیط کتاب کی ضرورت ہے جس کے لکھنے کا خود قابل مصنف نے وعدہ فرمایا ہے ۔ زیر تبصرہ کتاب کو دراصل اسی آئندہ تصنیف کا امید افزا پیش خیمہ سمجھنا چاہئے ۔ جہاں تک زبان اور مواد کا تعلق ہے مولوی صاحب موصوف کی یہ کوشش لائق تحسین ہے لیکن رائے اور نتائج کا استنباط ایک حد تک شخصی حیثیت رکھتا ہے ۔ نیز ایسی کتابوں کا علمی نقطہ نظر سے مورخانہ اسلوب اور غیر جانب دارانہ رنگ میں لکھا جانا لازمی ہے ۔ بہرطور ہمارے خیال میں اس مختصر مگر مفید کتاب کا مطالعہ ہر بہی خواہ ملک کے لئے ضروری ہے ۔

از جناب سید حسن علی صاحب

بی ۔ اے ایل ایل ۔ بی وکیل ہائیکورٹ

7. An attempt should be made to impart University education in mother-tongue, which should be taken as the common language of the entire student community.

SULAYAMAN NADAWI, MAWLANA SAYYID.

* * * * *

I belive that it is rather in the schools than in the University that the solution of your problem is to be looked for. Communal strife is founded upon elementary hates and prejudices acquired in childhood and early youth. If there were more good boarding schools in which the better class children of the two communities lived together in good fellowship, and in mutal respect, that would lay the foundation of a new understanding.

WEST, PRINCIPAL MICHAEL,
Dacca.

religion, this can be changed by disentangling the essentials of religion from nonessentials and stressing the former.

Another way in which the problem can be faced as an education problem is for Government or pulic bodies to establish nondenominational public schools and colleges of the residential type, where all pupils live and dine together and where no communal or caste distinctions are at all observed.

SETHNA, HON'BLE SIR PHIROZE

* * * *

In order to attain this high ideal of Inter-communal harmony through University Education, a few suggestions, such as these, may prove helpful :---

1. Books on Indian History in which facts are recorded without the least tinge of prejudice and communal bias and with the aim of bringing together the different communities of India, should be prescribed as text books.

2. Education, instruction, lectures and writings should bring to light such events of Indian History that arouse a genuine feeling of love, confidence and develop the idea of Unity in the country.

3. Every University should enjoin the wearing of a suitable academical dress and all the students whether Hindus, Muslims or of any other community, should adopt it.

4. In hostels an attempt should be made that all the Hindu and Muslim students live not separately but together in one room.

5. Importance should be attached to moral instruction. Such instruction should not concern itself with philosophic or theoritical speculations, but it should lead to practical ends.

6. The real significance of religion should be made clear, as such that it is not religion that inclucates factions and schisms but invokes love and sympathy.

It is however desirable to probe the question to its root. Perfect intercommunal unity will only be generated in this country when the following conditions are realised viz. (1) when the legitimate minority interests are duly safeguarded and when every minority feels that they are so safeguarded. (2) When no minority makes extravagant pretensions or claims, either out of fear or selfishness. (3) When every minority will feel that even though its relations with majority. communities are not quite satisfactory, it will never fail or abate in its allegiance and devotion to the nation and national interests. (4) When majorities will spare no efforts to respect the claims of minorities, even though in their own view such claims may appear to be not quite fully justified. (5) When higher education is more widely spread among the Moslems and education in general is more widely diffused among both Hindus and Moslems and (6) When more liberal ideas about religion and religious practices prevail among both the Hindus and Moslemsl This last, is necessary in particular, to prevent or minimise the causes of religious differences which sometimes result in breaches of the peace-

From all this, it will be seen that the problem is not a pure university or educational problem, it is a constitutional, political, social and religious problem as well. This does not mean, however, that the Universities can play no part whatever in contributing to its solution. In its educational aspect, they can and ought to face it by including Indian Politics, Indian Civics and Comparative Religions into their curriculum. Education is a powerful force which, if directed towards definite ends, hardly fails in achieving them. There have been instances in history of even national character being radically changed under the influence of a deliberate system of education specially designed to bring about such a change. If Indian Politics and Civics are properly and deliberately taught with a view to Impressing upon young minds the paramount duty and necessity of cultivating and fostering intercommunal unity and friendliness, such teaching will, in the long run, produce a nationamentality which will be absolutely undisturbed by, or impervious to the communal spirit, and a such a spirit, receiving no sustenance will die of inanition.

In the same way the study of comparative religions will reveal the essential beauty of all religions, it will show that the claim of any one religion being higher or better than another is absurd, that the root principles of all religions are the same, that there is need for the utmost religious toleration and mutual appreciation and that a true religious spirit consists not in outward observances but in leading a good and pure life in strict conformity with the foundamental teachings of religion. At present, many people violate religion in the name of

make a united effort to weld together their pupils they will send forth into the world every year thousands of young men bearing not only the conventional university hall-marks but imbued with patriotism and fraternal affection towards one another, irrespective of cast, colour or creed.

KHAN, Principal MOHD. ABDUR RAHMAN,
Osmania University College

The subject on which you have invited my views is as difficult as it is important. It is not possible for me to deal with it fully in this brief note which is all that I can write at the present moment. Nevertheless, I send you this statement of my views, fully hoping that it will help in the discussion of the problem, and in reaching sound conclusion.

I have considerable faith in the existing University system, in spite of its defects, and am of opinion that it does try, both directly and indirectly, to equip the minds of those who undergo University training with an outlook such as may promote the sense of mutual respect and love among the different sections of the Indian people. In other words, I consider the present University education as an important factor in promoting intercommunal sense, regard and unity.

I do not think that generally speaking, intercommunal discord and disunity is deliberately fostered by men, whether Hindus or Mohamedans, who have received such education. The University educated men who are at the present moment leading communal movements and stressing communal viewpoints and interests are comparatively few, the vast bulk of such men are, I believe, entirely in favour of intercommunal unity and are genuinely anxious to realise it fully and permanently. The deliberations of the All-Parties Conference recently held at Cawnpore are a decisive proof of this, they reveal a very encouraging and inspiring illustration of the subordination of communal to national interests, of the general prevalence of national sense and unity.

The study of English literature and of Western history and politics is such that it is bound to create a national outlook and to foster that genuine spirit of liberalism which is absolutely incompatible with a narrow communal outlook and with the petty desire to perpetuate communal interests at the sacrifice of those which are national.

and Resident Tutors of colleges should try to bring the students of the two communities as much together as possible by (*a*) holding social reunions, arranging instructive excursions and getting up pleasent theatrical shows (*b*) wherever there is no objection, common boarding and lodging, dinners and 'At-homes' may be provided for to stimulate greater intimacy and develope a deeper fellow-feeling (*c*) All topics of religious controversy should be avoided and ideal patriotism instilled into the minds of the pupils.

Both the Hindus and the Mohamedans should be brought to recognise in certain distinguished men and women famous alike for their genuine love of the country and for their remarkable achievements the typical hero or heroine whom all must love and try to emulate. Where the desire is sincere and the attempt is properly made, unbiassed by prejudice or favouritism, there will be no difficulty in finding such national heroes or heroines whom all would sincerely agree to venerate.

The idea of nationality as it is understood in European countries is well-known to the educated people of India. Mere adoption of a citizenship, or chance birth in a country with residence for a certain number of years, stamps an individual with a distinct nationality. Mahomedans in India have much stronger ties than these to entitle them to assume the Indian nationality. They should act and think as Indians only. Their Hindu fellow-countrymen should in no way regard them as foreigners or intruders but must consider them as truly Indian as they themselves are. There may have been a time when some Indian Musalmans felt towards the countries outside India whence their ancestors migrated, a yearning akin to that of a stranded sailor for the country of his birth, but generations of life in placid India and adaptation to its climate and customs, manners and mode of living have changed them completely---so much so that, except in the case of a few well-educated and wealthy families that can live with comfort in any part of the civilized world, they can never feel at home any where outside India for any great length of time.

When the young student finds his attention drawn to such obvious but far reaching facts and develops his mind in such an atmosphere of harmony and alliance, under the care of sympathetic, and patriotic professors, he will never regard his fellow-student of a different community as an alien or intruder but as a real compatriot with whom he must live and for whom he must feel. School friendships have been very strong and have often left a permanent impress on the histories of great nations. If the University Professors and Tutors

Whatever the methods adopted by the Universities towards the attainment of this object, they cannot differ in their basic principles from those which any non-academical institution may adopt for the same purpose. These principles are exceedingly simple. Both the Hindus and the Mohamedans should realise why it is necessary for them to unite. They can then see how it is possible to do so. Unity is possible only when both the parties make an honest and sincere attempt to *understand* each other and *learn* to respect and love each other.

It is my belief that while the Hindus and the Mohamedans know too little of the bright side of things in the best periods of each other's History in India, they know (and try to remember) too much of the sordid details of each other's darkest periods. This may be due to the deterioration that creeps into the mentality of a great people during its downfall, or may be the result of external influences. People with a cheerful disposition dô not brood on small wrongs done to them by their rivals or fellow-competitors. But men with a melancholy or hypochondriacal turn of mind wear out their lives by pondering over such matters. I am afraid, the same applies to the two great communities of India. We are too much engrossed in the past whether in childish exultation over the great achievements of our great ancestors or in sickly lamentation over the wrongs (real or imaginary) done to our forefathers by the forbears of our fellow country-men. If the past so universally dominates our minds and regulates our conduct in life, is it not advisable for the modern Indian Historian to turn over the mouldy leaves of documentary History and bring into lime-light neglect -ed or ignored periods of the mutual amity and happy co-operation between the two great communities of India, and include them in the University curricula of study? Is Muslim History in India but a chronology of wars and usurpations, or Hindu History merely a record of incessant intrigues and insurrections?

Another means of effecting a better understanding of each other is by exhorting the Mohamedan students to study Sanskrit and Hindi-Bhasha, and the Hindu students to learn Arabic and Persian as did their forefathers. A better appreciation of each other's classical literatures will certainly pave the way for mutual respect, as these literatures are expressions of the noblest ideas that have been developed in the minds of the most illustrious persons of either community.

Great advantage can be taken of our common social habits. These are the natural consequences of continuous close contact and amicable existence under all sorts of circumstances. The provosts

" Unity is not to be reached by any amount of writing, but it will be reached by a silent transformation of our hearts which would only come when we are truly desirous of achieving unity."

GANDHI, MAHATMA, M. K.

* * * * *

Your questions may be briefly re-stated as follows :---

(*a*) Does the existing University system aim at inspiring students with the desire to put a stop to Inter-communal strife and promote good-will among the different sections of the people of India ?

(*b*) Could the Indian Universities evolve a system of education that will contribute towards this end, and if so, how ?.

My answer to the first question is " No ", to the second, " Yes ".

Our Universities are chiefly concerned with purely academical matters. The most important members of their intelligenzia, the Professors, are either too much absorbed in their routine, or under existing circumstances, feel that they carry too little influence to attempt the solution of a problem of public affairs such as Inter-communal rivalry. The politicians alone are in a position to tackle this question, but they are apt to approach it in a purely party spirit. Perhaps it is for this reason that they, (amongst whom we find nowadays men with the very highest University education), sometimes get " mixed up " with inter-communal dissensions, though it is hard to believe that they actually " countenance " such dissensions.

National Universities can exercise an immense influence on the progress of a nation. Instances are not wanting to show that they can mould not merely the character but the very mentality of nations. It will be no abandonment of the high academical ideals of a University, if it sometimes directs its attention to the practical side of life and devises measures calculated to spread good-will and love among the rival sections of the people for whose benefit it is founded.

The tendency in these sectarian institutions is towards the fostering of a narrow, biassed, and sectarian outlook. Not only students connected with them but also the teachers get infected with its poisonous germ and it seems to me that the only way in which within the University this demon of communalism can be exercised is by having hostels open to every section of the community. I should also suggest the formation of cultural study circles, where subjects can be studied and discussed in an academic spirit, free from the rancour and the spite of the market place and the platform. I have in my humble way attempted to have a study circle of this character in the Hostel of which I am the Warden, and you can have my assurance that the experiment has been attended with the most gratifying success. A good deal of the present communal bitterness and mutual misunderstanding is based on almost complete ignorance of the Culture and the Religion of other communities and the God-less education which is imparted in the Secondary Schools and at the University can only be counteracted by an organised endeavour on the part of the University teachers to understand and appreciate the points of view of the sister-religious systems. That University men have during the past several years taken in India an unfortunately prominent part in encouraging communal dicsensions, is due in my opinion to economical and political causes, to an effort to get the loaves and fishes of office, and to an attempt to attain artifical political importance.

(2) The question is not educatianal at all and except when some communal leaders enters into the precincts of the University the placid stream of life in the University is not disturbed by external communal storms.

(3) Books, such as Radha Krishanan's Hindu View of Life or Amir Ali's Spirit of Islam or Mrs. Basants Translation of the Bhagvat Gita or Taraporevala's Pamphlet of the Religion of Zoroaster, should be recommended for study in every University. But what is required more than anything else is a recognition of the fact that political and social life need have no sort of relation to a person's religions convictions.

I hope these few lines of mine will commend themselves to you.

JHA, AMARNATH,
Vice-Chanceller, Allahabad University.

* * * * *

I know of no University which makes a direct effort to give its alumni an outlook which is likely to make for intercommunal peace later on in life, or to inculcate in the different communities, comprising its members, feelings of mutual respect, and I greatly doubt whether these things can be taught in the class room. In any well-conducted University or college, however, they should follow naturally from the social life of the institution, for students of different communities cannot mix in the playing fields and common rooms, or in the co-operative, debating, literary, scientific and other societies, or for common social service, without acquiring, consciously or unconsciously, something of these feelings and outlook. In my opinion it is in these spheres almost alone that any attemps of the kind can be made, if it is found to be necessary, and even there it should be as unobstrusive as possible :--- much will depend on the tact of the member of the staff who supervises these activities.

As regards the second part of the first question asked, I think the answer is to be found in the facts (*a*) that some people never profit by all that a University has to offer, and (*b*) that others forget only too easily the lessons they learned, directly or indirectly, at their University.

My answer to the second question would be that the snbject cannot be treated as " an educational problem properly so-called " i. e. as something which can be dealt with definitely and directly. It is a more a matter of sympathy and influence and guidance on the part of the University staff.

FAKHRUDDIN, HONOURABLE SIR MUHAMMAD,
Minister of Education,
Patna.

* * * * *

(1) To my mind the greatest need of the present day is the abolition of sectarian and communal organizations, particularly within the precincts of the University. Nothing can be more opposed to the true University spirit than the existence of Hostels and Colleges intended for particular communities.

European culture to enable boys to know and understand the good points of each, so that by the blending of these three cultures there may evolve a common culture for the whole of India. Each should try to admit as many boys of the other community as possible. I think that Indians must shake hands with Europeen culture as well.

(4) Clubs and outdoor games must be made compulsory feature of University life and marks should be given at the time of final examination for the extent of activity which each boy has shown in these matters. A weekly record of each boy's record of work in the above directions may be kept for the purpose of reference at the end of the year. Care should be taken that Hindu and Muslim boys should be intermingled in the activities of University social institutions of the above character in such a manner as to bring about the desired result. Even a professor's salary for the above purpose will be worth the money spent on the same.

(5) The most deplorable feature of Indian Universities is that they help very little in the formation of character. Attempts should be made to grow up certain traditions and etiquettes of social life within the University precincts. For example, from the daily topics of conversation, of self-conceit and priggishness should be eschewed out altogether. To probe into the religions beliefs of others should be treated as against the etiquettes of University life. Every student should be made to see what real self-respect means. An unwritten law may thus gradually grow up. Professors may meet often to divise means and methods of attaining these objects. Professors mixing freely with students can do a lot in this direction. I would go so far as to suggest that breach of certain accepted rules of University social life may affect the examination results.

(6) In short, every thing should be done to inspire common ideals, common culture and common goal of humanity. The above are bare hints. Details may me worked out. I would even curtail the courses of pure book reading in order to add those things in the curriculum which lead to the above results. It is through Universities that a ray of hope is falling upon the gloomy condition of the inter communal relations of India. In States, much can be done on the above lines. In British India, Education is a transferred subject and intelligent Indian Ministers may grapple with the problem.

BEG, MIRZA SAMIULLAH,
NAWAB MIRZA YAR JUNG,
Chief-Justice, High Court,
Hyderabad-Dn.

I think there is a great scope for improvement in the University life of students and in their methods of training to bring about that fusions of the different communities inhabiting this vast Peninsula which is absolutely necessary before any real progress can be made towards the attainment of a goal which every true well wisher and son of India has got in his heart. To achieve this result, I would make the following suggestions :---

(1) There should be a prescribed formula worded in a happy and soul inspiring form laying down the sanctity of maintaining unity and concord amongst fhe different communities of India. This is to be repeated by every professor and every student and if necessary to be sung in chorus as a first thing before a class begins. This should not take more than three or four minutes. It will tend to create impressions which may be indelible from their hearts for the rest of their life and may awaken them every day to their solemn duties as citizens of the country to which they have the honour to belong. I took this idea from a conversation that I had with a Japanese who told me that when they wanted to prepare their nation for war with America, the first thing that a teacher did before the class began, was to put a questions of the following character to the class.

"Why are you being educated and trained? The class was expected to reply,

"To fight with America."

The object was to bring up a generation with a certain determination in a particular matter.

(2) We should be very careful of the selection of history that we are teaching. It should not be dinned into the ears of our boys that Muslims wht made this country their homes, simply butchered Hindus, and maltreated them during the days of their rule, however euphemistic may be the phrases with which this idea is attempted to be clothed. It is a question of our life or death as Indians. Every caution that we exercise to save our national life is justified. Every history prescribed in the course must pass through the University censure from the above point of view.

(3) Two denominational Universities in India, one at Aligarh and the other at Benares, are quite sufficient to attract the resources of those who would not otherwise subscribe to the cause of General Education. There should be no more denominational Universities. Each of these two should create special chairs for Islamic, Hindu and

circular. For this, we shall wait till further opinions are collected opinions comprehending all the leading schools of thought in the country. In the meantime, we may draw the attention of the reader to the views of Mahatma Gandhi who says :---" Unity is not to be reached by any amount of writing, but it will be reached by a silent transformation of our hearts which would only come when we are truly desirous of achieving unity." If even so, the question remains. Can the Universities effect " silent transformation of our hearts," and by what methods ? The subject will be referred back to the Mahatmaji for his further consideration, as few have such vast and variegated experience of Indian life as he has to approach the problem in the right spirit and and contribute to its solution.

S. A. L.

OPINIONS

In my opinion the Existing University system in India does nothing to allay communal strife. Perhaps it fosters it. The books on Indian history which are adopted as text books or read by the students often contain a prejudiced view on Indian history, coloured by communal bias. The communal fights that take place in the senates and syndicates or governing bodies of the Indian Universities extend communal bitterness among all who come under University influences. I understand that in Bombay and Madras the situation is not so bad as in Northern India. In Northern India it is distressingly bad. The remedy noes not lie in one direction only. The spirit of communalism has to be banished from our public and private life. But that question touches the whole of the Indian problem, and is outside the purview of your enquiry.

ALI, MR. ABDULLAH YUSUF, I. C. S.
(Retired).

* * * * *

be explained that among those who countenance the inter-communal dissensions are to be found in the fore-front some of those who have received the very highest University education.?

(2) Could the Indian Universities convert subject under reference, in some way or the other, into an educational problem properly so called? If so, how?

As you are one of the leaders of thought and public opinion, may I earnestly hope and trust that you will give to this problm your best consideration, having regard to the imperative necessity there is of effacing the taint of disunion that has solong been allowed to disfigure the public life of the country? As it is intended to publish your views on this subject in our next number, may I request you to favour me with your views, as early as possible?

I may inform you that this circular is being sent round to all the leading publicist in India, belonging to every school of thought. If the opinions collected and published in the magazine are considered to be helpful in the framing of a scheme capable of being rightfully incorporated into our educational system, the collection will be issued in the form of a brochure to those engaged in University education in the different provinces in India, with a view to stimulating further thought over the problem."

"SAYYID ABDUL LATIF."

Of those whose opinions were invited on the above circular, a large majority have not given any reply. Dr. Rabindrnnath Tagore has been in indifferent health for sometime. He has therefore not been able to send us any message for the time being. So also several other friends. We hope that they will soon be in a position to send us their views before the publication of our next uumber which will further carry on the discussion of this interesting problem.

The opinions of the educationists who have responded very kindly to our invitation are set forth below in the alphabetical order of their names. To every one of them the Advisory Board of the Osmania Magazine accords very greatful thanks for the careful thought they have given to this problem. It is yet too early to analyse their views, and examine them from the stand-point indicated in the original

INTER-COMMUNAL HARMONY

AND

INDIAN UNIVERSITIES

As far back as the 17th August 1928, the following circular was addressed to about a hundred leading publicists interested in Indian education :—

"The 'Osmania Magazine' which is the journal of the students of the Osmania University College, Hyderabad, Deccan, is a quarterly Magazine comprising of two sections, one English, the other Urdu. It is essentially devoted to Arts and Letters. But one of its objects is to publish, every now and then, the opinions of the leading Indian and other publicists on some special problem of education. The advisory Board of the Magazine, therefore, have asked me to approach you for an expression of your views on the subject of "the part that Indian Universities can legitimately take in promoting the spirit of union among the different, especially the major, sections of the people inhabiting this country".

It is not necessary for me to urge that whatever opinion you may be pleased to express will undoubtedly be cognizant of the limitations under which the University teachers will, under any scheme that you may propose, have to apply themselves to the solution of the problem in question with its obvious and unmistakable political value. What I expect from you is not a mere earnest wish that the teachers should in their extra-mural or social relations with their students enjoin upon them the need for unity. On the other hand, I should like to know what is possible for the teacher in the class room itself to promote the object in view by methods which are essentially educational in character. In other words the problem resolves into

(1) Does the existing University system, directly or indirectly, try to equip the minds of those who undergo University training with an outlook such as may, in their different spheres of life, animate them to minimise the chances of inter-communal strife, and promote the sense of mutual respect and love among the different sections of the people of India ? If the answer be in the affirmative, how then is it to

PIVOT OF HUMANITY*

Your heart is as pure as your form is fine
As though the image of God were reflected in you;
Love and Truth are clear in this face of yours,
True index of your mind---

No spirit like you was ever wrought,
God-like custodian of chastity;
Robust in courage and wonderful in thought,
You are the Pivot of Humanity.

HAMIDUZ-ZAFAR,
IV year.

THE REAL POEMS

Surely all this world is a fair garden,
With poems springing up as plentiful
As leaves in summer, or stars in winter time.
For when I overhear poor people's tales,
Or children chatting, or schoolboys' eager shouts,
It seems to me they who forget themselves
Talk poetry.

But if I told them so
They would but laugh; for poetry, they think,
Is a great mystery.

And so it is,

And good it is that all the world is full
Of this mysterious beauty life creates
Unknowingly, as flowers that bloom and pass
Beyond their prime ungathered; good it is
That common things should be this mystery.

E. E. SPEIGHT.

* (These lines are rythmical free verse, with one rhyme (wrought ..... thought) and one assonance (fine .... mind).

(Editor.)

cannot be observed in very heavy elements and the M-line can only be observed in very heavy elements. But this is fully accounted for by the difficulties of observation.

We should there be a series corresponding to an orbit and not a line ? This fact is explained in the following way. If the particles were to drop from one orbit into the other, the radiation would have only one line in the spectrum. But it does not happen: the particles are dropping from many orbits into it. The particles dropping from the third orbit into the second give the line C, particles dropping from the fourth orbit into the second give the line F, while those dropping from the fifth to second orbit produces the line G. If the gas is taken from in a rarefied condition and under low temperature it gives more lines, because the electrons are found in outer orbits.

This is a short, concised and elementary outline of the facts ascertained about the structure of matter. A few facts about the complicated system of the interior of an atom---far more complicated than the Solar system---are glanced at. Optical spectra have revealed facts about the outer electrons, and X-rays about the inner ring of electrons. About the nucleus itself we know very little except what can be learnt from radio-activity.

MUHAMMAD SIDDIQ,
B. A. Senior Class,
O. U. C.

THE REVOLVING ELECTRONS.

Having peeped into the interior of the nucleus, let us now survey the arrangement of the outer-revolving electrons. The study of spectral analysis and X-rays has contributed greatly to determine the arrangement of these electrons.

Bohr asserts that an electron is capable of movement in more than one orbit. When an electron is knocked out from any orbit, it jumps into another. It gathers in this process a great deal of energy, the momentum. Thus the energy it has is greater than what is really necessary to revolve it in the orbit it has reached. The surplus energy is radiated out in the shape of waves. And the wave number depends both on the orbit it dropped from and the orbit it dropped into.

By the consideration of the quantum theory, Bohr discovered that calling the unit of angular momentum as one lot, the moments of momentum characteristic of successive orbits have to be one lot, 2 lots 3 lots and so on as the orbits increase in radius. Calculating in accordance with dymical principles, we know that the radii must proceed to the square of the natural numbers. They are called Bohr's orbits and seems to be the only possible and permanent ones.

The spectrum of Hydrogen, as is well known, has lines in the red, green and indigo parts of it. These lines were called by Frans haufer C. F and G. These lines represent the series belonging to the second orbit. They were first discovered owing to their occurrence in the visible part of the spectrum. The series belonging to the first orbit was predicted as far up in the ultra-violet. It was, afterwards, discovered by Lyman and is known as Lyman's Series. Paschen hadiscovered a series in Infra-red and this series is associated with the third orbit.

X-rays do not differ from the waves of light in any other respect but their frequency. X-rays have very small wave length and therefore their frequency and the wave number are very great. It is because the frequency increases fast as we go up the periodic table that the inner rings of the later elements give lines in the X-rays spectrum instead of the optical spectrum. The characteristic X-rays emitted by an element, when analysed and observed by means of suitable crystals, are found to consist of only a few sharp lines, giving a very simple spectrum, which varies in a perfectly regular manner with the atomic number. There are three lines K. L and M lines as they are called, which make up the X-ray spectra. Owing to the difficulties of observation, none can be observed in very light elements, the K-lines

increased by one. The atomic number being the same, the number of the revolving electrons is the same in both cases, which accounts for the similarity in the spectral and chemical properties. They differ only in their atomic weights. They are called 'Isotopes'. In ordinary circumstances what we think to be pure elements are often a mixture of these isotopes: which accounts for the fact that some observed atomic weights are not whole number.

HELIUM ION.

It is quite clear by the study of Radio-activity and the the disintegration of Nitrogen atom that matter is composed of electrons, protons and Helium ions. Whether the Helim ion is one of the individual units of which this universe is composed, is a question that now arises. Modern scientists, with all their skilful devices, are still unable to break the Helium ion. It has never been disintegrated; yet we believe that it contains 4 protons and two electrons. The above conclusions were obtained by the fact that one Helium ion weighs 4 and carries 2 positive charges. As one proton weighs one, the weight indicates the presence of 4 protons in a Helium ion. There being always one positive charge on a proton, there should have been 4 positive charges on the ion. Yet the presence of only two charges indicates that two positive charges are counter-balanced by the presence of two electrons.

A Hydrogen atom strictly speaking, does not weigh one. Taking the atomic weight of Oxygen as 16 units, the most sensitive experiments give us the value of the atomic weight of Hydrogen as 1.007. As we saw that Hydrogen ion contains four Hydrogen nuclei, it should weigh 4.028. But the Helium ion weighs only four. Has matter disappeard altogether and gone out of existence? It cannot be true: matter is indestructible. This curious fact is explained only by the theory of Relativity. It says that matter and energy are interchangeable. When 4 protons and 2 electrons are compressed into a very small space they lose some of their mass and energy. In order to separate them again the same amount of energy is required. It is calculated that the energy required is equal to the multiple of the loss of mass and the square of the velocity of light. Rutherford says that this energy is about 100 million times greater than the energy exchanged in any chemical combination. It is impossible to gather such a great deal of energy, and so it is not possible to split the Helium ion. Yet we can safely infer that it is composed of 4 protons and 2 electrons.

31 atomic weight has in its nucleus 15 active and 16 inert protons. The number of active protons or the revolving electrons, is equal to the atomic number. The protonic number is the number which gives the position of the element, in the periodic system, when due regard is taken of chemical relationship in deciding the number of each element. Oxygen has the atomic number 8, sodium 11, chlorine 17 and so on. Therefore the numbers of revolving electrons in Oxygen, sodium and chlorine are respectively 8, 11 and 17 and so on. If we inquire into the constitution of Radium we find 88 revolving electrons round a nucleus of 88 electrons and 166 protons.

RADIO-ACTIVITY.

Radio-activity has given us an insight into the interior of an atom. For a great deal of what we have learned above, we are indebted to the study of radio-activity.

As stated above, heavier elements have many positively and negatively charged particles, compressed within a very small space- the nucleus. These charges struggle against each other and try to break away. Owing to the want of space, the energy is tremendous: It is why, when a *B* particl is liberated, it travels with almost the velocity of light.

When the electrons or the protons are liberated, they give birth to the phenomenon called X or *B* rays. *B* rays consist of *B* particles- the electrons. The A rays are composed of Helium ions. A helium ion consists of four protons and two electrons. Owing to the excess of protons, there is a positive charge on the *A* particle. It tears away two electrons from the atoms of the medium it travels through and is charged into a Helium atom. By taking away the electrons from the medium, it charges it positively.

Whenever an atom sends out an *A* particle, the electrical equilibrium is disturbed. It loses two units of positive electricity and its atomic number is decreased by two. As it has lost four protons, the atomic weight is decreased by four. For example, Radium (atomic No. 88) is changed into Niton (atomic No. 86) by the radiation of *A* rays. The atomic weight of Radium is changed from 226 to 222.

Now the *B* particle is an electron. When a *B* particle is set free it increases unit positive charge of the nucleus; thereby increases one atomic number. The electron has no weight, so if an electron is torn away from the nucleus, it makes no difference in the weight of the atom. The atomic weight is constant, though the atomic number is

What is the constitution of a nucleus ? Its central feature, i. e. the unit of which it is built up, is the proton. A Hydrogen atom being the simplest, has only one porton in its nucleus. All other elements have their nuclei composed of a definite number of electrons and protons. The protons are always in excess as there is always a, positive charge round this nucleus. The total number of protons in the nucleus gives us the atomic weight, and the atomic weight is the number of the unbalanced positive particles in the nucleus.

REVOLVING ELECTRONS.

In order to couterbalance the positive charge of the nucleus it is surrounded by a group of electrons. Some scientists say that the surrounding electrons are stationary, crystallised into position under the action of some at present unknown forces. This view was presentted by Professors Langly and Lewis in America. The most popular hypothesis is that they are subject to the laws of dynamics. There is something like the general pattern of the solar system. The nucleus of the sun constituted of the electrons and protons. It has electrical orce of attraction. The electrons are the planets revolving round this, attracting centre in regular orbits. Bohr has elaborated this theory with great skill.

CHEMICAL AND SPECTRAL PROPERTIES

The chemical and spectral properties of an element depends on the planetary electrons. The chemical and spectral changes are produced owing to the disturbances in the revolving electrons. The electrons and protons packetted in the nucleus have nothing to do with these changes. They contribute to the weight of an atom, but have no effect on its chemical properties or its specific radiation. The compact, electrically composed and highly charged mass controls the movements of the planetary electrons.

ATOMIC NUMBER AND REVOLVING ELECTRONS.

We know that an atom of Hydrogen contains one proton and weighs one. It is known to us that all atomic weights are whole numbers. Therefore we can say that an atom of 16 atomic weight contains 16 protons. An atom of 35 atomic weight has 35 protons. The atomic weight is numerically equal to the number of protons in an atom. But all these are not active : only half of them exhibit electric forces and hold the same number of electrons in orbital movement. The other half of them annul the charge of electrons contained in the nucleus. The atomic weight of Oxygen being 16, there are 16 protons and 8 electrons at nucleus and 8 electrons revolve round them. An element of

Thus we have come to know that all atoms are divisible into electrons and protons. This wide universe is nothing but an aggregate of these tiny insignificant particles. Whether they are the ultimate unit, or whether they can be resolved into a closely packed assemblage of simpler constituents remains for further discovery. As they seem to move about freely, without friction of any kind, they are supposed to be foreign bodies in aether, but a specifically organised portion of it.

The protons are exceedingly small: they are in bulk a million times smaller than an atom of Hydrogen. We assume that protons and electrons are all alike. We think of them as little spheres, as there is no evidence against it.

An electron is 1835 times lighter or less massive than a proton The diameter of an electron is measured to be 37.5 times the hundred-millionth of a centimetre. An atom of Hydrogen weighs a hundred million-million times less than the lightest visible speck. A proton weighs about the same as one atom or Hydrogen. To be precise, the weight of a proton is 1.66 times the weight of a milligram divided by one followed by 21 zeros.

ATOMIC STRUCTURE.

The absorption of cathode rays and its dependence on the velocity, suggested to Denard that matter has a perforated structure, and that only a vanishingly small part of the space occupied is impenetrable by rapid cathode rays, whereas the remaining space allows them to pass freely. Ten years after, Rutherford achieves the same results as he was experimenting on cathode rays. If A rays are passed through any gas it is observed that sometimes they all of a sudden change their course. It seems as if something prevents them from preceding in their original directions. As A rays consist of positively charged Helium ions it is inferred that this obstacle is intense positive charge. Rutherford and his collaborators Geiger and Marden have investigated the distributions of these abnormal deflections among various media, using rays of various velocities.

NUCLEUS.

Rutherford came to the conclusion that an intense electric field starts from a very small element of space, the nucleus; and the deflection of positively charged particles owes its cause to the existence of this electric field. He observed that these deflections increase as the atomic weight increases.

atom. There were a few cases which could not be explained; for example, Chlorine has an atomic weight of 35.5, silicon of 28.3 and Magnesium 24.3. How are these discrepancies to be accounted for? W. Crook, in 1886, suggested that these elements may be a mixture of different things having the same chemical and spectral properties, and differing only so far as the atomic weight is concerned. We come to the same conclusion by the study of Radio-activity. It is observed that Radium and Thorium in the course of time are changed into Lead. So far as the chemical or spectral properties are concerned, these two different types of Lead are indistinguishable; yet their atomic weights are different. Thorium-Lead has an atomic weight of 207.2; Radium-Lead has 206.0, whereas ordinary Lead has only 207.2. These different types of Lead are called 'Isotopes'. The ordinary Lead is a mixture of these isotopes. Similiarly we may regard many elements like Chlorine, Magnesium and Silicon as mixtures of many Isotopes. Thus there is no objection to admit that atomic weights are whole numbers; and we can infer from this that all these elements are built up of some fundamental units.

ATOMICITY OF ELECTRICITY.

A necessary consequence of the theory of the atomicity of matter is the atomicity of electricity. Helmholtz said in 1881, "If we assume atoms of chemical elements, we can not escape from drawing the further inference that electricity too, positive as well as negative, is divided into definite elementary quanta that behave like atoms of electricity."

Faraday's Law of Electrolysis states, "one and the same quantity of electricity in discharging through various electrolytes always sets free chemically equivalent quantities of the dis-sociated products" The quantities of Hydrogen, Chlorine, Silver when liberated by means of the same quantity of electricity are in the ratio of 135.5 and 107.9 This fact is explained by the supposition of the atomicity of matter.. One gram of Hydrogen contains many atoms of Hydrogen as 35.5 grams of chlorine contain atoms of chlorine, or 107.9 grams of Silver contain those of Silver. The quantity of electricity utilised is the same, E in each case. Therefore E should consist of as many elementary charges, E, as there are atoms in one gram of Hydrogen.

These elementary charges of positive, as well as negative electricity, are associated with the parts of an atom: the positive charge associated with the part of an atom is called proton, whereas the negative charge is on the other part of the atom called electron.

RADIO--ACTITITY.

Becquerel has startled the world with the introduction of Radio-activity. A piece of uranium along with a very sensitive photographic plate was left in a dark chamber. In spite of utter darkness uranium was photographed. Further experiments showed that uranium is the source of radiation, radiating *A* Bandy-rays. These rays are very strong and have great penetrating power. *A* Rays are composed of *A* particles which have positive electric charges and have as much mass as an atom. Their velocity is 25×10^{7} cm. per second. *B*. particles are elementary negative charges. They move very swiftly owing to their very little mass. Their speed in 3.85×10^{10} cm. per second, whereas theoretically, the highest possible speed is 3.99×10^{10} cm. per second which is the speed of light. Searching for the source of energy which drives forth *A* and *B* particles with such a great velocity, we come across a very astonishing fact. It is discovered that this energy is supplied by the transmutation of the elements. Atoms are disintegrated, and the elements are changed from one to another. How strange! The dream of the Alchemists was not totally untrue. Transmutation ef elements is an every day happening in nature.

The possibility of atomic disintegration is not limited to radio-active and heavy elements. Sir Ernest Rutherford, by passing *B*-projectiles through Nitrogen gas has succeeded in indisintegrating the atoms of Nitrogen. After colliding with these rapidly moving particles the Nitrogen atom was broken into Hydrogen and Helium. These facts indicate that the atom is not the ultimate unit.

ATOMIC WEIGHT.

We are further urged to look beyond the atom for the basis of this universe by a regularity in the arrangement of atomic weights of various elements.

It was in 1813, ten years after Dalton had put forward his atomic theory that Prout observed that the fact that the atomic weights of all elements were very nearly whole numbers could not be the result of mere chance. Accordingly he made the suggestion that the outstanding discrepancies should be otherwise accounted for. He surmised that they were really whole numbers, and not fractions, so that all the elements were multiples or aggregates of the Hydrogen

THE ELECTRONIC THEORY OF MATTER.

INTRODUCTION.

THE modern electronic theory of matter is the scientific development of the ancient conception that matter is built up of atoms or indivisible particles. This view of the material structure had first occurred to the Greek philosophers; yet no scientific proof of it was given till the days of Dalton. It was Dalton who having throughly studied the behavior of compounds under chemical reactions, was successful in establishing the theory of the atomicity of matter. He discovered many elements, and other scientists working after him found out that there are 92 elements of which this whole universe composed.

PERIODIC SYSTEM.

A kind of regularity and order in these seemingly different elements was discovered by Luther Meyer and Mendeleeff. They wrote down the elements in the order of their increasing atomic weight. Chemically related elements were written in the same vertical column, e. g., the alkalies Li, Na, K, etc. in the first column; the hologens in the seventh and so on. Since 1895 the inert gases had been added in the eighth column.

In general the number of the column is the same as the valency of the elements of that column. The valency increases as we pass on from left to right. The electrio-positive character of the element becomes stronger with the increase of valency. Column eighth contains inert gases whose valency is zero. An element resembles in its properties, not those that come next to it in the series of atomic weight, but certain other elements which come at periodic intervals in the series. It was suggested by Luther Meyer and W. D. Harkins that we should imagine this table as written on a cylinder, not on a plane,

This strange phenomenon shows that an atom is not the ultimate unit of material structure. The atoms of the various elements are not different by nature but, in virtue of the uniform connection that exists between them, they must be similarly constituted and built up of indentical units.

So these lovely paintings of Mr. Chughtai are more than a mere events—they are full of promise, part of the Dawn-light of the Mohammedan Reformation which Mr. Bernard Shaw has predicted, of which also our *Islamic Culture* is a symptom. But they are more even than that, for they are new forms of beauty to which men and women will turn again and again, even such as are familiar with the best art of East and West. This is so because the man who drew these pictures is endowed with genius that is very rare. There are men in Europe well-known as illustrators who are not in the same world as this artist; there have been many in the last five hundred years who were greater than he. It is in Persian art of three centuries ago, and in Chinese and Japanese art that we find the nearest powers to his. He has been fascinated by mediaeval Italian art, that is clear from his pencil drawings; but his strength has its roots in the noble work of the Chinese masters of five and six centuries ago. For it was Chinese ideals which, by mingling with Persian aspiration, brought about that wonderlul harvest of painting which appeared simultaneouly with the dramas of Shakespeare, and are associated with the nama of Shah Abbas I.

The criticism has been made that sometimes these pictures do not exactly illustrate the verses of Ghalib with which they are connected. But pictures such as these are not mere pendents; they will be remembered independently of the poetry; and they will be seen by many to whom the poetry remains unknown. Great art is not illustrative: it is a revelation of how the pageant of this world moves the human soul to joyous expression. And in these pictures we have such sympathetic treatment of human moods and qualities, the innocense of children, the proud reserve of maidenwood, the ansterity of manhood,—set in exquisite arrangement of line and colour. It is to be hoped that the publishers of the book, the Jahangir Book Club of Lahore, will make it possible for the public to purchase single copies of these illustrations, as the book is too dear for any but libraries and rich individuals to buy. The price is a hundred and ten rupees.

E. E. SPEIGHT.
Professor of English Literature.
O. U. C.

MURAQQA-I-CHUGHTAI

Mr. RAHMAN CHUGHTAI'S ILLUSTRATIONS TO GHALIB.

A very heautiful book has just been bought by our College Library,---such a book as may have been eagerly looking for from the world of Islamic culture. Books of this kind, but not always of this quality, are appearing every year in England, sumptuous volumes to serve at Christmas presents, and the matter they contain is generally romantic fiction. The favourite artists are Mr. Arthur Rackham and Mr. Edmund Dulac, who kindly entertained me in London and showed me many of his original pictures, including an exquisite series illustrating Stevenson's *Treasure Island.* Mr. Rahman Chughtai's brother told me the other day that Mr. Dulac is the only European Artist influenced by old Persian style, but I think he had overlooked the French lady Marie Laurencin. However that may be, we have in Mr. Chughtai's work a different thing from alien influence : he is painting in the direct tradition of his people, and it is always a delight to see that a noble tradition is still alive. In this case the artist has defied a very strong counter tradition. The fear of introducing the human form into a picture has no religious basis at all : it is a relic of a very ancient superstition, connected with Evil emanations acting upon living persons in a detrimental manner. The injunction to avoid every appearance of idolatry was, I am sure, never intended to prevent people from sharing delight in one of the most beautiful of the creations of God, the human form, and especially the human face, the index of thoughts and emotions and resolves which are so often Divine inspiration.

It is a very happy thing that the sensitive spirit of Mr. Chughtai has yet been bold enough to break through this fence of tradition. Every age, it has been said, needs new freedoms and new restraints. Moreover there is nothing in the world which can so surely gain understanding and sympathy for a people as the expression of its ideals in forms of art. Religion too often sunders humanity ; music and poetry, painting and sculpture, draw nations together.

DEATH.

Whose love is it that leads me out to-night, athirst for far away things?
Whose feet does my soul kiss and yearn to touch the skirt of distance dim?

O Great-Beyond!
What symphony, the keen call of thy magic flute!
O beautiful, celestial, radiant vision of Great-Beyond!
How sad and wearisome am I and oft forget that I have no wings
To fly to thee, just once.
Alas! I am bound firm to this dark, lowly, lonesome spot for evermore.

I am as eager and as wakeful as a stranger in a strange land.
Thy warm breath creeps to me awhispering impossible love-hopes,
O Far-to-seek!
What zest of life! the keen call of thy magic flute
(O beautiful, celestial, radiant vision of Great-Beyond!)
In tunes sweet-strange sings soft to me; and do I understand
Thy subtle ways, for once?
And lo! I feel I am not bound to this dark, lowly, lonesome spot for evermore.

LIFE.

Lo! Nature shuts her hands behind
Her back, and laughingly doth ask of me,
"What have I got inside?"
And thrice echoes aloud the wind
Her question far and wide:
A challenge free!
And nothing seems impossible.

My sorrow's sweet to me this night of Spring.
Who cares to smile away heart-ache in songs that sing
The magic grandeur, love and beauty of death-pain,
And live again?

Across the pale moon-beams
Sweet smells from woodland breath in me Life's subtle sense,
Words reach my ears in whispers but I know not whence,
Methinks I am awake in poetic dreams
That nothing seems impossible!

NASEER-UD-DIN KHAN.

remarkable rhythm created in this way is most successfully reproduced, albeit the composition is by no means an easy one to perform on the piano.

The labouring of a ship in heavy seas provided a theme for the fertile imagination of Rimsky-Korsakoff the noted Russian composer it his Scheherade suite. The orchestra accompanies Sinbad the Sailor on one of his perilous voyages, and the howling of the tempest as indicated by the wood-wind is tremendous. At length when the doomed vessel is at last sent to its destruction amidst a crashing of drums and cymbals, every musician, from the first violin player to the triangle player, is bathed in perspiration, whilst the conducter shares the fate of the vessel, he is an utter wreck!

It is not often the orchestra is called upon the produce laughter but this is the case in the third act of Gounods Faust. Mephistopheles proffers Marguerite an ironical serenade interspersed with laughter which is echoed by the orchestra in true Mephistophelian fashion.

An amusing instance of musical illustrations occurs in the first act of Puccini's opera 'La Boheme'; where three of the characters grope their way downstairs from a garrat studio. They stumble and swear in the darkness, but eventually reach the street unhurt. The hazardous descent of each flight is cleverly suggested by the orchestra, one tast profound note signalizing their safe arrival.

These are but a few instances in which eminent composers have contrived to make the orchestra laugh, weep, neigh, gallop ' and even imitate cats and dogs. But it remained for Mendelssohn to make his orchestra bray like an ass. This he does in his incidental music to Shakespeare' s Midsummer Nights Dream. The phrase Bully Bottom whose head is changed by the sportive Puck into that of a donkey.

Flickering tongues of flame inspired the Feur-Zauber music of the walkure, and whilst this is less evident in the pianoforte score, judicious orchestration has enabled Wagner to give a very realistic version of his subject.

All of these musical impressions are very cleverly written, and there is no valid reason why dramatic materials of every description should not be interpreted musically.

The art of music possesses a living breathing soul which readily adapts itself to every changing condition.

LELAND J. BERRY,
Bermingham.

REALISM AND HUMOUR IN MUSIC.

THE bare mention of cats being represented in musical sounds is at once interesting and amusing, and perhaps to a few of us at first sight ..... ridiculous. But the celberated Scarlatti once wrote a "Cats Fugue" in which the feline association lay in the fact that the 'subject' had been suggested by a cat walking on the keys of an harpsichord, a proceeding of which cats are rather fond, which in the modern Jazz music has its reflection in a pianoforte composition entitled "Kitten on the Keys".

Stravinsky also found inspiration (?) in the pathetic 'meow' of pussy, but even he has failed to evolve anything representative of our friend the dog, unlike Chopin, of whom it is said, one of his best known valses was suggested by the gyrations of a puppy in pursuit of its tail! and Rossini, whom we are told, composed a piece of music in memory of a dead poodle.

Camille Saint-Saens composed for the orchestra a "Danse Macabre" in which he attempts to portray a skeleton dancing on a toombstone. Xylophones are used to indicate the rattle of the bones against the marble slab covering the grave. The skeleton can only stay out until daybreak, and immediately the first cock crows at dawn back he goes into his tomb with the stone clapped over him in a jiffy, all of which is most graphically illustrated by the instruments of the orchestra

The theme of horses in motion seems to have appealed to a large number of composers. A splendid instance of its use lies in that portion of Wagners Walkure known as the Ride of the Valkyries. In his treatment of this composition the composer has reproduced with marvellous fidelity the neighing of horses, sounds of galloping hoop beats, and the impetuous progress of a company of riders.

Another famous man to adopt this theme was Tschaikowsky who set himself the difficult task of writing a composition for the piano with the 'troika' as its motif. Now the 'troika' is a Russian vehicle to which three horses are harnessd in a single span. The middle horse in the shafts trots, whilst the other two, hitched to either side, gallop. The

Napoleons' military glories have woven a divine halo around his 'Victorious brow.' His figure has loomed large before our minds for over a century.

It is neccssary that a proper place be given to him in history. He belongs to the long line of 'the men of destiny' who appear on the stage of the world, and seem to perform heroic deeds. They are borne away on the wave of circumstances, and the background of tumltuous events lends an unearthly colour to their prodigious feats of heroism.

Shaw has written one act play "The Man of Destiny'. It was written for Richard Mansfield but refused by him. The part of the heroine was played by the artistic Ellen Terry. The time of the action is the close of the eighteenth century, heralding the French Revolution. Napaleon is introduced to us as a lad willingly letting himself to be conducted by destiny into the great events of that period.

His description of Nelson as a national hero is very amusing. He says, "Nelson intensely nervous and theatrical made an enormous fuss about victories so cheap that he would have deserved shooting if he had lost them" and concludes by saying, "Believe me you cannot be a hero without being a coward!" He frankly says "If you miss in my writings that hero-worship of dotards and duffers which is planting England with statues of disasterous statesmen and absurd generals, the explanation is simply I am an Irishman and you an Englishman."

It is evident from this brief essay that Shaw is out to break the age-worn idols of belief and worship. The iconoclasts have always been the victims of misrepresentation and ridicule. Shaw is no exception.

ITRAT HUSAYN,
B. A. Senior Class,
O. U. C.

doubt there is a vien of satire running through the above statements of Shaw, but it is not satire alone. Sympathy and sincerity have moved him to utter these words. His rousing words are caustic in proportion to our apathy. When he is ridiculing the greatness of the English nation he is also holding up the mirror to them for self-scrutiny.

"You can not carry out moral sanitation" he says "any more than physical sanitation, without in descent exposures. If a man holds up a mirror to your nature and shows you that it needs washing---not whitewashing---it is no use breaking the mirror. Go for soap and water."

We should not forget that he has not paraded his revolutionary ideas before the public after acheiving fame but they have clinged to him like clothes all his life. Before he had achieved any great measure of success as dramatist, A. B. Walkley wrote about him in "The Fortnightly" as, "one of the most courageous, most lucid, most remorselessly logical thinker of the day, and the invasion of the theatre by such a man is an event bound to leak its mark." It has proved so.

It is true he sometimes exaggerates the evils of society and the importance of his own Utopian schemes, but only to make us think over the every day problems of life. He carries you from the sphere of reality into a region of idealism but you do not feel you are being carried away, for by the force of his logical thinking, he keeps you linked to reality. He wants to reform the world not by the miraculous touch of a magic-wand but through a logic of events which is convincing. He takes up a trend of thought and carries you through a series of events which would justify the possibility of the realization of the idea. His critics have called him a cynic, for they see the way in which he says a thing rather than the thing itself.

Shaws' altitude towords hero-worship has given rise to a storm of opinion against him. Men are always building gods out of ordinary day to worship; but Shaw advises us to distinguish between the real man and the mythical figure that nation makes of him. He has attacked Shakespeare, Napoleon, Nelson, Cleopatra Caesar and Catherine the great. He has given the public his own protraits of these heroes. In attacking Shakespeare, he is only attacking the ultra--Shakespearians. Genius is divine. But Shakespeare the great poet, will be nearer to human experience than Shakespeare the God. He says that when he began to write dramatic criticism in the last decade of the nineteenth century, Shakespeare was a divinity and now he has become a fellow creature, and remarks, "In a deaf nation these plays would have died long ago."

among the imperialistic nations. "It may be" he says, "that if our (Ireland's) resources included the armed force and virtually unlimited money which push the political and military figure-heads of England through bungled enterprises to a muddled success, and creat an illusion of some miraculous and divine innate English equality that enables a general to become a conquerer with abilities that would not suffice to save a cabman from having his license marked, and a member of parliament to become Prime Minister with the outlook on life of a sporting country-solicitor educated by a private governess, I have no doubt we should lapse into gross intellectual sottishness and prefer leaders who encouraged our vulgarities by sharing them, and flattered us by associating them with purchased successes, to our betters." He has not only pleaded for Irish Home rule, but has declared in no ambiguous terms that if British Empire is to be saved from disintegration, India and Egypt should be included in the British Common Wealth of free nations. "The Englishman in India, for example, stands a very statue of justice between two natives. He says "I am impartial in your religious disputes, because I believe in neither of your religions. I am impartial in your conflicts of custom and sentiment, because your customs and sentiments are different from and abysmally inferior to my own. Finally I am impartial as to your interest, because they are both equally opposed to mine, which is to keep you both equally powerless against me in order that I may extract money from you to pay salaries, and pensions myself and fellow Englishmen as judges and rulers over you. In return for which you get the inestimable benefit of a government that does absolute justice as between Indian and Indian, being wholly pre-occupied with the maintainance of absolute injustice as between India and England. It will be observed that no English man without making himself ridiculous, could pretend to be perfectly just in English affairs, or would tolerate a proposal to establish the Indian or Irish system in Great Britain."

It is not the economic exploitation alone which plays havoc with national life, the political subjection also suppresses human spirit from bursting forth into song and manifesting itself in literature and art. "But it is not the spoils that matter," he truly says, "it is the waste, the sterilization, the perversion of fruitful brain power into a flatulent protest against unnecessary evil, the use of our entrails to tie our own hands and seal our own lips in the name of honour and patriotism."

It is the transparent honesty of Shaw which clears him of the charge of malicious cynicism some cranky critics attribute to him. No

live, behave, and think is a way suited to prepare them for active service is a blot on our civilization. It also forms a constant waste of humane energy which otherwise would have been drifted into useful channels.

Speaking to his American biographer on the effects of the Great War, Shaw said, "Well, the war shook down the Tsardom, an unspeakable abomination, and made an end of the new German Empire and the old apostalic Austrian one. It settled the Irish question, it gave votes and seats in Parliament to women, and it gave prohibition its dead lift over final obstacles in your country. It is conceivable that another war, if frightful enough, might even, reform our spelling. But if society can be reformed only by accidental rssults of horrible catastrophes---if these results are the precise opposite of what was intended by those who brought about the catastrophe---what hope is there for mankind in them? Then war was a horror and everybody is the worse for it except those who were so narrowly selfish that even a war improved them.',

Are these words the freaks of a cynic who sees society topsyturvey ? There is a passion for reform grounded in deep thought that appeals to us.

If his words are pungent, they are intended to make us think, as modern life has become mechanical; and an average man takes things as they are, without thinking for himself. This stagnation of of intellectual powers suppresses the growth of individuality. It is why Shaw lays such a great stress on our thinking capacity.

When the London audience roars with laughter at his caustic humour, brilliant aphorisms and startling turns of wit, unconsciously their ideas are being transformed; and when the play is over, their orthodox opinions have received a rude shock and they have been forced to view things from a new angle of vision. Shaw has made those subjects controversial that were regarded as settled and sacred.

His preface to John Bulls' other Islands (1907) is an attack on British imperialism. His Irish distrust in of the English nation to govern other nations not inferior to her in culture and scale of civilization, has found an eloquent expression in this play. He does not believe in the strength of the so-called English-character and has ridiculed the importance of the 'lone-man' in the development of the Empire. It is not the English genius but men and money obtained from the subject nations that have helped England to hold her head high

idolatory of sensousness, I would hold it good statesmanship to blow every cathedral in the world to pieces with dynamite, organ and all, without the least heed to the screams of the art critics and cultured voluptuaties,"

This Tolstoyian attitude is not confined to art alone. He subjects society and state to the same kind of criticism but there is a conscious attempt to strike home a certain idea. His views on modern military organization and the debasing influence of war on humanity, which he courageously expressed even in the heated period of the Great War, have given rise to a storm of opinion against him. They show the depth of his thinking power. His views on war interesting to us becouse the Great War has opened the eyes of all nations to the catastrophe and disorder which war brings in its train. The loss of human life, the economic displacement, and staggering taxation which the government has to impose in order to pay national debts, have led every thinking-man to the conclusion that war should no longer be a means of settling the international disputes. The League of nations, the Locarno- Pact and the recent historic Kellog-Pact are events which have attracted the attention of every man.

Shaw has always been an exponent of the renunciation of war and in this respect his views coincide with those of Tolstoy and Gandhi. But he does not recognize the principle of non-violence. To wage war for freedom is a sacred thing to him. He even justifies political assissinations on this ground. Now when the advancement of chemical knowledge, and scientfic skill and rapid means of transportation have made war, a danger to every nation, Shaw's opinions have gained a wide currency in recent time throughout the world.

" For permanent work," he says " the soldier is worse than useless: such efficiency as he has is the result of dehumanization and disablement. His whole training tends to make him a weakling. He has the easiest of lives: he has no freedon and no responsibility. He is politically and socially a child with rations instead of rights, treated like a child, punished like a child, dressed prettily and washed and combed like a child excused for outbreaks of naughtiness like a child, forbidden to marry like a child, and called Tommy like a child."

In his opinion, " soldiering is the completest slavery possible in civilized society." Its demoralising influence on human nature, so keenly felt by Tolstoy and so artistically depicted by him in ' Resurrection ', is one of the strongest arguments against war. To keep a large body of human beings isolated from civil life and to make them

Dickinson says, "what Shaw needed to find was a naked medium for the expression of his ideas, a medium of art which would permit the maximum of theorizing and a minimum of narrative. This he found in drama. With no affection for drama as such, Shaw seized upon it as the means of putting over his ideas.

Having chosen the medium, he now invented a form. He freely allowed his characters to perform laboratory experiments with their ideas and ideals, and turn themselves upside down as they liked, and himself contributed to the discussion in perfaces sometimes as long as the play itself. Thus he writes drama not for the faithful interpretation of life but for reformation of society and propagation of his ideas on this scheme of reformation. This utilization of drama, not for the sake of holding up the mirror to life but as a vehicle of expression of his scheme of reconstruction of human society, has given rise to a new kind of play.

He has no respect for the so-called traditions of the English drama and has written his plays upon a new design. His plays do not belong to the Shakespearian idealistic and Romantic plays or the Restoration play of Manners or the Realistic plays of the 19th century and yet they have something common with all these. From the Romantic school he takes its free imagination which he uses in the construction of his plays. The play of Manners has given him dignity of style, grace of wit and brilliance of humour. He has constructed his characters on the model of the realistic school placing them in their proper setting and thus creating a social atmosphere. But all this is done without any regard for balance and proportion. His only aim is to arrive at the conclusion he has in view and for it he is ready to sacrifice every thing. Carelessness in construction has thus become a matter of principle with him. But there is a method in his madness.

His criticism falls into two classes:

(1) Art, Painting, Literature

(2) Accepted ideas of Religion, Politics and Political Economy.

His art criticism has stimulating effect because he makes us see things from a different angle of vision. Art for arts' sake or pleasure's sake has no value in his eyes. Art should serve to produce harmony among the divergent forces of life. "I think" he says "I have always been a Puritan in my attitude towards art. I am as fond of fine music and handsome buildings as Milton was, or Cromwell or Bunyan; but whenI found that they were becoming the instruments of systematci

Tolstoy did in 'Resurrection' and 'Anna Karenina,' as George Meredith in 'The Egiost' and Goethe in 'Werther', or take to platform and pamphleteering as Gandhi or weave a desire in poetic thought as Tagore. Like Goethe or Meredith, Shaw is not dealing with one phase of human life concerning a fraction of humanity. Shaw, the reformer, needed a medium which, while giving a vivid expression to his own doctrines, might also bring in view the conflicting opinions in order to illustrate the superiority of the former and the weakness and fallacy of the latter. The only medium, which could voice the discontent and restlessness of his soul and expose to ridicule the views of his opponents and at the same time satisfy his longing for artistic creation, was drama alone.

The theatre-going public of London has been on the increase since the last decade of the 19th century and Shaw realized the advantage of using it as a weapon for attacking the existing social systems. "It (theatre) is as important" he says, "as the Church was in the Middle Ages. A theatre to me is a place, where two or three are gathered together. The apostatic succession from Aeschylus to myself is as serious and as continuously inspired as that younger institution, the apostatic succession of the Christian Church. Unfortunately this Christian Church, founded gaily with a pun, has been so largely corrupted by rank satanism that it has become the Church where you must not laugh; and so it is giving way to that older and greater Church to which I belong: the Church where the oftener you laugh the better, because by laughter you can destroy evil without malice, and affirm good fellowship without mawkishness. When I wrote I was well aware of what an unofficial census of Sunday worshippers presently proved: that Church-going in London has been largely replaced by play-going. This would be a very good thing if the theatre took itself seriously as a factory of thought, a promoter of conscience, an elucidator of social conduct, an armory against despair and dulness, and a temple of the Ascent of Man."

It is thus evident that Shaw had from the very outset realized the potential power of the stage and had little doubt about his success, though he knew a grim struggle was ahead. It must be clearly understood that Shaw is noted primarily as playwright like Shakespeare and Sheridan. He would have been content to remain a novelist if it would have served his purpose. His novels written between 1880-83 deal with the institutions and ideals he later attacked so successfully in his plays. 'The unsocial Socialist,' 'The irrational knot', 'Love Among the artists' reveal all the characterestic features of his revolt against modern life.

of that period. And only those survive the onslaught of time in whose works lies a universal appeal to human heart.

When asked by his biographer Archibald Henderson about his faith in his own greatness, he replied thus :---"The greatness of a dramatist is not a space dimension but a time dimension. How do you know where I shall stand as a dramatist when I have been as long dead as Euripides? Yet that is the only test. There is certainly no sign of falling off at present." It is this assertion of the superiority of his own principles and views combined with the 'shavian blasphemies' that has given rise to such contradictory opinions about him.

Like Tolstoy, Shaw has examined the world at the touchstone of his maxims and remorselessly rejected those that did not come up to the mark. The ready-made doctrines of the shelf do not satisfy his conscience and he is bold enough to substitute his own. This self-valuation of the world forms the arch-stone of his artistic creations. We are told that the world is moving in a wrong direction; our religious beliefs, social traditions, aesthetic and artistic conceptions are all wrong. Everyone has a right to pronounce and justify his own views if he has the courage to do so.

But the 'guardians of public conscience', critics, will not allow it. They want to regulate genius and control what is uncontrollable. The wholesale accusation of society by a saintly Tolstoy or Gandhi is hailed, as a warning, by our alarmed world, but society will not allow a 'poor litterateur' to raise his little finger against its glaring mistakes.

He is thus a social heretic and a rebel who has raised the standard of revolt against the existing political, economic and social systems. So we distinguish between the mission of Shaw and that of the other leading English dramatists. The mission of Shaw is to reform and remould modern life in order to give the maximum of happiness to humanity.

He does not require the microscopic vision of a critic to build up his mission, piece by piece, out of the stray lines. The note of discontent and a deep-seated desire to reform the world on a better and more humane lines runs like thread-mark throughout the texture of his works. It is natural. The exuberant zeal of a reformer is always born of a deep discontent with the existing systems. The motive is there, the desire exists and what he needs is a medium for the expression of his mission. He might hold a mirror to us through his novels as

FREAKS OF BERNARD SHAW.

IN the realm of modern literature, few personalities are more interesting than that of George Bernard Shaw. His name has become a household word among the English-speaking nations. Every one is familiar with the Shaw plays with their never-ending prefaces, Shaw opinions and the Shavian philosophy of life and interpretation of modern society. He has attained this measure of fame through strenuous labour. "I cross" he says, "all the frontiers from London to Japan both ways round. So does Mr. Chaplin." Kipling, Wells, Galsworthy, Drinkwater, CanonDoyle, Belloc, Max-Beerbohm, A. G. Gardiner are the bright planets of the literary firmament of England but Shaw has eclipsed them all.

We read books but seldom think of the men who wrote them. But there are some writers whose lives excite our interest. Who can draw a line of demarcation between Tolstoy and his works? The same is true of Shaw. It is the vigorous expression of his personality in all that he has written from the classical 'Antony and Cleopatra' to the journalistic satire on society, that has focussed the attention of millions of readers on him. If he is impracticable in his scheme of reformation, fantastic in his suggestions, indiscriminate in his 'gun-powder charges of truth' we cannot fail to be impressed with the vigour of his views, and the alert mental power which serves as the motive force of artistic creations. His satirical outbursts ef humour, and seething criticism of modern society might cloud the vision and judgment of the elder critics, but his popularity among the present generation bids fair to give him a permanent place among the English classical dramatists. He frankly admits, "I may be eclipsed by contemporaries and successors but not by the classical British playwrights who all belong to the theatrical dark-ages and did not get beyond sticking purple patches on second-hand rags. Most of them were ashamed of their professions, not without reason. Perhaps that is why so many people seem to think me immodest because I am not ashamed of mine."

He does not regard the appreciation of his own generation as a guarantee for greatness in future, for every age brings with it its own standard of judgment which is based on the characteristic tendencies

in general take of them. Their status in law and in fact has to be raised, and they should be given the chance of breathing free air and moulding their own destinies. The evil practice of child-marriage and the seclusion that is practised here (to an extent, may one dare to say, not required even by religion which is the excuse of many ?) have all to be removed and the path cleared of those anachronisms which are the bane of our society.

These changes youth may well undertake, provided sincerity and the requisite will are forthcoming. Youth is the worker of today and the guardian of tomorrow. It should feel in all its activities that it carries the destinies of a great nation and a great State in the palm of its hand.

MIRZA ALI YAR KHAN.
Professor of History,
O. U. C.

religious toleration in the days of the Moghuls. Such attempts of students to rise above the petty rancours of classes or creeds deserve applaud. It must be understood also that the attempt to eradicate time-immemorial vices and prejudices will not be a very popular work, nor should popularity be sought. Rather, the stings of hatred and contumely even should be borne with courage as the task is noble and the endeavour great in itself. In the Unions where most students should find centred the distinct beginnings of a fruitful public life, recourse should be had for discussions to subjects affecting the social and material welfare of the State rather than those which are purely academic in their importance. In a conversation which I had the pleasure of having once with an office-bearer of one such institution, I suggested to him that such questions should be discussed more frequently. His surprising reply was that it would be distressingly boring for members to listen to discussions on these topics which are invariably "dry." Now, in Universities in Europe, the Unions have been the training ground for most of the public men who have shone forth within the last century——Gladstone, Salisbury, Morley, Curzon, Balfour, Asquith,——invariably all of them owe their success on the platform to their University Unions, and it was there that they learnt their first lessons of public life, developed their convictions, and acquired the gentle art of chivalrous discussion.

There exist in our country the greatest possibilities for progress and a great future. There exist also a number of problems the solution of which would constitute a real advancement. We have yet to tackle the question of compulsory primary education, the difficulties in its application to rural areas, the question of taxation which it, of necessity, involves. We have to consider the needs of the vast teeming populations in our fields and factories whose happiness constitutes our prosperity and in whose discontent lies our economic ruin. Our industries and commerce, our methods of production need vast expansion. We have great revisions to make, outworn ideas to combat, enlightenment to foster. Our great problem of communalism has yet to be politically solved, and religion separated from considerations of politics and relegated to where it should rule supreme, in the conscience of each individual, unsullied by the base antagonisms and mean jealousies of racial hatred. Ultimately the time is to come when a common ideal will inspire all communities, and we have to realise, sooner or later, that, whether communalism is at present recognized or not, it has to be regarded as the source of most evils. And then we have the problem of our womanhood which involves not only more than half of our people but also the fate of the generations to come. Our ideas about them have to rise above the grossly material view we

there indeed is, for the reconstruction of our society, our habits, our way of thinking and living, of our education and environment. But these are best worked out by society itself, alive to its needs, and anxious to repair the neglect of ages. The great majority of our country is not educated and thus it is not very surprising to find them ignorant and apathetic. But those who are educated may well take a share in the enlightenment of their fellow-citizens and bring about by all the means in their power that progressive atmosphere which is needed. Unless they contribute at least in that manner their little bit to their country, wherefore is the education given to them, and how is theirs to be distinguished from the life of a parasite? Without the effort of every instructed element of society to help the progress of the others no amount of attempts from above will really reach any depth.

It is too much then to expect from the youth of our State, on whom in no small measure rests the future of our country, that they will instil into their studies, into their various activities in their literary unions and magazines, into their every day life even, the patriotic motif which would make even their academic life a kind of real service to the State which has given them so much? They can bring to task all the advantages they possess over others older than themselves; they can learn with ardour, enquire without bias, assimilate with ease, and believe with due toleration of what others believe in. They are capable of having a broader outlook of life, euthusiasm is their characteristic, and they have the capacity and the natural strength to labour for their ideals and work them through. What is required is the interest in their country, the patriotic motif. And once they come to possess that interest they will realise how much of value they can really achieve in the course of their ordinary studies when these are translated in terms of purposeful knowledge.

Probably the best work for students is to form study-circles among themselves or in their unions where capital is not made of differences that are bound to exist in matters of detail and where the fundamental principles rather are the ground for work and co-operation. Students of Economics may. for instance, join hands and form a study circle with a view to extend their studies to conditions obtained here. Students of the science and theory of politics may apply the results of their studies to the consideration of the many problems that exist here. Students of history in a similar manner may unite to our history in a less denationalised way then they have hitherto been accustomed to study. It is extremely gratifying to notice the liberal views so well combined with academic research in especially one essay contained in the Historical Journal of our University on the subject of

training to youth. As a matter of fact, these very virtues constitute its great value. Not yet actually in the wear and tear of life, and as such not having those prejudices that are the bane of advanced years, it has more chances of developing the qualities mentioned above. There lies its value.

None will deny, except perhaps the utterly unthinking, that there exists in our country a vast field for social work which requires the most dynamic energies to perform with any degree of success. The truth lies in the fact that an ancient country with a magnificently ancient civilisation was suddenly and rudely awakened to the change in the times, and the rapid march of ideas, whose interaction on the world in which we live, was seen to be inevitable. The internecine and political strife in the India of the eighteenth and nineteenth centuries completely shook the fabric of our civilisation and retrograded the evolution of gradual progress, so that society emerged out of the chaos degenerate, backward, and utterly ruined, with the foundations of its government completely shaken. When contact with the West made us aware of the material headway of the world outside, with knowledge came also the desire to progress. In our own State, reforms were initiated in every branch of the administrations, many old abuses were intelligently tackled, so that from the times of the great Salar Jung to the present day, the trend of reform is clear and runs through out. The attempt was made to progress along modern lines without losing the gems of our old and once-glorious culture. Besides other vast reforms, under the benevolent and generous patronage of out august Ruler, the Osmania University was brought into being with the pristine idea of training the youth of the State in the best of the West and East, and of giving not only to the State but also to the vast peoples of India on the whole, a common language which would rivet together their direrssities, accelerate their attainment of a common nationality, and " undo the work of Babel."

But there comes a time in the history of reform itself when worked from above, when the initiative passes from the govermnent to the people, and when radical measures cannot be adopted owing to the unpreparedness of the people themselves. Any government attempting such a reform to an unwilling people has to stoop to coercion and militarism, and in return may perhaps be called upon to face the utter subversion of its work ere long by the natural and historic instincts of reaction. The historic example of such a withholding of reforms is the case of the Reform Bill of 1860 in England which Lord John Russell withdrew deliberately because he thought it more advisable than " enforcing it on an unwilling country." There may be grave need, as

THE WORK FOR OUR YOUTH.

I do not think it will be doubted by anyone that the value of youth to a nation is immense and immeasureable, and that youth can claim a great share historically in the progress of different nations. Looking over the illuminating pages of Treitschke one cannot help, for instance, ascribing the great liberal wave which spread over Germany in the annus mirabilis of the nineteenth century largely to the heroic efforts of those young men, mostly students, who through such organizations as the Burschenschaft caused the change from the literary idealism of the eighteenth century which had produced Kant's Critique and Beethoven's Ninth Symphony to the highly developed nationalism of the nineteenth with its desiderata of Fichtes and Hegels. In a similar manner, for good or for bad, youth has had its due influence in our own days on the history of other countries like Russia, Turkey, China, Japan and Egypt. It was also youth which mostly left its peaceful occupations at the Universities and Colleges in 1914 to fight in the ranks of the army when its country was declared in danger. At the call of the country, youth did not sit at its desk pondering over the intricacies of a mathematical problem or studying with academic fervour the details of how the Roman legions had fought Carthage. The world had progressed too far to effect an exclusion of the element of youth from consideration, and the State had come to realise that in youth, organised according to patriotic principles, lay the salvation and health of the State. This idea that a good youth meant a good nation effected a tremendous change in the very theory of education, and it is being tried more and more in different countries to model their education in such a manner as to result not so much in a high level of scholarship as in a type which would be most conducive to the welfare of society, a type in short, which would be capable of combining conviction with toleration, scholarship with thought, and a developed sense of values. In the wider issue of national education, the needs of learning have well been ignored, while citizenship is the aim which has been steadily kept in view. And nature in her endowment of youth with the twin virtues of energy of body and energy of mind has facilitated the task of those who wish a particular kind of

A fairly good illustration can also be drawn from Qasidas written by the mediaeval poets of Persia. In poets like Sanai, Sadi, Zahir, Qaani and others, we find exordiums as well as highly poetic imagination. Those that are "*Bahariya*" are fine pieces of lyric poetry and are pure inspiration, melody and grace.

(*c*) Next comes the psychological interest of Qasida. Modern poetry that looks towards reality, materialism and rationality, does not value anything more than psychology in verse. Arabic and Persian Qasidas deal more with the psychology of the poet himself than with that of the lauded patron or anything else. Still, as far as the objectivity of Eastern poetry is concerned, they hold a unique importance of their own. To comprehend the psychology of a poet is one of the best methods to appreciate him most, but generally the Eastern Poetry does not help us to investigate his idiosyncracies through his works, as it is facile enough to fathom the depths of the European poet by a careful perusal of his poems. It is only Qasida that affords material to estimate the value of Eastern Poetry.

(*d*) Those Qasidas that are descriptive or eulogistic, are full of local colour and historic interest. They preserve to us the politics, economy and civilization of the nation under whom they flourished as " Qasida-i-Shahr Ashobe " of Sawda. They paint and picture the glory of kings and their durbars, they interpret their munificence and bounty, and illustrate national history. Shibli says:---

" Qasida is really a means of encouraging authorship, preserving life and fame of the nation. The real postulate of Qasida is panegyric and panegyric is of vital importance; but the praised should be really worthy of it. Truth and not falsehood should be utilised. The praise should invoke and inspire rather than create egotism. Persian Qasidas (by which he means modern) did never answer to these requisites fully well. Yet, after years of practice and intellectual activity, they established a language fully rich to convey any kind of ideas even at the present day."

It remains for our living writers of Urdu verse to break away from the stereotyped convention of poetic diction, which Qasida has long suffered, to change its themes and temper, and bring it to a form of perfection.

M. ABDUL QAYYUM.
(M. A. Senior Class)
O. U. C.

IV

Now we will take the second part of the subject, the importance of Qasida as a piece of literature. For the sake of convenience, we had better treat it under four heads.

(*a*) Qasida as a piece of Lyric Poetry.
(*b*) „ „ „ „ Natural Poetry
(*c*) „ „ „ „ Psychological Poetry.
(*d*) „ „ „ „ Historical Poetry.

(*a*) Literature in poetry is the reality of feeling and profundity of subject-matter or what is called lyricism in its purely modern sense. Again Lyric poetry is defined as that which conveys the personal feelings of a poet. It has been a popular field of activity in the West has and has had a universal fame in the literature of the world. It is a very wide term and has many postulates of a purely abstract nature. Foremost among them, however, are the subjectivity of passion and intensity of emotion.

Poetry in the East, as has been noted above, is not perfectly lyrical. It has been obscured by its conventional, artificial and objective character. But Qasida is an exception. Since it had to deal with one subject, whether panegyric, philosophy, didacticism, or description of Nature, the writer of the Qasida was bound to express himself with a concomitant sequence of thought. Hence passion and feeling were to be there. Otherwise inspiration would have been almost impossible. Now this passion and feeling intensified or lightened according to the theme of composition, utterly lost their importance as soon as they adopted eulogy as the field of action. Therefore it can be rightly inferred that Qasidas, except the panegyrics, produced literature that is lyrical and so admirable according to the modern point of view.

(*b*) Qasida, in its second aspect, is a piece of Natural Poetry. The best example of this kind is the classical Qasida of the Arabs. Although lacking deeply philosophic or mystic thoughts, it is yet natural and affective. It is often spoken of the Arabs that their utterances are vivid pictures of the their life, economy, customs and warfare; their praise was of military and athletic feats; their love is a real love of the fair sex; their philosophy, a practical wisdom of their nomad life, and their figures of speech, sweet expressions of their simple art and beauty. So their Qasidas, since they are literature that is felt and realised, simple and spontaneous, can be classified as a fair example of lyric, natural, and psychological poetry.

Qasida where a poet expressing some mood or phenomena in his introduction turns towards the main purport of his composition. The more harmonious and skillful his *guraẓ* is, the more is it worthy of credit and admiration.

Another point in this connection is the language of Qasida. It has been mentioned already that the early Arab poetry was simple and spontaneous. Pure and direct thoughts were expressed in equally pure and direct language. Figures and rhetoric were brought in to create force and effect. Gradually the language and diction of Qasida changed with its theme and interest. The piece transmuted itself into a panegyric, including artifice, adornment and figures, both in thought and style. The fashion was in vogue for such a long time that a specifie stereotyped language came into existence. A grand style and diction embellished with rhetoric, adorned with traditional enchantment of words inclusive of exaggeration, falsehood and all that was directly opposed to the classical poetry were regarded the touchstone of art in Qasida. They were faithfully followed and are followed even to this day.

This change effected in annihilating the entire beauty of natural poetry. It eclipsed the glory and light of a poet's heart and restrained direct approach to its innermost corners,

Nevertheless this class of Qasidas raised the beauty of language to its highest pitch. The Persian and subsequently the Urdu language were stored with the marvellous new figures, idioms and phrases The emphasis was thrown upon mere craftsmanship and thus true lyric element was eclipsed. Besides, since its transmutation, as a eulogy, induced the poets toward acquisition of wealth, it greatly changed and debased itself from a high art into a low profession. It became an incentive to egotism, flattery, avarice, and humiliation. Except the exordium, all that remained of Qasida was mere artifice and falsehood.

It also lost its popularity, mainly on account of its stringent character. Its length, its enigmatic style, its rhetorical language and lastly, its traditional theme of eulogy made it extremely difficult and unfruitful to handle. Even in these days when so many new forms of writing verses are being invented, no attention is turned towards its revival as a popular form of versification.

understanding the meaning depends on the unfamiliarity of that environment rather than upon anything far-fetched or fanciful in their comparisons, but apart from them, they are splendidly direct and spontaneous." But the later modification of Qasida entirely subverted the original scheme; and it was left for the exordium only to convey something original, true and effective.

Some of the early masters like Zahir, Sanai, Qa-ani, Khaqani, in their Qasidas deal with beautiful scenes of Nature, with didactic, philosophic, moral themes. However meagre such an output might be, it is of permanent value.

Are *thashbib*, *gurayz*, eulogy, and prayer, as arranged respectively in the Qasida, in any way impotant? How are they conducive to the artistic beauty of poetry? A question of 'why' in art, which has grown along with the life, civilization, and literature of mankind, is always irrelevant. Similarly it is irrelevant to ask why the Sonnet should be a poem of fourteen decasyllable iambic lines divided into two distinct parts consisting of the octave and the sestet. It can however be rightly asked whether there is any interrelation between *thashbib* and the panegyric immediately following it.

Prosody has laid down certain rules to determine their interrelation. Firstly, all Qasidas produced in our literature are not panegyrics only---some are '*Bahariya*,' or poems dealing with the season of spring, some are philosophic, some deal with love; others are eulogies written with a special motive on particular occasions. The subject of Qasidas thus being assigned, it depends on the craft and skill of a poet to compose his introductions so as dovetail with the subject matter. Poets like Khaqani, Qaani, Manuchiri, Sadi, Khusraw, Sawda, Zawq and Ghalib often selected their exordiums in accordance with the theme of their compositions. For example, Zawq while writing a qasida to congratulate Bahadur Shah on his recovery from an ailment begins with a temperate and healthy phenomena in Nature, and describes the world in its full state of puberty and efflorescence. The language, diction, terminology and figures all deal with health, gaiety and cheerfulness. To have a suitable exordium, concordant with the subject-matter of a Qasida, is just the test for any ingenous poet and the more harmoniously he starts to sing, the more applaudable his chant becomes.

Secondly, in cases whare it is not necessary to have similitude in the *thashbib* and the panegyric (which is permissable) there is one or more couplets, called *gurayz*, coming between the exordium and the panegyric, which create a unity of diction. *Gurayz* is that line of

thought sequence. Every distich is a broken incoherent song. There is nothing sustained and deliberate. It can be rightly said of Eastern poetry that there is much in it which is not purely lyrical. No form, suitable enough to give a free and continuous play to one's thoughts and ideals, exists, so that we might approach the poet's true genius and psychology as surely as those of a European poet. There is much that is objective, scattered and embellished. The ghazal covering the major part of oriental poetry is full of artifice and convention. Every poet is a supposed lover and has got an ideal sweetheart of his own. His feelings are mere imitations or attempts through imagination, though sometimes very successfully done. The Masnavi has been specified entirely for epic or narrative poetry. The Quatrain, although having scope a for lyricism, is too narrow in itself to become an effective medium of expression. Such is the case with almost every other traditional form.

Despite these limitations it cannot be said that our form and modes of expression are unfit in themselves to convey lyrical feeling. In fact a peculiar kind of convention has a strong hold upon our poetry. We embellish our writings too much, rather than express our real sentiments in plain language. The classical Arabian poetry was in most ways similar to that of the West but its advent into Persian and then its transference into Urdu entirely changed the usefulness of the forms. The ghazal and the Qasida with their conventional and artifical character side-tracked all that was left of classical lyricism, spontaneity and subjective idealism. Our poets until very recently did not care to bring about a reaction and to clarify poetry from its mere enchantment of words. Their inadvertancy towards the art of writing a coherent and consistent poem, dealing with one specified subject, deprived our art of naturalness and realism.

From this point of view, Qasida is the best field for our poets to display something of their own. But it is not often that it was so employed. Often in *thashkibs* does the poet deliberately fix his point of view on one subject only, and sings a long and continuous song which to a very great extent is the real voice of his heart. and soul.

The classical Arab poets, also some of the mediaeval persian singers, used the whole of Qasida as a medium of lyric expression. Hence their productions are really good and great pieces of poetry in the modren sense. Prof. E. G. Brown says "The early Arab poets of the classical period are naturally unaffected and perfectly true to their environment, and the difficulty which we often experience in

its pure lyric note. As time, guided by the ever-expanding dominance of Islam under the Umaiyyad rule, offered material wealth and comfort, it began to flow in a widely different channel. Eulogistic verses became the *locum-tenens*, and Qasida departing from its original position slowly turned into an unnatural, imperfect, form of panegyric. The affluent Abbasid Caliphate saw an inundation of, encomiums full of flattery and false approbation of kings and patrons.

Such was its brief history. When Qasida was introduced into Persia by the omnipotence of Islam and its national language, Arabic, it brought with it its own convention. Abbas of Marw was the first poet who composed a Persian Qasida in praise of Mamun-al-Rashid's arrival in Khurasan. Since then it became a favourite with the succeeding poets who, first imitating the old Arab style, slowly modified it in their own way.

In its earliest stage, Qasida in Persia was a close imitation of the purely lyrical and spontaneous form of Arab versification. Thoughts and ideals were all simple and artless. There was no trace of far-fetched conceits, or hyperbole. Still the diction and style were adorned by various figures of speech, 'Sanat-i-Tarsi' in particular †. Raudaki's Qasidas, for example, are composed in that spirit and possess the charm of natural poetry.

III

At the outset one would naturally ask what is poetic art and what is poetic literature. For our present purpose, by art, we mean the technique, and by literature, the thought, feeling, and subject-matter produced by the help of that technique.

Art then first deals with the form of poetic expression. It is the adoption of a suitable form that adds to the beauty of the poem. But it has been traditional in the East to imitate the arduous and the impracticable, secondly to display one's poetic merits only through their deliberate adoption. Hence Qasida failed to develop as a popular piece of poetry.

Still it can be said of Qasida that it is the only field wherein our poet has the best scope to give vent to his personal feelings. Ghazal as a conventional piece of love poetry is undeniably widely popular. Still its peculiar nature cannot uphold any continuous

* Jackson's 'Early Persian Poetry' and Awfi's 'Lubab.

† It is a figure where the arrangement and articulation of words are rhythmical in both the lines.

QASIDA AS A PIECE OF ART AND LITERATURE

PRIOR to any discussion, in particular, it seems necessary to comprehend the form and structure of the Qasida as determined by the rules of conventional prosody.

Qasida in its outward form is similar to that of the ghazal. It begins with *matla* and includes *radif*. It should have not more than twenty one couplets, and less than five. It has two main divisions, the first is called *tashbib* or exordium, the second is the eulogy which ends with prayer. Between the exordium and the eulogy, there are one or more couplets, called *gurayz*, which link them together.

Again *tashbib* or the introduction is of various kinds. It includes the description of a natural phenomenon or of a specific mood or occasion, or of some fanciful idea in keeping with the theme of the composition. Sometimes, like a ghazal, it has unconnected couplets that convey the philosophic, mystic, or didactic feeling of a poet.

II

Qasida, according to the position it now holds in Urdu Persian, owes its and origin to the genius of the Arabs. Simplicity of thought and style was an outstanding feature of Arabian poetry. Qasida developed in the hands of the Arabs as a beautiful art of lyric enchantment---an art which reflected the true picture of their simple but grand genius. In post-Islamic literature, it was not utilised as a panegyric but as an elaborate form of ghazal for expressing one's personal feeling.

Qasidas composed in the so called 'days of Ignorance' reveal to us a detailed record of all the economy, warfare, belief, morality, superstitions, customs and every possible information of Arab life. The post-Islamic strain was perfectly natural and versatile---it was a simple expression of their heart and soul. Gradually however it lost

THE OLD LION

(IN A METRE USEDBY SAPPHO 2500 YEARS AGO)

All the night I lay in a dreamless slumber,
Deep oblivion, tired with my lonely labour;
Then the dawn came suddenly, golden splendour
Flooding the deseıt

Free was I to rise and to roam and wonder,
Greeting friendly birds, as they filled the morning
Full with wine of rapturous incantation,
Fluting their carols.

Then I started, for from the city gardens
Came a sound, so piteous, old and plaintive,
Groan on groan, the heart of a weary lion
Misery-laden.

Captive, taunted, long had he languished, losing
Youth and noontide, gazing beyond his prison,
Brooding ever, piercing with eyes like starbeams
Years in their passing.

Time on time they brought him, for solace, lovers
Lithe and lustful, fresh from the distant wildness;
Fruitful gambols left him to fruitless pining,
Loncly as ever.

How he dies through waning of spring and summer,
Few to pity, ns one to end his pleading;
Storm and darkness, last of his loyal kindred,
Echo his anguish.

Moon on Moon, slim crescent to globe of glory,
Passed on high, the dream of who knows what saddened
Lion hearted world, in the chains of Evil,
Biding deliverance.

E. E. SPEIGHT.
Professor,
English Literature,
O. U. C.

"The reality of the knower, the known and the knowledge or the perceiver, the perceived and the perception, is one *i.e.* if the subject and the object are idential, I wonder how the relation of perception can arise which presupposes the duality of the knower and the known." One of his Urdu Ghazals is entirely an interrogation of wonder at the unintelligible relation of undifferentiated primeval Unity to the actual multiplicity and diversity of the actual world of infinitely varied things, beings and beauties.

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

Dr. KHALIFA ABDU'L HAKIM.
Professor of Philosophy,
O. U. C.

(To be Continued)

as the communion of Life with Life and of Soul with Soul. This intuition is not the creation of any one seer or artist; it is the product of a progressive revelation but all art and intellect is to be ultimately judged by reference to this fugitive spirit of the Unity of Life. Ghalib's poetry in this respect is sometimes the mere expression of a creed that is versified but at other times it has the exalted gaze of Wonder and the glow of an edifying Faith. As a specimen of merely rhymed metaphysics, we will take a few examples from his Urdu and Persian Divans.

ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب

"Reality is utterly beyond Appearance; our waking in it is like waking in a dream. The ocean, as perceived, consists of appearance of Forms; the drop, the wave and the bubble have no independent, substantial reality.

The monistic analogy of the sea and its waves is traditional; here Ghalib has versified it without giving it any original touch. similarly in a Persian quatrain he expresses it simply and directly:---

اے کردہ بآرائش گفتار بسیچ
در زلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرے می دانی
ذاتست بسیط منبسط دیگر ہیچ

"O Thou who maketh an effort to adorn thy speech and createth beautiful curls in the locks of thy expression; the Universe that thou regardeth dualistically is One Indivisible Being and nothing besides it exists." At another place he expresses it with a simile which is more original than that of the sea and its waves:---

سخن یکیست ولے در نظر زسرعت سیر
کند چو شعلۂ جوالہ نقطہ پرکاری

The Logos or the Word is originally One but like a swifly revolving luminous point it creates the illusion of a continuous circle (the appearance of a round Universe). Contenting ourselves with these examples of the mere utterance of a formula, we now proceed to cite some of his verses where he enters the Realm of Art in the spirit of wonder or honest doubt.

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

easily see that this desire for originality and hatred of the commonplace and the conventional has left its mark everywhere on his poetry as well as his prose. Even his epistolary art is a landmark in the history of letter writing in Urdu which was thus once for all delivered from its time honoured classical shackles. When he was following the classical models by deliberately and consciously setting before his eyes certain masters and masterpieces, his real endeavour was not to imitate but to create.

2. HIS PHILOSOPHY.

We will now turn to what one would call Ghalib's philosophy but which would be better expressed by the German expression "Gedanken Welt," Universe of Thought. No poet is a technical philosopher or a system builder. In the strict sense of these words, he is neither a philosopher nor a prophet, though he weaves into the warp and woof of his art much of the valuable elements of both and transforms abstract truth and practical insight into Beauty. For the sake of clear apprehension, we will divide his thought-world into a kind of metaphysics on the one hand and a wealth of certain deep and everlasting stray thoughts on the other.

His metaphysics like the best philosophy among the Musalmans is mystical which is a joint product of subtilized Islamic Theism, Hellenistic Rationalism and Aryan-Neoplatonic Monism. His view of Reality is pre-eminently monistic or pantheistic. Reality is fundamentally and essentially One. Human knowledge and human values are piecemeal, discursive and relative. The distinction of God and the Universe, subject and object, good and bad, high and low, is only phenomenal or unreally real. This thought of the ullimate Unity of Existence which is the greatest discovery of human intellect and human feeling, is the most fascinating intuition and faith in which art, science and religion coincide and get reconciled. This fascinating Creed of Unity was endorsed and preached by the real as well as the pseudo-artists and mystics throughout the Islamic world. With the pseudo-artist it becomes only a dignified dogma, a bloodless logical abstraction, a shibholeth and a catchword. By heaving it mechanically *ad nauseum* with only unappealing verbal variations, one becomes sick of it. But in the hand of a great artist whose art is suggestive of the Ineffable mystery and the half revealed fundamental Beauty of Existence this lofty doctrine appears to be an eternal Spring where every flower is a new revelation of one inexhaustable Being and where the Universe globes itself into every drop of dew. This doctrine makes the universe living in every aspect and justifies the artist in his approach to Reality

universally accepted, and in many places he enunciates it as a principle for men of insight.

با من میا و بزا ے پد ر فر زند آذ ر را نگر
ھر کس کہ شد صا حب نظر د ین بز رگاں خو ش نکر د

'Don't fall foul of me OFather; look at Abraham, the son of Azar; whoever becomes a man of insight does not like the creed of his ancestors." He says elsewhere that heresy or heterodoxy is a divine gift that is not bestowed indiscriminately on the unworthy and is not attainable by effort. "O mere man, thou shalt not be able to attain that privilege; therefore despair of it and remain an 'orthodox' Musalman.

د ولت بغ ط نر سد ا ز سعی پشیما ں شو
کا فر نتوا نی شد نا چا ر مسلما ں شو

In an Urdu Ghazil he repeats the same desire of independence most emphatically. "It is not necessary for us to follow 'Khizr' (the invisible guide of Muslim tradition); at best I can take him as a fellow traveller on the road of life."

لا زم نہیں کہ خضر کی ھم پیر وی کر یں
ما نا کہ اک بز رگ ہمیں ہمسفر ملے

And elsewhere he puts the same theme diversly referring in the dialogue between God and Moses.

کیا فر ض ھے کہ سب کو ملے ایک سا جوا ب
آ و نہ ھم بھی سیر کر یں کو ہ طو ر کی

"It is not necessary that God gives the same reply to everybody (that He is incapable of being seen); let us also attempt a visit to the Mount Taurus, undaunted by the failure of Moses." Referring again to the traditional Stone-hewer Lover of Persia, Ghalib reproaches him for having followed a very common way of committing suicide in despair, and deprecates the value of his martyrdom because he was not able to rise above custom and convention.

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن ا سد
سر گشتہ خما ر ر سو م و قیود تھا

One could quote mumerous verses from his Urdu and Persian collections to substantiate this special trend of his mind, and one can

system which is plausibly free from internal contradiction. The only consistency that is required of an artistic creation is the unity of impression of a single piece of art. But as all the variegated creations of a single artist have at least that much unity, in so far as they all emerge out of a personality that is fundamentally one, so the entire production of a single artist must have some colours that dominate over the larger portion of the canvas and give us a clue to his outlook on life. The same Milton wrote *L'Allegro* as well as *Il Penseroso* *Paradise Lost* as well as *Paradise Regained* but no critic would be entirely unjustified in his attempt to trace Milton's view of life in general. Ghalib has paid homage to the traditional, the conventional and the real, and has on different occasions expressed contradictory moods and conflicting views but a thorough study of him does give one a generic impression and reveal certain threads that give a special tone and colour to whatever pattern of variegated hues he may be weaving on the loom of his genius. Now we will attempt to single out certain. salient characteristics in his outlook on life.

1. REVOLT AGAINST THE CONVENTIONAL

Ghalib shared this trait with all the great minds of all ages Although in matter as well as manner, to a very great extent, he followed the traditions of Persian poetry, yet either actual divergence or at least the intense desire to deviate from the beaten tracks of thought are noticeable in his art as well as life at every step. His belief was that the conventional which means dead and unoriginal, is unworthy of a great mind. He considered it would degrade him either to think the common thought or to observe the common religion or to live a common life or to die a common death. He once put it humorously when he survived an epidemic, that although he was destined to die during that year, he held himself back because it was derogatory to his genius to perish in a general epidemic which happened to coincide with the predestined time of his death. He was loth to believe in anything simply on authority. He once indignantly remarked that people hold up as a standard and as a criterion of truth everything that belongs to the past " as if there were no asses in the times gone by." His contemporaries found it hard to understand him because he would not walk in their ruts and it is known to every reader of Ghalib how he fell foul of the Persian scholars of his time, because of his attack on Qatil who was accepted on all hands as an infallible lexicographer of the Persian tongue. In the sphere of religion too, it is not easy to label him with any denominational epithet. He does not believe in following blindly even the

partly modelling itself on the simple natural poetry of the Arabs, had expressed Reality and Beauty. But being temperamentally more metaphysical and subtle than the Arabs, the Persians diverted Islam from its simple moral dynamics into a sort of transcendental statics. With growing decadence and the lack of *elan vital* the impoverished forces of life engaged themselves either in culling new abstractions out of words and phrases that were once living or in weaving a cobweb of evasive and bloodless feelings. The later poets wrote love poetry, not because they felt the pangs and pulsations of original experience, but because they had inherited rich phraselogy which was capable of infinitely varied combinations and permutations, with the result that it became a travesty of what it was and lost all touch with life. The theme of love and metaphysical mysticism became the fashion for nearly all poets whether they were real or pseudo-artists, as Shaikh Ali Hazin said---

تصوف برائے شعر گفتن خوب است

Ghalib entered into full inheritance of all the motives mentioned above and set before himself the object of not opening new vistas of life but to dig more deeply into the treasure grounds already made available by the efforts of his predecessors and to soar more loftily into the heavens that had already been revealed. He strove to assimilate this inheritance and it must be confessed at the outset that he imbibed the decadent along with the living material. In the traditional Persian poetry there is hardly anything that he discarded. Pantheistic mysticism, love poetry at its highest and its lowest, real optimism and artificial pessimism, truthful as well as hypocritical encomiums on kings, rulers and men of power and pelf, both native and foreign, and even theological controversies of his day that interested him the least, all these things claimed to be shaped by his genius and to every one of them he gave a bit of it.

One might say that consistency among all the products of a single artist is a virtue that is foreign to artistic creation. If life in its infinite Will to Live, Will to Create and Will to Power creates elements and organisms that thrive both by harmony and by conflict, why should not the same privilege be granted to an artist who is not preaching a creed but whose function is to feel and express as many aspects of life as impress him and appeal to him to give them a habitation and a name. You may require of a prophet to have one definite view of existence and that his expression should conform to his thought, and his deed be consistent with his words. Similarly one may require of a philosopher or a scientist to be at least intellectually consistent and to have a

THE GENIUS OF GHALIB

SINCE the beginning of the 20th century the poetry of Ghalib has been steadily gaining in popularity and prestige and the momentum is not yet exhausted. It is a phenomenon that requires to be explained in the light of the history of culture in general and the history of Persian and Urdu poetry in particular. Ghalib is a bilingual poet and in consequence, any attempt to deal with his poetry in the two languages *separately* would be one-sided, empty and artificial. The genius of the two languages, especially in the style and diction of Ghalib, is so akin that in this respect the artist is not like the musician playing on two different instruments to express different moods of the Spirit, because in the case of Ghalib these instruments are not of different timbre and tone, but organs playing the same music with inessential external details. The difference between Ghalib's Persian and his Urdu is negligible from the point of view of determining his outlook on life, although, from the point of view of pure Art, his genius has expressed itself more perfectly and exquisitely in the former, so much so that in comparing the two himself, he disowned his Urdu poetry as not the true revelation of his genius.

فارسی بیں تا ببینی نقشہاے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

The purpose of this article is to determine Ghalib's 'Weltanschauung,' his angle of vision and his outlook on life. For this purpose it is absolutely essential that we first pass in brief survey his spiritual and intellectual inheritance, because in this world of causal chains and progressive evolution, phenomena are not thoroughly comprehended by studying what they are, but how they have come to be.

Before him Persian poetry had passed through various phases, advancing in some directions and retrogressing in others. With the stagnation of life forces, new matter for thought and feeling, new experiences and experiments on life were not forthcoming. The Persians were lovers of art racially and climatically, and the development of poetry with them had started with original life forces. Islam infused into them its yea-saying to life and democratic freshness Persian poetry

اگر چہ حسن فروشاں بجلوہ آمدہ اند
کسے بہ حسن لطاف تے نیا رما نرسد

"Although many a comely form has come with splendour, yet no one reaches my Beloved in beauty and Grace"

گل بے رخ یار خوش نہ باشد
بے بادہ بہار خوش نہ باشد
طرف چمن و ہوائے بستاں
بے لالہ عذار خوش نہ باشد

"The Rose Without the face of the Beloved and spring without wine are not pleasant. The border of the sward and the breeze of the garden without the tulip cheek of the Beloved are not pleasant."

زد ر د ر آ و شبستاں ما منو ر کن
د ما غ مجاس ر و حا نیا ں معطر کن

"O Beloved, enter by the door; and make the chamber luminious. Let they presence perfume the assembly of souls"

The Nawab strikes out nearly the same ring in the following sestet:

"So when thou com'st to me in Beauty's bloom,
And on thy face soft pity's grace shine,
Thou can'st dispel the heavy shades of gloom
From my sad heart, which ceases then to pine;
And hope and joy their quenched beams relume
And gild the universe with light divine."

As mystical truth cannot be fully apprehended, the only consistent way to propogate them is to explain them symbolically. The interpretation of these sonnets is imposible unless one gives time and patience to the study of mysticism. These sonnets, though retain the form and images of ordinary love-poetry, are marked with precise mystical significations.

Rabindranath Tagore is the spokesman of the Upanishads,------ the source of his inspiration. The Nawab is the exponent of Islamic Mysticism. Both agree in regarding universe as the manifestation of Divine Beauty. This is pure religion which has lived all ages and all times.

ABDUL-JALIL,
Editor,
Osmania Magazine.

The thoughts expressed here may not appear, to the casual reader, to be the Nawab's------they are hundereds of years older than the Nawab. But it will be a misfortune to deny the expression that is his own.

To a few these graceful sonnets may have 'the consoling quiet of classic utterance'. The writer thinks that the utterance of the Nawab which, in point of sublimity, imparts a larger sensation than the lyrical tenderness of other poets, is not inspired by the master-artists of the West. It is the inevitable self-expression of the influence exercised by the sufi poets of Persia. An account of the rise and development of Islamic Mysticism, as representing the esoteric doctrine of the prophet, or as Aryan reaction against Semitic religion, or as the outcome of Neo-Platonic influence, or according to recent speculations, an entirely independent growth and individuality, however interesting, does not come within the scope of our subject. But the fact that Mysticism has played a very important part in the literature of Musalmans, needs no proof for justification.

The Arabian poetry, though intensely subjective in feelling, attains, at its best, the joyful emotion of Shelly or the singular melancholy note of Keats. The Persian poetry, after the advent of Islam, with the dominating influence of sufism, gave a fresh impetus to the intensified feelings that already existed in the Persians.

The sufis think that the Phenomenal world is but the effulgence of One Divine Being, as Ghalib says :---

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ تا خود بیں

"Where would we be?" he asks, "if it were not for self-reflecting Beauty".

In this way the phenomena around us created a great interest, in so far as they formed an intermediary stage to lead us to the Divine. The sufis realised that Love is highest form in which God is worshipped and every fair object of the world is in reality a manifestation of Divine Beauty. The sufis under the stress of such conviction propounded their experiences, observation, ideas and emotions in a way that interested and made a general appeal to all Poetry should be the only medium of expressing such feelings. Words like Beloved, Wine, Tavern, Eyebrows, Candle and Moth, and phrases like Lotus of the Garden of Love, Sorrow-Stricken Lover; Agony of Separation: Ecstasy of Union; the Tear-Torrent of the Lover; the Tangled Tresses of the Beloved began to connote a specific spiritual meaning. We shall give a few specimens from Hafiz to illustrate this fact.

For to mine eyes thine eyes, through Love, reveal
The smile of God ; to me God's healing breath
Comes through thy hallowed lips whose pray'r is Love
Thy touch gives life ! And oh, let me but feel
Thy hovering hand my closing eyes above,---
Then, then, my soul will triumph over Death.

Plotinus in his ethical system has promulgated these very truths which the Nawab has expressed in his sonnets. The highest cognition, Plotinus states, is the vision of God. The various phenomena of the Universe are but modes of the Divine Being. The soul, though connected with the phenomenal world and subject to its influence, yet by the contemplation and by the love of beautiful things, beholds the images of Divine Beauty, strives to scale the heights of heavens in order to join the Infinite. Hence the Ideal beloved, in whom are present manifestations of unusual beauty and deep associations, is sure to impart incommunicable ecstasy, eternal joy and perfect bliss.

Truth is but as the eye of God doth see ;
And love is truth, and Love hath made thee mine.
What though on earth our lives may not combine,
Love makes us one for all Eternity !
God gives us to each other, bids us be
Each other's soul's fulfilment, makes Love shine
Upon our souls as His own light divine,
An effluence of His own deity.

Why ask for more ? Our union is above
All earthly unions, ours those heights serene
Where Love alone is Heav'n and Heav'n is Love---
Where never comes the world's harsh breath between
Hope's fruits and flowers. Ah, why then earthward move,
Where pure and perfect bliss hath never been ?

Thoughts such as these have eternal values !

It was Wordsworth who brought to perfection the naturalistic poetry of that mystic visionary Blake. He followed Plato in the conception of the relations between the natural and spiritual worlds. Every object of the sensible world is an instance. The universal element manifests itself in the particular. Hills and valleys, landscapes, waterfalls, meadows, sunrise and sunset, all the aspects of earth and sky, if contemplated with sympathetic gaze, give us spiritual moments. "We see into the life of things." His was the faith that intimate worship and contemplation of nature were an inlet to mystic truth.

The sonnets of Nawab Nizamat Jung, however instead of suggesting this potent originality of Wordsworth's outlook on the external world, do reveal idealistic, mystic Love, yearning after Ideal Beauty, which is also as effective, as operative in exciting in us the sense of vision and revelation even as that of Wordsworth. Such was the Mystic Love, such was the Ideal Beauty that inspired the loftiest passions of artists like Dante, and Michael Angelo. Our own Sufi poets, Sa'di, Hafiz, Jalalud-Din Rum 'Attar, have propounded their faith in Mystic Love. "The phantasmal is the Bridge to the Real." The love of a Sufi realizes in the beloved but a dim reflection of Eternal Beauty. The worship of the beloved, as the sweetest of all nature's manifestations is in itself a communion of the soul with the Absolute Good, God Himself.

How poor is all my love, how great thy claim!
How weak the breath, the voice which would reveal
All that thy soul hath taught my soul to feel---
Longings profound,---deep thoughts without a name.
If God's self might be worshipped without blame,
In His best works, thou would I silent kneel,
Watching thine eyes,--- until my soul should steal
Back, unperceived, to regions whence it came!

Sometime the Nawab falls into the mood which gave birth to that dictum of Plato. "All knowledge recollective," a mood which probably moved wordsworth to write that immortal song "Intimitations of Immortality."

I know not what Love is,--- a memory
Of Heav'n once known,-- a yearning for some goal
That shines afar,---a dream that doth control
The spirit, shadowing forth what is to be.
But this I know; my heart hath found in thee
The crown of life, the glory of the soul,
The healing of all strife, the making whole
Of my imperfect being,---yea, of me!

'Tis not for love to bid life's cares depart;
Love wings the soul for Heaven whence it came.
Such love from Petrarch's soul did Laura claim
And Beatrice to Dante did impart.
To thee I turn, --- be thou or near or far,
And whether on my love thou frown or smile,---
As, in mid-ocean, to some fairy isle
Palm-crowned; as, in the heav'ns, to eve's bright star
Whose pure white fire allures the vision, while
Myriads of paler lights unnoticed are!

* * * * * *

Time's cycle rolls---once more I hail the day
On which propitious Heaven sent to Earth
Disguised in thy fair form, in mortal birth,
The Star of Love, whose pure celestial ray
Glides through the spirit's gloom and lights the way
To bliss! I hail thy coming 'midst the dearth
Of the soul's aspirations, when the worth
Of hearts like thine had ceased men's hearts to sway.
I greet thee, Love, and with thee scale the height,
That cloudless height where winged spirits rest:
Where the deep yearnings of the mortal breast,
From mortal sin set free, reveal to sight
That living Presence, that Eternal Light
In which enwrapt the eager soul is blest.

It is in consideration of such aspiration, that Mr. Charles Fraser says in his foreword: "Of all the most famous writers of sonnets (probably in literatures of nations) it is Michaelangelo whose words come back most vividly to memory as we read the Nawab's expression of faith."

"Love wakes the soul and gives it wings to fly?"

* * * * * *

"All beauty that to human sight is given
Is but the shadow, if we rightly see,
Of Him from whom Man's spirit issueth?"

* * * * * *

"As heat from fire, my love from the ideal
Is parted never?"
"Oh noble spirit, noble semblance taking,
We mirrored in thy moral beauty see
What Heaven and earth achieve in harmony."

(Michaelangelo).

concentration of thought, by striving in all things along the upward way, can leave us in a few pages as it were a summary of patriotism, a manual of national honour, he surely has his place among his country's benefactors not only by that kind of courtesy which the nation extends to men of letters of whom her masses take little heed, but with a title as assured as any warrior or statesman, and with no less direct a claim."

But these sonnets do not indicate his original contribution, to English poetry, in which 'he has shown,' as Mr. Myers himself tells us 'by the subtle intensity of his own emotion how the contemplation of Nature can be made a revealing agency, like Love or Prayers---an opening, if indeed there be any opening, into the transcendent world.'

No poet in English literature has yet employed the sonnet for the expresson of idealistic mysticism. The gentle work of Elizabeth Barret Browning, whose place is high among English poets, is marked by overwrought emotionalism, rather natural to a woman. Dante Gabriel Rossetti in not only successful as a ballad writer but ranks with the greatest sonnet writers. But his sonnets were inspired by a woman whom he loved passionately. Every gracious thought of her---all the hopes, fears, anxieties they experienced in common, is revealed in his sonnets. These, therefore, do not rise above the pedestal of material, sensuous beauty.

Let us look at the progress of poetry in English Literature. What do we notice? Poets who lived in the world of idealism; poets to whom Beauty appeared as a symbol of loveliness that is infinite; poets who were inspired by initial impulses of eternal, ineffaceable and mystic love; poets whose pure emotions glorified the external world; and poets who, under the stress of such conceptions, produced poetry, at once dignified and sublime---are really a few in number. In short throughout the whole course of English Literature, from Chaucer down to Wordsworth, seldom has ideal Beauty, and mystic Love aroused in the poets, moods which draw from "visible things an intuition of things not seen." Has the story of Dante's mystic love for Beatrice become old? Has it exhausted its tender interest? Will it not continue to move humanity in this age of oppressive materialism? The sonnets of Nawab Nizamat Jung beckon us, stragglers as we are, and remind us that idealistic mysticism is not dead.

Ah, Love, I know that to my love thou art,
And must be, in this life, a dream,--- a name!
But be it joy or grief, or praise or blame,
I give thee all the worship of my heart.

The next epoch of literature, the age of Dryden, though. admirable in many ways, was the age of prose. The literature of this period was intellectual rather than imaginative and emotional. Again, in the Augustan age, poetry was an imitation of ancient models. This principle was reiterated by Pope himself:

"Learn hence for ancient rules a just esteem
To copy Nature is to copy them."

It is vain to find in the literature of this age any indication of high imagination or of subtle fancy. Nowhere the writings of classical school are characterized by a sense of mystery, sense of Romance, depth of feeling and above all greatness of impulses. If we turn to the age Age of Johnson, we find it obviously an age of transition. On the one hand poetry began to deal with nature and mystic life, with the growth of the sense of picturesque and on the other hand a tendency apparently at work was the strain of Romanticism. The former tendency led to the development of Naturalism. Several writers of this age, as Blake, Thomson, Collins, Gray, Cowper, Crabbe, are important to us, in as much as each of them, in some form or other, contributed to the movement. The age of Wordsworth was a triumph of Romanticism accompanied by that of Naturalism. Another aspect of this is to be discerned in the French Revolution. The intellectual phase of the Revolution affected Shelley, while its military phase appealed to Byron and its sentimental and political phase caught the imagination of Wordsworth and Coleridge:

"Bliss was it, in that dawn to be alive
But to be young was very heaven."

The excesses of the movement, the blood and fire across the English Channel, soon horrified Wordsworth and he recanted. But his best work, sonnets and other poems in the opinion of many, was accomlished in the days of his Revolutionary enthusiasm and inspired by the events of the Napoleonic period. "These sonnets to Liberty," Mr. Myers says, "are worthy of comparison with the noblest passages of patriotic verse or prose which all our history has inspired---the passages where Shakespeare brings his rays to poems on "this earth, this realm, this England,"---or where the dread of national dishonour has kindled Chatham to an iron glow,---or where Milton rises from the polemic into the prophet, and Burke from the partisan into the philosopher." He goes further and declares, "If a poet, by strong

concentration of thought, by striving in all things along the upward way, can leave us in a few pages as it were a summary of patriotism, a manual of national honour, he surely has his place among his country's benefactors not only by that kind of courtesy which the nation extends to men of letters of whom her masses take little heed, but with a title as assured as any warrior or statesman, and with no less direct a claim."

But these sonnets do not indicate his original contribution, to English poetry, in which 'he has shown,' as Mr. Myers himself tells us 'by the subtle intensity of his own emotion how the contemplation of Nature can be made a revealing agency, like Love or Prayers---an opening, if indeed there be any opening, into the transcendent world.'

No poet in English literature has yet employed the sonnet for the expresson of idealistic mysticism. The gentle work of Elizabeth Barret Browning, whose place is high among English poets, is marked by overwrought emotionalism, rather natural to a woman. Dante Gabriel Rossetti in not only successful as a ballad writer but ranks with the greatest sonnet writers. But his sonnets were inspired by a woman whom he loved passionately. Every gracious thought of her---all the hopes, fears, anxieties they experienced in common, is revealed in his sonnets. These, therefore, do not rise above the pedestal of material, sensuous beauty.

Let us look at the progress of poetry in English Literature. What do we notice? Poets who lived in the world of idealism; poets to whom Beauty appeared as a symbol of loveliness that is infinite; poets who were inspired by initial impulses of eternal, ineffaceable and mystic love; poets whose pure emotions glorified the external world; and poets who, under the stress of such conceptions, produced poetry, at once dignified and sublime---are really a few in number. In short throughout the whole course of English Literature, from Chaucer down to Wordsworth, seldom has ideal Beauty, and mystic Love aroused in the poets, moods which draw from "visible things an intuition of things not seen." Has the story of Dante's mystic love for Beatrice become old? Has it exhausted its tender interest? Will it not continue to move humanity in this age of oppressive materialism? The sonnets of Nawab Nizamat Jung beckon us, stragglers as we are, and remind us that idealistic mysticism is not dead.

Ah, Love, I know that to my love thou art,
And must be, in this life, a dream,--- a name!
But be it joy or grief, or praise or blame,
I give thee all the worship of my heart.

The next epoch of literature, the age of Dryden, though. admirable in many ways, was the age of prose. The literature of this period was intellectual rather than imaginative and emotional. Again, in the Augustan age, poetry was an imitation of ancient models. This principle was reiterated by Pope himself:

> "Learn hence for ancient rules a just esteem
> To copy Nature is to copy them."

It is vain to find in the literature of this age any indication of high imagination or of subtle fancy. Nowhere the writings of classical school are characterized by a sense of mystery, sense of Romance, depth of feeling and above all greatness of impulses. If we turn to the age Age of Johnson, we find it obviously an age of transition. On the one hand poetry began to deal with nature and mystic life, with the growth of the sense of picturesque and on the other hand a tendency apparently at work was the strain of Romanticism. The former tendency led to the development of Naturalism. Several writers of this age, as Blake, Thomson, Collins, Gray, Cowper, Crabbe, are important to us, in as much as each of them, in some form or other, contributed to the movement. The age of Wordsworth was a triumph of Romanticism accompanied by that of Naturalism. Another aspect of this is to be discerned in the French Revolution. The intellectual phase of the Revolution affected Shelley, while its military phase appealed to Byron and its sentimental and political phase caught the imagination of Wordsworth and Coleridge:

> "Bliss was it, in that dawn to be alive
> But to be young was very heaven."

The excesses of the movement, the blood and fire across the English Channel, soon horrified Wordsworth and he recanted. But his best work, sonnets and other poems in the opinion of many, was accomlished in the days of his Revolutionary enthusiasm and inspired by the events of the Napoleonic period. "These sonnets to Liberty," Mr. Myers says, "are worthy of comparison with the noblest passages of patriotic verse or prose which all our history has inspired---the passages where Shakespeare brings his rays to poems on "this earth, this realm, this England,"---or where the dread of national dishonour has kindled Chatham to an iron glow,---or where Milton rises from the polemic into the prophet, and Burke from the partisan into the philosopher." He goes further and declares, "If a poet, by strong

IV

Nawab Nizamat Jung's sonnets, the subject of our present study, which belong to the Italian or Petrarchan type, are interesting reading. The spirit working behind these sonnets, as Mr. Charles Fraser says, is "ever striving to look beyond the ephemeral sorrows up to the Eternal Beauty---now hidden behind the veil, but some day to be revealed in all its splendour and completeness." From this standpoint, the achievement of the Nawab is indeed remarkable, especially as the sonnets combine feelings deeply felt with perfect expression.

The sonnet which owes its origin to the Italian genius has been the favourite vehicle of elevated thoughts and feelings. "When an emotion," to quote Mr. Fraser again, "or conviction is deep-seated and permanent, it becomes clarified, concentrated, and intensified under the stern discipline of compression within the arbitrary yet expressive limitations of a sonnet."

Shakespeare is the first conspicuous figure, after the sonnet had been introduced into England by the Earl of Surrey and Thomas Wyatt, in whose hands "they became," as Sir Walter Raleigh says, "intensely personal in feeling and ran through many moods." Prof. Dowden remarks, "In the sonnets we recognize these things---that Shakespeare was capable of measureless devotion; that he was tenderly sensitive, sensitive above all to every diminution or alteration of that love his heart so eagerly craved; and that when wronged, although he suffered anguish, he transcended his private injury, and learned to forgive."

Milton, who was always successful in the fusion of the finest qualities of substance and perfect form, has composed sonnets, exquisite in poetic dignity. The opinion of Samuel Johnson about these sonnets stands in remarkable contrast to those of other critics. He disposes of them saying, "They deserve not any particular criticism: for the best, it can only be said that they are not bad." But Hallam writes, "These sonnets are indeed unequal; the expression is obscure; something too much of pedantic allusion interferes with the sentimental, nor am I reconciled to his frequent deviations from the best Italian structure." He, however, adds," Such blemishes are lost in the majestic simplicity, the holy calm that ennobles many of these short compositions."

opinion "deserves high commendation." But the other two artists, however, are completely ignored. It is the purpose of this essay to study, in the spirit of a humble student, one of these two poets.

III

Nawab Nizamat Jung, son of the late Nawab Rifa'at Yar Jung I, was born in Hyderabad on April 22, 1871. He was educated first under the paternal roof and later was sent to Madarsa-i-Aizza where at the early age of thirteen he appeared for the Matriculation Examination. He then joined the special class opened at the Nizam College where students intended to be sent to England were taught Latin by Mr. Hudson. The following year he came into personal contact with the sage Dr. Aghornath Chattopadhya who for a time superintended his private studies. In 1887 he was granted a European Scholarship by the Government of Hyderabad.

He joined Trinity College, Cambridge, in March 1888 and took his B. A. degree in Law in 1891. He also obtained the LL. B. degree of Cambridge. He returned to India in October 1891 and after spending ten months at home, went back to England in 1892 and was called to the Bar in 1895. While he was in London he worked in the chambers of a lawyer of note, with a view to gaining practical experience and qualifying himself for the judicial department of his own country. After his final return in 1896 he was enrolled as an advocate of the Madras High Court and later on in March 1897 he joined the service of the Hyderabad Government, and has ever since distinguished himself in diverse capacities---District Judge, Parbhani, Assistant Home Secretary (1897) Registrar, High Court (1898), Chief City Magistrate, (1899-1901), Under-Secretary, Legislative Council (1902-1907), High Court Judge (1907-1909), Home Secretary (1909-1910), High Court Judge (1910-1916), Chief Justice (1916-1918), Political Secretary (1918), and Political Member (1919 onward).

All through his official career, inspite of his multifarious preoccupations, he has never lost the company of the poetic Muse which inspired him at first while he was at Cambridge. He has composed sonnets some of which were published in London in 1918 and a large number of other poems and has also translated into English verse some poems of His Exalted Highness, himself a poet of distinguished rank in Urdu and Persian. These translations as well as a collection of his sonnets have also been separately issued.

II

The advent of the British rule in India has had far-reaching effects on the thought and life of the country. Owing to a combination of circumstances, the language of the rulers has assumed the role of the lingua franca of Indian intelligentzia. English in schools, English in government offices, English in firms and factories, English on political platforms, English in hotels and restaurants, English has so powerfully influenced the minds of the people that a few among them inclined to poetic experience have tried to lisp in English numbers; so much so that a fairly large quantity of literature has been produced which may go under the name of Anglo-Indian poetry.

Sir William Jones and John Leyden, two distinguished Orientalists, were the pioneers. Henry Derozio, styled as the "National Bard of India," won great distinction by his writings. Captain David Lester, Meredith Parker, and Horace Hayman Wilson should also be remembered for composing poems on Indian themes. Rudyard Kipling and Edwin Arnold are really poets of a very high order and their rank in Anglo-Indian poetry remains undisputed. Sir Alfred Lyall, Mrs. Violet Nicholson and Mayor Yeldham are also to be remembered. Prof. Webb commands our attention for the delightful volume of verse entitled Indian lyrics. R. C. Caldwell's *Chutney Lyrics* and W. Waterfield's *Indian Ballads* are works of buoyant humour and considerable Indian interest. Griffith, Miss Mary Leslie, H. G. Keene may also be included in the list.

Toru Dutt, Michael Dutt, the talented Anglo-Indians, who were the products of Christian influence, baffled even the mighty Western masters. It is here that the Indian affords a singular example of intellectual capacity. The names of the two gifted Ghosh brothers, the late Mr. Manmohan Ghosh and Aurobindo Ghosh cannot but be mentioned. Rabindranath Tagore, though primarily a poet in Bengali, is given by the present generation a high place among English poets owing to his command over the poetic vocabulary of English.

Mr. P. Seshadri, in a paper on Anglo-Indian Poetry, so comprehensive in its scope as to include nonentities, has made a strange omission of the two living poets of Hyderabad, Nawab Nizamat Jung and Harindranath Chattopadhya, whose writings equal those of the other poets expressing themselves in English verse. No doubt, the learned professor in his valuable review, has done justice to Mrs. Sarojini Naidu, "the lyric sweetness of whose verse," in his

ANGLO-INDIAN POETRY IN HYDERABAD

1. NAWAB NIZAMAT JUNG

(a) SONNETS

"THE English language," says a critic in a recent review in the *Athenaeum*, "in its passage through the popular and mixed imagination of America is losing its abstract and rhetorical accumulations and becoming an objective language once more." What would the attitude of this critic be, if he were to examine the kind of verse produced by our Indian poets? According to his standard of judgment, Anglo-Indian Poetry would naturally appear devoid of rich investiture and also lacking all those imaginative and emotional qualities that are the essential attributes of great poetry. But "Poetry," as the late Mr. Myers has so beautifully enunciated, "like all arts, is essentially 'a mystery'. Its charm depends upon qualities which we can neither define accurately, nor reduce to rule, nor create again at pleasure." If a critic is sympathetic enough to enter into the thoughts and feelings of our Indian poets, as manifested in their poetry, he will not fail to find in them charm and beauty. The labourer is worthy of his hire. The untiring industry of our poets who have given vent to their innermost feelings and devoted years to the production of a literature foreign to their national genius, must needs be accorded adequate recognition.

In every age there have been writers who have attempted to give expression to their emotions in a language other than their own. The literary compositions of Milton, Addison, Johnson, Rossetti, who wrote in Latin or French or Italian, indicate the command they acquired over foreign languages. A great number of Persians have left voluminous works in Arabic which in their very exquisiteness are worthy of being compared with the most perfect productions of Arabian poets. In India it is astonishing to find that the works of Fayzi, Amir Khusraw, Hasan Dihlavi and Ghalib, rival those of great masters like Hafiz and Urfi.

Few were its wants, and soon supplied.
Life's nobler cares unknown,
The heart's aspiring hopes denied,
The spirit's anguished moan
For visions vanished---these were not
The joy, the sorrow of its lot,
That nameless human bone!

God gave it with the need to live
Hope that from patience springs,
And faith, the boon His breath can give
To peasants as to kings.
With these it walked through life to death;
Gave back to heaven its borrowed breath
Upborne on Mercy's wings.

And back to Nature's hand it gave
The gift by Nature given,
Unheeded, unremembered, save
By God of earth and heaven.
Its tomb is now the Eternal Mind,
Though its frail atoms unconfined
On the four winds are driven!

The voiceless yearnings of the breast
Have reached their home on high,
The restless human heart at rest.
Let their last relic lie
Where the freed spirit rides the air
Blent with the glancing sunbeams fair,
Beneath its native sky!

NIZAMAT JUNG.

Beyond the moated way.
But soon we paused! Was it a stone,
Was it a bleaching human bone,
Across our path that lay?

"A femoral bone!" my friend exclaimed,
Who knew it at first sight,
And lifted up the thing he named
With somewhat of delight.
He was a doctor, and his heart
Made callous by long-practised art,
Felt not its piteous plight.

But oh! to me that human bone
With human soul was rife,
Fraught with the spell of the unknown,
The mystery of life!
I saw it robed in human form
Tingling with strength, with life-blood warm,
And stirred by passion's strife.

I saw it in its rustic home,
Growing from child to man:
Saw it a sturdy peasant roam
Through life's allotted span,
Taking with life its heritage ---
The storms of youth, the calm of age,
Life's blessings and its ban.

A fleshless bone! Yet once it trod
Mid scenes so sadly fair,
With buoyant tread the earth of God
And drank the joyous air,
And from the earth and from the Sun,
By dint of cheerful labour, won
The life that was its share.

And in that life were joy and grief
And love and hope and fear,
The transient charm, alas too brief,
Of all that life holds dear---
The soothing love of wife and child,
By which the heart is reconciled
To fate, however drear.

A COUNTRY WALK *

Grey skies above, green fields around,
Soft breezes, shine and shower ;
Beneath our roving feet the ground
Pulsing with new-born power ;
It was the season when the earth
Rejoicing waits the promised birth
Of corn and fruit and flower.

Such was the scene that Nature's hand
With bounteous care had spread
Where idly o'er the teeming land
We roamed, by fancy led ;
By thorn-fenced field, by peasant's cot,
By crumbling towers, by many a spot
Stone-marked, where sleep the dead.

We reached a hamlet poor and mean :
In sad repose it lay.
A watch-tower rose above the scene
And frowned in ruin grey :
While ancient, age-gnarl'd tamarind trees
Slow-nodding whispered to the breeze
Tales of a bygone day.

Though glad the earth with life renewed
And Nature's feast begun,
Though glad the toiler's heart imbued
With hope from Nature won,
Yet those old trees and that grey tower
Seemed to bemoan departed power
And days of gladness done.

We passed them by and wandered on,
Allured by scenes more gay,
Where dimly bright the sunbeams shone

* This is one of the latest poems composed by Nawab Nizamat Jung Bahadur and is written in a style not often used by him before

TO LET

EDUCATIONAL

AND

LITERARY

ADVERTISEMENTS ONLY.

Apply to the MANAGER,
Osmania Magazine.

CONTENTS

		Page
1.	A Country Walk .. .. NAWAB NIZAMAT JUNG BAHADUR	71
2.	Anglo-Indian Poetry in Hyderabad .. .. ABDUL-JALIL, Editor	74
3.	The Genius of Ghalib .. .. K. A. HAKIM, M.A. Ph. D.	85
4.	The Old Lion .. .. E. E. SPEIGHT	92
5.	Qasida as a Piece of Art .. .. ABDUL QAYYUM, B.A. (Osmania)	93
6.	The Work For Our Youth .. .. MIRZA ALI YAR KHAN, B.A. (Oxon)	100
7.	Freaks of Bernard Shaw .. .. ITRAT HUSAYN, (IV) year	105
8.	Realism and Humour in Music .. .. .. LELAND-J. BERRY	114
9.	"Death" and "Life" .. .. NASEER-UD-DIN KHAN, M.A. (Edin.)	116
10.	Muraqqa-i-Chughtai .. .. E. E. SPEIGHT, B.A., (London)	117
11.	The Electronic Theory of Matter .. .. .. MUHAMMAD SIDDIQ (IV) year	119
12.	Pivot of Humanity .. .. HAMIDUZ-ZAFAR, (IV) year	128
13.	The Real Poems .. .. E. E. SPEIGHT	128
14.	Inter-communal Harmony and Indian Universities .. .. S. ABDUL LATIF, B.A., Ph. D.	129

مجلۂ عثمانیہ

جلد دوم شمارۂ سوم و چہارم بہمن و اردی بہشت ۱۳۳۸ف

مجلس نگرانی

محمد عبدالرحمن خاں صدر کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

اے، آر، ای، ایس، بی، ایس، سی (لندن) فیلو آف دی رائل اسٹرونامکل سوسائٹی (لندن)

محمد نظام الدین مولوی فاضل، بی، اے (آکسن) ای، ای، اسمیٹ بی، اے (لندن)

پروفیسر فارسی و رفیق جامعۂ عثمانیہ — پروفیسر انگریزی کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

مدیرین

محمد جلال الدین اشک مدیر حصۂ اردو — محمد عبدالجلیل مدیر حصۂ انگریزی

منتظم اعزازی مجلۂ عثمانیہ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اطلاع

طلبۂ کلیہ جامعہ عثمانیہ کا یہ سہ ماہی علمی رسالہ حسب ذیل مہینوں کے آخری ہفتوں میں شائع ہوا کریگا۔

امرداد (جون) آبان (ستمبر) بہمن (ڈسمبر) اردی بہشت (مارچ)

سال تعلیمی اور مجلہ کا سال ایک ہوگا۔

۱۔ رسالہ انگریزی اور اردو دو حصوں پر مشتمل ہوگا۔ حصۂ اردو کیلئے تقریباً ۸ جزو اور حصۂ انگریزی کیلئے تقریباً ۴ جزو مختص کئے جائینگے۔ رسالہ کا سالانہ حجم کم از کم ۸۰۰ صفحات ہوگا۔

۳۔ مجلس نگرانی اشاعت کے متعلق ردّو بدل کی مجاز ہوگی۔

مضامین کا انتخاب مجلس ادارت کریگی۔

۴۔ تمام مضامین نظم و نثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔

۵۔ خریداری اور دیگر امور کیلئے اعزازی منتظم رسالہ سے دفتر کے پتہ پر خط و کتابت کیجائے۔

۶۔ چندہ کی تمام رقمیں اعزازی خازن مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں۔

چندہ

۱۔ سرکار آصفیہ و برطانیہ سے سالانہ پیشگی ۵۔ طلبۂ کلیۂ جامعہ عثمانیہ سے لکھ سالانہ پیشگی

۲۔ ارباب جامعہ، اصحاب اقتدار اور ادارو سے ۶۔ ممالک بیرون ہند سے ۱۵ شلنگ

۳۔ عام خریداروں سے ۷۔ بلاد یورپ کے طلبۂ قدیم سے ۱۰

۴۔ طلبۂ قدیم رفاہیہ انجمنوں اور مطالعہ خانوں سے ۸۔ فی رسالہ عا

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہونگے۔ بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی۔

(۱) بذریعہ رجسٹری عہ کلدار۔ (۲) بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کے وی پی کے اخراجات ۴ کلدار ۸ سکہ عثمانیہ (۳) بذریعہ بک پوسٹ ۹ کلدار۔ ۸ سکہ

مجلۂ عثمانیہ

فہرستِ مضامین حصۂ اردو جلد دوم شمارہ سوم و چہارم

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۔	صوتیات	از مولوی سید سجاد صاحب پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ	۱
۲۔	پراسرار محرابیں	از مولوی شبیر حسین خاں صاحب جوشؔ ملیح آبادی ناظر دبی دارالترجمہ	۷
۳۔	ذاتِ باری تصوری نقطۂ نظر سے (بہ سلسلۂ گذشتہ)	جناب مہر الدین صاحب بی۔اے۔ال۔بی (عثمانیہ)	۹
۴۔	غزل (فارسی)	از عالیجناب نواب ضیاء یار جنگ بہادر	۱۸
۵۔	حالی۔ انکی شاعری کی پیدائش خصوصیات وغیرہ	از مولوی محمد عبدالقادر صاحب سروری ام۔اے (عثمانیہ) مددگار پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ	۱۹
۶۔	شہر گوہرین (نظم) ترجمہ نظم مسز سروجنی نائڈو	از جناب محمد حبیب اللہ صاحب رشدی ام۔اے (عثمانیہ)	۳۳
۷۔	انسان اور توانائی	از جناب ابوالمکارم فیض محمد صاحب صدیقی متعلم ام۔ایس۔سی کلاس	۳۴
۸۔	آوازِ چمن (نظم)	از جناب محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی ام۔اے (عثمانیہ)	۵۲
۹۔	بھو بھوتی	از جناب لہونا تھراؤ صاحب بھوساری ام۔اے۔ال۔ال۔بی (عثمانیہ)	۵۴
۱۰۔	راج کماری	از جناب ابوالمکارم محمد بدرالدین صاحب متعلم ام۔بی۔بی۔ایس۔سی متعلم کلیہ جامعہ عثمانیہ	۶۳

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۱۔	آٹھویں صدی ہجری میں مصر شام کی ڈاک کا انتظام	از جناب حمید اللہ صاحب متعلم ام۔اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ)	۶۵
۱۲۔	فطرت اور زندگی (نظم)	از محمد جلال الدین اشک مدیر	۷۶
۱۳۔	اردو نثر اور عظمت اللہ خان مرحوم	از جناب سید وزیر حسن صاحب	،،
۱۴۔	قبرستان (نظم)	از جناب مسعود حسن صاحب ذوقی متعلم ال ال۔ بی (عثمانیہ)	۹۴
۱۵۔	مسجد (ایک تاریخی حسن کارانہ مطالعہ)	از جناب سید محمد اکبر صاحب وفا قانی بی اے (عثمانیہ)	۹۶
۱۶۔	واہ رے میں (رباعیات)	از مولوی سید احمد حسین صاحب امجد حیدر آبادی	۱۲۵
۱۷۔	ایرانی ادب فتح اسلام سے پہلے	ملخص ترجمہ از جناب سید محمد صاحب ام۔اے (عثمانیہ) اڈگار لکچرار ٹی کالج	۱۲۶
۱۸۔	نوائے فطرت (نظم)	از جناب محمد بدر الدین صاحب شکیب بی اے سابق متعلم کلیہ	۱۳۷
۱۹۔	غالب کی فارسی غزلیں	از جناب محمد عبد القیوم خانصاحب باقی ام۔اے (عثمانیہ)	۱۳۹
۲۰۔	اوستا	ملخص ترجمہ از محمد جلال الدین اشک مدیر	۱۶۱
۲۱۔	پر عظمت شاعری	ترجمہ از جناب معین الدین صاحب فرتشی ام۔اے (عثمانیہ)	۱۷۱
۲۲۔	تبصرہ پیام مشرق مصنفہ ڈاکٹر محمد اقبال	ترجمہ۔ از جناب محمد حبیب اللہ صاحب رشدی ام۔اے (عثمانیہ)	۱۸۱
۲۳۔	محروم خواب (افسانہ)	از جناب محمد ظہیر الدین احمد صاحب ام۔اے، ایچ سی۔ایس سابق متعلم کلیہ	۱۹۹
۲۴۔	نقش شباب (افسانہ)	ترجمہ۔ از قاضی آرام صاحب۔ سابق متعلم کلیہ	۲۰۷
۲۵۔	کلیہ کی خبریں	از محمد جلال الدین۔ اشک مدیر	۲۱۶

پُر اسرار محرابیں

از جناب شبیر حسن نصا صاحب جوشؔ ملیح آبادی ناظر ادبی دارالترجمہ

ہو رہا ہے ہر نفس کیوں اس بلا کا اختلاج
یہ تخیل مجھ کو کس عالم میں لے آیا ہے آج

کس قدر اسرار سے معمور ہے یہ سرزمیں
اک ادائے دلنشیں کے ساتھ ہیبت آفریں!

یاسمن کے برج میں شبنم کے ایوان و قصور
موتیے کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے دور دور

منجمد کرنوں کی محرابیں، قطار اندر قطار
جن پہ ہلکی سی شفق کے پردہ ہائے زرنگار

موتیوں کو گوندھ کر لکھے گئے ہیں جن پہ نام
"نیرنگی کا ہے یہ مسکن یہ تخلّی کا مقام"

جائیے جس سمت، پردوں پر نیا القاب ہے
یہ ہے غم کی، یہ خوشی کے راز کی محراب ہے

اک فرشتہ، میرے دل پر عکس دوڑاتا ہوا
پھر رہا ہے لوحِ جیں محرابوں کی دکھلاتا ہوا

"یہ حقیقت شادمانی کی ہے، یہ آلام کی
یہ حقیقت صبحِ جاں پرور کی ہے یہ شام کی

یہ نکاتِ حسنِ شیریں، یہ رموزِ کوہکن
یہ حقیقت ہے شمیمِ گل کی، یہ رازِ چمن"

اے خدا! لیکن اس آگاہی میں ہیئت کیا صفات — دلفریبی سے ہوی جاتی ہے عاری کائنات!
اڑتا جاتا ہے برابر رنگ موجودات کا — جتنا جتنا پڑ رہا ہے عکس معلومات کا
منکشف جس وقت ہوجاتا ہے ربط جزو کل — روح فرسا خار میں تبدیل ہوجاتا ہے گل!
عقل پا لیتی ہے جس شے کی حقیقت کا سراغ — دل میں ہوجاتا ہے گل اسکی لطافت کا چراغ!
جہل کے پھولوں کو اے بوئے بہار جھانے نہ دے — آدمی کو بارگاہِ علم میں جانے نہ دے!!

ذاتِ باری تصوّری نقطۂ نظر سے

(بسلسلۂ گذشتہ)

جناب میر حسن الدین صاحب بی۔ اے، ال ال۔ بی۔ (عثمانیہ)

مظاہرِ عالم میں غیر متغیر مرور کی جو صورتیں نظر آتی ہیں وہ اون صورتوں سے بالکل مختلف ہیں جن میں حقیقۃً لزومی رابطہ پایا جاتا ہے۔ اس بات کا تیقن حاصل کرنے کے لئے کہ دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں ہم کو اس قسم کی ہزارہا مثالوں پر غور کرنے کی ضرورت نہیں اور اس نتیجہ کے استنباط میں ہم کو یکسانیت فطرت کے کسی عام قانون کا حوالہ درکار ہے۔ ہم بس یہی دیکھتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں لہذا ہمیشہ چار ہی ہوں گے۔ جے۔ ایس مل کہتا ہے کہ یہ خیال کرنے میں کوئی دشواری نہیں کہ عالم ثوابت میں دو اور دو پانچ ہوسکتے ہیں لیکن کوئی شخص اس کو یقین نہیں کرسکتا۔ اس عالم ثوابت کا کوئی سیاح خواہ وہ کتنی ہی اچھی سیرت کا پادری ہو یا بلعیات کا قابل پروفیسر جب وہ ایسی متناقص شہادت پیش کرے تو لمحہ بھر کیلئے بھی اس واقعہ کی صداقت کو نہیں مان سکتے۔ یہ خیال میں آ ہی نہیں سکتا کہ دو اور دو پانچ ہوسکتے ہیں ہم تو بس یہی کہتے ہیں کہ دو اور دو چار ہونے چاہئیں۔ لیکن خارجی مظاہر کے مرور کی صورت خواہ وہ کتنی ہی غیر متغیر ہو اس سے بالکل مختلف ہے۔ جس حد تک ہمارے پیش نظر صرف طبعی مظاہر ہیں ہم کو ان میں مرور کے سوا کوئی لازمی شئی نظر نہیں آتی۔ لزومی رابطہ کے مفہوم میں ہم کو علیت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

تو کیا ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ کوئی ایسی شئی موجود ہی نہیں ہے جس کو علیت کہتے ہیں۔ مرور اور علیت کے مابین امتیاز کرنا یا یہ کہنا کہ طبعی مظاہر میں ربط علیت کا پتہ نہیں چلتا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہمارے

ذہن میں علیت کا ضرور کوئی تصور موجود ہے۔ حقیقی علیت کا ہمارے پاس خواہ کتنا ہی ناقص تصور ہو پھر بھی ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ کوئی شئی بغیر علیت کے وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔

ہم یہ مان سکتے ہیں کہ ایک حادثہ کے بعد ایک خاص حادثہ ہزارہا مرتبہ وقوع میں آچکا ہے لیکن آئندہ موقع پر اس کے برخلاف اس حادثہ کے بعد دوسرا حادثہ وقوع پذیر ہو سکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ اس قانون کا استثنا بھی ہے اور اس تغیر کی کوئی علت نہیں بالکل بے معنی ہے۔ اچھا اب اس بات پر ایک اور طریقہ سے غور کرو اگر بغیر تناقص کے یہ بات ممکن ہے تو فرض کرو کہ عالم خالی ہے، اور یہ خیال کرو کہ کسی زمانہ میں بھی کوئی چیز موجود ہی نہ تھی، نہ نفس متفکرہ مادہ، اور نہ وہ پراسرار ہستی جو نفس اور مادہ دونوں سے مختلف ہے۔ یعنے کوئی شخص موجود تھا نہ کوئی شئے۔ کیا تمھارے لئے عقلی طور پر ان شرائط کے تحت یہ خیال کرنا ممکن ہے کہ کوئی شئی وجود میں آسکتی ہے؟۔ کیا تم ایک لمحہ کے لئے بھی اس امکان کو تسلیم کر سکو گے کہ عدم محض کے بے شمار ادوار گزرنے کے بعد یکایک روشنی کی جھلک پیدا ہو جائے یا کوئی حیوان وجود میں آجائے؟ یقیناً وہ لوگ جنہیں حضوری علم (a priori) میں شک ہے یا وہ لوگ جو اپنے تخیلات کو تجربہ کے حدود سے آگے لیجانا پسند نہیں کرتے یہ جواب دینگے کہ "نہیں! یہ بات ہمیشہ کے لئے ناممکن ہے"۔ ہر حادثہ کے لئے ضرور کوئی علت ہونی چاہئے۔

اب ہمارے لئے یہ کہنا ممکن ہے کہ ہمارے ذہن میں علیت کا ایک مجرد تصور یا مقولہ (Category) موجود ہے، پھر بھی ہمارے تجربہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اسکا مظروف (Content) بن سکے تاکہ ہم یہ کہہ سکیں کہ ہر حادثہ کی علت ہوتی ہے لیکن ہم یہ نہیں جان سکتے کہ وہ علت کیا ہے۔ ایسا خیال تناقص سے بری نہیں ہو سکتا لیکن یہ ہے بھی بہت دقت طلب۔ فطرت ہم کو عام طور پر مقولات فکر (categones of though) عطا نہیں کرتی اور نہ ان کو استعمال کرنے کی قوت یا موقع دیتی ہے۔ یہ کہنا اس بات کے مساوی ہوگا کہ ہم کو عدد کا ایک تصور ودیعت کیا گیا ہے لیکن ہم اپنے تجربہ میں قابل شمار اشیاء نہیں پاتے یعنے ہم میں ایک، دو، تین، چار وغیرہ کا تصور تو ہے لیکن شمار کرنیکی ہم میں قابلیت نہیں ہے۔ فطرت ہم کو پہلے ایسے مقولات فکر عطا کرے، جنکی تحدید واضح طور پر ہو چکی ہو بعد میں ایسا مواد فراہم نہیں کرتی جس پر ہم ان مقولات کو

منطبق کرسکیں۔ ہم ان مجرد مقولات کو اوس وقت منکشف کرتے ہیں جبکہ ہم فکر کرتے وقت واقعاً ان کو استعمال کرتے ہیں۔ ہم عدد کا مجرد تصور حاصل کرنے سے پہلے انسان، حیوان، اور اشیا، کو شمار کر چکتے ہیں۔ ہم کو اگر اپنے تجربہ کے دوران میں کبھی اصلی علّت سے سابقہ نہ پڑا ہوتا تو یہ معلوم کرنا بہت دشوار ہوتا کہ علّت کا تصوّر ہمارے ذہن میں کیسے آسکتا تھا۔ خارجی حوادث کے مرور سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو ہم کو اپنے تجربہ میں علّت کی تلاش کہاں کرنی چاہئے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ باطن میں اسکی تلاش کرنی چاہئے۔ ہم کو اپنے ارادہ میں ایک ایسی شئی ملسکتی ہے جو ربط علیت کے تصور کا جواب ہے۔ ہم کو اوس شعور پر غور کرنا چاہئے جو اعضا، کی حرکت سے پیدا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بحث کرنا ممکن ہے کہ علیت کو استعمال کرنیکا تجربہ محض ایک التباس ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اپنے ہاتھ کو حرکت دیسکتے ہیں لیکن بعض وقت فالج یا کسی اور وجہ سے ہاتھ کو حرکت نہیں ہوتی خواہ ہم حرکت دینے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اعصاب کے سکڑنے کو ہم قوت کا استعمال کہتے ہیں۔ لیکن ہم اس قوت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے افکار و خیالات کے مرور کا رُخ بدل دیتی ہے۔ مثلاً مجھ کو براہ راست یہ شعور ہے کہ میں علت پر جو غور کر رہا ہوں اوسکی وجہ یہ ہے کہ میرے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ اس موضوع پر کچھ تحریر کروں۔ میرے ذہن میں تحریر کرتے وقت تصورات کا جو مرور ہو رہا ہے اوسکی توجیہ صرف کسی مقصد کے حوالے سے ہوسکتی ہے۔ افکار کے اس ارادی مرور میں میں علیت کو براہ راست استعمال کر رہا ہوں اور یہ علیت عالم طبعی میں حوادث و واقعات کی ترتیب پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ میرے قلم میں جو حرکت ہو رہی ہے وہ اس کوشش کا نتیجہ ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اس قسم کی کوششیں چند طبعی شرائط کو مفروض ہوتی ہیں جو میرے اختیار سے بالکل باہر ہوتی ہیں۔ عالم خارجی میں اس طرح جو تغیرات پیدا ہوتے ہیں اوسکی میں علت تو ہوں لیکن میں تنہا علت نہیں۔ میں ایسی علت نہیں ہوں جسکی کوئی علت نہ ہو۔ میرا ارادہ ہی اگرچہ وہ اس حادثہ کی تنہا علت نہیں لیکن مجھ میں علت کا تصوّر پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔

ہم کو اپنے ارادہ کا براہ راست جو شعور ہوتا ہے اوسکی یہ توجیہ کرنیکی کوشش کیگئی تھی کہ یہ اپنے ہی ذہنی تجربوں کے مرور کے سوا کسی اور شئی کا علم نہیں ہے۔ ہیوم کا نقطۂ نظر بھی یہی تھا۔ یہ بحث کیجاسکتی ہے کہ

مجھ کو پہلے تحریر کا خیال آتا ہے اور بعد میں خیالات کو ادا کرنے کے لئے قلم میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے ایک خیال دوسرے خیال کی علت ہے۔ لیکن ہم اپنے باطنی تجربوں کے متعلق بھی یہ فرض نہیں کرسکتے کہ مرور علیت کو مستلزم ہے۔ فرض کرو کہ دوران تحریر میں میرے کسی عضو میں یکایک درد پیدا ہوجائے۔ یہ درد میرے تجربات کے مرور میں شامل تو رہیگا لیکن اس جدید تجربہ میں اور اس کے ماقبل تجربہ میں کوئی باطنی رابطہ محسوس نہیں ہوتا۔ مجھ کو اسوقت (درد کی حالت میں) انفعالیت (Passivity) کا اتنا ہی واضح شعور ہے جتنا کہ تحریر کے وقت فعلیت کا شعور تھا۔ اگر فعلیت یا ارادہ کو استعمال کرنے کا شعور محض ایک التباس ہے تو یہ التباس اس دوسری صورت میں بھی کیوں پیدا نہیں ہوتا لہذا یہ لازم آتا ہے کہ فعلیت (Activity) کے شعور میں ہم کو براہ راست علیت کا تجربہ ہوتا ہے۔ اگر علیت کی یہ تعبیر کیجائے کہ یہ محض ایک لزومی رابطہ ہے جیسا کہ دو اور دو چار میں ہندسی یا مقدمات قیاس اور اوسکے نتیجہ میں منطقی رابطہ ہوتا ہے تو علیت کی یہ تعبیر کلیتہً غلط ہوگی۔ علیت کی ماہیت لزومی رابطہ نہیں بلکہ فعلیت ہے ایسی فعلیت کا علم ہم کو بجز اپنے ارادہ کے تجربہ کے اور کہیں نہیں ہوتا۔

ابتدائی انسان کے پاس یہ نسبت فطرت کا کوئی تخیل ہی نہ تھا۔ مہذب انسان ہی نے اسکو بتدریج منکشف کیا ہے۔ لیکن ابتدائی انسان قانون علیت میں ایک لمحہ کیلئے بھی شک نہیں کرتا تھا۔ اوس کو یہ مطلقاً شک نہیں تھا کہ ہر تغیر کی بالکم از کم ایسے تغیر کی جو اوس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے۔ ہر حرکت کرنیوالی شئی کو وہ ذی حیات سمجھتا تھا یا یہ خیال کرتا تھا کہ وہ اپنی جیسی کسی ذی حیات ہستی کے زیر اثر ہے۔ اگر سمندر میں تلاطم ہوتا تو وہ خیال کرتا کہ سمندر کا دیوتا حالت غضب میں ہے۔ اگر آج بارش نہ ہوتی جیسا کہ کل ہوئی تھی تو اوسکی وجہ ابر کے دیوتا کی نامہربانی تھی۔ اوسکے لئے کل کائنات ارواح سے معمور تھی۔

مہذب اور تعلیم یافتہ انسان کے لئے وحدت فطرت، یعنے فطرت کی مختلف قوتوں کے باہمی تعلق کے تجربہ نے اس نقطۂ نظر کو ناممکن بنا دیا ہے۔ ابتدائی انسان یہ استدلال کرنے میں حق بہ جانب تھا کہ جہاں کہیں حرکت ہے وہاں اپنی ہی جیسی کوئی ذی شعور ہستی موجود ہے۔ لیکن سائنس ہماری رہبری اس یقین کی طرف کرتی ہے کہ ایک مظہر کی جو علت ہے وہی کل مظاہر کی بھی علت ہے۔ مظاہر میں جو باہمی علاقہ یا باضابطگی اور ترتیب نظر آتی ہے وہ

محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہو سکتی ہے اور نہ چند آزاد و مستقل عوامل (Agencies) کے بے مقصد و بے ارادہ اتفاق و اتحاد کا۔ ہم آگے بڑھکر یہ استدلال بھی کر سکتے ہیں کہ یہ علت واحد اُن حوادث کی بھی انتہائی علت ہے جو براہ راست ہمارے ارادہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس سوال کو تھوڑی دیر کیلئے نظر انداز کر دینا چاہئے۔ کم از کم فطرت خارجی کے حوادث و مظاہر کے لئے ایک علت کا ہونا لازمی ہے اگر وہ علت جس کا ہم کو علم ہے ایک ذی شعور ناطق ہستی ہے تو ہم کو یہ یقین کرنے کے لئے ایک دلیل ہاتھ آجاتی ہے کہ وہ انتہائی حقیقت جس سے کل حقائق ماخوذ ہیں، ایک نفس ہے۔ یعنے ایک ایسا ذی شعور نفس ہے جس کو ہم نہ صرف فکر یا عقل بلکہ ارادہ سے بھی متصف کر سکتے ہیں۔

اس نتیجہ کی تائید میں ہم ایک اور خیال کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا نہ صرف کائنات پر فکر کرتا ہے بلکہ کائنات خدا کے ارادہ پر مبنی بھی ہے۔ فکر کو بے ارادہ کہنا گویا ایسی شئی پر بحث کرنا ہے جس سے ہم مطلقہً لاعلم ہیں۔ ہم کو اپنے شعوری تجربوں میں ہمیشہ شعور کے تین پہلو فکر، حس اور ارادہ کا علم ہوتا ہے۔ حیوانی ذہن میں اسی کے مماثل شعور کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ بہر حال نمو یافتہ شعور انسانی میں کوئی شئی ایسی نہیں ملتی جس میں فکر ہو مگر ارادہ نہ ہو۔ فکر توجہ کو مستلزم ہے اور توجہ کرنا گویا ارادہ کرنا ہے۔ ہیگل اور کانٹ کے بعد کے تصورین نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ ہماری رہنمائی اس خیال کی طرف کرتے ہیں کہ انتہائی حقیقت نفس یا روح ہے۔ اسطرح قدرتی طور پر بذریعہ تمثیل یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ اسمیں فکر کے ساتھ ساتھ ارادہ بھی موجود ہے۔ اسکے برعکس شوپن ہور اور ہارٹ مین کا یہ خیال ہے کہ فطرت میں غایت و مقصد کے جو علامات پائے جاتے ہیں وہ اس نقطۂ نظر کی طرف لیجاتے ہیں کہ فطرت کسی شئی کے حصول کی کوشش کر رہی ہے اور یہ کہ انتہائی حقیقت ارادہ ہے۔ لیکن ہم اپنے شعور کی تمثیل سے اس خیال میں یہ ترمیم کر سکتے ہیں کہ ارادہ بغیر عقل یا فکر کے ناقابل فہم اور ایک بے معنے تجرید ہے جسطرح شوپن ہور کا یہ خیال بے معنے ہے کہ حقیقت بے ارادہ ہے اسیطرح ہیگل کا خیال بھی ناقابل فہم ہے کہ حقیقت بے ارادہ عقل ہے۔ شوپن ہور اور ہیگل دونوں کے بیانات میں جزوی صداقت مضمر ہے۔ خدا بے ارادہ عقل یا بے عقل ارادہ نہیں بلکہ دونوں ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ شعور انسانی کی یہ تین فعلیتیں خدا میں بھی اوسیطرح پائی جاتی ہیں اور وضاحت کے ساتھ

موجود ہیں جس طرح کہ انسان میں ہیں۔ ایک ایسی ہستی میں جس کا کوئی مادی جسم نہیں جس کی کیا حیثیت ہوتی ہے ہم کوئی واضح تصور قائم نہیں کرسکتے۔ ہماری فکر جو معروف سے مجہول کی طرف ناقص طور پر استدلال کرتی ہے وہ ایسی ہستی کی فکر سے بالکل مختلف ہے جس کیلئے کوئی شئے نامعلوم نہیں ہے۔ فکر ہمیشہ تعمیم پر مشتمل ہوتی ہے اور ادراک میں ہم کو واقعاً جو تجربہ ہوتا ہے اوس کا بہت سا حصہ تعمیم میں حذف ہوجاتا ہے۔ فکر محض ایک ناقص اعادہ ہے واقعی اور حسی تجربہ کا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا میں بھی ادراک اور کلی تصورات میں وہی امتیاز ہے جیسا کہ ہم میں ہے۔ خدا کی نسبت ہمارے کل تصورات ناقص ہیں۔ لیکن جب تک ہم یہ خیال نہ کریں کہ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس میں فکر، حس اور ارادہ تمام قیود سے آزاد ہے ہم خدا کے صحیح تصور تک نہیں پہنچ سکتے۔ جزوی اور ناقص علم میں ہم کو کیا دشواری ہوتی ہے؟ اچھا ذرا غور کرو کہ دوسروں کی سیرت کے متعلق ہم کیا جانتے ہیں؟ ہم اپنے ہی تجربوں کی تمثیل سے کچھ جان سکتے ہیں کہ دوسروں کے اذہان میں کیا گزر رہا ہے۔ پھر بھی دوسروں کے افکار، جذبات، ارادوں اور سیرتوں کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ بہت ہی ناقص و نامکمل ہے۔ یہ دشواری اور بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ وہ نفس جسکو ہم جاننا چاہتے ہیں ہم سے بہت ہی بالاوبرتر ہو۔ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو یہ بتلا سکتے ہیں کہ اگر ہم شکسپیر یا فلاطون ہوتے تو ہمارے احساسات کیا ہوتے۔ پھر بھی یہ کہنا بے معنے ہوگا کہ ہم اپنے ابنائے جنس کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں وہ نہ جاننے کے برابر ہے۔ ہم میں ہمدردی اور محبت پیدا کرنے کے لئے دوسروں کے متعلق اس قدر علم کافی ہے لیکن خدا کے متعلق ہمارا علم بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے۔

اس استدلال کو جو شعور کی تمثیل سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ خدا ارادہ ہے ریڈ، مارٹی نو جیسے فلاسفہ جو حقیقئین کہلاتے ہیں اور بارکلے و لوئرے جیسے تصورئین نے بھی استعمال کیا ہے۔ اگرچہ یہ استدلال تصوریت کو مفروض نہیں ہے لیکن میرے خیال میں اس کو بہ نسبت حقیقت کے زیادہ تر تصوریت سے مناسبت ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ایک بے جان اور بے حرکت مادہ بغیر نفس مدرک کے موجود ہے لیکن حرکت پیدا کرنے کے لئے ایک نفس کی ضرورت ہے تو گویا مادہ اور نفس میں ایک ایسے سخت امتیاز کو تسلیم کرنا ہے جس کو حکمت جدید توڑ دینا چاہتی ہے۔ ہمارے خیال میں جدید طبیعیئں ایسے بے جان مادہ کو

تسلیم نہیں کرتے جو جذب و دفع نہ کرسکے ۔ حکمت جدید کے نزدیک فعلیت خود مادہ کے مایۂ خمیر میں داخل ہے اگر مادہ بغیر نفس کے موجود رہ سکتا ہے تو یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ کسی خارجی نفس کے اثر کے بغیر حرکت یا عمل نہیں کرسکتا اسکے برعکس اگر ہم تصوریئین کی طرح یہ خیال کریں کہ مادہ کا بغیر نفس کے موجود رہنا ایک ناقابل فہم تجرید ہے تو ہم کو معلوم ہوجائیگا کہ قوت بھی ذہنی عمل ہی کی ایک صورت ہے ۔ اگر طبعی نقطۂ نظر سے یہ کہا جائے کہ مادہ اور قوت میں بالآخر کوئی امتیاز نہیں تو یہ خیال اس مابعد الطبعی نقطۂ نظر سے مطابقت رکھتا ہے کہ فکر اور ارادہ حیات ذہنی کے دو لاینفک پہلو ہیں ۔

ہم تھوڑی دیر کے لئے پھر تصوری استدلال کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر لوگوں کو اس خیال کے تسلیم کرنے میں دقت ہوگی کہ وہ عالم جس کا ہم کو علم ہے ہمارے یا کسی اور شخص کے شعور کی محض ایک کیفیت یا حالت ہے ۔ یہ بات اس قدر بدیہی ہے کہ جس عالم کا ہم کو تجربہ ہوتا ہے اس کو ہم پیدا نہیں کرتے وہ ہر وقت ہماری خواہشات اور میلانات کی مزاحمت کرتا ہے ۔ آپ کو اتنا تو یقین ہوگیا ہوگا کہ ہم کسی خارجی عالم کو بجز اون اثرات کے جو وہ ہمارے شعور میں پیدا کرتا ہے، نہیں جانتے ۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جو ان اثرات کو پیدا کرسکے ۔ یقیناً ہم کو عالم خارجی کے تجربہ میں ایک ایسی حقیقت سے سابقہ پڑتا ہے جو محض ہمارے شعور کی کیفیت یا حالت نہیں ہے ۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کو ہم پیدا نہیں کرتے بلکہ صرف منکشف کرتے ہیں ۔ اسی حقیقت سے وہ تمام احساسات ماخوذ ہیں جن کو ہم محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے یہاں تک تو آپ صحیح ہیں ۔ لیکن جب ایک حقیقی اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ اس میز کے مظاہر کی علت "کوئی شئی" ہونی چاہئے تو وہ فرض کرتا ہے کہ یہ "کوئی شئی" یا حقیقی میز اون مظاہر کے عقب میں پوشیدہ ہے جن کو ہم میز کے مظاہر سے تعبیر کرتے ہیں یا الفاظ دیگر جو مظاہر موجود فی المکان ہیں اون کے عقب میں یہ "کوئی شئی" پوشیدہ ہے ۔ ہم نے مکان کی جو تحلیل کی ہے اور اگر یہ استدلال صحیح ہے کہ مکان ذہنی علائق سے تشکیل پاتا ہے اور ذہنی علائق نفس مدرک سے باہر موجود نہیں ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ حقیقت جو ہمارے خارجی کے تجربہ کی علت ہے، خارج میں موجود ہے اور نہ موجود فی المکان ہے ۔ اگر مکان ہماری فکر کی یا کانٹ کی

زبان میں حسیت (Sensibility) کی ایک صورت ہے تو حقیقت موجود فی المکان نہیں ہو سکتی۔ جو حقیقت موجود فی المکان نہ ہو ہم اوس کو مادہ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ مادہ کا خواہ کچھ ہی مفہوم ہو وہ موجود فی المکان ضرور ہے ہم کو بجز نفس کے کسی ایسے وجود کا علم نہیں جو موجود فی المکان نہ ہو۔ یہ الفاظ دیگر صرف نفس ہی خارج از مکان ہے۔ ہم اس تصوری نقطۂ نظر کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے تجربوں کی علت ایک ایسی حقیقت ہے جس کو ہم نہ صرف عقل بلکہ ارادہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک مفکر جو فطریت کا علم بردار ہے، خواہ ہم اوس کو مادیہ نہ کہیں، بالآخر اسی خیال کو تسلیم کرتا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر اپنی "اجتماعیات" میں ایک جگہ کہتا ہے کہ "باطنی تحلیل ہم کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ اشیاء کے مظاہر کی ہم جو تاویلات کرتے ہیں وہ ہمارے ہی احساسات و تصورات کی اصطلاحات میں ظاہر کیجاتی ہیں یعنے ایسے اجزا دیں اون کو ظاہر کیا جاتا ہے جن کا تعلق شعور سے ہوتا ہے اور جو کسی ماورائے شعور ہستی کے محض علائم ہیں۔ اگرچہ یہ تحلیل ہمارے ابتدائی معتقدات کو برقرار رکھتی ہے اور یہ ظاہر کرتی ہے کہ مظاہر کے ہر مجموعہ کے عقب میں ایک "لزومی علاقہ" ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو تغیر پذیر مظاہر میں مستقل و مستمر رہتی ہے۔ پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ حقیقت کا یہ "لزومی علاقہ" ہمارے شعور کی دسترس سے بالاتر ہے۔ جب ہم یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ وہ اعمال جن سے شعور کی تشکیل ہوتی ہے بالکل محدود ہونے کی وجہ سے اپنے اندر اون اعمال کو شامل نہیں کر سکتے جو حدود سے باہر ہیں اور اسی وجہ سے غیر شعوری نظر آتے ہیں، اگرچہ ان میں سے ایک کا دوسرے کو پیدا کرنا اس بات کو متلزم ہے کہ انکی ماہیت دراصل ایک ہی ہے اور خارجی توانائی کو باطنی توانائی کی اصطلاحات میں سمجھنے کے لئے ہم جو مجبور ہیں تو اس سے کائنات کی حقیقت روحانی قرار پاتی ہے نہ کہ مادی۔"

اس عبارت سے بریڈلے کے اس فقرے کی تائید ہوتی ہے کہ اسپنسر نے "ناقابل علم" کے متعلق جس قدر خیالات ظاہر کئے ہیں ایک سخت سے سخت متکلم بھی خدا کے متعلق اس قدر کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

خود کانٹ نے جس میں علیت کو ایک "لزومی علاقہ" سمجھنے کا میلان تھا بالآخر یہ تسلیم کرلیا کہ انتہائی تحلیل میں علیت خود ہمارے ہی ارادہ میں دریافت ہوسکتی ہے۔

فلسفہ جدید میں پروفیسر وارڈ کی کتاب "فطریت اور لاادریت" سے ہمارے اس نظریہ کی مزید تائید ہوتی ہے۔ یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ اسپنسر اور وارڈ جو لاادریت کے زبردست علمبردار تھے اپنی موت سے پہلے ایسے اعترافات کئے ہیں جو درحقیقت لاادریت سے توبہ کرنے کے مساوی ہے۔ اگر انتہائی حقیقت ایک ناطق ارادہ خیال کیجائے جو ہمارے ارادہ سے مماثلت رکھتی ہے تو یہ حقیقت "نامعلوم" اور "ناقابل علم" نہیں ہوسکتی بلکہ یہ مذہب کا خدا ہے جو اپنے آپ کو شعور انسانی میں آشکار کرتا ہے۔ یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا خدا شخصی (Personal) ہے۔ اس سوال کا مکمل جواب دینے کیلئے تفصیلی بحث کی ضرورت ہے لیکن ہمارے پیش نظر مقصد کے لئے اس کا مختصر طور پر جواب دیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم روح انسانی کی تمثیل سے خدا پر خیال کرنے میں حق بہ جانب ہیں اگر ہم اسکو ایسی شاعر الذات (Self conscious) ہستی تصور کرتے ہیں جو فکر، حس، اور ارادہ رکھتی ہے تو خدا کے وجود کو شخصی خیال کرنا بالکل فطری بات ہے۔ شخص سے ہماری مراد بھی ایک شاعر الذات ہستی ہی کے ہے جس کو خود اپنا اور دوسری ہستیوں کا شعور ہوتا ہے اور جس میں فکر، حس، اور ارادہ پایا جاتا ہے۔ ہمارا شعور ذات وجود کا ایک اعلیٰ ترین نصب العین پیش کرتا ہے جس سے ہماری بہت کچھ تشفی ہوجاتی ہے اس لئے ہم خدا کو ایک ایسی شخصی ہستی خیال کرتے ہیں جو انسانی شخصیت کے مقابل میں اعلیٰ ترین و کامل ترین ہے۔ شخصیت کا نصب العین خدا ہی میں متحقق ہوتا ہے۔ حقیقت کو "قوت" یا "بے شعور جوہر" کہنے کے بجائے شخصی خدا کہنا زیادہ قابل فہم ہے۔

غزل

از عالیجناب نواب ضیا یار جنگ بہادر

لگد زن بر سرِ پیمانہ برخیز — ز بزمِ میکشاں مستانہ برخیز
بہ بزمِ آشیانِ شمع می باش — چو شمع از محفلِ بیگانہ برخیز
نشد از ہیچکس تہ بستر خاک — ز فرشِ راحتِ دیوانہ برخیز
گراں بر خاطرِ اغیار تا کے — چو گرد کوچۂ جانانہ برخیز

ضیا شب کوتہ و منزل دراز است
ز خوابِ غفلت کاشانہ برخیز

حالی

انکی شاعری کی پیدائش، خصوصیات اور اثرات

از جناب محمد عبدالقادر صاحب سروری ایم۔اے عثمانیہ مددگار پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ

انیسویں صدی کے نصف آخر کا زمانہ بھی ہندوستان کی تاریخ میں عجیب ہنگامہ زا اور اہم تھا۔ اس دور کا مطالعہ کرنیوالوں کے سامنے ہندوستان کی حالت، قوموں کے بننے اور بگڑنے، عروج اور زوال کے اسباب فراہم ہوجانے اور ماحول کے اثرات کے تحت خیالات میں انقلاب شروع ہونے کے عجب منظر پیش کرتی ہے۔ ایک طرف تو مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا، دوسری طرف اجنبی قومیں اس سرزمین میں اپنے قدم جمانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ قدیم ہندی اور جدید ہند المانی تمدن پر مغربی تمدن کے اثرات مترتب ہونے شروع ہوگئے تھے۔ یہ ایسا خوفناک منظر تھا کہ اس کو سر سے ٹالنے کے لئے غریب ہندی ہندو اور مسلمان دونوں۔ اپنی بساط سے زیادہ ہی پر اتر آئے تھے۔ ان میں وہ عاقبت بیں بزرگ یقیناً موجود تھے، جو آنیوالے تمدنی۔ انقلاب کو مبہم شکل میں دیکھ رہے تھے۔ خیال کیجئے کہ کس قدر بیچارگی کا عالم تھا ایک قدیم قوم جو اپنی برسوں کی تہذیب، معاشرت، روایات، رسم و رواج اور زبان کی فضا میں پرورش پاتی رہی تھی، اسکی حیات ملی کو دھکا لگ رہا تھا۔ انھیں خصوصیات کو برقرار رکھنے کی خاطر وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی

اسکے آگے دو ہی سوال تھے ۔ تخت یا تختہ ۔ اپنے تمدن کا جنازہ اٹھا دے ۔ یا قدیم خوشحالی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرے ۔ ایک قدیم قوم پر جدید تمدن کو مسلط ہوتے دیکھنا بڑا نظر آزما واقعہ ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ مشیت ہندی اقوام کی کوششوں پر ہنس رہی تھی ۔ جان توڑ کوشش کے باوجود ہوا وہی جو کاشش نہوا ہوتا ۔ ہندی آزادی مغرب کے پنجہ میں گرفتار ہوگئی ۔ اب اسکے سوا اور کیا چارہ تھا ۔

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش حصہ میں اب ہمارے یہ شاد مانیاں ہیں

آخری کوشش میں ناکام ہوکر، ہندیوں نے غلامی کی کمر چست باندھ لی ۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے فیصلہ کن حادثہ کے بعد، ہندوستان ابھی دم لینے بھی نہ پایا تھا کہ، اسکی قومیں سرعت کے ساتھ انگریزی خیالات، معاشرت، تمدن اور زبان کو خیر مقدم کرتی دکھائی دیتی ہیں ۔ اس پر وہ فطرتاً مجبور تھیں ۔

جب زندگی کے ہر شعبہ پر انقلابی اثرات مرتب ہونے لگے تو ہماری زبان کی کیا خصوصیت تھی جو مستثنیٰ رہتی ۔ اب ہم زبان اور ادب میں بھی نئے خیال اور نئی امنگوں والی ہستیوں کو پیدا ہوتے دیکھتے ہیں ۔ انھیں میں ایک سرسید اور ایک حالی ہیں ۔

۲

حالی کی شاعری کے متعلق مختلف اظہار خیال ہو چکے ہیں ۔ اور ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن ان پر لکھنے والوں کے خیالات میں افراط و تفریط کو دیکھکر ایک متعلم ادب بڑی الجھن میں پڑ جاتا ہے کہ اس بڑے شخص کو اردو ادب خصوصاً شاعری میں کیا جگہ ملنی چاہئے ؟

نقاد اور سوانح نگار کی حیثیت سے حالی کا پایہ معین ہے ۔ بلاشبہ وہ علمی ادبی تنقید اور سوانح نگاری کے پیشرو ہیں ۔ یہاں ہمارا مقصد انکی شاعری کو اس کے ماحول میں رکھکر دکھانا ہے ۔ ہم نہ ان کے خلاف رائے زنی کرنے والے ہیں اور نہ انکی شاعری کی خوبیوں کو گنانا چاہتے ہیں ۔ حالی کی شاعری کی پیدائش اور اس کے اثرات پر غائر نظر ڈالنے کے بعد، یقین ہے کہ ہم انکی شاعری کی حقیقی اور اضافی اہمیت سے ایک بڑی حد تک واقف ہو سکینگے ۔

۳

کسی شاعر کے کلام کو اس کے اصلی خدوخال اور رنگ و روغن میں پیش کرنے کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ ہم اس کے اطراف و جوانب پر نظر ڈالنے کی کوشش کریں۔ اس لحاظ سے، حالی کے متعلق یہ چند سوال خود بخود ہماری نظر کے سامنے پیش ہو جاتے ہیں۔

۱۔ حالی سے پہلے اُردو شاعری کی حالت کیا تھی، اور شعرا کا میلان کس قسم کا تھا۔

۲۔ حالی کی شاعری کو بنانے والے اسباب راست اور توسطی۔ کیا ہیں۔

۳۔ حالی کے کلام کی وہ کونسی خصوصیات۔ نکتہ خوبیاں ہیں، جو ان کو دوسرے اردو شاعروں سے ممیز کر رہی ہیں۔ اور جن کا مطالعہ ہم کو کسی قطعی رائے کے قائم کرنے میں مدد دیسکتا ہے۔

۴۔ حالی کی شاعری نے آئندہ نسلوں پر کیا اثرات۔ اگر کچھ ہوں۔ مرتب کئے؟

۴

سب سے پہلے سوال کا جواب ہم کو، ان اردو شاعروں کے کلام میں تلاش کرنا پڑیگا، جو حالی سے پہلے، اور قریبی زمانے میں گذر چکے ہیں۔

جس طرح ہر زبان میں، کسی فن کی پیدائش سے پہلے اس کے آثار اور اسکی حقیقتیں منتشر صورتوں میں پیدا ہو جاتی ہیں، اسی طرح ادب میں کسی تبدیلی کے پیدا ہونے سے پہلے، اس کے اسباب اور خود نتائج بھی ایک حد تک، زبان سے روشناس ہو جاتے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد، متعلم ادب اس امر کا اندازہ قائم کر سکتا ہے کہ ادبیات میں کس طرح کی تبدیلی رونما ہونیوالی ہے۔

اُردو شاعری کی بنیادیں فارسی شاعری پر رکھی گئی تھیں۔ لیکن یہ فعل ارادی نہیں تھا۔ بلکہ لسانی اصولوں کے تحت۔ زبان ہمیشہ انھیں شاہراہوں پر چلنے لگتی ہے، جو ہر زمانہ میں اس کے لئے کھلی ہوئی اور صاف پیش نظر ہوتی ہیں۔ اسکی وضاحت کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ بدیہی اصول ہے۔ اُردو کی پیدائش کے وقت، سرزمین ہند میں جتنی ادبی اور وسیع زبانیں رائج تھیں، ان میں فارسی ہی سب سے زیادہ وسیع،

مہذب اور سب سے بڑھکر یہ کہ حاکم زبان تھی۔ اردو شاعری مسلّمہ قاعدے کی کونسی مستثنیٰ مثال تھی، جو انحراف کرتی
ابتدا میں اور عرصہ تک اردو شاعری کا یہ رجحان نہایت خوش آئند اور پسندیدہ بنا رہا۔
لیکن تکرار، خواہ کتنی مخفی کیوں نہ ہو، آخر کار زبون نظر آنے لگتی ہے۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ فارسی کا نشو و نما
مغلوں کی حکومت کے نزل سے پہلے ہی رک چکا تھا، اور یہ چراغ سرزمین ہند میں، اپنی شعاعیں پیوست
کرکے، اب سحر کا منتظر تھا۔ پھر اردو کے لئے یہ مشعل ہدایت کا کہاں تک کام دیسکتا تھا؟ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ
فارسی سوتوں سے اس قدر مستفید ہونے کے بعد، اردو شاعر اپنا راستہ خود آپ تلاش کرتے۔ لیکن چند در چند
وجوہات کے باعث یہ نہو سکا۔ ایک ہی قسم کے خیالات اور الفاظ کے استعمال نے اردو شاعری میں یکسانیت پیدا
کردی۔ یکسانیت خصوصاً شاعری میں پستی اور نزل کی دلیل ہے۔ یہ زبان کی حیات کے بھی منافی ہے۔
یکسانیت کی وجہ سے اردو نغمہ خوانوں کے ترانے، شمع خراشی کی حد تک پہنچ گئے تھے
سمع خراشی سے اکتانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اور پھر طبیعت انسانی خود تنوع پسند ہے۔ اس لئے
یہ ناممکن تھا کہ متاخرین شعرائے اردو، اس قدر بے حس رہتے کہ ان پر اسکا اثر ہی نہوتا۔ لکھنؤ میں اردو شاعری
کے نشو و نما کا آخری زمانہ تھا، کہ حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ شعراء کے وہ جگھٹے جن کا سماں یہاں۔ آخری
دفعہ۔ نظر آیا تھا، منتشر ہوگئے۔ اس سے قدیم شاعری کے ادارے کو ایک محسوس جھٹکا لگا۔ واقعات کی پے در پے
تبدیلیوں نے، اوسکی تلافی کی گنجائش ہی باقی نہ رکھی۔ یہ ایسے امور تھے کہ سب کا مجموعی اثر اس زمانے کے شاعروں
کی طبیعت پر ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت قدیم شاعروں ہی میں ذہنیت کی ہلکی سی تبدیلی رونما ہونے
لگتی ہے۔

اس زمانے کے مشہور شعراء میں، انیس، دبیر اور میاں نظیر اکبر آبادی نے قدیم اردو
شاعری (جو غزل گوئی پر مشتمل تھی) کے رنگ کو چھوڑا۔ اور ہر ایک نے اپنا اپنا راستہ خود تلاش کرنے کی
کوشش کی۔

نظیر اکبر آبادی کا کلام کثیر ہے۔ لیکن قدیم شاعری کی ڈگر سے ہٹا ہوا۔ وہ اپنے معاصر

نقادانِ سخن کی نظر میں شاعر نہ ٹھہرتے ہوں، لیکن اس حقیقت کے انکشاف کے بعد ان کا کلام نمایاں اہمیت حاصل کرلیتا ہے۔ ادنیٰ خیالات ہی سہی۔ لیکن وہ شعر کو اپنے محسوسات کا حامل بناتے اور نہ صرف فطرت کی مطابقت کرتے ہیں بلکہ اس کے گوناگوں مظاہر میں سے جو چیز سامنے آجاتی ہے، اسی کو اپنا موضوع بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام قدیم طرز کی صناعیوں سے مختلف اور نسبتاً زیادہ موثر ہے۔

انیس اور دبیر میں سے شبلی کو بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ، مرثیہ گوئی کی ابتدا پہلے کس نے کی۔ اور کون مقلد ہے۔ انیس کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے والد نے انھیں مرثیہ گوئی کے راستہ پر ڈالا لیکن ہم کو اس نام نہاد سبب سے زیادہ واسطہ نہیں۔ کیونکہ انکی طبیعت کا لگاؤ خود ان کے مرثیوں سے ظاہر ہے۔ ہمارے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ انیس نے بھی غزل گوئی کے پامال طریقہ کو چھوڑا۔ اور رزمیہ اور مرثیہ نگاری کے پیشرو بنے۔ دبیر کی بھی یہی حالت ہے۔ ان کا موضوع انیس ہی کا سہی، لیکن جدید ضرور ہے۔

یہ ایک اجمالی خاکہ ہے اس غیر شعوری انقلاب کا جو خود حالی، آزاد اور کرنل ہالرائیڈ کی ارادی مساعی سے پہلے ہی اردو شاعری میں رونما ہونے لگا تھا۔

لیکن یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظیر، انیس اور دبیر کے بعد بھی غزلگوئی کو وہی ہردلعزیزی نصیب رہتی ہے، جو پہلے تھی۔ چنانچہ مومن، ذوق اور غالب کا زمانہ نظیر، انیس اور دبیر کے بعد کا زمانہ ہے؟ یہ درست ہے۔ زبان کی تبدیلی، کیسی ہی کیوں نہو، کبھی، فعتاً نہیں ہوجاتی۔ ایک حالت سے دوسری حالت پر عبور کرنے کے لئے بھی عرصہ دراز کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ شاعر حقیقت میں قدیم اردو شاعری کا آخری وقفہ حیات ہیں۔ انکی غیر معمولی صنوف نیاں، درحقیقت قدیم شاعری کی شمع کے گل ہونے سے پہلے کی شعلہ افشانی ہے، اور انکی موجودگی ہی حالی کی کوششوں کے لئے زمین ہموار کردیتی ہے۔ اگر انیس، دبیر اور نظیر اکبرآبادی، کی اختیار کردہ راہوں سے کئی اور راہیں کھل جاتیں، اور ان پر گامزنی بھی شروع ہوجاتی، تو پھر یقین ہے کہ اردو کو حالی کی کوششوں کا ممنون ہی نہونا پڑتا۔

حالی کی شاعری کو متاثر کرنے اور پیدا کرنے والے اسباب میں حسب ذیل اُمور کو بہت بڑا دخل ہے۔

قدیم شاعری سے دل برداشتگی

۱۔ ہر نئی چیز، خواہ وہ کتنی ہی اجنبی کیوں نہو، اپنی حد تک ایک وقعت رکھتی ہے۔ ادبیات میں بھی یہ اصول فطرت اپنا کام کرتا ہے۔ اُردو شاعری جب پیدا ہوئی، تو باوجود اسکے کہ وہ ایرانیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی، اور ہندوستان کے لئے اجنبی چیز تھی تاہم بڑی خوش بخت ثابت ہوئی۔ بلکہ یہ کہیں تو بیجا نہو گا کہ ہندوستان کی زبانوں میں یہ اعلیٰ شاعری تھی۔ تقریباً ایکسو سال تک لوگوں کی توجہ کو یہ خوبی کے ساتھ جذب کرتی رہی۔ لیکن میر و سودا کے زمانے کے بعد اس طرز شاعری کا نشو و نما ختم ہوگیا۔ اور یکسانیت اور تکرار نے اسکو سمی چیز بنادی۔ ولی کے زمانے سے لیکر میر و سودا تک اردو شاعری کا ارتقا برابر جاری رہا۔ انشا، جرات، مصحفی وغیرہ نے اس میں زبان کی حد تک جدتیں پیدا کرنیکی کوشش کی۔ آتش، ناسخ، رند وغیرہ کے زمانے میں تو اردو شاعری لفظوں کا ایک گورکھ دھندا بنکر رہ گئی تھی۔ جس قوم اور ملک میں یہ پیدا ہوئی تھی، اسکا عکس تو شاید یہ پہلے بھی نہیں تھی۔ لیکن اب قوم اور افراد قوم کی زندگی سے اسکے کسی قسم کی مناسبت ہی باقی نہیں رہی۔ ابتدائی جدت خیال اور زبان کی خوبیوں کی وجہ سے اس میں جس قسم کی دلچسپی رہی تھی، وہ بھی اب فطرتاً ختم ہوگئی۔

مومن، ذوق اور غالب نے اسکو پھر سنبھالنا چاہا۔ اور اس کو سنجیدہ بنانے کی بھی کوشش کی لیکن اب وقت گذر چکا تھا۔ مجبوراً لوگوں میں اس سے ایک دل برداشتگی پیدا ہوگئی اور اس سے ہٹ کر چلنے کا احساس بھی پیدا ہونے لگا تھا، جسکی طرف ہم اپنے اگلے حصہ مضمون میں اشارہ کر چکے ہیں۔ حالی بھی اسی احساس کی ایک زبردست پیداوار ہے۔

مغربی تمدن کے اثرات

۲۔ اُردو شاعروں کی ذہنیت کو بدلنے میں ایک اور شئے بڑی معاون ثابت ہوئی۔ یہ مغربی اقوام کا ہندوستان میں آنا، اور انگریزی تمدن کا یہاں پھیلنا تھا۔ انگریزوں کے ذریعہ مغربی ادب خصوصاً انگریزی شاعری بھی یہاں داخل ہوگئی۔ مغرب کی شاعری اُردو شاعری سے

مختلف تھی۔ اسی وجہ سے انکی طرف اُردو شاعروں کی توجہ منعطف ہوئی۔ اگر مغربی ادبیات سے اُردو داں اسوقت واقف ہوتے، تو ممکن تھا کہ اُردو شاعروں کی ذہنیت میں تبدیلی اس قدر جلد نہ ہوتی۔ مغربی اثرات نے جہاں ہندی تمدن کو متاثر کیا، ان سے شاعری کو بھی ایک دھکا لگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ، اُردو شاعری کے لئے ایک سہارا بھی فراہم ہوگیا۔ یہ سہارا خود مغربی خصوصاً انگریزی شعراء کے کلام کے نمونے تھے۔ جن کو دیکھکر اُردو شاعروں نے، اپنی شاعری میں بھی تبدیلی پیدا کرنی شروع کی۔ حالی کو لاہور بک ڈپو کی ملازمت کے ذریعہ انگریزی خیالات سے متاثر ہونے کا موقع حاصل ہوچکا تھا۔ اس نے اپنی آئندہ زندگی اور شاعرانہ کردار کو بنانے میں بڑی مدد دی۔

۳۔ سرسید احمد خاں کے اصلاحی کارنامے

۳۔ اُردو زبان کے اس عبوری دور (Transition Period) کی سب سے اہم شخصیت سرسید احمد خاں کی ہے۔ یہ خود تو بلند پایہ ادیب یا شاعر نہ تھے لیکن اپنی اصلاحی کوششوں نے اُردو زبان کی بڑی مفید خدمت انجام دی۔ سرسید مشرقی رسومات کے دشمن اور مغربی خیالات کے دلدادہ ہو رہے تھے۔ اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں انہوں نے ساری عمر صرف کردی۔ اپنے اصلاحی پیغامات کی اشاعت اور استقامت کیلئے علیگڈھ کالج قائم کیا، "تہذیب اخلاق" اور "علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" جاری کئے۔ چونکہ اُردو زبان سے ان کو راست واسطہ تھا، اور یہی ان کے اظہار خیال کا ذریعہ تھی، اسلئے یہ بھی کسی نہ کسی طرح انکے اصلاحی دائرۂ عمل میں محصور ہوجاتی ہے۔ اُردو نثر کی اصلاح کی طرف بھی "آثار الصنادید" (دوسرا ایڈیشن) کی تحریر سے انکی توجہ منعطف ہوچکی تھی۔

حالی سرسید احمد خاں کے مصاحب اور ان کے پیغامات سے نہ صرف متاثر بلکہ انکے بڑے حامی بھی تھے۔ ان کی کوششوں میں ہاتھ بٹانا حالی کا فرض تھا۔ چنانچہ "مسدس مدوجزر اسلام" میں حالی نے سرسید احمد خاں ہی کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ یہ مسدس حالی کی شاعری کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس ماحول میں رہکر حالی مروجہ اُردو شاعری کو کس طرح پسند کرسکتے تھے؟

۴۔ ان گردوپیش کے اثرات کے درمیان حالی کی مساعی کے لئے ایک مرکز بھی قائم ہوگیا۔

اسی زمانے میں، اُردو شاعری کی بُری حالت کو دیکھکر، پنجاب کے وزیر تعلیمات کرنل ہالرائڈ کو اسکی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے کرنل نے محمد حسین آزاد کو فراہم کرکے ایک طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ اس مشاعرے کا طرۂ امتیاز، طرح پر غزلیں لکھنے کے بجائے موضوع پر نظمیں لکھنے کے طریقہ کو رواج دینا تھا۔ آزاد پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس مشاعرے میں موضوعی نظمیں پیش کیں۔ بعد میں حالی بھی آزاد کے شریک کار ہوگئے۔ حالی کی بعض اچھی نظمیں مثلاً "برکھارت" "وغیرہ اسی مشاعرے کی پیداوار ہیں۔

اس طرح کرنل کی تحریک اور تجویز نے مصلحین شاعری کے لئے ایک مرکز بھی قائم کردیا۔

حالی کی طبیعت کا اثر

۵۔ حالی کی شاعری کو بنانے والے اسباب پر نظر ڈالتے وقت ہم خود حالی کی سنجیدہ طبیعت اور فطری اپج کے اثر کو بھی نہیں بھول سکتے، جس کا مطالعہ انکی تمام نثری تحریروں اور شاعری میں کیا جاسکتا ہے۔ سنجیدگی اونچے خیالات کے ہمیشہ منافی ہوا کرتی ہے۔ اور اپج، نئے خیالات اور اسالیب کے پیدا کرنے میں معاون، بعض وقت شاعری میں حالی جو غیر معمولی طور پر شگفتہ ہوجاتے ہیں، اسکو انکی اصلی فطرت سے کسی قسم کی مناسبت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ انکی قدیم عاشقانہ شاعری کا اصلی سبب، اسکا اوسوقت تک اظہار خیال کا ذریعہ ہونا اور اس کا لوگوں میں مروج ہونا ہے۔ اس طرز میں راستہ نہایت صاف تھا۔ ہر مبتدی، اسمیں خواہ کتنی اپج کیوں نہو، اسی طرز میں شعر لکھنے پر مجبور رہے جو اس کے زمانے میں رائج ہو۔ حالی بھی اپنے زمانے کی پیداوار تھے۔ اور اسی لئے اسکے ہر پہلو سے متاثر ہوتے رہے۔ ہمارے لئے انکی قدیم شاعری، انکی فطرت کے ایک غیر معمولی مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ انکی اصلی طبیعت جدید شاعری میں زیادہ نمایاں ہے۔

۶

حالی کی شاعری کو بنانے والے اسباب پر روشنی ڈالنے کے بعد ہم، حالی کی شاعری کے ایک اہم رُخ یعنے اسکی خصوصیات پر پہنچتے ہیں۔ حالی کو اُردو شاعروں کی بھیڑ سے نمایاں کرنے کیلئے، ایک سرسری تقابلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔

جب ہم حالی سے پہلے اوواد کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ان میں خیالات کی یکسانیت

اور مضامین کے تکرار سے طبیعت اکتانے لگتی ہے ۔ قدیم سے قدیم شاعر مثلاً سراج یا ولی سے لیکر غالب تک بھی، شاعری کا مرکزی موضوع فطرت کے گوناگوں مظاہر میں سے صرف ایک ہی چیز یعنے انسانی عشق اور اسکے متعلقات تھے ۔ یہ ظاہر ہے کہ کائنات میں اس سے بہتر موضوع متشکل سے ملسکتا ہے ۔ لیکن اسکی بھی ایک حد ہے ۔ پھر اردو شاعری کے عاشق و معشوق اپنی ظاہری شکل اور باطنی کیفیات کے اعتبار سے ایک ہی ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر شاعر کا مطمح نظر ایک ہی واقعہ ہے ۔ کہیں کہیں کچھ روشنی دوسرے امور پر جو پڑ جاتی ہے، وہ اسی مرکزی موضوع کی تابع اور ضمنی ہیں ۔ اور کمیت کے لحاظ سے ساقط از اعتبار ۔

سید انشاء، جرأت، مصحفی، رنگین اور میر حسن نے اگلے شاعروں کے مقابلے میں کچھ جدت ضرور پیدا کرنیکی کوشش کی ۔ لیکن غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جو لانگاہ بھی قدیم فضا سے ملحق ہی ہے ۔ سید انشاء کے دیوان میں ریختی کی نظمیں ملتی ہیں، رنگین، اور جان صاحب کے کلام میں بھی انکا وجود ہے ۔ یہ وجود حقیقت ایک ہی تصویر کا دوسرا پہلو ہے ۔ پہلے عورت منفعل تھی اب مرد ۔ یہ طرز یقیناً ہندی شاعری سے ماخوذ ہے میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اردو شاعری کا ایک قابل قدر نمونہ اور منظوم قصوں کا معراج کمال ہے ۔ لیکن اسکے ساتھ میر حسن غزلگو شاعر بھی تھے ۔ جس قدر ہمت انہوں نے غزلگوئی پر صرف کی، وہ مثنوی نگاری کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے ۔

قدیم شاعری کے آخری دور میں، شعرا کی ذہنیت میں ایک ہلکی سی تبدیلی کی کچھ مثالیں ملتی ہیں ۔ جن کا ہم نے پہلے عنوان کے تحت تفصیل سے ذکر کیا ہے ۔ یہ درحقیقت حالی کی شاعری کی تمہید تھی ۔

حالی پر بھی ابتدا میں قدیم رنگ غالب تھا ۔ چنانچہ ان کے دیوان میں قدیم اور جدید غزلوں کی تقسیم موجود ہے ۔ لیکن ان کی نظر میں شعر کا معیار بدل جانے کے بعد، انہوں نے اردو شاعری کے قالب کو بھی بدلنے کی کوشش کی ۔ اپنی تجویز کو مدلل بنانے کے لئے انہوں نے ایک "مقدمہ شعر و شاعری" لکھکر شعر کو اسکے اصلی خدوخال میں پیش کیا ۔ اس اعتبار سے انکے کلام میں نئے مضامین اور نئے اسالیب کا داخل ہونا ضروری تھا، جو ہوا ۔ انکا آخری کلام قدیم عاشقانہ مضامین پر محدود نہیں ہے ۔ مصرعہ طرح پر غزل لکھنے کے رسمی

طریقہ کو بھی یہ چھوڑ چکے تھے ۔ غزل لکھتے تو اس میں زیادہ تر مفید، کارآمد اور اخلاقی مضامین کو نمایاں جگہ دیتے۔

غرض حالی کے آخری کلام میں اسی قسم کی اور کئی تبدیلیاں پیدا ہوگئیں ۔ جو قدیم شاعروں کے کلام سے بآسانی علیحدہ کیجا سکتی ہیں ۔ خود ان کے ابتدائی اور آخری کلام میں بھی ایک اصولی فرق پیدا ہوگیا تھا عاشقانہ مضامین جو پہلے مرکزی موضوع تھے ۔ اب ضمنی ہوگئے تھے اور اس کے بجائے اخلاق انسانی اور اسکے مختلف پہلو انکی شاعری کا موضوع بن گئے ۔

اس تمہید کے بعد مگر حالی کی شاعری کی خصوصیات کو بیان کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کو خود ان کے پیش کردہ معیار پر جانچیں شعر میں وہ سادگی، اصلیت اور جوش کا ہونا ضروری سمجھتے تھے ۔ پہلی دو خصوصیات حالی کے کلام میں موجود ہیں ۔ انکی رباعیاں، قصیدے اور قطعے، ترکیب اور ترجیع بند سب کے سب اصلیت پر مبنی ہیں ۔ غزل میں بھی محض خیالی مبالغے نہیں ہیں ۔ عاشقانہ مضامین لکھتے وقت بھی وہ اس خصوصیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ مثال کے لئے انکی وہ غزلیں ملاحظہ ہوں جن کے مطلع یہ ہیں ۔

جس کو غصہ میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے — آج دل لیگا اگر کل نہ لیا، یاد رہے

وصل کا اس کے دل زار تمنائی ہے — نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے

چھیڑ اب نہ اے تصور مژگان یار بس — کافی ہے خار خار غم روزگار بس

سادگی بھی حالی کے کلام کا نمایاں وصف ہے ۔ ایک معمولی علمیت کا آدمی بھی اُن کے کلام کو پڑھ کر اچھی طرح سمجھ جاتا ہے ۔ لیکن جوش کا اسمیں فقدان ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پڑھنے والے ان کے خیالات سے بہت کم متاثر ہوتے ہیں ۔

۲ ۔ ان خصوصیات کے علاوہ، حالی کی شاعری کا اہم ترین پہلو، اس کے ناصحانہ اور اخلاقی مضامین ہیں قطعے اور رباعیاں اس قسم کے مضامین سے مملو ہیں ۔ "قومی شاعری" میں انکا "مدوجزر اسلام" ہمیشہ یادگار رہیگا ۔

ظرافت ۔ ۳ ۔ حالی کے کلام میں کہیں کہیں ظرافت بھی ہے ۔ اخلاقی قطعے لکھتے ہوئے وہ

اس امر کا ضرور لحاظ رکھتے ہیں کہ انکی گرانباری کو ہلکی ظرافت سے کم کریں۔ ایک قطعے ("کالے اور گورے کی صحت کا مذیکل امتحان") کا آخری شعر ہے۔

ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر گیا ۔۔۔ آئے بابا! اسکی بیماری کا کیونکر اعتبار

اسی طرح "نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام"۔ "قحط اہل اللہ"۔ "فرض بیکر جج کو جانیکی ضرورت"۔ والے قطعے شوخی اور ظرافت کا رنگ رکھتے ہیں۔

لیکن ان کی ظرافت کی دو قابل ذکر خصوصیات ہیں۔ یا تو وہ آورد معلوم ہوتی ہے۔ یا اس سے عقلی کوشش (Intellectual device) نمایاں ہے۔

غزل میں ان کی ظرافت کے موضوع اکثر و بیشتر ظاہر پرست زاہد، صوفی یا واعظ ہوتے ہیں ان پر وہ ایک رند خراباتی بنکر حملہ کرتے ہیں۔

سنجیدگی طبع

۴۔ ہم نے اوپر حالی کی سنجیدگی طبع کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس افتاد طبیعت نے بھی حالی کی شاعری میں کئی ایک اہم خواص پیدا کر دئے۔ اسکی وجہ سے انکی نظمیں بہت سے ایسے عیوب سے پاک ہو جاتی ہیں، جو عام طور سے اردو شاعری کا لازمی جزو بن گئے تھے۔ ان کا کلام رکیک اور بازاری خیالات سے خالی اور مبتذل مضامین سے عاری ہے۔ انکی زبان اعلیٰ علمی زبان ہے اور خیالات محض شاعرانہ نہیں بلکہ عالمانہ بھی ہیں۔

حالی کے تخیل سے زیادہ مشاہدہ، اور احساس سے زیادہ عقل قوی تھی۔ جس کا نتیجہ یوں ظہور پذیر ہوا کہ وہ ہر جگہ معقولیت سے متجاوز نہیں ہوتے۔ نثر کی طرح نظموں کو بھی وہ منطقی حدود کے اندر ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ اس طبیعت کے شاعر دنیا میں بہت کم غیر فانی کارنامے چھوڑ سکے۔ ہومر، ملٹن، شیکسپیر، فردوسی وغیرہ میں عقل کے ساتھ ساتھ احساسات بھی بدرجہ اتم موجود تھے، جو ان کے لازوال ادبی شہ کاروں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

حالی کی شاعری کا سب سے آخری مگر سب سے اہم پہلو، اس کا اثر ہے۔ جو آئندہ

شاعروں اور غیر شاعروں پر مرتب ہوا۔ اس میں حالی کی شاعری کے خواص سے زیادہ ان حالات کو دخل ہے جنکی وجہ سے حالی میں مصلح ادب کی خصوصیات جمع ہوگئی تھیں۔ اس اثر کے مختلف مظاہر پر ہم ذیل میں بحث کرینگے۔

۱۔ اسکے اظہار کی یہاں ضرورت نہیں کہ مصرعہ طرح پر غزل لکھنے کا کام کس قدر مصنوعی، غیر فطری اور رسمی ہے۔ یہ بھی ہم کو معلوم ہوچکا ہے کہ کرنل ہالرائڈ کی تحریک پر آزاد نے اس طریقہ کو محو کرنا شروع کر دیا تھا جس میں حالی نے بھی انکا ساتھ دیا۔ لیکن آزاد کی نظمیں وہ اثر پیدا کرسکیں جو حالی کی نظموں نے کیا۔ اسکا سبب یہ ہے کہ آزاد میدان شاعری کے مشہور شہسوار نہیں تھے انکی شہرت نظم سے زیادہ نثر پر مبنی ہے۔ اس کے برخلاف حالی پہلے پہل عوام میں اپنی شاعری کے ذریعہ روشناس ہوئے اور اسی کے ذریعہ بڑھے۔ ادب میں شہرت اور ہر دلعزیزی کو بڑا دخل ہے۔ حالی کی نظمیں ان کے مؤیدین اور مخالفین کے پاس جلد سے جلد پہنچ جاتی تھیں۔ جن کو پڑھکر مؤیدین نے انکی تقلید شروع کی اور مخالفین، رفتہ رفتہ مانوس ہوگئے۔

قدیم شاعروں پر متقدمین کا اثر

۲۔ حالی سے پہلے اور بعد بھی، فن شعر کے نقاد عموماً متقدمین کی پابندی کو خیال اور زبان دونوں میں ضروری سمجھتے تھے۔ ہر نئی بات پر قدما کے کلام سے سند مانگی جاتی تھی۔ اور جب تک یہ نہو، غریب شاعر، اپنی تمام جدّت طبع کے ساتھ بھی، ان خود رائے نقادوں کی نظر میں وزن اور شعرا کے زمرہ میں بار نہیں پاسکتا تھا۔ وہ جدّت کے متلاشی تو ضرور تھے لیکن قدیم زبان اور خیالات کے دائرے ہی کے اندر۔

خود رائے نقاد، ادب کے لئے بلائے آسمانی ثابت ہوئے ہیں۔ تقدیر کی ستم ظریفی سے یہی لوگ عموماً عوام کی نظر میں اہمیت کے سرمایہ دار ہوتے آئے ہیں۔ یہ خیال ایک بھاری زنجیر تھی جو اردو شاعروں کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھی۔ جدید خیالات نے جوں ہی شاعری کا مطمح نظر بدل دیا، میدان بجیر ڈھیلی ہونے لگی۔ اجنبی خیالات جو مضامین غزل سے مختلف تھے، ایسی زبان میں ادا ہونے لگے، جو غزل کی زبان سے ممیز تھی۔ یہ فخر حالی کی نظموں کو حاصل ہوا کہ ان سے تمام اردو دانوں کے خیالات میں انقلاب رونما ہونے لگا۔ حالی نے شاعروں کو راستہ بتلادیا۔ لیکن اپنی اپنی سرمنزل سے ناواقف ہونے کی وجہ سے

اکثروں نے راہنما کے بتلائے ہوئے راستہ میں تگ و دو شروع کر دی۔

قومی شاعروں کا آغاز

۳۔ حالی نے اردو شاعری کو فطری راستہ پر لانے کی جو سعی شروع کی تھی وہ ایک حد تک بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ یہاں ایک "حد تک" کا کلمہ ہم نے قصداً استعمال کیا ہے۔ جس کی وضاحت آخری حصہ میں پیش ہوگی۔ خود حالی نے جس شاعری کے نمونے پیش کئے، وہ یا تو واعظانہ تھے یا قومی۔ "قومی شاعری" کے معنے حالی کے کلام کے مطالعہ سے جو سمجھ میں آتے ہیں وہ صرف مسلمانوں کے زوال کے مرثیے ہیں۔ ہم کو یہ سوء ظن نہیں کہ حالی قومی شاعری کے اصلی مفہوم سے ناواقف تھے۔ لیکن یہ اتفاقی بات ہے کہ ضرورت زمانہ کی وجہ سے انکی "قومی شاعری" اس پہلو سے متعلق رہی اور عوام جو ہمیشہ انجذاب گدایانہ کے اصول پر کاربند ہیں، قومی شاعری کی اس ایک شاخ کو مکمل قومی شاعری کے مترادف سمجھنے لگے۔ چنانچہ اس خیال میں اب تک بھی کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں دکھائی دیتی۔ قومی شاعری کی اصطلاح، جس کی پیدائش حالی کی رہین منت ہے۔ انہیں سے چلی ہے۔ اور اب اس کے معنی ایک خاص قسم کی نظموں کے لئے جاتے ہیں، جن میں مسلمانوں کے پہلے عروج کا موجودہ تنزل سے مقابلہ کر کے، ان کو غیرت دلائی جاتی اور ابھارنے کی سعی کیجاتی ہے۔

اخلاقی شاعری

۴۔ قومی شاعری کے ساتھ ساتھ، اردو شاعری میں اخلاق انسانی کا استعمال بھی حالی ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں چیزوں کو حالی نے اسقدر زور کے ساتھ پیش کیا کہ، شاعروں کے سامنے جو مطمح نظر پہلے موجود تھے، وہ گر گئے۔ انکی جگہ کوئی معین خیال نے تو نہیں لی۔ تاہم ان میں تلاش اور جستجو پیدا ہوگئی۔ اعلیٰ شاعری کی طرف چلنے کے لئے راستہ بھی مل گئے۔ گو سر منزل کچھ دور تھی۔ خود حالی نے نئی شاعری کے جو نمونے پیش کئے تھے، وہ ربع صدی تک اردو شاعروں کی توجہ کو مصروف رکھے رہتے ہیں۔

خاتمہ

مختصر یہ کہ حالی کے زمانے ہی میں، اور خود حالی ہی کی کوشش سے، شعر کی ظاہری شکل اور معنوی تخیل کے ساتھ، شعرا کی ذہنیت میں بھی محسوس اور نمایاں تبدیلی ہوگئی۔ شاعری صرف غزلگوئی کا نام نہیں رہا۔ شاعروں کے متعلق یہ خیال بھی بدل گیا کہ وہ متقدمین کا پوری پوری طرح غلام ہے۔ اصناف شاعری سے زیادہ خیالات پر توجہ صرف کیجانے لگی۔ مجموعی حیثیت سے بھی مروجہ شاعری کے متعلق یہ خیال

پیدا ہوگیا کہ اس میں کچھ خامیاں ضرور ہیں۔ مرض کے معلوم ہو جانے کے بعد علاج بہت مشکل نہیں رہتا۔

اسی انقلاب نے خود حالی سے زیادہ متہم بالشان شاعر، مثلاً اکبر اور اقبال پیدا کئے جو قدیم ایرانی رنگ کی اردو شاعری اور آئندہ ہندی اور مقامی شاعری کی قابل قدر درمیانی کڑی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو شاعری کی اصلاح اسوقت مکمل ہو جائیگی، جب وہ قومی اور ملکی خصوصیات پر حاوی ہو جائیگی وہ اس قوم اور ملک کے تمدن کا آئینہ ہو جائیگی جس میں وہ پیدا ہوئی اور نشو و نما پاتی رہی ہے۔ یہی ہماری قومی شاعری ہوگی جس کے آثار اقبال کے مطلع دیوان سے نمایاں ہیں۔

شہر گوہریں

حیدرآباد دکن

ترجمہ از انگریزی مصنفہ مسز سروجنی نائیڈو

محمد حبیب اللہ رشدی صاحب ایم۔ اے عثمانیہ

اے گل گوہر، مسرت کے شہر، میرے وطن! — تو مرے سارے تخیل کی ہے اک کانِ عدن
میرے دل میں تیری الفت کا ہے جو طوفان بپا — آہ ہو سکتا نہیں کوئی بھی اس سے آشنا
حسن و خوبی تیرے سینہ میں جو فطرت نے بھری — ہاں اسی چشمے سے میری زندگی پیدا ہوئی
کیا مرا یہ جسم پتلا خاک کا تیری نہیں؟ — کیا تری پاکیزہ مٹی سے مری مٹی نہیں؟
زندگی کے نخل نے میرے نہیں پائی ہے کیا — تیرے چشموں کے مصفا آب سے نشو و نما؟
کیا ترے صحرا میں سحر آگیں پہاڑی نے کبھی — اپنی فکر انگیز رونق سے مجھے لوری نہ دی
آہ اب میں گرچہ اک تکلیف دہ غربت میں ہوں — اور آوارہ بہت کچھ میں تری فرقت میں ہوں

پھر بھی کیا میرے دل محزوں کا تو معبد نہیں
اور کیا میری بھٹکتی روح کا مقصد نہیں

انسان اور توانائی

از جناب ابوالکارم فیض محمد صاحب نقشی متعلم ایم ایس سی کلیہ جامعہ عثمانیہ

توانائی کیا ہے؟

کام کرنے کی یا کسی جسم کی حالتِ حرکت میں تبدیلی پیدا کرنے والی طاقت کا نام توانائی ہے۔ توانائی دو قسم کی ہوتی ہے ایک توانائی بالقوہ اور دوسرے توانائی بالحرکت۔ اول الذکر کا تعلق شئے کی وضع سے ہے اور دوسری کا حرکت سے، اگر کسی میز پر پتھر کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں توانائی بالقوہ موجود ہے لیکن جب وہی پتھر جاذبہ کی تحت نیچے کو گرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں توانائی یا تو حرکت یا حرکت کی توانائی ہے، یہ توانائی اکثر لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے چنانچہ، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ زمین کے اپنے محور کے اطراف گھومنے سے جو توانائی بالحرکت حاصل ہوتی ہے وہ توانائی کا ایک اہم قدرتی مبداء ہے۔

توانائی اور اس کے دو اقسام کی مختصر تعریف کر دینے کے بعد اب ہم سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ مسئلہ یعنی اصولِ بقائے توانائی پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کیونکہ توانائی کے بیان میں اس سے زیادہ دلچسپ اور مفید کوئی دوسرا مسئلہ نہیں ہے۔

ہمارے روزمرہ کے تجربہ سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ توانائی مختلف

شکلیں بدل سکتی ہے یا اس کو مختلف اشکال میں تبدیل کیا جاسکتا ہے مثلاً نور، حرارت، برق، وضع وحالت کی توانائی، حرکت کی توانائی وغیرہ وغیرہ۔ توانائی کو ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کیا جاسکتا ہے مثلاً حرارت کی توانائی ڈانامو کو چلاتی ہے جس سے برق پیدا ہوتی ہے اور برقی لمپ میں نور کی شکل اختیار کرکے گلی کوچوں کو روشن کرتی ہے یہ نوری توانائی دراصل وہی حرارت کی توانائی ہے جو ڈانامو کو چلاتی ہے۔ لیکن اب اس نے دوسری شکل اختیار کرلی ہے، کہا جاتا ہے اور تجربہ سے بھی ثابت ہے کہ اس دوران میں توانائی کا ایک شائبہ بھی ضائع ہونے نہیں پاتا۔ ابتداءً لوگوں نے اس خیال کی مخالفت کی اور اسکو غلط ٹھہرایا اس لئے کہ سوائے تجربات (اور وہ بھی بھدے) کے ان کے پاس اس کا اور کوئی سائنٹفک ثبوت موجود نہ تھا۔ نیوٹن کے تیسرے کلیہ (یعنی عمل اور ردِ عمل ہمیشہ مساوی اور متضاد ہوتے ہیں) سے ان لوگوں کو اس کے سمجھنے میں کسی قدر آسانی ہوگئی لیکن اس پر بھی لوگ بقائے توانائی کے اصول کو ایک خیالی مسئلہ تصور کرتے تھے لیکن بعد کو جب پروفیسر ٹیٹ، سر ہنری ڈیوی، کونٹ رمفرڈ اور دیگر ممتاز شخصیتوں نے اس کے ثبوت میں اپنے نازک اور حساس تجربے پیش کئے تو لوگوں کو اس اصول کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی اور بقول گرفتھ کے، "اب یہ مسئلہ اس قدر درجہ صداقت کو پہنچ چکا ہے کہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں لوگ اسے ایسا مسئلہ سمجھنے نہ لگیں جس میں کوئی سقم نہ ہو اور نہ مزید تحقیق کی گنجائش ہو" ونیز جس طرح ہم مادہ کے ایک ذرہ کو بھی فنا نہیں کرسکتے اسی طرح توانائی کے شائبہ کو بھی ضائع نہیں کرسکتے، انسان صرف اسکی شکل بدل سکتا ہے، نہ تو اس میں توانائی کو پیدا کرنے کی ہی قدرت ہے اور نہ تباہ کرنے کی، جس قدر بھی توانائی دنیا میں موجود ہے وہ بالکل ایک مستقل چیز ہے، یہ اصولِ بقائے توانائی کا عام فہم نظریہ تھا جس کا جان لینا ہمارے لئے ازبس ضروری ہے

۱

توانائی کے مختلف قدرتی مبداء

اب ہم نفسِ مضمون کی طرف اپنی توجہ منعطف کرکے توانائی کے مختلف قدرتی مبداؤں کا

تفصیل وار ذکر کرینگے

تمام دوسرے مبداء توانائی کے مقابلہ میں سورج کو خاص اہمیت حاصل ہے، ہم تک اسکی توانائی اشعاعی حرارت کی صورت میں پہنچتی ہے، دوسرا مبداء زمین کی اندرونی حرارت ہے اور اس سے بھی بڑھکر وہ توانائی بالحرکت ہے جو زمین کی روزانہ گردش سے پیدا ہوتی ہے۔ اس توانائی کا آفتاب سے کوئی تعلق نہیں اس چیز کو ہم آگے چلکر سمجھائینگے۔ یہاں صرف توانائی کے مختلف قدرتی مبداؤں کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

ان کے علاوہ اور دیگر قدرتی مبداء ایسے ہیں جن کی توانائی کو انسان بہت زیادہ کام میں لاتا ہے زمین کا اندرونی حصّہ توانائی کا ایک بیش بہا خزانہ ہے مثلاً کوئلہ ہی کو لیجئے، یہ وہ منبع توانائی ہے کہ جس کو انسان پیدائش آفرینش سے لیکر اب تک استعمال کرتا چلا آرہا ہے اور وہ برابر زمانہ کا ساتھ دیرہا ہے، کوئلہ زمین کی اوپری پرتوں میں دستیاب ہوتا ہے جسکی وجہ سے بے حد ارزاں ہے اور ہر شخص اسی کو استعمال کرنا فائدہ مند سمجھتا ہے مگر آج کل کوئلہ کی دستیابی کے سوال نے ایک پیچیدہ صورت اختیار کرلی ہے، دنیا کے ہر گوشہ میں اسکی مانگ ہے اور اس کے سالانہ خرچ میں ایک قسم کا اسراع پایا جاتا ہے، کوئلہ کی مقدار کا اندازہ لگانے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ کتنے عرصہ تک یہ انسان کے کام آسکتا ہے ایک انجمن قائم کی گئی تھی سنہ ۱۹۱۱ء میں سر ولیم رامزے اس کے صدر تھے، انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں بیان کیا تھا کہ اگر کوئلہ کے خرچ کی یہی رفتار رہے تو کوئلہ کی کانوں میں ۷۵ سال کے بعد کوئلہ میسّر نہ آئیگا یہ تو اس زمانہ کا حال تھا، جنگ عظیم کے موقعہ پر کوئلہ کی کافی مقدار خرچ ہوگئی اور آئے دن اسکی مانگ بڑھتی جارہی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ زمین کی اوپری پرتوں میں جس قدر بھی کوئلہ تھا اب تقریباً ختم ہوچکا ہے، کچھ زمانہ بعد اس کو حاصل کرنے کیلئے ہمیں زمین کو کافی گہرائی تک کھودنا ہوگا اس کے لئے مزید مشینریوں کی ضرورت لاحق ہوگی جس سے لازمی طور پر کوئلہ بے حد گراں ہوجائے گا۔ اس لئے حاصل شدہ کوئلہ تجارتی اور صنعتی اعتبار سے بالکل غیر مفید ثابت ہوگا۔

اسکے بعد ہم دوسرے اہم مبداء توانائی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں وہ جلانے کا تیل ہے،

یوں تو قدیم زمانے سے مختلف قسم کے تیل جلانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن زمانۂ حال میں جلانے کے علاوہ اور دوسرے کاموں میں بھی ان سے بڑی مدد لیجاتی ہے، مزید برآں ایسے مختلف قسم کے تیل دریافت کئے گئے ہیں جو بھاپ کے انجنوں اور بائلر میں کام آتے ہیں۔ جو تیل ان مشتریوں میں کام آتا ہے وہ بالعموم پٹرولیم ہی ہوتا ہے جو زمین کے بعض طبقوں سے نکالا جاتا ہے، اس قسم کے طبقات بالعموم شمالی امریکہ میں پائے جاتے ہیں اگرچہ روس، گلیشیا اور دیگر ممالک میں بھی پٹرولیم پایا جاتا ہے مگر امریکہ کو سب پر فوقیت حاصل ہے اس لئے کہ وہ کل تیل کا ۶۲ فیصدی پیدا کرتا ہے۔

پٹرولیم کو نہ صرف بھاپ کے انجنوں اور بائلر ہی میں استعمال کیا جاتا ہے بلکہ اندرونی طور پر احتراق پذیر انجنوں میں بھی بہت بڑی حد تک اس سے مدد لیجاتی ہے جس وقت اس تیل کو زمین کے اندر سے نکالا جاتا ہے تو وہ اس حالت میں نہیں ہوتا جیسا کہ ہم بازار میں حاصل کرتے ہیں، سب سے پہلے اسکو عمل تقطیر سے صاف کیا جاتا ہے اس دوران میں خارص پٹرولیم کے علاوہ مشعل جلانے کا تیل اور ملاست پیدا کرنے والا تیل دونوں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ تیل معاشی اور تجارتی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتا ہے ایک پونڈ تیل سے اتنی ہی توانائی حاصل ہوتی ہے جو ۳٫۵ پونڈ کوئلہ سے حاصل کیجاتی ہے۔

قدرتی گیس (میتھین) بھی اندرونی احتراق پذیر مشین میں جلائی جاتی ہے، علاوہ ازیں اس سے روشنی کا بھی کام لیا جاتا ہے، پیٹ Peat بھی ایک مبداء توانائی ہے خانہ داری اور صنعتی کاموں میں بہت استعمال کیا جاتا ہے، یورپ اور امریکہ میں اسکی خاصی مقدار پائی جاتی ہے اور وہاں اس سے بیحد کام لیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ دریاؤں، آبشاروں اور ہوا اور جذر و مد کی توانائی بھی ہماری زندگی میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

یہ بات یہاں قابل غور ہے کہ تمام مبداء توانائی آفتاب کی اشعاعی حرارت کے ممنونِ احسان ہیں بعض صورتوں میں راست طور پر اور بعض میں ضمنی طور پر۔ حقیقت میں کرۂ ارض پر حیات کا دارومدار آفتاب کے اشعاع پر ہے اگر اس سے ہمارا تعلق ٹوٹ جائے تو پھر صفحۂ زمین پر کسی ذی حیات کا

نظر آنا ناممکن ہو جائیگا اس لئے کہ ہمارے استعمال کے لئے توانائی کا کوئی مبداء نہ ہوگا، زمین کی گردش کی وجہ سے پیدا ہونے والی توانائی اور زمین کی اندرونی حرارت کا سورج کے اشعاع سے کوئی تعلق نہیں۔

ان تمام کے علاوہ حال ہی میں ایک ایسا مبداء توانائی بھی دریافت ہوا ہے جس سے بے حد توانائی حاصل کیجاسکتی ہے، یہ مبداء ریڈیم عنصر ہے جس کی تحقیق ۱۸۹۸ء میں ہوئی آجکل اسکی توانائی دنیا کے مسئلہ توانائی میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مفصل ذکر ہم آگے کرینگے۔

ہم نے سطور بالا میں جن مبداء کا ذکر کیا ہے ان کا تعلق زمین سے ہے ان کو فضاء سے کوئی تعلق نہیں۔ حال کے محققین جن میں سر آلیور لاج کو ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اثیر کا کرہ توانائی کا زبردست مبداء ہے جو ابتک انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے، ضرورت ایجاد کی ماں ہے! ممکن ہے کہ کچھ عرصے بعد انسان کو اس مبداء کی توانائی کا استعمال معلوم ہو جائے اس سے اس قدر توانائی مفت حاصل ہوگی کہ اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، اس سلسلہ میں تحقیقات کا میدان بہت وسیع ہے اور ابھی بہت سے نئے مبداء معلوم کرنے کی گنجائش ہے، اگر ایسی تحقیقات کامیاب ہوگئیں تو پھر دنیا کی معاشیات کا نظام بدل جائے گا۔

ابتک ہم نے مختلف مبداہائے توانائی سے بحث کی ہے، اب ان کے فوائد اور استعمال کو بھی بیان کرینگے۔ یعنی یہ کہ انسان ان مبداء کی توانائی کو اپنے کاموں میں لانے کے لئے کیا طریقے اختیار کرتا ہے اور اس کا کیا طریق عمل ہوتا ہے، قبل اس کے کہ ہم ان کے فوائد سے بحث کریں ان تمام مبداہائے توانائی کو ایک جدول کی شکل میں لکھدینا مفید سمجھتے ہیں، یہاں ہم مسٹر ای۔ ای سلوسن کے مرتب کردہ جدول کو درج کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے مفید ہے۔

مبداہائے توانائی

۱۔ غیر شمسی

۱۔ جذر و مد (قمری)

۲۔ زمین کی اندرونی حرارت

۳۔ جوہر کی اندرونی حرارت

۲۔ شمسی

۱۔ بالراست شمسی انجن

۲۔ بلاراست

ا۔ طبعی

ا۔ ہوائیں (جہازرانی اور ہوائی چکی میں)

۲۔ آبشار (پن چکیوں کو گھماتے ہیں)

۳۔ شمسی جذر و مد اور موجیں

ب۔ کیمیائی ۔ کاربن اور ہیڈروجن کا آکسائڈ

ا۔ اندرونی ۔ غذا

۲۔ بیرونی ۔ سوختنی اشیاء

(ا) گیسی ۔ قدرتی گیس

(ب) مائع ۔ پٹرولیم، نباتاتی تیل اور الکحل

(ج) ٹھوس

کوئلہ ۔ قدیم، محدود

لکڑی ۔ جدید اور مسلسل

مبداہائے توانائی کا استعمال

ہم نے ابتک جن مبداء توانائی کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند مثلاً ہوائیں، جذر و مد اور آبشار وغیرہ کے علاوہ دیگر مبداء کی توانائی کو حیلی کاموں میں بالراست استعمال نہیں کیا جاسکتا اسلئے ہمیں ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اس کو حرارت یا برقی توانائی کی شکل میں تبدیل کیا جائے، مثال کے طور پر کوئلہ جب ہوا کی آکسیجن سے ملکر جلتا ہے تو اسکی توانائی حرارت کی شکل میں خارج ہوتی ہے اب اگر کوئی شخص اس توانائی کو استعمال کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حرارت کی توانائی کو حیلی توانائی میں تبدیل کرے۔ برخلاف اس کے جذر و مدیا ہوا کی توانائی کو بالراست حیلی کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض مبداء بالراست اور بعض بالواسطہ حیلی کاموں میں استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

جذر و مد کی توانائی (قمری و شمسی)

ہم نے قبل ازیں اس بات کو بیان کردیا ہے کہ زمین کے اپنے محور کے اطراف گھومنے سے جو توانائی بالحرکت حاصل ہوتی ہے اسکو انسان بالراست استعمال نہیں کرسکتا ہاں البتہ اس کا خارجی اثر قابل لحاظ ہے، ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ جذر و مد کے پیدا ہونے کی اصل وجہ چاند اور سورج کی کشش جاذبہ اور زمین کی توانائی بالحرکت کا اثر ہے، پس جذر و مد کی توانائی فی الحقیقت زمین کے اپنے محور کے گرد گھومنے سے پیدا ہونیوالی توانائی کا اثر ہے۔

جذر و مد کی توانائی کو کام میں لانے کے لئے سمندروں کے کنارے بڑے بڑے مصنوعی حوض بنائے جاتے ہیں، ان کو اونچے مقام پر تعمیر کیا جاتا ہے، جذر کے وقت پانی ان کے اندر بھر جاتا ہے اسکو ایک نالی کے ذریعہ خارج کیا جاتا ہے، اس کے اندر بڑے بڑے پنکھے دار چرخ ہوتے ہیں، پانی جب ان پنکھوں پر گرتا ہے تو وہ گھومنے لگتے ہیں، ان کے گھومنے سے ہم کسی مشین کو چلانے میں مدد لے سکتے ہیں

اگر چرخیوں کا دوہرا نظام استعمال کیا جائے یعنی اندر بہنے والے اور باہر بہنے والے پانی سے کام لیا جائے تو حاصل توانائی دوگنی ہوگی، اس طرح معاشی نقطہ سے اس میں بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔

جذر و مدی طاقت کو ایک دوسرے طریقے پر بھی استعمال کیا جاتا ہے، سمندر کے اندر ہوائی استوانے رکھے جاتے ہیں، جب موج اوپر چڑھتی ہے یعنی حالتِ اوج میں ہوتی ہے تو استوانہ کے اندر کی ہوا بھیچتی ہے اور پھر اس کے بعد پھیلتی ہے، اس طرح استوانہ میں ہوا کے پچکاؤ سے بجلی توانائی حاصل کی جاتی ہے۔

زمین کی اندرونی حرارت

قدیم زمانہ سے انسان زمین کی اندرونی حرارت سے اچھی طرح واقف ہے، آتش فشاں پہاڑوں سے انھیں اس بات کا کافی ثبوت ملتا تھا کہ زمین کے اندر حرارت موجود ہے جو راستہ پاکر باہر کی طرف خارج ہوتی ہے، قدیم زمانہ کے لوگ تو زمین کے اندرونی حصّہ کو دوزخ تصور کرتے تھے اور آتش فشاں پہاڑوں کو اس کے دود دان۔ ایک زمانہ تک ان کے دماغوں میں انہی خیالات کی پرورش ہوتی رہی لیکن جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا اسکی سائنٹفک توجیہ بھی پیش کیجانے لگی۔

زمین کی اندرونی حرارت سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جو کانوں کے اندر کام کرتے ہیں، تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ جیسے جیسے ہم زمین کے اندر جاتے ہیں تپش میں بتدریج اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ کوئلہ کی کان میں اس کا تجربہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ زمین کے قطر کے لحاظ سے زمین کے مرکز کی کافی بلند تپش ہونی چاہئے اور ایسا ہی ہے۔ زمین کے اندرونی حصّہ میں کافی حرارت موجود ہے، پہلی نظر میں یہ مبدا ہمیں کارآمد معلوم ہوتا ہے اسلئے کہ آئس لینڈ کی ایلو سٹون پارک اور نیوزی لینڈ کے بعض شمالی اضلاع میں بعض ایسے چشمے پائے جاتے ہیں جن سے گرم پانی نکلتا ہے، اسکی تپش ۹۰° فارنہیٹ ہوتی ہے۔ نظری حیثیت سے اس پانی کی تپش اور اس تپش میں جہاں سے یہ پانی نکل رہا ہے جو فرق ہے اس سے بہت فائدہ کی امید نظر آتی ہے لیکن عملی نقطۂ نظر سے یہ بات بالکل ناکام ثابت ہوتی ہے، علاوہ ازیں گرم پانی کے چشمے

محدود مقامات پر واقع ہیں اور وہ مقامات بھی کچھ اس قدر بکھرے ہوئے جنگلوں میں واقع ہیں کہ وہاں اپنے مقاصد کے لئے آبادی کا بسانا سخت مشکل ہے۔ مزید برآں ایسے مقامات پر آتش فشاں پہاڑوں کے پھوٹنے اور زلزلوں کے نمودار ہونے کا خوف لگا ہوا ہے، اسلئے ایسے مقامات انسانی مقاصد اور اغراض کے لئے ہرگز سودمند نہیں ہوسکتے۔

مغربی ورجینیا میں مقام وہیلنگ پر ۴۵۰۰ فٹ گہرا ایک سوراخ کیا گیا تھا، اوپری حصوں میں ۱۰۰ فٹ میں ۱° ف کا اضافہ ہوتا گیا اور نچلے حصوں میں ۶۰ فٹ میں ۱° ف کا بعض مقامات پر تپش کا اضافہ اس سے بھی زیادہ تر ہوتا ہے مثلاً شہر ورجینیا میں 'کام اسٹاک' کان میں تپش کا اضافہ اس قدر سرعت کے ساتھ ہوتا گیا کہ کام کرنے کے مقامات پر کی تپش ۱۷۰° ف تھی، ایسے نچلے حصوں سے جب پانی اوپر آتا ہے تو اسکی تپش گھٹ جاتی ہے اس لئے کہ پانی کے اوپر آنے تک حرارت کا بیشتر حصہ اسکے راستہ کے بازو کی چٹانوں اور طبقوں میں ایصال حرارت کی وجہ سے ضائع ہوجاتا ہے اور اس لئے جب پانی اوپر نکلتا ہے تو اسکی تپش ایک بڑی حد تک گھٹ جاتی ہے، بہرحال اس حرارت سے ہم عملی طور پر کوئی فائدہ اٹھانے کی توقع نہیں کرسکتے۔

لیکن اس سلسلہ میں ہمیں ایک اہم چیز کو بھی بیان کردینا چاہئے وہ یہ کہ زمین کی اندرونی حرارت ایصال حرارت کے ذریعہ اوپر آتی ہے جس کی مقدار گو بہت تھوڑی ہوتی ہے مگر پودوں وغیرہ کے نشو ونما میں کافی مدد دیتی ہے، اس لحاظ سے اس سے راست طور پر تو کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے البتہ بالراست ہماری زندگی میں یہ بہت فائدہ پہنچاتی ہے۔

آخر میں ہم اس بات کا بھی ذکر کردینا مناسب تصور کرتے ہیں کہ زمین کی اندرونی حرارت کو کام میں لانے کے لئے بیشمار تجاویز پیش کی گئیں اور کیجارہی ہیں جن میں سے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ زمین کے اندر ایک گہرا سوراخ اس مقام تک کیا جائے جہاں کی تپش پانی کو بھاپ بنا سکے۔ اس کے بعد اسمیں پانی ڈالکر بھاپ حاصل کیجائے اور پھر اسکی مدد سے انجنوں اور مشینوں میں مدد لیجائے، یہ تجویز فن انجنیرنگ کی نظر کرم کی

محتاج ہے اگر کامیاب ہوجائے تو پھر دنیا کا بہت سا کوئلہ بچنے کی اُمید ہوسکتی ہے۔

جوہر کی اندرونی حرارت:۔

حال ہی میں چند ایسے عناصر کا پتہ چلا ہے جن سے حرارت کا اشعاع ہوتا ہے، ایسے عناصر کی فہرست میں ریڈیم، یورانیم اور تھوریم کے نام قابل ذکر ہیں، ان عناصر کو نابکار اشیاء Radio-active Substances کہا جاتا ہے ان سے عہ، بہ اور جہ شعاعیں مسلسل خارج ہوتے رہتی ہیں جن سے ان کے جواہر کی اندرونی توانائی کا پتہ چلتا ہے، گویا ہر ایک جوہر بجائے خود توانائی کا ایک مبداء ہے جس سے مسلسل حرارت خارج ہوتے رہتی ہے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ایک گرام ریڈیم سے فی ساعت سو حرارے اور اسکی تمام زندگی میں ۱۰ حرارے خارج ہوتے ہیں۔ اس سے ہم بہت کام لے سکتے ہیں، سرطان کا علاج انہی شعاعوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے، ریڈیم کے نمک گھڑی کی سوئیوں کو رات کے وقت منور رکھتے ہیں۔

ان تین عناصر کے علاوہ اور بہت سے نابکار اشیاء ہیں، لیکن ابھی ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوئیں، اگر یہ بات تحقیق ہوجائے کہ کائنات کا ہر ذرہ بجائے خود ایک توانائی کا مبداء ہے جس کو انسان استعمال کرسکتا ہے تو دنیا کا مسئلہ توانائی سرے سے بدل جائیگا اور نہ معلوم دنیا اسوقت تمدن کے کس اسٹیج پر ہوگی۔

حرارت شمسی

اگرچہ آفتاب ہم سے ۹ کروڑ تیس لاکھ میل دور فاصلہ پر واقع ہے تاہم ہماری زندگی کا دار و مدار اس سے خارج ہونیوالی اشعاعی توانائی پر ہے اگر آج اس سے ہمارا تعلق منقطع ہوجائے اور توانائی کی وہ رسد جو وہاں سے ہم تک آتی ہے بند ہوجائے تو بس ہمیں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیگا اور صفحۂ زمین پر کسی ذی روح کی صورت نظر نہ آئیگی یہ آفتاب ہی کی حرارت ہے جو تمام مبداہائے توانائی کو برقرار رکھتی ہے اور ان میں اس بات کی صلاحیت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنی پوشیدہ توانائی کو ظاہر کریں

اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس کا ذکر کیا ہے سوائے دو کے باقی تمام مبداء توانائی دراصل اس بڑے مبداء کی وجہ سے ہیں اور سچ اگر پوچھو تو بالواسطہ طریقہ پر ہم سورج ہی کی توانائی کو استعمال کرتے ہیں، ہوا چلتی ہے تو بھی اسی کی وجہ سے، سمندر میں جذر و مد پیدا ہوتے ہیں تو اسکی ہی کشش کی وجہ سے، آگ جلتی ہے تو بھی اسی کی وجہ سے غرض کائنات کا پورا نظام اس واحد مبداء توانائی پر مبنی ہے۔

اب ہم سطور ذیل میں اس بات کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ سورج کی اشعاعی حرارت کو بالراست کیسے حاصل کیا جاتا ہے اور ایسا کرنے میں ہمارا کیا فائدہ ہے؟

زمین پر سورج کی توانائی جو اشعاعی توانائی کی صورت میں پہنچتی ہے بہت زیادہ ہے، خطِ استوا اور طول بلد ۴۵° شمال و جنوب کے درمیان کسی نقطہ پر فی مربع فٹ فی منٹ ... ۴ فٹ پونڈ توانائی پہنچتی ہے اس صورت میں جب کہ سورج کی شعاعیں سطح مذکور پر عمود وارانہ پڑ رہی ہوں، اگر اس توانائی کو حیلی توانائی میں تبدیل کیا جائے تو چار مربع فٹ سطح کی توانائی ایک اسپی طاقت کے برابر ہوتی ہے، سورج کی سطح کی تپش تقریباً ... ۹° مئی ہے اگر اس سے نکلنے والی توانائی کو راست طور پر تبدیل کیا جائے تو بہت فائدہ ہوگا لیکن ایسے طریقے فی الحال نامعلوم ہیں۔ ابتک ہم نے جو طریقے معلوم کئے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس سے پانی یا کسی سیال مثلاً سلفر ڈائی آکسائیڈ یا ایتھر کو گرم کرنے میں مدد لیجاتی ہے ان صورتوں میں تپش کسی طرح بھی ۲۰۰° سے بڑھنے نہیں پاتی، اگر اس کو حیلی توانائی میں تبدیل کیا جائے تو حاصل شدہ توانائی اس توانائی کا صرف ½ حصہ ہوگی، علاوہ ازیں انجن کے اندر حرارتی اور حیلی نقصانات سے وہ اور بھی گھٹ جاتی ہے۔ بہرحال چند لوگوں نے اس موضوع پر عملی تحقیق کی ہے اور نئے نئے طریقے بھی ایجاد کئے ہیں۔

فرانس اور ممالک متحدہ کے مشہور محققین موشات اور ارکسن نے اس میدان میں ابتدائی تحقیق کی ہے انہوں نے ایک ناقص مُنَاَیْنہ جو کھلی ہوئی چھتری کے مانند تھا استعمال کیا اور اسکو اس طرح مرتب کیا کہ سورج کی شعاعیں اس پر پڑھنے کے بعد منعکس ہوکر بائلر پر پڑیں اس طرح سے انہوں نے

... ۱ مربع فٹ سے منعکس ہونیوالی شعاعوں کو ایک نقطہ یعنی نقطۂ ماسکہ پر مرتکز کرکے ایک اسپی طاقت حاصل کی بالکل اسی طرح مگر کسی قدر بدلی ہوئی صورت میں مقام سپاڈونا پر ۱۸۹۵ء میں ایک تجربہ کیا گیا تھا، اس میں ناقص نما آئینہ استعمال کیا گیا جس میں آئینہ کے مستطیل ٹکڑوں کو اس طرح مرتب کیا گیا تھا کہ ہر ایک سے منعکس ہونیوالی شعاعیں بائلر پر پڑیں۔ جو آئینہ کے ماسکہ پر رکھا ہوا تھا، عکاس کا قطر ۱۳ فٹ ۶ انچ تھا، نیز اس میں اس طرح کا انتظام تھا کہ وہ سمت ساعت میں گھوم سکے تاکہ اس کا محور ہمیشہ سورج کی سمت میں رہے، اسکی تیاری میں تقریباً ... ۱ پونڈ صرف ہوئے تھے جو معمولی بائلر کی قیمت کا ۱۲ گنا ہے، اسمیں کئی نقص تھے، پہلے یہ کہ قیمت زیادہ، دوسرے اس کی ساخت کچھ اس قدر پیچیدہ تھی کہ اس کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے ایک کثیر رقم کی ضرورت تھی جو تجارتی لحاظ سے بالکل غیر مفید تھا۔

حال میں چند طریقے اور ایجاد ہوئے ہیں، نیڈلس نے اس موضوع پر بہت تحقیق کی ہے اور بہت سی پیچیدگیوں کو دور کر دیا اس نے حرارت جذب کرنے والی تختیوں کو استعمال کیا لیکن ہر صورت میں تجارتی اور صنعتی نقطہ نظر سے ناکامی نظر آئی۔ لیکن زمانہ کی ضروریات انسان کو نئی نئی ایجادات کی طرف مائل کرتی ہیں چنانچہ زمانہ حال کے محققین کے آگے جب کوئلہ کا سوال پیش ہوا تو انکی آنکھیں کھل گئیں اور تحقیق کے میدان میں انہوں نے بڑی ہمت سے اپنا قدم بڑھایا اور جاذب حرارت تختیوں کی ساخت و ترتیب میں انہوں نے بہت سی پیچیدگیوں کو دور کر دیا اور نئے نئے آلات ایجاد کئے جن کا تفصیل وار ذکر ہمارے موجودہ مضمون کی بساط سے باہر ہے۔

ہوا کی توانائی۔

قدیم زمانہ ہی سے لوگ ہوا کی طاقت اور اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ قدیم زمانہ میں عام طور پر اور اب بھی بعض جگہ جہازوں کو اسی کی طاقت سے چلایا جاتا ہے، ہوائی چکیوں کو بھی اسی کی مدد سے چلایا جاتا تھا۔ زمانۂ حال میں بھی اسی اصول کو کام میں لایا جارہا ہے اور ہوا کی اس طاقت سے مشین وغیرہ کے چلانے میں مدد لی جاتی ہے، معاشی نقطہ نظر سے توانائی کی یہ ارزاں ترین قسم ہے اسلئے کہ

ہوا ساری دنیا کی ملک ہے اور کسی کی بھی نہیں ۔

ہوا بالعموم فی گھنٹہ دس سے لیکر بیس میل تک کی رفتار سے چلتی ہے اس کے راستہ میں اگر گردشی پنکھوں کو رکھ دیا جائے تو وہ ہوا کی زد سے گھومنے لگتے ہیں، پھر اگر اسکا تعلق کسی مشین سے پیدا کر دیا جائے تو وہ بھی کام کرنے لگے گا ۔ اس میں نقص صرف یہ ہے کہ ہوا کا چلنا بالکل غیر یقینی چیز ہے کبھی چلتی ہے اور کبھی نہیں لیکن اس مشکل کو بہت آسانی سے دور کیا گیا ہے، اونچے اونچے مقامات پر بڑے بڑے حوض تعمیر کرائے گئے ہیں اور جب کبھی ہوا چلتی ہے تو مشین کی مدد سے پانی کو حوضوں میں پمپ کے ذریعہ داخل کر دیا جاتا ہے، حوضوں میں نالیاں بنائی جاتی ہیں اور پانی کو نیچے گرایا جاتا ہے اس کے راستے میں گردشی پہیے ہوتے ہیں، پانی جب بہتا ہے تو اسکی زد سے یہ پہیے گردش کرنے لگتے ہیں، اور ہم اس حاصل شدہ توانائی کو جو پانی کو اوپر چڑھانے میں خرچ ہوئی تھی پھر اُسے حاصل کرتے ہیں، اس سے فائدہ یہ ہوا کہ غیر یقینی توانائی اب ایک اختیاری چیز بن گئی ۔

پرانے زمانے کے آلات اور مشین بھونڈے تھے اس لئے اس سے کچھ ایسا نمایاں فائدہ حاصل نہ ہوتا تھا لیکن جدید اور نئے مشین اور نازک آلات کے ذریعہ اس توانائی سے بہت زیادہ فائدہ کی امید رکھنا کوئی بیجا بات نہیں ہے ۔

آبی توانائی ۔

دنیا کے اکثر حصّوں میں کثرت سے بارش ہوتی ہے، جنوبی امریکہ، کنیڈا، برطانوی ہند اور جنوبی امریکہ اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں " ان حصّوں میں پانی کی توانائی کو حیلی کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ ان میں فرانس، سوئیزرلینڈ اور اسپین خاص طور پر مشہور رہیں، ان مقامات پر آبی توانائی کو حاصل کرنے کے لئے نئی نئی تدابیر اختیار کیجارہی ہیں اور اسپین میں ایک اسکیم اس قسم کی بھی تیار ہو رہی ہے کہ اگر وہ کامیاب ہو جائے تو اس سے انھیں بیس لاکھ اسپی طاقت حاصل ہوگی، چنانچہ ان نئی تدابیر کی وجہ سے دس سال قبل جو آبی توانائی حاصل کیجاتی تھی اب اس کا تین گنا توانائی حاصل ہو رہی ہے، کنیڈا، جاپان

اٹلی، ناروے، سوئیڈن اور ہندوستان بھی اس میں خوب زور لگا رہے ہیں اس لئے کہ قدرت نے ان کے ہاں اس قسم کے ذرائع مہیا کر دئے ہیں صرف ان کا استعمال جاننا باقی ہے یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دنیا کے پانی کی توانائی سے سالانہ ۲ کروڑ اسپی طاقت حاصل کیجا سکتی ہے۔ یہ بہت ارزاں اور کارآمد ہے، مزید تحقیقات اسکو اور بھی ارزاں بنا دینگے اور صنعتی اور تجارتی دنیا بالکل بدل جائیگی۔ موجودہ زمانہ میں آبی طاقت سے جو توانائی حاصل کی جارہی ہے وہ اس کوئلہ کی توانائی کے برابر ہے جو سال بھر میں نکلتا ہے، شمالی سوئیڈن میں کثرت سے کوئلہ ہوتا ہے اور ناروے میں کم لیکن ناروے میں جو آبی توانائی حاصل کیجاتی ہے وہ سوئیڈن کے کوئلہ کی توانائی سے کہیں زیادہ ہے۔

اب ہم دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ آخر اس کو استعمال کیسے کیا جائے اور کیا طریق کار اختیار کیا جائے کہ یہ توانائی بآسانی ہم کو حاصل ہو، یوں تو اسکے لئے ہزاروں طریقے نکالے گئے ہیں جنکے تفصیل وار ذکر کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی تاہم ہم یہاں صرف ابتدائی اصول کو بتلا دینا چاہتے ہیں۔

کرہ ارض کے اکثر حصوں میں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں جہاں آبی طاقت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، دریاؤں کے راستے میں بے شمار نشیب و فراز اور موڑ ہوتے ہیں، یہاں آبی طاقت پورے طور پر نمایاں ہوتی ہے، ایسے مقامات پر بند تعمیر کروائے جاتے ہیں اور پھر پانی کو نسبتاً تنگ راستہ میں سے گزرنے دیا جاتا ہے جس کے اندر گردشی پہیے رکھے ہوتے ہیں جن کا تعلق کسی مشین سے ہوتا ہے، اس طرح سے آبی توانائی کو حیلی توانائی میں منتقل کیا جاتا ہے۔

جہاں قدرت نے آبشار مہیا کر دئے ہیں وہاں بے حساب توانائی حاصل کیجاتی ہے، امریکہ اور ناروے اس لحاظ سے مشہور ہیں۔ امریکہ کے زبردست آبشار نائیگرا (دنیا کا سب سے بڑا آبشار ہے) سے اس قدر توانائی حاصل ہوتی ہے کہ امریکہ کے سارے برقی کام اسی سے انجام پاتے ہیں۔ اس میں بھی پانی کی قوت سے گردشی پہیوں کو پھرانے میں مدد لیجاتی ہے اور اس سے برق پیدا کرنے والی یا دوسری مشنری کو چلایا جاتا ہے۔ نائیگرا پاور کمپنی میں ایک عجیب انتظام ہے، گردشی پہیوں کو کافی گہرائی کے اندر رکھا گیا ہے اور وہاں سے

توانائی کو انتقابی ڈنڈے کے ذریعہ برق پیدا کرنے والے مشین میں منتقل کیا جاتا ہے جو سطح آب سے کسی قدر اوپر رکھا ہوتا ہے۔

پانی کی اس طاقت کو حاصل کرنے کے لئے جو اخراجات ہوتے ہیں ان کا انحصار زیادہ تر مقامی اور طبعی خصوصیات پر ہے، جن مقامات پر قدرتی آبشار اور بڑے بڑے دریا واقع ہیں وہاں آبی توانائی سستے داموں حاصل ہوتی ہے برخلاف اس کے جہاں مصنوعی طور پر اس کام کو کیا جاتا ہے اخراجات بڑھ جاتے ہیں لیکن ہر حالت میں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے، نائیگرا آبشار میں فی اسپی طاقت سالانہ ۱۵ شلنگ خرچ ہوتے ہیں بجائے اس کے دوسرے مقامات پر اس کے لئے ۶ پونڈ سے لیکر ۲۰ پونڈ تک درکار ہوتے ہیں، عام طور پر حرارتی انجن کی توانائی تجارتی اعتبار سے آبی توانائی سے زیادہ فائدہ بخش ہے، یہ اس وقت کی بات ہے، ممکن کیا بلکہ یقین ہے کہ کچھ سال کے اندر اندر نئے طریقے اس کو فائدہ بخش بنا دینگے، ان مقامات پر جہاں جلانے کی اشیاء مثلاً کوئلہ، لکڑی تیل وغیرہ گراں ہیں وہاں اب بھی یہ مفید ثابت ہوتی ہے۔

متحجرات سوختنی کی توانائی۔

متحجرات کی توانائی، توانائی کی سب سے ارزاں ترین قسم ہے، ابتدائے آفرینش سے لیکر ابتک انسان اس کو برابر استعمال کرتا چلا آرہا ہے اور امید ہے کہ کچھ دن اور یہ توانائی ہمارے کاموں میں ہاتھ بٹاتے رہیگی، ہمارا موجودہ تمدن جو "سنہری تمدن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس بیدار توانائی کا ممنون احسان ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں اس کا بھی افسوس ہے کہ متحجرات کے اندر جو توانائی بالقوہ موجود تھی اس کو دور حاضرہ کے عیش پرست ہاتھوں نے بہت جلد ٹھکانے لگا دیا اور اب وہ بالکل قریب الختم ہے کوئلہ، تیل اور گیس سب کی سب ایک حد تک ختم ہو گئے ہیں، اگر ان کے خرچ کی یہی رفتار رہے تو آنیوالی نسلوں کے لئے کچھ بچ نہ رہیگا۔ لیکن ضرورت ایجادات کی ماں ہے آئے دن اس کی تلافی کے لئے نئی نئی تجاویز پیش کیجارہی ہیں جن کا مختصر ذکر ہم نے اوپر کر دیا ہے۔

کوئلہ بالعموم خانہ داری کے کاموں میں، طاقت پیدا کرنے کے لئے اور صنعت وحرفت کے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے، جلتے ہوئے کوئلہ کی توانائی کو پہلے حیلی توانائی میں تبدیل کیا جاتا ہے جس سے مشین چلائے جاتے ہیں، جوشدانوں کا انحصار اسی پر ہے۔

خانہ داری کے کاموں میں کوئلہ کی ایک معتدبہ مقدار خرچ ہوتی ہے لیکن اگر ہم بجائے اسکے کوئلہ کی گیس استعمال کریں تو یہ ہمارے لئے بیحد مفید ہوگا۔ جب کسی فزنیق میں گیسی کوئلہ کو رکھکر گرم کیا جاتا ہے تو اس سے جو گیس نکلتی ہے اس میں کوئلہ کو جلانے کی قابلیت کی اٹھارہ فیصدی قابلیت موجود ہوتی ہے اسکے علاوہ گیسی کوک بچ رہتا ہے جس میں کوئلہ کے لحاظ سے ۶۰ فیصدی حرارت پہنچانے کی قابلیت موجود ہوتی ہے نیز کچھ کول ٹار Coal tar بھی بچ جاتا ہے جو تیل کی انجنوں میں کام آتا ہے، اس لحاظ سے اگر مناسب طریقے پر کوئلہ کی گیس کو استعمال کیا جائے تو اس سے دوگنا فائدہ ہونے کی امید ہے۔

طاقت پیدا کرنے کے کاموں میں جب کبھی ٹھوس سوختنی چیز کو استعمال کرنا ہوتا ہے تو اسکے دو طریقے ہیں ایک تو اس کو راست طور پر بھٹی کے اندر گرم کرکے جوشدانوں کو حرارت پہنچائی جاتی ہے دوسرے اس سے گیس پیدا کرکے اندرونی احتراق پذیر انجن کے استوانہ کے اندر اسے جلایا جاتا ہے، اس کو نہایت آسانی کے ساتھ بغیر کسی قسم کے نقصان کے حیلی توانائی میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ ایک ٹن گیس کوئلہ سے ۱۰۰۰ مکعب فٹ گیس، ۱۵ پونڈ کوک اور ۱۱۰ پونڈ گیس ٹار Gas tar حاصل ہوتا ہے علاوہ ازیں اس سے روشنی کرنے کا بھی کام لیا جاسکتا ہے۔

پٹرولیم کے متعلق ہم نے مضمون کے ابتدائی حصہ میں شرح وبسط کے ساتھ بتلا دیا ہے کہ اسکو زمین کے اندر سے حاصل کرتے ہیں اور اسکی توانائی کو طاقت پیدا کرنے کے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے

نباتات کی توانائی۔

ہر پتے کے اندر چھوٹے چھوٹے خلیے ہوتے ہیں جن کے اندر سبز رنگ کا ایک مادہ ہوتا ہے جس کو کلوروفل کہتے ہیں، سورج کی روشنی میں وہ ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کو حاصل کرتا اور زمین سے

پانی حاصل کرکے کاربن کو پودے کا ایک نامیاتی جز بنا دیتا ہے۔ اس کے ریشوں کی ترتیب میں جو چیز سب سے زیادہ حصہ لیتی ہے، وہ سیلولوس ہے جو ایک کاربوہائیڈریٹ ہے جس میں ۴۴ فیصدی کاربن ۶ فی صدی ہائیڈروجن اور ۵۰ فیصدی آکسیجن ہوتی ہے۔

اکثر پودوں مثلاً آلو، چاول، گیہوں وغیرہ میں یہ کاربوہائیڈریٹ نشاستہ کی صورت میں موجود ہوتا ہے اور بعضوں میں شکر کی ایک خاص مقدار حاصل ہوتی ہے، ان کو الکحل میں بآسانی تبدیل کیا جاسکتا ہے حال کی تحقیقات اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ جوش یا اُبال کے طریقے سے اس قسم کی نباتات مثلاً لکڑی کے برادے وغیرہ سے بھی ہم اس کے وزن کا تقریباً ۱۸ فیصدی الکحل حاصل کرسکتے ہیں۔ بحیثیت ایک سوختنی شئے کے الکحل اندرونی احتراق پذیر مشینوں میں بہت کام آتا ہے اور بعض صورتوں میں تو الکحل اپنی حرارتی قابلیت کے لحاظ سے پٹرول اور مٹی کے تیل سے بھی بڑھ جاتا ہے۔

ساگوان کی لکڑی جلانے کے کام میں آتی ہے، خصوصاً جبکہ وہ خشک ہوتی ہے اس سے کافی توانائی حاصل کیجا سکتی ہے۔

پودوں سے حاصل ہونے والے میووں اور ان کے بیجوں سے بھی توانائی حاصل کیجا سکتی ہے، یعنی ان سے تیل نکالا جاتا ہے مثلاً ارنڈی کا تیل، کھوپرے کا تیل وغیرہ، مٹر کے تیل کو ڈائیسل انجن میں استعمال کیا جاتا ہے، ارنڈی کا تیل بھی بحیثیت ایک سوختنی شئے کے مختلف تجربات میں بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ چونکہ اس قسم کے پودے اکثر مقامات پر بے شمار تعداد میں اُگتے ہیں اس لئے اس کی توانائی بہت فائدہ مند ہے۔

غذا کی توانائی۔

ہم روزانہ جو غذا کھاتے ہیں اسکی توانائی ہم میں حرکت کرنے کی قابلیت پیدا کرتی ہے، انسانی توانائی کا دارومدار غذا پر ہے، اگر انسان غذا کا استعمال چھوڑ دے تو اس سے نقل و حرکت کی قابلیت مفقود ہو جائیگی۔ غذا رگ پٹھوں میں توانائی پیدا کرتی ہے، اس سے خون بنتا ہے۔ اور

سارے جسم میں دوڑنے لگتا ہے ۔ ہر آغاز چمن؟

سطور بالا میں ہم نے توانائی کے مختلف مبداؤں کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے جو ہو گیا ہوگا کہ کائنات کا ہر ایک ذرہ بجائے خود توانائی کا ایک قدرتی مبداء ہے جو انسان کے کام آسکتا ہے بشرطیکہ وہ اس کے استعمال سے واقف ہو ۔ اکثر مبداء کی توانائی ختم ہو چکی ہے اور آئے دن توانائی کے نئے نئے مبداء دریافت ہو رہے ہیں، ان تمام مبداء میں سب سے زیادہ اہم شمسی حرارت ہے، اگر انسان کوئی ایسا طریقہ نکالے جس سے اس مبداء کی توانائی راست طور پر حاصل کی جاسکے تو پھر ہم کو توانائی حاصل کرنے کے لئے اس قدر دقت اٹھانی نہ پڑیگی ۔ ہوا کی توانائی بھی خاص اہمیت رکھتی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے یہ ہر ایک کی ملک ہے اور پھر کسی کی ملک نہیں ۔ جوہر کی اندرونی توانائی کے راز کا افشاء بھی مسئلہ توانائی میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ ان باتوں کا لحاظ کرتے توانائی کے مسئلہ کا میدان بہت وسیع ہے جس میں آنیوالی نسلوں کو جولانیاں دکھلانے کا کافی موقع حاصل ہے !

آوازِ چمن

از جناب محمد عبدالقیوم صاحب خانصاحب باقی متعلم ایم۔اے (فائنل) کلیہ جامعہ عثمانیہ

چھیڑ اُس سُور سے اے بادِ سحر سازِ چمن
گوشِ انجم بھی ہوں دیوانہ آوازِ چمن

شبنم جلوہ فزا، نکہتِ گل، بادِ صبا
رہزنِ ہوش ہے کیفیتِ پروازِ چمن

پرشکستہ، قفسِ تنگ، زباں پر نغمے
دیکھنا ہمتِ مردانہ جانبازِ چمن

ایک آئینہ ہے آغاز کا، انجامِ بہار
ایک تصویر ہے انجام کی، آغازِ چمن

آہ و نالے سے بھی ڈرتا ہوں کہیں اے صبا
تجھکو بھا جائے نہ دلسوزیٔ آوازِ چمن

لالہ و گل میں نظر آنے لگے داغِ جگر
ہے یہ افسونِ محبت کہ ہے اعجازِ چمن

نغمہ بنکر کبھی نکلی گلِ تر کی صورت
ہوگئی بند کبھی غنچہ میں آوازِ چمن

پرشکستہ مجھے یوں چھوڑ نہ دے بھول نہ جا
یاد ہے مجھکو ابھی لذتِ پروازِ چمن

آوازِ چمن

از جناب محمد عبدالقیوم صاحب خانصاحب باقی متعلم بی۔اے (فائنل) کلیہ جامعہ عثمانیہ

چھیڑ اُس سُور سے اے بادِ سحر سازِ چمن
گوشِ انجم بھی ہوں دیوانہ آوازِ چمن

شبنم جلوہ فزا، نکہتِ گل، بادِ صبا
رہزنِ ہوش ہے کیفیتِ پروازِ چمن

پرشکستہ، قفسِ تنگ، زباں پر نغمے
دیکھنا ہمتِ مردانہ جانبازِ چمن

ایک آئینہ ہے آغاز کا، انجامِ بہار
ایک تصویر ہے انجام کی، آغازِ چمن

آہ و نالے سے بھی ڈرتا ہوں کہیں اے صیاد
تجھکو بھا جائے نہ دلسوزیٔ آوازِ چمن

لالہ و گل میں نظر آنے لگے داغِ جگر
ہے یہ افسونِ محبت کہ ہے اعجازِ چمن

نغمہ بنکر کبھی نکلی گلِ تر کی صورت
ہوگئی بند کبھی غنچہ میں آوازِ چمن

پرشکستہ مجھے یوں چھوڑ نہ دے بھول نہ جا
یاد ہے مجھکو ابھی لذتِ پروازِ چمن

بھبھوتی

سنسکرت زبان کا ایک شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار

از جناب رگھوناتھ راؤ صاحب بھوساری یم۔اے متعلم ال ال۔بی (فائنل) کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

سنسکرت ڈرامہ نگاروں میں جو شہرت اور اہمیت کالیداس کو حاصل ہے اس کا یہاں تفصیلی تذکرہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس مقام پر اتنا لکھ دینا ضروری ہے کہ کالیداس نہ صرف سنسکرت کے بلکہ دنیا کے ان عظیم المرتبت ڈرامہ نگاروں میں سمجھا جاتا ہے جن کو دائمی شہرت اور لازوال مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ کالیداس کے بعد اگر کوئی دوسرا شاعر سنسکرت ڈرامہ نگاروں کی صفِ اولین میں جگہ پانے کا مستحق ہوسکتا ہے تو وہ بھوبھوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کالیداس کا ڈرامہ "شکنتلا" ان معدودے چند ڈراموں میں تصور کیا جاتا ہے جن کے تازہ اور مقبولیت میں صدیوں کے گذر جانے کے بعد بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ لیکن بھوبھوتی کا شاہکار "اوتر رام چریت" بھی فن ڈرامہ نگاری کے لحاظ سے کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ شکنتلا کے بعد اوتر رام چریت کو بھی سنسکرت لٹریچر میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور وہ اس زبان کا ایک عظیم الشان کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

ذیل میں ہم بھوبھوتی کے حالاتِ زندگی پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسکے

ساتھ ساتھ مختصر طور پر اس کے مشہور ڈراموں کے مطالب اور انکی خصوصیات کا ذکر بھی کئے دیتے ہیں تاکہ ناظرین اس بڑے شاعر سے اچھی طرح واقف ہوجائیں اور اس کے شاہکاروں سے بلاواسطہ مستفید ہونے کا شوق ان کے دلوں میں پیدا ہو۔

بھوبھوتی کے حالات زندگی

یہ امر مسلمہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں اہل ہند کو تاریخ نگاری سے بہت کم دلچسپی رہی ہے ہندوستان والوں نے اپنے غور و فکر کے نتائج کو محفوظ رکھنے میں تو بہت کچھ جد وجہد کی لیکن اپنے افعال اور اعمال کی کرشمہ سازیوں کی طرف انھیں مطلق اعتنا نہیں تھا، یہی باعث ہے کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ بڑی حد تک ناقص اور روایتوں یا افسانوں کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ اس عجیب غریب رجحان نے مشاہیر ہند کے حالات زندگی پر ایسا تاریک پردہ ڈالدیا ہے کہ اب محققین کو ان کا پتہ چلانا بہت دشوار نظر آتا ہے۔ خود کالیداس جیسے گرانپایہ شاعر کے متعلق سنسکرت کے ادب میں بہت کم معلومات پائی جاتی ہیں اس لحاظ سے بھوبھوتی میں کچھ زیادہ خوش نصیب نہیں ہے۔ سینکڑوں کتابوں کی چھان بین کرنے کے بعد بھی اسکے حالات زندگی پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ تاہم یہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہے کہ بھوبھوتی نے اپنی کتابوں کے دیباچوں میں تھوڑا بہت اپنا حال بھی لکھ دیا ہے۔ بھوبھوتی کے یہ دیباچے اس لحاظ سے کہ ان سے اس کی زندگی کے کچھ حالات معلوم ہوجاتے ہیں تاریخ ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر کہیں یہ دیباچے تلف ہوجاتے تو پھر اس کے متعلق کسی قسم کی معلومات کا فراہم کرنا تقریباً ناممکن ہوجاتا۔ بھوبھوتی کی مذکورۂ بالا تحریرات سے جو علم ہم کو اس کی زندگی کے حالات کے متعلق ہوا ہے اس کو ہم یہاں اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

اہل دکن کے لئے یہ امر باعث فخر و مباہات ہے کہ سنسکرت کے اس عظیم الشان ڈرامہ نگار نے اس سرزمین میں جنم لیا۔ صوبۂ برار میں پدمپور ایک قصبہ تھا۔ یہاں اس کا خاندان جو اودمبر کے نام سے مشہور تھا بود و باش رکھتا تھا۔ یہ خاندان کرشن یجروید اور تتریہ شاکھا کا پیرو تھا۔ اس خاندان کا بانی کاشیپ رشی[1]

---

[1] ویدوں میں کئی رشیوں (وسیوں) کے نام پائے جاتے ہیں۔ ان رشیوں میں سے کاشیپ رشی بھی ایک ہیں۔ چند منطروں کے نام سے منسوب ہیں۔

مقبول بھوبھوتی کے اس خاندان کے اکثر لوگ ویدانتی علوم کے ماہر تھے اور ان کو سوم یاگ کرنے کی عزت بھی حاصل تھی۔ بھوبھوتی کے دادا کا نام بھٹ گوپال، والد کا نام نیلکنٹھ اور اس کی والدہ کا نام جتوکرنی تھا۔ بھوبھوتی کا دوسرا نام یا لقب شری کنٹھ بھی تھا۔ اس کے استاد یا گرو کا نام گیان ندھی بتلایا گیا ہے جو اجین میں رہا کرتا تھا۔ بھوبھوتی کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے تحصیل علم کی خاطر اجین کا سفر کیا تھا اور وہاں اسے گیان ندھی سے شرف تلمذ حاصل ہوا تھا۔ اسکے ڈراموں کا اگر تعمق نظر سے مطالعہ کیا جائے تو صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ صرف و نحو، علم بلاغت اور منطق میں کافی مہارت رکھتا ہے اس کے علاوہ اس امر کا پتہ بھی چل جاتا ہے کہ اسے ویدوں، اپنشدوں، سانکھیہ اور یوگ کے فلسفے سے بھی خاص واقفیت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بھوبھوتی کی زندگی کچھ زیادہ خوشگوار حالات میں نہیں بسر ہوئی۔ اسے دنیا میں بہت سے تلخ تجربات حاصل کرنے پڑے۔ ابتداء میں لوگ اسکی شاعرانہ قابلیتوں کے قائل نہیں تھے ظاہر ہے کہ کالیداس، بھاس اور بان جیسے مشہور شعراء کا کلام پڑھنے والے غریب بھوبھوتی کو کیوں خاطر میں لاتے۔ عرصہ دراز تک وہ ایک گمنام شاعر کی حیثیت میں زندگی بسر کرتا رہا۔ لیکن ان ناموافق حالات سے اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ اس نے ڈرامہ نگاری کو اپنا مقصدِ زندگی بنالیا اور بالآخر سنسکرت لٹریچر میں ایک وقیع درجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اپنے مشہور ڈرامہ "مالتی مادھو" میں وہ زمانے کی ناقدردانی کا شکوہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے کہ

"لوگ میری تصنیفات کو دیکھکر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ ان کو ایسا کرنا زیبا ہے کیونکہ ان کی معلومات بہت وسیع ہیں واضح ہو کہ میں ایسے حضرات کے لئے اپنی کتابیں نہیں لکھتا ہوں۔ میں جو کچھ بھی کام کر رہا ہوں اس توقع پر کر رہا ہوں کہ آج یا کل زمانہ حال میں یا مستقبل میں کوئی نہ کوئی میرے کلام کو دیکھنے والا پیدا ہو ہی جائیگا کیونکہ زمانہ لامنتہا اور دنیا بہت وسیع ہے"۔

اس عام ناقدردانی کی وجہ سے بھوبھوتی کی طبیعت میں قنوطیت پیدا ہوگئی تھی

چنانچہ اس کا اثر اسکی تصانیف میں جا بجا نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

بھبھوتی کس دور کا شاعر ہے

بھبھوتی کے سوانح نگار کو سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ وہ اسے کس دور کا شاعر قرار دے۔ اسکی تحریرات سے اس خاص مسئلہ پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اس نے سین کا تذکرہ کرنے کی گویا قسم کھائی ہے۔ ایسی صورت میں سوائے اسکے کہ روایتوں کی طرف رُخ کیا جائے اور کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ ایک مشہور روایت میں بھبھوتی کو کالیداس کا معاصر بتلایا گیا ہے اور اسے راجہ بکرماجیت کے نورتن میں شامل کیا گیا ہے۔ مگر یہ روایت حسب ذیل وجوہات سے بالکل غلط معلوم ہوتی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ ہند میں بکرماجیت نام رکھنے والے راجہ متعدد گزرے ہیں۔ اس امر کا پتہ چلانا کہ روایت مذکور میں کس بکرماجیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تقریباً ناممکن ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دونوں شاعروں کی زبان اور طرز بیان میں عظیم الشان اختلاف نظر آتا ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ ان دونوں شاعروں کے درمیان کم از کم تین چار صدیوں کا فرق ہونا چاہیے اس قسم کی عام روایات سے مایوس ہوکر ہم نے زیادہ صحیح معلومات حاصل کرنے کی خاطر تحقیق کے میدان میں گھوڑے دوڑانے شروع کئے۔ خوش قسمتی سے ہمیں کشمیر کی ایک قدیم تاریخی کتاب راجترنگینی کا پتہ چلا جو سنسکرت کے مشہور شاعر لکھن کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں چند سطور ایسی پائی جاتی ہیں جن سے ہمیں بھبھوتی کے زمانے کے متعلق نہایت قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ چنانچہ مذکورۂ بالا کتاب میں ایک مقام پر لکھن لکھتا ہے کہ:—

"قنوج کے راجا یشوورما کو جس کے دربار میں واکپتی اور بھبھوتی جیسے قادر الکلام شاعر تھے کشمیر کے راجا للتیا دتیہ نے شکست دی"

اس فقرے سے حسب ذیل امور کا صاف طور پر پتہ چل جاتا ہے۔

ایک تو یہ کہ یشوورما کے زمانے میں بھبھوتی قنوج کا درباری شاعر تھا۔

دوسرے یہ کہ ۶۹۰ء تک اسکی شاعری کی خاصی شہرت ہو چکی تھی۔

شنکر پانڈورنگ پنڈت نے اپنی کتاب گورہو کے دیباچے میں للتیا رتنہ کی تخت نشینی کا سال ۶۹۰ء قرار دیا ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ تخت نشینی کے کچھ دنوں بعد ہی اس نے یشو ورما کو شکست دی۔ ان وجوہات کی بناء پر ہم نے جو نتیجہ نکالا ہے اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ علاوہ ازیں بھبھوتی کے معاصر واکپتی راج کے ایک شعر سے بھی ہمارے مذکورہ بالا خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے

"بھبھوتی کی شاعری کے ناپید کنار سمندر سے میں بھی فیضیاب ہوا ہوں"۔ "میرے کلام میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ اسی کے طفیل سے ہیں"۔

بھبھوتی کی تصانیف

آجکل بھبھوتی کی تصانیف میں اس کے صرف تین ڈرامے موجود ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اس نے اور کتابیں بھی تصنیف کی ہوں جن کا نام و نشان گردش زمانہ نے بالکل مٹا دیا۔ قدیم زمانے کے بہت سارے نامور شعراء کا کلام آج دنیا میں پایا نہیں جاتا۔ ممکن ہے کہ بھبھوتی کا کچھ کلام بھی اسی طرح نایاب ہو گیا ہو۔ ہمارے اس خیال کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ سنسکرت نظموں کے کئی مجموعوں میں بعض بعض نظمیں ایسی بھی ملتی ہیں جن کو بھبھوتی کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ بہرحال کچھ ہو۔ آجکل تو اس کے صرف تین ڈرامے موجود ہیں۔ ان ڈراموں کے علاوہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اور کتابیں بھی تصنیف کیں یا نہیں۔

ذیل میں ہم ان ڈراموں کے پلاٹ اور انکی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں

مہاویرچریت۔ یہ بھبھوتی کا پہلا ڈرامہ ہے۔ مہاویرچریت کے لفظی معنی "بہادر کی سوانحعمری" ہیں۔ اس میں سری رامچندر کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں۔ اس ڈرامے کا ماخذ والمیکی کی مشہور عالم تصنیف "رامائن" ہے تاہم اسمیں اور رامائن میں بعض مقامات پر اہم فرق موجود ہے۔ یہ فرق فن ڈرامہ نگاری کے لحاظ سے عمداً پیدا کیا گیا ہے۔ اس ڈرامہ میں جس واقعے کو سب سے زیادہ نمایاں کیا گیا ہے وہ راون کی سازش ہے۔ گویا یہ سازش ایک نقطۂ مرکزی ہے جس کے اطراف اور واقعات ایک دائرے کی

شکل میں چکر لگاتے ہیں ۔ ڈرامہ کا آغاز رشی وشوامتر کے آشرم میں ہوتا ہے ۔ یہاں رامچندر سیتا پر اور ان کے بھائی لکشمن اور میلا پر عاشق ہوتے ہیں ۔ سیتا اور اور میلا متھلا کی شہزادیاں ہیں ۔ راجہ راون جو رامچندر کا رقیب ہے رامچندر سیتا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ اپنا ایک قاصد راجہ جنک کے دربار میں بھیجتا ہے ۔ راجہ جنک سوئمبر کا اعلان کرتا ہے اور شیو دھنش (دیوتا شیو کی کمان) کو توڑنے کی شرط لگائی جاتی ہے ۔ رامچندر اس شرط کو پورا کرتے ہیں اور سیتا کے ساتھ ان کی شادی دھوم دھام سے ہو جاتی ہے ۔ راون کے قاصد کو یہ بات بہت ناگوار گذرتی ہے اور وہ پیچ و تاب کھاکر وہاں سے چلا جاتا ہے

دوسرے ایکٹ میں راون اس کی بہن اور اس کا وزیر رامچندر کے خلاف سازش کرتے ہیں ۔ یہ تینوں حکمت عملی سے پرشرام[1] کو اس بات پر آمادہ کر لیتے ہیں کہ وہ شیو دھنش کے توڑے جانے کا انتقام لینے کے لئے متھلا جائے اور رامچندر کو نیچا دکھائے ۔ پرشرام متھلا جاتا ہے اور رامچندر کو مقابلے کے لئے للکارتا ہے

تیسرے ایکٹ میں راجہ دشرتھ، رشی وشیشٹھ[2] اور دوسرے لوگ کوشش کرتے ہیں کہ پرشرام لڑائی سے باز رہے مگر ان کی یہ کوشش بیکار جاتی ہے ۔

چوتھے ایکٹ میں رام اور پرشرام دونوں کی لڑائی ہوتی ہے اور پرشرام مغلوب ہو جاتا ہے اسکے بعد راون کا وزیر مایاوان اپنی ہمشیرہ کو راجہ دشرتھ کی رانی کی ایک خادمہ منتھرا کا بھیس بدلنے اور اسکے محل میں جاکر نااتفاقی پیدا کرنے پر آمادہ کرتا ہے ۔ یہ فرضی خادمہ راجہ دشرتھ کے محل میں داخل ہو جاتی ہے اور وہاں سازش کو مکمل کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔ کچھ دنوں کے بعد وہ متھلا روانہ ہو جاتی ہے جہاں کہ رامچندر جی اپنے خسر راجہ جنک کے مہمان کی حیثیت میں ابتک ٹھیرے ہوئے ہیں اور انہیں راجہ دشرتھ کی رانی کیکئی کی جانب سے ایک جعلی خط دیتی ہے ۔ اس خط میں حسب ذیل امور کا ذکر کیا گیا تھا ۔

---

[1] ہندوؤں کے ہاں دس اوتار ہیں ۔ ان اوتاروں میں پرشرام چھٹے اوتار مانے جاتے ہیں ۔

[2] رامچندر جی کے گرو کا نام ہے ۔

(۱) راجہ دشرتھ کے انتقال کے بعد کیکئی کا بیٹا بھرت تخت و تاج کا وارث ہوگا۔

(۲) رام کو چودہ سال کے لئے بن باس بننا پڑیگا۔

رام ان امور سے جب مطلع ہوتے ہیں تو اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بن باس اختیار کرتے ہیں بھرت اس امر کی سخت کوشش کرتا ہے کہ رام بن باس اختیار نہ کریں اور راجہ دشرتھ کے حقیقی جانشین کی حیثیت سے تخت و تاج کے مالک بنیں لیکن اس کی ایک نہیں چلتی۔ رام، سیتا اور لکشمن اجودھیا سے قطع تعلق کر کے جنگل چلے جاتے ہیں اور بھرت اپنی خواہش کے خلاف ان کی بجائے حکومت کرتا ہے۔

پانچویں ایکٹ میں جٹایو اور سمپاتی کا ایک طویل مکالمہ درج کیا گیا ہے۔ یہ دونوں پرندے ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ سمپاتی جو بڑا بھائی ہے جٹایو سے رام کی اسیری اور راکشسوں کی تباہی کے حالات بیان کرتا ہے اور آخر میں اسے ہدایت کرتا ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے رام کی مدد کرے جٹایو کی اس ہدایت پر عمل کرنے کا بہت جلد موقع ملجاتا ہے۔ اتفاقاً وہ راون کو دیکھتا ہے کہ راجکماری سیتا کو زبردستی پکڑ کر اپنے ملک کی طرف لئے جارہا ہے اس امر سے جٹایو کو بہت غصہ آتا ہے اور وہ بیدھڑک راون سے لڑ پڑتا ہے اور اسی مقابلہ میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ رام اور لکشمن سیتا کے گم ہو جانے سے سخت رنجیدہ اور پریشان ہوتے ہیں اور اسکی تلاش میں جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ آخر کار ایک جوگی انہیں حقیقت حال سے مطلع کرتا ہے۔ اسی پریشانی کے زمانے میں راون کا بھائی بھاشن جس کو اس نے شہر بدر کر دیا تھا رام سے ملنے کی خواہش کرتا ہے۔

رام اور لکشمن پھرتے پھراتے رشمو کہ پہاڑ پر پہنچتے ہیں جہاں کہ سیتا نے اپنے جواہر پھینکے تھے۔ اس مقام پر راون کا وزیر راجہ والی کو ترغیب دیتا ہے کہ رام کی مزاحمت کرے۔ والی رام سے لڑتا ہے اور لڑائی میں زخمی ہو کر مر جاتا ہے۔ مرنے سے پیشتر وہ اپنے بھائی سوگرو کو رام سے ملنے کی ہدایت کرتا ہے۔ چنانچہ بعد میں رام اور سوگرو کی ملاقات ہوتی ہے اور ان دونوں میں دوستی اور محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

چھٹے ایکٹ میں راون کا دیوان سازش کی کامیابی سے مایوس ہوجاتا ہے اور اسے ہنومان کے ہاتھ سے لنکا کے جلنے کی خبر ملتی ہے ۔ راون کی بیوی مندودری اپنے شوہر کے متعلق حقارت آمیز گفتگو کرتی ہے ۔ آنگو، رام کے قاصد کی حیثیت میں راون کے دربار میں جاتا ہے اور سیتا کی رہائی کی کوشش کرتا ہے ۔ لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوتی اب لکشمن غضبناک ہوکر راون سے لڑنے پر آمادہ ہوتا ہے ۔ ان دونوں کے درمیان بہت سخت لڑائی ہوتی ہے ۔ اس لڑائی کو اندر دیوتا اور چترا تھ آسمان سے دیکھتے ہیں اور اس کے حالات سے عوام کو مطلع کرتے ہیں ۔ راون بہادری سے لڑتا ہے ۔ آخر میں ہنومان آب حیات (امرت) کی مدد سے رام اور اس کے ساتھیوں کو زندہ کرتا ہے اور اس کے بعد راون اور اس کا بیٹا دونوں ہلاک ہوجاتے ہیں

ساتویں ایکٹ میں سیتا آگ میں کود کر اپنی پاکدامنی کا ثبوت دیتی ہے ۔ رام اور انکے رفقاء اپنے مقاصد میں کامیاب ہوکر ایک اڑن کھٹولے کے ذریعہ اجودھیا پہنچتے ہیں ۔ یہاں بھرت اور رام کی والدہ ان کا پرجوش استقبال کرتے ہیں ۔ بعد ازاں وشوامتر کی امداد سے رام تخت نشین ہوتے ہیں۔

مہاویرچرت کا پلاٹ اختصار کے ساتھ بیان کردیا گیا ۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامہ کے متعلق چند خاص خاص باتوں کی طرف اشارہ کردیا جائے ۔

اس ڈرامہ میں بھبھوتی نے رام کو شرافت، دلیری اور دوسری اخلاقی خوبیوں کے ایک بہترین نمونے کی حیثیت میں پیش کیا ہے ۔ رام کی سیرت نگاری میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے ۔ اگرچہ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ رام نہ صرف ایک فانی انسان بلکہ دیوتا ہیں تاہم اپنے ڈرامے میں وہ انھیں محض انسان کی حیثیت میں پیش کرتا ہے ۔ یہ بات بھبھوتی کے کمال فن پر دلالت کرتی ہے ۔ مہاویرچرت میں رام کی سیرت کے حسب ذیل خصوصیات کو زیادہ نمایاں کرکے دکھایا گیا ہے ۔

رام ایک بہادر اور نڈر آدمی ہیں ۔ وہ کسی کے خلاف نہ تو سازش کرتے ہیں اور نہ انہیں کسی سے دشمنی ہے ۔ وہ دوستوں کی محبت میں وفادار ہیں ۔ سخاوت انکی فطرت میں داخل ہے ۔ وہ اپنے

فرائض کو ہمیشہ محسوس کرتے ہیں اور ان کو پورا کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتے ہیں ۔

اس ڈرامے کا انداز بیان وہی ہے جو مشہور آفاق شاعر بان کے بعد سنسکرت لٹریچر میں رائج ہوا ۔ واضح ہو کہ بان ساتویں صدی عیسوی کا شاعر ہے ۔ اسی بنا پر محققین کا خیال ہے کہ بھبھوتی کالیداس کا معاصر نہیں ہو سکتا ۔

مہاویر چرت نقائص سے بالکل خالی نہیں ہے ۔ دقت نظر سے اگر اس کا مطالعہ کیا جائے تو چند خاص معائب نمایاں طور پر نظر آجاتے ہیں ۔ مثلاً اس میں جٹایو اور سمپاتی کا مکالمہ یا اندر اور جتر رتھ کا مکالمہ بہت زیادہ طویل اور غیر ضروری ہے ۔ ان مکالموں سے مصنف کی علمی قابلیت کا پتہ تو چل جاتا ہے لیکن اس کے فن ڈرامہ نگاری پر حرف آتا ہے علاوہ ازیں اس میں کیریکٹروں کا ارتقا بھی کچھ کم زور سا نظر آتا ہے ۔

(باقی آئندہ)

راج کماری

از جناب ابوالکلام محمد بدرالدین صاحب بدر متعلم بی بی یس عثمانیہ سابق متعلم کلیہ

تمکنت ناز و ادا اور وہ بانی تیری
حسن پر ایک قیامت ہے جوانی تیری
کتنی رنگین ہے طفلی سے کہانی تیری
دعوت دار و رسن نرم بیانی تیری
تیرے مشتاقوں میں ہے نغمۂ آہن برپا تیرے ابرو کے اشاروں نے کئے رن برپا
نازکی وہ ہے کہ موجِ نفسِ گل سے سوا
غیرتِ حسن کہ خورشید نہ دیکھے چہرا
اتنی مغرور کہ خاطر میں نہ آئیں راجا
تیرا کاشانہ ہے کچھ بامِ فلک سے اونچا
دل ہمالہ سے قوی تر پہ ہے نازک اتنا دونوں آنکھوں سے رواں بات میں گنگا جمنا

سُورما کھیچ کے چلے ہیں تیرا ڈولہ لینے
ہار اک بار گلے ڈال کے تو ہار بنے
اپنے شوہر کی رضا جوئی ہو منظور تجھے
آپنے بات تو ناموس پہ تو نذر چڑھے
آبرو تیری ہو جانباز کی تلوار و نپر تو کرے رقص دہکتے ہوئے انگارو نپر
تو ہے وہ پھول تمناؤں سے جو آئے نظر
جو بڑھے راجا و پرجا کی دعائیں لیکر
روز و شب در پہ نگہبان ترے شمس و قمر
ابر رحمت ہے کہ آکاش کا منڈل سر پر
مایۂ ناز ہے تو قوم کی پیاری تو ہے دیس کی نور نظر راج دلاری تو ہے

آٹھویں صدی ہجری میں مصر و شام کی ڈاک کا انتظام

از جناب حمید اللہ صاحب متعلم ایم اے، ال ال بی (عثمانیہ)

تمہید

"التعریف بالمصطلح الشریف" فن انشاء کی ایک عربی انسائیکلوپیڈیا ہے جو ۷۴۲ھ میں یعنی اب سے زائد از (۶۰۰) سال قبل تالیف ہوئی۔ بروکلی مان کی تاریخ (ادب اللغۃ العربیہ) کی فہرست[1] سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے متعدد نسخے کتب خانہ ایا صوفیہ، قاہرہ، لائیڈن وغیرہ میں موجود ہیں۔ اسکے مصنف کا نام ابو العباس احمد بن ابو المعالی یحیی بن فضل اللہ القرشی العدوی العمری الشافعی ہے۔ اسکے مزید حالاتِ زندگی و کارنامہ حیاتِ علمی کا مواد مذکورۂ فہرست کے علاوہ فوات الوفیات میں بھی ملتا ہے۔ گو یہ کتاب ۱۳۱۲ھ میں قاہرہ میں چھپ چکی ہے لیکن چونکہ اس قسم کے مواد سے اردو ادب خالی ہے اور یہ کتاب اس شخص کی تالیف ہے جو سرکاری میر منشی ابن میر منشی تھا جسکی بناء پر یہ مواد مستند قرار پاتا ہے، اس لئے اس کا مختصر تذکرہ اور ایک باب کا اقتباس غیر دلچسپ نہ ہوگا۔

---

[1] جلد دوم صفحہ ۱۴۱ C. Brockelmaun, Gaschichte der Arab'schen Letterature

کتاب کے سات باب ہیں۔ پہلے کا عنوان "رتب المکاتبات" ہے اسمیں جہاں سلاطینِ عالم سے فرداً فرداً ہر ایک کے القاب، خط کی تمہید وغیرہ بیان ہوئے ہیں وہیں اس ملک کے اہم حالات کا بھی محل ذکر اسکی اہمیت اور دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔ خلیفۂ وقت اور بیسیوں دیگر سلاطین اسلام مثلاً "محمد بن طغلق" شہنشاہِ ہند اور "صاحب البلغار" وغیرہ کے تذکروں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بادشاہوں اور حکمرانوں وغیرہ کا بھی بیان اس میں موجود ہے۔ دوسرے باب میں "عادات العہود والتقالید والتفاویض والتوافیع والمراسیم والمناشیر" یعنی مختلف قسموں اور ورجوں کے معاہدے کرنے کے خاکے اور مسودے دئے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں قسموں کے متعلق اور چوتھے میں "الامانات والدفن والھدن والمواصفات والمفاسحات" کا ذکر ہے۔ پانچواں باب تاریخی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں ہر ملک وریاست کا جغرافیہ اور اس زمانے کے حدود وغیرہ بیان ہوئے ہیں۔ چھٹے باب میں چند فصلیں "ڈاک اور کبوتروں کے اسٹیشنوں" کے متعلق ہیں۔ اور یہ مقالہ اسی پر تحریر کیا گیا ہے۔ اس باب میں تجارتی اور مسافرتی بندرگاہوں وغیرہ کا بھی مختلف فصلوں میں ذکر ہے۔ ساتواں اور آخری باب "ایسے امور کے متعلق ہے جن کی عموماً ضرورت پیش آیا کرتی ہے"۔ اس آخری باب کی سات فصلیں ہیں۔

اس موقع پر جیسا کہ اوپر بیان ہوا صرف یہ بتایا جائیگا کہ اس وقت ڈاک کا کتنا باقاعدہ اور منظم انتظام تھا۔ ضمناً اسلامی ڈاک کی تاریخ بھی آگئی ہے

ڈاک

"ڈاک کے متعلق قاعدہ ہے کہ ہر چار فرسخ پر اسٹیشن ہوں۔ ہر فرسخ تین میل کا ہوتا ہے۔ ہر میل میں تین ہزار گز ہوتے ہیں۔ ہر گز میں چوبیس انگل اور ہر انگل کے چھ جَو اور ہر جَو کے چھ خچر کے بال ہوتے ہیں۔ اسی ناپ پر ڈاک کا عمل ہے۔

لیکن ڈاک کے موجودہ مرکزوں میں اس کا لحاظ نہیں ہے کیونکہ بعض کی مسافت میں تفاوت پایا جاتا ہے جو کبھی تو پانی کی دوری کے سبب اور کبھی کسی گانوں سے مانوس رہنے کے باعث واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض جگہ ایک کی بجائے دو برید (اسٹیشن)

کرنے پڑتے ہیں۔

ڈاک کا انتظام اکاسرۂ ایران وقیاصرۂ روم کے عہد میں بھی تھا لیکن مجھے (مولف کتاب التعریف بالمصطلح الشریف کو) ان کی صورت اور پیمانے کا حال معلوم نہیں۔

اسلام میں سب سے پہلے معاویہ بن ابی سفیانؓ نے "برید" کا انتظام کیا۔ یہ اسوقت رائج کیا گیا جب "امیر المومنین علیؓ" کا انتقال ہوگیا اور ان کے بیٹے اور جانشین حضرت امام حسنؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں سلطنت وخلافت سے دست بردار ہوگئے۔ آپ نے اپنی سلطنت کے ہر حصے سے جلد سے جلد خبریں حاصل کرنے کی غرض سے ایرانی دہقانوں اور رومی واقف کاروں کو جمع کرکے ان کو اپنے منشا و مقصد سے آگاہ کیا۔ انہوں نے حسب الحکم "برید" کی تنظیم کی اور اس سلسلہ میں خچر سے کام لیا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسکی اولیت کا سہرا خلیفہ عبدالملک بن مروان کے سر ہے جس نے عمرو بن سعید الاشدق، عبداللہ بن زبیر، مصعب بن زبیر اور مختار بن ابی عبید کی "بغاوت وخروج" کے خاتمے کے بعد اس کا انتظام کیا اور اس کے ذریعے سے قسطنطنیہ سے طلا کاری کیلئے منگا کر دمشق کی جامع مسجد، اور مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کی مسجدوں کی آرائش کی۔ جسکی کچھ باقیات اب بھی (۱۳۴۶ھ میں) جامع دمشق کے صحن، قبوں اور اس کے آس پاس پائی جاتی ہیں مکے میں باب بنی شیبہ اور دار الحجلہ کے پاس مہدی کے اضافہ کردہ حصے میں یہ طلا کاری دیکھی جاسکتی ہے جس کو تا حال مہدی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ بیت المقدس میں صخرۂ مبارک اور محراب القبلی کے پاس اسکے کچھ آثار باقی ہیں۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ برید کے ذریعے مزار نبویؐ پر درود وسلام بھیجا کرتے تھے۔

اسکے بعد عرصے تک ڈاک کا انتظام قائم رہا۔ لیکن بنی امیہ کے خاتمے اور بنی عباس کے برسر حکومت آنے کے عہد میں خراسان وعراق میں سلسلۂ تعلقات منقطع ہوگیا۔

خاندان خلافت عباسیہ میں مہدی کے زمانے تک اس طرف کوئی توجہ نہیں کیگئی

خلیفہ مہدی نے اپنے بیٹے ہاروں رشید کو جب ایک موقع پر سپہ سالار بنا کر بھیجا تو احوال و کوائف سے باخبر رہنے کے لئے اپنے اور لشکر گاہ کے درمیان برید کا انتظام کیا جو ہر وقت تازہ بہ تازہ نو بہ نو اخبار پہنچانے لگی۔ اس سفر جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی یہ انتظام بھی برخاست ہوگیا۔ ہاروں رشید جب خود تخت نشین ہوا تو ایک دن اسے یہ انتظام بھی یاد آیا اور اپنے وزیر اعظم یحییٰ بن خالد برمکی کے مشورے سے سلطنت کے صوبہ جات سے باضابطہ خبریں حاصل کرنے کا بندوبست کیا اور وہی طریقہ اختیار کیا جو بنی امیہ کے دور میں رائج تھا۔ مختلف مرکزوں پر خچر جمع کئے گئے اور اسکے ذریعہ خلیفہ اور خبر رساں خط و کتابت کرنے لگے۔

یہی حالت مامون رشید کے زمانے تک رہی۔ بنی بویہ نے جو خلفاء عباسیہ کی کمزوری سے ان پر غالب آرہے تھے اس سلسلۂ برید یا ڈاک کو منقطع کر دیا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے حالات خلیفے سے مخفی رکھنا چاہتے تھے تاکہ اچانک بغداد پر حملہ کر کے خلیفہ سے من مانی باتیں منوالیں۔

سلجوقی بادشاہوں نے بھی یہی طریقہ جاری رکھا کیونکہ انکی خانہ جنگی اور باہمی نزاعات حسب منشا گھڑ جڑ دھے اور خچر سوار ڈاکئے روانہ کرنے سے مانع تھے۔

جب زنگی خاندان حکومت کرنے لگا تو برید کے لئے اعلیٰ نسل کی اونٹنیاں منتخب کر کے مقرر کیں۔ بنی ایوب نے بھی اپنے زوال تک اس کو جاری رکھا۔

ان کے بعد ترکی خانوادے حکمران ہونے لگے تا آنکہ ملک الظاہر بیبرس[1] کے زمانے میں مصر و شام اور حلب سے فرات تک تمام ممالک ایک ہی علم کے زیر نگین ہو گئے۔ دمشق میں یہ خاص انتظام ہوا کہ وہاں ایک ایک نائب، وزیر، قاضی اور کاتب الانشاء متعین ہوئے۔ اور میرے

---

[1] مصنف کو یہ روایت مفصل و مطول طور پر جمال الدین الدواداری نے جو برید کے نام سے موسوم اور ابن سدید سے معروف ہے بیان کی تھی۔

(مصنف کتاب کے) چچا "الصاحب شرف الدین ابو محمد عبد الوہاب" کاتب الانشاء مقرر ہوئے۔ جب وہ اپنے مستقر جانے سے قبل حضور میں باریاب ہوئے تو انھیں ہدایات دی گئیں ہمیشہ مرکز اعلےٰ کو تاتاریوں اور فرنگیوں کی تازہ کارستانیوں اور دیگر حالات سے باخبر رکھیں اور کہا گیا "اگر ممکن ہو تو ہر رات مجھے تازہ خبریں پہنچایا کرو"۔ پھر زمانہ قدیم اور عہد خلفاء کی ڈاک کے عمدہ انتظام کا تذکرہ سنا تو بادشاہ نے انھیں بھی اسی طرح عمل کرنے کا حکم دیا۔

یہ برید اب تک باقی ہے اور اتنی اہمیت و وسعت اختیار کر چکی ہے کہ اسکی موقوفی کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔

موجودہ مراکز برید

مصر میں تین جہتوں سے ڈاک آتی ہے (۱) مرکز قلعہ جبل محروسہ سے قوص اور پھر اسوان جانے کے لئے پہلے جیزہ جاتی ہے وہاں سے زاویہ حسین، منیۃ القائد۔ (نو قائم شدہ مرکز) ونا، بیا، دہروط، اقلوسنا ہو کر منیہ بن خصیب پہنچتا ہے جو دریائے نیل کے کنارے آباد ہے۔ یہاں عمدہ چراگاہیں ہیں۔ مدرسے، حمام اور بازار بھی کچھ کم نہیں۔ کہتے ہیں کہ امیر خصیب نے اپنی حکومت مصر کے زمانے میں اسے اپنے بیٹے کے لئے بسایا اور اسی کے نام سے موسوم کیا اور جواب بھی مشہور ہے۔ ڈاک یہاں سے اشمونین جاتی ہے جو صعید کا ایک شہر ہے اور یہیں پائے تخت بھی ہے۔ پھر ذروۃ سربام جاتی ہے جو شریف حسن الدین بن تغلب کی طرف منسوب ہو کر ذروۃ الشریف بھی کہلاتا ہے۔ یہ شریفی مستقر تھا۔ یہاں ان کے قصر اور مکانات موجود ہیں یہ بھی نیل کے کنارے آباد ہے۔ یہاں سے منفلوط، اسیلوط (یہ دونوں صعید میں ہیں) طما مراغہ (یا مرایغ)، بلشن بوزہ (یا بلزبوزہ)، جرجہ، بلینہ اور ہو جاتی ہے۔ اس سے قریب کوم احمر واقع ہے اور یہ دونوں صرف خاص سلطان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہیں مغربی میدانوں کا سرسبز علاقہ

ختم ہو جاتا ہے اور ریتیلے میدان خانق دندرا سے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں سے ڈاک قوص جاتی ہے پھر اسوان، نوبہ اور سواکن تک بھی "ہمن" کے ذریعے جاتی ہے۔

(۲) اسکندریہ کے دو راستے ہیں پہلے قلعہ محروسہ سے براہ قلیوب، منوف، محلہ (مدینہ غزیہ)، اور تحریر پہنچتی ہے۔ دوسرا راستہ مرکز قلعہ سے جیزہ، جزیرۃ الفطہ، دردان، طراز زاویہ مبارک (یا انباوک)، دھنور اوشس سے ہوتا ہوا اسکندریہ پہنچتا ہے۔

(۳) دمیاط جانے کے لئے سعیدیہ سے جس کا ذکر نیچے آئیگا راستہ پھر پھوٹتا ہے۔ چنانچہ قلعہ محروسہ سے سعیدیہ جاکر اشموم الرمان جاتے ہیں اور پھر دمیاط پہنچتے ہیں۔

فرات

قلعۃ الجبل المحروسہ سے "مراکز اخذہ" کے ذریعے فرات جانے کے لئے پہلے سریاقوس جاتے ہیں اس کے قریب خانقاہ ناصریہ اور بازارات بھی ہیں یہاں سے بیر البیضا اور بلبیس پہنچتے ہیں جو سلطانی گھوڑوں کا آخری مرکز ہے۔ سلطانی گھوڑوں کے لئے سائس اور چارہ وغیرہ سرکاری اہتمام میں ملتا ہے۔ اس کے بعد مقررہ برید عربی قبائل کے ہاتھ میں ہے۔ ان کو گھوڑوں کا کرایہ دیا جاتا ہے۔ ہر ماہ کی پہلی کو نوبت بہ نوبت یہ لوگ ہر مرکز پر اپنے گھوڑوں کے ساتھ آتے ہیں۔ ایک ماہ ایک لوگ دوسرے ماہ دوسرے لوگ آتے ہیں۔ اسکی نگرانی کے لئے ایک سرکاری عہدہ دار مقرر ہے جو اس نوبت کے گھوڑوں کو سرکاری نشان کا داغ لگاتا ہے۔

ان مرکزوں میں سے پہلا سعیدیہ ہے جہاں سے خطارہ، قبر الوالی (جو عمارات چشموں اور باغوں کے باعث خوب آباد ہو رہا ہے)، صالحیہ، (جو مصری علاقے کا آخری معمور شہر ہے) بیر غزی قصیر (کریم الدین وکیل الخاص الناصری نے یہاں ایک مکان مسجد اور اذاں گاہ تعمیر کی تھی مگر سوائے آخر البیان کے سب منہدم ہو گئے ہیں۔ اس اذاں گاہ سے روشنی گھر کا کام لیا جاتا ہے اسکے قریب ہی کاقوا کا قدیم مرکز ہے جس کے متصل ایک پل کے نیچے سے طغیانی کے زمانے میں علاقہ رمل کا

پانی بہ جاتا ہے) جب وہ (یہاں عمارت و پانی معدوم ہیں صرف شہادت {داغ اندازی} کے لئے گھوڑے یہاں ٹھہرتے ہیں اور پانی ساتھ لاتے ہیں) غربلی، قطبا، صبیحہ نخل معن (اس کو مخفف کرکے کوئی ایک لفظ بولتے ہیں)، مطیلب، سواوہ، وواوہ، (یہاں ایک چھوٹا سا قریہ اور ملک الاشرف خلیل کی بنائی ہوئی مسجد ہے۔ فخرالدین کاتب الممالک نے یہاں ایک رباط تعمیر کی تھی جو بعد میں فروخت ہوگئی) بیرالقاضی، (وواوہ اور اس میں فاصلہ بہت ہے) عرنیش (کریم الدین وکیل خاص نے یہاں ایک مضبوط و محفوظ مسافر گھر بنایا ہے اور پانی کا بھی انتظام کیا ہے۔ رات کو مسافر یہاں رہتے ہیں اور فرنگی ڈاکوؤں سے اطمینان رہتا ہے)، خروبہ (یہاں بھی مسافر گھر ہے جو فخرالدین کاتب نے تیار کرایا تھا) ڈاک پہنچتی ہے۔ شہادت زدہ گھوڑے یہاں ختم ہوجاتے ہیں۔ اس سے آگے جانے کے لئے سرکاری گھوڑے اور اصطبل ہیں۔ چنانچہ یہاں سے زعقہ، رمح، سلقہ (یہ بیزنطینی ڈاک کا بھی مرکز تھا) غزہ کی راہ سے ملاقس، بلدالخلیلؑ، جنبا، صافیہ ہوکر کمرک جاتے ہیں۔

اگر دمشق جانا ہو تو غزہ (مذکورۂ صدر) سے جلجین، (جو مرکز برید گویا ڈاک خانہ یا پوسٹ آفس ہے) بیت دراس، (یہاں ناصرالدین خزندار تنکری نے ایک عمارت بنائی ہے۔ پہلے یاسور میں ٹھہرتے تھے مگر فاصلہ زیادہ ہونے سے اب اسے اسٹیشن بنایا گیا ہے) قطری (یہاں ایک وقف کا کواں ہے اور طاجار الدوادار الناصری کے جو اس مرکز کی تجدید کا مشیر تھا، آثار موجود ہیں۔ اور لدو بلیت، دراس، یاسور میں مسافت زیادہ ہونے سے بہت مفید ثابت ہو رہا ہے) لد عوجا (یہ راستے سے ہٹ کر ہے اگر یہاں سے بدلی جائے تو بہتر ہو) طیرہ (یہاں مکان ناصرالدین دوادار تنکری نے بنانا شروع کیا تھا جس کو اس کے بعد دوسروں نے مکمل کیا) فاقون، فحمہ، جینین پہنچتے ہیں۔ یہاں سے ایک راستہ نین اور حطین ہوکر صفد بھی جاتا ہے۔ دمشق جانے کے لئے زرعین، بلیان، مجامع (یہ ۱۳۴۱ء میں بطور زاید مقرر ہوا)؟

زحر اربد جامع (امیر کاخل نے طفس سے قربت کے باعث اسے اسٹیشن بنایا

پہلے ڈلی یعنی راس المار میں تھا) صنمین، غباغب، کسوہ، دمشق اسٹیشن تھے۔

دمشق سے متعدد شاخیں پھوٹتی ہیں چنانچہ قصیر۔ قطیفہ۔ قسطل۔ قارا۔ بریج العطش۔ فسولہ۔ یہاں سے طرابلس کو بھی راستہ جاتا ہے۔ شمین۔ حمص۔ حماہ۔ طمین۔ جرابلس۔ معرہ۔ انقرابا۔ آباد۔ قنسرین۔ حلب۔ باب۔ تناجور۔ بیرہ۔ یہ ایک زبردست قلعہ ہے اور شروع سے ابتک مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔

قصیر۔ قطیفہ۔ قطنہ۔ (یہاں کوئی مرکز نہیں ہے صرف جوتے بنتے، روٹی اور صدقہ ملتا ہے)۔ جلجل۔ مضع۔ قرتین۔ حیر۔ بیضا۔ تدمر۔ ارک۔ شخنہ۔ کوائل۔ قباقب۔ رحبہ۔ (مشرقی سرحد پر آخری اسٹیشن ہے)

دمشق سے بریج الفلوس۔ ارنیب۔ نصران۔ صفد تک

دمشق سے خان میشلون۔ زبدل۔ حصین۔ بیروت تک

دمشق سے خان میشلون۔ جزین۔ صیدا تک (صیدا سے بیروت جانے والوں کے لئے ایک مرکز ہو سکتا ہے)

دمشق سے خان میشلون۔ کرک نوح (صوبہ بقاع کا مستقر) بعلبک تک

دمشق سے زبدانی۔ بعلبک۔ قصیا۔ فسولہ۔ قصب۔ قدس۔ انمار۔ شعرا عرقا۔ طرابلس۔

دمشق سے براہ جبر حمص جاتے ہیں پھر سلمیہ۔ بفدید۔ سوریا

دمشق سے براہ جبر عین یزال۔ صہلان۔ خابور۔ راس العین

دمشق سے مصیاف، حمص میں بھی راست اتصال ہے۔

دمشق سے براہ طفس۔ قنیبہ۔ برج ابیض۔ خشبان۔ (اور دو مزید مرکزوں کے بعد) کرک۔

دمشق سے صوبۂ ولات کو براہ صفقہ ۔ طفس ۔ اذرعات جاتے ہیں ۔
حلب جانے کے لئے نمبر (۱) کے آخری مشہور اسٹیشن بیرہ ہوکر جاتے ہیں۔ اس سے آگے سموقہ ۔ سندرا ۔ بیت الغار ۔ عینتاب ۔ بہشنی ہیں یہاں سے قیساریہ وغیرہ بھی جاتے ہیں ۔
عنیتاب مذکورۂ بالا سے قلعۃ المسلمین ایک مرکز ہے اور یہیں فرات ہے قلعۃ المسلمین سے جسر الحجر اور لنخا پر یہ سلسلہ منتہی ہوتا ہے
حلب سے ارجاب ۔ تیزین ۔ یغرا ۔ یغراض ۔ (ارمینیا کی سرحد پر ہے) مایاس ایاس جاتے ہیں ۔
حلب سے جبول ، بالس ، جعبر بھی ایک سلسلہ ہے اور یہ حلب کے مرکزوں کا خاکہ ہے ۔
باقی دوسرے قلعے اور منتظم صوبہ جات انھیں کی ذیلی شاخوں یا ایک سے دوسرے کی راہ میں واقع ہیں ۔

طرابلس کے مرکز

طرابلس سے مرقیہ ، بلنیاس ، لاذقیہ (یہاں کی بندرگاہ بہترین اور درجۂ اول کا شمار ہوتا ہے) صہیون (قلعہ اور سابق پائے تخت ہے ۔ اور تاریخی حیثیت سے بہت سے واقعات کا موقع رہا ہے) بلاطنس ، قلیعہ ، کہف ، قدموس خوابی ، رصافہ ، مصاف ۔ صہیون سے برزید کو بھی ایک راستہ جاتا ہے ۔

ممالک محروسہ سے متصل بریدی راستے

حمصیرہ الاردو کے ہیں جو ہلاکو خاں کے جانشینوں کے قبضے میں ہیں ۔ ان کے مرکزوں کو "خیل الاولاق" اور "خیل الیام" کہتے ہیں ۔ مگر یہاں کے گھوڑے وغیرہ نہ تو سلطانی ملک ہیں اور نہ کام کرنے پر مجبور ۔ وہ صرف اپنی مرضی سے عربی قبائل اہل مصر

کی طرح ڈاک لاتے لیجاتے ہیں۔

کبوتروں کی ڈاک

سب سے پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کی ابتدا موصل سے ہوئی اور فاطمی خلفاء مصر اس سے کام لیتے رہے اس کے لئے ایک خاص محکمہ قائم کیا اور کبوتروں کے اترنے کے مقامات مقرر کئے۔

محی الدین بن عبد الظاہر نے ایک فاضلانہ کتاب "تمایم الحمام" کے نام سے اسی بارے میں لکھی ہے۔

موصل کی اس "ایجاد" پر سب سے پہلے نورالدین بن زنگی نے ۵۶۵ھ میں توجہ کی اور اس سے فائدہ اٹھایا۔

مراکز اس کا جال تمام اسلامی ممالک میں بچھا ہوا ہے چنانچہ گو اب مصر سے قوس اسوان اور عینتاب سے تعلق ٹوٹ گیا ہے لیکن پھر بھی قاہرہ سے اسکندریہ، قاہرہ سے دمیاط، قاہرہ سے سویس، قاہرہ سے بلبیس (سرحد شام پر) صالحیہ، قطیا، دلداده غزہ، قدس شریف تک، غزہ سے نابلس، غزہ سے لد، قاقون، جینین، صفد، تک، جینین سے بلیان، اربد، طبش، صیحین، دمشق تک۔ اور پھر ان میں سے ہر ایک سے متصلہ مشہور مقامات تک مثلاً بلیسان سے اذرعات اور طبش تک (والی الولات یعنی گورنر جنرل کو باخبر رکھنے کیلئے) پھر دمشق، بعلبک، قارا، قریتین تک، قارا سے حمص، حماہ، معرہ، حلب، بیرہ، قلعۃ المسلمین بہنسی تک اور آس جہاں کہیں بھی ضرورت ہو انتظام ہے، پھر قریتین سے تدمر، سخنہ، قباقب، رحبہ تک اتصال ہے (البتہ واضح رہے کہ آجکل سخنہ سے قباقب کو کبوتر نہیں لیجاتے ہیں بلکہ تدمر کے چٹھی رساں ہی جو سخنہ میں رکھے گئے ہیں قباقب پہنچاتے ہیں)

یہ خلاصہ ہے اس کبوتری ڈاک کے مرکزوں کا جو اب (۱۳۴۶ھ) میں ممالک اسلامیہ میں قائم ہیں۔ محفظ

کبوتروں کی اور معمولی ڈاک کا خریطہ جس میں ان ممالک کا نقشہ بنا کر اتصال دکھایا جا سکتا ہے اگر تیار ہو تو باعث دلچسپی ہوگا۔ مذکورۂ بالا مقالے سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ برید کتنی منظم اور باقاعدہ تھی۔

فطرت اور زندگی

از محمد جلال الدین اشک

ابر سیاہ فام سے تاریک تھی فضا — جھکڑ تھے تیز و تند ہوائے شمال کے
زہرہ تھا آب آب کڑک سن کے رعد کی — گم ہو گئے تھے ہوش ہمارے خیال کے
پانی کا زور و شور غضب کا بلا کا تھا — ٹکڑے سے اڑ رہے تھے ردائے جلال کے
البتہ برق نور فگن تھی کبھی کبھی — ظلمت دکھا رہی تھی کرشمے جمال کے

فطرت دکھا رہی ہے تماشائے زندگی
کر غور تا کہ تجھ کو نظر آئے زندگی

دنیا فضا ہے ابر سیہ نامراد یاں — جھکڑ یہ تیز و تند ہیں آہ سرد ہے
یہ رعد کی کڑک ہے صدا انقلاب کی — عزم ثبات جس کے مقابل میں گرد ہے

مینہ کا وفور دیدۂ تر کا ہے جوش اشک
لمعانِ برق عشق و محبت کا درد ہے

اردو نثر اور محمد عظمت اللہ خان مرحوم دہلوی

از جناب سید وزیر حسن صاحب (عثمانیہ)

جناب من! السلام علیکم

اس لحاظ سے کہ خانصاحب مرحوم کو مجلہ سے بھی محبت تھا تعلق رہا، ذیل کا مضمون مرسل ہے رسالہ نمائش کے عظمت نمبر کے لئے تیار ہوا تھا؛ جو سنا ہے: مختلف رکاوٹوں سے اب شائع نہیں ہوگا۔ اس لئے توقع ہے کہ مجلہ کی قریب ترین اشاعت میں اسے شائع فرماکر منت گوار فرمایا جائے گا۔ فقط خاکسار

سعید متعلم بی اے (عثمانیہ)

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

خدا کی شان ہے: جو خیالات سال بھر پہلے خوشی خوشی سپرد قلم ہوتے آج درد کی ٹیس، دکھ کی چبک کے ساتھ ادا ہو رہے ہیں! محترم خانصاحب جنت میں ہیں اور سب کو مرنا ہے ہیچ یوں ہے: موت نے گلشن علم وادب کا یہ پھول عین بہار میں توڑا۔ اس علم کے پتلے کو زمانے نے آسانی سے میٹ تو دیا، مگر یقین مانئے مدت کی لگاتار روادوی کے بعد بھی یہ اسکی نظیر بمشکل پیدا کرے تو کرے۔

جوانمرگ مہدی افادی، ڈاکٹر بجنوری، اور خانصاحب جیسے بزرگ ـــــ خدا انھیں کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے! دنیائے اردو کی ایسی ضائعاتِ علمیہ ہیں کہ برسوں ماتم سرائی پر بھی ہمیں اب ان کا نعم البدل مل چکا!!

فرصت مساعد ہو تو جی چاہتا ہے: مرحوم کی ممتاز شخصیت پر کئی حیثیت سے روشنی ڈالی جائے۔ اس سے انکی زندگی کے متعدد پہلو ایک گرانقدر رہبرے کی طرح جگمگا اٹھیں گے۔ کیوں؟ کہ مرحوم جس طرح ایک اچھے شاعر، اچھے ادیب تھے؛ اچھے دوست، اچھے بھائی غرض اک اچھے انسان تھے۔ اُن کا مرثیہ خصوصی چاہتا ہے کہ وہ عام طور پر روشناس ہوں۔ مگر آہ! اس خیال سے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے کہ اُس بہشت نصیب کے رحیلِ جنت ہونے سے پہلے جب کبھی اظہار خیال کرنا چاہا، کوئی نہ کوئی ناگزیر رکاوٹ پیدا ہو گئی؛ گویا ہاتھ مُنہ کِل گئے تھے، جو مرحوم کے جیتے جی لکھتے یا کہتے بن ہی نہ پڑی۔ اب کہ وہ محبِ صادق آغوشِ الٰہی میں ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا اور کس لیے لکھیے!

خیر! تعمیلِ فرمایش کے طور پر جو بن پڑا، نذر ہے۔ مرحوم کی نظم و نثر کے دو مجموعے زیرِ انشاعت ہیں۔ اُن میں علاوہ متعلقہ انتقاد کے سوانح کا حصہ بھی ہوگا؛ اس لئے سردست اُن کی نثر کی حذاقت ہی اجمالاً کچھ عرض کر دینا ٹوٹی پائنٹ سمجھتا ہوں۔

خانصاحب کے حصۂ نثر میں ان مضامین سے الگ، جو وقتاً فوقتاً نقیب، لسان الملک، علی گڑھ میگزین، ترقی، بہارستان، نمایش اور مجلّہ میں آب و تاب سے نکلے؛ رسالۂ اردو کے مضمون "حضرت میر درد" اور "شاعری" بھی شامل ہیں۔ ان کے ادبی وقار اور ادبی سنجیدگی کا تقاضہ ہے کہ تنقید کی لپیٹ میں ضمناً مرحوم کے سلامت ذوق، ذہنی اٹھان اور فلسفیانہ گہرائی پر بھی قلم اٹھایا جائے۔ مگر یہ لیاقت کا کام ہے۔ جسے باستحقاق ملک کے فاضل تر طبقہ کے لئے چھوڑا جا سکتا ہے؛ بشرطیکہ ہمعصرانہ کوششوں کے اعتراف میں وہ بخل سے کام نہ لے

اور کھل کے داد دے۔ میں یہاں اختصار سے کام لیکر سرسری طور پر کچھ نہ کچھ کہہ جاؤنگا؛ انہیں ایک تو میرا پردہ رہا جاتا ہے۔ دوسرے ذمہ داری بھی پیچھے جھاڑ کر پیچھے نہ پڑیگی!

ساتھ ہی اتنا اور سُن لیجئے: سطور ذیل میں مرحوم کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں مضامین کا ذکر آگیا؛ اور یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ اس طرح آپ کے خیال کی بھی ایک حد تک تائید ہوسکی یعنی یہ کہ مرحوم کے نوٹس (Notes) ادھورے ٹکڑے (Fragments) غرض اُن کی ہر ادبی کوشش جوں جوں ہاتھ لگے، چھپتی رہے تو اچھا؛ اس سے گویا ایک تو خلاّق دماغ کی قیمتی پیداوار رائگاں جانے سے بچ جائے گی، دوسرے آنیوالی نسلیں مدّتوں آپ کی قدر و اہتمام کی احسان مند رہیں گی۔ کیونکہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ایک اچھے ادیب کی نامتمام چیزیں بھی ایک چیز ہوا کرتی ہیں؛ جو اپنی دیگر ادبی رنگینیوں کے ساتھ ساتھ یہ رعنائی خیال بھی لئے ہوتی ہیں کہ کاش! یہ مکمل ہوتیں تو کیا چیز ہوتیں۔ ان کا یوں ادھورا رہ جانا ہی گویا شوق دانبساط کی ایک سدا بہار موج ہے؛ جو تخیّل کی رومانی (Romantic) جھلملیوں میں سے چھنکر نت نئے کرشمے دکھاتی رہتی ہے!

اچھا تو اس تمہید کے بعد اب کہنا یہ ہے: ظاہری لحاظ سے انسان جس طرح ایک دوسرے سے نہیں ملتا؛ اسکے داخلی خدوخال بھی مختلف ہوا کرتے ہیں، جن کے نقوش حرفی کا ادبی نام اسٹائل ہے۔ یہ خدوخال یا شمائل نفسی جتنی ممتاز اور کبیر کی شان لئے ہوتے ہیں، اسٹائل بھی اتنا ہی دلنی اور رودار ہوتا جاتا ہے۔ مرحوم کی دماغی تربیت، حُسن ذوق، مادۂ اختراعی، آزادہ روی اور خوش مزاجی نے باہم زلف و شانہ ہوکر جو گلرنگ اسٹائل پیدا کیا، اس کے معزز شواہد ان کی تحفہ تحریر میں جابجا ملتے ہیں؛ اور گو مرحوم نے کوئی مستقل تصنیف یا تالیف نہیں چھوڑی، پھر بھی اُن کے چند مضامین میں سے اکثر مستقل زندگی کے مالک ہیں۔ مثلاً "خیالی پلاؤ" ہی لیجئے: نفسیات کی کتنی گہری اور عالمگیر چیز ہے۔ یہ گویا ایک سچائی ہے، جو ہر ملک و زمانے کے لئے ہے اور رہتی دنیا موت نہیں۔ ابالے خشکے سے لیکر یہ خوش ذائقہ بریانی ہو! یا آسمان کے جھلملاتے تاروں" کی سی بے گنتی

اقسام میں سے کسی اور قسم کا ہو، ہماری ازلی لٹک کا کرشمہ ہے۔ سچ ہے زندگی کا چھوٹے سے لگا کر بڑے سے بڑا واقعہ بلکہ خود زندگی، خیالی پلاؤ سے زیادہ نہیں! یہی اصل میں سماجیات ہے، سیاسیات ہے، انتہا یہ الٰہیات ہے! انسان کا یہی فطری اور عام وصف خانصاحب نے بھی ہنسی ہنسی میں ابھار کر دکھایا ہے سنجیدگی سے کہیں کہیں چٹکیاں بھی بھرتے گئے ہیں ادبیاتی نقطۂ نظر سے تو یادش بخیر! "شیخ چلی" کی یاد دلاکر قومی لٹریچر کا اس خوبصورتی سے ذکر کیا ہے کہ یہ حصہ ہمارے ہاں کی تنقیدات عالیہ میں جگہ پائے گا۔

فلسفۂ حیات کی ایک اور مکمل تصویر دیکھئے: "سورما چنا" "اور گڑیا خانہ" بے شک سورما چنا پن انسان کی وہ تمنائے دلی ہے؛ جو بادعائے "ضعیف البنیانی" اسے "مقدر" کے خواب دکھادیتی ہے۔ جہاں یہ مخلوق خالق بن بیٹھتا ہے! مگر یاد رہے: اولادِ آدم کی یہ تمنا صرف انھیں ارباب ہمم کا حصہ ہے، جنھیں "یزدان بکمند آور اے ہمتِ مردانہ" کی سطح سے مساوات ہو۔ جن کا بے دھڑک دل، نڈر دماغ کسی کے بس میں نہ آئے، کسی سے نہ دبے۔ عوام اس بات سے گھبرایا کریں؛ حسنِ نیاز چاہتا ہے: قادرِ مطلق کی "تقویم احسن" کسی حال مجبور نہ رہے!

مضمون، فلسفے کی بنیادی تنقیحات ۔ کہاں سے؟ کیوں اور کہاں کو؟ کی روشنی میں شروع ہوا ہے۔ جوں جوں بڑھتا ہے، نظر بلند اور مقصد زندگی بلند تر ہوجاتا ہے؛ جو اصل پوچھئے تو حقیقی اور عطرِ زندگی ہے۔ چہ جائیکہ اپنے ہاں کی یونیورسٹیاں ہمت وارادے کے لئے اوس ہیں؛ جو بڑھتے حوصلوں، اٹھتی امنگوں کو ٹھنڈا دیتی ہے۔ اسی راہ پڑکر خانصاحب اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ موت سی ڈراؤنی چیز بھی جا کچلی؛ اور کھلم کھلا کہدیا کہ غلامیوں سے آزاد ہونا ہے تو سورما چنے والی امنگ کی بجلی رگوں میں، رگوں کے دوڑتے ہوئے خون میں کوندتی رہنی چاہئے چشم سخن کا یہ اشارہ دل جوش سے بھر دیتا ہے؛ اور بے تحاشہ جی چاہنے لگتا ہے کہ اپنے ہاں کے نوجوان بھی بوڑھے بچے نہ رہیں۔ سورما چنا بنیں! جوانی آئے تو اسطرح کہ پھر ذہنی بڑھاپا نہ چھائے! فطرت کی ساری

قوتیں نذر شباب ہو جائیں ۔ غرض ایسا انسان بن جائیں کہ جو ـــــ " ازسرتا پا نور ہو کر کسی ایک تاریک یا جھلملاتے ستارے کا پابند نہ رہے ، بلکہ کل تماشاہ کائنات اس کی جولانگاہ ہو جائے بے گنتی سورجوں کی کرنیں اس کی سیر و تفریح کی شاہراہیں ہو جائیں ۔ ستاروں اور ان کے نظامات کی چال ڈھال ، کائناتی قوتوں کا زور و شور اس کے لئے ناچ گانا ہو ۔ نئے نئے عالموں کے بننے سنورنے میں اس کو دخل ہو اور کائنات کی عظیم ترین روح اس کا ملجا و ماویٰ ، اسی مسرت اور شانتی کا لامتناہی سرچشمہ ہو جائے !"

تصویر کا دوسرا رخ " گڑیا خانہ " ہے ۔ جس میں اوّل اوّل " بی نٹی " گڑیاں کھیلتی دکھائی دیتی ہیں ۔ پھر بات میں بات پیدا ہوتے ہوتے بات یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ ساری دنیا و بلکہ ساری کائنات گڑیا خانہ بن جاتی ہے ۔ جہاں اللہ میاں بیٹھے روح دما دے کی گڑیاں کھیل رہے ہیں ! اور نہ جانے کب تک یونہی کھیلتے رہیں !! اس گڑیا خانہ میں انسان بھی ایک بے بس ، بے خبر مگر گوشت پوست والی گڑیا سے زیادہ نہیں ! پھر بھی اس کی ستم ظریفی بڑی بڑی کائناتوں پر چھائی ہوئی ہے ؛ اور اسوقت تک چھائی رہے گی کہ ـــ " اس زمین کو جسکی گولائی پر انسانی گڑیوں کا کھیل ہو رہا ہے ، کائنات کی گڑیوں کا زبردست اور بے نظیر کھلاڑی بے ضرورت اور غیر دلچسپ قرار دیکر ستاروں کے کسی پرانے کھنڈر میں توڑ پھوڑ اور پاش پاش کر کے نہ پھینک دے ! "۔

ذرا دیکھئے گا ، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ! اور باتوں باتوں میں " بی نٹی " کی گڑیاں عرفانی رموز کا خزانہ بن گئیں ۔ کیا مزے کی سیر ہے ، بے بس انسان کرسب کچھ لیتا ہے لیکن پھر معصوم کا معصوم ! عالم مجبوری کا حسن اختیار بھی دیکھا ، دنیا کے مزے خود لوٹے ! ذمہ دار دوسرا ٹھہرے ! اس پر فاضل مضمون نگار کے مخصوص کمال انشا پردازی کا اضافہ کیجئے ، جس نے لفظ و معنی کی وہ وہ نفیس گڑیاں سجائی ہیں کہ آدمی دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے ۔ یہی چیز تھی جس نے

باایمان ملحد سے بھی کہوا دیا کہ "گڑیا خانے والے مضمون میں انھوں نے (خانصاحب نے) فلسفے کو جس طرح پانی کیا ہے، وہ میرے لئے قابل رشک ہے!"

خیر تو خانصاحب کے یہ یا دوسرے جواہر پارے ــ بھیڑ یا چال، زندہ بدست مردہ

نیا یا دیگر ادھورے حصّے Fragments ..... ایک طرف تنقید عالیہ کی چٹکیوں اور ظرافت کی گدگدیوں کی جان بن گئے ہیں تو دوسری طرف خیال کی گہرائی، نظر کی پنہائی نے انھیں کوزے میں دریا، ذرّے میں آفتاب بنا دیا ہے۔ بڑی سی بڑی بات دلّی کی سادی سی سادی زبان میں بے دھڑک کہکر سائنٹفک مہمات کو گویا پانی کر دیا ہے۔ پھر کہیں اشکال نہیں، تعقید نہیں؛ اجنبی سے اجنبی مسائل روزمرّہ اردو میں انگوٹھی میں نگ کی سی موزونیت سے ڈھل گئے ہیں۔ انتقاد کا وہ حصّہ ابھی الگ ہی رہا جو بحیثیت مدیر "المعلم" میں ان کے قلم کے سایہ سایہ نکلتا تھا۔ علمی بردباری کی بنا پر یہ بھی اردو نثر میں خاصے کی چیز اور اپنی تازگی، سادگی، پاکیزگی کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتا۔ بھلا ان علمی اکتشافات کے لئے، آپ ہی اندازہ کیجئے، سرسری تعارف کیا کام دیگا۔ نکتہ سنج مصنف نے جن خوبصورت وسائل سے انھیں پھیلایا ہے؛ اپنی مجبوریات سے انھیں سمیٹ دینا، ادب لطیف کا برملا خون کرنا ہے۔ مگر کچھ کہئے تو طول کلامی ہے۔ اوپر کے دو مضمونوں پر گنتی کے چار الفاظ سے ہی خاصا پھیلاوا ہوگیا۔ فرصت کا سوال ابھی باقی ہے۔ پھر اصل اصل ہے اور نقل نقل! اس لئے میں کہتا ہوں: آپ خود ہی انھیں دیکھیں تو اچھا۔ یہ مؤلفانہ گریز نہیں! مرحوم کا تصنیفی وقار اور سخن گسترانہ دلربائیوں کا ہجوم بہار چاہتا ہے کہ انسان نفس نفیس ہی اُن سے دوچار ہو!۔

اچھا! علم کی اس سنجیدگی پر اس سریلے بول کے رسیا کی خوش مزاجی (Humour) اور ادبی خوش عیشی (Literary luxury) بھی بھولنے بھلانے کی چیز نہیں۔ سچ یہ ہے: مرحوم ان اجاگر خصائص کی تصویر مرئی بنے ہوئے تھے۔

آٹھوں پہر ہنستے ہنساتے رہتے۔ مزے مزے کی باتیں سنا کر جی لبھایا کرتے ناز کیجال قریشی نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ ان کی صحبتوں میں ٹھنڈی چھاؤں اور میٹھی چاندنی کا مزہ آتا تھا! تنقیط خیال کے طور پر لگے ہاتھ کچھ ان معنوں بھی لیجیے۔

خانصاحب کیونکر ہنسے اور ہنسایا؟ یہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ ان کا ذہنی انبساط جو دوسروں کو بھی کھلکھلا دے، اردوئے خاصہ کی نفیس سے نفیس گدگدیاں ہیں! آپ اسے عطرِ ادب کہئے!! پھر یہ اس ادب کا ذکر ہے جو بیگماتی زبان میں سدا کا "نین متنا" رہا جس کی ساری فردِ حیات میں گنتی کے خوش قلم بھی مشکل نظر پڑتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہنس مکھ خانصاحب بالخصوص ان چیدہ بزرگوں میں شامل ہیں، جن پر اردو بجا طور پر ناز اسکتی ہے۔ اور رہے بھی یوں خوش خیال ادیب نے اسے جتنا خیالات سے مالا مال کیا، اتنا ہی ہنس مکھ بنایا۔ جبھی تو خوش ادا بات بات پر کھلے پڑتی ہے!

"ہنسی" کو دیکھئے! اسکی نقرئی کرنیں سوچ کی وہ وہ گہرائیاں روشن کرتی ہیں، جہاں کی بھول بھلیاں اچھے اچھوں کو رو کھا کر دیں! اس ہنسوڑ نعمت میں مرحوم ہنسی ہنسی میں عمدہ ترین احساسات زندگی پیش کر گئے ہیں۔ تجسس نظر کی ذرا نوخیز اختراع دیکھئے: "ہم اس لیئے ہنستے ہیں کہ ہمیں غصہ آتا ہے"! بات کتنی اچھوتی اور قوت آخذہ کی دلیل ہے! جسے فاضل مضمون نگار نے کہیں سے کہیں پہنچا کر دیکھنے دکھانے کی چیز بنا دیا ہے۔ پھر اسی خیال کو فلسفیانہ موشگافی سے پھیلا کر ہنسی کو سماج کی ایک ارتقا یافتہ سزا قرار دیا ہے۔ یعنی یہ کہ سماج کو جب کسی حرکت پر کم غصہ آتا ہے اور بالفاظِ غیر اسے قانونی سزا کا مستوجب نہیں گردانتا تو ہنسی کے کوڑے کی پھٹکار سے کام چلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہنسی بات کی بات میں اپنی غصہ والی اصلیت پر آن ٹکتی ہے۔

ثبوت لیجئے! اور ایک واقعہ یہاں خانصاحب کی ہی زبانی سنیئے۔ اس سے انکا انداز خاص اور مزہ ظرافت دونوں ساتھ ساتھ اجاگر ہوتے جائیں گے:—

ف۔ سابق مدیر مجلہ عثمانیہ

"ایک محفل میں ایک صاحب نہایت بھاری بھرکم توند اور گلگلا سا منہ لئے بیٹھے تھے۔ توند اتنی گستاخ اور بن کہے ہوگئی تھی کہ بیچارے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تو اس کا مزاج دیکھکر! قضارا وہاں شاعری پر بحث چھڑ گئی۔ ایک طرف یہ استدلال تھا کہ شاعری خدا کی دین ہے اور دوسری طرف یہ خیال کہ یہ بھی ایک اکتسابی شئے ہے۔ منطق کی پالی میں صغرا کبرا بھڑک رہے تھے کہ اتنے میں ظرافت کی دیوی نے ایک دماغ کو چھیڑ دیا:"

"آپ کا استدلال تو اس قدر عام ہے کہ پھر ایک توند کو بھی خدا کی دین ماننا پڑے گا۔"

"تو اس میں کس کو کلام ہے۔ آپ لاکھ کوشش کر دیکھئے، یہ بڑھ جائے تو ہم جانیں!"

"جی میں اپنی تو یہ کہتا ہوں: اگر یہ خدا کی دین ہے تو، اور اکتسابی شئے ہے تو، دونوں صورتوں میں میرا تو دور ہی سے سلام ہے!"

"جناب من! فطرت کا کوئی عطیہ مسرت سے خالی نہیں۔ توند کے مزے وہی جانے جسے یہ دین ملی ہو!"

"جی توند کے مزے تو وہ جانیں، جو ایسے صاحب نصیب ہوں۔ میں تو یہ جانتا ہوں، یہ دین مسرت کے راستہ میں روڑا ہی نہیں بلکہ ٹیلہ ہے!"

"بغیر تجربے کے آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"تجربہ کو یہاں کیا دخل؟! تجربہ کی نوبت بھی آئے۔ بدیہات میں تجربہ [illegible] ہے!"

"تو آپ کا خیال ہے، توند کا عطیہ مسرت سے محروم کر دیتا ہے؟"

"یہ تو کسی توند والے ہی سے پوچھئے!"

"ابتک تو بچارے توند کی "دین" والے توند کے پیچھے سے مڑمڑ کر سنتے رہے؛ لیکن آخری فقرہ پر نہیں رہا گیا، تو فرمانے لگے:۔

"کیا آپ کا روئے سخن میری طرف ہے؟"

"جی نہیں، آپ کی توند کی طرف!!"

"اس پر فرمائشی قہقہہ پڑا اور اب باوجود بلغمی مزاج اور توند کے وہ اپنے پیروں کھڑے ہو گئے!"

"لاحول ولا یہ بھی کوئی ہنسی ہے!"

"ایک بے تکلف بول اٹھے: دیکھو بھئی! بے تحاشہ کھڑے ہو گئے ہو، ذرا کمر تھامے رہنا!!"

ہنسی کی ایک تو یہ شکل ہے۔ جہاں آپ نے دیکھا باتوں باتوں میں اس کا "تعزیری ڈنک" ابھر آیا اور ہنسی میں کھسی ہو گئی۔ ایک اور شکل ہے، جسمیں انسان ہنستا ہے مگر چٹکیاں بھرتا جاتا ہے۔ ادبیات میں یہ بڑی مفید چیز ثابت ہوئی؛ اور سماج کی بڑی بڑی برائیاں اس سے دور ہوئیں۔ سروان ٹیز، تھیکرے اور مولیئر ظرافت کی دیوی کے ایسے ہی ہنسوڑ فرزند ہیں، جنھوں نے بقول مرحوم انسانی حماقتوں کی گہرائیوں کو ہنسی ہنسی میں گھنگول ڈالا۔ خانصاحب کا بھی ہنسی سے یہی مدعا ظاہر ہوتا ہے۔ "روغن قاز" کی اقساط اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ "ہنسی" میں بھی اس پر یوں روشنی ڈالی ہے کہ: "۔۔۔ یہی گویا اس مضمون کا مقصد تھا۔ آپ ہنسیں تو سوچ سمجھکر ہنسیں۔ بے تحاشہ منہ پھاڑکر ہنس دینا بھی موقع پر مناسب ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہنسی کی خالی خولی گرج ہے۔ وہ ہنسی جس سے سبق ملے، جس سے فطرت انسانی کا مطالعہ ہو، جو دیرپا اور ساتھ ہی دوررس ہو، عموماً ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں سے ملتے جلتے تبسم میں ظاہر ہوتی ہے!"

دوسری جاذب نظر چیز خانصاحب کا حسن ذوق ہے، جو یونانیوں کا سا نازک اور دلفریب تھا؛ اور جس سے خوش خیال فرانسیسیوں کی طرح یہ ادب کو پری بناتے جاتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو اس ادبی خوش باش کے سارے مضمون ایک فسانۂ دلکش ہیں؛ جن میں بالفاظ مہذب انسان کے "نصف بہتر حصہ" کا نغمہ مستانہ سروں میں چڑھا رہتا ہے۔ ہائیں! یہ کیا کہدیا! اردو ادب کی "جنس مشترک" کے ہوتے بھلا یہ باتیں پیش جاسکتی ہیں! تاہم عرض کرونگا، ان کی معذوری خود ان کی ضامن سفارش ہے۔ غریب، یونانیوں کا سا ذوقِ حسن کہاں سے لائیں، جو صنفِ لطیف اور اس کے حسین متعلقات کے اعتراف سے نہ بولائیں۔ بقولیکہ وہاں مذاقِ حسن اتنا رچ گیا تھا کہ اس فطرت کی لاڈلی کا دوسرا نام حسن رکھا گیا؛ جس سے آج بھی مہذب دنیا رنگین ہے۔ یہاں پھوہڑ مذاق کا ابتک یہ عالم ہے کہ باوجودِ سنجیدگی اسکی مادّیت! سے نظر آگے نہیں بڑھتی!! جس سے اپنے آپ اسکی دوسری باتیں بھی فحش دکھائی دیتی ہیں! صورتِ حال یہ ہو تو فرمائیے: اس خشکی دماغ سے انسان اخلاقاً منہ نہ موڑلے تو اور کیا کرے؟!

خیر یہ جملۂ معترضہ تھا۔ خانصاحب کی نفاست ذوق پر مغربی نازک خیالی کا بڑا خوبصورت اثر ہوا۔ اور انکی باتوں میں ایک خاص قسم کا شاعرانہ بانکپن کوٹ کوٹ کر بھر گیا۔ اسی لئے مرحوم کے جذباتی صفات کا اظہار جہاں کہیں بھی بے تحاشہ ہوا ہے۔ ایک عکس ریز مرقع حسن بن گیا ہے! مثلاً "ہنسی" کے دو جملے کافی ہیں۔ جہاں اس سرخوشِ ادب کی شادابی مذاق پڑی منہ سے بولتی ہے؛ اور تحریر کا موہن انداز ادب کو جدا پر شباب بناتا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"صنفِ نازک کی اداؤں اور تقریبِ ہنسی کے قدر دان ہی خوب جانتے ہیں کہ گدگدی کسی دلفریب اور کن کن دلکش اداؤں کی کنجی ہے!" یا

"بچے عموماً اور جوانی کی راتوں مرادوں کے دنوں میں قدم رکھنے والیاں خصوصاً بعض موقعوں پر رونی صورت لمبے لمبے آنسوؤں کے تار کے ساتھ اک لطیف پیرایہ میں اس طرح ہنس پڑتی ہیں؛ گویا گھٹا چھائی ہے، مینہ برس رہا ہے اور اس سمے بجلی کوند کوند جاتی ہے!"

اللہ رے جذبات کا بہاؤ! بات اس سج دھج سے کہی کہ حسین دوشیزہ بنا دیا!!

پھر ادبی سادگی سونے پر سہاگہ ہے! جسے اس شاعرِ نثر کا طغرائے امتیاز کہیئے۔ مختصر یہ ہے: مرحوم کے اس پیرایۂ خاص میں بالخاصہ وہ رسیلاپن اور کھرپائیت ہے کہ بڑا دل کھینچ جاتا ہے!

اس شیدائے ادب میں شاعرانہ بانکپن ہی نہیں، ادبی تخلیق، تشبیہ اور استعارے کا بھی بڑا صحیح ذوق تھا؛ جس سے ایک تو ان کی دماغی پیداوار میں جان پڑی، دوسری چونکہ تشبیہ کا دوسرا نام شاعری ہے، جو مشاطۂ زبان و خیال کہی جاتی ہے؛ اس لئے مرحوم کی باتیں شرمائی لجائی دلہن بن گئیں۔ "شاعر"، "روغن قاز"، "منچلے" دماغی پیداوار کا ایسا حصہ ہیں، جن میں جیتی جاگتی شخصیتیں ملتی ہیں۔ پھر ان کے علاوہ بھی جہاں کہیں کردار ادبی Characterization سے کام لیا گیا ہے، جان کی گھما گھمی اور جلت پھرت ملتی ہے۔ مثلاً "گڑیا خانے" کا آغاز دیکھئے دلّی کے ایک شریف، کھاتے پیتے گھرانے کا گویا لطیف تعارف ہے؛ جہاں "بی نئی" "کلّو"۔ "سانولی"۔ بیٹھی گڑیاں کھیل رہی ہیں۔ کبھی گڑیا کا دوپٹہ اترتا ہے۔ کبھی انگیا ٹھیک ہوتی ہے۔ کبھی نیفہ درست کیا جاکر بڑی احتیاط سے دوپٹہ اڑھایا جاتا ہے اور یوں باتیں ہونے لگتی ہیں:

"اری کلّو! دیکھ تو سہی، اس نے رات بھر میں دوپٹہ کا کیا ستیاناس کیا ہے۔ موئی گڑیا یا دیوانی ہے۔ اور یہ تو دیکھ انگیا کا کیا حال کیا ہے۔ ساری چرسیں ڈالدیں۔ بڑی پھوہڑ ہے میں نے کیسی انگیا سی تھی۔ یہ ایسی ہی پھوہڑ رہی تو میں اس کا بیاہ ویاہ نہیں کردوں گی۔"

"کلّو بولیں:— اے ہے انی بیوی!! اسکی صورت تو بڑی پیاری پیاری، بھولی بھالی سی ہے۔ اچھی بیوی اس کا بیاہ کردو! ہم ہنڈکلیاں پکائیں گے۔ بھورا، نورا باجا بجائیں گے۔"

"اری ہاں! بڑا تماشہ ہوگا۔ اماں جان سے دو آنے کے پیسے لونگی۔ بریانی، متنجن اور....."

"سانولی نے لقمہ دیا:— کواب، پراٹھے، سموسے!"

"کلّو چیخنے لگیں:— بیوی! کھیر زردہ!!"

"نئی کو یاد آیا:— ارے ہاں! مزعفر، نان پاؤ کے ٹکڑے اور بھنی.....!"

"سانولی بولیں:— اور پوی گجر بھنتہ!"

"کلو اٹھیں:— چل دیوانی کوئی شادی بیاہ میں گجر بھنتہ بھی پکواتا ہے۔ اتنی بھی خبر نہیں چلی ہیں گڑیاں کھیلنے!"

"سانولی نے تیوری چڑھا ناک پر انگلی رکھ جواب دیا:— بڑی آئی ہیں یہ جاننے والی، صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل!"

"کلو لال پیلی ہو کر بولیں:— دیکھئے، نئی بیوی! اس سلّو کی باتیں۔ کیا ہم نے اپنی صورت اپنے آپ بنائی ہے۔ جیسی صورت خدا نے بنادی ویسی ہے۔ تم بڑی خبصورت ہو۔ بھینگی بھینگی آنکھوں پر اتراتی ہیں!"

"لو نئی بیوی! بھلا یاں آنکھوں کی بھی کوئی بات تھی۔ آنکھوں کا نام لیا تو ایسا طمانچہ دوں گی کہ سیچ مچ بھینگی ہو جائے گی!"

کہئے! لڑکی بالیوں کی سیچ مچ کی زندگی کا یہ کیسا نفیس اور عین مین خاکہ ہے۔ بھولی بھالی بچیاں گویا سامنے آگئیں۔ جو باتیں لڑاتے لڑاتے بتقاضائے سن و فطرت لڑائی پر بھی اتر آئیں! غرض اس طرح چاٹ لگا کر چاہتا ہوں: یہ چیزیں بھی آپ خود دیکھیں۔ انسان ہزار کوشش کرے، کہنے سننے میں فرق آ ہی جاتا ہے؛ جس سے ظاہر ہے، اصلی مزہ پھیکا پڑ جائے گا۔

خانصاحب کی تشبیہ اور استعارہ کی رنگارنگی بھی لطف سے خالی نہیں۔ "صحیح خیال" اور "صحیح الفاظ" کے اصول سے انجان میں ایسی ہلگت پڑ گئی تھی کہ بڑے سے بڑا خیال بھی اضطراراً ان سے سیدھی سادھی اور خوبصورت زبان میں ادا ہو جاتا تھا۔ اس لئے جہاں دیکھئے خواب طفلی اور آرزوئے شباب کے ٹھاٹ ہیں۔ انگریزی کے موہن انداز کی مزاولت سے میلان طبیعی یہہ ہو گیا تھا کہ مشرق مغرب سمو دی جائے؛ جس سے خود ان کا انداز تحریر بامتیاز گنگا جمنی ہو گیا۔

اور بات بات میں جوش اوائی کی ندرت گھل مل گئی ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

"قافیہ نظم میں آبشار کا کام دیتا ہے ۔ خیال کا تسلسل اور الفاظ کا ترنم قافیہ کی چٹان سے ٹکرا کر ابھرتا اور بلند ہوتا ہے ؛ اور اگر قافیہ کو غزل کی طرح خیال کے بہاؤ کی روکنے والی دیوار بنا دیا جائے تو پھر خیال قافیہ پر سے ابل کر کھلکھلاتا اور ترنم کی دھواں دھار بوچھاڑ کرتا ، دوسرے مصرع میں سرپلی ہلچل ڈالدیتا ہے ۔ اور پھر اس مصرع کے ترنم کو ساتھ لیکر آگے کے مصرعوں میں قافیہ پر سے چادر کی طرح بہتا نغمہ بلند کرتا ہوا پورے بند کے بند کو خیال کے تسلسل اور موسیقی کے اتار چڑھاؤ سے ایک دلفریب زندہ چیز بنا دیتا ہے ! " یا

"اس شعر میں ' دیکھا ' کا لفظ وہ بجلی کا بٹن ہے جس کو دباتے ہی اس شعر والا "تخیلی پیکر" دماغ میں تصویر کی طرح سامنے آجاتا ہے !" یا

"تشبیہ کے ذہن میں ابھر آنے کے بعد دوسرا مرحلہ شاعر کا یہ ہوتا ہے ۔ کہ اس ذہنی تشبیہ کو جو جگنو کی طرح ذہن میں کبھی موہوم ، کبھی واضح پھرتی رہتی ہے ۔ اُسے ایسے الفاظ کا جامہ پہنایا جائے کہ ....." یا

"خیال ایک پانی کا سا بہاؤ ہے ؛ یہ جب زبان کی صورت اختیار کرتا ہے تو بڑے سمندروں کا ناپید اکنار ، آسمانوں سے باتیں کرتا لہراؤ نہیں رہتا بلکہ ندیوں کی طرح کنارے اور چٹانیں اسے گھیر گھار لیتی ہیں ، اس کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں ؛ اور خیال کی ندی کا نشیب و فراز ، کج مج پن ، روڑوں اور کوڑے کرکٹ میں اس کو مبتلا کر دیتا ہے ۔ ادبیات اور موسیقی کا یہ کام ہے کہ جہانتک ہو سکے زبان کی صورت میں خیال کے بہاؤ کو پھس پھسی اور رادنی عضو بندی ـــــ کم منتظم اور بن سجھی ترکیبوں ۔ سے نجات دے اور جوں جوں کلچر (Cul ture) کی ارتقاء ہوتی جائے ، زبان بھی اپنی مناسبت سے اگتی ، پھیلتی ، پھولتی ، پھلتی خیال کے اصلی بہاؤ کی تصویر بنتی جائے ۔" یا

"ہر حرف موزونیت کا کم سے کم جز ہے ؛ ترنم کی ایک پنکھڑی ہے ـــ الفاظ

دو یا دو سے زیادہ حروف کی پنکھڑی کے پھول ہیں؛ اسی لئے جسے نثر کہتے ہیں وہ بھی ایک موزوں کلام ہے۔" یا

"!!..... شاعر اپنے خیالات اور اپنی رُوح کے نغمے کے مطابق بند وضع کرے؛ جس وقت شاعر کے اذہان کی گہرائیوں میں سے خیالات اور جذبات کنول کی کلیوں کی طرح لہراتے دماغ کے شعوری بہاؤ کی سطح پر آتے اور تخیل کے جان ڈالنے والے سانس سے کھلنے لگتے ہیں شاعر کے دل میں ایک موہوم سا ترنم کسی بھولی بسری شئے کی طرح پھرنے لگتا ہے اور شاعر اس کھوج میں پڑ جاتا ہے کہ موزوں عروضی سانچے میں اس ترنم کو پوری طرح مقید کرے جو دُور سے اپنے دلفریب اور سہانے راگ سے رُوح کو بے چین ضرور کرتا ہے لیکن قابو میں نہیں آتا۔"

میں سمجھتا ہوں: اس اجمالی تعارف میں مجھے اب کچھ اور کہنا باقی نہیں۔

ہاں! ایک بات اور یاد آئی۔ یہ سوسائٹی کی ناقدر شناسی کا رونا ہے؛ جو سدا ہوتا رہا۔ بھلا ایسوں کو کیا کہئے جو اس قحط الرّجال میں بھی اچھوں سے آنکھیں پھوڑ لیں! اپنے اچھے دن ہوتے، قومی لٹریچر کی کوئی توقیر ہوتی تو یقین مانیئے، خانصاحب ہرگز اتنے سستے ہونے کے لائق نہ تھے ان کی قابلیت پکارے کہتی رہی کہ وہ ایک چیز تھے؛ لیکن سنتا کون؟ کھاتے پیتوں میں دوردور اس بات کی سمجھ بوجھ نہیں۔ طالب علمانہ زندگی ان کے ہاں مفت کی دردسری گنی جاتی ہے۔ جو تھوڑے بہت اس گون کے ہیں؛ ان کے آگے ساری دنیا حرف غلط! یہ اپنے ہوتے کسی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے؛ اسلئے غریب بنے بگڑے۔ عوام کا مذکور ہی کیا۔ یہ ہوئے نہوئے برابر؛ چلئے قصہ ختم ہوا! ایک پڑھے لکھے لائق لحاظ رہ جاتے ہیں۔ ان میں خیر سے وہ ہمدردی اور سرد مہری کی بہتات ہے کہ بیچارے پڑھ لکھکر گونگے ہیں! صرف ذاتیات اور اس جلن سے کسی چیز کو سراہنا گناہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُن کے دماغ کی پیداوار نہیں!! نتیجہ جو کچھ ہوسکتا ہے، ظاہر ہے۔ یعنی یہی کہ کام کے آدمی بے کار بنے جاتے ہیں اور سوسائٹی کے یوں پہلو بچانے سے مجبوراً وہ غیر طبعی افعال، توبہ!

ملازمت وغیرہ پر نہ جھک پڑیں تو اور کیا کریں ؟ !

خانصاحب کو بھی یہ کڑی جھیلنی پڑی ؛ جس سے بجائے اس کے کہ یہ کسی اکاڈمی (زاویہ علمی) میں ہوتے ' ملازمت کے پھیر میں رہے ؛ اور ہمیشہ آرزو رہی کہ یہ وقت علم و ادب کی خدمت میں گزار دیں ۔ مرنے سے دو ڈھائی مہینے پہلے ایک دفعہ ملا ۔ اس جنتِ قلب و روح میں نہیں ! جو نازنینانِ علم و ادب یعنی اچھی اچھی کتابوں کی بدولت ان کی حرم سرا بنی ہوئی تھی اور جہاں وہ فرصت کا بیشتر حصہ ہنسنے بولنے میں گزارا کرتے تھے ! بلکہ اندر مکان میں بسترِ مرگ کے قریب !! مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے اور مصافحہ کے لئے حسب معمول مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا ۔ ہاتھ کیا ملے گویا دل ملگئے ؛ فرمانے لگے : " بھئی ! کہتے ہیں : ماندگی سے عقل آتی ہے ۔ اس شدید ماندگی کے بعد تو انسان عقل کل بنجانا ہوگا !! " کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھے رہے ۔ اس ماندگی کے عالم میں بھی منہ سے ظرافت اور بذلہ سنجی کے پھول جھڑتے تھے ۔ آخر میں فرمایا : " اچھا ہوگیا تو ارادہ ہے : یہاں سے دور چلا جاؤں اور اس پلاٹ کا ایک ناول لکھوں کہ ایک شخص نصف عمر مرد اور نصف عمر قلب ماہیت سے عورت بنجاتا ہے ! " غرض یہ اور اسی قسم کی صدا مزیدار باتیں ہوتی رہیں ؛ جن کے سننے کے لئے آہ ! اب کان ترسیں گے !!

خدا بخشے محترم افادی نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ ایسے دماغوں کو ہندوستان کی ہوا راس ہی نہیں ۔ ان کے کمالات کی قدر یہاں سے سات سمندر پار ہی ہوتی تو ہوتی ۔ واقعی ' کبھی کبھی خیال آتا ہے ؛ ہنس مکھ خانصاحب کالے کوسوں دور یورپ یا امریکہ کے کسی زاویہ علمی کی زیب و زینت ہوتے تو کیا بات تھی ! وہاں اس مختصر عمر کے چالیس پچاس برس میں ہی کبھی کا ایک وقت آچکتا کہ ان کے نتائج دماغ اور رشحات قلم کی کسی محسوس یادگار سے تعطیلین میں تہلکہ پڑ جاتا ! اخباروں کے کالم کے کالم تعریف و تحسین سے روشن ہوتے ؛ اور ایشیا کا یہ مایۂ ناز اہلِ قلم معاوضۂ تصنیف کی بدولت بادشاہی کرتا ہوتا ! تحسینِ کمالات کی یوں بھی داد ملتی کہ ایک آفتِ جان و ایمان ' پرکالۂ نورین ؎

"سرشوخیٔ مدہوش، موسیقی خاموش!"

یعنی کوئی کافرادا، شیریں سخن مریاتاماج جگمگاتے موٹر سے اتر کر بلا تکلف کمرے میں چلی آتی ہے۔ موتی چور آنکھیں محبت سے روشن ہیں؛ یاقوتی ہونٹوں پر پھول سا تبسم! اور منچلے ہندی کی میٹھی زبان میں کہتی ہے: "میں تمھاری کتاب پڑھتے پڑھتے آئی ہوں، میں تمھاری اور یہ دولت تمھاری! ساتھ ہی ساتھ آٹھ دس لاکھ کے نوٹ سنبھال دئے اور ہاتھ گلے میں ڈالدئے!!"

بہرحال یہ ہیں محمد عظمت اللہ خانصاحب، جنھیں ایک سے زیادہ حیثیت سے یہاں آپ نے دیکھا۔ اردو کی بڑی ہی بدنصیبی ہے کہ جسم و روح کا یہ شیر جوان سپرد خاک ہوگیا! جن اصحاب نے خوبصورت قالب کی اس خوبصورت روح کو مسکراتے دیکھا ہے، وہ اب یہ بلند و بالا، سرخ و سفید، مضبوط و توانا، مرنجان مرنج اور بے لوث ہستی رہتی دنیا نہ دیکھیں گے۔ ہائے! وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ خانصاحب دیسی بدیسی نازنینان علم و ادب میں گلفام بنے بیٹھے ہیں۔ اجلی برف سی پوشاک، کہنیوں تک آستین چڑھی، صبح جاؤ تو کبھی شیونگ میں مصروف ہیں، کبھی پیر ہلاتے، آرام کرسی پر لیٹے، اپنی انوکھی نظموں کے سریلے بول پڑھ رہے ہیں یا مصروف مطالعہ ہیں۔ آپ گئے تو انھوں نے کتاب رکھدی، مسکراتے ہوئے اٹھے، ہاتھ ملایا اور باتیں ہونے لگیں۔ اب جو بات، اس ٹھاٹھ کی کہ ڈھیٹ ہوئی ہمت، مرجھائے ہوئے دل گرما اٹھیں۔ شگفتگی ہے کہ چہرہ سے پڑی ٹپکتی ہے؛ بذلہ سنجی منہ سے پھول بنکر جھڑتی ہے۔ علم و انکسار کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اپنے پرائے، آئے گئے، چھوٹے بڑے سب ہی سے تو جھک کر مل رہے ہیں۔ صبح چھ بجے سے رات کے دس گیارہ کبھی کبھی اس سے زیادہ بھی آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے؛ جن سے یہ پرلطف باتیں سنتے ہیں؛ سناتے ہیں؛ خود ہنستے ہیں؛ انھیں بھی ہنسائے، لٹائے جاتے ہیں۔ علم کا سچا شوق طبیعت میں اتار چڑھ گیا ہے کہ معمولی معمولی باتیں بھی علمی رنگ سے خالی نہیں۔ اسکی بھی لوگی ہے کہ اردو، اردو بولنے والے دنیا میں رودار ہوں اور کسی طرح اغیار سے پیٹے نہ رہیں۔ غرض علم و فضل کے زور سے ایک دریا بنے بیٹھے ہیں

جو قلب کی سی گہرائی، خیال کی سی وسعت اور جذبات کا سا بہاؤ لیکر خود تو سیراب ہو ہی مگر دوسروں کو بھی شاداب کرتا جائے! اچھا! اتنا ہونے پر بھی جس کسی سے ملتے ہیں، اسی کے ذوق کی سی کہتے ہیں بلکہ باتوں باتوں میں ایسی صائب رائے اور نیک مشورہ دیدیتے ہیں کہ اچانک طبیعت کی برکتیں بیدار ہو جائیں یا آدمی کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ انسان بن جائے! لیکن آج یہ بہشت قلب و روح اجڑ گئی! اب ادھر قدم رکھو تو کان آواز کو اور آنکھیں اس صورت کو ڈھونڈتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے: کوئی دم میں اندر سے نکلے چلے آتے ہیں! مگر اصل پوچھئے تو اب نما نصاحب کہاں؟ ہاں! ان کی غیر فانی نشانیوں میں وہ نتائج فکر و نظر یعنی ان کی فتوحات علم و ادب البتہ باقی ہیں؛ جو نظم و نثر کے برن میں ہم آپ تک پہنچی ہیں؛ اور جنھیں حفاظت سے رکھا تو سمجھئے رہتی دنیا انھیں موت نہیں! خیر تو یہ ہے مرحوم کے عمدہ ترین اوقات زندگی کی سدا بہار لطف صحبت؛ جس سے ان گنتی کی سطروں میں سرسری طور پر آپ روشناس ہوئے۔ لیکن انکی زبردست شخصیت، اعلیٰ انشا پردازی، علمی مرتبت اور بے نظیر طباعی کو دیکھتے یہ چند سطریں آفتاب و ذرّے کی نسبت سے بھی گئی گزری ہیں؛ اس لئے التماس ہے: میری خاطر آپ اسے بھی نہ بھولئے کہ آج ذرّے سالمات ہیں!

قبرستان

اندھیری رات میں

از جناب مسعود حسن صاحب فوقی متعلم ایل ایل بی (عثمانیہ)

خوشی کے چہچہوں سے دور اک سنسان بستی ہے
جہاں ہر سمت ویرانی ہی ویرانی برستی ہے

قیامت کی سیاہی ہے قیامت کا اندھیرا ہے
زمیں کو ہر طرف سنسان سناٹے نے گھیرا ہے

خموشی کی ردا اوڑھے ہوئے کا وا ک تاریکی
مسلط ہے فضا پر ایک ہیبت ناک تاریکی

زمیں پر خشک پتوں کی اچانک سرسراہٹ سے
جھجک اٹھتے ہیں انسانی قدم اپنی ہی آہٹ سے

صدائیں گیدڑوں کی دور میدانوں سے آتی ہیں
بلاؤں کی طرح ویرانیوں پر پھیل جاتی ہیں

بدن میں سنسنی پیدا ہے تاریکی کے اثر سے
لرز جاتا ہے دل ہر گام پر آسیب کے ڈر سے

ہوا کے تیز جھونکے یوں درختوں سے گذرتے ہیں
ہزاروں بھوت گویا سسکیاں روکے بھرتے ہیں

صدائے بوم گونج اٹھتی ہے برگد کے درختوں پر
اداسی چھا رہی ہے اس زمیں کے خفتہ بختوں پر

تم ان ٹوٹی ہوئی قبروں کی بربادی پہ مت جاؤ
حقیقت سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں ادھر آؤ

یہاں کے ساکنوں کی ظاہری حالت کو جانے دو
زمانہ گرنشاں اُن کا مٹاتا ہے مٹانے دو

شکستہ ہو رہی ہیں اُنکی قبریں گر تو کیا غم ہے
اعزا آکے روتے ہیں جو بالیں پر تو کیا غم ہے

جو سچ پوچھو تو کتنی قابلِ رشک اُنکی حالت ہے
میسّر اُن کو کیسا چین ہے کیسی فراغت ہے

نہ دنیا کے بکھیڑے ہیں مصیبت ہی نہ بیماری
نہ آپس کی عداوت ہے نہ چالاکی نہ مکّاری

یہاں کی سرزمیں اک دوسرے عالم میں شامل ہے
یہاں غمگین روحوں کو دوامی عیشیں حاصل ہے

میسّر ہے یہاں دنیا کی سب فکروں سے آزادی
فراغت اور سکوں کا گھر ہے یہ ویران آبادی

یہاں کی نیند انسانی مصائب کا مداوا ہے
یہاں ٹوٹے دلوں کو مرہم تسکیں مہیّا ہے

شکستہ خاطروں کی آخری منزل ہے یہ بستی
تھکے ہارے ہوؤں کی جاوداں محفل ہے یہ بستی

مسجد

ایک تاریخی حسن کارانہ مطالعہ[1]

از۔ سید محمد اکبر وفا قانی۔ مدیر

اسلام اور حسن کاری بظاہر متضاد چیزیں معلوم ہوتی ہیں جانداروں کو متشکل کرنے کی ممانعت اور نغمہ و سرود کو لہو لعب قرار دینا ایسی باتیں ہیں جنکی بناء پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اسلام حسن کاری کا مخالف ہے لیکن جن لوگوں کو اس کا علم ہے کہ تخلیق حسن کے لئے صرف جاندار چیزوں کی نقل ہی نہیں ہے اور بغیر چنگ و رباب کے بھی سامعہ کے ذریعہ روح کو مسرور کرنے کے ذرائع موجود ہیں وہ ایسے غیر ذمہ دارانہ خیال کو مان نہیں سکتے۔

مسٹر اسپیرس[2] ٹھیک فرماتے ہیں کہ "جاندار اشیاء کو حسن افروزی کا موضوع بنانے کی

---

[1] یہ مضمون ایک لکچر کا خلاصہ ہے جو بزم تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے ایک جلسہ میں دیا گیا تھا اور ناظم صاحب بزم تاریخ کی اجازت سے "مجلہ" میں شائع کیا جا رہا ہے۔

[2] Art East and West by Spiers

ممانعت نے دنیا کے لئے ایک ایسی نئی حسن کاری کی داغ بیل ڈالی ہے جس نے انسان کو جانداروں کو بیجان مادہ کی قید میں لانے کی بجائے غیر جاندار اشیاء کو متحرک اور حسن آفرین بنانے کا سلیقہ سکھایا ہے" حقیقت یہ ہے پاکیزگی، لطافت اور خوش وضعی کا جو سبق مسلم حسن کاری نے دنیا کو عطا کیا ہے اسکی مثال کرۂ ارض کی کوئی اور قوم پیش نہیں کرسکتی۔ جس طرح بغیر کسی مادّی وسیلہ کے اسلام نے خدا کا صحیح تخیل دنیا کے لئے پیش کیا اسی طرح مسلم حسن کاری نے اپنے طریقۂ حسن آفرینیت میں کسی جاندار شئے کا بار احسان اٹھانا پسند نہیں کیا۔ مسلم حسن کاری کا ہر نمونہ زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ اسلام کا خدا حسین اور حسن دوست ہے۔

دنیا کی ہر متمدن قوم حسن کاری کے ایک نہ ایک شعبہ میں ممتاز ہے۔ مصریوں کی معماری یونانیوں کی آزری، چینیوں کی رنگ کاری اور ہندوستان کی موسیقی اپنے اپنے ڈھب پر خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح مسلم حسن کاری کی سب میں نمایاں چیز فن تعمیر ہے۔ اور باقی تمام شعبہ ہائے حسن کاری اسی مرکز کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ سنگ کاری (Art in stone) رنگ کاری (Painting) منبت کاری، پچہ کاری (Mosaic) اور دیگر معمولی حرفتی کام رفتہ رفتہ فن تعمیر کی آرائش و زیبائش کی خاطر ظہور پذیر ہوئے ہیں مصوری مسلم حسن کاری میں بزرگوں اور بادشاہوں کی شبیہ کشی (Portraiture) یا اشعار کی تصویری تعبیر کے بہانے اور موسیقی، تجوید کے ذریعے دبے پاؤں اسلامی محفل میں داخل ہوگئی ہے۔ آزری کو کسی صورت اس ابن آزر کے پیروؤں کے بنائے ہوئے تخیلی فن میں جگہ نہ مل سکی۔ بھلا خدا پرستی اور صنم گری دونوں کس طرح یکجا ہو سکتے تھے!

مسلم حسن کاری پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے لئے بھی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے اسکے ہر شعبہ کی وسعت ایک ضخیم کتاب کے اوراق چاہتی ہے۔ یہاں پر ہم مسلم حسن کاری کے صرف ایک جزو سے بحث کرسکتے ہیں جس طرح مسجد اسلامی سیاسیات، معاشیات اور تمدن کے ہر شعبہ کا مرکز رہی ہے اسی طرح حسن کاری بھی جو کسی تمدن کا نچوڑ ہوتی ہے اپنا خم بھوم مسجد ہی میں پاتی ہے اسلام کی روح خدائے واحد کی پرستش ہے تو اس کا قالب اسکی پرستش گاہ مسلمانوں کی اس روحانی محبت کا نتیجہ جسکو انھوں نے

خدائے حسین وجمیل کے عبادت گاہ کو بنانے میں صرف کیدا نکی بے لوث اور پاکیزہ حسن کاری ہے۔

اس سے پیشتر کہ ہم مسجد کی ابتداء، ارتقاء اور عروج کے منازل کو یہاں بیان کریں یہہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے فن تعمیر کے مختلف اداروں کو جو قبل اسلام موجود تھے مختصراً لکھدیں۔ متمدن دنیا کے رہبر عام طور پر دجلہ اور فرات کے اطراف بسنے والے انسان مانے جاتے ہیں جنھوں نے اکثر شعبہ ہائے زندگی میں اپنے بعد آنیوالوں کی رہبری کی۔ فن تعمیر میں کلدانیوں اور سریانیوں کی عمارتیں بہت مشہور ہیں اور بابل کا مندر اور معلق باغ ابتک قدماء کے عجائبات عالم میں گنے جاتے ہیں۔ سادگی بلندی اور وسعت ان کی تعمیر کا اصلی گر ہے مصر کے اہرام ابتک زبان حال سے اپنے بانیوں کی اولوالعزمی، ثابت قدمی اور فن تعمیر کے قصیدے سنا رہے ہیں ایران کے آثار وضادید وہاں کے اعلیٰ فن تعمیر کی مشاطہ گری کر رہے ہیں جو در اصل دجلہ اور فرات کے تمدن کی ایک جھلک ہے یونان مغرب کا تنہا استاد اور مصر کا شاگرد فن تعمیر کے بہت سے نمونے چھوڑ جاتا ہے۔ اکروپولیس اور ڈلفائی کے مناظر حقیقت میں موجودہ فن تعمیر کے رہبر ہیں روم انفرادیت پسند یونان کا اجتماعیت پرست مقلد ہے جسکی تعمیر میں شہنشاہیت کا شکوہ اور عالمی حکومت کی تمنا مضمر ہے اب اگر ان تمام تمدنوں کی مختلف کڑیوں کو ملایا جائے تو ہم کو ایک سلسلہ نظر آئیگا ایک قدیم تمدن کا اثر دوسرے میں اور دوسرے تمدن کا اثر اپنے آنیوالے تمدن میں صاف جھلکے پڑتا ہے وہی بابل کے پرشکوہ مناظر مصری اہرام کے مورث اعلیٰ ہیں اور وہی اہرام کا تخیل سکندریہ کے یونانی رہنما مینار (Light house جو بطلیموس کی یادگار رہے) میں روپوش ہے اور یونانیوں کی تعمیر کا اثر رومائی رقص گاہوں دیولوں اور فتح کمانوں میں نظر آتا ہے غرض ایک چراغ سے دوسرا چراغ برابر روشن ہوتا چلا جاتا ہے لیکن جب ہم اس ارتقائی معیار کو مسلم فن تعمیر کی جانچ میں برتتے ہیں تو وہ پورا نہیں اترتا۔ ریویرا اور اسی قبیل کے اک رخہ محققوں نے اپنا سارا زور اس کوشش میں صرف کر دیا کہ اسلامی تخلیق حسن کو یونانیوں یا رومانیوں کے حسن کا ماخذ قرار دیں لیکن باوجود پوری کد و کاوش اور چھان بین کے، سوائے جزئیات کے کوئی بھی تخیل اور تجسیم میں اسکو مکمل ثابت نہیں کرسکا لین پول نے اپنی کتاب

"مصری مسلم حسن کاری" (Art of Saracens in Egypt.) میں اس بات کی توجیہ یوں کی ہے کہ "مسلمانوں نے اپنے فن تعمیر کو ابتداء میں دوسروں سے سیکھ کر اس میں ایسی جدتیں کیں کہ آخر کار وہ غیر اسلامی عناصر و اثرات سے بالکل الگ ہوگیا" کسی حسن کاری کا اثر جزئیات کی کیفیت یا بعض اجزاء کی تقلید کی وجہ سے ثابت نہیں ہوسکتا بلکہ ایک تمدن کا اثر دوسرے تمدن پر اسی وقت کہا جاتا ہے جبکہ حسن کاری کے اساسی تخیل اور تجسیم میں مشابہت اور ہمجنسی پائی جائے اور جب اس اصول سے مسلمانوں کے فن تعمیر پر غور کرتے ہیں تو اسکو کسی کا مقلد نہیں پاتے بغیر کسی طرفداری کے ہر شخص اگر ذرا غور کرے تو اسکی وجہ ظاہر ہو جائیگی۔ کسی قوم کے کارناموں میں یکساں اثرات اسوقت پائے جاتے ہیں جبکہ وہ کسی اپنے پیشرو قوم کے اعتقادات اور جذبات میں مماثلت رکھتی ہو اور جب یہ بات نہیں ہے تو یکساں نتیجہ عمل کا موجود ہونا ناممکن ہے جتنے تمدن اسلام کے پیشتر گذرے ہیں سب میں اپنے سے کمتر شئے کے آگے سر جھکا کر اپنے سے بزرگ اور بالا ہستی کی پرستش کا طریقہ عام رہا ہے اور اسلام نہ صرف اس طرز تعمیر کا پیرو نہیں ہے بلکہ اسکو قطعاً اپنے اعتقاد کے مخالف سمجھتا ہے اس خیال سے جس قدر ہم آگے بڑھیں فرق زیادہ سے زیادہ نظر آئیگا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم حسن کاری سوائے جزئیات کے باقی اپنی مکمل صورت میں غیر متاثر اور الگ تھلگ ہے۔

اب ہم اُس زمانے کی طرف رجوع ہوتے ہیں جب کہ اسلام ظہور پذیر ہوا اسلام کو سر اٹھاتے ہی دو زبردست تمدنوں سے سابقہ پڑا۔ جوں جوں تمدنِ اسلام تہذیب ایران اور روم پر حاوی ہوتا گیا آگے اثرات اوران کی صحبت کا اثر نامعلوم طور پر سیدھے سادھے مسلمانوں میں پیدا ہوتا گیا لیکن یہ کہنا کہ حسن کاری ان ہی اثرات کا نتیجہ ہے ایک ایسا خیال ہوگا جو کہنے والے کی تمدنی معلومات کی کوتاہی ظاہر کریگا۔ ایک محکوم قوم کسی مقتدر اور حاکم قوم پر خدمت کی حد تک اثر پذیر ہوسکتی ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی غلامانہ حیثیت کو اپنے آزاد آقاؤں کے دماغوں پر حاوی کر دے۔ مسلم حسن کاری اپنے معرض وجود میں آنے کی حد تک غیر مسلم محنت اور مہارت کی ممنون ہے لیکن اپنے اساسی خصوصیات کے لحاظ سے وہ سوائے اپنے مذہب کے

کسی کی منت پذیر نہیں ۔

مسجد نے اپنا جنم حقیقی معنوں میں اسی وقت لیا جبکہ خدا نے سرکار دو عالم پر وحی نازل کی اور لوگوں کو ماسوا اللہ کی پرستش سے ہٹا کر اپنے طرف بلانے کا حکم فرمایا ۔ آپ کی بعثت کے بعد مکہ کی زندگی اس قدر پُر آشوب ہو گئی تھی کہ کوئی تعمیری کام ناممکن تھا ۔ تاہم چالیسویں مسلمان نے اس حقیقی مذہب کو اسقدر تقویت بخشی کہ مسلمان خدائے واحد کے سب میں پہلے گھر میں اپنی عبادت علی الاعلان ادا کرسکے

ہجرت کے دوسرے سال حضور انور نے مسجد النبی کی بنیاد ڈالی یہ نہایت سادی سیدھی تعمیر تھی کچی دیواروں پر کھجور کی ٹہنیوں کا چھت اور کھجور ہی کے تنوں کے ستون قائم کئے گئے تھے ۔ قبلہ ابتداء میں بیت المقدس کی طرف تھا جو نزول[1] وحی کے بعد خانۂ کعبہ کی طرف بدل دیا گیا سب میں پہلی مسجد کے متعلق مغربی مورخ بہت بہکے ہوئے نظر آتے ہیں کچھ زمانہ پیشتر ۔ یہ خیال عام طور پر پھیلا دیا گیا تھا کہ خانۂ کعبہ دنیا میں سب سے پہلی مسجد ہے شاید یہ اس تعصب کا نتیجہ ہے جو ان سیاہ عینک والے مورخوں کو سرتاج عرب وعجم کے بانیٔ مسجد تسلیم کرنے میں مانع آتا تھا حال حال میں انھوں نے اس بات کو ماننا شروع کیا کہ دنیا کی سب میں پہلی مسجد، مسجد النبی ہے لیکن اسکی بناء کے متعلق اپنے حسب عادت عجیب وغریب مضحکہ خیز وجوہات تلاش کر لیتے ہیں ۔ خود ریورینڈ جو مسلم حسن کاری کا اسقدر زبردست ماہر جانا جاتا ہے اس غلطی سے بچ نہ سکا گر بیچارہ مجبور نظر آتا ہے ایک تو تعصب کی پٹی اس کے آنکھوں پر ہے دوسری طرف گمراہ کن رہنماؤں نے جن کی مدد سے وہ دیکھتا ہے اسکو حقیقت سے بہت دور کر دیا ۔ ہماری نظر میں صرف ایک اسپیرس ہی ایسا پایا جاتا ہے جو مسلم حسن کاری کے صحیح نصب العین کے متعلق نہایت بے تعصبی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے بہرحال اسلام کی سب میں پہلی عبادت گاہ مدینہ سے شروع ہوتی ہے ۔ ہم کو یہاں تاریخ اسلام کے مختلف دور کی اوراق گردانی

---

[1] سیرۃ النبی ۔

فرصت نہیں صرف اپنی ضرورت کے موافق بعض اہم چیزوں پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ مدینہ کی مسجد کے بعد تعمیر مساجد کا سلسلہ دو طرح پر قائم ہوا[1] ایک مفتوح شہروں میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی تعمیر دوسرے نو تعمیر شہروں میں مساجد کی بناء۔ دوسری صورت ہی مساجد کے ارتقاء میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ایران کی طرف مسلم نو تعمیر شہر کوفہ بصرہ اور خراسان ہیں اور مصر کے طرف فسطاط[2] (قدیم قاہرہ) اور قیروان ہیں۔

مسلمانوں نے جہاں کہیں عمارات تعمیر کیں وہاں ضروریات تعمیر اور مہارت جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے مفتوح قوموں سے حاصل کی اسی لئے ہم اسلامی تعمیر کو ان مفتوح قوموں کے لحاظ سے تقسیم کرینگے۔ ایک طرف ایرانی تمدن دوسری طرف رومائی تمدن، مسلمانوں کے زیر اثر آیا لیکن موخر الذکر تمدن کا اثر چونکہ بالواسطہ تھا اس لئے اسکو رومائی تمدن کہنا ٹھیک نہیں اسلئے سہولت کے لحاظ سے یہاں ایرانی سمت کو ایرانی کہینگے اور باقی سمت کو عربی۔ جو لوگ تاریخ اسلام کا مطالعہ سیاسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ وہ ممالک جن پر علاوہ خلافت راشدہ کے بنو امیہ کی بھی حکومت رہی ہے اور بنو عباس کے زیادہ عرصہ تک زیر نگین نہیں رہے ٹھیٹ عربی رجحانات اور جذبات کے حامل ہیں اور وہ ممالک جو ابو مسلم خراسانی کی بنائی ہوئی خلافت عباسیہ کے قلمرو میں رہے ہیں ان کا میلان زیادہ تر عجمیت یا ایرانیت کی طرف ہے اس لحاظ سے ہماری موجودہ تقسیم مسلم حسن کاری کی علمی تقسیم کہلائی جاسکتی ہے لیکن اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ مسلم حسن کاری کے دونوں شعبے ایک دوسرے سے

---

[1] الفاروق (حصہ دوم) از شبلی نعمانی۔

[2] فسطاط کے اصلی معنی خیمہ کے ہیں یہاں پر حضرت عمرو ابن عاص نے اپنا خیمہ اسلئے جاتے وقت برخاست نہیں کیا تھا کہ اسمیں ایک کبوتر کے جوڑے نے اپنا نشیمن بنالیا تھا۔ فتح و ظفر کے وقت واپس لوٹتے ہوئے حضرت عمرو نے یہاں پر ایک شہر بسایا جس کا نام اسی خیمہ کی وجہ سے فسطاط پڑ گیا۔

بالکل غیر متاثر ہیں علاوہ ازیں اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکالا جا سکتا تھا کہ مسلم حسن کاری کے صرف یہ دو ہی پہلو ہیں ۔ اسلام عالمی مذہب ہے اور جو مذہب عالمی ہو اس میں لازمی طور پر اس قدر لچک اور سیلان ہونا چاہیے کہ وہ ہر ملک کی آب و ہوا اور وہاں کے لوگوں کے مزاج اور ماحول کے مطابق ڈھل سکے یہی وجہ ہے کہ مسلمان جہاں گئے وہاں اپنے مذہب کی اصلیت قائم رکھکر باقی تمام حالات کے لحاظ سے جیسا دیس ویسا بھیس اختیار کر لیا ان معنوں میں مسلم حسن کاری کے اتنے ہی نام ہو سکتے ہیں جتنے ممالک میں یہ فن اس خاص مذہب کے ذریعہ سے ظاہر ہوا ۔ تاہم ہم آسانی کے لئے اپنی پہلی تقسیم کو بحال رکھ کر اس کی تقسیم پر بحث کرینگے ۔

عربی طرز حسن کاری میں جو مسجد اس وقت اپنے قدیم خدوخال میں ایک حد تک دکھائی دیتی ہے وہ جامعہ عمرو ابن عاص ہے اسکی اصلی حالت پر اگر ہم اعتبار کریں تو اس کا زیادہ تر مواد قدیم قبطی اور رومائی عمارت سے مستعار لیا گیا ہے جب مرمریں ستون اور سرستون Capital اپنی بلندی میں چھت کے سہارے نہ ٹھہر سکے تو اسمیں کمانوں کا اضافہ کیا گیا جن کو مضبوط بنانے کیلئے سرستون کے اوپر چوطرف شہتیروں کا بندھن دیا گیا ۔ غرض یہ تعمیر مسجد کا ابتدائی نمونہ ہے اس خاص طرز کار کی دو شاخیں پھوٹتی ہیں ایک وہ جو اموی دار الخلافہ دمشق میں پرورش پاتی ہے دوسرا وہ جو قرطبہ کے فن تعمیر میں نظر آتی ہے ۔ اس کے انتہائی نمونے ایک طرف جامع دمشق دوسری طرف جامع قرطبہ ہیں ۔ ان کا مفصل ذکر آئندہ مناسب موقع پر آئیگا ۔ اس کے بعد اس طرز کا دوسرا دور نو عباس کے مصری عاملوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے جس میں خاندان ابن طولون بہت مشہور ہے اس کے بعد فاطمین اور صلاح الدین اور اس کے جانشین کے دور میں سب سے آخری مصری نمونہ عثمانی ترکوں کے کارناموں میں داخل ہے ترکان آل عثمانی کی طرز تعمیر اپنی نوعیت میں بازنطانی اثرات کا نمونہ ہیں جس کو عربی اور عجمی کسی طرز سے کوئی تعلق نہیں ہے عجمی حسن کاری میں بغداد یاد کیا جا سکتا ہے لیکن وحشی تاتاریوں کے طوفان نے سوائے گنبد زبیدہ اور مسجد سامرہ کے کوئی چیز نہیں چھوڑی اس کے بعد دور قوم پر ستی کے

یادگار کے طور پر مسجد اصفہان نظر آتی ہے عجمی حسن کاری کی دوسری شاخ ہندوستان میں پھلتی پھولتی ہے اسکی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ طرز تعلیم جو بابر اور اس کی اولاد سے پہلے ہندوستان میں فروغ پا چکی تھی جو ایک کی مسجد قوت اسلام سے شروع ہوکر جامع بیجاپور پر ختم ہوتی ہے۔ دوسرے دو یعنی دور مغلیہ کی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ جامع مسجد دہلی ہے۔

اس سرسری تاریخی خاکہ کے بعد مسجد کی اندرونی چیزوں کے متعلق یہاں لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے مسجد نبوی سب میں پہلی مسجد ہے جس کے نمونہ پر تمام مساجد عالم تعمیر ہوئی ہیں اندرونی حیثیت سے مسجد نبوی کی ہر چیز بدل کر مسلم حسن کاری کی ایک خاص خصوصیت ہوگئی اس کے دو شعبے ہیں ایک مذہبی مثلاً ممبر، محراب، دیوار کعبہ وغیرہ دوسرے تعمیری مثلاً چھت، ستون، کمانیں اور قبے وغیرہ دیوار کعبہ وہ دیوار ہے جس کا رخ مکہ کی طرف ہو یہ دیوار ہر ملک میں اپنا رخ جغرافی حیثیت سے قائم کرتی ہے اور اسی کی پیروی میں تمام عمارت کی ساخت ہوتی ہے۔ محراب اور ممبر اسی دیوار کے ملحقہ لوازم ہیں چھت، ستون اور صحن مسجد یہ چیزیں ابتدائی مسجد کے لازمی اجزا ہیں بعد میں چلکر جب ستون اپنے خوش وضعی اور نزاکت کے ساتھ ساتھ مسجد کے چھت کی بلندی کو سنبھالنے کے قابل نہیں رہا تو کمانوں کا اضافہ کیا گیا۔ کمانوں میں جو جدتیں مسلمانوں نے پیدا کیں اسکی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ عرب اپنے وطن کی ہر چیز کو حسن کے معیار میں پیش نظر رکھتے تھے۔ کھجور کے نازک اور متناسب تنوں کا خیال ستون کی ساخت اور ترقی میں ہمیشہ مدد دیتا رہا یہی وجہ ہے کہ رومائی اور دوسرے بھاری بھرکم ستونوں کو عرب بھدا اور بدوضع سمجھتے تھے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے۔ نازک ستونوں کی خواہش نے کمانوں کی ضرورت پیدا کردی اور کمانوں میں بھی بجائے رومائی، گانھک یا دیگر موجودہ کمانوں کی تقلید کرنے کے انھوں نے ایک نئے طرز کی داغ بیل ڈالی جو خوبصورتی اور نزاکت کی وجہ سے اپنی آپ نظیر ہیں۔ مینار ابتداء میں ایک خاص ضرورت کی بناء پر مسجد کا جزو بنگئے "اسلام[1] نے" بجائے ناقوس یا جرس کے انسانی آواز کو اللہ کی طرف بلانے کا ذریعہ قرار دیا یہ چیز فطرت انسانی کے عین مطابق تھی" اس اصول اذان نے نہ صرف اسلامی

[1] لین پول۔ منقول ریو یا۔

مینار کو فن تعمیر میں داخل کیا بلکہ اس کے ذریعہ موسیقی بھی بالواسطہ مسلم حسن کاری میں راہ پاگئی ۔ موذن کا مینار ترقی کرتے کرتے مسجد کی زینت کے کام آنے لگا اور بعد میں بالکل ضروریات سے نکل کر حسنیات میں داخل ہوگیا ۔ صحن مسجد کا ایک لازمی جزو ہے اور سوائے بعض مستثنیات کے جیسے جامع گلبرگہ بھی داخل ہے ۔ یہ امر روشن رہے کہ یہاں صحن کے عرض مسجد کے اطراف ایک بڑا احاطہ چھوڑ دیا گیا جو ایک بڑی حد تک صحن کی قائم مقامی کرتا ہے ۔ یہ ہر مسجد میں پایا جاتا ہے یہ بھی سنت نبوی کی پیروی ہے صحن کے دونوں جانب دو دالان اکثر عربی مساجد میں نظر آتے ہیں جن کا تعلق مسجد کی اصلی عمارت سے ہوتا ہے انہیں ایک طرف غسل خانے اور طہارت خانے بناتے ہیں دوسری طرف مسافروں کے کمرے اور قرآن خوانی کا مکتب ہوتا ہے ۔ ایرانی طرز میں یہ دونوں دالان ایک متطیل کی شکل میں مسجد کے اصلی عمارت سے الگ بنائے جاتے ہیں دکن کی مساجد میں یہ چیز عام ہے صحن کے بیچ میں حوض ہوتا ہے تاکہ نمازیوں کو وضو اور غسل کیلئے پانی دستیاب ہوسکے مسجد کا دروازہ بھی تعمیری لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے اسکی تعمیر میں مسلمانوں نے بڑی دلدہی اور عرق ریزی سے کام لیا ہے ۔ قبہ یوں تو مسجد کا کوئی لازمی جزو نہیں لیکن شوق حسن آفرینی نے اس کو بھی مسجد کے ضروریات میں داخل کرلیا قبہ ابتداء میں منبروں کی چھت کا کام دیتا تھا بعد میں بنو امیہ کے الولعزم خلیفہ ولید کے ہاتھوں یہ مسجد کی چھت کا لازمی عنصر بنگیا ۔

اوپر ہم بتلا آئے ہیں کہ مسلم حسن کاری اپنی تخیل اور تجسیم میں کسی قدیم تمدن کی مقلد نہیں یہاں پر ہم یہ کہدینا مناسب سمجھتے ہیں کہ مسجد فن تعمیر کی ایک خاص صورت کے لحاظ سے اپنی نوعیت کا ایک مستقل اضافہ ہے مسجد کے متعلق جہاں تک مبصرین نے غور کیا ہے وہ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ایک ٹھیٹ اسلامی یادگار ہے ۔ اور اسکی ابتداء سرکار دوعالم کی بنائی ہوئی مسجد سے ہوئی ہے آگے چل کر ہم ہر مناسب موقع پر یہ بتلانے کی کوشش کرینگے کہ مسجد اپنی ہر انفرادی چیز میں بھی سنت نبوی کی پیروی کرتی ہے

یوں تو دنیا کی ہر قوم فن تعمیر میں جزئیات کے لحاظ سے یکساں نظر آتی ہے تاہم ہر ملک اور ہر قوم کا فن تعمیر اپنے ذاتی خصوصیات میں ایک دوسرے سے الگ ہے خاص طور پر وہ خصوصیات

جو روایات، اعتقادات اور آب و ہوا کا اثر ہوتی ہیں۔ یہی کیفیت اپنے عام مفہوم میں مسلم حسن کاری کی بھی ہے اسکا فن تعمیر بھی اپنے بعض خصوصیات میں دوسروں سے ممتاز ہے اور جو کچھ بھی انھوں نے اس خصوص میں کمایا وہ اس جوش اور وارفتگی کا نتیجہ ہے جو اس خدا پرست قوم نے مسجد کے بنانے اور سنوارنے میں ظاہر کیا وہ چیزیں جو اس طرح اس کی خاص بنگئیں ان میں سے بعض تو مسلمانوں کی جدت اور اختراع کا نتیجہ ہیں اور بعض انھوں نے دوسروں سے مستعار لیکر اپنا بنالیا۔ یہاں پر چند اجزائے مسجد کی تفصیل بیجا نہ ہوگی۔

محراب مسلمانوں کو خانۂ کعبہ کی طرف رُخ کرکے نماز ادا کرنیکا حکم ہے ہر مسجد کی سب میں اہم دیوار وہ ہوتی ہے جو قبلہ رُخ ہو اس دیوار کا درمیانی حصہ امام کے لئے ہوتا ہے اور چونکہ امام عبادت کا رہبر ہے اسلئے اسکو ایک امتیازی جگہ ملنی چاہئے اسی خیال سے دیوار قبلہ کے درمیانی حصہ میں ایک محراب بنائی جاتی ہے اسکی تعمیر میں مسلمانوں نے بہت محنت صرف کی ہے محراب کی وجہ سے دیوار قبلہ کا درمیانی حصہ مسجد کی دیوار سے کچھ آگے نکلا ہوا ہوتا ہے یوں تو عام طور پر ضرورت کے لحاظ سے محراب ہر مسجد میں ایک ہی ہوتا ہے لیکن بعض مساجد میں ان کی تعداد تین تک پہنچ گئی ہے جیسے کہ آجکل مسجد النبی[1] میں ہے یہ شاید مسجد میں تناسب اور حسن پیدا کرنے کے لئے بنایا گیا ہو زیادہ محرابوں کا رواج سب میں پہلے حضرت معاویہ کی مسجد سے شروع ہوتا ہے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت نے خلیفہ کو اس خطرہ سے آگاہ کیا جو ایک ہی صف میں کھڑے ہوکر نماز ادا کرنے میں پیدا ہوگیا تھا اس لئے حضرت معاویہ نے امام کے درمیانی محراب کے علاوہ ایک اور محراب سیدھے جانب پر بنالیا تھا اسی کے بالمقابل تعادل کی خاطر شاید ایک اور محراب بنائی گئی ہے اسطرح ممکن ہے کہ تین محرابوں کا رواج بعض مسجدوں میں پڑگیا ہو محراب کے بنانے میں جس قدر دیدہ ریزی عربی طرز تعمیر میں صرف ہوئی ہے اسقدر اہتمام عجمی طرز تعمیر میں نہیں پایا جاتا۔ جامع قرطبہ اور مسجد ابن طولون کے محراب حُسن کاری کے شہکار ہیں یہاں پر محراب کی ظاہری

---

[1] صراط الحمید از الیاس برنی۔

وضع و قطع سے ہم زیادہ تفصیلی بحث نہیں کر سکتے اس لئے کہ اس کا مفصل بیان کمانوں کے سلسلہ میں آجائے گا یہاں صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ محرابیں اپنی شکل و صورت میں ہمیشہ اپنے مسجد کی کمانوں کے طرز کے پابند ہوتے ہیں محراب کی تزئین اور آرائش بھی ایک خاص چیز ہے جس کا ذکر تزئینی کام کے تحت مفصل آئیگا ۔

ممبر

اسکے بعد ممبر کی باری آتی ہے مسجد النبی میں ایک کھجور کے تنہ کو کاٹ کر ایک اونچا مقام خطیب کے لئے بنایا گیا تھا جس کو بعد میں چھکر دفن کر دیا گیا زائرین ابتک اس مقام کی زیارت کرتے ہیں ممبر کی یہی ابتدا ہے جو آگے چل کر مسجد کی ایک منتقل چیز بنگئی ممبر کا رواج یوں تو عیسائیوں اور دوسرے مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے جن کے وجود سے مسلم ممبر نے اپنی آرائش اور تزئین میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے لیکن اپنی نوعیت اور شکل و صورت میں اس کو اپنے پیشروؤں سے کوئی نسبت نہیں ہر مشہور مسجد کا ممبر ایک خاص قسم کا ہوتا ہے اور مواد و حسن کاری کے لحاظ سے اس میں بہت کچھ اختلاف ہوتا ہے پتھر کے ممبر سے لیکر لکڑی کے ممبر تک موجود ہیں تاہم اپنی بساط کے موافق ممبروں کے بنانے میں بڑی مہارت اور محنت سے کام لیا گیا ہے اور بعض بعض ممبر تو اس قدر حسین ہیں کہ جسکو دیکھکر عقل حیران ہوجاتی ہے مثال کے طور پر مسجد قایت بے (قاہرہ) کا چوبی ممبر یا مسجد سلطان حسین (قاہرہ) کا مرمریں ممبر حسن آفرینی اور جدت طرازی کے یہ دو نمونے ایسے لاجواب ہیں کہ ان پر ان کے بنانے والی قوم فخر و ناز کر سکتی ہے سادہ سیدھا ممبر میں صرف تین بیڑھیوں کا ایک چبوترہ ہوتا ہے عموماً ہر مسجد میں محراب کے بائیں جانب ممبر رکھا رہتا ہے لیکن بعض مساجد میں ایک سے زیادہ مختلف مقامات پر نصب کئے جاتے ہیں بعض مرتبہ ممبر کی پہلی سیڑھی کے سامنے ایک دروازہ بھی بنایا جاتا ہے اور آخری سیڑھی پر چھت ہوتی ہے یہ طرز عربی ممبروں میں عام ہے بعض ممبر اپنی بلندی اور بعض وسعت کی وجہ سے مشہور ہیں ترکی مساجد کے ممبر بہت بلند ہوتے ہیں شاید انھوں نے بازنطائی کلیسا سے اس چیز کو اخذ کیا ہے ایرانی ممبر ممکن ہے کہ شاہان کیانی کی تقلید میں وسیع ہوگئے ہوں ۔

کمان

مسلم حسن کاری کی سب میں دلچسپ چیز کمان ہے اس میں مسلمانوں نے اس قدر ترقی کی ہے کہ اس خصوص میں کوئی دوسرا فن تعمیر اسکے مقابل نہیں ٹھہر سکتا ہر قطعۂ ارض کے مسلمانوں نے اس کو اپنی جگہ پر نئے انداز میں تعمیر کیا ہے اور اپنے بل بوتہ کے موافق اسمیں بہت کچھ ترقی کی ہے کمانوں کی کئی قسمیں ہیں خالص عربی طرز میں دائری کمان (ابتدائی کمان) نکیلی کمان Pointed Arch نعل نما Horse Shoe پیازی Cuspid سہ دائری Trifoil اور لکڑی کے سہارے والی کمانیں نظر آتی ہیں ایرانی طرز میں زیادہ تر دائری، نکیلی، پیازی اور کنول نما Flower کمانیں استعمال ہوتی ہیں۔ مغلیہ طرز تعمیر میں کنول نما کمان بہت پائی جاتی ہے کمانوں کا سب میں پہلا نمونہ اگر ہم اسکی قدامت پر اعتبار کرسکیں تو مسجد ابن طولون اور مسجد عمرو ابن عاص کا ہے مسجد ابن طولون کی کمانیں کچھ نکیلی اور کچھ نعل نما ہیں اور مسجد عمرو کی کمانیں دائری ہیں جن کو ستونوں کے قریب لکڑی کا سہارا دیا گیا ہے مصر میں آگے چل کر بارہویں اور چودھویں صدی کے اخیر میں سہ دائری کمانوں کا رواج عام ہوگیا یہ کمانیں مغربی اموی حکومت کی یادگاریں ہیں اور اس کے بہترین نمونے اندلس کے اجڑے ہوئے آثار میں پائیجاتے ہیں ایرانی طرز تعمیر میں جیسا کہ ہم نے بیان کیا نکیلی، پیازی اور کنول نما کمان عام ہے ہندوستان میں پٹھانوں نے زیادہ تر پیازی اور نکیلی کمانیں استعمال کی ہیں مغلوں نے کنول نما کمان کو بہت استعمال کیا ہے جو ایک حد تک ہندو مسلم اتحاد کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں ان کے حسن کو علاوہ ظاہری شکل کے تزئینی نمونوں کی وجہ سے دوبالا کیا گیا ہے موتی مسجد دیوان عام اور خاص کی کمانیں اسکی اچھی مثالیں ہیں ترکوں نے اپنے طرز تعمیر کو بازنطائی حسن کاری سے حاصل کیا ہے اسلئے وہ اپنی ہر چیز میں ان ہی کے پیرو نظر آتے ہیں انکی کمانوں میں بازنطائی اور عربی دونوں طرز شامل ہیں۔

ستون اور سرستون

ستون کے استعمال میں مسلمانوں نے نہایت آزادی اور فراخدلی سے کام لیا ہے جہاں جہاں اُن کو اپنے کام کی چیز نظر آئی اسکو انہوں نے

چن لیا ہاں اتنا خیال ہر وقت اُن کے پیش نظر رہا کہ ستونوں کو مسجد النبی کی پیروی میں نزاکت اور تناسب میں اعتدال سے بڑھنے نہیں دیا جائے یہی وجہ ہے کہ رومائی پرشکوہ ستونوں اور یونانی گاؤدم اور بھاری بھرکم ستونوں کا رواج مسجدوں میں نہیں ہوسکا۔ ہاں سرستونوں کے استعمال میں بالکل آزاد اور بے پرواہ نظر آتے ہیں جامع قرطبہ اور جامع دمشق میں بعض ایسے رومائی یونانی اور گاتھی سرستون نظر آئینگے جن کا جوڑ تک ستونوں سے نہیں ملتا مسجد عمرو ابن عاص میں تو بالکل غیر تبدیل شدہ رومائی سرستون استعمال ہوئے ہیں عربی اصول پر بنائے ہوئے سب میں پہلے سرستون جامع ابن طولون میں نظر آتے ہیں جو بارہویں صدی عیسوی کی یادگار ہیں اسلامی ستون اور سرستون ایک حذنک آویزانی Stalactic نمونہ کی ترقی یافتہ شکل ہے بعض مرتبہ ستونوں کو رکن Piers کے چاروں طرف چڑھا دیا گیا ہے ایسی صورت میں ستون محض رکن کی تزئین کے خاطر بنائے گئے ہیں اور اصلی عمارت کا سہار رکنوں پر رکھا گیا ہے ہندوستان میں ستونوں کا رواج بہت کم ہے زیادہ تر کمانیں رکنوں پر قائم کیگئیں ہیں مساجد میں سب میں پہلے رکنوں کا استعمال مسجد ابن طولون میں ہوا اسکی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ مسجد کی وسعت کے لحاظ سے جب ستون لگانے کا اندازہ کیا گیا تو تمام مصر کے کلیسا اور پرانے محلوں کے ستون بھی اس کے لئے ناکافی نظر آئے اور ساتھ ہی والئی مصر اسکو پسند نہیں کرسکتا تھا کہ اپنی ذمی رعایا کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگے یہی وجہ ہے کہ جامع ابن طولون میں بجائے ستون کے ارکان استعمال ہوئے۔

مینار

سب میں پہلا مینار جو اب موجود ہے وہ جامع ابن طولون کا مینار اذان ہے جو مسجد سامرہ عباسی طرز کی تقلید میں بنایا گیا تھا ابن طولون کے مینار میں دو مینار گردشیں Balconies of Minarets ہیں۔ مصری مینار کا زیرین حصہ عموماً چوگوشہ ہوتا ہے اور مسجد کی دیوار کی بلندی تک اسی قسم کا بنایا جاتا ہے اسکے بعد اس کی شکل چھ گوشیہ یا استوانی ہوجاتی ہے اس پر بعض وقت سانچہ کاری اور بعض وقت نمونہ کاری کے ذریعے سے آرائش

کیجاتی ہے ۔ اور بعض دفعہ ان دونوں کے بجائے صرف ایک یا چند کمر بند عربی کام کے مینار کے درمیان استعمال کئے جاتے ہیں جس پر یا تو آیات قرآنی لکھی جاتی ہیں یا گل بوٹہ کاری کا کام ہوتا ہے ۔ شام اور فلسطین میں عموماً ہر مینار کے دو مینار گردش ہوتے ہیں اور اوپر کا حصہ مخروطی شکل کا ہوتا ہے اندلسی تعمیر کا سب میں مشہور مینار اشبیلیہ کا مینار ہے جو شکل میں مربع ہے یہ مینار عربی طرز کے خوبصورت گل بوٹہ کاری کے لئے جو چونہ کا بہترین کام ہے بہت مشہور ہے ۔ ایرانی طرز تعمیر میں مینار مسجد کا مذہبی جزو قرار نہیں دیا گیا ۔ بلکہ اسکو علیحدہ ایک شعبۂ فن تعمیر سمجھا گیا ایک مدت کے بعد مینار مساجد میں حسن آفرینی کے لئے استعمال ہونے لگے انفرادی مینار کی ابتداء محمود غزنوی (۹۷۰ء) کے فتح مینار سے ہوتی ہے ۔ قطب مینار (۱۲۲۰ء) اس کا انتہائی نمونہ ہے اس کے بعد اکبر کا فتح مینار چتوڑ میں نظر آتا ہے لیکن یہ مینار بالکل ہندو طرز تعمیر پر بنایا گیا ہے دکن میں علائی مینار (چاند مینار دولت آباد) بہمنی شوق تعمیر کی یادگار ہے اس مینار کی تعمیر میں فن تعمیر کی مضبوطی اور استحکام سے زیادہ حسن اور نزاکت کو پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ نہایت خوبصورت اور سبک مینار ہے جس پر چینی کا خوبصورت کام کیا گیا تھا جس کے آثار اب بھی موجود ہیں ۔ ان میناروں میں قطب مینار کا زیرین حصہ مکرکی اور اوپر کا حصہ گول ہے ۔ اس پر قرآن شریف کے آیات سے حمایل کیا گیا ہے مسجد میں جو مینار نظر آتے ہیں وہ دروازوں یا مسجد کے سامنے کے رُخ کے دونوں جانب بنائے جاتے ہیں ۔ صرف تاج محل میں تزئینی مینار اصل عمارت سے ہٹا کر بنائے گئے ہیں جو شکل اور بلندی میں اصل عمارت کے متناسب تعمیر ہوئے ہیں اس کا مقصد دراصل اصلی عمارت کو نمایاں کرنا ہے اس کو دیکھ کر ایک مغربی ادیب کو دھوکہ ہوا اور اس نے بغیر سوچے سمجھے یہ رائے قائم کرلی کہ اصل عمارت کے لحاظ سے یہ مینار چھچھورے معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ بات محض مسلم حسن کاری کی روح سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے جو مینار مغلیہ دور کی یادگار ہیں وہ شان و شکوہ میں اپنے پیش رو سے کم ہیں لیکن لطافت اور خوبی میں بڑھے ہوئے ہیں مغلیہ مینار نیچے سے اوپر تک سڈول طریقہ پر بنائے گئے ہیں جس کو دیکھکر غالب کے "انگشت حنائی" کا تصور پیش نظر ہوجاتا ہے ۔ مینار گردشین حسین انگلیوں پر انگشتری کی طرح ایک سے

زیادہ ہوتے ہیں اور سرے کا حصّہ ایک چھ گوشیہ لیان ٹرن Lantern ہوتی ہے جسکے اوپر مخصوص مغلیہ طرز کا ٹوپن یا سہ پوش Cupola بنایا جاتا ہے جو سنہری کلس سے آراستہ ہوتا ہے۔ ہندی میناروں کا حُسن بجائے تعمیر کے اجزائے تعمیر میں مضمر ہے سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ کا استعمال جس میں سنگ سُرخ موزونیت سے شامل ہو مختلف چیزوں کی حُسن کارانہ تقسیم نہایت لطیف اور پاکیزہ گل بوٹا کاری اور کتابت اس کے تمام حسن کے حامل ہیں۔

قبہ[1] مسلم حسن کاری میں۔ یہ جزو تعمیر مستعار شئے ہے سب میں پہلے ولید نے اس کو بازنطینی طرز تعمیر سے لیکر اپنا حیرت انگیز قبہ جامعہ دمشق میں تعمیر کیا جس کی خوبی یہ ہے کہ وہ بلا دیوار اور سہارے کے چوکور بالائی کرسی پر قائم ہے لیکن یہ چیز یکدم مسجد کے لئے عام نہیں ہوئی۔ جامعہ دمشق کے بعد مساجد میں اس چیز کا اہتمام لازمی طور پر نہیں رہا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قبہ صرف مقابر کے چھتوں کے کام آنے لگا جس کا مذہبی مقصد اس شئے کی طرز تعمیر کے ذریعہ دکھایا جاتا تھا۔ گنبدوں کے قبے کچھ اس انداز سے تعمیر کئے جاتے تھے کہ جس سے خدا کی جلالی شان ظاہر ہو۔ اس قسم کا سب میں پہلا قبہ بغداد کی نیک خاتون زبیدہ کے مقبرہ پر بنایا گیا ہے رفتہ رفتہ یہ چیز بھی مسجدیں جگہ پانے لگی اور اس جلالی شان کے مظہر کو جمالیاتی روپ میں بدل دیا گیا۔ مصر میں سب میں پہلا قبہ تاریخی لحاظ سے جامعہ سلطان حسین کا ہے۔ مصر اور شام کے جس قدر بھی قبے ہیں اُن پر عربی طرز کی گلبوٹہ کاری اور پیچ در پیچ ہندسیہ کاری تمام دلدادگان حُسن کیلئے حیرت انگیز چیز ہے۔ اندلس میں قبوں سے بہت کم کام لیا گیا ہے اور اگر لیا بھی تو محض کنگرون وغیرہ کے غرض سے

---

[1] قبہ مینار وغیرہ کے متعلق ہم نے اپنے اصلی موضوع سے گریز کر کے گنبد وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے لیکن محض تشکیل کی خاطر کرنا پڑا ورنہ فی الحال ہمارا مقصد صرف مسجد سے ہے تاہم مسجد ہی چونکہ تمام مسلم حسن کاری کی جان ہے اس لئے اسکے سلسلہ میں دوسری عمارتوں کا ضرورتاً ذکر کرنا خارج از موضوع نہ سمجھا جائے گا۔

لیکن ان کو صحیح معنوں میں قبے نہیں کہہ سکتے۔

ایرانی طرز کا سب میں پہلا مغربی قبہ جامعہ تبریز کا ہے۔ اس قبہ کا ابھار و بلندی ہندوستان کے حسن کاری کے لئے سبق آموز اجزا ہیں۔ بعض قبوں کی بیرونی سطح پر عربی طرز کی تقلید میں گلبوٹہ کاری یا ہندسہ کاری ہے لیکن عربی گلبوٹہ کاری اور ایرانی گلبوٹہ کاری میں بہت بڑا فرق ہے جسکے متعلق بحث کرنے کی یہاں گنجایش نہیں۔ ہندوستان میں ترکوں کا دور فن تعمیر کے لحاظ سے کمانوں اور قبوں کا دور ہے۔ بعض مقامات میں تو پوری عمارت کی عمارت اپنے بالائی اجزا کے لحاظ سے صرف کمانوں اور قبوں کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ترکی قوم کو قبے بنانے سے عشق تھا۔ دکن میں جامعہ گلبرگہ تو صرف قبے ملاکر بنائی گئی ہے۔ البتہ مغل قبوں کو فن تعمیر کی جمالی خوبی سمجھتے تھے اسلئے انھوں نے اس کو ایک طرف تو نازک بنا دیا اور دوسری طرف اس کا استعمال ترکوں کی طرح شد و مد سے نہیں کیا۔ ہندوستان میں گنبدوں کی وسعت اور انتہا بولی گنبد بیجاپور پر ختم ہوتی ہے۔ جو عادل شاہی یادگار ہے۔ ہندوستان کے قبوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انکی بیرونی سطح بالکل سادہ ہوتی ہے انھوں نے اس خصوص میں اپنے کو عربوں یا ایرانیوں کی تقلید سے الگ رکھا

اب ہم مسجد کی آرائش اور زیبائش کے متعلق مختصر طور پر بحث کرینگے۔ مسلم حسن کاری کے اکثر شعبوں کی ترقی مسجد کو سنوارنے میں مسلمانوں کے شوق آرائش کا نتیجہ ہے۔ مسلم حسن کاری میں تزئین و آرائش کیلئے سوائے بتگری اور تصویر کشی کے مختلف آرائشی چیزوں کا استعمال کیا گیا ہے جسمیں سے بعض اہم چیزیں یہاں درج کیجاتی ہیں۔

(۱) ہندسیہ نمونے Geometrical Design (۲) گلبرگ نمونے Ornamental Design

(۳) تزئینی نمونے Foliage Design (۴) خط کاری Line Work (۵) خطاطی Calligraphy

عربوں نے ہندسیہ نمونوں کو اس قدر ترقی دی کہ وہ معمولی حرفتی کام کے بجائے

حسن کاری کا مستقل شعبہ بنگئے ۔ بعض بعض نمونے ان میں سے اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ نظر ان کی باریک اور نازک پیچیدگیوں میں الجھ کر حیران رہجاتی ہے زاویوں، قوسوں Cords اور خطوط کا اس قدر خوبصورت امتزاج اور ہر معمولی معمولی چیز کے لئے اسی قدر دیدہ ریزی اور مہارت کے اظہار نے واقعی اس چیز میں ایک جان پیدا کردی ہے یہ کام ابتداء میں مسجد کے دالانوں، کمانوں سرستونوں، ممبروں اور محرابوں کی زیبائش کے لئے عام تھا ۔ آگے چلکر اور چیزیں بھی اس کام سے فائدہ اٹھانے لگیں ۔ جب سے قالینی نماز گاہوں کا رواج ہوا تو اس حسن کاری نے ان کی تزئین میں بھی حصہ لیا ۔ مسجد کی قندیلیں، دریچوں کے جال، ہوادانوں کے آئینے، مینار گردشوں کے کٹگرا اور قرآن شریف کے رحال اور جلدیں غرض عربی طرز کے ہر کام میں ہندسیہ حسن کاری پیش پیش نظر آنے لگی ۔

گلبرگ نمونوں کی ابتداء یوں تو عربوں کے بہت پہلے کی ہے ۔ یونانیوں اور ان کے مقلدوں نے اس تزئینی شعبہ کو بہت کچھ ترقی دی ۔ لیکن عربوں نے اس کو اپنے ڈھب پر بالکل ہی ایک الگ چیز بنالیا ۔ قدیم (یونانی) گلبرگ نمونوں اور مسلم گلبرگ نمونوں میں یہ فرق ہے کہ مسلمانوں نے اپنے روایات کے مطابق انسیں جانداروں اور خیالی انسانی شکلوں کو علیحدہ کرکے خالص پھولوں اور پتوں سے کام لیا اور اگر کسی جگہ شاذ و نادر کیونتر، طوطا، عقاب، شیر و ببر کے نمونے نظر آتے بھی ہیں تو ان کو مسجد کی تزئین سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ دوسری چیز امتیاز کی یہ ہے کہ یونانیوں میں زیادہ تر اصلی پھول پات کے خدوخال نمونوں میں پیش کئے جاتے ہیں لیکن مسلم حسن کاری نے اسکو نزاکت اور حسن آفرینی کے شوق کے ذریعہ کچھ سے کچھ بنادیا ۔ کسی گلبرگ نمونے کو لیجئے چاہے وہ مسجد کی دیوار سے وابستہ ہو یا نماز گاہ سے ۔ اس سے اصلی پھول پتوں کا پتہ چلانا مشکل ہے ۔ خود مسلم حسن کاری کے دونوں طرزوں میں بہت بڑا فرق ہے ۔ عربی طرز میں پھول پات کا ڈھب سادہ تخیلی ہے تاہم یونانی طرز سے ایک حد تک متاثر نظر آتا ہے ۔ اس کے برخلاف ایرانی طرز پر جو بہت بعد کی پیداوار ہے چینی حسن کاری کا بہت بڑا اثر ہے ۔ مثال کے طور پر قائت بے کی مسجد کے نمونوں کو موتی مسجد کے نمونوں سے

مقابلہ کریں تو خود بخود ان دو بڑے دبستانوں (Schools) کا فرق نظر آئیگا۔

بعض وقت ہندسیہ اور گلبرگ نمونوں کو ملاکر کام کیا جاتا ہے ایسی چیزیں مسجد کی آرائش میں چونکہ بہت زیادہ استعمال ہوتی ہیں اس لئے سہولت کے خیال سے ان کو ہم تزئینی نمونے (Decorative design) کہینگے۔ یہ دراصل ہندسیہ نمونوں کے کھانچوں اور کھلے ہوئے مقاموں کو پُر کرنیکی کوشش ہے لیکن ایرانی طرز میں اس کو دوسرے ہی طریقہ سے استعمال کیا گیا ہے۔ وہاں بجائے ہندسیہ نمونوں کے، گلبرگ نمونوں پر خطوط مستقیم اور منحنی کا انطباق کیا ہے اور حسن و نزاکت میں بھی بہت اضافہ نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ طرز نے اس کام کے نہایت نایاب نمونے چھوڑے ہیں۔

تزئینی فن میں نظر فریبی یا خوش تناسبی پیدا کرنے کے لئے بعض وقت مسلم حسن کار مختلف رنگوں کے خطوط سے کام لیتی ہے۔ اسی کو ہم خط کاری کہتے ہیں۔ مصر میں مملوکوں نے اس کام کو عربی طرز کار کا طغرۂ امتیاز بنا لیا ہے۔ مختلف رنگ کے پتھروں کا استعمال اور ایک سے زیادہ رنگوں کے مختلف پٹیوں کا جوڑ آنکھوں پر ایک عجیب اثر ڈالتا ہے۔ سلطان حسین اور قیت بے کی مسجد میں یہ کمال اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ ایرانی طرز میں یہ کام شاذ ہی دکھائی دیتا ہے۔ تاہم دکن میں اس قسم کے کام کا بہت کچھ شوق معلوم ہوتا ہے حیدرآباد کی ٹولی مسجد میں سنگ سیاہ کا بھورے سنگلاخ پتھر کے ساتھ استعمال اور کہیں کہیں سفید گچ کا کام مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

تحفظ قرآن شریف کا شوق مسلم حسن کاری میں فن خطاطی کا اضافہ کرتا ہے خطاطی میں مہارت رکھنا بڑے بڑے بادشاہوں کے لئے ایک قابل فخر و ناز چیز سمجھی جاتی تھی۔ عربی طرز حسن کاری میں خط کوفی اور خط نسخ بہت مقبول ہیں۔ ابتداء میں چوطرف خط کوفی کا استعمال تھا یہ خط، خطوط اور زاویوں کے ذریعہ عربی حروف تہجی اور الفاظ و تحریر کو ادا کرتا ہے۔ بعض مرتبہ خط کوفی میں گلبوٹہ کاری سے جان ڈالی جاتی ہے ابتدائی مساجد میں اسی سے زیادہ کام لیا گیا۔ مسجد ابن طولون، اور مسجد سامرہ میں یہ کام دوسری تزئینی چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ مقدار میں ہے۔ مصر میں خط کوفی کے زاویوں کو خطوط منحنی سے بھی بنایا جاتا ہے

اسکی وجہ سے حروف کی شکل میں ایک خاص نزاکت وخوبی پیدا ہو جاتی ہے ۔ خط نسخ اور خط طغرہ' مساجد میں ایک زمانہ کے بعد مقبول ہوئے ۔ یہی خطوط اندلس کے طرز کار میں بھی نظر آتے ہیں ۔ ایرانیوں میں خط نستعلیق بہت مقبول ہے یوں تو خطاطی میں اہل ایران نے بیحد محنت و مہارت صرف کی ہے اور اس کو مستقل و اعلیٰ فن بنا دیا ہے اور علاوہ نستعلیق کے ہر قسم کی خطاطی میں ترقی کی ہے ۔ ہندوستان میں یہ فن بیحد مقبول رہا ۔ شمالی ہند اور دکن کی مساجد خواہ ترکوں کے دور کی ہوں یا مغلوں کے اس فن شریف کے نمونوں سے بھری پڑی ہیں اس کی ترقی کی محرک کئی چیزیں ہیں ۔ قرآن شریف اور احادیث کو حسین اور پائیدار خط میں لکھنے کا شوق ، تعمیر کرنیوالے اولوالعزموں کا اپنا نام اور اپنے کارنامے زندہ رکھنے کا خیال' بادشاہوں اور امراء کی تعریف کو پائیدار بنانے کی دھن اس کے ساتھ ساتھ حروف تہجی سے تاریخ کوئی کا مستقل فن یہ سب فن خطاطی کو ترقی دینے میں بہت کچھ ممد و معاون ہوئے ۔ خود خطاطی' اسلامی تاریخی کارناموں کے تحفظ میں بہت ہی کارآمد اور قیمتی خدمات انجام دیتی ہے ۔ بقول لین پول اگر یہ شوق اور عربی حروف تہجی کو خوبصورت بنانے کا یہ خیال مسلمانوں میں عام نہوتا تو اسلامی تعمیر کی ایک عمارت سے دوسری عمارت کو امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ۔ یہاں اتنی فرصت نہیں کہ اس فن شریف کی مختلف شاخوں کے حسن اور خوبی پر بحث کریں جو بجائے خود ایک مستقل مضمون چاہتا ہے ۔

مواد (Material) اور اس کے استعمال کے لحاظ سے بھی تزئینی حسن کاری کی کئی قسمیں ہوتی ہیں ۔ سنگ کاری' منبت کاری' مینا کاری' پچیہ کاری وغیرہ لیکن چونکہ ان سب چیزوں میں وہی حسن کاری استعمال ہوئی ہے جسکی تشریح اوپر گذر چکی ہے اس لئے یہاں پر ان کے تکرار کی چنداں ضرورت نہیں ہاں اس قدر بتلا دینا لازم ہے کہ عربی طرز سنگ کاری اپنے دقیق کام کیوجہ سے ممتاز ہے تو ایرانی طرز اپنی نزاکت اور خوش وضعی کے لئے مشہور رہے ۔ قیت بے اور سلطان حسین کی مسجد کے ممبر اور دالان کا کام' عربی تزئین کا بہترنمونہ ہے تو آگرہ اور دہلی کی پچہ کاری ایرانی طرز کا معراج تصور ہو سکتی ہے ۔ سب سے آخر ہم مساجد عالم پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تاکہ اس موضوع کے متعلق ہماری

ابتدائی معلومات اختتام کو پہنچیں ۔ مسجد کی ابتداء اور سب سے پہلی مسجد کے متعلق بحث اس سے پہلے گزر چکی ہے یہاں پر موجودہ دنیا کی مسجدوں کی تاریخی اہمیت، قدامت اور حیثیت کے لحاظ سے ہم مختلف مقامات کی مسجدوں کو پیش کریں گے ۔ دنیا کی قدیم ترین مسجدیں صرف دو ہیں جو دستبرد زمانہ سے محفوظ ہیں اور ساتھ ہی عقیدت کے ہاتھوں نے ان کے قدامت کے دامن کو ہر زمانہ کے گلوں سے پُر نہیں کیا ہے ۔ مسجد سامرہ بنو عباس کی یادگار ہے ۔ اور اسی کے بعد بنو عباس کے ایک عامل ابن طولون نے جامع ابن طولون قاہرہ میں تیار کی ۔ لیکن ہم عقیدت کے لحاظ سے جامع عمرو ابن عاص کو شروع کرتے ہیں اسکی قدامت بعد کے معتقدین کی محنت و کاوش نے ایک حد تک باقی نہیں رکھی تاہم اس کو دیکھکر ابتدائی مصری مسجد کا تخیل جما سکتے ہیں ۔ یہ مسجد ۶۴۲ء میں تعمیر ہوی اسمیں عربی امتیازی خصوصیات نمایاں ہیں لیکن سادگی اور کارا جرائی اسکی سب میں غالب خصوصیت ہے ۔ یہ وضع قطع میں مسلم تعمیر ہے لیکن اس کا رنگ روپ غیر مسلم ۔ تمام ستون رومائی مندروں سے مستعار لئے گئے ہیں جو اپنے طرز کاریں قبطی رومائی اور یونانی ہیں ۔ ستونوں کی بلندی کافی نہ ہونے پر کمانیں بنائی گئی ہیں گھماؤ میں پختگی پیدا کرنے کے لئے ستونوں کے اوپر لکڑی کے شہتیر دئے گئے ہیں جو سر ستونوں پر سہارہ کئے ہوئے ہیں ۔ اس طرح کمانوں کا بوجھ ہٹکر ستونوں پر منقسم ہوگیا ۔ اس مسجد کی اتنے مرتبہ مرمت اور تعمیر ہوئی ہے کہ قدامت کی جھلکیاں ایک حد تک بہت ہی دھندلی ہیں ۔ مصر میں دوسری قدیم مسجد جامع ابن طولون ہے جو ۸۷۶ء میں خاندان ابن طولون کے سب میں پہلے جو شیلے فرد نے سامرہ کے جامع مسجد کے نمونہ پر تعمیر کروایا ۔ لیکن سوائے مینار کے باقی سب چیزوں میں یہ اپنے نمونہ سے مختلف ہے ۔ اس کا مینار سامرہ کے مینار کی طرح ہے جو کلدانی تعمیر کے اثر کا حامل ہے ۔ تمام مصر میں ایک یہی مسجد ہے جس کے مینار کی سیڑھیاں، مینار کے اطراف ہیں جو بعینہ سامرہ کے مینار کی تقلید ہے ۔ مسجد ابن طولون کی کمانیں نکیلی اور نعل نما شکلوں کے اتحاد کا نتیجہ ہیں ۔ کہا جاتا ہے کہ اس مسجد کا عیسائی معمار یہاں کے رکنوں (Columns) کی تعمیر کا باعث ہوا جو بجائے مرمر کے ستونوں (Capitals) کے گچ سے بنائے گئے ہیں ۔ ہاں رکنوں کے اطراف

چاروں گوشوں پر گچ ہی میں ستونوں کی شکل بنادی گئی ہے تاکہ مسجد کی یہ خصوصیت استعارتاً موجود رہے ریورآنے اس زمانے کے مشہور مؤرخ مقریزی کے حوالے سے اس تبدیلی کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ بلند حوصلہ ابن طولون کا ارادہ اس مسجد میں صرف مرمریں ستون استعمال کرنے کا تھا۔ لیکن جب اس کا اندازہ لگایا گیا تو تمام مصر کے مختلف مذہبی اور غیر مذہبی عمارتوں کے ستون کی مجموعی تعداد اس ایک مسجد میں کھپ جانے کا خوف تھا۔ اس مجبوری کی وجہ سے اس نئے تعمیری جز کو مسجد میں اختیار کرنا پڑا جس سے مسجد کی تعمیر میں ایک خاص خوبی کا اضافہ ہوا ہے کمانوں کے حاشیوں کی طرح گچ سے تزئینی تحریر (Panning design) بنائی گئی ہے دو دو کمانوں کے بیچ میں رکنوں کے عینوں پر ایک ایک چھوٹی نمائشی کمان تعمیر کیگئی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف بوجھ کم ہوکر مضبوطی میں اضافہ ہوا بلکہ عمارت کے اندرونی حسن اور زیبائش کو چار چاند لگ گئے ساتھ ہی روشنی اور ہوا دونوں ضروریات کیلئے سہولت ہوگئی اور انہی چھوٹی کمانوں کو دیوار میں دریچہ کے بجائے بنایا گیا ہے۔ جو ہوادان اور روشن دان کا کام دیتے ہیں۔ دریچوں پر نہایت خوبصورت ہندسیہ کاری کے نمونے ہیں جو عربی طرز تعمیر کی ایک لازمی خصوصیت ہے۔ قاہرہ میں جامع ابن طولون کے بعد مسجد الحکم (۱۰۱۳ء) جامع الازہر قدیم وجدید (۱۲۲۷ء) اپنے پیرس[1] (Piers) کی وجہ سے مشہور رہیں۔ ان سب کا کام تعمیری اعتبار سے یکسانیت رکھتا ہے متوازی دالانیں ان عمارتوں کی خاص خصوصیات میں سے ہیں۔

یہاں پر ہم اس مختصر مضمون میں قاہرہ کی بعد کی مسجدوں پر بحث نہیں کرسکتے حالانکہ مسجد سلطان حسین اور مسجد قائت بے اس قابل تھے کہ ان کے متعلق اس جگہ پر لکھا جاتا لیکن ہم نے انکی انفرادی چیزوں کے متعلق اس سے پیشتر بہت کچھ کہا ہے اسلئے ان دونوں حسین پیکروں کی خوبیوں کو

---

[1] رکن اور کمان ملاکر جو ستون تعمیر کئے جاتے ہیں ایک حد تک ان کو سمجھنے کیلئے، پیرس کہہ سکتے ہیں چونکہ اردو میں کوئی لفظ اس مفہوم کا نہیں ملا اسلئے ہم اسی لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔

انشاء اللہ کسی اور موقع پر بیان کریگے ۔

قاہرہ کے بعد ہم قروان کا ذکر کرینگے ۔ مسجد قروان، مسجد عمرو بن عاص کے ۳۲ سال بعد بنائی گئی ہے اسلئے قدامت کے لحاظ سے دوسری مسجد کہلائی جاسکتی ہے جسکے اصلی آثار ابتک ہم کو ملتے ہیں ۔ اس کے دیوار کعبہ کا تعین امیر اکبر نے کیا تھا ۔ اصل مسجد کا پتہ چلنا تو تعمیر مسجد میں ناممکن ہے ۔ وسعت میں یہہ مسجد، مسجد عمرو سے زیادہ بڑی ہے اس کے شمال، مشرق و مغرب تینوں جانب دالانیں ہیں ۔ بیچ میں وسیع صحن چھوڑ دیا گیا ہے اصل عمارت کے درمیان عربی طرز کا مینار ہے ۔ یہاں کے رکن اور ستون سب کے سب رومائی عمارتوں سے لئے گئے ہیں کمانوں کے ابتدائی حصہ میں مسجد عمرو کی طرح، لکڑی کی کڑیوں کے سہارے دئے گئے ہیں ۔ یہاں کی کمانیں بھی نعل نما کمانوں سے مشابہت رکھتی ہیں ۔ اس سے آگے بڑھکر جب ہم اندلس کے مساجد پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو امیہ نے اپنی حکومت اور عبودیت دونوں کا زور اس قطعہ ارض پر دکھایا ہے جس طرح مشرق میں بنو امیہ کی شاندار ثانی جامع دمشق ہے تو مغرب میں جامعہ قرطبہ ۔ خلیفہ عبدالرحمن الداخل نے اس مسجد کو ۷۸۶ء میں شروع کیا تین سال میں اس مسجد کا پہلا حصہ ختم ہوا ۔ اسکے طرز تعمیر میں بجائے جامع دمشق کے جامع قروان کی تقلید کیگئی ۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ جامع دمشق اپنی وضع قطع میں نومسلم ہے اور جامع قروان پیدائشی مسلم ۔ ابتدائی مسجد میں اکیس کمانوں والے چودہ دالانیں ایک سے ایک ملحق بنائے گئے تھے اور ان دالانوں کی درمیانی کمانیں دوسرے کے مقابلہ میں بڑی تھیں، تمام مواد ابتدائی گاتھی (Gothic) عمارتوں سے لیا گیا تھا ۔ لیکن چونکہ ستون اور سرستون بلندی میں ناکافی تھے اسلئے نعل نما کمانیں ڈالی گئیں اور ان پر یا تو ازدیاد حسن کے خیال سے یا توسیع بلندی کے لئے اور ایک کمان کا اضافہ کیا گیا جسکی وجہ سے مسجد قرطبہ تمام دنیا کی مساجد سے الگ ایک نیا نمونہ حسن رکھتی ہے ۔ اس مسجد پر خلیفہ الحکم نے ۹۶۲ء میں بارہ کمانوں کا اضافہ کیا اور منصور نے ۹۸۵ء میں آٹھ اور دالانوں کا ۔ موجودہ صحن کا کچھ حصہ شمال کی جانب خلیفہ عبدالرحمن کے زمانہ کا ہے اور کچھ خلیفہ منصور کے ۔

جامع مسجد[1]

مسلمانوں نے دمشق کو ۶۳۵ء میں فتح کیا۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ انھوں نے وہاں کوئی مسجد ابتداء میں تعمیر نہیں کی صرف سینٹ جان نامی ایک گرجے کا مشرقی حصہ مسلمان اپنی نماز کے لئے استعمال کرنے لگے اور مغربی حد میں تو عیسائی بدستور اپنے تصرف میں رکھتے تھے دونوں قوموں کی آمد و رفت ایک ہی دروازے سے تھی جو رومی عہد کی ایک دیوار کے آثار سے تھا لیکن سٹیانی (Caetani) نے اس روایت کو ناقابل امکان ثابت کیا ہے۔ جامع دمشق اپنے اسلامی جنم سے پیشتر عیسائی گرجا تھی اور اس سے پہلے تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں رومائی دیول تھی اس کے بقیہ آثار کے ذریعہ جو اب تک جامع دمشق میں موجود ہیں مسٹر اسپیرس اور مسٹر ڈکی نے ایک نقشہ تیار کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمارت کا اندرونی حصہ ۱۳۰ فٹ لمبا اور ۱۰۰ فٹ چوڑا تھا۔ مشرق اور مغرب کے سمت دو دروازے تھے جن میں مغربی دروازہ اب تک موجود ہے قدیم دیول کو شہنشاہ تھیوڈوسس نے ۳۹۰ء میں ڈھا کر گرجا تعمیر کیا اور اس کو سینٹ جان کے نام پر معنون کیا اس کے بعد اسکے بیٹے آرکیڈیس نے اسمیں اضافے کئے۔ جب بنو امیہ نے اپنا پایۂ تخت مستقلاً دمشق کو بنا لیا اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کا دور (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) شروع ہوا تو اس عالی ہمت صاحب ذوق خلیفہ نے یہاں پر دنیا کی سب میں بڑی اور حسین ترین مسجد تعمیر کرنے کی دل میں ٹھان لی۔ اس کی ابتداء کے متعلق ابن جابر کہتا ہے۔

"ولید نے چاہا کہ عیسائی اس گرجا کے نصف حصہ کے معاوضے میں ایک نیا خوبصورت گرجا بنا لیں لیکن عیسائی اس پر کسی طرح راضی نہیں ہوئے اور خلیفہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی قوت کے ذریعہ سے اپنی تمنا پوری کرے۔ ایک روز ولید نے اپنے دست خاص سے اس پرانی عمارت کے

---

[1] جامع دمشق کے متعلق مفصل حالات مسٹر ہیم۔ لیس برگس کی کتاب "مصر اور فلسطین میں مسلم فن تعمیر" سے لئے گئے ہیں۔

آثار گرانا شروع کئے خلیفہ کے اس طرز عمل کو دیکھ کر تمام مسلمان دیوانہ وار آگے اور آن کی آن میں تمام عمارت تودۂ خاک تھی"

مسجد کی تعمیر میں جنوب اور مغرب کی طرف اب بھی گرجا کی دیواروں کے آثار موجود ہیں۔ مسجد کا اصلی حصہ ۵۳۰ فٹ لمبا اور ۳۲۰ فٹ عریض ہے اور صحن کا طول ۴۳۰ فٹ اور عرض ۱۲۵ فٹ ہے جنوب کی طرف اصلی مسجد کی عمارت ہے جو مصر عرب اور مغربی افریقہ کی مسجدوں سے الگ پورے طور پر گھری ہوئی ہے۔ ابتداء میں مغربی علمائے حسن کاری اس بات پر یقین کرتے تھے کہ یہ مسجد پرانے گرجا پر تعمیر کیگئی ہے اس لئے شکل وصورت میں یہ دوسری مساجد سے بالکل الگ ہے لیکن فرگسن اور ریویرا نے مدلل طور پر اس بات کو ثابت کردیا کہ یہ خیال غلط ہے۔ ریویرا نے بڑی قابلانہ تحقیق وبحث کے بعد اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ کسی صورت اتنی بڑی گرجا اس زمانہ میں موجود نہیں ہوسکتی جبکہ دنیا کی سب سے بڑی گرجا سینٹ پیٹر (روما) اس سے کچھ ہی بڑی ہے دوسرے گرجا کی تعمیر میں ٹران سیپٹ[1] عموماً بیچوں بیچ نہیں ہوتا جیسا کہ اس مسجد میں ہے۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ ولید نے ٹران سیپٹ کو محض اس لئے پرانی عمارت سے قبول کرلیا کہ اس کے اوپر دنما کا سب میں عجیب وغریب گنبد تعمیر کرنا اس کا مقصد تھا۔ ہم صلاح الدین نے ریویرا کے خیال سے اختلاف کیا ہے لیکن ہمارے خیال میں ریویرا اور صلاح الدین اپنے اپنے خیال میں صحیح ہیں۔ یقیناً ولید نے گرجا کی بنیادوں کو مسجد کا نقشہ ڈالنے میں استعمال کیا ہے لیکن اس کے چوطرف اپنے حسب منشاء اور مسجد کی ضروریات کے لحاظ سے توسیع کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود گرجا کے نمونے سے الگ ہونے کے اس جامع میں گرجا کی بنیادوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ برگس کا یہ خیال ہے کہ ابھی یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے ممکن ہے کہ آیندہ محققین کوئی صحیح نتیجہ پر پہونچیں۔ مسجد کا صحن تین طرف دالانوں سے گھرا ہوا ہے جن میں سے شمال کے سوائے باقی دونوں سمت کے متعلق ولید کے زمانہ کی عمارت

---

[1] ٹران سیپٹ گرجا کی تعمیر کا درمیانی حصہ جسکی شکل صلیب کی ہوتی ہے۔

ہونے کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ جنوب کے طرف مسجد کی عمارت ہے جس کی کمانوں میں دروازے ہیں اور عربی طرز کی جالی سے پردہ کا کام لیا گیا ہے اور یہ اس عمارت کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ یہاں کی کمانیں نعل نما ہیں لیکن برخلاف جامع ابن طولون کی کمانوں کے اوپر کا سرا نکیلا نہیں صرف دائری کمانوں کے نیچے کے دونوں گوشے دبا دئے گئے ہیں جسکی وجہ سے نعل کی شکل پیدا ہوگئی ہے یہ کمان آگے چلکر مسلم حسن کاری کی ایک خاص خصوصیت بنجاتی ہے۔ محراب کی کمان خاص نزاکت سے بنائی گئی ہے جس کے اوپر ایک قبہ بھی ہے۔

ولید کی مسجد کے متعلق روایت سے پایا گیا ہے کہ اس کے چاروں ضلعوں پر چار مینار تھے لیکن چونکہ وہ اس وقت موجود نہیں ہیں اس لئے ہم اسلامی فن تعمیر کے سب سے قدیم میناروں سے محروم ہیں ان میں سے وہ مینار پرانی عیسائی عمارت کی بنیادوں پر بنائے گئے تھے جس کے آثار ابتک پائے جاتے ہیں۔ مینار عیسےٰ اور غربی مینار ۱۲۷۰ء اور ۱۴۸۳ء کی تعمیر ہیں۔ دو مینار جو شمال کی طرف بنائے گئے تھے وہ اب ناپید ہیں مینار عروس جو ولید کے زمانہ کا بتایا جاتا تھا اس کے متعلق ریویرا کی تحقیق ہے کہ وہ ۱۲ صدی عیسوی کی یادگار ہے جو زمانہ سلطان صلاح الدین ایوب کا تھا اس کے دریچے، ہوا دان سب مغربی اثر کا پتہ دیتے ہیں اس لئے اس مینار کو کم سے کم عربی حسن کاری میں داخل نہیں کرسکتے۔ گنبد کے متعلق جو ٹران سیپٹ کے وسط میں تعمیر کیگئی ہے یہ متفقہ خیال ہے کہ وہ بعد میں بنائی گئی جو پیرس اسکے سہارنے کے لئے دالان کے وسط میں چاروں طرف بنائے گئے ہیں وہ نہایت ہی وسیع ہیں۔ ولید کا قبہ اسی پر قائم ہے جو فن تعمیر کے عجائبات سے ہے۔ بعد کے قبے ۱۸۲۰ء کی تعمیر ہیں جو ۱۹۶۰ء کی آتشزدگی کے بعد بنائے گئے ہیں اس کے بعد اسکی دوبارہ تعمیر تیمور کی آتشزدگی (۱۴۰۰ء) کے بعد ہوی۔ سب میں آخر ۱۸۹۳ء کی عظیم الشان آگ لگ جانے کے بعد اس کو ازسرنو تعمیر کیا گیا ہے اسکی وجہ سے پرانی عمارت کے تمام آثار نذر آتش ہوگئے ولید کی مسجد اپنی اصلی حالت میں دنیا کی ایک عجیب و غریب تعمیر تھی۔ مقدسی نے دسویں صدی عیسوی میں اس کو دیکھکر اسکے مفصل

حالات قلمبند کئے ہیں۔ ابن جابر ۱۳۴۵ء کا دلچسپ اقتباس درج ذیل کرکے ہم اس خوبصورت مسجد کی داستان کو ختم کرتے ہیں۔

"مسجد کے دونوں جانب خوبصورت شاہراہیں ہیں جہاں عطاروں کی دکانیں سجی ہوئی ہیں اور ان دوکانوں کے اوپر کی منزلوں میں لوگ رہتے ہیں جہاں سے مسجد کا نظارہ ہوسکتا ہے صحن کے بیچ میں ایک خوبصورت حوض ہے جو سنگ مرمر سے بنایا گیا اور اس کا سرپوش ایک خوبصورت قبہ ہے جسکو مرمر کے ستون تھامے ہوئے ہیں۔ اطراف ایک خوبصورت جالی ہے۔ حوض کے بیچ میں فوارے ہیں جن میں سے پانی نہایت ہی خوش فعلیاں کرتے ہوئے قد آدم بلند ہوتا ہے۔ وسطی فوارہ کے اطراف اور فوارے لگائے گئے ہیں ان میں سے بھی نخل آب بلند ہوتے ہیں۔ ان تمام کو دیکھکر ایک چاندی کے درخت کا تصور پیدا ہوتا ہے جسکی سیمیں ٹہنیاں چوطرف لہرا رہی ہیں اور اس کا نظارہ آنکھوں میں روحانی کیف پیدا کر دیتا ہے" اس عرب سیاح کو تمام عمارت کی خوبی میں دو چیزیں نظر آئیں۔ اطراف کی عطر بیز دوکانیں درمیانی حوض جہاں فوارے کا سیمیں درخت نظر آتا ہے۔ یہی عربوں کے لئے بہشت نظر ہے

مساجد ایران

آخر میں ہم ایرانی طرز مسلم حسن کاری کا ذکر کرینگے۔ ایران میں مسجد کے بنانے یا اسمیں حسن اور استقامت پیدا کرنے کا نسبتاً کم شوق رہا ہے عربی طرز کے مقابلہ میں یہ طرز محض اسلئے بیان کیا جارہا ہے کہ مضمون کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑجائے ورنہ صرف عربی طرز ہی میں سب کچھ آجاتا ہے۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ بنو عباس کے خزائن حسن کاری تاتاریوں کے حملہ کی وجہ سے تباہ ہوگئے تھے۔ جو کچھ نمونے موجودہ ایران میں ملینگے وہ بہت بعد کے ہیں۔ چنگیز خانی مسجد تبریز سے اسکی ابتداء ہوتی ہے جو ۱۲۹۴ء میں تعمیر ہوئی تھی اس مسجد کے متعلق جو کچھ بھی معلومات حاصل ہوتے ہیں اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرز نے تزئینی حسن میں بعض اضافے کئے ہیں۔ اس مسجد کا نمونۂ تعمیر بازنطانی طرز تعمیر سے متاثر ہے جو مرکزی گنبد، والانوں اور محراب پر مشتمل ہے۔ البتہ مسجد کا دروازہ نہایت شاندار محراب نما تعمیر ہے۔ جس پر ایک نیم دائری قبہ بنا ہوا ہے،

اسکے آویزانی کام (Statical work) سلطان حسین کی مسجد (قاہرہ) کے مشابہ ہیں جو اس سے سات سال پہلے بنائی گئی تھی۔ اسکی آرائش مختلف رنگوں کی اینٹوں سے کیگئی ہے جس کو عام طور پر چینی کا کام کہتے ہیں۔ نہایت باریک اور پر پیچ تزئینی نمونوں کے درمیان خط کوفی سے آیتیں لکھی گئی ہیں۔ گل بوٹہ کاری تمام تر ٹھیٹ ایرانی ہیں۔ دوسری قابل ذکر مسجد جامع اصفہانی ہے یہ مسجد ۱۵۰۵ء میں تعمیر ہوئی جسکو دیکھنے سے بیرونی سطح پر، تزئینی کام کرنے کی بے ثباتی محسوس ہوتی ہے وہ نہایت خوبصورت کام جو بیرونی کام پر صرف کیا گیا تھا اب بالکل فنا ہوگیا ہے مسجد کی اندرونی حالت اب بھی نسبتاً بہتر ہے اسکے کام کا تنوع اور رنگ کا نہایت خوبصورت استعمال زائر کی آنکھوں کو مسحور کرلیتا ہے۔ آویزانی کام جو محراب اور دالان کی چھت پر کیا گیا ہے وہ غالباً اپنی نوعیت کے بہترین نمونوں میں سے ہے اس مسجد کا نقشہ کم وبیش مسجد سلطان حسین (قاہرہ) سے ملتا جلتا ہے۔

مساجد ہند

ہندوستان میں بقول فرگوسن مسلم حسن کاری نے اپنی قدیم خصوصیت ہمہ گیری کا اظہار کیا ہے اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلم حسن کاری جو عجمی طرز کی ایک شاخ ہے کئی طرزوں پر منقسم ہوسکتی ہے لیکن نمایاں خصوصیت کے لحاظ سے ہم صرف دو حصوں میں ہندوستانی مسلم حسن کاری کو تقسیم کرینگے۔ ایک وہ حسن کاری جو محمود غزنوی کے حملہ سے بابر کی آمد تک دکھائی دیتی ہے جس کو ہم ترکی یا پٹھان حسن کاری کہینگے۔ اور بابر کے بعد سے مغل حسن کاری شروع ہوتی ہے۔ لیکن دکن میں عالمگیر کے حملہ تک ترکی حسن کاری کا دور دورہ رہا۔ یہ دونوں طرز اپنے اساس میں زیادہ تر ایرانی طرز سے متاثر ہیں۔ سادگی شان وشکوہ اور استحکام ترکی طرز کا اہم مقصد ہے۔

مسجد قوت اسلام دہلی، مسجد علاء الدین خلجی اجمیر اور مشہور مساجد دکن مثلاً جامع گلبرگہ جامع احمد نگر اور جامع بیجاپور اس طرز کی نمایاں مثالیں ہیں اس میں ایک مسجد گور بنگال بھی داخل ہے۔

بعض چیزوں کو ترکوں نے ہندوؤں سے ستعار لیا ہے جسمیں پیازی کمان (Cuspid arclr) سب میں مشہور ہے۔ یہ ہندی پیداوار دیولوں کی تعمیری مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے لیکن فرق یہ ہے

دیولوں میں ایسی کمانیں بجائے تعمیری مقصد کے تزئین کے کام میں آتی ہیں اور مسجد میں یہ چیز مستقل جزو تعمیر بن گئی۔ ترکی طرز تعمیر میں ہم صرف جامع بیجاپور کا ذکر کرینگے جو اپنی خصوصیات میں اس خاص طرز کی سب میں مشہور چیز ہے بیجاپور کی مسجد عادل شاہیوں کی مذہبی عمارات کا بہترین نمونہ ہے۔ اس مسجد کا نقشہ قدیم مصری مساجد پر رکھا گیا ہے۔ کمان، رکن اور دالانوں کی ساخت بالکل ہندی اور تزئین ایرانی طرز کی ہے۔ وسعت، سادگی اور خوش سلیقگی میں یہ مسجد اپنی آپ نظیر ہے۔ باوجود ویران اور غیر آباد ہونے کے اب بھی اس میں زائروں کا دل کھینچ لینے کی طاقت باقی ہے۔

مغلیہ طرز تعمیر کی ابتداء اکبر کی مسجد فتح پور سیکری سے ہوتی ہے۔ جس کا دروازہ اپنے بانی کی اولوالعزمی اور شان کا پتہ دیتا ہے۔ اسپیرس نے اس دروازہ کو انسانی قوت تخلیق کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے۔ موتی مسجد اور جامع مسجد دہلی مغلیہ طرز تعمیر کے دوسرے مشہور نمونے ہیں۔ جامع مسجد دہلی شکوہ پسند شہنشاہ شاہ جہاں کی یادگار ہے اسکی تعمیری خصوصیات میں اس کی اونچی کرسی بھی داخل ہے طرز تعمیر کچھ اس ڈھب کا ہے کہ باوجود وسعت اور فراخی کے یہ مسجد ایک خوبصورت ننھی منی چیز نظر آتی ہے۔ نزاکت اور اختتام میں پوری مہارت صرف کیگئی ہے۔ مینار اس مسجد میں بجائے مذہبی ضرورت کے تزئین کی خاطر بنائے گئے ہیں۔ پیش دالان کے کمان مغلیہ طرز کے کنول نما کمان کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ دروازے اپنے شکوہ میں اکبری دروازہ فتح پور سیکری سے کم اور حسن و نزاکت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ مسجد کے اوپر تین قبے ہیں جن کا درمیانی قبہ نہایت بلند و بالا ہے۔ بازو کے دونوں قبے شاید وسطی قبے کو نمایاں کرنے کے لئے تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہ تناسبی خوبی مغلیہ طرز کے ہر کام میں نظر آتی ہے۔ میناروں کی بلندی۔ سہی قدی اور موزونیت مسجد کی رفعت و شان کو بڑھا رہی ہے۔ یہاں پر ہم جامع مسجد دہلی کی مفصل کیفیت نہیں بیان کرسکتے تاہم اس مختصر سے بیان سے ایک حد تک مسجد کی حسن کارانہ حیثیت نظروں کے سامنے آسکتی ہے۔

ذیل میں ہم بعض ان کتابوں کا ذکر کرینگے جن سے اس مضمون کے لکھنے میں مدد لی گئی : —

1. Architecture, East and West by Spiers.

2. Muslim Architecture by G. T. Revora.

3. Saracenic Architecture in Egypt by S. Lane Poole

4: Mohammaden Architecture in Egypt and Palestine by M. S. Briggs.

5. History of Art by Carroti Vol. I & II.

6. Encyclopaedia Britanica See under "Mosque" "Muslim" Architecture" Etc.

واہ رے میں

از مولوی سید احمد حسین صاحب امجد حیدرآبادی

رباعی

عالم میں ہمارا کون محکوم نہیں دنیا میں ہماری کس جگہ دھوم نہیں
کیا پوچھتا ہے ہمارا اللہ اللہ ہم وہ ہیں کہ خود ہمیں کو معلوم نہیں

رباعی

یہ بھوت ہی جن ہی یا کوئی دیوتا ہی اکسیر ہے کیمیا ہے یا عنقا ہی
اک عمر سے سن رہا ہوں میں کی آواز سمجھا نہیں آج تک کہ یہ میں کیا ہی

رباعی

موہوم نمود نے ابھارا مجھ کو سر چڑھنے نے قبر میں اتارا مجھ کو
ہر شخص جہاں میں غیر کا ساتھی ہی اک میں ہوں کہ میرے میں نے مارا مجھ کو

ایرانی ادب فتح اسلام سے پہلے

(پرسٹین لٹریچر روبن لوی)

ملخص و ترجمہ از سید محمد صاحب بی۔ اے امدد گار لکچرار سٹی کالج

سرزمین ایران پر جو قوم آباد ہے وہ مشہور ہند یورپی خاندان سے علاقہ رکھتی ہے اور خود اس سرزمین کا نام ایران لفظ آریا سے صرفی تعلق رکھتا ہے۔ یہ ملک ایک تاریخی اتفاق سے جس نے یونانیوں کی خاص توجہ اسکی طرف پھیر دی تھی اور جس سے اس کا ایک صوبہ فارس یا پارس (یونانی پرس) خاص طور پر شہرت پا گیا تھا، فارس کہلانے لگا۔ اہل ایران کی زبان اگر ایک طرف اُن زبانوں سے مشابہت و قرابت رکھتی ہے جو یورپ کی قدیم السنہ ہیں تو دوسری طرف ہندوستانی زبانوں کے سنسکرتی خاندان سے بھی اسکا علاقہ ہے۔ ایرانی اقوام پارس، میڈی وغیرہ ہمیشہ ان علاقوں اور ملکوں پر قابض نہیں رہیں جو تاریخی طور پر ان کے نام سے وابستہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی خانہ بدوشی کے دوران میں بحر اخضر کے علاقے میں کہیں اپنی آبائی نسل سے جدا ہو کر جنوب کی طرف دریائے جیحون و سیحون کے مابین ملک میں گھومتے ہوئے اپنے مالیہ وطن کی طرف جا نکلیں اور اسی تو طن کی وجہ سے ان کی تاریخ جدا جدا دوروں میں منقسم ہو گئی اگرچہ ایسی روایتیں موجود ہیں جو دور دراز ماضی میں بلخ (Bactria) میں ایک

ایرانی خاندان کی حکومت کا پتہ دیتی ہیں لیکن ایرانی ریاست کا قدیم ترین تاریخی ذکر تقریباً نویں صدی قبل مسیح کے وسط سے ملتا ہے جبکہ آشوری بادشاہوں نے علاقہ میڈیا کی طرف اپنی توجہ منعطف کی۔ ایران کی شہرت کا آغاز تو کورش (Cyrus) اعظم کے عہد (۵۵۹ ق م تا ۵۳۰ ق م) میں ہوا۔ یہ بادشاہ میڈوی خاندان کو جو اس وقت برسر اقتدار تھا شکست دیکر خود بابل اور اس کے تمام مقبوضات اور باجگذار علاقوں کا مالک بن گیا۔ اسی نے ھخامنشی خاندان کی بنیاد ڈالی جس نے صوبہ فارس میں عروج پاکر اس صوبہ کو اس قدر عظمت و اہمیت بخشی کہ یونانیوں نے پرس (فارس) کو اسی طرح ساری سرزمین کا نام سمجھا جس طرح آج فارس یا اس کے لاطینی مرادف پرشیا سے ہم سارا ایران مراد لیتے ہیں۔

سیرس کے بعد اس کا بیٹا کمبوجیہ (Cambyses) اسکا جانشین ہوا یہ بڑا اولوالعزم تھا۔ باپ کی چھوڑی ہوئی سلطنت کو اور وسیع کرنا چاہا اور مصر فتح کرنے کی کوشش بھی کی مگر اندرون ملک کی ایک بغاوت نے اس کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہ دیا اور وہ مجبوراً مصر کی مہم کو خیرباد کہہ کر وطن واپس ہوا۔ یہاں ایک مجوسی گوماتا (Gaumata) نامی نے بادشاہ کے بھائی سمرڈیس (Smerdis) کے بھیس میں جس کو بادشاہ بے وفائی اور غداری کے شبہ پر عرصہ دراز قبل قتل کر چکا تھا، خروج کیا تھا۔ کمبوجیہ اس باغی کی سرکوبی کے لئے عجلت کے ساتھ وطن لوٹ رہا تھا کہ راہ میں اسکی زندگی کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور ملک شام ہی میں ۵۲۱ ق م میں راہی ملک عدم ہوا۔ اسکے بعد تخت و تاج کا وارث وشتاسپ (Hystaspes) تھا جو کورش کی طرح ھخامنشیوں کی اولاد سے تھا۔ لیکن وہ یا تو تخت و تاج غاصب سے لینا ہی نہیں چاہتا تھا یا اس پر قادر نہیں تھا۔ غاصب مستحکم طور پر تخت پر متمکن رہا اور بالآخر ہسٹاسپس کا بیٹا دارا اس کو تخت سے اتار کر خود صاحب تخت و تاج بنگیا

دارا ۵۲۹ ق م میں تخت نشین ہوا اور اس تاریخ سے لیکر اپنی وفات ۴۸۵ ق م تک مسلسل جنگوں میں پھنسا رہا۔ کبھی نئے ملک فتح کئے اور کبھی باغی صوبوں کو زیر کیا۔ فارسی ادبیات کا آغاز دارا ہی کے زمانے سے ماننا چاہئے۔ اسکی اپنی مہمات کے کارنامے قدیم فارسی رسم الخط میں مختلف

چٹانوں اور ایک دو پتھر کی لاٹوں پر کندہ موجود ہیں۔ اس کے کتبوں میں سب سے زیادہ مہتم بالشان اور نہایت اہم وہ کتبے ہیں جو خراسان کی شاہراہ پر کرمان شاہ سے کوئی تیس میل مشرق میں کوہ بیستون کی زبردست چٹانوں پر کندہ ہیں۔ دارا نے اس میں اپنی اصل و نسل اور القاب و اعلام کے ساتھ استحکام سلطنت کی تمام مہمات اور لڑائیوں کو تفصیل وار درج کیا ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ خدائے بوتر اہورہ مزدہ کے فضل و کرم سے اس کو تخت سلطنت حاصل ہوا۔ وہ ان لوگوں کے لئے جو اس کے کارناموں کی تشہیر و تبلیغ کریں دعائے خیر کرتا ہے اور ان کے لئے جو انھیں برباد کریں چھپائیں بددعا دیتا ہے۔

ادب کی مسلّمہ تعریف یعنے شاعری یا حسن کارانہ نثر کے لحاظ سے یہ کتبہ بمشکل ادبی پارہ کہا جاسکتا ہے کیونکہ اس کا طرز بیان بالکل غیر مربوط اور بے ڈھنگا ہے۔ تکرار الفاظ متعدد جگہ پائی جاتی ہے تقریباً ہر ایک فقرہ ایک مقررہ جملہ "شاہ دارا کہتا ہے" سے شروع کیا گیا ہے اور پڑھنے والے کو قانونی دستاویز سا معلوم ہوتا ہے۔ ذیل کا اقتباس اس کتبہ کی نوعیت کو بخوبی ظاہر کرسکتا ہے

"شاہ دارا کہتا ہے: یہ وہ (ہے) جو میں نے بابل میں کیا۔

شاہ دارا کہتا ہے: یہ وہ (ہے) جو میں نے کیا۔ اہورہ مزدہ کے فضل و کرم سے جب میں بادشاہ ہوا اس کے اگلے ہی برس میں انیس لڑائیوں میں مشغول ہوا۔ اہورہ مزدہ کے فضل و کرم سے میں نے لڑائیاں لڑیں اور نو بادشاہوں کو گرفتار کیا۔ گوماتا نامی ایک مجوسی تھا۔ اس نے جھوٹ کہا۔ اس نے ایسا کہا میں باردیہ سیرس کا بیٹا ہوں۔ اس نے ایران کو باغی بنادیا۔ ایک شخص نیڈن ٹوبل نامی بابل کا رہنے والا تھا۔ اس نے جھوٹ کہا۔ اس نے ایسا کہا۔ میں نیبوکڈنزر (نبوخذ نصر) نیبونائڈ کا بیٹا ہوں۔ اس نے بابل کو باغی بنادیا۔

شاہ دارا کہتا ہے: ان جنگوں میں میں نے ان نو بادشاہوں کو گرفتار کیا۔

شاہ دارا کہتا ہے: یہ وہ صوبے ہیں جو باغی ہوگئے۔ جھوٹ نے انھیں باغی بنادیا

تاآنکہ انھوں نے لوگوں کو دھوکا دیا۔ بعد ازاں آہورہ مزدہ نے ان کو میرے ہاتھ میں گرفتار کرادیا۔ جیسا کہ میرا ارادہ تھا میں نے ان کو نیست و نابود کیا۔

"شاہ دارا کہتا ہے: آہورہ مزدہ کے فضل وکرم سے میں نے بہت کچھ کیا (تھا) جو اس کتبہ میں نہیں لکھا (گیا) یہ اس لئے نہیں لکھا (گیا) کہ آیندہ جو کوئی بھی اس کتبہ کو دیکھے کہیں اسکو جو کچھ میں نے کیا بہت کچھ نہ معلوم ہو۔ کہیں وہ (اسکو) غلط نہ سمجھے"۔

دارا کے یہ اور دوسرے کتبے اور اسکے جانشین زرکسز (Xerxes)

(۴۸۵ ق م تا ۴۶۵ ق م) اور ارتخزرکسز (Artaxerxes) (۴۶۵ ق م تا ۴۲۵ ق م) کے کتبات نقش رستم و اصطخر ایران کے قومی ادب کی ابتداء کا پتہ دیتے ہیں اگرچہ یہ مشتبہ ہے کہ ایران کے باشندے حروف کے راز سے آگاہ بھی تھے یا نہیں۔ بعض قدیم دور میں اہل ایران ایک جنگجو قوم تھے اور اپنے معاصرین کی جرات و نیک مزاجی اور دقت شعاری کی تعریف کیا کرتے تھے۔ الکانا دشا سیرس یہودیوں کے لئے ایک برگزیدہ اور موحن اللہ بادشاہ تھا اور اسکی رعایا کی مردانہ خصائل نے نواہل یونان سے بھی خراج تحسین حاصل کیا تھا۔ ان کے کارنامے ایسے ہیں جو ایک جنگجو اور سخت جان قوم ہی سے توقع کئے جاسکتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی شاعرانہ یا جذباتی رنگ آمیزی نظر نہیں آتی مگر مذہبی حوالے جیسے آہورہ مزدہ کا ذکر جابجا ملتے ہیں اور یہ اس لئے قابل بیان ہیں کہ بادشاہ اور بلاشبہ اسکی رعایا میں سے چند کا زرتشتیت کے پکے پیرو ہونے کا ثبوت دیتے ہیں اور ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب اس زمانہ میں مستقل طور پر ایران میں رائج تھا۔ زرتشتی مذہبی کتابیں میں ایک جداگانہ ذخیرۂ تحریرات ہیں اور یہ بھی لسانی طور پر فارسی قدیم میں شمار کیجاتی ہیں۔

مذہب زرتشت کی ابتداء اور پیدائش کی نسبت بے حد اختلاف رائے ہے۔ بعض لوگوں نے تو زرتشت کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور بعض جو اس کے وجود کے قائل ہیں اس کا زمانہ ۶۰۰ ق م اور ۶۰۰ ق م کے درمیان کہیں بتاتے ہیں۔ علمائے حال میں سے اکثر کا خیال ہے کہ زرتشت

ساتویں صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں اور غالباً موجودہ آذربائیجان کے علاقہ میں گزرا ہے۔ یہ امر بھی مختلف فیہ ہے کہ اسکی کوئی مذہبی یا ادبی تصنیف اس وقت موجود ہے یا نہیں۔ اوستا یا زرتشتیوں کی انجیل جن کتابوں پر مشتمل ہے ان میں سے صرف ایک حصہ 'گاتھا' یا گیتوں کو عام طور پر خود بانیٔ مذہب کی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔ ان گیتوں کے طرز بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً پہلے پہل یہ نثر پر سے سنائے گئے تھے۔

پروفیسر۔ اے۔ وی۔ ولیس جیاکسن جنھوں نے اوستا کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اسکے بعض حصوں میں اعلیٰ شاعری بتاتے ہیں۔ اپنی رائے کی تائید میں وہ متھرا کی مدح کے مندرجہ ذیل حصہ کو پیش کرتے ہیں:۔

"وہ آسمانی فرشتہ متھرا لافانی سورج سے بھی پہلے جو تیز رفتار گھوڑوں پر سوار آتا ہے کوہ ہیرانی (البرز) پر چڑھ جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے سنہری زیوروں میں پہاڑ کی خوبصورت اور فلک بوس چوٹیوں پر تصرف کرلیتا ہے اور پھر مہربانی کی نظروں سے سارے آریاؤں کے وطن کی طرف جہاں بہادر سردار اپنی لاتعداد سپاہ کو میدان جنگ میں صف بستہ کر رہے ہیں دیکھنے لگتا ہے"۔

اوستا کی اصل و ابتدا اور دیگر متعلقہ کتب کی تصنیف ایسے ہی مختلف فیہ مسئلے ہیں جیسے کہ خود زرتشت کی تاریخ اوستا کتاب کا نام ہونے کے علاوہ اس زبان کو بھی کہتے ہیں جس میں یہ کتاب لکھی گئی اور یہ سنسکرت سے بہت ملتی جلتی زبان ہے اور بہت سے امور میں پیکانی خط کے کتبات والی قدیم فارسی سے بالکل جدا ہے۔ بعض علما نے اوستا کی زبان کو مشرقی فارسی اور گاتھوں کی زبان کو مغربی فارسی قرار دیا ہے مگر یہ نظریہ دلائل و براہین کا حامل نہیں۔

پارسیوں کی روایت کے بموجب ساسانی عہد میں اوستا (۲۱) کتب پر مشتمل تھی مگر اب اس کا صرف ایک جز باقی رہ گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں ان (۲۱) کتابوں میں صرف ایک کتاب تمام و کمال اور چند ناقص و نامکمل حصے پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام حصص عبارات کے دستور العمل اور مذہبی قانون سے

متعلق ہیں اور روزمرہ استعمال ہی کی وجہ سے محفوظ رہے ہیں۔ اوستا کا موجودہ سرمایہ دو حصوں میں منقسم ہے (۱) اصل اوستا (۲) خرد اوستا۔ آخرالذکر چھوٹی دعاؤں کی کتاب ہے۔ اصل اوستا کی تین شاخیں (۱) وندی داد جو روایت کے بموجب واحد مکمل کتاب ہے اور جو مذہبی قانون، دیو بالا اور گاتھا کا مجموعہ ہے (۲) وسپارد جو قربانی کی دعاؤں کا مجموعہ ہے (۳) یسنا جو دوسرا مجموعہ ادعیہ و عبادات ہے۔ زرتشت کے خاص متعلقوں سے قطع نظر اوستا میں لسانیاتی دلچسپی کے سوا ادبی اہمیت بہت ہی کم ہے۔

۳۳۱ ق م میں سکندر اعظم کے ہاتھوں ایران کی تسخیر نے نہ صرف ہخامنشی خاندان کا خاتمہ کر دیا بلکہ اس کے مذہب کو بھی سخت صدمہ پہنچایا۔ اس عہد کے آثار کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اس فتح نے قومیت کی روح اور مذہبی جوش دونوں فنا کر دئے اور اس کے بعد ساڑھے پانسو برس کی طویل مدت میں انبیا شعرا اور مورخ یا تو پیدا ہی نہیں ہوئے یا اپنے کارناموں کے معدوم ہو جانے کی وجہ سے خود بھی آیندہ نسلوں کے لئے فراموش ہو گئے۔ ۲۲۴ء میں ساسانی خاندان کی حکومت کی بنیاد پڑنے تک کوئی بنیاد صورت حالات میں نہ ہو سکی اور ادبی پیداوار کا احیا نہ ہو سکا۔

اس عرصہ میں جیسا کہ یونان اور روما کے قدیم مورخوں اور سکندر کے جانشینوں کے سکوں سے معلوم ہوتا ہے، اس فاتح اعظم کا سارا ملک اسکے دو جرنیلوں سلوکس اور ارکیلس میں تقسیم ہو گیا اور یہ اپنے اپنے علاقوں میں مرزبانوں کی طرح حکومت کیا کرتے تھے۔ زاں بعد جو ایام مصائب پیش آئے ان میں یہ دونوں خاندان اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے مسلسل برسرپیکار رہے پہلا خاندان میسوپوٹامیہ میں اور دوسرا پارتھیہ میں حکمران تھا ان کی تاریخی سلطنت روما کی تاریخ سے غیر منفک طور پر ملی ہوئی ہیں۔

بالآخر پارتھوی اقتدار کے زوال نے مغربی اثر و اقتدار کے خلاف ایران میں قومی بغاوت کو فروغ دیا اور اس کے ساتھ ہی زرتشتیت کا بھی جو اصنام پرستی، یہودیت اور غالباً عیسائیت کی صدیوں شریک تمنی احیا ہوا اور پہلی مرتبہ ۲۲۴ء میں ساسانیوں کے برسر اقتدار ہونے سے قومیت کی روح

نمودار ہوئی ۔ یہ خاندان مقامی ایرانی شہزادوں کا تھا اور اس کا پہلا بادشاہ اردشیر یا ارتخشیر اپنا سلسلہ نسب ہخامنشیوں سے بتاتا ہے ۔

اگرچہ زرتشتیت اور اوستا نے ایران کی زبان کی خصوصیات کو محفوظ رکھنے میں بڑی مدد دی تاہم اس عرصہ میں اس میں بہت سی تبدیلیاں اور ترمیمیں ہو گئی تھیں ۔ اس وقت وہ جس حالت میں تھی پہلوی کہلاتی تھی اور لفظ پہلوی یا پارتھوی یا پارتھی کی مرمہ صو بنیاتی شکل ہے پہلوی گو سارے ایران کی زبان نہیں تھی لیکن جس طرح زمانۂ سابق میں صوبۂ فارس سارے ایران کا نمایندہ تھا اسی طرح اس زمانہ میں جبکہ پارتھیہ کا سارے ایران پر غلبہ رہا ہے ایرانی اور پارتھوی دونوں ایک دوسرے کے مرادف ہو گئے تھے ۔

پہلوی کی سب سے قدیم تحریرات چند چٹانوں کے کتبے ہیں اور ان میں ساسانیوں کے ابتدائی عہد کے بعض تاریخی کارنامے اعلام والقاب پائے جاتے ہیں ۔ ان کتبوں کے زمانے سے لیکر عربوں کی فتح ایران تک پہلوی ادب میں بہت کچھ تصنیف و تالیف کا کام ہوا ہوگا اور بالخصوص زرتشتیت سے متعلق موضوعات پر متعدد کتب لکھی گئی ہونگی ۔ اسلامی فتح کی غارتگری ایک طرف ان کارناموں کے معدوم ہونے کی ذمہ دار ہے تو دوسری طرف ملک مفتوحہ کے نومسلموں میں عربی حروف کے رواج نے پہلوی رسم الخط کے علم اور اس کے استعمال کو صرف زرتشتی موبدوں اور مذہبی پیشواؤں تک محدود کر دیا علاوہ ازیں اسلام کسی گھر کے کارنامے کو کیسے پسندیدہ نظروں سے دیکھ سکتا تھا ۔ ممکن ہے کہ ان کارناموں سے اسکے اثر کے مٹ جانے کا اندیشہ ہو اور حقیقت بھی یہ ہے کہ نویں صدی عیسوی کے بعد بہت ہی کم ادبی پیداوار وجود میں آئی ۔ پہلوی ادب کے اس مختصر ذخیرہ کے لئے جو اب تک محفوظ ہے ہم کو ان قدیم ایرانی زرتشتیوں کے شائستہ اخلاف یعنی بمبئی کے پارسیوں کا ممنون ہونا چاہئے جو اسلام کی سختیوں سے بچنے کے لئے آٹھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں پناہ گزیں ہوئے ۔ اگرچہ یہ مہاجرین کچھ زیادہ ذخیرہ اپنے ساتھ نہیں لائے اور نہ اسکی حفاظت ہی کا خاص اہتمام کیا مگر ایران سے بعد آنیوالے موبدوں نے بہت سی پہلوی کتابوں کو بچا لیا جو بصورت دیگر یقیناً معدوم ہو جاتیں ۔

پہلوی زبان کا جو کچھ ادب اس وقت باقی ہے وہ اکثر و بیشتر مذہبی نوعیت کا اور اوستا اور اسکی شرح زند سے متعلق ہونے کی وجہ سے محفوظ رہا ہے۔ زند تو پہلوی زبان ہی میں لکھی گئی ہے اور اوستا و زند گویا صحیفہ آسمانی اور اسکی تفسیر ہیں۔ اوستا کے پہلوی تراجم مجوسیت کے اصول و عقائد، اعمال و عبادات اور ابداع و تکوین عالم کے خیالات کی کتابیں پہلوی کے مذہبی ادب کا نکلہ ہیں۔ ان کتابوں میں یورپ میں سب سے زیادہ مشہور بندہش، دین کارت اور مینوخرد ہیں جن کو ای۔ ڈبلیو۔ وسٹ اور دیگر افراد نے یورپی السنہ میں ترجمہ کر دیا ہے۔

پہلوی ادبیات کا غیر دینی حصہ جو بہت ہی مختصر باقی رہا ہے بعد کی فارسی تحریرات کے ارتقاء کے مطالعہ میں خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں ان مخصوص خیالات، حکایات اور تاریخی مواد کی بنیاد ملتی ہے جسکو اسلامی ایران کے شعرا نے استعمال کیا ہے۔ ان پند باقی ماندہ کتابوں میں موضوعات کی حیرت انگیز گوناگونی پائی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک معاشی "دستور ایرانیاں بہ عہد ساسانیاں" کا بڑا حصہ ہے۔ یہ عملی قوانین متعلقہ ازدواج، شخصی جائداد غلام وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ دوسری کتاب "انشا نامہ" ہے جس میں شائستہ اور درباری خط و کتابت کے مناسب آغاز و اختتام کے اصول درج ہیں۔ تیسری کتاب قدیم پہلوی الفاظ کی پازند میں فرہنگ ہے۔ دو اور دلچسپ کتابیں "تاریخ شطرنج" اور خسرو کاوتان اور اسکے حاجب کا قصہ ہیں۔ مگر سب سے زیادہ اہم کتابیں یادگار زریران یا شاہ نامہ گشتاسپ اور کارنامک انخ شیر یا پکان یعنے کارنامہ اردشیر بن بابک ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں ایران کی قدیم روایات اور نیم تاریخی شخصیتوں کا ذکر ہے۔ ان میں بہت سی ایسی حکایات درج ہیں جو فردوسی نے اپنے شاہ نامہ میں بیان کی ہیں۔

یادگار زریران ارجاسپ اور گشتاسپ کی اس جنگ کی داستان مذکور ہے جو آفرالذکر نے اپنے نئے مذہب زرتشتیت کو ارجاسپ کے سفرا کے کہنے پر ترک نہ کرنے سے چھڑی تھی۔ گشتاسپ کا بھائی جوارجاسپ کی مقاومت کا تمامتر ذمہ دار ہے میدان جنگ میں جرات و مردانگی کے حیرت انگیز

مظاہرات دکھاکر بالآخر مارا جاتا ہے مگر اسکی کوشش رائگاں نہیں جاتی اور اسکی بدولت اس کی جماعت کامیاب ہوجاتی ہے ۔

کارنامک اردشیر تو بیانگار سے بھی زیادہ شاہ نامہ فردوسی سے ملتا جلتا ہے ۔ اس میں اردشیر بن ساسان کی بچپن ماں بابک کسی بادشاہ کی بیٹی تھی جانبازیاں مندرج ہیں ۔ ساسان گو بظاہر ایک معمولی چرواہا تھا مگر حقیقت میں دارا کی اولاد سے تھا ۔ اس کا بیٹا اردشیر جب بچپن کی منزلیں طے کرکے عالم شباب میں پہنچا تو اس کو ایران کے حاکم اعلیٰ نے اپنے دربار میں طلب کیا ۔ یہاں سے وہ بادشاہ کے بیٹے سے جھگڑا کرنے پر شہر بدر کیا گیا ۔ مگر وہ طاقتور ہوکر واپس آیا اور بادشاہ کو مغلوب کرکے اسکی بیٹی سے شادی کرلی ۔ باقی کتاب میں بھی ایسی ہی جانبازیاں بیان ہوئی ہیں ۔

ان کتابوں کی تاریخ تصنیف صحت کے ساتھ معلوم نہیں لیکن اس میں بہت کم شبہ ہے کہ یہ کسی متاخر ساسانی بادشاہ کی فیاضی کا نتیجہ ہیں ۔ دقیقی جس نے شاہ نامہ کی ابتدا کی اور فردوسی جس نے اسکو پایہ تکمیل کو پہنچایا دونوں نے اس سے خوب مواد حاصل کیا ہے ۔ اس اصل کا طرز بیان بالکل سادہ ہے ۔ قصہ براہ راست آگے بڑھتا جاتا ہے اور کہیں پہلو نہیں بدلتا مگر شاہ نامہ قصہ کی اصل شاہراہ سے بار بار ہٹ جاتا ہے اور اس کا طرز بیان بھی آرایش و تکلفات سے مملو ہے ۔ اختتام پر دونوں میں بڑا اختلاف ہے ۔ تاہم دونوں میں تشابہ اس قدر زیادہ ہے کہ ایک کا دوسرے پر مبنی ہونا صاف طور سے ظاہر ہے ۔

ساسانیوں کی شاعری سرے سے مفقود ہے اور اگرچہ یہ تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ نوشیروان اور خسرو پرویز جیسے اولوالعزم بادشاہوں کے دربار مغنیوں اور شاعروں سے خالی ہوں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ساسانیوں کی حسن کاری ادبیات کی بجائے معماری و آذری میں رونما ہوئی ہو ۔

۶۵۱ء میں ساسانیوں کی سلطنت عربوں کے حملوں سے پاش پاش ہوگئی اور ساسانی خاندان کی آخری نشانی یزدجرد کی شکست کے ساتھ اس خاندان کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا

تاریخ عرب میں ایسے متعدد عہد گزرے ہیں جن میں اہل عرب نے قحط سالی سے مجبور ہو کر زرخیز زمینوں کی تلاش میں ترک وطن کیا۔ ایک ایسے ہی زمانہ میں جبکہ اہل عرب زرخیز زمینوں کے متلاشی تھے اسلام کو عروج ہوا۔ اس موقع سے اسلام کو قوت حاصل ہوی اور عربوں کی فتوحات کا سلسلہ دراز ہوگیا۔ ایران میں خلاف توقع آسان کامیابیوں کے بعد ایرانی تہذیب وتمدن کے آخری وشوارگذار مرکز سے مقاومت شروع ہوئی تو عربوں کے جذبات عداوت ونفرت میں زبردست ہیجان پیدا ہوا اور یہ مذہبی رنگ میں ظاہر ہونے لگا۔ عربوں اور ان کے نئے عقاید کی مخالفت کا قلع قمع کرنے کے لئے شدومد سے کوشش کیجانے لگی۔ ایران کے قدیم مذہب زرتشتیت کو مجبوراً عربی اصول وعقاید کی بڑھتی ہوئی قوت کے آگے ہار ماننی پڑی۔ اور وہ سلطنت جو کسی زمانہ میں بڑی عظیم الشان تھی اب ایک باجگذار علاقہ سے زیادہ نہیں رہی۔

موجودہ مختصر صفحات میں اسکی گنجایش نہیں کہ اس زبردست بیرونی انقلاب کے اثرات وعواقب وضاحت سے بیان کئے جائیں۔ اسلام بھی یہودیت کی طرح اپنے پیروؤں کی زندگی کے ایک ایک لمحہ کے لئے قانون اور اصول رکھنے کا مدعی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ اس دنیا اور آنیوالی دنیا کی چیزوں کے لئے نیا نقطہ نگاہ پیدا کرنا تھا۔ اس نے قوم کی دینیات کے سارے نظام کو بدلدیا اسکے ساتھ اس کے ادبی تعلقات کا بڑا حصہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ پہلوی رسم الخط کو مجبوراً اپنی جگہ عربی رسم الخط کو دینی پڑی اور عربی زبان سے واقفیت ان نومسلموں کے لئے ناگزیر ہوگئی کیونکہ اسکے بغیر انکی عبادات اور قرآن کی صحیح قرات ممکن ہی نہ تھی۔

ایرانیوں کی مرنجان ومرنج خصلت اور اثرپذیری نے انھیں اس جسمانی اور سیاسی قوت کی فیصلہ کن مخالفت کرنے سے باز رکھا جو ان کے استیصال پر تلی ہوئی تھی مگر اسکے ساتھ ہی ان کی اسی خصلت اور نرم مزاجی نے انکی اپنی روحانیت کے چند عناصر کے بقا کا سامان بھی کردیا اور ایک نئی زندگی کی توقعات بندھنے لگیں۔ زرتشتیت ملک سے بالکل فنا نہیں ہوئی اگرچہ اس میں وسعت ناممکن ہوگئی تھی۔ اسی طرح قدیم زمانہ کی روایات، قصص اور خاص خاص باتیں بھی باقی رہ گئیں اور آیندہ ادبیات کی

بنیاد کا کام دیا۔ خود اسلام بھی ایران میں آکر جب وطن کے جذبات میں رنگا گیا جس سے حضرت علیؓ کی وفات کے بعد ہی شیعوں کا فرقہ پیدا ہوا۔

عربی دور حکومت کے پہلے ڈیڑھ سو برس میں ایران کی اندرونی حالت کیا تھی اس کا بہت ہی کم علم ہے۔ سیاسی طور پر سارا ایران ایک باجگذار صوبہ تھا جسکے کاروبار پہلے اموی خلیفہ کے بنائے ہوئے عاقلانہ نظام کے تحت سلطنت کی نگرانی میں چلائے جاتے تھے۔ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ مقامی ادب کی جو حب وطن کی تحریرات کے پیرایہ میں پیدا ہوا حوصلہ افزائی نہ کی گئی ہو مگر کیا عجب ہے کہ دوسری قسم کی کتابیں اس قول کے بموجب جو حضرت عمرؓ سے منسوب ہے غیر ضروری اور وہمی سمجھکر نیست و نابود کردی گئی ہوں کیونکہ قرآن حکیم تمام علوم کا پاک سرچشمہ ہے۔ خود فاتح قوم بھی پہلی صدی میں مہموں اور تنظیم کی مشغولیات کی وجہ سے بہت ہی کم ادب پیدا کرسکی۔ اس زمانہ میں اگر کوئی نظم لکھی بھی گئی تو وہ قدیم بت پرستانہ شاعری کے نمونے پر تھی اور اس میں اسلام کی فتوحات کی بجائے پرانی ڈگری پر شاعر کی تفریحی جانبازیاں بیان کی گئیں۔ ان حالات میں ایران کی خموشی کے اسباب و علل آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں فقط

نوائے فطرت

جناب محمد بدرالدین صاحب شکیب بی۔ اے (عثمانیہ)

اے سراپا محویت! سرمستیٔ عہدِ شباب — اے مداوائے دلِ محزوں تمنائے رباب
کچھ سکوں بخشِ دلِ ناکامیٔ الفت ہے تو — ٹوٹ جائیں بندِ غم وہ عالمِ عشرت ہے تو
روح کی گہرائیوں کا ایک پیمانہ ہے تو — سُن رہے ہیں گوشِ جاں جسکو وہ افسانہ ہے تو
تو جمالِ شاہدِ فطرت کی اک تصویر ہے — اِس سکوت افزا فضا کی خامشی تفسیر ہے
ایک ارمانوں کا طوفاں تیرے زیر و بم میں ہے — عکسِ دل بھی جلوہ فرما دیدۂ پُرنم میں ہے
لحن بخشِ آہنگِ ہنگامہ، دل کو پیغامِ حیات — نغمہ جو ہے سکوتِ شب میں نبضِ کائنات

ذرہ ذرہ نغمۂ خاموشی سے وارفتہ ہے
جانِ شاعر کائناتِ دہر سے وابستہ ہے

اے مغنی! اے سراپا عشوہ و ناز و ادا — اے محبت کی زباں! شاعر کی جاں تجھ پر فدا

آہ تو اسرارِ فطرت کر رہی ہے بے نقاب — اور خود ناآشنائے لذتِ کیفِ شباب

حسن جاں بخشِ ازل تیرے لب گفتار سے — تازہ پود عشق ملتے ہیں تیری رفتار سے

لحن داؤدی سے پھر ساری فضا معمور ہو — ساغر نو پھر شرابِ کہنہ سے پُر نور ہو

یہ دلِ صد چاک ہے محرمِ غمِ فردا و دوش — بے نیازی غمِ ہستی کا دے جامِ سروش

تو مجھے منت پذیرِ ساقیٔ و لبریز کر — بادۂ ہستی کو تو آلودۂ ساغر نہ کر

صوت بنکر عرصۂ عالم پہ چھا جاؤنگا میں
سرمدی نغموں کے سایہ میں چلا جاؤنگا میں

غالب کی فارسی غزلیں

از جناب محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی ایم۔اے جامعہ عثمانیہ

قدیم مذاق شاعری کے دلدادہ اور خصوصاً ایسے طبقہ میں جس کو ایران کی فارسی شاعری نے مرعوب کر رکھا ہے۔ یہ خیال متحقق رائج ہے کہ شعرائے ایران کی عدم توجہی، وناپسندیدگی کے باعث غالب کا فارسی کلام مستند اور مقبول نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اس کی دو وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) اہل زبان نے اسکو غیر مستند قرار دیا ہے (۲) مشہور شعرائے ایران مثل عرفی خاقانی قاآنی کمال اصفہانی نظیری وغیرہ میدان شاعری کے شہ سوار ہیں۔ جہاں غالب کا اشہب قلم ان کی برابر جولانی نہیں دکھا سکتا۔ (۳) غیر زبان میں کسی شاعر کا بلند پایہ اور مقبول ہونا ایک امر محال ہے۔

اس قسم کے خیالات دراصل مضمون ذیل کے محرک ہیں۔ لیکن منشا یہ نہیں کہ انہی کی جوابدہی پر اکتفا کیا جائے۔ خیالات اور نقطۂ نظر کچھ ہی ہوں، ہمارا مقصد یہ ہے کہ کلام غالب (فارسی) کو تا حد امکان معیار صحیح اور تنقید اصولی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

ابتدائی سوال اس عقیدہ کی تحقیق پر مبنی ہے کہ ایک شخص غیر زبان میں بلند پایہ شاعر نہیں ہو سکتا۔ نظر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ عقیدہ غلط العام نہیں بلکہ غلط العوام ہے۔ غلطی دراصل

لفظ بلند پایہ کے اطلاق و تعین میں ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک مشرقی شاعری کی عظمت کو جانچنے کے معیار صرف دو تھے (۱) زبان کی اہمیت (۲) شاعر کی شہرت اور مقبولیت۔ اور انہی دو امور پر اس کے رفع مرتبت کا انحصار تھا۔ زمانۂ موجودہ میں جبکہ تعلیم و تمدن کی گوناگوں ترقیوں کی بدولت قوم کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ شاعری کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرکے ہر ایک حصہ کی انفرادی اور اجتماعی اہمیت ہر اس کی عظمت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ ایک حصہ کو آرٹ، دوسرے کو لٹریچر کہتے ہیں۔ آرٹ سے مراد شاعر کی فنی خوبی، لٹریچر سے مراد اسکی تخیلی پیداوار ہے۔

اس اصول کو اگر معیار تحقیقات بنایا جائے تو ان مشکوک نظریات کا جسکی ایک مثال عقیدہ متذکرہ ہے معرض وجود میں آنا ناممکن ہوجاتا ہے۔

مضمون ذیل میں ہم اپنے آپ کو غالب کی غزلیات تک محدود کرتے ہوئے اس امر کے بخوبی انکشاف کی کوشش کرینگے کہ اس نے اپنی فارسی شاعری کی بدولت آرٹ اور لٹریچر کی کس حد تک خدمت کی ہے۔

جیسا کہ مذکور ہوا آرٹ سے مراد فن شاعری کے وہ محاسن ہیں جن کا تعلق مفہوم و معنی سے نہیں بلکہ ظاہری شکل و صورت سے ہے، بلا تخصیص زبان اگر ہماری شاعری پر نظر غائر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ الف ابتدا سے لیکر تا ئے تست تک آرٹ کی حکمرانی ہے۔ پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ مشرقی شاعری بالخصوص فارسی شاعری میں لفظی مینا کاری بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس شاعری کی افتاد کچھ ایسی پڑی ہے کہ فارسی اور اردو دونوں زبان کے شعراء نے علی الرغم عربی کے معنی سے قطع نظر کرکے اپنی پوری توجہ شاعری کے ظاہرا بناؤ سنگھار کی طرف مبذول کردی ہے۔ چنانچہ مغربی طرز کے نقاد جب اسکا تحقیقی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی طبیعت جو احساسات قلبی کو دیکھنے کی عادی ہے ہماری نقالی اور غیر احساسی لن ترانیوں سے اچٹ جاتی ہے، اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ اس شاعری میں صداقت احساس کا فقدان، جھوٹ اور لفاظی کی گرم بازاری ہے۔ یہ خیال اگر سراسر غلط نہیں تو سراسر صحیح بھی نہیں، ہمارے یہاں اس جھوٹ

اور لفاظی کے پردے میں ایک مخصوص ہیئت کے ساتھ ایسے نکات بیان کئے گئے ہیں جنکا نشان کسی دوسرے ملک کی شاعری میں بہ مشکل مل سکتا ہے۔ خیر۔ یہاں کہنا یہ تھا کہ آرٹ ہماری شاعری کا جزو لاینفک بلکہ عنصر اعظم ہے لہذا مشرقی شاعر مجبور ہے کہ وہ اپنی شاعری کا زیادہ تر انحصار اس لفظی مینا کاری پر رکھے جو سالہائے دراز سے اس کے ساتھ ممزوج اور مخلوط ہوگئی ہے۔

آرٹ اور غالب کی خصوصیات

غالب کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے ماحول کے مطابق آرٹ پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی لیکن اس میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اصلاح اور ترمیم بھی کی۔

انتخاب بحور آرٹ میں پہلی چیز غزلیات کی بحور کا انتخاب ہے۔ عمدہ بحور دراصل غزل کی عمدہ شکل وصورت کا پیش خیمہ ہے۔ اس کی موزونیت سے الفاظ و معنی میں موسیقیت، دلآویزی اور رنگ پیدا ہوجاتا ہے۔ مشاہیر شعرائے ایران اور متقدمین کی خاص روش یہ تھی کہ مشکل اوزان اور قوافی کی بحروں میں طبع آزمائی کی جائے۔ دراصل یہ وہ ابتدائی منزل ہے جہاں شاعر کے فطری جوش میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے اور اس عنصر کا استیصال ہوتا ہے جسے "سرک نوٹ" یا داخلی رنگ کہتے ہیں۔

غالب نے اس آئینی اور رسمی پابندی کی تقلید نہیں کی۔ عموماً اس کی غزلیں شگفتہ بحروں میں ہیں۔ الّا ان مقامات کے جہاں اس نے اپنے آپ کو اساتذۂ ایران کے مقابلہ میں پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ جو من قبیل شاذ ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی ہے۔ وہ شاعری میں لطافت اور ندرت کا دلدادہ تھا، اس کا یہ اصول تھا کہ تا حد امکان غزل کی زمین میں مشکل قوافی اور ردیف، ٹیڑھے اوزان کے سنگلاخ راستے نہ ہوں، بلکہ باغ کی طرح مسطح روشیں اور عنبر بیز فضا موجود ہو۔ اس خیال کو وہ اسطح

ظاہر کرتا ہے۔

بہ زمینے کہ بہ آہنگ غزل بہ نشینم خاک گلبوئے و ہوا مشک فشاں می بایست

ایک اور شعر میں اپنی شاعرانہ طرز روش کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے۔

غالب نہ بود شیوۂ من قافیہ بندی ظلمے ست کہ بر کلک و ورق می کنم امشب

یہی حال قوافی اور ان کی شگفتگی اور بے ساختگی کا ہے۔

غالب کی یہ خصوصیت جہانتک آرٹ کا تعلق ہے اہم ہے۔

خوبی مطلع انتخاب بحر کے بعد دوسری خصوصیت وہ ہے جسکو ہم خوبی مطلع سے تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ غزل مطلع سے شروع ہوتی ہے اس لئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جسقدر مطلع چست اور خوب ہوگا اسی قدر غزل کی آیندہ قدر و منزلت بڑھے گی مطلع کی خوبی نہ صرف ناظر بلکہ خود شاعر کے لئے موجب عذب و لطافت ہوتی ہے۔ غالب کی فارسی غزلوں میں عموماً مطالع نہایت بلند پایہ اور نیچرل پائے جاتے ہیں۔ مثلاً غزل ہے:

مرزا آمد و رفت قرار آمد و رفت، اس کا مطلع لکھا ہے۔

یار در عہد شباہم بہ کنار آمد و رفت ہمچو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت[1]

دوسری غزل ہے۔ مزارم می تواں کشتن، کنارم می تواں کشتن، اس کا مطلع ہے۔

(۲) جنوں ستم۔ بہ فصل نو بہارم می تواں کشتن صراحی بر کف و گل در کنارم می تواں کشتن

اسی طرح ــ

(۳) مرزفنا فراغ را مژدۂ برگ و ساز دہ سایہ بہ مہر واگذار قطرہ بہ بحر باز دہ

(۴) سرچشمۂ خونست زدل تا بزبان ہائے دارم سخنے با تو و گفتن نہ تواں ہائے

(۵) رفت آنکہ کسب بوئے تو از باد کردمے گل دیدمے در روئے ترا یاد کردمے

غالب کے ہاں مطلع غزل صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ جہاں تک ہم نے مطالعہ کیا ہے سوائے

---

[1] دیوان غالب فارسی مطبوعۂ نولکشور پریس ۱۲۷۹ھ ہجری۔

دو چار کے کسی غزل میں ایک سے زیادہ مطلع نہیں دیکھا۔ بادی النظر میں یہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن اس امر میں شاعر کی ایک خصوصیت مضمر ہے۔ اصل یہ ہے کہ غزل نویس کے لئے سب سے زیادہ مشکل مطلع اور سب سے آسان مقطع لکھنا ہے مشکل ایسی کہ اس پر غالب آنے کے بعد فن شاعری میں کوئی اہم چیز کا اضافہ نہیں ہوتا آسانی وہ کہ درحقیقت غزل میں ایک معمولی شعر کی بھرتی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ غالب نے مطالع کے لئے ایسی دماغ سوزی کو جو نتیجہ خیز نہ ہو اور جس سے روانی طبع و اظہار خیالات میں مداخلت بیجا ہوتی ہو نظر انداز کر دیا۔

اس منزل سے آگے بڑھنے کے بعد زبان اور پیرایۂ بیان کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ ہم پہلے پیرایۂ بیان کی بحث شروع کرتے ہیں۔

اس مبحث کا تعلق علم بدیع یعنی اس علم سے ہے جس سے تحسین و تزئین کلام کے طریقے معلوم ہوتے ہوں۔ علم بدیع کے دو بڑے شعبہ ہیں۔ صنایع لفظی، صنایع معنوی۔ چونکہ لفظ معنی کا تابع ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے صنایع معنوی کا ذکر کیا جائے۔

صنایع معنوی وہ ہیں جن سے معانی میں خوبی اور حسن پیدا ہوتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ تمام صنایع جو کلام غالب میں پائی جاتی ہیں، رفعت، سنجیدگی اور جدت، اور ندرت سے معمور، ابتذال اور سوقیانہ پن سے معرا ہیں۔

صنائع و بدائع کلام غالب

صنعتِ مراعات النظیر کلام میں کئی ایسی چیزیں مذکور ہوں جو باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہوں اور یہ مناسبت بطور تضاد نہ ہو ۔ مثلاً

خاک آئینہ سے ہے نام سکندر روشن روشنی دیکھتا گر دل کی صفائی کرتا

خاک، آئینہ، سکندر، روشن، صفائی سب باہم مناسبت رکھتے ہیں۔

غالب کا کلام اس صنعت سے معمور ہے اور خوبی یہ ہے کہ باستثنائے معدودے چند کہیں بھی ابتذال نہیں اس صنعت کو محض رعایات لفظی کے اعتبار سے برتا جائے تو کلام نہایت پست ہو جاتا ہے۔ قدیم اساتذہ ایران کا دیوان پڑھیئے جگہ جگہ اس کی مثالیں ملیں گی لیکن غالب نے رعایات لفظی جیسی معمولی چیز کو چھوا تک نہیں اس لئے اس صنعت میں ہمیشہ خوبی کا پہلو غالب رہا۔

گویم[1] سخنے گرچہ شنیدن نہ شناسد — صبحیست شبم را کہ دیدن نہ شناسد
بے پردہ شو از ناز و مبندیش کہ مارا — چون آئینہ چشمیست کہ دیدن نہ شناسد
پیوستہ رواں از مژۂ خوں جگر ستم — رنگیست رخم را کہ پریدن نہ شناسد
شوقم می گلگوں بسبومی زند اشک — پیمانہ ز ساقی طلبیدن نہ شناسد

دیکھئے شمع و آفتاب کی مناسبت کو اپنے خاص رنگ میں کس انداز سے باندھا ہے

آفتابیم بہم دشمن و ہمدرد اے شمع — ما ہلاک سر شاییم و تو داغ دم صبح

صنعت حسن التعلیل یہ وہ صنعت ہے جس میں کسی چیز کی علت ایسی فرض کر لی جاتی ہے جو دراصل اس کی علت نہیں۔ اس صنعت سے کلام میں نزاکت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی بدولت شاعر اپنی روح اور تخیل کو اپنے سے غیر شئے میں منتقل کر سکتا ہے۔ اس کے استعمال کرنے کے لئے تشبیہ اور استعارات میں کامل مہارت ہونی چاہیئے ورنہ کلام میں تک بندی کے سوائے کچھ نہ ہوگا خصوصاً اس لئے کہ علت اور معلول میں مناسبت پیدا کرنی اوس وقت ممکن ہے جبکہ شاعر یا تو مناسب اور موزوں تشبیہ اور استعارہ سے کام لے یا اپنی طرف سے کوئی بات ایسی بیان کرے جو باوجود خلاف واقعہ ہونے کے چسپاں اور مطابق حال ہو سکے۔

---

[1] ۔ ان اشعار میں جو اب اور آئندہ بطور مثال کے پیش کئے جاتے ہیں ہم نے کسی خاص انتخاب سے کام نہیں لیا ہے۔ کیوں کہ عمدہ اشعار کی کثرت سے انتخاب ایک حد تک مشکل تھا۔

حسن التعلیل کی عمدہ مثال غالب کے حسب ذیل اشعار ہیں۔

چون بہ سنجد کہ نہ آنست۔ یکاہد از شرم۔ ماہ یکچند بہ بالد کہ جبیں تو شود۔

مطلب یہ ہے کہ چاند اس ارادہ سے کہ معشوق کی جبینِ منور کا مقابلہ کرسکے ہلال سے بدر کی شکل اختیار کرتا رہا لیکن بدر کامل بننے کے بعد معلوم ہوا کہ ابھی وہ خوبی و لطافت میں اس سے بہت پیچھے ہے لہذا اپنی ناکامی پر شرمندہ ہوکر پھر گھٹنے کی طرف مایل ہوا۔

چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی حقیقت یہ نہیں لیکن صنعتِ حسن التعلیل کی خوبی نے اوس کو اصلیت جامہ پہنا دیا ہے۔

شوخیٔ چشم حبیب فتنۂ ایام شد قسمتِ بختِ رقیب گردشِ صد جام شد

ظاہر ہے کہ فتنۂ ایام کی علّتِ غائی کوئی اور ہے لیکن شاعر کے نزدیک سوائے معشوق کی شوخیٔ کے کوئی اور نہیں۔ اسی طرح گردشِ صد جام کو گردش میں تاخیر اور کمی کی وجہ سے "بختِ رقیب" سے تعبیر کیا ہے۔

صنعتِ ایہام

ایہام کے لغوی معنی وہم میں ڈالنا ہیں۔

صنعتِ ایہام یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں یا وہ دو معنوں میں استعمال کیا جاسکے، ایک قریب، دوسرے بعید۔ لیکن متکلم بعید معنی مراد لے۔ یہ صنعت عام نہیں لیکن اہم ہے۔

متقدمین کے ہاں اسکی مثالیں کثرت سے پائی جاتیں ہیں بعد میں حافظ اور غالب نے بھی اس کو برتا ہے اور اچھی طرح برتا ہے۔

(ایہام مجرد) ۱۔ دریں روش بچہ امید دل توان بستن میانۂ کن و او شوق حایل افتاد است

" ۲۔ دل بُرد و حق آنست کہ دلبر نتواں گفت بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت

۱؎ یہ ساری غزل اسی صنعت میں ہے۔

(ایہام التناسب) ۳۔ برنج از پئے راحت نگاہ داشتہ اند — زحکمت است کہ پائے شکستہ دربند است

(" ") ۴۔ چہ نو نسیم بتو نامہ کز ابنوہی غم — نیست ممکن کہ روانی زعبارت نزود

(ایہام مرشحہ) ۵۔ کلید بستگی تست غم۔ بہ جوش اید ل — تو گرچنیں نہ گزاری گرہ کشائے تو کیست

صنعت مذہب الکلامی کلام میں کوئی دعوی کیا جائے اور اس کو کسی دلیل سے ثابت کیا جائے۔ اس صنعت میں مرزا صائب اصفہانی مشہور ہے۔ اس کا استعمال عموماً اخلاقی مضامین کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن غالب نے اس کو اپنی شوخی طبع اور نزاکت کا مظہر بنایا اور جہاں اس کو اختیار کیا ہے ایک خاص جدت کے ساتھ کیا ہے۔ پہلے اس صنعت کی بے تکلفی ملاحظہ ہو ــــ

دل اسباب طرب گم کردہ در بند غم نان شد — زراعت گاہ دہقاں میشود چوں باغ ویران شد

اب اس میں سحر طرازیوں کی سیر کیجئے ــــ

فتیلۂ رگ جان سر بسر گداختہ شد — ز پیچ و تاب نفس ہائے آتشیں پیداست

نفس گداختن جلوہ در ہوائے قدش — زخوں فشانی این روئے نازنیں پیداست

عیار فطرت پیشینان زما خیزد — صفائے بادۂ از دردتہ نشیں پیداست

زہے شکوہ تو کاندر طراز صورت تو — زخود برآمدن صورت آفریں پیداست

صنعت ترصیع ایسا کلام جس کے پہلے فقرے میں جو الفاظ آئے ہیں وہ دوسرے فقرے کے الفاظ کے ساتھ علی الترتیب ہموزن ہوں اور آخر الفاظ ہم قافیہ بھی ہوں۔

اس صنعت کی تین قسمیں ہیں۔

۱ صنعت متوازی۔ ایسا کلام کہ الفاظ آخر فقرہ یا مصرع ہم قافیہ تو ہوں لیکن ترصیع کی طرح الفاظ علی الترتیب ہم وزن نہ ہوں۔

۲ صنعت تشطیر۔ ہر مصرعہ مسجع ہو لیکن پہلے مصرعہ کے تمام سجعات دوسرے مصرعہ کے سجعوں

سے مختلف ہوں۔

۳ صنعتِ تصریع۔ مصرعہ اول کا پہلا جزو (صدر) مصرع ثانی کے جزو آخر (ضرب) کے ساتھ حرفِ آخر میں موافقت رکھتا ہو۔

۴ صنعتِ سجع۔ پہلے فقرہ کا آخری کلمہ دوسرے کلمہ کا ہم قافیہ ہو۔

پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ فارسی شاعری میں صنعتِ ترصیع بکثرت رایج ہے۔ یہ خیال صرف قصیدہ کی حد تک صحیح ہے دوسرے اصناف سخن میں بجائے صنعت ترصیع کے اوس کی چار نام مذکورہ مستعمل ہوئی ہیں۔

غالب کا انداز بیان اور بندش شعری فطرتاً ان چاروں صنایع پر محتوی اور مشتمل ہے۔ چونکہ مثالیں پیش کرنی سمندر سے چند قطرہ نکالنا ہے ہم دو چار شعر بطور سند پیش کرتے ہیں۔

موجے از شرابستم لختے از کبابستم — شورِ من ہم از من پرس سوزِ من ہم از می پرس
اے کہ در دل آزاری پیش پا کم انگاری — در شمار غمخواری پیش کم از من پرس

مژۂ غنا فراغ را مژدہ برگ و سازدہ — سایہ بہ مہر و اگذار قطرہ بہ بحر بازدہ
طرۂ حیب ناز را چاک شانۂ التفات کش — عارض خویش راز اشک غازۂ امتیازدہ
یا بہ بساط دلبری عام مکن ادائے لطف — یا ز نگاہ خشمگیں مژدۂ امتیازدہ

صنعتِ ادماج لغوی معنی پیٹنا اصطلاح میں ایک مدعا سے دوسرا مدعا ضمناً پیدا ہونا یا ایک کلام سے دو معنی حاصل ہونا۔

ہندوستان میں ولی دکنی میر اور مومن کے سوائے عہد غالب تک بہت کم شاعروں نے اس صنعت کو برتا ہے وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں صاف گوئی اور سلیس و عام فہم شعر کہنا شاعری کا خاص انداز تھا، اور مذاق عام نیز تمدن و ادب سے متاثر ہو کر شعرا یہ سمجھتے تھے کہ ایسی صنعت سے تعقیدِ لفظی و معنوی پیدا ہو یکا

اندیشہ ہے۔ حالانکہ تعقید سے ادماج کو کوئی تعلق نہیں۔

میر نے سب سے پہلے کامیابی کے ساتھ اس صنعت کی بنیاد ڈالی لیکن اس نے شعر میں دلّی کی بامحاورہ اُردو اور روزمرّہ کو زیادہ ملحوظ رکھا غالب نے اپنی جدّت طرازی اور شوخی طبع سے ایکطرف تو آسان شعر کہنے سے انحراف کیا ــــ

سخن سادہ دلم را نہ فریبد غالبؔ نکتۂ چند زپیچیدہ بیانے بمن آر

دوسری طرف اپنے پیرایہ بیان میں عام طرز کے خلاف فارسیت کا رنگ پیدا کیا جو اپنی ایک مخصوص اور امتیازی شان رکھتا ہے۔

ادماج کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ "ایک کلام سے دو معنی حاصل ہونا" اس جملہ کے مفہوم کو اوّلیٰ لغوی معنی تک محدود نہ کرنا چاہیئے۔ درحقیقت ادماج سے مراد ایسی صنعت ہے جس سے مفہوم میں تعمیم اور تخصیص نہیں بلکہ وسعت اور تنوع پیدا ہوتا ہے۔ غالبؔ کے کلام کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ اوس کے معنی اوس کے الفاظ سے زاید اور پیش پیش رہتے ہیں۔ اسمیں کچھ تو اوس کے انداز بیان اور کچھ اس کے پرواز تخیل کو دخل ہے اوس کی مثالیں دیوان میں کثرت سے ملیں گی۔ ہم یہاں ایک مرصّع غزل کے چند منتخب اشعار پر اکتفا کرتے ہیں۔

اے موج گل، نوید تماشائے کیستی؟ انگارۂ مثال سراپائے کیستی؟
بیہودہ نیست سعیٔ صبا، در دیار ما اے بوئے گل، پیام تمنائے کیستی؟
خون گشتم از تو، باغ و بہار کہ بودۂ کشتی مرا بہ غمزہ، مسیحائے کیستی؟
یادش بخیر، تا چہ قدر سبز بودۂ اے طرف جوئے بار، چمن جائے کیستی؟
نشنیدہ لذت تو فرومیرود بدل اے حرف، محو لعل شکر خائے کیستی؟
با ہیچ کافراں ہمہ سختی نمیرود اے شب برگ من، کہ تو فردائے کیستی؟

۱۰ مارچ کے قریب قریب دو تین چیزیں آجاتی ہیں جنکا واضح کرنا ضروری ہے۔

(۱) **مشکل گوئی** ۔ شعر ایسا کہنا کہ ایک نظر میں اس کے معنی سمجھ میں نہ آئیں ۔ اردو شاعری میں اسکے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند ہوتی رہی چنانچہ اب بھی بعض پرانے شاعر جدید شاعری کو "چیستاں" اور "مطلب شاعر در بطن شاعر" سے تعبیر کرتے ہیں ۔ غالب نے کبھی اس آواز کی پروا نہ کی اور اپنے کلام میں مشکل گوئی کو اس خوبی سے نبھایا کہ اس کے بعد اس کا انداز کلام آئندہ نسل کے لئے نمونہ بلکہ شاعری کا نصب العین بن گیا ۔ غور کرنا چاہیئے کہ عام مذاق اور ایک زبردست رسمی اصول کے خلاف مشکل گوئی کو کیوں فروغ ہوا اور غالب کیوں اس کا سب سے بڑا موجد اور مورث اعلیٰ ہے ؟ بات بھی نہیں حقیقت یہ ہے کہ مشکل شعر کہنے کے لئے اول تو تخیل کی بلندی اور ندرت چاہیئے دوسرے اس اور انداز بیان میں چستی اور قدرت ۔ اکثر اہل نظر اور خود غالب کا یہی خیال ہے کہ تخیل اور بیان کی ندرت پر ایک دوسرے کی نوعیت اور رفعت کا انحصار ہے ۔ لیکن متقدمین کے ہاں بے پامال مضامین کے استعمال یا معمولی مفاہیم یا مطالب کو برتنے کے کوئی اور چیز رائج نہیں تھی دوسرے زبان اور پیرایۂ بیان کی شرائط مثل سادگی یا محاورہ پن ایسی تھیں جسکی بدولت شعر میں ندرت اور امتیازی شان پیدا ہونا ناممکن تھا لہذا مشکل گوئی کا رائج اور مقبول ہونا بھی اس زمانے کے لحاظ سے قبل از وقت تھا ۔

فارسی شاعری میں مشکل گوئی نئی چیز نہیں ہے ۔ اساتذہ کا کلام اس سے معمور ہے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ غالب ایک طرف فارسی شاعری کا نہایت دلدادہ تھا دوسری طرف اس کو فارسی زبان سے طبعی مناسبت تھی اس لحاظ سے کچھ تو اس کی تقلیدی طرز نے اور کچھ اس کی طبعی جدت اور شوخی نے مشکل گوئی کو اردو اور فارسی کے لئے ایک دلفریب شئے بنا دیا جسمیں عیوب کم اور خوبیاں زیادہ ہیں ۔

۲ **کلام کا پہلودار ہونا** ۔ یہ مولوی حالی کے الفاظ ہیں اس سے مراد شعر کے دو مصرعوں میں علانیہ ربط نظر نہ آئے بلکہ غور کرنے کے بعد ۔ یہ بھی مشکل گوئی کی ایک شاخ ہے ۔ اگر تخیل نازک یا

پیرایۂ بیان چست اور مکمل ہو تو سرتا پا خوبی ہے ورنہ مجسم عیب۔ قسم اول کی مثال فارسی میں خاقانی۔ قاآنی۔ عرفی۔ نظیری۔ ظہوری۔ اور اردو میں۔ میر۔ مومن اور غالب کے کلام میں ملیگی قسم دوم میں قدیم شعرار فارسی اور اردو شعرار لکھنؤ خصوصاً ناسخ اور آتش کے دواوین میں۔

۳ تعقید لفظی اور معنوی۔ سجاد مرزا بیگ دہلوی لکھتے ہیں "کلام کی دلالت معانی پر صحیح اور واضح نہو بلکہ تامل اور غور کے بعد مطلب ظاہر ہو سکے۔ اس کی دو قسمیں ہیں تعقید لفظی اور تعقید معنوی . . . . تعقید لفظی ہو یا معنوی اوسکے یہ معنی نہیں کہ کلام کے الفاظ اپنے معنی پر دلالت نہ کریں ایسا کلام تو مہمل ہوگا' بلکہ یہ معنی ہیں کہ الفاظ پر دلالت تو کرتے ہیں مگر یہ دلالت صحیح اور واضح نہیں ہوتی' یہ بھی ضرور نہیں۔ کہ تعقید ہر جگہ حسن کلام کو کھودے بلکہ انشا پرداز کا زور قلم کبھی کلام میں لطافت اور زور بھی پیدا کر دیتا ہے" اس رائے سے متفق ہیں۔

غالب کے فارسی کلام میں تعقید لفظی بہت شاذ ہے الّا اس مقام کے جہاں اس نے اساتذۂ ایران کی تقلید کی ہے تعجب ہوتا ہے کہ غالب کی نفسیات شخص پرست نہ تھی' اس کا خیال بلند' حوصلہ اس قدر چست تھا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی عظمتیں اوس کی نظر میں ہیچ تھیں' دنیائے شاعری میں تو وہ اپنے آپ کو اعظم الشعرار سمجھتا تھا' باوجود اس کے وہ بڑی حد تک ایران کے سامنے سر نیاز جھکاتا ہے اصل شاید یہ ہے کہ زبان کی حد تک اہل زبان کی ممنونیت نے اس کو معنی اور انداز بیان میں بھی ایران کا نیاز مند کر دیا ہو۔ تعقید معنوی' غالب میں موجود ہے لیکن سوائے چند مقامات کے کہیں بھی عیب کی صورت میں نہیں' بلکہ فصاحت' بلاغت' حسن اور خوبی کی شکل میں ہے۔ اگر تعقید کے معنی مشکل گوئی کے لئے جائیں تو چونکہ یہ فارسی شاعری کا مخصوص انداز ہے' فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو غالب کا کلام اس سے مبرّا نظر آئے گا۔ اور اگر اردو شاعری کے رسمی اصول کے مطابق تعقید کو سراپا عیب جان کر اوس کو غیر موزوں قرار دیا جائے تو باوجود اس کے کہ فارسی ادب اور تمدن کے اصولی خصائص نظر انداز ہوتے ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کے ہاں صاف اور سادہ اشعار کم' پیچیدہ اور مشکل اشعار بہت زیادہ ہیں۔

یہ صنعت اداج کی گویا مختلف صورتیں ہیں۔ ناظرین دیوان پڑھ کر اس کی مثالیں معلوم کر سکتے ہیں

صنعتِ ایجاز

کلام میں الفاظ اصل مراد سے کم ہوں۔ اس صنعت کا استعمال جتنا خوب ہے اُتنا ہی خطرناک ہے۔ الفاظ کی کمی سے مطلب پورا نہ ہو تو وہ اخلال ہے، اور اگر مطلب سے الفاظ زیادہ ہوں تو اطناب اور شاعری کی حد تک دونوں عیوب سقیم ہیں۔ غالب نے اس صنعت کو ہر جگہ خوبی سے استعمال کیا ہے اور اس کو کبھی اخلال اور اطناب کی حدود سے متصادم نہ ہونے دیا۔ دیوان کی پہلی غزل جو حمد میں لکھی گئی ہے اس صنعت کی بہترین مثال ہے۔

اے بخلا و ملائخوے تو ہنگامہ زا — یا ہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا
شاہدِ حسن تر اور روشِ دلبری — طرہ پُر خم صفات، موے میان ما سوا
آب نہ بخشی بزور خونِ سکندر بہ — جان نہ پذیری بہ ہیچ نقدِ خضر نا روا
بزم ترا شمع و گل، خستگیٔ بو تراب — سازِ ترا زیر و بم، واقعۂ کربلا

تشبیہ اور استعارہ

ان کی تعریف کرنی اور نیز یہ بیان کرنا کہ ان کی بدولت شاعری میں کسقدر لطافت پیدا ہو جاتی ہے تحصیل حاصل ہے۔

تشبیہ کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں (۱) حسّی۔ (۲) غیر حسّی۔ تشبیہ حسّی وہ ہے جس میں ارکان تشبیہ (مشبہ اور مشبہ بہ) ظاہری حواسِ خمسہ کے ذریعہ معلوم ہو سکیں۔ اس کا نقیض غیر حسّی ہے مغربی شاعری میں جسکی روح رواں نیچرل شاعری ہے، زیادہ تر تشبیہاتِ حسّی سے کام لیا جاتا ہے۔ آج کل جبکہ قوم کی ذہنیت، اصلیت، اور حقیقت کی متلاشی ہے غیر حسّی امور کی کوئی قدر نہیں کی جاتی۔ لیکن چونکہ شاعر کی دنیا عامۃ الناس سے جدا ہوتی ہے وہ غیر حسّی اشیاء سے صداقت کا نہیں تو وجدان اور کیف پیدا کرنے کا کام لیتا ہے جسمیں ان کی افادیت کا پہلو مضمر ہے۔

تشبیہ دنیائے تخیل کا رکن رکین اور نہایت اہم عنصر ہے۔ بعض اوقات صرف یہی کلام شاعر کیلئے سرمایۂ حیات بن جاتی ہے۔ غالب نے حسّی اور عقلی دونوں قسم کی تشبیہات استعمال کیں اور ان کو نہ صرف

صنعت ظاہری کا آلۂ کار بلکہ معنی اور صداقت پیدا کرنے کا لطیف ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے اس کی تشابیہ اوس کے لٹریچر کے ساتھ پیوست ہوگئی ہیں۔ اس کے ساتھ اس نے تشابیہ قریب، مردود، و مبتذل سے دور رہنے کا التزام کیا جس سے اس کے اعلیٰ مذاق شاعری کا بھی پتہ چلتا ہے ــــ

تشبیہ میں خاکے کے لئے تین چیزیں معیار کمال سمجھی جاتی ہیں۔ (۱) تشبیہ کی ندرت اور لطافت (۲) ارکانِ تشبیہ کی کامل مناسبت (۳) اُس کا صحیح اور مناسب استعمال۔ غالب اس محک امتحان خصوصاً آخری نمبر پہ کامیابی کے ساتھ اترتا ہے۔

ندرت تشبیہ اور لطافت تشبیہ میں ندرت پیدا کرنے کا تعلق، اور لطافت کا انحصار اس کی نوعیت پر ہے۔ ندرت تشبیہ وجہ شبہ سے دریافت کی جاسکتی ہے۔ وجہ شبہ تین قسم کی ہیں (۱) حقیقی (۲) اضافی (۳) اعتباری۔ شیر میں شجاعت، حقیقی، دلیل کو آفتاب سے بوجہ ازالۂ حجاب جو دونوں میں مشترک ہے تشبیہ دینا اضافی، اور شیشہ کا، ہچکی لینا، اعتباری ہے اہل ذوق کے نزدیک حقیقی اول، اضافی دوم، اور اعتباری سوم درجہ کی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مدارج ان کی نوعیت کے اعتبار سے ہیں، لیکن شاعر اپنے تخیل اور الفاظ کے سحر سے ان کے مدارج میں اختلاف پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ غالب کے ہاں اس قسم کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ ہم چند شعر سنداً پیش کرتے ہیں

تشبیہ حقیقی ــــ

واہ! چوں عکس پل بسیل، بذوق بلا برقص — جارا نگاہدار و ہم از خود جدا، برقص
در عشق انبساطِ بیاباں نمی رسد — چوں گرد باد خاک شود، در ہوا برقص

تشبیہ اضافی ــــ

ز نیساں کہ سر بسر گل و ریحاں و سنبلست — طرف چمن، نمونۂ طرف کلاہ کیست؟
مو بر تنا بدایں ہمہ پیچ و خم و شکن — زلفِ تو، روزنامۂ بخت سیاہ کیست؟

تشبیہ اضماری ــــ

جہاں دو دلیست از سودا کہ میگرداندش غالب — تو گوئی گنبد گردوں سر شوریدہ را ماند
چہ غم زافتادگیہا چوں روان پالاست اندوہت — تن از مستی بکویت جان آرامیدہ را ماند

ان اشعار سے باقی دو امور یعنی ارکانِ تشبیہ کی مناسبت اور خوبی استعمال بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

استعارہ ــ یہ بھی ایک قسم کی تشبیہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں حرفِ تشبیہ نہیں رہتا' باعتبار بلاغت و معنی استعارہ کا پایہ تشبیہ سے بلند ہے اور باعتبار اصلیت و تاثیر تشبیہ کا استعارہ کے بھی متعدد اقسام ہیں مگر چونکہ ہم کو صرف اس کی نوعیت اور خصائص عام سے بحث ہے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

ندرت و لطافت استعارہ ــ

رفت آنکہ کسب بوئے تو از باد کردمے — گل دیدمی و روئے ترا یاد کردمے
رفت آنکہ جانب رخ و قدت گرفتمے — در جلوہ بحث با گل و شمشاد کردمے
ریزم از وصف رخت گل را شرر در پیرہن — آتشِ رشکم بجانِ نو بہار افتادہ ام
کشتی بے ناخدایم سرگذشتِ من مپرس — از شکست خویش بر دریا کنار افتادہ ام

مبالغہ یہ صنعت مستغنی عن التعریف ہے۔ تاریخ ادب جاننے والوں پر روشن ہے کہ اس کی وجہ سے شاعری میں کتنی مہملات اور بدعتوں کا طوفان برپا ہو گیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی اور اردو شعرا میں سوائے ایک دو کے کسی نے مبالغہ کو ایجادِ حسن و لطافت کے لئے استعمال نہیں کیا۔ اس کی بجائے تبلیغ' اغراق' غلو کی حدود سے آگے نکل کر ابتذال کی بدترین مثالیں پیش کی ہیں۔

اصولی نقطۂ نظر سے علم بیان' بدیع' اور معانی کے لئے مبالغہ ایک ناگزیر شئے ہے لیکن حسن اور سلیقۂ استعمال شرط ــــ غالب کے ہاں مبالغہ موجود ہے اور با ... ہر جگہ شاعرانہ ندرت کو کام میں لایا گیا ہے۔

بے نوائی ہیں کہ گر در کلبہ ام باشد چراغ بخت را نازم کہ با من دولتِ بیدار ہست
لبم از نام تو آں مایہ پرستے کہ اگر بوسہ بر غنچہ زنم غنچہ نگینِ تو شود
صد قیامت بگذارند و بہم آمیزند تا خمیرِ دل ہنگامہ گزینِ تو شود

ابتذال غالب کا کلام ان عیوب سے جو شعر کو پست کر دیتے ہیں قطعاً مبرّا ہے۔ یہ احتمال تھا کہ تخیل اور معنی آفرینی کا ولدادہ شاعر بعض باتیں ایسی کہہ جائے جو صریحاً خلاف عقل و قیاس ہوں یا یا اس قدر سوقیانہ ہوں کہ اہل نظر اس سے منہ پھیر لیں، دوسرے معنوں میں وہ ابتذال میں یا اس کے قریب پہنچ جائے لیکن غالب نے خصوصیت کے ساتھ اس سہو خفیف سے بچنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔

یہی حال معمولی رعایات لفظی اور پست و سطحی مضامین کا ہے۔

غالب نے اس قسم کی سد سکندری کو توڑ کر اپنے کلام کو اعلیٰ درجہ کی صنائع سے مالا مال کیا اور دنیا کے سامنے ایک اصلاحی اسکیم پیش کی جو علم ادب خصوصاً شاعری کے لئے بیحد مفید ہے۔

بندش اور پیرایۂ بیان

غالب کی وہ ممتاز خصوصیت جس سے اس کا کلام ہزاروں میں پہچانا جا سکتا ہے انہی دو امور میں پوشیدہ ہے۔

شاعری کے دو اہم ارکان ہیں۔ ایک بیان دوسرا معنی۔ نقادان سخن کے مابین اختلاف ہے کہ ان دو میں سے کسی کی اہمیت زیادہ ہے۔ اصولی نظر سے دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حقیقتاً دونوں کا درجہ بہ حیثیت لازم و ملزوم ہونے کے مساوی ہے۔ لیکن الفاظ چونکہ معنی کا لباس اور آئینہ ہیں اس سے زیادہ اہم ہیں، الفاظ کی بدولت نہ صرف معنی کا اظہار ہوتا بلکہ اس کی خوبیوں اور تاثیرات میں تنوع اور گوناگونی پیدا ہوتی ہے۔ ابن خلدون کی طرح ہماری بھی یہ رائے ہے کہ ایک آرٹسٹ کو معنی سے زیادہ الفاظ اور اسلوب بیان کی نگہداشت کرنی چاہئے۔

زمانۂ موجودہ میں بعض شعرا جدت معنی کے مقابلہ میں زبان اور پیرایۂ بیان کو قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ دراصل معنی میں انحلا پیدا کرنا نہیں اس کا خون کرنا ہے۔

غالب ہندوستان کا سب سے پہلا شاعر ہے جس نے صحتِ زبان کے علاوہ بندشِ شعری اور اسلوبِ بیان میں اپنے لئے ایک روشن اور مخصوص راستہ بنایا جو آجکل شعرا کی جولانگاہِ فکر بنا ہوا ہے۔ اس اسلوب بیان کا تجزیہ کرنا اور یہ بتانا کہ اس کی انفرادی خصوصیات اور نوعیتیں کیا ہیں مشکل ہے۔ اس کی صحیح واقفیت اس شخص کو ہو سکتی ہے جو بطور خود کلام کا مطالعہ کرے۔ تاہم اس کے متعلق ہم دو تین نمایاں خصوصیتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱) غالب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی بات کو سیدھے سادے طریقے سے بیان نہیں کرتا بلکہ اس کو ــــ

(ا) کسی نہ کسی صنعت لفظی و معنوی سے مزین کرتا ہے۔

(ب) شعر کو پہلو دار رکھتا ہے۔

(ج) کلام میں انوکھا پن پیدا کرتا ہے۔

(۲) اس کے ہر شعر میں چستی پائی جاتی ہے۔ تخیل اور اس کے طریقۂ اظہار میں بلندی اور ندرت ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی پابندی کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ غالب کی شاعری میں بیساختہ اشعار اور آمد کی کمی ہے۔ اس کے برخلاف صنعت گری اور آورد کی کثرت۔ لیکن حقیقت حال یہ نہیں۔ بندش اور اسلوب بیان کی چستی اور یکسانیت غالب کی فطری ودیعتیں ہیں اور اس کے لئے مختص۔ اسی طرح تخیل میں آمد کا پہلو غالب ہے مگر چونکہ شعر میں چستیٔ بندش اور تخیل دونوں کا ایک موزوں اختلاط موجود ہے دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شعر کہتے وقت غالب نے نہایت جگر کاوی سے کام لیا ہے ــــ

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل غالب اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیر من بری

مگر یہ جگر کاوی زیادہ تر معنی آفرینی کے لئے تھی۔ اس کی انشا پردازی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زبان اور بیان کا حاکم تھا۔ جسکے لئے اس کو کسی خاص محنت اور کاوش کی ضرورت نہیں تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ معنی آفرینی کے لئے جگر کاوی کی کیا ضرورت ہے؟ پروفیسر عبد اللطیف صاحب نے اسی سوال کے مدنظر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غالب کی شاعری زیادہ تر دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس خیال میں جو نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ جب آمد اور وہ الہامی کیفیت جسکو انگریزی میں انسپریشن (Inspiration) کہتے ہیں۔ شاعری کا جزو لاینفک ہے تو پھر طبیعت اور دماغ پر زور ڈالکر شعر کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ گویا الہام اور آمد یو تو تخیل کے دباؤ اور دماغی کاوش کی ضرورت نہیں رہتی۔

ہم اسکو تسلیم کرتے ہیں لیکن کہنا یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی شاعری میں جو اصولی فرق ہے وہ یہ ہے کہ اول الذکر میں الہام تخیل کے تابع رہتا ہے اور آخر الذکر میں تخیل الہام کے یا اشائے خارجی مثل مناظر قدرت وغیرہ کے تابع۔ لہذا مشرقی شاعر کے لئے ضروری ہے کہ تخیلی مظاہرات کو اصلیت کا جامہ پہنانے کے لئے وہ لفاظی اور جدت سے کام لے۔

غالب کی شاعری کو محض تخیلی اور غیر احساسی فرض کر لینا متذکرۂ بالا خصوصیت کو نظر انداز کرنا ہے

سلاست و روانی کلام

بہ حیثیت مجموعی یہ خصوصیت بھی جیتی بیان کے مشابہ ہے۔ غالب کو اس میں کمال دکھانے کے لئے فارسی زبان کی لسانی (Philological) خوبیوں مثل کثرت اضافات، وسعت شیرینی اور دلآویزی نے بہ نسبت اردو کے بہت امداد دی۔ مثالیں ——

سلاست۔ چہ عیش از وعدہ چوں باور زعنوانم نمی آید — بنوعے گفت می آیم کہ می دانم نمی آید

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

حق کہ حسنت وسیع ست، فلانی بشنو — شنو گر تو خداوند جہانی بشنو

روانی۔ در خود گم ست جلوۂ برق عتاب تو — این تیرگی بہ طالع شب گیاہ کیست؟

نیرنگ عشق، شوکت رعنائی تو برد — در طالع تو گردش چشم سیاہ کیست؟

با این ہمہ شکست، درستی ادائے اوست — رنگ رخت، نمونۂ طرف کلاہ کیست؟

قادرالکلامی

یہ وہ صفت ہے جسکی بدولت کلام میں بختگی کا اظہار ہوتا نیز معانی کے دریا بہ جاتے ہیں۔ عام خیال ہے کہ اس کا پیدا ہونا مشق اور تجربہ پر منحصر ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن راقم کے نزدیک اس کو فطرت اور طبعی مناسبت سے بھی گہرا تعلق ہے۔ بعض اشخاص کا پیرایہ بیان ابتدا ہی سے ایسا ہوتا ہے کہ وہ جس جامعیت اور خوش اسلوبی کے ساتھ بڑے سے بڑا مضمون ادا کر جاتے ہیں وہ کسی دوسرے سے نہیں ہو سکتا اور جب اس میں مشق بہم پہنچتی ہے تو پھر ان کی زبان اور قلم طلسمات اور سحر کا کام کرتی ہے۔

غالب بہ حیثیت آرٹسٹ کے اس صفت میں ید طولے رکھتا ہے ــــ

ایکہ گفتی غم درون سینہ جانفرساست، ہست — خامشیم اما اگر دانی کہ حق با ماست، ہست
دیدہ تا دل خون شدن کز غم روایت می کنی — گر بگویم کاین نخستین موج آن دریاست، ہست
باری از خود گو کہ چونی ورزمن پرسی بہ پرس — بخت نا سازست آری یار بے پرواست ہست
ہم وفا ہم خواہش ما ہیچ پرسش عیب نیست — آنکہ میگفتی کہ خواہش درد فاہیجاست، ہست
دیدی آخر کانتقام خستگان چون می کشند — آنکہ می گفتیم ما۔ کامروز را فرداست، ہست

صفت قادرالکلامی صرف یہ نہیں ہے کہ مضمون کو کسی طرح شعر میں کھپا دیا جائے اس میں طریقۂ اظہار یوقیت اور تاثیر کو بھی دخل ہے ــــ

دولت بہ غلط بنود، از سعی پشیمان شو — کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو

جنون خرامے کا اظہار کس پیرایہ میں کیا ہے ــــ

از ہر زہ روان گشتن قلزم نہ توان گشتن — جوئے بہ خیاباں رو سیلے بہ بیابان شو

نصیحت دیکھئے ــــ

ہم خانہ بساماں بہ، ہم جلوہ فراوان بہ — در کعبہ اقامت کن، در بتکدہ مہمان شو

خوبئ عرض حال ــــ

ہر کجا غالب تخلص در غزل بینی مرا — می تراش او را و مغلوبے بجائش می نویس

زبان اور محاورات ترکیبی

سب جانتے ہیں کہ اہل زبان اور غیر شخص میں فرق بے نہایت ہے، مگر سوال یہ ہے کہ آیا شاعری کے لئے اہل زبان ہی ہونا ضروری ہے؟ اصولی جواب تو نفی میں ہونا چاہیئے زبان دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک بول چال کی دوسرے علمی۔ اہل زبان تقریر یا تحریر میں جو زبان استعمال کرتے ہیں اوس میں روزمرہ اور محاورہ وغیرہ کا اشتراک زیادہ رہتا ہے۔ ایک غیر شخص جو اس زبان کو اپنی تحریر کا آلۂ کار بناتا ہے، گو اُس میں محاورہ اور روزمرہ کی کمی ہو وہ بحیثیتِ مجموعی صاف اور شستہ ہوتی ہے۔ نیز زبان کی گرامر سے متجاوز نہیں ہوتی اس لحاظ سے وہ مستند نہیں مگر صحیح ضرور ہے۔

فن شاعری کی حد تک صحیح اور شستہ زبان کا استعمال کافی ہے۔ گو محاورے اور روزمرہ کے بے تکلف استعمال سے اوس کے محاسن میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے فقدان سے شاعری میں عیب بھی پیدا ہو جائے۔ موخر الذکر عقیدہ کی ابتک شرق میں کافی اہمیت ہے۔

انگریزی زبان میں زبان اور اہل زبان کا جھگڑا موجود ہے لیکن وہ اس قدر عالمگیر اور موثر نہیں جس سے شاعری کے جملہ محاسن پر پردہ پڑتا ہو۔ ضرورت ہے اس بات کی کہ شرق میں تا حدِ امکان اس جھگڑے کو فرو کر کے تصویر شاعری کے دوسرے اہم رخ کو خوشرنگ بنانے کی سعی کی جائے جس سے ایک طرف زبان کو وسعت ہو، دوسری طرف شاعر کو اپنے جذباتِ فطری کے اظہار میں بیجا مزاحمتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

غالب کی فارسی زبان ایک مخصوص ہیئت رکھتی ہے، وہ ایک طرف ہندوستانی شعرا کے جملہ فارسی کلام سے ممتاز ہے دوسری طرف وہ اہلِ ایران کی خاص زبان میں قطعاً ضم نہیں لیکن اس کی حدود کے ساتھ متصادم ہے۔

یہ تو مجرد زبان کی حد تک ہے، دوسری بات یہ ہے کہ غالب کی مخصوص طرز ادا اور اندازِ بیان جب شعر کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو اوس کا رنگ نیا اور انوکھا ہو جاتا ہے۔

محاورات ترکیبی

غالب کو محاورات ترکیبی استعمال کرنے میں کمال حاصل ہے، جسطرح اس نے اردو زبان میں نئی نئی ترکیبیں تراشیں اسی طرح فارسی میں کئی دلآویز محاورات

ایجاد کئے ـــــ مثلاً قلزم فشان مژہ، ذرہ ہائے آفتاب آشام، سطر شکستِ رنگ بسیما، فرہنگ نامہ ہائے تمنا، بے پردہ گئی محشر رسوائی، بند گہر آمائی، جہاں گران پائی، دل دیر مہربان، مہتاب کف دست نمائی، دل ہنگامہ گزین، روزنامۂ بخت سیاہ، کف الماس فشاں، دعوئے گاہ شوق، آرائش عنواں، وقف خم چوگاں وغیرہ ـــــ ان محاورات ترکیبی سے شاعری میں ایک طرف زبان اور آواز شعری میں موسیقیت، دل آویزی، دوسری طرف معنی میں بلاغت کا جوہر نمایاں ہوتا ہے۔ جہاں تک راقم نے مطالعہ کیا ہے ایسی خاص شاعرانہ تراکیب کی کثرت جو کلام غالب کی جان ہے اوسی کے ساتھ مختص پایا۔

محاورات اہل زبان اور روزمرہ فارسی زبان میں خالص ایرانیت محاورات اور روزمرہ کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے کسی ہندوستانی شاعر کا فارسی کلام دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یہ خالص ایرانی رنگ سے معرّا ہے لیکن کلام خسروؒ اور کلام غالب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ جبتک عمیق نظر سے نہ دیکھا جائے اہل زبان میں اور ان میں تمیز کرنی مشکل ہے۔ باوجود اس کے ان کو خالص ایرانی نہیں کہا جاتا اور نہ اہل ایران اسکو تسلیم کرتے ہیں ـــ غالب کی حد تک اس کی تین وجوہات معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) کلام غالب کی فارسیت پر اس کی ندرتِ تخیل، جدت بندش اور مخصوص اسلوب بیان کا روشن پردہ پڑا ہوا ہے۔

(۲) غالب کی زبان میں ایران کا روزمرہ مفقود ہے۔

(۳) فارسی محاورات ایسے استعمال ہوئے ہیں جو زبان کو اس کی ابتدائی اور وسطی منازل کی حد تک ایرانیت کے قریب پہونچاتے ہیں لیکن انتہائی منازل میں اسکو بالکل ایرانی فارسی میں شامل نہیں کر دیتے۔ دوسرے الفاظ میں غالب کی زبان گویا بہترین ہندی فارسی ہے۔

(۴) غزلوں میں تاریخ ایران اور تلمیح صنائی کا فقدان ہے۔ اس وجہ سے صنائی رنگ کی جھلک نمایاں نہیں معلوم ہوتی (مجبوری ہے کہ غالب کو تاریخ اور افسانوں کے ذریعہ سے ہندی بنا مرالغہ اپنے کلام میں زور پیدا کرنا خوش نہ آتا تھا)۔

پیرایۂ کلام (۱) غالب کی فارسی غزلوں میں صنائی کا پہلو نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ شاعر کی

اکثر اوقات ایسے ہونے چاہئیں جو الہامی ہوں اور جنکی وجہ سے کلام میں آمد اور بے ساختگی کا اظہار ہو۔ یہ کہنا کہ غیر زبان میں خامہ فرسائی کرنے سے یہ شکایت پیدا ہوتی ہے غالب کی حد تک درست نہیں اس لئے کہ فارسی زبان پر غالب کو خاصہ اقتدار حاصل تھا اور اس سے اسکو طبعی مناسبت بھی تھی۔

(۲) اسلوب بیان میں سہولت، اور تنوع نہیں ہے اس کے طرز ادا کی یکسانیت ایک ناگوار شئے بنکر کھٹکتی ہے اور پردۂ گوش پر ایک ہی نہج کی آواز پہونچنے سے دل میں برخاستگی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اگر روزمرہ اور سادگی بیان سے کام لیا جاتا تو اس شکایت کا پیدا ہونا قدرے دشوار تھا۔

(۳) مشکل گوئی کی وجہ سے رنگِ تغزل پھیکا پڑتا ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے فارسی لٹریچر نہایت وسیع ہے اور اس میں ہر ایک شعبہ کا ایک استاد پیدا ہوا ہے۔ غزل کی حد تک حافظ اور حسن سجزی نے جو مقبولیت حاصل کی وہ بہت کم شعرا کو نصیب ہوئی۔ دونوں کی خصوصیت سادگی اور صفائی بیان ہے۔ غالب نے مطالب اور معنی آفرینی پیرایۂ بیان کی حد تک ظہوری، نظیری، عرفی، وغیرہ کی تقلید کی، اور انہی کی ریس میں پیچیدہ بیانی کو اختیار کیا۔ لیکن یہ پالیسی غلط تھی۔ اول تو اسکو تقلید ہی نہیں کرنی چاہیئے تھی کیونکہ اس کی ایک اختراعی اور ایجادی شخصیت تھی اور ایسی شخصیت کیلئے تقلید خود اس کے اور ادب کے لئے نقصان عظیم ہے۔ بالفرض یہ سمجھکر تقلید کی کہ غیر زبان میں اساتذہ کی پیروی پُر امن اور مبنی بر مصلحت ہے تو اس کو غزل میں ان اساتذہ کا تتبع کرنا چاہیئے تھا جو اس مملکت کے بادشاہ تھے نظیری، ظہوری، عرفی وغیرہ غزل میں حافظ حسن، سعدی وغیرہ کے ہم پایہ نہیں ہیں۔

(۴) غالب کے خیالات، تھوڑی حد تک انداز بیان، فارسی زبان کے لئے نئے معلوم ہوتے ہیں۔ محض لٹریچر کی خاطر اگر اس کے کلام کی تنقید کی جائے تو یقیناً وہ ایک قابل قدر شئے ہوگی مگر آرٹ کی حد تک بعض امور میں غالب اساتذہ ایران کے پیچھے ہے۔

گو اس اعتراض کی نوعیت قدامت پسندی کے حامل ہے تاہم ایسی نہیں ہے کہ اس کو قطعاً نظر انداز کر دیا جائے۔ جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ۔ جن خیالات کو غالب نے ظاہر کیا اور اسکے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا وہ باہم لازم و ملزوم ہیں۔ انکو شاعر کی طبعی خاصیت کیساتھ گہرا تعلق ہے۔ یہ خیال ایک حد تک درست ہے لیکن محال سا معلوم ہوتا ہے کہ اہل زبان کو اس سے تشفی ہو جائے۔

(باقی آئندہ)

اوستا

از مقدمہ "اوستا گرامر"

پروفیسر ولیم جیاکسن کولمبیا یونیورسٹی
ملخص ترجمہ از محمد جلال الدین اشک مدیر

اوستا بہ حیثیت کتاب مقدس جب ہم اوستا یا زند اوستا کہتے ہیں تو اس سے ہماری مراد زرتشتی مذہب کی آسمانی کتاب سے ہوتی ہے۔ اوستا کو بالعموم زند اوستا بھی کہا جاتا ہے اگرچہ ایسا کہنا کسی قدر غلط اور نادرست ہے اوستا کوئی ایک مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ یہ پارسیوں کی (جنکو آتش پرست بھی کہتے ہیں) مقدس کتابوں کا مجموعہ ہے۔ آج کل پارسیوں کی قوم کوئی بہت بڑی قوم نہیں رہی ہے۔ اس کے زیادہ تر افراد ہندوستان میں پائے جاتے ہیں اور تھوڑے بہت ایران کے مختلف مقامات میں منتشر ہیں۔ آتش پرستوں اور اوران کی مقدس کتابوں کا جنم بھوم ایران قدیم ہے۔ اس مذہب کا بانی زرتشت نامی ایک شخص گزرا ہے جس نے کئی صدی پیشتر ایران میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی تھی اور جو مشرق کے نامور بانیان مذاہب میں شمار کیا جاتا ہے۔

اوستا جیسا کہ سطور بالا سے معلوم ہوا ہوگا ایک بہت ہی اہم کتاب یا کتابوں کا مجموعہ ہے۔ اسی کی بدولت ایرانِ قدیم کے بہت سارے معتقدات اور رسوم و رواج کا ہم کو پتہ چل سکتا ہے جسطرح کہ وید ہندوستان کے قدیم زمانے کے مذہب اور اس کی خصوصیت کا حال

بتاتی ہے بالکل اسی طرح اوستا بھی ایران کے قدیم مذہب کے متعلق ہمیں نہایت اہم تفصیلات سے باخبر کرتی ہے۔ اوستا کے قدیم ترین حصے قدامت کے لحاظ سے رگ وید کے ہمعصر ہیں۔ البتہ بعض جدید حصوں کے متعلق ایسا کہنا بالکل غلط ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ موخر الذکر حصے بہت بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ زرتشتی مذہب کسی زمانے میں دنیا کے عظیم الشان مذاہب میں شمار ہوتا تھا۔ آج کل بھی تاریخ عالم پر اس کے نہ مٹنے والے اثرات بخوبی نمایاں ہیں۔ سنین عیسوی کے آغاز سے ایک ہزار سال پیشتر اس مذہب کا بہت عروج تھا طاقتور ہخامنشی بادشاہ مثلاً سائرس، دارا اور زرکسیز اس کے پیرو بن گئے تھے لیکن سکندر اعظم کے حملے کے بعد سے اس میں زوال کے آثار پیدا ہونے لگے اس تاریخی حملے کے دوران میں اس مذہب کی کئی مقدس کتابیں ناپید ہوگئیں۔ سنہ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں اس میں پھر کچھ جان پڑنے لگی تھی کہ مسلمانوں کی فتوحات نے اسے بالکل تہس نہس کر دیا۔

مسلمانوں کے ایران پر کامیاب حملوں کے بعد زرتشتی مذہب کے اکثر پیرو ترک وطن پر مجبور ہوگئے اور وہ ایک بڑی تعداد میں ہندوستان بھاگ آئے۔ ان کے ایران کو چھوڑنے کے سلسلے میں جو بات علمی نقطۂ نظر سے خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ ان کے مذہب کی کئی مقدس کتابیں بھی ہندوستان پہنچ گئیں۔ آج کل اس مذہب کے شاید تقریباً اسی ہزار پیرو ہندوستان میں اور صرف دس ہزار ایران میں پائے جاتے ہیں۔

تحقیقات کرنے کے بعد پتہ چلا کہ لفظ اوستا، اوستاک سے ماخوذ ہے اور اوستاک ایک ایسا لفظ ہے جو ساسانی دور کی پہلوی زبان میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ابھی تک اس لفظ کے مادے اور معنی کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ پہلوی زبان کا لفظ "اوستاک" مانند سنسکرت لفظ "وید" کے "عقل" "علم" یا "علم بڑھانیوالی کتاب" کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہو۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اس لفظ سے مراد "اصل متن" "الہامی کتاب" یا "شرع" لی جاتی ہو۔

انکو ئی ٹل ڈیو پرّاں نے ہمیں زند اوستا کے نام سے روشناس کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اوستا کا یہ نام صحت پر مبنی نہیں ہے۔ زند کے معنی پہلوی زبان میں شرح یا تفسیر کے ہیں۔ اس لحاظ سے زند اوستا سے مراد "قانون مع شرح" ہوگی۔ ان وجوہات کی بنا پر اس کتاب کا نام صرف "اوستا" ہو سکتا ہے۔

اوستا کے پرانے حوالے اس کی تحقیقات وغیرہ

ایرانِ قدیم کے مذہب طور طریق اور رسوم و رواجات کے حالات جو اوستا کے ذریعے سے ابھی تک محفوظ ہیں ایک صدی پیشتر تک ہم بہت کم جانتے تھے ہماری معلومات کے ماخذ ناقابل اطمینان تھے یعنی یا تو ہمیں یونانی اور لاطینی قدیم کتابوں میں ان کے متعلق کچھ ضمنی اشارے مل جاتے تھے یا بعض مستشرقین کی کچھ تحریرات نظر سے گزر جاتی تھیں۔ اگر ہم نے زیادہ جد و جہد کی تو ایران کے رزمیہ ادب سے جو بہت بعد کی چیز ہے تھوڑا بہت مواد مل جاتا تھا ایسے ماخذ جو براہِ راست ہم کو ان سے واقف کریں ہماری دست رس سے باہر تھے۔ انجیل مقدس میں مذہب مغان (جسکی اوستا تلقین کرتی ہے) کے متعلق کہیں کہیں کچھ اشارے کئے گئے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے "مشرق کے عقلمند لوگ جو ہمارے نجات دہندہ پر ایمان لائے مغ تھے اس واقعے کے صدیوں پیشتر سائرس بھی جو زرتشتی مذہب کا پیرو تھا ہمارے آقا کا معتقد بن چکا تھا۔ اور اس کو ہمارے آقا نے اپنے پیروؤں میں شمار کیا تھا۔ اور جس نے یہودیوں کو بابل سے رہا کر کے بیت المقدس لوٹانے کا حکم دیا تھا۔

علاوہ ازیں دارا نے بھی جو اہورہ مزدہ کا پرستار تھا جروسلم میں گرجا گھر کے بنانے کو نگاہِ پسندیدگی سے دیکھا جس کی اجازت قبل از قبل سائرس نے دیدی تھی۔"

رومی اور یونانی اہل قلم نے اپنی قابلِ قدر کتابوں میں زرتشتی مذہب کی تعلیمات کا تھوڑا بہت حال لکھا ہے۔ ان میں سب سے پہلا شخص ہیرو ڈوٹس (۴۵۰ ق م) ہے جس نے اپنے وقایع ایران میں اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالی ہے (جلد اول ص ۱۳۱ تا ص ۱۴۱) اس کے علاوہ اور کتابوں میں جستہ جستہ اشارے پائے جاتے ہیں بالخصوص پلوٹارک کی دو کتابیں کچھ مواد فراہم کر دیتی ہیں۔ مسلمانوں کی فتوحاتِ ایران کے بعد عرب مورخین کی کتابوں میں بھی کچھ ضمنی حوالے پائے جاتے ہیں مثلاً مسعودی (۹۴۰ ب م) زرتشت

کی اوستا اور اس کی تفسیر زند اور اس کی شرح پازند کا ذکر کرتا ہے۔ البیرونی نے (۱۰۰۰ ب۔م) بھی متعدد مقامات پر اوستا کا ذکر کیا ہے۔ متاخرین میں شہرستانی (۱۱۵۰ ب۔م) اپنے زمانے کے مذہب مغان کا کچھ خاکہ کھینچتا ہے۔ ایک دلچسپ حوالہ بارہبلول (۱۱۵۰ ب۔م) کی سریانی عربی لغت میں ملتا ہے۔ اس میں وہ "اوستاک" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "یہ زرتشت کی کتاب ہے جو حسب ذیل سات زبانوں میں لکھی گئی تھی۔ سریانی ایرانی ارمی سجستانی مروزی یونانی اور عبرانی۔

ایک قدیم سریانی شرح کے قلمی نسخے میں جو عہد جدید (۸۵۲ ب۔م) پر اشو داؤ حدیثہ (قریب موصل) کے اسقف نے لکھی ہے اوستا یا ابہستا کے متعلق یہ لکھا گیا ہے۔ "ابہستا کو زرتشت نے بارہ مختلف زبانوں میں تحریر کیا ہے"۔ یہ موخر الذکر حوالہ جات اگرچہ بہت بعد کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اہمیت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ ان سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ہر زمانے میں اوستا کے متعلق یہی خیال رہا کہ اس میں زرتشت پیغمبر ایران کی تعلیمات پائی جاتی ہیں لیکن یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ اس قسم کے تمام حوالے اجنبیوں کے قلم سے لکھے گئے ہیں کوئی راست ایرانی ماخذ ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔

سترہویں صدی تک جیسا کہ ہم نے دیکھا ایران کی مقدس کتابوں کے متعلق کچھ زیادہ تحقیقات نہیں کی گئی۔ یونانی اور رومی ماخذوں سے اوستا کے متعلق تحقیقات کرنے کا سلسلہ ایک یوروپین بارتلمی برسٹان (۱۵۹۰ ب۔م) نے شروع کیا۔ اطالوی انگریز اور فرانسیسی سیاحوں نے جو مشرق کی سیاحت کرتے تھے۔ ایران کے مذہب اور رسوم و رواج کے متعلق کچھ مزید معلومات فراہم کیں۔ ان میں سب سے اہم آکسفورڈ یونیورسٹی کے نامور طالبعلم تھامس ہائڈ (۱۶۰۰ ب۔م) کی کتاب ہے۔ ہائڈ نے یہ کتاب لاطینی میں لکھی تھی۔ ہائڈ نے زیادہ تر بعد کے زمانے کے پارسی ماخذوں سے امداد لی تھی اصلی کتاب سے فائدہ اٹھانے سے وہ قاصر تھا اگرچہ اوستا کے یسنا کا ایک نسخہ شاید ۱۶۶۳ء ہی میں کنٹربری کے گرجا میں پہنچ چکا تھا۔ ہائڈ نے اپنے زمانے کے فاضلوں سے درخواست کی کہ کسی نہ کسی طرح پارسیوں کی مقدس کتابوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کی اس درخواست نے اکثر لوگوں میں اس موضوع سے گہری دلچسپی پیدا کر دی

۱۷۲۳ء میں "وندی داد ساد ہا" کا ایک نسخہ ایک انگریز جارج بوشیئر نے سورت کے پارسیوں سے حاصل کیا اور وہ آکسفورڈ کی باڈلین لائبریری میں داخل کر دیا گیا۔

تاہم اس وقت تک اوستا کے متن کا مطالعہ کرنا ناممکن تھا۔ ایک نوجوان فرانسیسی انکوئی ٹل ڈو پرآن نے اس کی طلسم کشائی کی پہلے پہل عزت حاصل کی۔ اس کی مساعی کی تاریخ مجدد دلچسپ اور سبق آموز ہے ۱۷۵۴ء میں اس نے اتفاقاً چند خاکے دیکھے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے مذکورہ بالا نسخے سے حاصل کئے گئے تھے اور جو نمونتہً پیرس بھیجے گئے تھے ان کو دیکھ کر اس کے دل میں اس امر کی زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ فوراً ایران یا ہندوستان کا سفر اختیار کر کے پارسیوں کی مقدس کتابوں کا ان کے مذہبی پیشواؤں سے براہ راست علم حاصل کرے۔ اگرچہ ذوق و شوق کی اس کے دل میں کمی نہیں تھی لیکن اسے اتنی مقدرت نہیں تھی کہ اپنی تجاویز پر عمل کر سکے۔ تاہم ناموافق حالات سے وہ مایوس نہیں ہوا اور فوراً سپاہیوں میں بھرتی ہو کر ہندوستان روانہ ہو گیا۔ نومبر ۱۷۵۴ء میں یہ حوصلہ مند نوجوان پیرس سے روانہ ہوا۔ فرانسیسی گورنمنٹ کو جب اس کے اعلیٰ مقاصد کی اطلاع ملی تو اس نے فی الفور اسے فوجی خدمات سے مستثنیٰ کر دیا اور ہندوستان تک پہنچا دینے کا ذمہ لے لیا۔ بے انتہا مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے بالآخر وہ سورت پہنچ گیا اور اگرچہ اس کی راہ میں بڑی بڑی دشواریاں اور انگنت تکالیف اور دقتیں تھیں تاہم وہ اپنے غیر متزلزل استقلال کی بدولت پارسیوں کے مذہبی پیشواؤں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اس نے کچھ عرصے میں جدید فارسی سیکھ لی اور اب وہ پارسیوں سے معلومات حاصل کرنے کے قابل ہو گیا۔ اس نے رفتہ رفتہ ان پیشواؤں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسے اپنی مقدس کتابوں کی زبان سکھلا دیں اور اپنے مذہب کے خاص خاص رسومات سے واقف ہونے کا موقع عطا کریں۔ وہ ان لوگوں میں سات سال تک ٹھیرا رہا اور بعد ازاں ۱۷۶۱ء میں وطن کے ارادے سے چل پڑا۔ وہ راست پیرس جانے کے بجائے آکسفورڈ میں ٹھیر گیا اور وہاں وہ اپنے نسخوں کا جو اس نے پارسیوں سے حاصل کئے تھے باڈلین لائبریری کے مذکورہ بالا نسخے سے مقابلہ کرنے لگا تاکہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ اسے کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی ہے بعد کے دس سالوں میں اس نے نہایت

انہماک کے ساتھ اپنے حاصل کردہ نسخوں پر کام کیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کا ترجمہ بھی کرتا گیا ۱۷۷۱ء میں یعنی اپنی روانگی ہندوستان سے پورے سترہ سال بعد اس نے دنیا کو اپنی غیر معمولی محنت کے ثمرات سے روشناس کیا۔ یہی اوستا یا زند اوستا کا (جیسا کہ انکوئی ٹل نے اسے موسوم کیا تھا) پہلا ترجمہ ہے۔

اس سے پارسیوں کے مذہب اور ان کے رسوم و رواج کے متعلق بہت ساری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ دنیا نے اس انکشاف کا جس سے کہ قدیم زمانے کے ایک عظیم الشان مذہب اور فلسفے پر روشنی پڑتی تھی بڑے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا۔ لیکن افسوس کہ بہت جلد یہ جوش و خروش سرد مہری سے بدل گیا۔ اس کے حسب ذیل وجوہات قابل ذکر ہیں۔

چند فضلائے زمانہ مثلاً کانٹ وغیرہم کو اس ترجمہ کے دیکھنے سے اس لئے مایوسی ہوئی کہ مذہب اور فلسفے کے وہ بلند خیالات جن کو وہ اوستا میں دیکھنے کے متوقع تھے اس میں نہیں پائے جاتے تھے۔ اور لوگوں کو بھی اس ترجمے نے بڑی حد تک مایوس کر دیا کیونکہ اس میں ان ادبی خوبیوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا جنکے متعلق وہ خیال کرتے تھے کہ اوستا میں ضرور موجود ہوں گی۔ انھوں نے اس امر کا مطلق خیال نہیں کیا کہ اس قسم کے ترجمے جو پہلے پہل کئے گئے ہوں قدرے ناقص اور نادرست ہوتے ہیں۔ ترجمے کی ناکامی کے حسب ذیل وجوہ قابل غور ہیں۔

انکوئی ٹل ڈوپرّان نے ایک اجنبی زبان کو دوسری اجنبی زبان کے توسط سے حاصل کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں زبان کی اصلی خوبیوں کا کماحقہ علم حاصل کرنا از بس دشوار ہے۔ اس نے کوئی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی۔

ان مذہبی پیشواؤں کو بھی جن سے انکوئی ٹل ڈوپرّان نے اوستا کی زبان سیکھی تھی کافی معلومات حاصل نہ ہوں گی کیونکہ مرور زمانہ اور ناموافق حالات کی وجہ سے اس کا قوی امکان ہے کہ وہ کئی اہم روایات کو فراموش کر چکے ہوں گے۔

عام طور پر لوگوں نے امور مندرجہ بالا پر توجہ نہیں کی اور ترجمے کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے

یعنی انھوں نے خیال کیا کہ زند اوستا کا زرتشت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور یہ کتاب ایک فرضی اور جعلی چیز ہے۔ افسوس ہے کہ اس قسم کے خیالات کی نشر و اشاعت میں مشہور و معروف مستشرق سر ولیم جونز نے بھی اپنے قلم کو آلودہ کیا۔ ۱۷۷۱ء میں مستشرق مذکور نے اپنا ایک خط فرانسیسی زبان میں شائع کیا جس میں اس نے یہ لکھا تھا کہ انکوئی ٹل کو اوستا کے متعلق سخت مغالطہ ہوا ہے اور پارسیوں نے چند مزخرفات کے سوائے کسی اہم کتاب کا اسے علم نہیں ہونے دیا ہے۔ انگلستان میں سر ولیم کی تائید رچرڈسن اور سر جان چارڈن نے کی۔ جرمنی میں میئرز نے اس کی ہمنوائی کی۔ البتہ فرانس میں کتاب کے اصلی ہونے کے متعلق اتفاق آرا رہا۔ علاوہ ازیں ایک فاضل جرمن مستشرق کلوکر نے بھی فرانسیسی مستشرقین کی رائے سے اتفاق کیا۔ اس نے انکوئی ٹل کی کتاب کا جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا (۱۷۷۶ء ریگا) اور بعض قدیم کتابوں کے حوالوں سے اس کی اصلیت ثابت کرنے کی کوشش بھی کی تقریباً پچاس سال تک یہ مسئلہ سخت مختلف فیہ رہا۔ بات یہ تھی کہ اب تک اصل کتابوں سے متعلق کوئی تحقیقات نہیں کی گئی تھی اور اوستا کی اصلیت کو جانچنے کا جو معیار نقادوں کے پیش نظر رہتا تھا وہ وہی تھا جو انکوئی ٹل کے ترجمے سے انھیں ملتا تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ رائے کہ زند اوستا ایک فرضی اور جعلی کتاب ہے اپنی طاقت اور قوت کھونے لگی اور رفتہ رفتہ بالکل معدوم ہوگئی۔

مستشرقین میں سنسکرت زبان کو سیکھنے کا شوق پیدا ہو جانے کے بعد اوستا کی اصلیت بے نقاب ہوگئی۔ تقریباً ۱۸۲۵ء میں یعنی انکوئی ٹل کے ترجمے کے پورے پچاس سال بعد سنسکرت جاننے والوں نے اس کا اصلی کتابوں سے مقابلہ کرنا شروع کیا۔ سنسکرت اور اوستا کی زبان میں جو قریبی مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے اس کا اندازہ پہلے ہی سے علمائے سنسکرت نے لگا لیا تھا۔ لیکن ۱۸۲۶ء میں ایک ڈین ماہر لسانیات راسک نامی نے اس تعلق کو زیادہ واضح طور پر ثابت کیا۔ راسک ہندوستان اور ایران کا سفر کر چکا تھا اور ان مقامات سے اس نے اوستا اور دوسری پہلوی کتابوں کے متعدد نسخے فراہم کر کے کوپن ہیگن کے کتبخانے میں داخل کئے تھے۔ راسک نے اپنی ایک مختصر سی کتاب میں (۱۸۲۶ء) زند زبان اور اس کے عہد اور اصلیت کے متعلق ذکر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا تھا کہ سنسکرت اور زند دو

جداگانہ زبانیں ہیں اگرچہ ان میں قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے زند کی قدامت بھی ثابت کی تھی اور اس کے حروف تہجی کے متعلق بھی اپنی تحقیقات کے نتائج شائع کئے تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں ایک فرانسیسی عالم سنسکرت یوجین برنوف نامی (Eugene Burnouf) نے اوستا کا مطالعہ شروع کیا اور اپنی سنسکرت کی معلومات سے فائدہ اٹھاکر اس امر کا پتہ چلالیا کہ انکوئی ٹل کے ترجمے میں بعض لسانیاتی غلطیاں موجود ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ غالباً انکوئی ٹل نے اپنے استادوں کے خیالات کی غلط ترجمانی کی ہے یا اس کا بھی امکان ہے کہ اس تک جو روایتیں پہنچیں وہ خود ناقص اور غلط ہوں۔ ناقابل اعتماد فرانسیسی ترجمے کو دیکھنے کی بجائے برنوف نے اوستا کے ایک حصے کا قدیم زمانے میں کیا ہوا سنسکرت ترجمہ مطالعہ کیا۔ موخرالذکر ترجمہ نریوسنگھ پارسی نے پندرھویں صدی میں کیا تھا اور اس کا ماخذ پہلوی ترجمہ تھا کچھ تو اس ترجمے کی مدد سے اور کچھ اپنی لسانیاتی معلومات کی بنا پر وہ اس قابل ہوا کہ اوستا کے اکثر ایسے حصوں کا مطلب واضح کرے جہاں کہ انکوئی ٹل نے مطلب کو بالکل ہی خبط کر دیا تھا۔

اوستا کے متعلق معلومات حاصل کرنے کیلئے بجائے پارسیوں کی مذہبی روایات پر اعتماد کرنے کے سنسکرت سے مدد لینی ایک نیا طریقہ تھا جو آگے چل کر بہت مفید ثابت ہوا۔ اس طریقے کے رائج ہونے سے اوستا کی اصلیت کا مسئلہ جو ایک زمانے سے مابہ النزاع تھا حل ہوگیا اور بہت جلد اس قسم کے غلط خیالات کافور ہو گئے علاوہ ازیں اس خاص معاملے میں ایک اور شہادت بھی دستیاب ہوئی۔ یعنی گروٹ فنڈ (۱۸۰۲ء) برنوف لاسن اور سر ہنری رالنسن نے فرانسیسی زبان کی بعض قدیم کتبوں کے پڑھنے میں کامیابی حاصل کر لی اب اس بات کا اندازہ ہوا کہ ان قدیم کتبوں کے مطالب اور زبان میں اوستا کے مطالب اور زبان کے ساتھ قریبی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس امر سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی کہ اوستا ایک فرضی اور جعلی کتاب نہیں ہے بلکہ بالکل اصلی ہے۔ جس کام کا آغاز برنوف نے کیا تھا اس کی تکمیل باپ، ہاگ، واتھ، اسپیگل وغیرہ وغیرہ نے کی۔ یہ فضلائے زمانہ کچھ تو سنسکرت سے مدد حاصل کرکے اور کچھ پہلوی ترجمہ کو پیش نظر رکھکر اب اوستا کے متعلق (جس قدر کہ وہ کتاب آج کل پائی جاتی ہے) صاف اور واضح معلومات اور

اور اس کے مطالب بیان کرنے کے قابل ہو گئے ہیں بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب ہم ان قدیم کتابوں کی حقیقی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہو سکتے ہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مطالب کے متعلق کہیں کہیں اختلاف رائے پایا جاتا ہے

اوستا کے مطالب ترتیب وسعت اور خصوصیات

اوستا کا لٹریچر کسی زمانے میں بہت عظیم اور وسیع لٹریچر تھا۔ آج کل اسکے چند حصے دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ یہ حصے بہت ہی منتشر اور پریشان حالت میں دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ آج تک اوستا کا کوئی نسخہ ایسا نہیں ملا ہے جس میں کم از کم وہی اجزا پوری طرح پائے جائیں جن سے کہ آج دنیا واقف ہے۔ ان پریشان اجزا کو بڑی محنتوں سے جمع کیا گیا ہے اور اس کو ترتیب دینے میں بھی بہت جانفشانی سے کام لیا گیا ہے۔ دور حاضرہ میں مذکورۂ بالا اوستا کے اجزا کو حسب ذیل طریق پر منقسم اور مرتب کیا گیا ہے۔

(۱) یسنا جس میں کہ گاتھا بھی شامل ہیں۔

(۲) وسپرد

(۳) یشت

(۴) چھوٹے چھوٹے حصے مثلاً نیائش گاتھا وغیرہ

(۵) وندے داد

(۶) ہاؤم ہوخت نسخ وغیرہ کے اجزار

پہلی پانچ قسموں کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں وندے داد وسپرد اور یسنا شامل ہیں۔ یہ حصے دعا مناجات اور خاص خاص مذہبی رسومات کے وقت پڑھے جاتے تھے اور ان کا تعلق "اوستائے خاص" سے ہے۔ قدیم قلمی نسخوں میں یہ تینوں حصے دو مختلف شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ان کے ساتھ یا تو پہلوی ترجمہ شامل ہے یا یہ کہ ایسا کوئی ترجمہ شامل نہیں کیا گیا ہے دوسرا حصہ مشتمل ہے مناجات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور یشت پر، ان مناجاتوں اور یشت کے مجموعے کو اوستائے خورد بھی کہا جاتا ہے۔ اوستائے خورد کا اکثر و بیشتر حصہ کوئی پہلوی

ترجمہ نہیں رکھتا ہے

اسکندر اعظم کے حملۂ ایران کے بعد پانچ صدیوں کے دوران میں اوستا کے کئی حصے ضائع ہو گئے اور اس کے متعلق اکثر اہم باتیں فراموش کر دی گئیں۔ چنانچہ اس خیال کی تائید پارسیوں کی روایات سے ہوتی ہے۔ ایک روایت کے بموجب نسخ کی پچاس فصلیں تھیں لیکن اب صرف تیرہ دستیاب ہوتی ہیں۔

(باقی آئندہ)

پُرعظمت شاعری

ترجمہ: معین الدین قریشی ام۔ اے عثمانیہ سابق مدیر مجلہ

ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کی کتاب "غالب" نے ملک کے ادبی حلقوں میں جو ہلچل اور ہنگامہ پیدا کر دیا ہے اس کے اظہار کی اس مقام پر چنداں ضرورت نہیں۔ ذیل کا مضمون صاحب معرکۃ الآرا کتاب کے چھٹے باب Greatness in Poetry کا ترجمہ ہے اس باب میں یورپ کے مشاہیر شعراء کے کلام کی روشنی میں اعلیٰ شاعری کا ایک عالمگیر معیار پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی معیار پر ساتویں باب میں غالب کی شاعری جانچی گئی ہے۔

یہ باب پوری کتاب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا ترجمہ مجلہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ علمی ذوق رکھنے والے حضرات اس سے پوری طرح

مستفید ہوں گے۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ مترجم نے بڑی محنت اور جگر کاوی سے پوری کتاب کا ترجمہ کر لیا ہے جسکے عنقریب شائع ہونے کی قوی امید ہے۔

ملٹن

"اگر تو واقعی قدرت کے نورانی سرچشمہ سے فیض اٹھاتا ہے تو اے شاعر! اٹھ اور خدا کے دیے ہوئے نور کے مطابق اپنے مقام پر جلوہ گستر ہو اور رہین قناعت ہو جا۔

قوی ہیکل ستارے اور وہ جو منتہائے بلندی سے نور برساتے ہیں (گو صرف آدھی دنیا ان کو دیکھ سکتی ہے اور بقیہ نصف عالم صرف ان کے وجود کا علم رکھتا ہے) اس تنہا ستارہ سے زیادہ لطیف اور حامل شان الٰہی نہیں جو کسی بھیانک پہاڑ کی چوٹی پر آپ ہی آپ روشن رہتے والے شعلۂ ہدایت کی طرح فروزاں رہتا ہے۔

اور نہ ان ننھے ستاروں سے جو بے برگ و بار درختوں کی ٹہنیوں میں موسم سرما کی جھلملاتی شمعوں کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

یہ سب ایک ہستیٔ واحد کے غیر فانی چشم و چراغ ہیں۔

تو پھر اے شاعر! اٹھ اور خدا کے دیے ہوئے نور کے مطابق اپنے مقام پر جلوہ گستر ہو اور رہین قناعت ہو جا" (ورڈسورتھ)

ورڈسورتھ کی بتائی ہوئی یہی وہ ربانی تجلّی ہے جو شاعری کی جان ہے۔ خدا کی یہ دین کسی کو زیادہ نصیب ہوتی ہے تو کسی کو کم۔ بعض قوی ہیکل ستاروں کی آن سے جگمگاتے ہیں تو بعض بے برگ و بار درختوں کی شاخوں میں، سرما کے ٹمٹماتے ستاروں کی "مدھم تابی" کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ بہرصورت ہر شخص بشرطیکہ وہ واقعی شاعر ہو ایک ہی سرچشمہ سے اکتساب نور کرتا ہے۔

یہ نور شاعر کے دل و دماغ کو اپنا بسیرا بنا لیتا ہے۔ جہاں وہ مادرانہ محبت سے اس کو پالتا پوستا رہتا ہے،

اس تاریکی کو دور کرتا ہے جس میں ذہن انسانی گھر جاتا ہے اور پھر اس کو رازِ زندگی کے سمجھنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لیکن ہر شاعر اس مانا بھری پرورش اور تربیت کو قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ پر عظمت شاعری کا راستہ بڑا کٹھن اور دشوار گزار ہے۔ بعض خدا کے بندوں کو عمر بھر اس نور کا احساس نہیں ہوتا۔ بعضوں پر تاریکی کے اتنے گہرے پردے پڑ جاتے ہیں کہ وہ اس تجلی سے بہرہ اندوز ہی نہیں ہو سکتے۔ زمرۂ اول کے شعرا شعر تو کہتے ہیں لیکن اس کا ربانی پہلو ان کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے اور انہیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ زندگی میں اس کا کیا حصہ ہے۔ وہ وہ زندگی میں لطف ضرور اٹھاتے ہیں لیکن ان کی لطف اندوزی ایک بچہ کی خوشی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس میں وہ اہمیت کا کوئی خاص سامان نہیں پاتے۔ بسنتی گلاب ان کی نگاہوں میں ایک نظر فریب زرد رنگ کا پھول ہے اور بس۔ ایسے شاعر اپنے حال میں خوش رہتے ہیں اور انھیں آگے کی طرف قدم بڑھانے کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ دوسرے زمرہ کے شعرا گویا طفلانِ ظلمت ہیں۔ ان میں اگر کوئی اظہار خیال پر قادر ہوتے ہیں تو وہ قدرت کے اس عطیہ کو انسان کے کثیف جذبات کی ترجمانی میں صرف کر ڈالتے ہیں۔

بعض ایسے بھی ہیں جنھیں اس تجلی کا سپاس گزارانہ احساس ہوتا ہے وہ اس سفر کے لئے کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں جسکی آخری منزل خدا کی ہستی ہے۔ یہاں وہ اس ہم آہنگی کا تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں جسکو وہ اندر ہی اندر محسوس کرتے رہے ہیں اور جسکی نورانی کرنیں چھن چھن کر تمام عالم میں پھیلتی رہتی ہیں لیکن ہر کوئی اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا اپنے اپنے ظرف نور کے مطابق ہر شخص زور لگاتا ہے بعض اپنے پیمانۂ نور کے ختم ہوتے ہی راستہ ہی میں رہجاتے ہیں اور بعض باوجود اس کے قدم آگے بڑھا کر تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں بعض اس ظلمت یعنی "زندگی کے خوفناک ہجوم غم" سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ انھیں کچھ نہیں سجھائی دیتا

"امید کا آسرا اور تاب و تواں کی نعمتیں" میں کہاں سے لاؤں۔ دل میں طوفانِ اضطراب اور عالم خارج میں ایک ہنگامہ بپا ہے۔

قناعت کی وہ دولت بیدار بھی میرے مقسوم میں نہیں جسکو اہلِ حال اپنے مراقبوں میں ڈھونڈھ پاتے ہیں اور اس شان سے نکلتے ہیں کہ روحانی فتح کا تاج ان کے زیب سر ہوتا ہے۔

شہرت و اقتدار اور محبت و آرام کی لذتوں سے میں ناآشنا ہوں وہ لوگ ایک ایک کرکے میری نظر کے سامنے ہیں جو ان چیزوں میں بسے ہوئے ہیں۔ ہنس بول کر جیتے اور زندگی کو سازِ عشرت سمجھتے ہیں لیکن کیا بتاؤں کہ مجھے قدرت نے زندگی کے اور ہی گھونٹ پلائے! اب یاس و حرماں، ہوا اور پانی کی طرح میرے لئے شیریں بن گئے ہیں۔ ایک تھکے ہوئے بچہ کی طرح میں اس جنجال کی زندگی کو رو رو کر اپنے آنسوؤں سے بہا سکتا ہوں تا آنکہ موت دبے پاؤں نیند کی طرح مجھ پر چھا جائے ہوا کی گرمی میں میرے گال ٹھنڈے پڑنے لگیں اور سمندر کی آخری تان میری مائل بہ پرواز روح پر ٹوٹ جائے" (شبلی)

سمندر کی یہ تان آخری نہیں بلکہ ابدی ہے۔

ان اسیران رعب میں سے بعض الٹے پاؤں جہاں سے چلے تھے وہیں آ رہتے ہیں ذرا عقل ٹھکانے لگتی ہے تو اپنے المناک تجربہ پر غور کرنے لگتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ایک سمہ ہے لیکن تسکین کی صورت نکالنی بھی ضروری ہے۔ اس لئے وہ فکر و تخیل کی ایک مثالی دنیا میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں۔

چند ایسے بھی ہیں جو اپنے "نور" کو مدھم پڑتا دیکھتے ہیں۔ تو ان کا دل بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن پھر اس خیال سے ڈھارس بندھتی ہے کہ آخر اوروں نے اس منزل کو جا ہی لیا۔ اس بنا پر وہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر اور نور اُن کے حصہ میں آگیا تو وہ بھی اپنے مقصد کو پالیں گے وہ آگے بڑھ کر خطرہ میں پڑنا نہیں چاہتے اور نہ ان کے قدم پیچھے کی طرف پلٹتے ہیں کیونکہ ارباب بازگشت کے مقابلہ میں انھیں زیادہ "ذوق یقین" حاصل ہوتا ہے۔ وہ ستم کش امید و انتظار رہتے ہیں۔

"اے دوست۔ دیکھنا! تیری اور ہماری زندگی میں کتنا بیّن فرق ہے۔ ہم ہیں کہ بغیر کسی مقصد و نشاط اور احساس وقت کے بہے چلے جا رہے ہیں۔ ہر شخص کوشش میں مصروف ہے لیکن اُسکے مآل سے ناآشنا۔ وہ سو رنگ کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن ہر زندگی ادھوری۔ تیری طرح محو انتظار بھی رہتا ہے لیکن اس میں تیری سی شانِ امیدواری کہاں"۔

"تو جلوۂ طور کا منتظر ہے اور ایک ہم بھی ہیں جو عارضی ملتوں کے نیم پرستار ہیں جنکے احساس میں گہرائی اور ارادوں میں صفائی نہیں جنکی بصیرتوں نے عمل کے پہل نہیں چکھے اور دھندلے خواب و خیال تکمیل سے بے نیاز رہے جنھیں ہر سال نئے غم اور نئے سامان دیے جاتا ہے۔ جو اپنی زندگی کو تذبذب میں گنوا دیتے ہیں اور آج کی کمائی بے دردی سے کل لٹا دیتے ہیں۔ سچ بتا اے خانہ بدوش! کیا ہم اس نور کے انتظار میں نہیں بیٹھے رہے؟

ہم بے شک بلا کش انتظار ہیں لیکن وہاں حجاب ہے اور یہاں درماندگی۔ پھر ہم میں کا وہ شخص جس نے سب سے زیادہ درماندگی کے مزے چکھے ہیں بیزار اور ہراساں ہو کر عقل کے تخت پر متمکن ہوتا ہے۔ ایام غم کے تمام تلخ تجربوں کو ایک ایک کر کے بے نقاب کرتا ہے اور جی کے جنجال کے آغاز و ارتقاء اور نشانات کی ساری کہانی بیان کر دیتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ امید کے بجھنے والے شرارے کو وہ کسطرح چمکاتا رہا پہلو میں دل کو سمجھاتا اور ادھر عقل کی فہمائش کرتا رہا۔ غرض وہ گھڑی گھڑی کی تسلیوں کا ایک دفتر کھول دیتا ہے۔

لیکن یہ صرف ارباب عقل کا شیوہ ہے۔ ہمارے حصہ میں تو پچھتانا لکھا ہے۔ ہم آرزو کرتے ہیں کہ جلد ہمارے خواب پریشاں کا خاتمہ اور رحمتوں کا نزول ہو۔ ہم دم بخود ہو کر صبر کے ساتھ سب کچھ سہے جاتے ہیں۔ تلخیٔ صبر بھی کیا بلا ہے۔ گویا نامرادی کے در و دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ لیکن اے دوست! کسی میں بھی امید کی وہ شان نہیں پائی جاتی جو تجھ میں ہے۔" (آرنلڈ)

ان میں سے بعض فضول انتظار کشی کی زحمت میں مبتلا رہتے ہیں پھر بھی وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔

"ہاں اب بھی ہم امیدوار ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر حال میں شر کی آخری منزل خیر ہی ہے ضمیر کی ملامتیں، ارادوں کی لغزشیں، دل کے وسوسے اور طبیعت کی خامیاں خیر ہی پر ختم ہونگی۔"

"کوئی چیز بے مقصد جادہ پیما نہیں۔ حیات کی کوئی چیونٹ ضائع نہیں جائے گی۔ اور نہ وہ

بیکار سمجھکر سپرد عدم کردی جائے گی۔ جبکہ خدا نے یہ کارخانہ مکمل بنایا ہے۔"

یہ پتنگے کی ننھی سی جان بھی یوں ہی وجود میں نہیں آگئی۔ اور نہ جگنو بغیر کسی مقصد کے نور کی بے محل چنگاری اپنے ساتھ لئے لئے پھرتا ہے۔ یہ سب یا تو اپنی اپنی جگہ مآل حیات رکھتی ہیں یا کسی اور حامل مقصد کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔"

"دیکھنا! ہر چیز ہماری نگاہوں سے مستور ہے۔ لیکن میرا ایمان تو یہی ہے کہ منزلوں دور ہی سہی انجام کار "خیر" ہمارے گلے کا ہار بنے گا۔"

"یہ ہے لڑی میرے خواب کی لیکن خود میرا کیا حال ہے۔ میں ایک بچہ کی طرح رات کی تاریکی میں نور کے لئے بلبلا رہا ہوں۔ جسکے بس میں سوائے اس رونے کے کوئی اور بات نہیں۔"

صرف چند ہی افراد ہیں جنکا سفر بالآخر انجام کو پہنچتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقی معنوں میں بڑے ہوتے ہیں۔ اور نہ صرف زندگی بلکہ کل کائنات کی زندگی میں وہ احساس ہم آہنگی سے لذت آشنا ہوتے ہیں۔

"میں اس دربار میں ہوں جہاں اعلیٰ خیالات کی خوشی مجھے رہ رہ کر گدگداتی ہے وہ حسن لطیف مجھ سے ہمکنار ہے جو کسی گہری چیز سے لبریز ہے۔ ڈوبتے سورج کی کرنیں، سمندر کی موجیں جیتی جاگتی ہوا اور انسان کا کاسۂ دماغ اس کا نشیمن ہے۔ وہ کوئی بیتاب سی چیز ہے جو ہر ذی ہوش اور ہر پیکر خیال میں اور کائنات کی ہر شئے میں سمائی ہوئی ہے۔"

یہ چیز بعضوں کو ایمان و ایقان سے حاصل ہوتی ہے اور بعض غور و فکر یا ایمان و غور دونوں سے حاصل کرتے ہیں۔

"ذرا کمہار کے اس چاک کو دیکھنا۔ کیسا بلیغ استعارہ ہے غور تو کرو کہ گردش ایام میں ایسی تیزی کہاں سے آگئی اور یہ مٹی کا ڈھیر اس کے ہاتوں کیسے مجبور اور بے بس ہوگیا۔ کبھی اس رندخراب حال کی اس بات کو بھی تو نے کان دھر کر سنا کہ زندگی ایک چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ ہر چیز پابند تغیر ہے۔ آئی تو چل بسا۔ اب حال کو تو کم از کم اپنا بنالے۔"

"نادان انسان! جانتا بھی ہے کہ جوہر حیات کو بقائے دوام حاصل ہے۔ ماضی اپنی داستانیں دہراتا رہے گا اور زمین اپنی کینچلیاں بدلتی رہے گی لیکن خدا اور تیری روح ایک حقیقت محکم ہے۔ تجھ میں جو چیز سما گئی وہ پہلے بھی تھی اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی زمانہ کا چاک خواہ رک جائے یا پیچھے کی طرف دوڑنے لگے۔ کمہار اور اس کی مٹی کو بقا رہے گی۔"

"اس نے تجھے سوم سے نازک ماحول کی آغوش مضطرب میں دیدیا تیرا جی تو بہت چاہتا ہوگا کہ زمانہ کی چال کو اپنی مٹھی میں بند کرلے لیکن جانتا بھی ہے کہ اس کا منشا کیا ہے۔ یہ تیری روح کی سنوار کا ایک آلہ ہے جو جی بھر کر تیرے نقش و نگار بناتا اور آخر کار تکمیل کے روپ میں تجھے ڈھال نکالتا ہے۔"

"گردش جام میں اگر شباب کی سرمستیوں اور عاشقانہ رموز کے دلنشیں جلوے پیش نظر ہوں تو کیا مضایقہ اب اگر بڑھاپے کے ڈراؤنے منظر نگاہ عبرت بیں کے سامنے آجاتے ہیں تو کیوں ڈرتا ہے تجھے ان جھمیلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا۔"

"ذرا اوپر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ کہ آخر اس ساغر کا معرف کیا ہے جوانی کی رنگین محفلوں کو بھلا بھی دے۔ نئی شراب ابل ابل کر کف آلود ہو رہی ہے اور آثار کا "چہرہ قرون مئے سے گلستاں" بنا ہوا ہے تو خاص دست قدرت کا بنایا ہوا ایک مکمل ساغر ہے تجھے زمین کے اس چاک سے کیا واسطہ۔"

"اے خالق کارساز تو تو اب بھی ہم غریبوں کا ملجا و ماوا ہے۔ زندگی کے طوفان اور عالم رنگ و بو کی ہر منزل حیات میں میں نے تیرا دامن نہیں چھوڑا مقصد آفرینش کو کبھی دل سے نہیں بھلایا اور ہمیشہ تیری لو میں لگا رہا۔"

"اب یہ تیری دستکاری تیرے حضور میں پیش ہے تو اسے ذرا ٹھونک بجا کر دیکھ لے۔ اگر کچھ بل رہ گیا ہو تو اسے نکال دے۔ اور اگر تیرے منشا کے خلاف اس میں کوئی خس و خاشاک آگئے

ہوں تو ان سے پاک کردے۔ میرا پیمانۂ حیات تیرے ہاتھ میں ہے۔ تو اسے اپنی مشیت کے مطابق صورت تکمیل عطا فرما۔"

"خدا کرے کہ بڑھاپا جوانی کا خیر مقدم کرے اور موت اس کو تکمیل کا آخری پیغام سنائے"

(برونننگ)

جب ایسی ہم آہنگی حاصل ہو جاتی ہے تو انسان کا ذہن "حسین پیکروں کی جلوہ گاہ" بن جاتا ہے اور اس مقام پر شاعر ایک خاص کیفیت میں چور ہو جاتا ہے۔

"وہ کیفیت سعود جس میں اس پر اسرار کائنات کی گرانیاں ہلکی پڑنے لگتی ہیں یہ وہ لطیف کیفیت ہے جسمیں محبت، نرمی و نزاکت سے ہمیں آگے بڑھائے جاتی ہے تا آنکہ ہمارا یہ پیکر خاکی، سہم جاتا ہے۔ اور اس کے خون کی گردش رک جاتی ہے۔ جسمانی حیثیت سے ہم سو جاتے ہیں لیکن ہماری روح بیدار ہو جاتی ہے۔ ہمارے دیدۂ منتظر کو ہم آہنگی کے تماشے اور مسرت کے بھرپور جذبے سے سکون و قرار حاصل ہوتا ہے۔ پھر کائنات کے سارے حجاب چاک ہو جاتے ہیں۔"

جب انسان کا ذہن یہ شان اختیار کر لیتا ہے تو وہ اپنے لطف و تفکر کی خاطر تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

"مجھے کبھی دھندلکے میں بساط زمین پر چلنا پڑتا ہے۔ اور کبھی ڈوب کر انتہائی گہرائیوں تک جانا پڑتا ہے جہاں فلک الافلاک بھی ایک حجاب معلوم ہوتا ہے۔ پست و بلند کی اس سیر میں کہیں قوت و جبروت، اور کہیں خوف و دہشت شکل و صورت کے مہیب پردوں میں نظر آتے ہیں جنکا ظہور کبھی اجتماعی شان میں ہوتا ہے اور کبھی انفرادی۔ یہودیوں کا خدائے قہار، اہل شور فرشتوں کے اکھاڑے میں کس جلال سے گرجتا رہتا ہے۔ لیکن میں ان سب سے بلا کھٹکے گزر جاتا ہوں کوئی حالت، انتشار میرے دل میں خوف نہیں پیدا کرتی۔ جہنم کا سب سے تاریک اور اسفل طبقہ اور عالم رویا کا بھیانک سے بھیانک مقام مجھے خوفزدہ نہیں بنا سکتا۔ لیکن جب میں اس ذہن

انسانی پر نظر ڈالتا ہوں جو میرا نشیمن اور میرے نغموں کی حقیقی بستی ہے تو میرا دل مارے خوف کے دھڑکنے لگتا ہے۔"

ذہنی فتحمندی کی یہ قوت خاص لوگوں کا حصہ ہے۔ کسی خاص صنف سخن میں یا کسی خاص مقدار میں عظمت حاصل کرنی ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس صنف یا مقدار میں کوئی کمال حاصل کیا جائے۔

شاعری میں احساس ہم آہنگی پر زور دینے سے ہمارا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ شاعر اپنی شاعری میں التزاماً اس کا اظہار کرتا رہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک آن کی مسرت یا احساس کی ترجمانی کرے اور چپ ہو رہے۔ کوئی شخص محض اس بنا پر اسکو شاعروں کی صف سے جدا نہیں کر سکتا کہ جن چیزوں کو وہ وقتاً فوقتاً محسوس کرتا رہا ہے یا جن سے وہ محظوظ ہوتا رہا ہے وہ ان کی تنظیم یا تعبیر نہیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ شاعروں میں اس کو کیا درجہ حاصل ہے تو لامحالہ اس کو ایسے شاعر کے مقابلہ میں کم درجہ دینا ہوگا جو نہ صرف اپنے تجربات سے مخلوط ہوا ہو بلکہ ان پر غور و خوض بھی کرتا رہا ہو۔ نیز اپنے ذہن میں "ہم آہنگی" کا ایک احساس پیدا کر لیا ہو جس کی روشنی میں وہ اپنے سارے تجربات کی جانچ پڑتال کر کے ایک "انتہائی کوشش" میں اس کو عالمگیر اور مثالی قالب عطا کرتا ہے۔

یہ "انتہائی کوشش" شاعری کا ایک تعین کن جزو ہے کہ کوئی شخص ایک بڑے احساس ہم آہنگی کے زیر اثر ایک بڑا شاعرانہ تجربہ محسوس کرے۔ لیکن تاوقتیکہ یہ تجربہ بصورت الفاظ اعلیٰ شعری روپ میں ظاہر نہو ہمیں اعلیٰ قسم کی شاعری نہیں حاصل ہو سکتی۔

اس "انتہائی کوشش" کے لئے ضروری ہے کہ ایک "انتہائی گھڑی" بھی نصیب ہو" اس وقت گویا شاعر کی زندگی کے تمام تجربات ایک وسیع اور بالاتر تجربہ میں سما جاتے ہیں۔

شاعر طرح طرح کے تجربات محسوس کرتا ہے اور ان میں کا ہر تجربہ اس کے ذہن کے ایک پہلو کا آئینہ بردار ہوتا ہے۔ اس پہلو کی ترجمانی بجائے خود موثر ہو سکتی ہے۔

ایک بڑا شاعرانہ تجربہ بڑھتے ہوئے احساس ہم آہنگی سے گھل مل کر اعلیٰ شعر کی صورت

میں ٹپک پڑتا ہے۔ اور یہی شاعر کو ایک بڑے شاعر کے درجہ پر فائز کرتا ہے۔

اب ہمیں پھر غالب کی طرف رجوع ہو کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ بحیثیت شاعر ہمارے لئے وہ کس قسم کا تحفہ لایا ہے۔

تبصرہ پیام مشرق مصنفہ سر محمد اقبال[1]

از

پروفیسر رینالڈ۔ اے۔ نکلسن (کیمبرج)
مترجمہ محمد حبیب اللہ صاحب رشدی۔ ایم۔ اے عثمانیہ

زمانۂ حال کے ہندوستانی مسلمان شعرا میں اقبال نے بہت بڑا درجہ حاصل کیا ہے۔ ان کی شاعرانہ قوت کی دو آوازیں ہیں۔ ایک اردو میں بلند ہوتی ہے اور ہندوستانی حب الوطنی کو اکساتی ہے اگرچہ اقبال سیاسی نقطۂ نظر سے قوم پرست نہیں ہیں، دوسری آواز ایران کی خوبصورت اور ترنم ریز زبان میں بلند ہوتی ہے، اور اسلامی دنیا کی سامعہ نوازی کرتی ہے۔ حقیقت میں یہ نیا اور جوش دلانے والا گیت ایک آگ برسانے والا سحر ہے جو زاکھ اور شعلے اچھال اچھال کر یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ "صوریہ پیغمبر" ہے۔

اقبال پنجاب میں پیدا ہوئے، تعلیم کی تکمیل انگلستان اور جرمنی میں کی۔ مشرق اور مغرب مل گئے لیکن یہ کہنا ٹھیک نہ ہوگا کہ وہ متحد بھی ہو گئے۔ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی جوہر خداداد کیوں نہ رکھتا ہو یہ امید نہیں کر سکتا کہ وہ ان دونوں تمدنوں سے جو دو مختلف بنیادوں پر قائم ہیں، مساویانہ اور مکمل طور پر حصہ لے سکتا ہے۔ اقبال مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہوئے لیکن ان کی طبیعت حقیقت میں مشرقی ہی رہی۔ وہ گیٹے، بائرن اور شیلے سے واقف ہیں، اُن کو اُلسواشپیراخ زرا تھسترا اور ال اُو نوشن

---

[1] یہ رسالہ اسلامیکا (Islamica) سے باجازت پروفیسر نکلسن ترجمہ کیا گیا۔

کرائے ٹریس سے ایسا ہی ربط رہا جیسا کہ قرآن اور مثنوی سے۔ لیکن وہ یورپی تہذیب کی اساس انسانیت سے کم واقف نظر آتے ہیں اور ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تنقید اگرچہ ہرگز سطحی نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی وسعت میں ضرور کم ہوتی ہے۔

ان کا فلسفہ جو اسرار خودی اور رموز بیخودی میں بجائے مشکل ہونے کے بیان کیا گیا ہے اس کے اہم خیالات یہاں اختصار کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں کیونکہ ان خیالات سے تھوڑی سے واقفیت کے بغیر اقبال کی شاعری کا سمجھنا آسان نہیں۔

وہ حقیقت کو عمل تکوین میں تصور کرتے ہیں نہ کہ حالت قیام میں۔ ان کے نظام اشیا میں ذات مطلق کوئی جگہ نہیں پاتی بلکہ کل کا کل ایک سیلابی حالت میں ہے۔ ان کی کائنات افراد کی ایک محفل ہے جس کا صدر سب سے واحد فرد یعنی خدا ہے۔ ان افراد کی زندگی اپنی شخصیت کے ڈھالنے اور ترقی دینے پر موقوف ہے۔ انسان کامل نہ صرف مادی دنیا پر حاوی ہو کر اس کو اپنے اندر ضم کر لیتا ہے بلکہ وہ صفات الٰہی کو بھی کامل طور پر اپنے میں بھر کر خدا کو بھی اپنے میں ضم کر لیتا ہے۔ پس زندگی کی جان عشق ہے جو اپنی انتہائی شکل میں تمناؤں اور مقاصد کی تخلیق اور ان کے حصول کی جد و جہد ہے۔ شخصیت کو قوی یا کمزور بنانے کے اعتبار سے تمنائیں اچھی یا بری قرار پاتی ہیں اور تمام قدر و قیمت اسی معیار سے قرار پانی چاہئے۔

نیتشے اور برگسان کو ان خیالات سے تعلق ہونے پر زور دینے کی ضرورت نہیں تاہم یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اقبال اپنے تصوری معاشرے کو (حضرت) محمدؐ کے تصور اسلام سے کیوں تعبیر کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ان کے اس معاشرے کا رکن ہونا مسلمانوں ہی کا خاص حق کیوں ہو؟۔ یہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے مذہبی جوش نے فلسفہ کو بالکل نکال باہر کیا (یہ ایسا نتیجہ ہے جو منطق کے لحاظ سے غلط ہے لیکن شاعرانہ اعتبار سے بالکل صحیح ہے)۔ اقبال بہ حیثیت شاعر کے عقلیت سے نفرت کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ابن سینا (ابو علی سینا) کا جلال الدین رومی سے اس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔

بوعلی[۱] اندر غبار ناقہ گم — دست رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فرو تر رفت تا گوہر رسید — آں بگرداب چوخس منزل گرفت

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر میگردد چو سوز از دل گرفت

پیام مشرق گیٹے کے **دیوان مغرب** کے جواب میں لکھی گئی تھی انتسابی نظم میں امیر افغانستان کو خطاب کرکے اقبال کہتے ہیں:۔

پیر[۲] مغرب شاعر المانوی — آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی
بست نقش شاہداں شوخ و شنگ — داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق — ماہتابے ریختم بر شام شرق

اگرچہ پیام مشرق ظاہری صورت میں "دیوان مغرب" سے بہت مشابہ ہے اس لئے کہ دونوں میں چھوٹی چھوٹی نظمیں علیحدہ علیحدہ سرخیوں کے تحت مختلف حصوں میں تقسیم کردی گئی ہیں[۳] اور یہ مشابہت اس کے مقصد میں بھی ہے لیکن ان دونوں کی نوعیت مضامین میں کوئی تعلق نہیں۔ گیٹے کی صرف دو نظموں کی بلاواسطہ تقلید کی گئی ہے[۴] جو "میدشن اُند دشتر" اور "محمدس گسانگ" ہیں۔ (لیکن یہ دونوں نظمیں "دیوان مغرب" میں

---

[۱] ۔ پیام مشرق صفحہ ۱۱۲ ۔

[۲] " " ۲ ۔

[۳] ۔ پیام مشرق میں نظمیں حسب ذیل سرخیوں کی تحت درج کی گئی ہیں:۔ لالۂ طور (۱۶۳ رباعیات)؛ افکار (متفرق نظمیں)؛ مے باقی (غزلیات)؛ نقش فرنگ (مغربی حیات و خیال کی تنقید)؛ خردہ (قطعات)

[۴] ۔ "میدشن اُند دشتر" کے مقابلہ میں پیام مشرق میں حور و شاعر ہے (صفحہ ۱۴۰) اور "محمدس گسانگ" کا نفیس لیکن بہت آزاد ترجمہ جوئے آب (صفحہ ۱۵۱) ہے۔

نہیں ہیں۔) "جلال اور گیٹے" کی سرخی والی نظم میں اقبال یہ تصور کرتے ہیں کہ فردوس بریں میں گیٹے اور جلال الدین رومی (جنکی اقبال سب سے زیادہ عزت کرتے ہیں) کی ملاقات ہوتی ہے[1] مولانا روم گیٹے کی زبان سے فاوسٹ کو سنکر یہ کہتے ہیں:۔

گفت رومی اے سخن را جاں نگار — تو ملک صید استی و یزدان شکار
فکر تو در کنج دل خلوت گزید — این جہانِ کہنہ را باز آفرید
سوز و ساز جان بہ پیکر دیدۂ — در صدف تعمیرِ گوہر دیدۂ
ہر کسے از رمزِ عشق آگاہ نیست — ہر کسے شایانِ ایں درگاہ نیست

"داند آن کو نیکبخت و محرم است
زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است"

پیام مشرق کے ایک بڑے حصہ کا سمجھنا مشکل ہے اور ترجمہ کرنا اس سے زیادہ مشکل۔ نازک جذبات اور دقیق فلسفیانہ خیالات جو اکثر فارسی شاعری کے قدیم رنگ میں لیکن بالکل نئی مرتبہ بیان کئے گئے ہیں ہمارے فہم و ادراک پر بہت بار ڈالتے ہیں ـــــ اور اس سے زیادہ ہماری ہمدردی پر۔ ذیل میں شاعر کے ایک مسلمان دوست (جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب ذوق ہے) کے خط سے ایک اقتباس دیا جاتا ہے جو شاعر کو لکھا گیا تھا۔ یہ اقتباس اقبال کی شاعری پر گہری روشنی ڈالتا ہے۔

"آپ اپنے ناظر کو جس بلندی پر آسانی سے لیجانا چاہتے ہیں اس شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ بہت وسیع ہو۔ غور و فکر کی عادت بہت بڑھی ہوئی ہو اور وہ دنیا پر بہت شک و شبہ کی نظر ڈالتا رہا ہو۔ آپ کا کلام صرف ان لوگوں کے لئے ہے جنکو ایسے جادو سے مسحور ہو جانے کی عادت ہو یا ایسے لوگوں کے لئے جو ایک دام سے دوسرے دام میں پھنستے

---

[1] ۔ پیام مشرق صفحہ ۲۴۲

رہنے کے متلاشی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انسانی جذبات کے سارے عالم کی خاک چھانی ہے۔ جس میں اعلیٰ ترین وجدانی کیفیات اور تاریک ترین شکوک سبھی شامل ہیں آپ کے کلام کے بارے میں یہ مصرعہ بالکل صحیح ہے ع

"رست از یک بند تا افتاد در بند دگر"

ہم جیسے لوگ جنھوں نے نہ اتنا محسوس کیا ہے اور نہ اتنا مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے، اس لایق نہیں کہ اس اعلیٰ روحانی دنیا میں رہیں یا رہنے کی کوشش کریں تاہم کبھی کبھی ہم اس میں داخل ہو جاتے ہیں"

میں یہاں صرف اتنی ہی کوشش کر سکتا ہوں کہ شاعر کے خیالات کی جھلک دکھلا دوں۔ اور اور وہ بھی اس امید میں کہ شاید میرے ترجموں کو پڑھنے کے بعد کسی کو شاعر کے اس شاندار کلام کا پورا مطالعہ کرنے کی ترغیب ہو۔ اقبال کی اعلیٰ اور پُر زور شاعری اس قابل ہے کہ اس سے واقفیت پیدا کی جائے۔ مانا کہ اس کلام کے پڑھنے اور سمجھنے اور لطف اندوز ہونے میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہے لیکن ان مشکلات کے جھیلنے کے بعد صلہ بھی کافی مل جاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک خود شعوری اور انفرادیت ہی سب کچھ ہے۔ وہ اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ خود شناسی، خود استقلالی اور ترقی ذاتی کا وعظ کہیں۔ زندگی کا مغز "عمل" ہے۔ زندگی کی تکمیل روحانی اور اخلاقی قوت میں ہے جو اطاعت اور تسلیم سے ترقی پاتی ہے۔ مادہ پہ فتح پانے سے ہم آزاد ہو جاتے ہیں۔ سرگرم زندگی اور وقت کے مکانی تصور کو نظر انداز کر دینے سے ہم بقا کو حاصل کر سکتے ہیں۔

(۱)

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست — گفتا مُے کہ تلخ تر از اُو نکو تر است
گفتم کہ کرمک است و زِ گل سر برون زند — گفتا کہ شعلہ زاد و شال سمندر است

گفتم کہ شر بنظرت خامش نہادہ اند گفتا کہ خیر او نشناسی ہمیں شر است
گفتم کہ شوقِ سیر نبردش بہ منزلے گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق منحصر است
گفتم کہ خاکی است و بخاکش ہمی دہند
گفتا چو دانہ خاک شگافد گلِ تر است[۱]

(۲)

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور کہ جانِ تو ز خود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن خدا ہم در تلاش آدمے ہست[۲]

(۳)

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز حیات جاویدان اندر ستیز است[۳]

(۴)

دل من راز دان جسم و جان است نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است[۴]

(۵)

جہانِ ما کہ پایانے ندارد چو ماہی در یم ایام غرق است
یکے بر دل نظر وا کن کہ بینی یم ایام در یک جام غرق است[۵]

---

۱ - پیام مشرق صـ ۱۴۵
۲ " " ۳۴
۳ " " ۴۱
۴ " " ۶۷
۵ " " ۴۵

(۶)

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشان
خواب را مرگِ سبک دان مرگ را خوابِ گراں[۱]

(۷)

میخورد ہر ذرّہ ما پیچ و تاب — محشرے در ہر دم ما مضمر است
با سکندر خضر در ظلمات گفت — مرگ مشکل زندگی مشکل تر است[۲]

(۸)

حیات جاوید

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں — ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است
چمن خوش است ولیکن چو غنچہ نتواں زیست — قبائے زندگیش از دمِ صبا چاک است
اگر ز رمزِ حیات آگہی مجوے و مگیر — دلے کہ از خلش خار آرزو پاک است

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است[۳]

(۹)

شبے ز ارنالید ابرِ بہار — کہ این زندگی گریۂ پیہم است
درخشید برقِ سبک سیر و گفت — خطا کردۂ خندۂ یک دم است[۴]

۱۔ پیام مشرق ص ۱۶۱
۲۔ 〃 〃 ۲۵۹
۳۔ 〃 〃 ۱۰۸
۴۔ 〃 〃 ۱۱۰

(۱۰)

زندگی و عمل

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج زخود رفتۂ تیز خیز امید و گفت ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم[1]

(۱۱)

نوائے وقت[2]

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم در من نگری ہیچم در خود نگری جانم
در شہر و بیابانم در کاخ و دبستانم من دردم و درمانم من عیش و فراوانم
من تیغِ جہاں سوزم من چشمۂ حیوانم

چنگیزی و تیموری مشتے زغبارِ من ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارِ من
انسان و جہانِ او از نقش و نگارِ من خونِ جگرِ مرداں سامانِ بہارِ من
من آتشِ سوزانم، من روضۂ رضوانم

آسودہ و سیارم این طرفہ تماشا بین در بادۂ امروزم کیفیتِ فردا بین
پنہاں بضمیرِ من صد عالمِ رعنا بین صد کوکبِ غلطاں بین صد گنبدِ خضرا بین
من کسوتِ انسانم، پیراہنِ یزدانم

---

[1] ۔ پیامِ مشرق صـــ ۱۵۰ ۔ ہائے کی نظم "فراگن" کے جواب میں ۔

[2] ۔ اقبال "وقت" کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں جن معنی میں برگسان لفظ "لادُوری" کو استعمال کرتا ہے ۔ یعنی وہ چیز جس سے زندگی اور شعور کی تعمیر ہوئی ہے ۔

تقدیر فسونِ من تدبیر فسونِ تو چوں روحِ رواں پاکم از چند و چگونِ تو
تو عاشقِ لیلائی من دشتِ جنونِ تو تو راز درونِ من، من رازِ درونِ تو
از جانِ تو پیدائم در جانِ تو پنہانم
من رہرو و تو منزل، من مزرع و تو حاصل تو ساز صدا آہنگے، تو گرمیٔ ایں محفل
آوارۂ آب و گل با دریاب مقامِ دل گنجیدہ بہ جامے بیں ایں قلزمِ بے ساحل
از موجِ بلندِ تو سر بر زدہ طوفانم[1]

(۱۲)

سرودِ انجم

ہستیٔ ما نظامِ ما
مستیٔ ما خرامِ ما
گردشِ بے مقامِ ما
زندگیٔ دوامِ ما
دورِ فلک بہ کامِ ما، می نگریم و می رویم
جلوہ گہِ شہود را
بتکدۂ نمود را
رزمِ نبود و بود را
کشمکشِ وجود را
عالمِ دیر و زود را، می نگریم و می رویم

---

[1] - پیامِ مشرق ص ۱۰۲

گرمیٔ کارزارها
خامیٔ پخته کارها
تاج و سریر و دارها
خواریٔ شهریارها
بازیٔ روزگارها، می نگریم و می رویم

خواجه ز سروری گذشت
بنده ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت
دورِ سکندری گذشت
شیوهٔ بت گری گذشت، می نگریم و می رویم

خاک خموش و در خروش
سست نهاد و سخت کوش
گاه به بزم ناؤ نوش
گاه جنازهٔ به دوش
میر جهان و سفته گوش، می نگریم و می رویم

تو به طلسمِ چون و چند
عقل تو در کشاد و بند
مثلِ غزاله در کمند
زار و زبون و دردمند
ما به نشیمن بلند، می نگریم و می رویم

پردہ چرا؟ ظہور چیست؟
اصل ظلام و نور چیست؟
چشم و دل و شعور چیست؟
فطرتِ ناصبور چیست؟
ایں ہمہ نزد و دور چیست، می نگریم و می رویم
بیش تو نزد ما کمے
سالِ تو پیشِ ما دمے
اے بکنارِ تو یمے
ساختۂ بہ شبنمے
ما بہ تلاش عالمے، می نگریم و می رویم[1]

پیام مشرق کے آخری حصہ کا مقصد جس کا عنوان "نقشِ فرنگ" ہے یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مشرق کے رہنے والے کو یورپی خیال کے چند اہم پہلوؤں کی ایک جھلک دکھادی جائے جیسی کہ شاعر نے خود اپنی آنکھ سے دیکھی ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ ہم اپنے آپ کو ویسا ہی دیکھیں جیسا کہ دوسرے لوگ ہمیں دیکھتے ہیں۔ اور یہ بات اس سے بھی بہتر ہوگی اگر ہم اس اعلیٰ پیغام کو اپنے دلوں میں جگہ دیں جس میں اقبال ہمیں یہ تلقین کرتے ہیں کہ ہم خشک عقلیت کی بیڑیوں کو توڑ کر زندگی اور محبت کی اندرونی دنیا میں داخل ہوں۔

(۱۳)

دانش اندوختۂ دل زکف انداختۂ
آہ زاں نقد گرانمایہ کہ در باختۂ

---

[1] - پیام مشرق ص ۱۱۲

حکمت و فلسفہ کارے است کہ پایانش نیست
سیلی عشق و محبت بہ دبستانش نیست

بیشتر راہ دلِ مردم بیدار زند
فتنہ نیست کہ در چشم سخندانش نیست

دل ز نازِ خنک او بہ تپیدن نرسد
لذتے در خلشِ غمزۂ پنہانش نیست

دشت و کہسار نوردید و غزالے نگرفت
طوفِ گلشن زد و یک گل بگریبانش نیست

چارہ اینست کہ از عشق کشادے طلبیم
پیش او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم[1]

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پے تعمیرِ جہان دگر است[2]

زندگی جوئے روانست و رواں خواہد بود
ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

---

[1] ۔ پیام مشرق ص ۲۲۶
[2] ۔ 〃 〃 〃 ۲۳۱

آنچہ بود ست و نباید زیباں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود ست ہماں خواہد بود
عشق از لذّت دیدار سراپا نظر است
حسن مشتاق نمود است وعیاں خواہد بود
آن زمینے کہ بروگریۂ خونیں زدہ ام
اشک من در جگرش لعل گراں خواہد بود
مُژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کُشتند و ز خورشید نشانم دادند[1]

اقبال سیاسیات میں کسی آسان راستہ کے قائل نہیں۔ مجلس اقوام کے متعلق ان کی نظم اُن کی اس خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔

(۱۴)

برفتد تا روش رزم دریں بزم کہن
دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند
بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

(۱۵)

فلسفی را با سیاست داں بیک میزاں سنج
چشم آن خورشید کورے دیدۂ ایں بے نمے

---

[1] ۔ پیام مشرق ص ۲۳۲
[2] ۔ " " ۲۳۳

آن تراشد قولِ حق را حجتِ نا استوار
وین تراشد قولِ باطل را دلیلِ محکمے [1]

لیکن فلاسفہ کو بھی اقبال سے چند سخت مکے کھانے پڑتے ہیں ـــــ ان میں خاص طور پر ہیگل قابل ذکر ہے جسکی فلک پرواز عقل کو :-

ماکیان کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس

کہا گیا ہے۔ مسلم ناظرین کے سامنے یورپین فلاسفی کو پیش کرنے کا طریقہ جو مصنف نے اختیار کیا ہے اس کو دکھانے کے لئے میں ان اشعار کو پیش کرتا ہوں جو "شوپن ہار اور نیٹشا" کے عنوان سے لکھے گئے ہیں۔

(۱۶)

مرغے ز آشیانہ بسیرِ چمن پرید
خارے ز شاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید
بدگفت فطرتِ چمن روزگار را
از درد و خویش و ہم ز غمِ دیگران تپید
داغے ز خونِ بے گنہے لالہ را شمرد
اندر طلسمِ غنچہ فریبِ بہار دید

سوزِ فغانِ او بدلِ ہدہدے گرفت
با نوکِ خویش خار ز اندامِ او کشید

---

[1] ۔ پیام مشرق ص ۲۳۵
[2] " " " ۲۴۵

گفتش کہ سود خویش زجیب زیاں برار
گل از شگاف سینہ زر ناب آفرید
درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خو گر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی[۱]

اقبال نیٹشے کے خیال "خواہش قوت" (جس کی توجیہ یہ ہے کہ "ایک کامل" قائم بالذات شخصیت کی مکمل ترین ممکنہ تحصیل") کو گرمجوشی سے قبول کرتے ہیں۔ اور ان کا یہ خیال ہے کہ اسلام بحیثیت ایک تصوری جماعت کے، ایک جمہوریت اور مذہبی حکومت ہے[۲]۔ اس خیال کی وجہ سے اقبال میں اور "دیوانہ بکار گہ شیشہ گر"[۳] (نیٹشے) میں مخالفت ہو جاتی ہے کیونکہ وہ (غیر ذمہ دارانہ طور پر) نیٹشے کو دہریہ سمجھتے ہیں۔

(۱۷)

گر نو اخواہی ز پیش او گریز — در نئے کلکش غریو تندر است
نیشتر اندر دل مغرب فشرد — دستش از خون چلیپا احمر است
آنکہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت — قلب او مومن دماغش کافر است
خویش را در نار آن نمرود سوز[۴]
زانکہ بستان خلیل از آذر است

---

[۱] ۔ پیام مشرق ص ۲۳۴
[۲] ۔ ملاحظہ ہو اسرار خودی ۔ مقدمہ ۔ ص ۱۰ و ص ۲۹
[۳] ۔ پیام مشرق ص ۲۳۸
[۴] ۔ " " " ۲۴۱ و حاشیہ تحت

میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں مصنف پیام مشرق کو مسلمان وائٹلسٹ (Vitalist) کہوں تو بیجا نہ ہوگا اور یہ واقعہ ہے کہ وہ جدید فلاسفہ میں جتنی زیادہ ہمدردی برگسان سے رکھتے ہیں اتنی کسی اور فلسفی سے نہیں رکھتے۔ برگسان کی تعلیم کو انہوں نے ان اشعار میں پیش کیا ہے۔

(۱۸)

پیغام برگسان

تا بر تو آشکار شود راز زندگی — خود را جدا ز شعلہ شمال شرر مکن
بہر نظارہ جز نگہ آشنا مبار — در مرز بوم خود چو غریباں گذر مکن
نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است[۱]

ظریفانہ اور تیز تنقید کے خواہشمندوں کے لئے پیام مشرق میں بہت کچھ دلچسپی کا سامان موجود ہے مثلاً آئین سٹائین کے متعلق لکھا ہے کہ "روشنی کا مظہر جس نے موسیٰ اور ہارون کی نسل سے زردشتی مذہب کو زندہ کیا" یا لینن قیصر و لہلم سے اشتراکیت کی فتح کا ذکر کرتا ہے جس کا جواب قیصر یہ دیتا ہے کہ لوگوں نے ایک مالک کی جگہ دوسرا مالک بدل لیا۔

"نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست"[۲]

---

[۱] ۔ پیام مشرق ص ۲۴۷

[۲] ۔ " " " ۲۳۹

[۳] ۔ " " " ۲۴۹

"محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ و مردِ مزدور"[۱] "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور"[۲] اور "نوائے مزدور"[۳] یہ تینوں نظمیں یہ بتانے کے لئے کافی ہیں کہ اقبال کلیتہً مزدور طبقہ کے طرفدار ہیں۔ تو اے مزدور سے تین شعر ملاحظہ ہوں

(۱۹)

زمزد بندۂ کرپاس پوشش و محنت کش — نصیب خواجۂ ناکردہ کار رخت حریر
زخوئے فشانی من لعل خاتم والی — زاشک کودکِ من گوہر ستام امیر

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تاکے
زخویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تاکے

یہ کہا جاتا ہے کہ "فلسفہ خیالات کی جس رَو کو عقلیت کی مخالفت میں جاری کرتا ہے وہی سیاسی دنیا میں سلطنت کی مخالفت میں جاری ہو جاتی ہے"[۴] انتہا پسند قوم پرست اور اتحاد اسلام کے حامی اقبال کے کلام کو اپنی تائید میں نقل کریں گے بالکل اسی طرح جس طرح کہ سنڈیکلسٹ افراد (Syndicalist) برگسان کو نقل کرتے ہیں۔ لیکن زندگی کی ابداعی حرکت کا غیر عقلی ہیجؔ پر قائم ہونا ضروری نہیں ہے۔ اقبال نے صاف طور پر کہا ہے کہ ضبطِ نفس "خود شعوری کی اعلےٰ ترین شکل" ہے اور یہ کہ تصوری انسان میں "عقل اور جبلّت ایک ہو جاتے ہیں"[۵] یہ یقین ہے کہ اس سے ان کے نقادوں کو تشفی نہیں ہوگی کیونکہ وہ صاف طور پر اس بات کو دیکھیں گے کہ اقبال کے اصول کا

---

[۱] پیام مشرق ص ۲۴۴
[۲] " " ۲۵۵
[۳] " " ۲۵۷
[۴] برگسان اینڈ ہز فلاسفی مصنفہ جے۔ اے۔ گن ص ۱۱۰
[۵] اسرار خودی

کیا استعمال ہوتا ہے۔ اقبال کا اعتذار بھی ملاحظہ ہو۔

(۲۰)

خطاب بہ انگلستان

مشرقی بادہ چشیدہ است ز مینائے فرنگ — عجبے نیست اگر تو بہ دیرینہ شکست
فکر نوزادۂ او شیوۂ تدبیر آموخت — جوش زد خوں بہ رگِ بندۂ تقدیر پرست
ساقیا تنگ دل از شورش مستاں نشوی — خود تو انصاف بدہ ایں ہمہ ہنگامہ کہ بست

"بوئے گل خود بہ چمن راہ نما شد زنخست
ورنہ بلبل چہ خبر داشت کہ گلزارے ہست"[۱]

۱۔ پیام مشرق ص ۲۵۴

افسانے

(۱)

محرومِ خواب

از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم۔ اے ایچ۔ سی۔ ایس سابق متعلم کلیہ

رات کا وقت ہے، نرگس، ایک ننھی سی تیرہ سالہ آیا بچے کا جھولا جھلا رہی ہے اور دبی آواز سے لوری دے رہی ہے۔

کمرے کے اندر ایک کونہ میں ایک چھوٹا سا سبز فانوس روشن ہے، ایک طرف دیوار میں دو کھونٹیوں سے ایک ڈوری بندھی ہوئی ہے جس پر ننھے ننھے بچہ کے کپڑے اور ایک بڑی سیاہ رنگ کی شلوار لٹک رہی ہے۔ جس مقام پر چراغ رکھا ہوا ہے وہاں چھت پر سبز رنگ کا ایک حلقہ دائرہ کی شکل میں نمودار ہے۔ اور ڈوری پر جو کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں اُن کی پرچھائیں آتشدان، جھولے اور نرگس پر پڑ رہی ہے۔ جب چراغ ٹمٹماتا ہے تو اس پرچھائیں، اور سبز رنگ کی روشنی کے حلقے میں جان سی پڑ جاتی ہے اور ان سب میں اس طرح ایک حرکت پیدا ہوتی ہے۔ گویا ہوا اِن کو ہلا رہی ہے۔

جھولے میں بچی پڑی رو رہی ہے۔ بہت دیر سے روتے روتے اُس کی آواز بیٹھ گئی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اوس کے چیخنے اور چلّانے کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا اِدھر نرگس، کو نیند پہ نیند آ رہی ہے۔

آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں۔ شدت بیتابی سے بار بار اس کا سر جھکا جارہا ہے۔ غرض نیند سے اُس کا حال بُرا ہے اور ایک غنودگی سی طاری ہے۔ "سو جارے للّو ہائی"۔ وہ بہت ہی آہستہ لوری دے رہی ہے۔

بازو والے کمرے سے اُس کے آقا اور آقا کے کارپرداز یوسف کے خرّاٹوں کی آواز، جھولے کی چوں چوں، اور خود نرگس کی لوری کا ترنّم، یہ سب ملکر ایک خاص کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی آرام سے بستر پر لیٹے ہوئے آدمی کے لئے اس قسم کی موسیقیت پر لطف و دلکش ثابت ہو۔ لیکن اس وقت اس میں بجائے گداز کے سوز کی کیفیت نمایاں ہے۔ بجائے لطف اندوز ہونے کے۔ نرگس کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک خواب آور نغمہ تھا اور آج کی رات نرگس کی قسمت میں نیند لکھی ہی نہ تھی۔ اگر ــــ خدانخواستہ ــــ کہیں اس کی آنکھ لگ جائے، تو پھر اوس کے آقا اور بیگم، دونوں کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہے۔

چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ چھت کے سبز روشن حلقہ اور ہر چیز کی پرچھائیں میں جان پیدا ہو جاتی ہے اور نرگس کی نیم باز آنکھوں اور پریشان دماغ کے سامنے عجیب و غریب منظر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ دیکھتی ہے کہ سیاہ رنگ کے بادل، ڈراؤنی اور ہیئت ناک شکل لئے ہوئے آگے پیچھے دوڑے چلے جارہے ہیں اور جھولے والی بچی کی طرح رو رہے ہیں۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد بادل غائب ہو جاتے ہیں، ہوا چلنے لگتی ہے اور نرگس کو کیچڑ سے بھری ہوئی ایک کشادہ شاہ راہ دکھائی دیتی ہے۔ اس راستہ پر بنڈیوں کی قطاریں ہیں اور کچھ لوگ اپنے سروں پر گٹھریاں لئے ہوئے چلے جارہے ہیں۔ سڑک کے دونوں بازو کہر اور جنگل نظر آتا ہے۔ اچانک وہ تمام لوگ جو گٹھریاں لیجاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے سب کے سب گیلی اور کیچڑ سے بھری زمین پر گر جاتے ہیں۔ "کیوں ۔ یہ کس لئے" نرگس اون سے پوچھتی ہے وہ لوگ جواب دیتے ہیں "نیند آرہی ہے، سوتے ہیں" یہ کہکر گہری نیند سو جاتے ہیں۔ اگرچہ کوّے اور دیگر پرندتار کے کھمبوں پر بیٹھکر جھولے والی بچی کی طرح چلّا چلّا کر انہیں جگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"سوجا رے للو ہائی" نرگس لوری دیتی ہے، اور اپنے آپ کو ایک دبلی ہوئی چھت کی چھوٹی سی جھونپڑی میں پاتی ہے۔

اُس کا مرحوم باپ شمیم زمین پر کروٹیں بدل رہا ہے۔ وہ اس کو دکھائی نہیں دے رہا ہے، لیکن اُسکے لوٹنے اور کراہنے کی آواز آرہی ہے۔ "پیٹ پھٹا جا رہا ہے" درد اس شدت کا ہے کہ وہ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی زبان سے پورا ادا نہیں کر سکتا صرف سانس لے سکتا ہے اب اُس کے دانت پیسنے کی آواز آرہی ہے۔

"اوو۔ اوو۔ آآں"

اُس کی ماں نسیمہ اپنے آقا کے گھر دوڑے ہوئی گئی کہ شمیم مر رہا ہے۔ اُس کو گئے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے اور اب واپس آنا چاہیئے۔ نرگس آتشدان کے قریب پڑی جاگ رہی ہے اور اُس کے باپ کے کراہنے کی "اوو۔ اوو۔ آآں" کی آواز سن رہی ہے۔ جھونپڑی کے قریب گاڑی کے آنے کی آواز آتی ہے۔ شہر سے ایک نوجوان ڈاکٹر آیا ہوا ہے جو اس کے آقا کا مہمان ہے جسکو یہاں شمیم کی مدد کے لئے بھیجا گیا ہے۔

ڈاکٹر جھونپڑی میں داخل ہوتا ہے۔ تاریکی کی وجہ سے اُس کا چہرہ نہیں دکھائی دیتا لیکن اُس کے کھانسنے، اور دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آرہی ہے۔

وہ کہتا ہے "چراغ روشن کرو"

نسیمہ آتشدان کے قریب جا کر ٹین کی ٹوٹی ہوئی کپی اور دیا سلائی ڈھونڈتی ہے۔ ایک منٹ تک سکوت رہتا ہے۔ ڈاکٹر اپنی جیب سے ایک دیا سلائی نکالکر روشن کرتا ہے۔

"ابھی، صاحب، ابھی کہتے ہوئے نسیمہ گھر کے باہر دوڑتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد موم بتی کا ٹکڑا لئے واپس آتی ہے۔

شمیم کا چہرہ سُرخ ہے، آنکھیں روشن، اور اس کی نگاہ میں خاص تیزی پائی جاتی ہے گویا اُس کی نگاہ گھر کی ہر چیز پر جمی ہوئی ہے۔

"کہو بھئی کیسے ہو۔ کیا سوچ رہے ہو" ڈاکٹر نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "کب سے یہ حال ہے"

"جی۔ صاحب۔ میں مر رہا ہوں۔ میرا وقت آ پہونچا ہے۔ تھوڑی دیر میں خاتمہ ہے"۔

"فضول باتیں نہ کرو۔ ہم تمہیں اچھا کر دیں گے"۔

"بجا۔ صاحب جو فرمائیں درست ہے۔ غلام شکریہ ادا کرتا ہے اور صاحب ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ موت آگئی ہے"۔

ڈاکٹر تقریباً نصف گھنٹے تک بیمار کے ساتھ رہتا ہے، اُس کے بعد کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:۔

"افسوس۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تم دواخانے جاؤ۔ وہاں تم پر عمل جراحی کیا جائے گا تم اچھے ہو جاؤ گے۔ ابھی جاؤ۔ فوراً جاؤ اور تمہیں ضرور جانا چاہئے۔ اگرچہ رات زیادہ ہو چکی ہے اور دواخانہ سونا پڑا ہوگا۔ لیکن کوئی ہرج نہیں۔ میں تمہیں رقعہ دیتا ہوں۔ سنتے ہو بھئی میں کیا کہہ رہا ہوں"

نسیمہ نے ڈرتے ڈرتے کہا "میرے حضور وہ کیسے جا سکتا ہے، ہمارے ہاں کوئی سواری نہیں ہے"۔

"پروا نہیں۔ میں تمہارے آقا سے کہتا ہوں وہ تمہارے لئے سواری بھیج دیں گے"

ڈاکٹر چلا جاتا ہے۔ موم بتی جل جاتی ہے اور پھر وہی "اوہ۔ اوہ۔ آآں"۔ نصف گھنٹے بعد باہر گاڑی کی آواز آتی ہے۔ دواخانے لے جانے کے لئے بنڈی بھیجی گئی ہے شمیم تیار ہو کر سوار ہو جاتا ہے .....

صبح کا وقت ہے، دھوپ تیز ہے۔ نسیمہ باہر گئی ہوئی ہے تاکہ اپنے شوہر کی خیریت دریافت کرے۔ کہیں سے بچے کے رونے کی آواز آتی ہے اور نرگس کسی کو خود اپنی آواز سے گاتے ہوئے سُنتی ہے۔

"سو جا رے۔ للّو ہائی"

نسیمہ واپس آتی ہے اور دبی آواز سے کہتی ہے۔ "آہ رات لوگوں نے اُن کا علاج کیا، لیکن صبح اُنہوں نے اپنی جان خدا کے سپرد کی۔ خدا جنت نصیب کرے۔ اُن کی قبر پر رحمت کے پھول نچھاور کرے .....

وہاں لوگ کہتے ہیں کہ اُن کو دواخانہ پہلے ہی آنا چاہئے تھا۔ دیر کی گئی۔

نرگس گھر کے باہر نکل جاتی ہے اور سڑک کے کنارے ایک درخت سے لپٹ کر رونا شروع کرتی ہے کہ پیچھے سے کوئی شخص گدی پر اس زور سے گھونسہ مارتا ہے کہ اُس کا سر چکرا جاتا ہے۔ وہ آنکھ اٹھاتی

ہے اور کیا دیکھتی ہے کہ اس کا آقا سامنے کھڑا ہے آواز آتی ہے "اری نالائق۔ بچی چلّا رہی ہے اور تو پڑی مر رہی ہے"

یہ کہہ کر وہ گال پر زور سے ایک طمانچہ بھی رسید کرتا ہے اور یہ تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ جھولے کی ڈوری کھینچنے لگتی ہے۔ اور پھر لوری دینا شروع کرتی ہے، تھوڑی دیر بعد پھر وہی سبز روشنی کا حلقہ وہی پرچھائیں، اور وہی آوازیں اُس کے دماغ کو متاثر کرتی ہیں۔ پھر وہی کیچڑ سے بھرا ہوا راستہ نظر آتا ہے۔ پھر وہی منظر کہ لوگ اپنے سروں پر سے بوجھ اتار کر میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ نرگس اُن کو دیکھتی ہے۔ نیند کا غلبہ ہوتا ہے وہ سو رہتی، لیکن اُس کی ماں اُس کے بازو ہے اور اس کو گھسیٹے لئے جا رہی ہے۔ روٹی کی تلاش میں دونوں شہر کی طرف جا رہے ہیں۔

"اللہ کے نام پر کچھ دلا دو" اُس کی ماں راہگیروں سے سوال کرتی ہے "ہمارے حال پر رحم کرو۔ ہماری مدد کرو۔ خدا تمہاری مدد کرے گا"۔

"بچی کو مجھے دیدے" ایک آواز آتی ہے جس سے وہ خوب واقف ہے "بچی کو مجھے دیدے" پھر وہی آواز کہتی ہے "کیا تو سو گئی مردار"

نرگس چونک پڑتی ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتی ہے کہ کیا واقعہ ہے۔ نہ تو کوئی سڑک ہے نہ کوئی راہگیر اور نہ اُس کی ماں کا کہیں پتہ ہے۔ البتہ اُس کی مالکہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی ہوئی ہے۔ موٹی تازی تنومند عورت۔ بچی کو دودھ پلانے اور سمجھانے لگی اور نرگس خاموش کھڑی دیکھتی رہی۔

دریچہ کے باہر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ صبح ہونے کو ہے اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔

لو۔ اِس کو لو" اُس کی مالکہ نے اپنے کرتے کے بٹن لگاتے ہوئے کہا۔ "یہ رو رہی ہے۔ اِس کو نظر لگ گئی"

نرگس بچی کو لیکر جھولے میں سلا دیتی ہے اور پھر لوری شروع ہو جاتی ہے۔ اب چھت پر نہ وہ سبز روشنی کا حلقہ ہے اور نہ کیڑوں کا سایہ جو اُس کے دماغ کو متاثر کر سکے لیکن اب نیند سے اُس کا اور بھی برا حال ہے۔ جھولے کی پٹّی پر سر رکھ کر اپنے پورے جسم کو ہلا ہلا کر نیند بہلاتی ہے۔ لیکن اُس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی

ہیں اور سر چکرا رہا ہے۔

"نرگس۔ آگ جلاؤ" وہ اپنے مالک کی آواز سنتی ہے۔

معلوم ہوا کہ صبح ہوگئی اور کام کا وقت آگیا۔ نرگس جھونپڑے کو چھوڑ لکڑیاں لانے کے لئے چھپر کی طرف دوڑتی ہے۔ ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے کی بہ نسبت چلتے پھرتے رہنے میں نیند کا غلبہ کم ہو جاتا ہے۔ غرض وہ لکڑیاں لاتی اور چولہا جلاتی ہے اب اس کے خیالات کا دھندلا پن رفع ہو رہا ہے اور تکان کم ہو رہی ہے

"نرگس۔ چار کا پانی تیار کرو" اس کی مالکہ پکارتی ہے۔

نرگس لکڑی کے چورے توڑ کر ایک جا کرتی ہے۔ لیکن ابھی آگ روشن کر کے سماور گرم کرنے نہ پائی تھی کہ ایک اور حکم ملتا ہے۔

"جاؤ سرکار کے موزے صاف کرو"

زمین پر بیٹھکر نرگس اپنے آقا کے موزے صاف کرتے ہوئے سوچنے لگتی ہے کہ اگر ان موزوں پر سر رکھکر وہ سو جائے تو کیا ہی اچھی بات ہوگی۔ اور وہ محسوس کرنے لگتی ہے۔ کہ موزہ ایک دم سے بڑھ رہا ہے پھول رہا ہے، اور سارے کمرے میں سمائے جاتا ہے۔ اُس کے ہاتھ سے برش گر پڑتا ہے۔ وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھتی ہے۔ اپنے سر کو ہلاتی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمام چیزوں کو دیکھتی ہے تاکہ تمام چیزیں بڑی بڑی ہو کر نہ تھرتھرائیں۔

"نرگس گھر کی سیڑھیاں دیکھکر مجھے شرم آتی ہے۔ ذرا اُن کو دھو دو" نرگس سیڑھیاں دھوتی ہے گرد صاف کرتی ہے۔ ایک دفعہ اور چولہا جلا کر دوکان جاتی ہے۔ کام بہت ہے اور اسے ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں۔

سب سے مشکل کام چکّی پیسنا ہے۔ چکّی کے ساتھ اُس کا سر بھی چکرا رہا ہے۔ چکّی رک جاتی ہے اور قریب سے اس کی مالکہ اس زور سے چلاتی ہے کہ اُس کے کان بہرے ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کھانا کھلانا بچی کے کپڑے دھونا یہ سبھی کچھ ہے۔

دن ختم ہوا۔ رات آگئی۔ نرگس اپنے سر کو دباتی ہے اور معلوم نہیں کہ کیوں، وہ مسکراتی ہے۔ اور رات کے ساتھ نیند بھی اس کو اپنے آغوش میں لینے آموجود ہوتی ہے۔ صاحب خانہ کے دوست ملاقات کے لئے آتے ہیں "نرگس سماور چڑھاؤ" اس کی مالکہ پکارتی ہے۔

چھوٹے سماور میں وقت واحد میں زیادہ سے زیادہ تین چار پیالی چاء آسکتی ہے نتیجہ یہ کہ تمام مہمانوں کی تواضع ہونے تک سماور چھ سات دفعہ گرم کیا جاتا ہے۔ چاء نوشی ختم ہوئی۔ لیکن نرگس کی مجال نہیں کہ وہاں سے ہلے۔ بلکہ مزید احکام کی منتظر کھڑی رہتی ہے۔

"نرگس بازار سے پان لے آ"

وہ تیزی سے جاتی ہے تاکہ خون کی روانی زیادہ ہو اور نیند نہ آئے۔

"نرگس۔ چھالیہ کہاں ہے۔ سروتا لے آؤ۔ پانی پلاؤ"

خدا خدا کر کے تمام مہمان رخصت ہوئے۔ سرکار اور بیگم صاحبہ نے اپنی خوابگاہ کا رُخ کیا۔ چراغ گل کر دئے گئے۔

"نرگس جھولا ہلاتی رہو۔ دیکھو سونا نہیں" یہ آخری حکم ملتا ہے۔ پھر وہی کمرہ ہے، وہی چھت، وہی سبز روشنی، اور وہی سایہ اُس کے دماغ کو متاثر کرنے کے لئے موجود ہیں۔

بچی پھر رونے لگتی ہے۔ روتے روتے تھک جاتی ہے۔ پھر نرگس کے سامنے وہی بھیانک منظر ہے وہی سڑک وہی لوگ، اس کی ماں نسیمہ اور اس کا باپ شمیم۔ وہ سب کچھ سمجھتی ہے ہر ایک کو پہچانتی ہے لیکن اس نیم بیداری کی حالت میں وہ اس قوت کا اندازہ نہیں کر سکتی جس نے اس کے ہاتھ پیر باندھ رکھے ہیں۔ جس کا بار وہ محسوس کرتی ہے اور جو اسے زندہ نہیں رہنے دیتی۔ وہ اپنے اطراف دیکھتی ہے، ڈھونڈتی ہے کہ کسی طرح اس قوت کا اندازہ کرے تاکہ اس کی بندش سے اپنے آپ کو آزاد کرے لیکن کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ آخر کار، زندگی سے بیزار، تھکی ماندی وہ ایک آخری کوشش کرتی ہے۔ پھر اوسی سبز روشنی کو دیکھنے کے لئے آنکھیں پھاڑتی ہے چیخنے، چلانے کی آواز آتی ہے اور وہ بالآخر اپنے

دشمن کو پالیتی ہے۔

جھولے میں سونے والی اس کی دشمن ہے۔

نرگس ہنستی ہے۔ اس کو تعجب ہوتا ہے کہ وہ ایک معمولی سی بات کو پہلے کیوں نہیں سمجھ سکی۔ سبز روشنی، سایہ ہر ایک چیز اُس کو متبسم نظر آتی ہے یہ خیال اُس کے دماغ میں پیوست ہوجاتا ہے۔ اپنی جگہ سے اٹھکر ہنستے ہوئے وہ ٹہلنا شروع کرتی ہے۔ وہ خوش ہے۔ یہ خیال اس کے لئے باعث شادمانی ہے کہ بہت جلد اس کو اس بچی سے نجات مل جائے گی جو اس کی زندگی کی بے لطفی کا سبب ہے۔

بچی کو مار ڈالنا چاہیئے اور پھر خوب خوب سونا چاہیئے۔ . . . . . .

مسکراتی، آنکھیں مٹکاتی، انگلیاں چٹخاتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ جھولے کی طرف بڑھتی اور بچی کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ فوراً زمین پر لیٹ جاتی ہے۔ اب اس کے دل پر کوئی بار نہیں ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گہری نیند میں غرق ہو جاتی ہے گویا ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو رہی ہے۔

(ماخوذ از چیخوف)

(۲)

نقش شباب

مترجمہ جناب قاضی آرام صاحب (قدیم طالب علم کلیہ)

تعمیری حسن کا ریوسل خوف (رکن مجلس ملکی) نے گاڑی سے اتر کر اس شہر کی زمین پر قدم رکھا جو اُسکا وطن مالوف تھا۔ یہاں کے گرجے کی تعمیر و ترمیم کا کام اس کے سپرد کیا گیا تھا اس کی پیدائش، تعلیم و تربیت اور پہلی شادی اسی شہر میں ہوئی تھی لیکن اب بیس سال کے بعد ریل کے باہر کی دنیا اس کو بالکل اجنبی نظر آرہی تھی۔ اسکی ہر چیز اب متغیر تھی۔ مثال کے طور پر اٹھارہ سال قبل جب کہ اس نے سینٹ پیٹرسبرگ میں جا بسنے کے لئے اس شہر کو خیرباد کہا تھا تو جہاں اب ریل کا اسٹیشن ہے اس جگہ پر لڑکے کھیلا کرتے تھے۔ بڑے بازار میں جہاں اب ایک شاندار چہار منزلہ عمارت "ڈینیبہ ہوٹل" کے نام سے موسوم ہے، ایک نہایت بدنما اور پرانی باڑہ تھی۔ لیکن یہ تمام تبدیلیاں وہاں کے باشندوں کے ذہنی و معاشی ارتقا کے مقابلہ میں ہیچ تھیں ہوٹل کے دربان سے دریافت کرنے پر یوسیل خوف کو معلوم ہوا کہ نصف سے زیادہ اس کے شناسائی مرچکے یا مفلس و گمنام ہوچکے ہیں۔

"میاں دربان کیا تمہیں یاد ہے ایک شخص یوسیل خوف یہاں رہتا تھا جو تعمیری حسن کاری کا کام کرتا تھا۔ وہی جس نے اپنی بیوی کو طلاق دی . . . . جس کا مکان شری بیف محلہ میں تھا کچھ یاد ہے؟"

دربان نے اس سوال کا جواب صرف اس قدر دیا کہ اس کو اس نام کا کوئی شخص یاد نہیں پڑتا۔ "یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایسا سنسنی خیز مقدمہ تمہیں یاد نہ ہو۔ اس شخص نے اپنی زوجہ سے طلاق شاپکن وکیل کی معرفت

حاصل کی تھی یہ واقعہ اس زمانہ میں ہر گاڑی بان تک کی زبان پر تھا۔ وہی وکیل جو اپنی دغابازی اور بدمعاشی کی وجہ سے بدنام تھا جو اپنے ایسے ہی کردار کی وجہ سے کلب میں اچھی طرح پٹا بھی تھا۔ دیکھو غور کرو کم از کم وکیل تو یاد ہی آجائے گا"

"کیا آپ ایوان نکولاچ کو دریافت فرما رہے ہیں؟"

"ہاں ہاں ..... کیا وہ زندہ ہے یا چل بسا؟"

"جی سرکار! خدا کے فضل سے وہ زندہ ہیں۔ وہ تو اب عہدے دار ہیں رجسٹرار کہلاتے ہیں بڑے مالدار اور معزز آدمی ہیں محلہ کرپنی میں ان کے ایک چھوڑ دو دو مکانات ہیں۔ ابھی ابھی انہوں نے اپنی بیٹی کو بیاہ دیا ہے"۔ یوسل خوف نے اپنے کمرہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ اس بیکاری سے تنگ آکر اس نے اپنے دل میں کہا "چلو اس سلسلہ میں شابکن سے ہی مل لیں کیا ہرج ہے"۔ دوپہر کا وقت تھا کہ اس نے اپنے ہوٹل سے نکل کر محلہ کرپنی کی راہ لی اس نے شابکن کو اپنے دفتر ہی پر پایا۔ لیکن اس کو پہچان نہ سکا کہاں وہ ہٹا کٹا چست و چالاک نوجوان وکیل جس کے چہرے سے بدتمیزی اور بدمستی کے آثار نمایاں تھے اور کہاں یہ شخص جو بالکل متین، معمر اور نحیف ہے"

"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں ..... کیا اس قدر جلد بھول گئے میں وہی آپ کا پرانا موکل یوسل خوف ہوں"

"یوسل خوف؟ ..... کون یوسل خوف؟ ..... ہاں!" اب اس ضعیف آدمی کا حافظہ اس کو مدد دینے لگا۔ اس نے اپنے مخاطب کو پہچان لیا۔ لیکن اس پہچان نے ایک قسم کی ازخود رفتگی پیدا کردی اس نے یکساں استعجاب، استفسار اور یاد آوری کے جملوں کی بھرمار کردی۔

اچھا آپ ہیں ..... بھلا آپ کو اس وقت میں یہاں کیسے تصور کرسکتا تھا؟ کہئے آپ کیا نوش جان فرمائیں گے؟۔ شاید آپ کو شیامپین پسند آئے! کچھ ناشتہ بھی منگوالیں تو مناسب ہے؟ عزیز من ان دنوں میں نے کس قدر زر کثیر آپ کے ذریعہ حاصل کیا"

اس غیر مربوط گفتگو کے جواب میں یوسل خوف نے کہا "جی شکریہ۔ آپ کسی قسم کی تکلیف نہ فرمایئے

میں بالکل مدیم العزمت ہوں مجھے یہاں سے سیدھے گرجے جانا ہے جہاں مجھے اپنے کاروبار کے سلسلہ میں چند چیزوں کا معائنہ کرنا ہے۔"

"تو کیا مضائقہ ہے ہم پہلے کچھ تھوڑا بہت کھا پی لیں پھر دونوں ملکر گرجے چلیں گے۔ میرے یہاں خوش قسمتی سے، بہت ہی عمدہ گھوڑوں کی جوڑی ہے میں تمہیں وہاں پہنچادوں گا اور ساتھ ہی گرجا کے پادری سے آپ کا تعارف بھی کرادوں گا۔ آپ بے فکر رہیے۔ . . . . بھلے آدمی یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ کیا اب بھی آپ مجھ سے خائف ہیں اب بھی آپ مجھ سے کھچے رہیں گے۔ آیئے ذرا کرسی قریب کرکے بے تکلف ہوجایئے۔ حضرت! اب مجھ میں وہ اگلی سی کوئی بات ایسی موجود نہیں ہے کہ لوگ مجھ سے سہمے رہیں بیشک ماضی دفن شدہ ہیں میں بے حد عیار اور ایک حد تک چالیہ تھا۔ لیکن اب . . . . . اب تو میں پانی سے زیادہ بے ضرر اور نرم روسبزے سے زیادہ خاک آگین ہوں۔ میں اب جوان نہیں بوڑھا ہوں۔ زندگی مجھ سے دور اور گور قریب تر ہوگئی ہے۔"

دونوں نے کچھ کھا پی کر کوچ میں گرجے کی راہ لی۔

راستہ میں گاڑی میں سوار شاپکن نے قصۂ ماضی کو چھیڑنا شروع کیا۔

"ہاں! وہ بھی کیا مزے کا زمانہ تھا مجھے وہ تمام گئی گذری داستانیں پوری طرح یاد ہیں گو دل ان کو سچا یاد کرنے سے بغاوت کرتا ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ تم نے اپنے شریک زندگی کو کس طرح جدا کیا؟ مجھے اس بیس سال کے عرصہ کے بعد بھی وہ واقعات اسی طرح یاد ہیں جیسے میں نے اس بدنصیب کی طلاق کی درخواست عدالت میں کل ہی پیش کی۔ خدا رحم کرے میں بھی اس زمانے میں کس قدر نابکار تھا۔ میں ایک افترا پرداز شیطان مجسم تھا جس میں بدمعاشی اور پرکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو . . . . . ایسی باتیں گویا میرا مقصد حیات تھیں۔ میں ہمیشہ ہر بدنام کن معاملہ میں ہاتھ ڈالنے آمادہ تھا بشرطیکہ اس میں کافی روپیہ ہضم کرنے کی گنجائش ہو۔ جس طرح کہ میں نے آپ کے مقدمہ میں حاصل کیا۔ مجھے یاد ہے تم نے کس قدر رقم مجھکو اس کار خیر کا محنتانہ ادا کیا تھا۔ شاید پانچ چھ سو یہ رقم تو اس قدر ہے کہ جس سے کوئی بھلا

آدمی بھی ہر قسم کے کام پر آمادہ ہوتا ہے۔ تم نے پیٹرسبرگ جانے سے پیشتر اس مقدمہ کو کلیتہً میرے حوالہ کر دیا تھا یہ تمہارے الفاظ تھے' جاؤ تمہارے جو جی میں آیا کرو' اور تمہاری گزشتہ بیوی صوفیہ مگ بلوفینا باوجود تاجر پیشہ خاندان سے نہ ہونے کے کچھ خود غرض اور مغرور واقع ہوئی تھی اس کو روپیہ کے لالچ پر دوسرے کا جرم اپنے ذات پر منسوب کروانے پر مائل کرنا کوئی آسان کام یا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ جب کبھی میں اس سے معاملہ کی گفتگو کرنے کے لئے اس کے مکان پر ملتا تو مجھ سے مخاطب ہونے کے بجائے اپنی خادمہ کو ڈانٹ کر کہتی' مار نتا! میں تجھے کتنی مرتبہ سمجھاؤں کہ میں بدمعاشوں سے ملنا نہیں چاہتی' میں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے سینکڑوں ہی طریقے استعمال کئے کبھی اس کو طول طویل خطوط لکھتا۔ کبھی کسی نہ کسی بہانہ سے خود مل کر اس کو راضی کرنے کی کوشش کرتا لیکن میری ایک نہ چلی۔ ایک عرصۂ دراز تک یہی تردد اور پریشانی رہی آخر کار تمہارے دس ہزار روپیہ کے لالچ نے خدا خدا کر کے اس بت کو رام کر ہی لیا۔ لیکن وہ بھی ایک دم نہیں بلکہ رفتہ رفتہ کبھی تو وہ اس لالچ کے دام میں پھنس جانے کے خیال سے رونے لگتی کبھی مجھکو اس کا بانی سمجھکر اپنے غصہ کا ہدف بناتی۔ بالآخر اس نے میری استدعا منظور کر لی۔ ۔ ۔ ۔" یہاں پر یوسل خوف نے بات کاٹ کر کہا" مجھے خیال پڑتا ہے کہ میں نے تمہیں دس ہزار نہیں بلکہ پندرہ ہزار دئے تھے"۔

پندرہ ہزار! جی ہاں۔ پندرہ ہزار۔ میں بھولا آپ نے واقعی اتنی ہی رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اس قدر زمانہ گزر گیا ہے کہ یہ سب خواب وخیال نظر آتا ہے۔ کیوں میں آپ کو صاف صاف اپنی کارستانی کا کچا چٹھا نہ سنا دوں۔ اس میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ دس ہزار تو میں نے اس ضدی عورت کو دئے اور باقی پانچ ہزار اس جھنجھٹ کے معاوضہ کے طور پر ہتھیا لئے میں نے تم دونوں کو الو بنایا۔ یہ تو ماضی ہی کی داستان ٹھیری اس کو دہرانے میں میں کیوں شرماؤں؟ آخر میں تم سے نہیں لیتا تو اپنے کارگزار دماغ کا صلہ کس سے پاتا؟ میں نے تم سے اس رقم کو حاصل کیا۔ تم اس زمانہ میں بہت مالدار اور دولتمند بنتے جا رہے تھے اور مرفہ الحالی تمہارا حصہ ہو گئی تھی تمہاری بدگمان طبیعت ہی نے تمہیں شادی پر مجبور کیا اور وہی بعد میں اس طلاق کا باعث ہوئی۔ اس زمانہ میں تم دولت دونوں ہاتھ سے سمیٹ

رہے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ صرف ایک گنّہ کے معاملہ میں تم نے بیس ہزار نقد کمائے تھے بھلا تم سے نہیں لیتا تو پھر کس کی گردن دبوچ کر روپیہ حاصل کرتا اور اپنی ناداری اور عسرت کو عشرت اور فارغ البالی سے بدلتا؟ مجھے اقبال ہے کہ تمہیں دیکھ کر اس زمانہ میں رشک وحسد کی آگ میں جلا کرتا تھا۔ لوگ محض اس لئے کہ تم چار پیسے والے ہو تمہارے آگے آنکھیں بچھاتے تھے اور ایک میں تھا کہ جبّہ جبّہ کی خاطر مجھے سر محفل ذلیل وخوار کرتے تھے۔ لیکن اب ان پرانی قبروں کو کھودنے سے کیا حاصل یہ تو بھولی بسری کہانیاں ہیں۔"

اتنا سننے کے بعد یوسل خوف نے کہا "براہ کرم صرف اس قدر اور سنا دیجئے کہ آخر صوفیہ میری پہلی بیوی نے بعد میں اپنی زندگی کے ایام کس طرح بسر کئے"

"دس ہزار روپیہ حاصل کرنے کے بعد نہ معلوم وہ جنون، غرور، یا ضمیر کی ملامت تھی (جو خود کو روپیہ کے ہاتھوں بیچنے کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی) یا وہ تم سے اس قدر محبت کرتی تھی کہ تمہاری جدائی نے اس کو صدمہ پہنچایا غرض اس نے جیسے کہ آپ کو علم ہے میری طرح شراب کے ذریعہ اپنا غم غلط کرنا شروع کیا۔ ادھر اس کو روپیہ ملا ادھر اس نے فوجی افسروں کے ساتھ گل چھرّے اڑانا اور کھل کھیلنا شروع کیا۔ بدمستی، بدروشی اور بدکرداری ..... وہ کسی میخانہ میں ایک آدھ بانکے افسر کے ساتھ آتی اور بجائے پورٹ یا کوئی معمولی کیف آور شراب کے نہایت تیز و آتشہ جام مل اڑاتی تاکہ نشہ میں اپنے احساس و ہوش کو گم کردے"

"بیشک" یوسل خوف نے تائید کی کہا "وہ اسی قماش کی تھی اس کی انہی بے اعتدالیوں نے مجھکو تنگ کر رکھا تھا" وہ کسی معمولی بات پر اس قدر برافروختہ ہو جاتی کہ خدا کی پناہ .... اچھا خیر آگے کیا ہوا؟"

"ایک ہفتہ عشرہ اسی طرح گزرا۔ میں اپنے دفتر میں دن کے وقت مصروف کار تھا کہ یکایک دروازہ زور سے کھلا اور وہ اندر داخل ہوئی "لے یہ اپنے منحوس روپئے مجھے نہ چاہئے

میں اس کو تیرے منہ پر مارتی ہوا، اس نے روپیوں کی تھیلی میری جانب پھینک دی۔ شاید وہ اب اس بدبخت کمائی سے تنگ آگئی تھی۔ پانچسو روپئے اصل رقم میں کم تھے اور یہی اپنے چند روزہ اسراف میں اس نے صرف کئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا تم نے ان روپیوں کو کیا کیا" یوسیل خوف نے بیچینی سے دریافت کیا۔

"میں نے ان روپیوں کو کیا کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب اس قدر مدت گزر جانے کے بعد حقیقت کا اظہار بھیانک نہیں رہتا۔ اور چھپانے سے حاصل ؟ جی میں نے ان روپیوں کو بھی اپنے الماری میں محفوظ کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں یہ آپ مجھے اس تیور سے کیوں دیکھ رہے ہیں ؟ سنئے تو سہی آخر اس کا انجام کیا ہوا یہ تو ایک عورت کے روحانی کرب و اضطراب کا افسانہ ہے دو مہینہ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ ایک رات میں نہایت مخمور اور خبیث دماغی کیفیت میں اپنے مکان پر پہنچا۔ لیمپ کی روشنی بڑھانے پر کیا دیکھتا ہوں کہ صوفیہ میرے صوفے پر دراز ہے نشہ میں چُور اور بدمست ہے اس کے آنکھوں میں کچھ ایسی چمک نمایاں تھی گویا وہ ابھی ابھی پاگل خانہ سے بھاگ آئی ہے لا میرے روپئے مجھے واپس کر دے میں نے اپنے ارادہ کو بدل دیا ہے مجھے تباہ ہی ہونا ہے تو کیوں نہ دل کھول کر مزے اڑاؤں۔ چل جلدی کر او بدمعاش میرے پیسے مجھے واپس کر دے کس قدر بدتمیزی اور غضب خیز انداز سے اس نے مطالبہ کیا !"

"اور کیا تم نے وہ روپئے واپس کر دئے"

"جی ہاں میں نے اس کو روپئے تو دئے لیکن بیس روبل سے زیادہ نہیں"

"اف کیا واقعی تم نے ایسا غضب کیا !" یوسیلخوف کے ماتھے پر شکن پڑ گئے "اگر تم سے یہ کام ناممکن تھا تم نے اس کو اس کا روپیہ دینا نہیں چاہا تو بھلے مانس کم از کم مجھے تو لکھ دیا ہوتا۔ مجھے اس کا علم نہ تھا۔ آہ میں بالکل لاعلم تھا"

بھائی جان۔ میں آپ کو لکھکر کیا کرتا۔ جب اس کے بعد میں نے خود تمہیں ہسپتال سے

لکھا تو کیا نتیجہ نکلا۔"

"میں اس زمانہ میں اپنی جدید شادی کی تیاری میں اس قدر مصروف تھا کہ مجھے خطوط کی طرف توجہ منعطف کرنے کی مطلق فرصت ہی نہیں ملی لیکن تم کو کیا ہو گیا تھا۔ آخر تم غیر متعلق شخص تھے تم نے ہی اس غریب کی کوئی مدد کی ہوتی؟"

"میرے دوست ہم اس وقت کے حالات کو موجودہ معیار سے نہیں جانچ سکتے۔ ہم اس چیز کو اس روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ اس زمانہ میں یہی چیزیں ہماری نظر میں کچھ اور تھیں۔ آج میں بلا کسی تردد کے اس کو ایک ہزار روبل بھی دے دوں لیکن اُس وقت تو دس روبل بھی دینا مجھے ناگوار تھا۔ وہ روپئے بھی اس نے مجھسے سفت حاصل نہیں کئے۔ یہ ایک سیاہ داستان ہے اس کو جس قدر جلد فراموش کر دیں بہتر ہے۔ لیجئے ہمارا مقام مقصود بھی آگیا۔"

یوسیلخوف اور شاپکن گرجہ کے دروازے پر اتر پڑے اور دور و یہ درختوں کے راستہ سے گزرنے لگے۔ درخت بے برگ تھے۔ قبروں پر کی صلیبیں اور کتبے برف میں ملبوس تھے۔ پتھر کے ہر ہر ٹکڑے پر خوشگوار دھوپ کی کرنیں رقص کر رہی تھیں۔ وہی قبرستان کی معمولی بو سے فضا معمور تھی جس میں عطر کی خوشبو کھدی ہوئی تازہ مٹی کی بو میں سمو گئی تھی۔ "تمہارے ہاں کا قبرستان تو بہت سہانا اور اچھا خاصہ تفریح معلوم ہوتا ہے" یوسیل خوف اس رائے کے جواب میں اس کے ساتھی نے کہا "جی بیشک۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کسی قدر افسوس کی بات ہے کہ یہاں کے چور قبروں کے کتبے تک چرا لے جاتے ہیں۔ ادھر دیکھئے وہ جو لوہے کے ڈھلواں کتبہ والی قبر آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں اسی کے پہلو میں صوفیہ کی بھی قبر ہے۔ کیا آپ اس کو دیکھنا چاہتے ہیں؟"

دونوں دوست سیدھی جانب پلٹے اور گہرے برف کے دل میں قدم ڈالتے ہوئے ڈھلواں لوہے والے مزار تک پہنچے۔

"یہاں دفن ہے" اس نے ایک چھوٹی سی مرمرین تختی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس کو کوئی فوجی یا

کسی اور شخص نے بطور یادگار کے لگوا دیا ہے" یوسیل خوف نے اپنی ٹوپی تعظیماً اتار دی۔ اور ایک صاف چندیا برفباری کا ہدف بننے کے لئے چمکنے لگی۔ اس کو دیکھ کر شاپکن نے بھی ٹوپی اتار دی اور ایک چھوڑ دو چندیا زیر سما ہو گئیں۔ فضا کی خاشی قبر کے سکوت کی طرح تھی۔ ہوا تک بھی گویا مردہ تھی۔ دونوں دوستوں نے نہایت سکوں اور خاموشی سے مرمریں تختی کو دیکھنا شروع کیا اور ان کے دل ماضی کے افسانوں میں گم ہو گئے۔

"وہ محو خواب ہے" کھکر آخر کار شاپکن نے طلسم سکوت توڑ ہی دیا اور اب اس کو مطلق غم نہیں کہ اس نے دوسروں کا الزام اپنی گردن پر لے لیا۔ یا اس نے اپنی زندگی کو کیف شراب کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اقرار کیجئے میرے دوست اقرار کیجئے"

"کیا"؟ یوسیل خوف نے دریافت کیا۔

"کیا! یہی کہ شباب کی نفرت انگیز گھڑیاں خواہ کتنی ہی خراب کیوں نہ گزری ہوں موجودہ حالت سے تو لاکھ درجہ دل آویز تھیں" شاپکن نے اس جملہ کو کہتے ہوئے اپنے سفید بالوں کی طرف اشارہ کیا "اس زمانہ میں مجھے موت کا دھیان تک نہیں آتا تھا اور اگر کبھی بھولے سے خیال بھی آتا تو میں خود میں اس سے مقابلہ کرنے اس پر غالب آنے کی سکت پاتا تھا۔ لیکن ..... آہ اب!"

غم کی گھٹاؤں نے یوسیلخوف کے دل و دماغ کو گھیر لیا۔ وہ اسی جوش و خروش سے اس وقت آنسو بھانا چاہتا تھا۔ جس جوش سے وہ کبھی زیر مزار ہستی سے محبت کرتا تھا۔ ..... اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ آنسو ہی اس کو سکون بخش سکتے ہیں۔ آنسو کے دو قطرے آنکھوں میں کھیلنے لگے گلے میں ایک شئے ہے کہ اٹھی چلی آ رہی ہے۔ گویا "نالے حلق میں چھریاں چبھو رہے ہیں" لیکن شاپکن قریب ہی ہے آخر یہ اپنے دل کی بھڑاس نکالے بھی تو کیونکر! اس کو متین آنکھوں کے مقابلے میں آنسو بہانا کمزوری کی علامت معلوم ہونے لگی۔ آہ یاس و ضع! اس نے وہاں سے ایک دم گرجا کا رخ کیا اور قدم بڑھا کر وہاں پہنچ گیا۔

کامل دو گھنٹے کے بعد اس نے پادری سے ملاقات کی گرجے کے ضروری اجزا کا معائنہ کیا اور شاپکن کو پادری سے مصروف تکلم دیکھ کر اس نے دو رُکے ہوئے آنسو بہانے کے لئے قبرستان کی طرف رخ کیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس مرمریں تختی کی طرف قدم بڑھائے۔ نگاہیں چوطرف تھیں کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ تعویذ لحد اس کو نہایت معصوم، مغموم اور بے پردہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی گویا اس تختی کے نیچے بجائے ایک بے جرم مجرمہ عورت کے ایک بے گناہ دوشیزہ خواب شیریں کے مزے لے رہی ہے۔

یوسیل خوف نے خیال کیا "کاش میں اس وقت دل کھول کر رو سکوں دو آنسو ہی میرے خشک آنکھوں سے نکل پڑیں"۔

لیکن اب لذت گریہ کے لمحے گزر چکے تھے گو اس بڈھے آدمی نے کسی طرح اپنے آنکھوں کو پُرنم تو کر لئے لیکن وہ دل گداز کیفیت اب کہاں۔ وہ بہنے کے لئے مضطرب آنسو وہ گلوگیر نالے اب کہاں اب تو بس ؎

آنسو تھے سو خشک ہوئے دل ہے کہ امڈا آتا ہے
غم کی گھٹا وہ چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دس منٹ کے قلبی طوفان کے بعد یوسیل خوف نے اس کس مپرس تودۂ خاک کو خدا حافظ کہا پھر ایک بار شاپکن وکیل کے ہمراہ تھا۔

(از چیخوف)

کُلیّہ کی خبریں

ڈاکٹر سر محمد اقبال

اس سال جامعۂ عثمانیہ کی جانب سے توسیعی لکچروں (Extension Lectures) کے لئے ڈاکٹر سر محمد اقبال کو مدعو کیا گیا تھا صاحب معزکے تین گراں قدر لکچر فلسفۂ اسلام پر ٹاؤن ہال (باغ عام) میں ہوئے جن میں متعلمینِ کلیہ نے بڑے شوق اور دلچسپی سے شرکت کی۔

پہلے روز جلسے کی صدارت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بالتفاہم نے کی۔ دوسرے روز نواب سرحیدر نواز جنگ بہادر صدر رہے۔ تیسرے روز نواب سرامین جنگ بہادر نے صدارتی فرائض انجام دئے۔

ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر اقبال ان لکچروں کو بہت جلد کتاب کی شکل میں شائع کرکے اپنی اعلیٰ تحقیقات کے نتائج سے مشرق و مغرب کو مستفید فرمائیں گے۔

سر اقبال سے مدیرین مجلّہ اور انجمن اتحاد کے معتمد نے دارالاصناف میں ملاقات کی۔ موصوف دیر تک جامعہ عثمانیہ کے متعلق گفتگو فرماتے رہے۔ مدیرین مجلہ کو اس امر کے معلوم ہونے سے بڑی مسرت ہوئی کہ وہ جامعۂ عثمانیہ اور اس کے مستقبل سے گہری ہمدردی اور دلچسپی رکھتے ہیں۔

ملاقات کے اختتام پر مدیرین نے مجلہ کی جلدیں تحفتہً ان کی خدمت میں پیش کیں جن کو سر موصوف نے بڑی مسرت کے ساتھ قبول کیا۔

ڈاکٹر پیرولی الدین صاحب کا تقرر

مولوی پیرولی الدین صاحب ام۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لا جنکی ولایت سے واپسی کا ذکر گذشتہ نمبر میں تفصیل کے ساتھ کیا جاچکا ہے کلیۂ جامعہ عثمانیہ میں بمشاہرۂ ۱۵۰ مامور کئے گئے۔ یہ تعلیم یافتہ یورپ کا ابتدائی مشاہرہ ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ موصوف کو بہت جلد یورپین گریڈ (۴۰۰ تا ۱۰۰۰) پر ترقی مل جائے گی۔

مسٹر جوشی ام۔ اے کا تقرر

ہماری جامعہ نے مسٹر جوشی کی خدمات سات سال کے لئے بمبئی یونیورسٹی سے مستعار لی ہیں۔ موصوف کا تقرر بہ حیثیت مددگار پروفیسر مرہٹی بمشاہرہ ۱۵۰ تا ۲۰۰ (اللوکی) پر عمل میں آیا ہے۔

حج سے واپسی

ہمارے محترم پروفیسر مولوی مناظر احسن صاحب گیلانی مددگار پروفیسر دینیات و مولوی عبدالباری صاحب ندوی مددگار پروفیسر فلسفہ حج بیت اللہ سے واپس ہوئے اور کلیہ کی روحانی زندگی میں اپنی آمد سے ایک خوشگوار فضا پیدا کردی اللھم زد فزد۔

روانگی یوروپ

مولوی ابن حسن صاحب مددگار پروفیسر تاریخ و مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مددگار پروفیسر معاشیات عنقریب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یوروپ روانہ ہونے والے ہیں۔ ہم ان دونوں اساتذہ کو خلوص دل سے "خدا حافظ" کہتے ہیں

کتبخانۂ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

بوجہ قلت مکانیت کلیہ کا کتبخانہ اپنی سابقہ عمارت سے مولوی پیر صاحب علیقا کے بنگلے میں منتقل کردیا گیا ہے۔ اس نئے مکان میں کافی وسعت ہے اس لئے کتابوں وغیرہ کی شعبہ واری تقسیم پہلے سے زیادہ بہتر ہوئی ہے۔

جماعت ہائے قانون

اس سال قانون کی جماعتیں تطامت منزل سے کتبخانے کی سابقہ عمارت میں منتقل کی گئیں۔ اس عمارت کا زیریں حصہ قانون کی جماعتوں اور کتبخانہ وغیرہ کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے۔

ہندو ہوسٹل

ہندو ہوسٹل نیولین (New Lane) سے "بیت الحیدر" کی نئی عمارت میں

میں منتقل ہوا جو کنگ کوٹھی روڈ پر نظامت منزل کے قریب واقع ہے۔

اقامت خانۂ طیلسانیین گزشتہ میقات کے آغاز میں ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب پروفیسر فارسی نے عہدۂ مودب مقیم اقامت خانۂ طیلسانیین سے سبکدوشی حاصل کی ان کی بجائے ڈاکٹر سید حسین صاحب پروفیسر کیمسٹری مودب مقرر ہوئے۔

برادران کلیہ کی کامیابیاں کلیۂ جامعہ عثمانیہ اپنی خوش نصیبی پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ اس کے فرزند ان معنوی جہاں کہیں جاتے ہیں اپنے علمی ذوق و شوق کا بہت اچھی طرح ثبوت دیتے ہیں۔ ذیل میں ان یونیورسٹیوں اور اداروں کی تفصیل درج کی جاتی ہے جہاں سے ہمارے طالبعلموں نے شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

مانچسٹر یونیورسٹی بحری تار منظر ہے کہ مولوی ضیاء الدین صاحب انصاری ام۔اے (عثمانیہ) نے جو اعلیٰ تعلیم کے لئے ہماری جامعہ سے ۱۹۲۶ء میں یوروپ بھیجے گئے تھے میکانکل انجینیرنگ کے مضمون میں مانچسٹر یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی آنرز کی ڈگری بدرجۂ اول حاصل کی۔

لنڈن یونیورسٹی بحری تار سے یہ خبر موصول ہوئی ہے کہ مولوی سید غلام محی الدین صاحب زور ام اے (عثمانیہ) نے لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ صاحب موصوف نے یہ ڈگری ارتقاء زبان اردو کے متعلق تحقیقات کرنے کے صلے میں پائی ہے۔ وہ فی الحال اور کچھ دنوں تک یوروپ ہی میں قیام کریں گے اور صوتیات و لسانیات میں ڈپلوما حاصل کرنے کی کوشش کریں گے تعطیلات موسمی میں موصوف بلدہ آئے ہوئے ہیں۔

زور صاحب نے اپنے زمانۂ طالبعلمی ہی میں یہ حیثیت ایک مولف کے کافی شہرت حاصل کرلی تھی اور ان کی قابلیتوں کے مدنظر انہیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے وظیفۂ تعلیمی عطا کیا گیا تھا۔

مسلم یونیورسٹی۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی سے امسال حسب ذیل طالبعلموں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ ان طالبعلموں کو سوائے مولوی فضل الدین صاحب کے جامعہ کی جانب سے

وظیفۂ تعلیمی دیا گیا تھا۔

(۱) این رام لال صاحب	ام۔ایس۔سی (طبیعات)
(۲) مولوی فضل الدین صاحب	ام۔ایس۔سی (طبیعات)
(۳) سید عبداللطیف صاحب رضوی	ام۔اے (معاشیات)
(۴) میر ابو طالب صاحب	ام۔اے (معاشیات)

موخر الذکر علیگڈھ میں کتبخانۂ شاخ معاشیات کے کتبخانہ دار بھی مقرر کئے گئے تھے یہ ایسا اعزاز ہے جو صرف محنتی اور شوقین طالبعلموں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

حیدرآباد سول سرویس کلاس

مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایچ۔سی۔ایس کے آخری امتحان میں اول رہے اور سر جارج کیاسن وار کے طلائی تمغہ کے مستحق قرار پائے۔

ان کے علاوہ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے حسب ذیل سابق طالبعلموں نے ایچ۔سی۔ایس کے آخری امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔

(۱) مولوی غوث الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ)

(۲) مولوی غازی الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ)

ان تمام کامیاب ہونے والوں کی خدمت میں ہم انتہائی مسرت کے ساتھ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

فٹبال ٹیم کی کامیابی

سرما کی تعطیلات میں کلیہ کی فٹبال ٹیم اورنگ آباد روانہ ہوئی تاکہ وہاں انٹر میڈیٹ کالج ٹورنمنٹ میں شریک ہو سکے۔ وہاں اس کا مقابلہ انٹر میڈیٹ کالج ٹیم سے ہوا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہماری ٹیم کامیاب رہی اور اس نے کپ حاصل کر لیا۔ ہماری ٹیم انٹر میڈیٹ کالج ٹورنمنٹ میں مسلسل دو سال سے جیت رہی تھی۔ مقابلے کا یہ تیسرا سال تھا۔ کپ کے قطعی طور پر مالک ہونے کے لئے اس سال کی کامیابی از بس ضروری تھی شکر ہے کہ ہماری ٹیم اس سال بھی کامیاب

رہی اور کپ کی ملکیت قطعی طور پر اسے حاصل ہوگئی۔ اس ٹیم کے کیپٹن مولوی سید حبیب اللہ صاحب حسینی متعلم سال دوم اور معتمد مولوی محمد منیر الرحمن صاحب ہیں۔

حبیب اللہ حسینی صاحب کو انٹرمیڈیٹ کالج ٹورنمنٹ کی جانب سے اس سال فٹبال کے بہترین کھلاڑی ہونے کا تمغہ دیا گیا علاوہ ازیں موصوف نے پنگ پانگ کا بھی فائنل جیتا۔

ہم فٹبال ٹیم کو اور حبیب اللہ صاحب کو ان کامیابیوں پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

جناب علی محمد خاں صاحب ام۔ اے (عثمانیہ) نے ٹیم کو پچاس روپیہ کا گرانقدر عطیہ دیا تھا جس کے لئے ہم موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

یوروپی وظائف تعلیمی

اس سال کلیہ کے حسب ذیل طالبعلموں کو یوروپی وظائف تعلیمی دئے گئے

میرزا محمود احمد بیگ صاحب ام۔ اے (عثمانیہ) انجنیرنگ کے لئے

صاحبزادہ میر دوست علی خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) قانون کے لئے (خاص وظیفہ از روئے فرمان مبارک)

مولوی انتصار الدین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) انجنیرنگ کے لئے (خاص وظیفہ)

رسید کتب و رسائل

مجلہ کے دفتر میں حسب کتب و رسائل بغرض ریویو وصول ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں ان پر ریویو کیا جائے گا۔

(۱) مخزن نکات (از قائم چاندپوری) مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب۔

(۲) سلیم۔ از مولوی محمد امیر صاحب بی۔ اے۔ بی ٹی۔

(۳) ہنری چہارم از مولوی وقار احمد صاحب ام۔ اے۔

(۴) پیام تعلیم دہلی

(۵) ادبی دنیا لاہور

(۶) خضر راہ لکھنؤ

(۷) سروش دہلی

اعتذار

ہمیں افسوس ہے کہ بعض ناگزیر اسباب کی وجہ سے اس مرتبہ رسالہ کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق ہوگئی۔ اس تعویق کی تلافی شتر کہ نمبر نکالنے سے کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس سے ہمارے مہربان معاونین کی یک گونہ تشفی ہو جائے گی۔

معاونین کرام کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ مجلہ میں بھرتی کے مضامین شائع نہیں کئے جا سکتے اور ایسے مضامین کی فراہمی جو مجلہ کے معیار پر پورے اتر سکیں کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اگر ہمارے فاضل مضامین نگار ہمارے ساتھ اشتراک عمل کریں اور اپنے قابل قدر مضامین وقت پر دفتر مجلہ میں روانہ کر دیا کریں تو بہت آسانی کے ساتھ بلا تاخیر رسالہ شائع ہو سکتا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ آئندہ سے ہم کو اپنے مضمون نگاروں سے وقت پر امداد مل جایا کرے گی اور ہم بروقت مجلہ کی اشاعت کا انتظام کر سکیں گے۔

ایسے مضمون نگاروں سے جنہوں نے اب تک اپنی قلمی امداد سے مجلہ کو بہرہ اندوز نہیں کیا ہے ہماری پرزور اپیل ہے کہ براہ کرم مجلہ کو جامعہ عثمانیہ کا آرگن تصور کرتے ہوئے اس کی امداد و اعانت کی طرف فوری توجہ کریں اور اس کی صوری و معنوی خوبیوں میں اضافہ کرنے کی ممکنہ کوشش فرمائیں۔ آخر میں ہم معاونین کرام کو اطمینان دلاتے ہیں کہ آئندہ نمبر سے پرچہ کے وقت پر شائع کرنے کیلئے سعی بلیغ کی جائے گی۔

محمد جلال الدین اشک مدیر

تاریخ

تاریخ اور آثار قدیمہ کا سہ ماہی رسالہ

جو مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری کی ادارت میں جنوری ۱۹۲۹ء سے شایع ہو رہا ہے۔ اور اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ ہے۔ حجم کم از کم ۱۰۰ صفحے قیمت سالانہ پانچ روپیہ آٹھ آنہ معہ محصول ڈاک

فہرست مضامین جلد ۱ نمبر (۲)

۱۔ دکن کی علمی ترقیاں سلاطین قطب شاہیہ کے عہد میں

۲۔ دکن میں مسلمان سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات سے قبل

۳۔ سلاطین قطب شاہیہ کے تعلقات خارجہ

۴۔ مشہور مورخ خافی خاں کا کتبہ

۵۔ ملیبار سے قدیم عربوں کے تعلقات

۶۔ تبصرے

پتہ

دفتر رسالہ تاریخ کوٹلہ اکبر جاہ حیدر آباد دکن سے طلب فرمایئے

As he uttered these words he touched a beautiful, silver-mounted Albamin pistol in his firdle. Then he took my hand, and before I could understand what he wanted, he pressed it to his lips and forehead.

When I actually saved his life he failed to find a word of thanks, and now he kissed my hand.

Then for the first time I understood Hamlet's words, when he says that great love cannot permit even a wind to caress the face of a sweet-heart without envy.

When Ferid was taking coffee from someone's hands through a partly open door, I noticed through the opening something that looked like a dream about oriental odalisques, and I felt, as if struck by lightning, the gaze if a big, enchanting eye. I said.

"Ferid, there is something I should like."

"Now, brother be it what it may, it shall be."

I hesitated for a moment, and was merely ashamed, but a desire for adventure was stronger than honesty. Then I said:

"It is not right for your wife to conceal herself when I am your brother! I would like to see her just once."

Ferid, who was pouring coffee for me from a small ibrik, paused for a moment. He looked into my eyes, seriously, camly, and then asked with unusually soft voice:

"Do you really wish it."

Inquisitive and frolisome, I replied:

"Yes, I do."

He became silent, raised his hand to his head, pushed his fez back out his neck, and rubbed his head and face with his hand. Then he bowed before me, staring at the floor, and suldeuly he turned away from me. But I was startled when I saw his face and two big tears which he quickly wiped away.

I saw, in those tears, all the torture he was suffering. I was deeply sorry and said:

"For God's sake, parden me, Ferid; I did not know that I was asking something so hard of you,—I did not know, believe me. I was only joking."

As I was saying this Ferid was weeping. Then he quieted himself and said:

"And your joke nearly cost Zadihe her life!"

"How, for heaven's sake! What had you intended to do?"

"For the second time you have saved my life.... After your eyes had looked at her no other would have ever seen us alive."

As he stood against the wall, erect, tall, quiet, he seemed to me like a hero, a martyr. I felt a chill through my heart. I turned again to the Colonel, who in the meantime ordered the selecting and placing of the firing squad.

"What day and at what hour was Lieutenant Ranchich killed, sir!"

"The day before yesterday, Wednesday, afternoon, until night, Ferid Bey was hunting with me at Blato."

"What, is it possible!" exclaimed the Colonel, evidently disappointed.

"Upon my word as an officer!"

"And those witnesses?

"Lying, like dogs."

"To the gallows with them!

I untied Ferid Bey's arms. His body was shaking like a leaf in mind, and he was unable to speak.

When a litte later, we had coffe together, Ferid told me solemnly:

"Sir, brother, whatever you desire from me, it is yours."

From that time on, we were very close friends. Ferid was dear to me from the first moment and now I was unable to escape the impression of this heroic figure, this ordinary, and at the same time, aristrocratic spirit, and I asked myself:

"Haven't there remained here, on the shores of the Neretva, other Roman relics besides the stone bridges?"

How Ferid, ten years younger than I, did serve me and look after me! He would not allow me to carry either a gun or what I had shot, and when I went to his house he could not make me comfortable enough to satisfy himself, bringing out all the rugs and pillows so that I should sit at ease, and pouring coffee and lemonade and rolling cigarettes for me till I almost became sick.

"If I could only please you..... If I only know what you would like best!" he would say with a sigh.

One day a thought, insane and insolent, came into my head.

As he stood against the wall, erect, tall, quiet, he seemed to me like a hero, a martyr. I felt a chill through my heart. I turned again to the Colonel, who in the meantime ordered the selecting and placing of the firing squad.

"What day and at what hour was Lieutenant Ranchich killed, sir!"

"The day before yesterday, Wednesday, afternoon, until night, Ferid Bey was hunting with me at Blato."

"What, is it possible!" exclaimed the Colonel, evidently disappointed.

"Upon my word as an officer!"

"And those witnesses?

"Lying, like dogs."

"To the gallows with them!

I untied Ferid Bey's arms. His body was shaking like a leaf in mind, and he was unable to speak.

When a litte later, we had coffe together, Ferid told me solemnly:

"Sir, brother, whatever you desire from me, it is yours."

From that time on, we were very close friends. Ferid was dear to me from the first moment and now I was unable to escape the impression of this heroic figure, this ordinary, and at the same time, aristocratic spirit, and I asked myself:

"Haven't there remained here, on the shores of the Neretva, other Roman relics besides the stone bridges?"

How Ferid, ten years younger than I, did serve me and look after me! He would not allow me to carry either a gun or what I had shot, and when I went to his house he could not make me comfortable enough to satisfy himself, bringing out all the rugs and pillows so that I should sit at ease, and pouring coffee and lemonade and rolling cigarettes for me till I almost became sick.

"If I could only please you..... If I only know what you would like best!" he would say with a sigh.

One day a thought, insane and insolent, came into my head.

Ferid,

BY

VLADIMIR TRESCHEC

(A Croatian Writer.)

CAN you imagine a sea of rock? Whenever you cast your eye nothing but rock! White grey, naked rock, high up in the sky; the loftiest pile touching the azure is called Velesh. Below it, between the rocks, a lake, endlessly long, muddy, full of fruitful sand—called Blato.

In the midst of such scenery I became aquainted with Ferid Bey, while waiting, behind a rock, for the fall of wild duck. I heard shots from his gun about two hundred paces away and when it became dark he appeared behind a rock by the light of a young moon; he seemed to me like a giant with a cannon on his shoulder. His gun was longer than a metre and the barrel wider than a child's arm. I smiled to myself, I the owner of a light Lancaster with double barrel. But when I saw Ferid carrying a bag full of ducks, I took off my cap to him and we became close friends. That autumn we found each other nearly every day at Blato. and first at that time Herzeg—Bosnia was up in arms, due to the first military service draft.

"You are a hero"—said Ferid to me.—"when you dare to be alone."

I laughed aloud.

"Is it herosism when one does not care for life? What do I care! Today I am and tomorrow I am not."

"Right," said Ferid, but I saw in my eyes that he was talking tactfully, not being of my mind.

Army officers and Ferid's friends wondered about our comradeship, he a proud Herzegovinian and I a Croatian.

"And they killed him—to death?"

"To death."

Through the youthful and wide-open eyes silence and sorrow stared into darkness, into something unknown, to heart and mind inconceivable.

At the same time on a bench before cottage sat the grandfather grandmother. The last red rays of the sun glowed through the dark foliage in the garden. The evening was silent except for a smothered, prolonged sob, already grown hoarse, which came from the stable. In all probability it was the moaning of the young mother who had gone there to tend the live stock.

The two old people sat deeply bowed, close to one another and held each other's hands as they had not done for a long time. They gazed into the heavenly after glow with eyes devoid of tears, and did not speak.

All lapsed into silence. They seemed tob standing before a great black wall, and beyond it they could not see.

"I'm going to war, too!" unexpectedly announced seven year old Matiche, as if he had swiftly hit upon the right thought.

"You're too small," admonished four year old Tonchek. Tonchek still wore dresses.

Milka, the thinnest and sickliest of them all, who was wrapped in her mother's large shawl and resembled a wayfarer's pack, asked in her soft little voice from somewhere out of the shadows: "what is war like? Tell us, Matiche, tell us that story."

Matiche explained: "Well, war is like this. People stab each other with knives, cut each other down with swords, and shoot each other with guns. The more you stab and cut down, the better it is. "That's war."

"But why do they stab and cut each other down?" asked Milka.

"For the Emperor!" said Matiche, and all were silent.

Then Matiche again swiftly gathered his thoughts, possibly just to dispel the silence which lay so heavy over them. "I'm going to war, too. Against the enemy."

"What is the enemy like? Has he horns?" suddenly inquired the thin voice of Milka.

"Of course he has, else how could he be the enemy?" Tonchek replied seriously, almost angrily. And now, not even Matiche himself knew the correct answer.

"I don't think he—has them," he said slowly, haltingly.

"How can he have horns? He is a person like us," said Loizka, "Only he has no soul."

After a while Tonchek asked: "But how does a person fall in the war? Like this, backward?" And he fell, to show how.

"They kill him to death," explained Matiche.

"Father promised to bring me a gun."

"How can he bring you a gun if he has fallen?" Loizka asked, rather roughly.

Children And Old Folk,

BY

IVAN CANKAR

(A slovenian Writer.)

EACH night, before they went to bed, the children used to chat together. Seating themselves on the ledge of the broad oven, they uttered whatever came into their minds. Through the dim window the evening twilight peered into the room with dream-laden eyes.

Out of every corner the silent shadows drifted upwards, carrying strange stories with them.

They spoke of whatever came to their minds, but to their minds came only pleasant stories of sunlight and warmth interwoven with love and hope. The whole future was one bright holiday. Words were whispered and only half understood. No story had any begining, nor definite form. No story had an end. At times all four children spoke at once, yet none confused the other.

The children bore so marked a resemblance to one another that in the dim twilight the face of youngest, four year old Tonchek, could not be distinguished from that of the ten year old Loizka, the eldest.

That evening, something unknown from an unknown place reached with violent hand into that heavenly light and struck pitilessly among the holidays, the stories and legends. The post had brought tidings that their father had fallen on Italian soil.

"But when will he come back?" asked Tonchek, wonderingly.

Loizka nudged him and and gave him a grieved look "How can he come back if he has fallen?"

زاهد کہ و مسجد چہ و محراب کجائی؟ عید ست و دم صبح مئی ناب کجائی؟
دریا زحباب آبلہ پائے طلب تست نور نظر اے گوہر نایاب کجائی؟
بوے گل و شبنم نسزد کلبۂ ما را صرصر تو کجا رفتی و سیلاب کجائی؟
حشر ست و خدا داور و ہنگامہ بپایاں اے شکوۂ بے مہری احباب کجائی؟
آن شور کہ گرداب جگر داشت ندارد ای لخت دل غرقہ بخوناب کجائی؟
با گرمئی ہنگامۂ خواہش نہ شکیبم آتش بہ شبستان زدم اے آب کجائی؟
چون نیست نمکسائے اشکم بہ فغانم کای زوشنی دیدہ بے خواب کجائی؟
شوریست نوا ریز بہ تار نفسم را پیدا نۂ اے جنبش مضراب کجائی؟

THE ETERNAL QUEST

Who the Zahid, what the mosque, the holy archway, where art thou!
'Tis I'd to-day, the early morn ; the shining liquor, where art thou?

The Ocean deep is flecked with countless bubbles in its search for thee ;
The Glory of Sight, the rarest Ruby, tell me Jewel, where art thou ?

The fragrant rose, the morning dew, they are not for my darkened hut ;
The Autumnal Wind, the Stormy Wave, O tell me : where art thou?

The day of doom, the Lord's Decree, and endeth thus a great uproar ;
Reproach of all the faithless friends—O tell me : where art thou ?

There is no tumult in the whirling vortex of my heart to-day ;
O little heart embathed in blood, that's pure and crimson : where art thou ?

I can't for bear the longing heart with all its fervent heart of love ;
Enkindled is the night chamber, O Water, where art thou ?

My saline tears do not upraise the burning passion of my cries ;
Thou gleaming Light of sleepless eyes, O tell me: Where art thou?

My shattered breaths are like to strings, that air a doleful song of love;
Invisible O the scratching flash of the plectrum—where art thou ?

THE ECSTACY OF YOUTH

بیا بباغ و نقاب از رخ چمن بر کش دل عدو نه اگر خون شود در آذر کش
بیا و منظر بام فلک نشمین ساز بیا و شاهد کام دو کون در بر کش
سمن بجیب غنا از نوای مطرب ریز تتق به روی هوا از بخور مجمر کش
نسیم طرز خرام تو در نظر دارد تو طیلسان روش را طراز دیگر کش
هزار آئینه نازد در مقابل نه هزار نقش دل افروز در برابر کش
گر بباده گرائی قدح زنرگس خواه وگر به سبحه زشبنم به رشته گوهر کش
اله لاله گوے که هاں بسدین قدح دردہ به مرغ گوے که هیں خسروی نوا بر کش
بدان ترانه که ممنوع نیست مستی کن ازان شراب نه نبود حرام ساغر کش
زسرفرازی بخت جوان خویش بیال بروی چرخ زطرف کلاه خنجر کش
نشاط ور زو گهر پاش و شادمانی کن جهاں ستان و قلمرو کشای و لشکر کش
ترا که رفعت که منت کشی زچرخ کبود به قهر کام دل خویشتن زاختر کش

Come to the garden and unveil the glorious park to sight,
The hostile heart to blood-red envy leave.
Come and restle on the winsome arch of Heaven,
Come and embrace the angel of Two worlds.

Scatter the flowers of content through the ministrel's song,
Roof the air with fragrant incense high.
Cool Zephyr keeps thy graceful gait in sight;
Come fringe anew the curling parks of green.

A thousand brandishing mirrors set in front,
A thousand pleasing images place in view.
Woulds't drink ? demand a cup from the narcissus ;
Woulds't count thy beads ? ask pearls of the morning dew.

Say to the tulip, out with a cup of nectar ;
Say to the bird, on with a regal song.
Enjoy the music, allowed by the pious creed.
Drink the wine sanctioned by holiness.

Boast of the exalted youth of Fate and Self,
Flaunting thy blade like headgear against the heavens.
Gain luxury, scatter the pearls, enjoy the life,
Conquer the world, go forth and lead the host,

Who bade submission to the azure heavens ?
Rise wrathful, bid the stars work thy desires.

It was the Voice of Night that came to me yesterday,
A cry from the strings of a tattered mantle on my back,
Saying: " O straw of the fire in the Muazzan's voice
Do not rely on clamour only for giving warmth to life.
No trust can be laid on the learn'ed and the pious,
The one an idle talker, the other a doer in vain ;
Nothing but empty words hallow the decietful creed,
Nothing but colour shines in the blue-mantled crowd.
Abandon the road, walk free, and in the rush
Be not allured with wine, nor yet with woman—
For thus ye rob yourselves of sense and sight.
Steal not a kiss though easy from a virgin
Enraptured ; buy not wine however cheap at the shop."
To pray not, nor be pious is a joyous part of man,
To drink not, as they bid us, a challange to soul's delight.
The result of all this Naught is, not to Be,
I do not talk, nor dost thou listen, in vain.
To me whose hand had been empty of Pious gold
Came the Unknown Voice through my heart enriched,
(As I said I would turn from the coloured to the plain :)
" Lo! take this other way, gaze inward with shielded eyes."
I sprang from myself led on by sense and slight
I left myself with word and deed in escort,
Until I reached a party where I found
To-day's drinking and to-morrow's blood-red slumber.
Yet cloisteral in luminous a luminous sea
The party, wine and kisses, a spring of delight.
The presiding angel whose bower was that banquet,
Enticing with open arms herself and the world.
Like the sun which engilds the dark atom of dust
Was the cup-bearer,—drunk himself and the world enraptured.
Colours out of no colour and unseen through the eyes,
Secrets opened from silence and unheard through the ears.
A drop undropped from the cup, yet reflecting a thousand lines,
A jug of crystal colour, corked and foaming.

Both God and the world can be realised through the mind
Ghalib likes not these gentle voices to die.

Translations from Ghalib

BY

ABDUL QAYYUM M. A. (Osmania.)

THE VOICE OF THE NIGHT

دوشم آہنگ عشا بود کہ آمد در گوش ۱ نالہ از تار رد الے کہ مرا بود بدوش
کاے خس شعلۂ آواز مؤذن زنہار ازپئے گرمی ہنگامہ منہ دل بہ خروش
تکیہ بر عالم و عابد نتوان کرد کہ ہست آن یکے بیہدہ گو این دگرے بیہدہ کوش
نیست جز رنگ دریں طائفہ از رق پوش نیست جز زرق دریں فرقۂ اندر زسرا ے
جادہ بگزار و پریشان رو و در راہ روی بہ فریب می و معشوق مشو رہزن ہوش
بوسہ گر خود بود آسان مبر از شاہد مست بادہ گر خود بود ارزان مخر از بادہ فروش
این نشید ست کہ طاعت مکن و زہد مورز این نہ ساز ست کہ رسوا مشو و بادہ منوش
حاصل آنست ازیں جملہ بنودن کہ مباش مانہ افسانہ سرائیم و تو افسانہ نیوش
منکر بودی کفم از مزد عبادت خالی چون دلم گشت تو انگر بہ رہ آورد سروش
گفتم از رنگ بہ بیرنگی اگر آرم روے رہ دگر چون سپرم گفت زخود دیدہ بپوش
جستم از جاے ولے ہوش و خرد پیشا پیش رفتم از خویش ولے علم عمل دوشا دوش
تا بہ بزمے کہ بیک وقت در آنجا دیدم بادہ پیمودن امروز و بہ خون خفتن دوش
خانقہ از روش زہد و ورع قلزم نور بزمگہ از اثر بوسہ و مئی چشمۂ نوش
شاہد بزم در آن بزم کہ خلوت گہ اوست فتنہ بر خویش و بر آفاق کشادہ آغوش
ہمچو خورشید کزو ذرہ درخشان گردد خوردہ ساقی می و گردید جہانے مدہوش
رنگہا جستہ زبیرنگی و دیدن نہ بہ چشم رازہا گفتہ خموشی و شنیدن نہ بہ گوش
قطرہ ناریختہ از طرف خم و رنگ ہزار یک خم رنگ و سرش بستہ و پیوستہ بہ جوش
ہمہ محسوس بود ایزد و عالم معقول غالب این زمزمہ آواز نخواہد خاموش

What the poet does is to enshrine a unique experience of universal applicability in a few pregnant words of abiding value. The spirit which informs certain isolated distiches that bear the imprematur of universal acknowledgement and have passed into common curreney is the product of their being steeped in the crucible of the poet's imagination. In a time of stress and storm when adverse circumstances assail and over-awe, these words of wisdom exercise a potent influence on the imagination and help, not a little, to assuage the burden of life.

dynamic growth of society has landed us into an era of enlightenment, and we run no risk of worshipping any crude symbolism. It is taking too static a view indeed, to allow the letter of the law to stand in the way of our progress.

It was quite inevitable that the pent-up energy of artistic creation should find its sole outlet in poetic composition. It goes almost without saying that the love of the picturesque is too deeply ingrained in human nature to be suppressed or driven underground. The artistic impulse with almost fatal inevitability was forced into the poetic channel, instead of ramifying over the wide field of the fine arts and seeking fresh words and pastures new.

What is the role of the poet? It is possible to specify his true vocation? The poet according to Emerson is a 'sayer' one who gives expression to the deed-seated laws of our being that await formulation at his hands, and looking back over bygone ages and onwards into times yet to be apprised of

That one far off divine event
To which the whole creation moves.

The poet is untrammelled by any dogma and entirely free from any preconceived notions. He studies things at first hand and after discarding what is dross and commonplace, communicates the central essence. Inasmuch as the message comes from the heart, it goes to the heart and rouses our faded faculties into a sense of divine presence—a presence not to be put by---a presence that dominates and moulds our character on healthy lines.

The inner working of the poe'ts mind is nowhere better illustrated than in the following lines:

The poet's eye, in a fine frenzy rolling
Doth glance from heaven to earth, from earth to heaven.
And as imagination bodies forth
The forms of things unknown, the poet's pen
Turns them to a shape, and gives to a airy nothing
A local habitation and a name

Poetry :---It is common ground that a great mass of poetic literature turned out of late years is, in the main, erotic and has more affinity with the Cavalier school of English poetry which synchoronised with the period of Milton's youth. The so called poets of our own day (barring certain exceptions) are not inspired with 'divine discontent!' Their verse never enables us "to see into the life of things." It is conveniently draped in sensuous imagery and if we try to look beyond the picturesque surface into the inner meaning of the verse, we are forced to conclude that it leads us nowhere. We become conscious of the fact that certain amorous phrases, turns of expression and striking antitheses are the regular stock-in-trade of these writers, and that all this paraphernalia of accessories is employed to delude the fancy for the nonce into believing that something very substantial is being offered. Indeed one hears too often remarked that the nightingale and the rose have been done to death, and although the point has been worn off the simile, it is repeated almost *ad nauseam*.

The reason for this state of things is not far to seek. Of the Fine arts, music, painting and sculpture are ruled out of consideration, owing partly to the difficulty of mastering the technical details and the arduous apprenticeship it involves, whereas everyone who is endowed with the ability of composing a line without infringing the laws of metre, can turn his facile pen to the writing of verse, and partly to the religious ban placed upon them. The latter is perhaps the chief deterrent factor, for the technicalities be they are so great, can be mastered somehow, since the human spirit exhilirates in triumphing out transcendent difficulties. Our religion however discourages any move in the direction of painting and sculpture in as much as a certain type of mind is too prone to fasten on some external symbol, the statue or picture, for instance of a great moral reformer or prophet, and isolating it from its real live context of historical perspective, begins to think of it as something possessing a mysterious influence for good or evil.

Coming as it did at a time when rank materialism and polytheism were rampant, Islam adopted an intransigeant attitude towards all these things which ran directly counter to its fundamental tenet—God is one and indivisible. The prophet was an iconoclast and wanted to make a tabula rasa of the pagan past. In order to guard against the recrudescence of symbolic worship, it was necessary to stamp out altogether the arts that served the purpose. It was almost inevitable in the circumstances to adopt a strong line in dealing with these idolatorous phenomena; but now the lines have changed and we must like wise change our orientation in regard to matters affecting Art. The

That music is the spiritual aliment of mankind and that the mind refuses to be starved of what constitutes the prerequisite of spiritual well-being is clear beyond the shadow of doubt. The sufis who live a life of feeling found in music something intangible that brought them into intimate contact with ultimate supernal verities. It is interesting to note that inspite of the religious ban placed upon musical entertainment the sufis have broken loose from the trammels of dogamtic theology and have found out a way to meet the demands of the aesthetic impulse by discarding the veto. These sufistic utterances because of their being clothed in poetic language pass muster in orthodox circles and are not commented upon; otherwise they could not escape the *odium theologicum* almost proverbial in its bitterness.

It is hard to resist the the temptation to resurrect the lines that Sidney Colvin wrote on the subject: "The torrent of varried and entrancing emotion which it pours along the heart, that is music's achievement and its success. It is this effect whether coupled or not with a trained intellectual recognition.....that has caused some thinkers with Schopenhauer at their head to find in music the nearest approach we have to a voice from behind the viel, a universal voice expressing the central purpose and deepest essence of things, unconfused by fleeting actualities or by the distracting duty of calling up images of particular and perishable phenomena. 'Music,' in Schopenhauer's own words 'reveals the innermost essential being of the world and expresses the highest wisdom in a language the reason does not understand.' "

The last sentence is remarkble because it indicates the antithesis between reason and feeling. In a state of feeling the distinction between subject and object is obliterated. The intellect sets itself over against the world without and is conscious of the externality of sensible things. In a state of ecstatic communion the subject and object are fused as it were, into a harmonious whole which is not capable of further differentiation. Shelley has remarked that "Poetry is not like reasoning, a power to be exerted according to the determination of the will." Only when we are able to derive inspiration from the fountain of the muses, is it possible to compose poetry. The poetic mood comes almost on a sudden, so that the " the conscious portions of our nature are unprophetic either of its approach or departure." We are led to believe that over against reason something essential and primary exists e.g., feeling.

In point of fact music exercises a very potent infuence on the human soul; and though in its pristine purity divested of all extraneous associations it cannot of course be gainsaid that it exalts, purifies and enables us to see some eternal truth emerging from the depths of Being. The soothing effect of music on a poet's mind is nowhere better exemplified than in the case of Coleridge. Says he:

'I could write as good verses now as ever I did, if I were perfectly free from vexations and were in the *ad libitum*' hearing of fine music which has a sensible effect in harmonising my thoughts and in animating and as it were, lubricating my inventive faculty!'

Music as almost everything in this world of appearances is capable of being abused. It has been contended by the purists that, more often than not, the effect of musical entertainment is degrading inasmuch as it is associated almost invariably with feminine pranks and voluptuous gestures. The contention is surely justified but it excludes from our view the other side of the picture. Everything has its bright as well as its seamy side. We must of course, in this as in everything else, select with discrimination the good from the bad, and take our fill of the good things of life and ignore all that does not make for our spiritual betterment.

Musics help us to see things *sub specie aeternitatis*. It transports us into the realm of substance where the categories of our understanding fail of application, where space, time and number are nought. The veil of appearances is rent in twain; we transcend, as it were, the limitations of being and feel that the centre of creation is within and not without us—feel, in short, the essential community of our soul with the Ineffable One of mystic contemplation.

The prelusive note or strain of a symphony causes deep stirrings in the soul and raises us from our sublunary concerns into the celestial sphere of eternal and immutable realities. It is a state of feeling when we experience an elysian glow—a state of feeling which cannot be expressed with anything like articulate coherence. Indeed it is incapable of being transfused into the material medium of words, inasmuch as they are charged with a definite meaning and so cannot convey the mysterious and ineffable reality that lies at the bottom of it. It is the case with almost everything of deep-seated import, with almost every experience that is unique and *sui generis*. The straining after violent metaphor and far-fetched simile, which is so eminently characteristic of sufistic utterances is really the attempt to express the ineffable, to clothe with flesh and blood what is too ethereal to be incarnated.

"the perfection of sensible knowledge." He followed the wolffian tradition and exalted reason at the expense of feeling.

Nature, according to Hegel is not stricltly beautiful. To the fine arts alone beauty belongs. In the hierarchy of spiritnal things, art fills an inferior place and is relegated to the lowest rung of the ladder. Art prepares the ground for the germinal seed to srike root which is ultimately to burst into flower in the higher activities of religion and philosophy. He subdivides art into the symbolic, classic and Romantic. In its early stages the Idea is of necessity vague and indefinite and cannot be adequately shadowed forth. Symbolic Art merely suggests the Absolute. In classical art, however, the evolution of Idea reaches a stage when there is no disparity between the form and the content. Classical art evolves into the Romantic, in which the infinitude of the perfect Idea cannot be adequately expressed, with the result that form and content are rent in twain. The Romantic triad of poetry, music and painting serves to convey the striving of the soul for things spiritual and infinite. We will take up music and poetry, as according to Hegel, they are by far the most ethereal forms of artistic activity.

Music:—That finitude involves imperfection is obvions enough. The world is imperfect, and bristles with paradoxical antinomies and contradictions. Perhaps for an absolute intelligence these contradictions would fade into a higher unity, but for human beings the world is a mass of fragmentary events, co-existing or following each other. The dogma of 'original sin' may or may not be true, but what the philosphers have called metaphysical evil, springing from finitude, forms part surely of our innermost nature. What we want is to break down the barriers of finitude to commingle with Infinite spirit, as water mixes with water. It is then alone that actual felicity can be attained. Everything that is instrumental in bringing us into communication with ultimate reality is to be valued, if not as an end in itself, at least as a means to a highly desirable end.

Music appeals to feeling rather than to reason, to heart rather than to head. As philosphers only too well know, Reason has failed to deliver the goods that we require. Metaphysical discussion tends to pass into verbal subtleties and lacks the glow, warmth and immediacy that charcterrizes the feeling state. Music appeals to the finer sensibilities that defy any attempt at analysis. Indeed it is quite impossible to enter into the holy of holies, except through the ethereal agency of music.

the same conclusion and was at one with Plato on this fundamental point. Art he thought was destructive of all that is best and noblest in the life man. Indeed he levelled his shafts against culture and civilization generally and was inclined to think that they keep us away from the simple life of primitive man. A luxurious and listless life tends to encourage artistiv activity and hinders equally the realisation of the life of spirit. Aristotle was inclined to take a more sympathetic view. The scientist in him impelled to take things at their proper valuation. He had no doubt whatsoever, as to the significance of artistic activity and the place it fills as a harmonizing agency in the life of man. It was his conviction that art brings us into communication with things "divine undivined." Although he alienated himself considerably from the Platonic tradition, the dominating influence of his master told, of necessity, on his mental development. Was he not nearer to Plato when he maintained that art rested on imitation. Painting and sculpture may be classed as imitative in as much as they represent things having their counterpart in the natural world but to include instrumental music, unaccompained by words which play upon the nerves to produce an emotional state of hope or excitement without calling up any specific image, in the same category rests surely upon a misconception of what constitutes the imitative and non-imitative in art. His theory, however, might serve as a corrective to caprice and grotesqueness that is so much in evidence in the symbolic art of Hinduism, which in the endeavour to invest divinity with preternatural attributes transgresses the bounds of Nature.

Plotinus, the fountainhead of mystic inspiration, believed that the effulgence of the Ineffable One enveloped matter in light and reduced it to form. As there are graditions of light and shade, so there are gradations of the Beautiful, the One being beauty itself. So far as divine light was there things were beautiful; if not, not. The ecstatic vision was pre-eminently an aesthetic experience, when the currents of divinity cross and recross through every fibre of our being. Though he was a follower of Plato and tried to synthesize the various elements of his teaching. Plotinus was essentially an independent thinker who tried to impart a mystic tinge to all that came in his way, and did not fail to see that art can convey the intimations of immortality far more perfectly than a study of natural phenomena, pure and simple, can possibly do.

Coming to modern times we notice that the first German philosopher, at whose hands a theory of beauty recieved its formulation was Baumgarten. Over against the dialectical subtlety of formal logic, he set the confused knowledge of the senses and defined beauty as

the dead weight of Platonic tradition was overthrown and human spirit came into its own, the doctrine was allowed to go by the board. The cry of "art for art's sake" has gathered in volume and intensity and has been of late adopted as the watchword of an artistic school that has nothing to do with morality.

It must not, however, lead us to suppose that artistic activity is diametrically opposed to moral sanctions. Not "in chambering and wantonness" but in a spirit of earnestness is the artistic ideal conceived. The artist ofcourse is actuated by a desire to attain immortal things surrounded by a halo of infinity. It is quite obvious that he cannot live up to his self-appointed task, if he were to allow his productions to degenerate into maudlin sentimentality.

It is instru ctive though rather distracting to trace the views of pre-eminent philosphers who seem to us from our vantage-point of the present as so many mile-stones on the road of philosophic inquiry. The variety of opinions is so overwhelming as to lead us into believing that it is impossible to see the wood for the trees. It must not, however discourage us in pursuing our inquiry. The seeming variety might possibly be the result of the diverse manifestations of a single primal essence or informing principle. We must follow *ignis fatuus*, be it ever so elusive and transient, at least for the sake of healthy exercise.

The great philospher in whom Hellenic thought reached its apogee and to whose writings the students still turn with unsatiated appetite as a fountainhead of inspiration was curiously enough averse from believing that art could play a harmonising part and serve as a vehicle of those ideal realities by which, as we know, he set so much store. Plato was influenced by the Heraclitean conception of perpetual flux and thought that everything in the world was evanescent and transitory. As a result of slow and gradual evolution of thought, he ultimately arrived at the conclusion that the world of Ideas is to be exalted at the expense of this visible world. Since it was impossible to know anything in this "lone lorn world" of fleeting appearances, the true object of knowledge, of deep abiding thought was the world of universal Ideas that transcends the spatial and temporal relations that hedge us in. The world is but a shadow of eternal prototypes. The artist tries to convey in words or pigments these shadowy things. The work of art is a shadow of a shadow thrice removed from reality.

Perhaps in his day art had degenerated into gross immorality and he thoght that indulgence in artistic activity might lead to spiritual deterioration. It is interesting to note that Tolstoy arrived at much

The artist then moves about in a world not realized, a world containing the promise and potency of spiritual life. Indeed the life we live bears no affinity to that which lifts us into the realm of spirit.

The world of sense and the world of spirit are supremely antithetical. The former, as is commonly supposed, possesses reality and being, while the latter, as the Sufis have affirmed, can only be described as non-being, where the limitations of our finite nature are annihilated, transcended, taken up into a high unity. Preoccupation with the evanescent and transitory has never been the vocation of the artist; on the contrary he endows the particular and the accidental with the universal.

In the main, however, artistic activity is not imitative, as Aristotle was inclined to think. If it were so the vitalizing play of the artists' fancy would be ruled out as introducing a subjective element into the objectivity of natural facts. What he really endeavours to accomplish is the infusion of the fugitive and impalpable longing for infinity into the representations of natural facts.

We must note, however, the difference of attitude toward Nature adopted by an aesthete and a scientist. The scientist wants to study natural phenomena without the glamour of mystic associations. He tries to rule out altogether the element of personality and throws the cold douche of scientific investigation on everything which he wants to study. His treatment is prosaic and unappealing. It does not tend to produce catholicity of outlook. The aesthete, however, never takes account of the utilitarianism inherent in things. What he wants is to enjoy to the full the beauties of the circumjacent world. He never tries to analyse the component elements of the stuff of which this world is constitued but diverts his attention to whatever is a fit object of aesthetic contemplation. The straining of intellectual faculties characteristic of scientific study is to an aesthete an abomination. He drinks in the beauty of the ensemble of things and leaves the rest to take care of itself. One further distinction between an aesthete and a moral philospher remains to be noted. Moral laws are too stringent in their application and restrict the genial flow of aesthetic emotion that leads us into the realm of fanciful imaginings. It is here that Kant's theory of categorical imperative fails of application. According to it, everything must be subordinated to the connection of duty, even if it leads to the sacrifice of the noblest things in life. Plato when he formulated the conception of his Utopian body-politic was careful to lay down strict ordinances against the exercise of artistic activity. When

Thes facts ars indubitable; they cannot be explained away. That there is a great amount of evil in the world is evident enough and cannot be too much insisted upon. To escape the evil burden something must surely be done; some form of activity must be devised to lighten the unintelligible burden of the world and to give us a respite from the arduous work of willing and knowing. We want a heaven of refuge from troubles and anxieties. Where is it to be found?

Schiller has devised a way of emerging from the impasse in which we are placed. Aesthetic activity, he has pointed out is a gift of God, sent from on high. It is the only kind of activity that stimulates the faculties without burdening them, works them up to a pitch of liveliness without generating undue heat and excitement. It is a calm mood of dispassionate contemplation in which we see the objects of beauty in an interesting and subtle light of mind. It transmutes the dross of common-place experience into the gold of abiding value. At least, it is a consolation to think that life has a saving grace that relieves it from the octopus grip of circumstance and makes it worth living. Even Schopenhauer who read into everything his doctrine of will, was forced to admit that in a mood of aesthetic contemplation, the will itself is in abeyance and does not hamper the free play of aesthetic faculties by the insistent demands and driving forces of its own.

By far the most dominant characterisitic of aesthetic experience is its freedom from passion, from excitement, from anything that tends to throw the mental mechinery out of gear and does not conduce to its harmonious working. Schiller with profound insight into the problem says that "only when man plays is he truly himself." Play signifies a remoteness from bodily embarrasment and grossness of our sublunary concerns. It brings into play the finer sensibilities of our souls, and fuses in a dynamic harmony the discordant elements of our nature.

If all of us are disinterested in our enjoyment of beauty and keep ourselves free from dust and soil, we shall exclaim with wonder as Arnold does.

> How fair a lot to fill
> Is left to each man still!

The exercise of aesthetic activity opens up vast horizons; indeed

> It creates transcending these
> Far other worlds and other seas

in which we may live and move and have our being.

inexorable laws of Nature, and her numerous destructive agencies. Man was forced to feel and be under the stress of disquieting circumstances. A modicum of imagination can help us to visualize the perspiring conditions under which he laboured in order to remove the stumbling stones in the way of his continued existence. It might be thought that he has acquitted himself of the task quite creditably and that the menace at least for us who are living in an age of scientific inventions—an age when the resourcefulness of human ingenuity is bent on harnessing the arcana of Nature for our purposes, dwindles into the unreality of a dream. Nothing could be far from the truth. The Will to struggle is as lively as ever but it has taken a form more subtle and subterranean. The growth of nationalist feeling in different races is a case in point; the bid for hegemony made by Germany to buy a place in the sun that culminated in the great cataclysm, has tended to bring into prominence the futility of utopian imaginings, when the irrational forces are at work under the veneer of superficial decorum. Labour and capital are bent on fighting to a finish and have joined issue openly and frankly. Indeed, we have a good deal about the "dictatorship of the proletariat" and the overthrow of capital. The industrialization of the West is not without its seamy side. Tending machines has turned human beings themselves into mechines. The strain on the system has resulted in physiological deterioration and decrepitude. Such a state of things hastens senescene and madness. Is lite worth living? we ask and ask, and to borrow a picturesque phrase, "our outlook is barred by a gignatic note of interrogation."

Matthew Arnold in his exquisite poem "A Summer Night" speaks of "the old unquiet breast, which never deadens into rest" speaks of men who live in brazen prison, whose lives pass along humdrum lines, who find themselves in a *cul-de-sac* which leads nowwhere who look in vain for the efflorescence of their efforts, and who sink at least into the slough of disappointment. Others more adventurous are no less unfortunate. For a while the adventurer holds on and braves

> The freshening wind and blackening waves
> And then the tempest strikes him; and between
> The lightning bursts is seen
> Only a driving wreck

Are we not tempted to ask with Arnold

> Is there no life but these alone?
> Madman or slave, must man be one?

Artistic Impulse: itsgenesis and florescene.

BY

MOHD. ABDUL HAKIM, B. A., (Osmania)

IT is almost a truism to say that man, so long as he remains truly himself, does not rest content with the mere shows of things. There is that in human nature which transcends the limitations of phenomenal existence. Indeed, there is infinitely more in man's make-up which cannot be visualized through the instrumentality of the discursive intellect. Neither the man in the street, nor the evolutionist who is preoccupied with the study of the externalities of bodily structure and the gradual transformation of species, knows anything about it. The subtle movements of the soul, the longing for infinity, the impalpable congeries of hopes and fears are not susceptible of verbal formulation but have neverthless a potent influence on our conduct—in short, all that

> The world's coarse thumb
> And finger failed to plumb

is buried in the innermost recesses of the mysterious soul. To those who are preoccupied with spiritual things, the life of the flesh seems flashy and insipid; moreover the flesh is heir to troubles and anxieties that perturb, not a little, the equanimity of the spirit. This contemplation of the Infinite supplies the urge towards artistic creation. It constitutes the mainspring from which works of art emanate.

The burden of existence is too heavy to be borne lightly. Practical life makes various insistant demands that constitute as it were a drain on our energies. Life involves action, and action calls for will power to sustain and animate it. The world itself as Schopenhauer has tried to make out is a manifestation of the All-embracing will. We see it in the blind irrational impulses of animal nature, in its strivings to triumph and vanquish and trample underfoot the lower grades of existence. Nature, according to the independent testimony of the evolutionist, is "red in tooth and claw;" the "struggle for existence" has passed into a by-word and one is inclined to think that irrational striving is the very corner stone of the universe. The truth is borne in more intensely than ever when we view in perspective the strivings of humanity to hold its own against overwhelming odds, against the

establish something entirely new in its place; and has formed many colleagues and admirers. But the party in power is in minority. The majority of the Nation, as a rule, has reactionary tendencies. For, as a general phenomnon, our morality and mentality and political systems, laws have been things of growth. The past has always been acting upon the present as an unseen but an unavoidable power. The past is the accumulated wills and works of all mankind that goes to build up civilization. Consquently, civilization is not a work of a day but has its roots deep in the past. Thus no measure of radical change can entirely sweep away the relics of old customs and connections. To crash the present against the past is to crush one's head against a mountain.

Revolution is a violent gust of wind that indulges in a wild frolic and passes away. While reactionary tendencies and the forces of the past are always steadfast, though invisible, yet they sweep away all the new changes along with them when an opportunity arises.

Thus, the modern Revolution in Turkey, rejecting all connection with the facts and ideas of the past, has really cut the ground from under its feet. The present order will vanish, sooner or later, like a madman's dream. As Cromwell's scheme was split up, so also the present revolution of Turkey will go down. On these grounds we can say that the present Revolution of Turkey is transitory and delusive.

The name of Kamal Pasha is on all men's lips: his valour, his military talents, tact and ability are everywhere extolled. He is hailed as the saviour of Turkey and is justly proclaimed one of the greatest soldiers of the age. He is a successful administrator too. But to call him a great Reformer, we cannot shut our eyes to the state of prevalent abuses in Turkey that are caused by his action.

To sum up, as an administrator he sits on the pedestal, as a soldier, he soars to the zenith, while, as a reformer he remains at the nadir.

We admire him as a zealous soldier, like him as an adequate administrator, extol him as an ethusiastic patrot and liberator but dislike him as a reformer and denounce him as a destroyer of civilization and Islamic culture.

HAMIDUZZAFAR.

of the army and navy. He can declare war with the consent of his cabinet and make treaties subject, in certain cases, to the ratification of the assembly.

Turkey had become involved in the sphere of foreign influence. The foreign yoke was severe: the national liberty was sacrificed. The whole of Turkey was plunged in profound gloom and terror reigned at Constantinople. As a result, an out burst of patriotic indignation made the Turkish Nation rise like one man against their foreign enemies: ande Mustafa Kamal Pasha at the head of the nation won a miraculous series of victories. Thus a sudden turn of fortune's wheel raised him to power and dignity. The very Mustafa Kamal Pasha, who once was the exponent of theories about the importance of democratic form of government and as such the national welfare, discarded all his thread-bare nations with Islamic culture and civilization, and so attained the pinnacle of his glory. That is to say, though the National Assembly is constituted on a democratio basis, yet the helm of the government is in the hand of one man—Mustafa Kamal Pasha. Because, his iron-will is the only voice that rules the Assembly : and his is the pen that paints the fate of Turkey. Moreover, Mustafa Kamal Pasha is making his Nation acquire the civilization of the West at the cost of the feelings of the majority of the Nation and of Islamic culture and civilization. Now, he is the *de facto* sovereign of Turkey: the presidency is converted into a dicatatorship. Thus the fate of Turkey is being held in his hands and as long as he rules over the party in power, the government will remain under his firm grip.

The party in power in Turkey calls Mustafa Kamal Pasha the great reformer. But acting as a reformer he utterly fell short. He blindly puts faith in Western society and civilization. He is too optimistic about western social life. He made his nation acquire all the virtues and vices of the West. The veil is lifted from the face of the women, the dress is changed, the standard of living has become high and religion has given place ot diplomacy.

Mustafa Kamal put forth the theory that as Turkey was a cosmopolitan country, a radical change in every sphere of life was necessary. First of all religion was sacrifed, for it was considered as an utter failure in leading a nation. Latin alphabet is introduced in every department of the government. All this, it is asserted, goes to gain universal unformity of order in the country, although at an enormous cost.

Mustafa Pasha, like the most violent rebels against the past, has attempted to destroy every thing belonging to the past and to

a blind eye to the doings of the British when they arrested the Turkish leaders. The dreaded blow fell even sooner than was expected. The National Assembly issued a pact in November 1922 that the National Assembly alone should have, thereafter, the control of Turkey.

The successor of the Ottoman Dynasty was considered only as a Caliph devoid of any political power or control. But, subsequently, Sultan Wahiduddin proved himself a political traitor. Thus closely pressed, he threw himself into the arms of the British. This facilitated the National Assembly's announcing herself as the pivot of the Republic Government in Turkey.

Thereafter, Abdul Majid was selected as Caliph without having been given any political power. But as the Caliphate was considered as an obstacle in the way of the Government, the former was effaced altogether from the Turkish world in March 1924. Then Caliph Abdul Majid met the same fate as his predecessor.

THE NATIONAL ASSEMBLY

The preseut Constitution---Turkey has a republican form of Government. The chief organ of the Turkish Government is the. National Assembly. The executive, legislative and judicial powers of. the Republic are vested in it. It is an indirectly—elected committee of the Nation. The voting age is 18. Criminals, minors, bankrupts and persons in military or naval service do not possess the right of franchise, Each citizen thirty years old is eligible for election, except those who are disqualified from being voters or those who are illiterate. Its members are elected by direct vote for four years.

The National Assembly has the power to revise the Constitutional laws when it deems necessary.

THE PRESIDENT.

The President is elected by the Nationl Assembly and holds office for four years. He is eligible to be re-elected. He has a ministry of his own. The president is the executive head of Turkey and as such he is responsible for the civil administration and appoints all the members of his cabinet or the ministry. He has no seat in the assembly He is denied the power of veto on legislation, though he may demand a reconsideration of any bill by the assembly. If it is, again, passed by a majority in the assembly, it becomes law forthwith without requiring the president's signature. The president is also the commander-in-chief

Thus the success of the National Party was assured. But to achieve real success, the National movement had to undergo a great loss, which filled the Turks with indignation and dismay.

What has a drowning man more to catch at than a straw? The British influence in Turkey was on the wane. To strike finally, the British forces took possession of Constantinople, arrested the National Leaders and oppressed them with violence. This catastrophe came like a thunderbolt to the Nation. Kamal Pasha and his party could not shut their eyes to the state of affairs and began to feel grave disquietude. Anyhow the Kamalist Party mustered courage and returned to Angora to take energetic steps against the English without delay. With great difficulty it succeeded in assembling a parliament there. It was the first time that this parliament was called the National Assembly. There it revised and put in force, for the second time, the National Pact. Hence Turkey was divided into two governments, viz--the one in Constantinople under the ministry of Damad Farid Pasha and in the hands of the Allies, i. e., English, French and the Greeks; and the another in Angora under the presidency of Mustafa Kamal Pasha and the National Assembly.

This was the greatest crisis the Kamalist Party had ever to face. Resolved to die rather than to surrender to the yoke of the Allies, the Kamalist Party first turned towards the Greeks to take them to task for their violence and misdeeds. The Kamalist Party bent the National energy to procure an army and implements of war. Thousands and thousands gathered under the Crescent. They fought with the courage of despair and sallied forth with such an impetuous fury that the enemy fled before them in utter confusion. Thus the Greeks were driven, bag and baggage, out of the territories of Turkey.

The Second Peace Conference Then a Peace Conference, the second, was summoned. It goes by the name of the Lausanne Conference. This Conference bears great weight in International history. It settled the boundaries of the states between Turkey. and other states; decided also the transaction about the commercial and material success of Turkey. And lastly the foreign capitulations came to an end.

To sum up, Turkey was recognised as an independent state in Anatolio as well as in Eastern Thrace wherein Constantinople lies. The National Assembly established her independence, and the Caliphate Government was abolished. The Sultan of Turkey became a mere puppet whose strings were in the hands of the British. He turned

Greece and the National movement in Turkey:—According to the Peace conference Smyrna had fallen in May 1919 to the lot of Greece. consequently, the Greek forces burst into Smyrna like a torrent bringing death and destruction in their train. They oppressed the civil population of Smyrna and committed terrible atrocities and shameful butcheries. This raised the passions of the Turks to the boiling point. The idea of casting off the Greek yoke was ingrained in every heart. This gave occassion to the National movement that was progressing with acceleration. Thus the hopes of the Allies were dashed.

The National movement had already begun there and was ripe at this critical movement. All of a sudden, an efficient and born soldier, stimulated by the love of his country, entered upon the stage of National activity. This zealous soldier, with all his might and fervour gathered all the scattered Turkish forces under the Crescent. The National movement was fully confirmed and gradually matured under his leadership. This reverened Saviour is the world-renowned Mustafa Kamal Pasha.

He rose by various steps to become Inspector General of the Eastern territories of the Turkish Empire. There he realised the need of equipping a trained army. After making there some preliminary preparations he held the first congress in July 1919. It laid down the foundation of the present National society.

Later a second congress was summoned in the same year. It appointed an excutive committee under the presidency of Mustafa Kamal. Consquently, Angora was made the seat of the congress. Mustafa Kamal Pasha and the new National Party became intensely popular. As a result, this party came out successful in the parliamentary election with a great majority in 1919. Thereafter, a meeting was called upon in Angora that passed the famous National Pact of Turkey. This pact is the basis of the present National Movement. Its fundamental principles were in effect to safeguard constantinople, and to maintain full liberty in internal affairs.

But then, a new obstacle was thrown in its way. The British raised an objection that unless this Turkish assembly was held in Constantinople, the universally accepted capital of Turkey, they would not recognise it. Then a meeting was called upon in Constantinople. There the Parliament sanctioned again the Pact in January 1920.

on a sound basis of Nationalism. But the following events stand as evidence that this was blown to the winds. The struggle for liberty between the government and the Nation gave the Non-Turkish element full scope to proclaim themselves independent. To crown these misfortunes, the great powers around were bent on the destruction of Turkey.

Tripolitan and Balkan War:—The Balkan Dominions drew all the European Provinces situated to the west of the Danube, from the Turkish circle; Bulgaria declared her independence in 1908; and Austria-Hangary annexed Bosnia and Herzegonnia in 1908. The result was the Tripolitan War and the Balkan War of 1911 and 1912-13 respectively.

The great War:—A year and a half had elapsed since the Balkan War, when Turkey had to plunge out of the frying pan into the fire of the Great War in 1914. Partly because Russia looked on Turkey as an enemy, and partly owing to British policy, Turkey threw her lot along with Germany into the European conflagration.

Subsequently, Britain, France and Russia made a secret contract in March 1915. It effected constantinople; the Basphorus coast, the European coasts on the sea of Marmora and the Dardanells were to be ceded to Russia: and all the Islamic Holy Places were set aside from Turkish sway as having independent government of their own. Furthermore, the same powers, succeeded in rousing an insurrection, on a religious basis, in Hijaz against Turkey. As a result the whole Ottoman Empire was shattered to pieces.

To sum up, the treaty which put an end to the Great war in October 1918 made Turkey accept very unfavourable terms. Then Turkey presented a melancholy spectacle. Everywhere the public mind was troubled, the future was contemplated with dismay and the past recalled with regret.

Every neighbouring power sought only means to wrest from her a share of her territories.

The Treaty of Sevres:—The enemies of Turkey determined to sea her fate by the Treaty of Sevres in August 1920. This arbitrary Treaty left Turkey stripped of many of her fertile territories. Accordingly, Mesopotamia and Palestine became British Mandatory States; Armenia and Khurdistan in the East were made independent. And, finally the Greeks got Eastern and Western Thrace as a reward for their help offered to the Allies. So the whole of Turkey was reduced to constantinople and a small and unfertile part of Asia Minor.

Modern Turkey.

"WAR undoubtedly has its own value. It breeds courage, loyalty, self-reliance and patriotism." All these characteristics were focussed in their full vigour in the last few years by Turkey. For a century and a half Europe has set a standard of National greatness by attaining the culmination of its material success. Turkey being very conservative and reactionary had been lurking in the back-ground. Yet, she discarded altogether the European influence and power within a very short time: which is almost a marvellous metamorphosis!

The Ottoman Empire, which was established at the close of the 13th century, extended, by degrees, to the whole of the Balkan Peninsula, including a large part of central Europe, Northern Africa, Egypt, Asia Minor, Mesopotamia, Syria and Palestine. So it was considered to be one of the greatest powers of the world. Its constitution was based on absolute monarchy.

In the latter half of the 19th century a change came over Turkey The absolutism and autocracy of the Ottoman Emperors made the Nation demand reforms in the constitution. Sultan Abdul Hamid II, the then Emperor, promised to safe-guard the rights of his subjects and to establish a parliamentary government. But the promised reforms were not realized. The Nation still smouldered under the Hamidian absolutism. At last, to end the tyrannical yoke, an insurrection broke out under the leadership of that great outstanding figure Anvar Bey in 1908. Eventually Sultan Abdul Hamid bowed to the inevitable. A parliament was summoned and the constituional government was established.

Nevertheless fire yet smouldered beneath the ashes ready to be fanned into a flame. Discontent with the existing order was prevalent and it seemed that by the pressure of circumstances society was impelled towards a revolution. The Nation wanted to replace the ruling government with an Occidental Polity, so as to effect a close union between the Crown and the Turkish and Non-Turkish elements

Sometimes robbers and thieves are worshipped as heroes.

As a reward for his services, the king gave the hand of his daughter to the thief-prince, and made the prince the real heir and the successor to his throne. Now the thief-prince became the king of two countries and was happy in the company of his wife, the beloved of his father and father-in-law. The prince-thief ruled over his dominions and all his subjects were happy and prosperous.

the gardener, came where the guard had stood. The guards seeing such a horrible sight fled for their lives. The prince put the head near the deadbody and ran off to his place.

When it was day the guards saw a head near the deadbody and reported to the king. The King asked them how it had happened, and they told him what had occurred and also about the pandit. So a search was started for the pundit, but it was in vain. Then the king was very angry with the guards and punished all of them.

At last it was counselled to put the deadbody on the cross-road. If any one was seen weeping over the deadbady, he should be arrested.

When this news reached the ears of the wife of the gardener, she the told the prince that she would go to see the last of her husband. The prince told her not to go there, but if she wanted to go, she should not weep. She asked him how it would be possible for her to see such a sight and not weep. Then the prince told her to go in disguise as a milk-maid and to carry with her a basket in which there should be milk and butter. But when she chanced to see the horrible sight of the deadbody of her husband, she should drop the basket on the ground and weep for the loss of her milk and butter. He said: "If they who are on guard arrest you, say that you are not weeping for the dead man, but for the goods you have lost." She consented to do so and did as she was directed. But when she wept, the guardians arrested her and brought her into the presence of the king. She told the king that she was not weeping for the dead man, but because she lost the foundation of her livelihood. Then the king set her free and awarded her a hundred gold coins.

At last the daughter of the minister, who was very beautiful and clever, took upon her head the burden of arresting the thief herself. She announced that whoever would come before her palace and consent that he had commited murder, she would become his wife but she was also cheated by the prince and was not successful in her aim.

Then the Sheriff of the city took the responsibility. The prince went to him in disguise as a woman and made him drink the juice of hemlock, and he was found unconscious in the morning.

In short the king himself resolved to find out the culprit but was cheated by the prince in such a way that he was compelled to give the crest, the horse and the royal robes.

the gardener, came where the guard had stood. The guards seeing such a horrible sight fled for their lives. The prince put the head near the deadbody and ran off to his place.

When it was day the guards saw a head near the deadbody and reported to the king. The King asked them how it had happened, and they told him what had occurred and also about the pandit. So a search was started for the pundit, but it was in vain. Then the king was very angry with the guards and punished all of them.

At last it was counselled to put the deadbody on the cross-road. If any one was seen weeping over the deadbady, he should be arrested.

When this news reached the ears of the wife of the gardener, she the told the prince that she would go to see the last of her husband. The prince told her not to go there, but if she wanted to go, she should not weep. She asked him how it would be possible for her to see such a sight and not weep. Then the prince told her to go in disguise as a milk-maid and to carry with her a basket in which there should be milk and butter. But when she chanced to see the horrible sight of the deadbody of her husband, she should drop the basket on the ground and weep for the loss of her milk and butter. He said: "If they who are on guard arrest you, say that you are not weeping for the dead man, but for the goods you have lost." She consented to do so and did as she was directed. But when she wept, the guardians arrested her and brought her into the presence of the king. She told the king that she was not weeping for the dead man, but because she lost the foundation of her livelihood. Then the king set her free and awarded her a hundred gold coins.

At last the daughter of the minister, who was very beautiful and clever, took upon her head the burden of arresting the thief herself. She announced that whoever would come before her palace and consent that he had commited murder, she would become his wife but she was also cheated by the prince and was not successful in her aim.

Then the Sheriff of the city took the responsibility. The prince went to him in disguise as a woman and made him drink the juice of hemlock, and he was found unconscious in the morning.

In short the king himself resolved to find out the culprit but was cheated by the prince in such a way that he was compelled to give the crest, the horse and the royal robes.

The Thief Prince

BY

ABU TURAB ALI SIDDIQI.

IT is said, that in the divinity of God and in the reign of Mohammad, the prophet, there was a king, who had no child. One day by chance when he was looking his face in the looking-glass, he saw a white hair in his beard. On seeing this he became very sad, and said to himself: "Though I am so old that there are white hairs in my beard, yet I have no son to be king after me." After this he called for the astrologers to tell him whether he would beget any children or not, or if he would, when? The astrologers after a long meditation told him that he would beget a son after a year. The king was very pleased at this and gave them rewards. After a year he begot a child.

The prince from his very infancy was naughty, clever and quite a genius. When the prince was two years old, he began to steal the things of his nurses and his ladies-in-waiting. And he began to put the things belonging to one in the boxes of others and vice versa. When he was twelve years old, he had learnt all the sciences and arts and was very dexterous in the use of the lance, swordsmanship and shooting.

One day the prince sat near the king, who inquired of him about his stealing things. On hearing that, the prince kept silent. The king laughed at him and in good humour told him that all those actions were of no matter, but he would call him a real thief, if he could steal the crest, the horse and the robes of the neighbouring king.

When the prince was near the realm of that king, he took off his own dress and clad himself in the dress of a servant, as usually worn in those days. When he reached the king's city, he entered a Sarai. He stayed there for several days in search of a post. After many day's search, he came to know that there was a post for him as *Taster* of the king's drink. The salary for that post was a hundred rupees. The prince gladly accepted it it and began to do his work.

A month or two passed, when he began to know the places where the royal robes and crests were kept. He used to live in the

The Thief Prince

BY

ABU TURAB ALI SIDDIQI.

IT is said, that in the divinity of God and in the reign of Mohammad, the prophet, there was a king, who had no child. One day by chance when he was looking his face in the looking-glass, he saw a white hair in his beard. On seeing this he became very sad, and said to himself: "Though I am so old that there are white hairs in my beard, yet I have no son to be king after me." After this he called for the astrologers to tell him whether he would beget any children or not, or if he would, when? The astrologers after a long meditation told him that he would beget a son after a year. The king was very pleased at this and gave them rewards. After a year he begot a child.

The prince from his very infancy was naughty, clever and quite a genius. When the prince was two years old, he began to steal the things of his nurses and his ladies-in-waiting. And he began to put the things belonging to one in the boxes of others and vice versa. When he was twelve years old, he had learnt all the sciences and arts and was very dexterous in the use of the lance, swordsmanship and shooting.

One day the prince sat near the king, who inquired of him about his stealing things. On hearing that, the prince kept silent. The king laughed at him and in good humour told him that all those actions were of no matter, but he would call him a real thief, if he could steal the crest, the horse and the robes of the neighbouring king.

When the prince was near the realm of that king, he took off his own dress and clad himself in the dress of a servant, as usually worn in those days. When he reached the king's city, he entered a Sarai. He stayed there for several days in search of a post. After many day's search, he came to know that there was a post for him as *Taster* of the king's drink. The salary for that post was a hundred rupees. The prince gladly accepted it it and began to do his work.

A month or two passed, when he began to know the places where the royal robes and crests were kept. He used to live in the

Welsh proverbs, and this contemporary criticism disparages even the conclusions of Kant which I have already quoted. Lord Haldane says:

"The very loftiness of the motive which makes a man think more of the interests of his neighbour than of himself, or that bids him sell his goods and give the price to the poor in obedience to an inward call, renders that motive in the highest cases incapable of being made a rule of universal application in any positive form.

To make it so would trench on the freedom of other persons to seek and follow the dictates of their own consciences.

That was why Kant's attempt failed, the attempt to lay down on the canon for all conduct that it should conform to an obligation to act at all times from maxims fit to be universal rules. When this was worked out in relation to human society it appeared that such maxims could be no more than merely negative, and must prove inadequate as guides to daily life."

These words are not easy. In simpler language they mean this: We can never make a body of maxims our guide in life if we are striving to lead the loftier kind of life. For that kind of life must be regulated by the highest kind of reason of which man is capable, the reason dictated by the human conscience working freely.

Now the training of the human conscience is the highest kind of education man can attempt, and the most difficult, just because it is not a matter of plan or schedule, but a spiritual process. Science cannot achieve it any more than philosophy, but both can greatly help. Indeed help can come from any side, even from what we regard as the most trivial sources.

To my mind it is only the highest poetry which can most deeply affect the human soul, and by the highest poetry I mean that possessing a quality of ascension which may be found in every constructive human activity, in the conduct of life itself as well as the forms of art. And so it often happens that in our school or college life we get little or nothing of the higher education, because there we submit to being led, and we never really act of our own impulse, which is the only way we can learn the reality of things. It is not passive acceptance of teaching, not the memorizing of conclusions reached by others, but something very different—which is education. It can best be suggested by a word which has been associated with every upward movement or advance of mankind,—and that word is *Adventure*.

Welsh proverbs, and this contemporary criticism disparages even the conclusions of Kant which I have already quoted. Lord Haldane says:

"The very loftiness of the motive which makes a man think more of the interests of his neighbour than of himself, or that bids him sell his goods and give the price to the poor in obedience to an inward call, renders that motive in the highest cases incapable of being made a rule of universal application in any positive form.

To make it so would trench on the freedom of other persons to seek and follow the dictates of their own consciences.

That was why Kant's attempt failed, the attempt to lay down on the canon for all conduct that it should conform to an obligation to act at all times from maxims fit to be universal rules. When this was worked out in relation to human society it appeared that such maxims could be no more than merely negative, and must prove inadequate as guides to daily life."

These words are not easy. In simpler language they mean this: We can never make a body of maxims our guide in life if we are striving to lead the loftier kind of life. For that kind of life must be regulated by the highest kind of reason of which man is capable, the reason dictated by the human conscience working freely.

Now the training of the human conscience is the highest kind of education man can attempt, and the most difficult, just because it is not a matter of plan or schedule, but a spiritual process. Science cannot achieve it any more than philosophy, but both can greatly help. Indeed help can come from any side, even from what we regard as the most trivial sources.

To my mind it is only the highest poetry which can most deeply affect the human soul, and by the highest poetry I mean that possessing a quality of ascension which may be found in every constructive human activity, in the conduct of life itself as well as the forms of art. And so it often happens that in our school or college life we get little or nothing of the higher education, because there we submit to being led, and we never really act of our own impulse, which is the only way we can learn the reality of things. It is not passive acceptance of teaching, not the memorizing of conclusions reached by others, but something very different—which is education. It can best be suggested by a word which has been associated with every upward movement or advance of mankind,—and that word is *Adventure*.

"The best is the enemy of the good." But when Emerson says:

"A good intention clothes itself with sudden power," we at once feel inclined to try it. Let me give you a few of these stimulating passages.

1. One belongs to one's race and country, even when one reacts against one's race and country.

E. Renan

2. Life is sweet, brother, said Jasper....
   There's day and night, brother, both sweet things; sun, moon and stars, all sweet things; there's likewise a wind on the heath.

G. Borrow

3. As for friends lost (though I believe it not),
   A man is nourished by his enemies
   No less than by his friends.

Herbert Trench

4. We ought to realise that every deed and thought and word of ours is shaping some nucleus and cell in the higher organism of humanity.

Walter Rathenau.

5. Man by opening himself at will to new areas of stimulation, is hereby determining his own higher evolution.

Sir J. C. Bose

6. Tomorrow morning, if you choose to take up a spirit of such power, you may rise like soul without a past.

James Martinean.

7. Why does man go out to look for a god?
   It is your own heart beating, and you did not know; you were mistaking it for something external.
   He, nearest of the near, my own self, the reality of my own life, my body and my soul,—
   I am Thou and thou art Me.

Swami Vivekananda

And, last of all, this magnificient appeal from Swinburne :---
"There must be someone on the side of the stars!

Welsh proverbs, and this contemporary criticism disparages even the conclusions of Kant which I have already quoted. Lord Haldane says:

"The very loftiness of the motive which makes a man think more of the interests of his neighbour than of himself, or that bids him sell his goods and give the price to the poor in obedience to an inward call, renders that motive in the highest cases incapable of being made a rule of universal application in any positive form.

To make it so would trench on the freedom of other persons to seek and follow the dictates of their own consciences.

That was why Kant's attempt failed, the attempt to lay down on the canon for all conduct that it should conform to an obligation to act at all times from maxims fit to be universal rules. When this was worked out in relation to human society it appeared that such maxims could be no more than merely negative, and must prove inadequate as guides to daily life."

These words are not easy. In simpler language they mean this: We can never make a body of maxims our guide in life if we are striving to lead the loftier kind of life. For that kind of life must be regulated by the highest kind of reason of which man is capable, the reason dictated by the human conscience working freely.

Now the training of the human conscience is the highest kind of education man can attempt, and the most difficult, just because it is not a matter of plan or schedule, but a spiritual process. Science cannot achieve it any more than philosophy, but both can greatly help. Indeed help can come from any side, even from what we regard as the most trivial sources.

To my mind it is only the highest poetry which can most deeply affect the human soul, and by the highest poetry I mean that possessing a quality of ascension which may be found in every constructive human activity, in the conduct of life itself as well as the forms of art. And so it often happens that in our school or college life we get little or nothing of the higher education, because there we submit to being led, and we never really act of our own impulse, which is the only way we can learn the reality of things. It is not passive acceptance of teaching, not the memorizing of conclusions reached by others, but something very different—which is education. It can best be suggested by a word which has been associated with every upward movement or advance of mankind,—and that word is *Adventure*.

In Western literature, which is expansive rather than repressive, I believe this negative spirit is rarer than the positive and constructive.

Balzac said: "Be neither confidential, nor commonplace, nor overeager,—three rocks ahead."

Emerson: "Do not make life hard for any."

And Arnold Bennett: "Never show a wound, and what is better, never feel one.

All such negative injunctions are liable to become what we call pious resolutions: we read them and approve of them, and then—forget them. It seems to me that we get more help from the positive rules: we can at any rate try to follow them as far as possible. I will mention here a few of the more striking I have come across in my reading. You will see what an improvement most of them are on the Welsh proverbs I began with.

1. The greatest thing of the world is for a man to know how to be his own. *Montaigne*

2. The only path of escape known in all the worlds of God is performance. *Emerson*

3. When you are afraid to speak, speak up! *R. L. Steven on*

4. Beyond thyself shalt thou build. *Nietzsche*

5. The whole of the day should not be daytime; there should be one hour, if no more, which the day did not bring forth. *H. D. Thoreau*

6. Evil is like a nightmare; the instant you begin to strive with it, to bestir yourself, it has already ended. *J. P. Richter*

7. Don't look at life so much as a problem; it is most likely, far simpler. *Anton Chekhof*

To these I add three rules which connect human conduct with the rythms of nature.

Shakspeare said: speak frankly as the wind.
Emerson: Live as on a mountain.
And Michael Artsibashf: Live as the bird flies.

Very few people nowadays would be content to adopt as their guide through life a collection of those old proverbs. We require our teaching to be connected with some personality, as the main religions of the world are so connected, and when a man whose own life is a noble example feels moved to preach to us we listen to him gladly and treasure his sayings. The help we get from the writings of such men as Carlyle, Brownning and Ruskin has something much more valuable than the impersonal half-truths of proverbs: it has the glow of personality, and often of recognizable personality.

There are golden rules both negative and positive scattered every where through modern literature. Sri Rama Krishna has said:

"If thou livest in the world make thyself feared and respected. Do not injure any one, neither be thou injured by any one."

And a little more than a century ago Kant preached the same lesson: "Never be any man's servant. Let not your rights be trampled under foot! accept no benefits which you can do without. Bear yourself bravely, and shun unworthy complaints over suffering. Kneel to no one, for the ideal is within yourselves."

And he laid down this golden rule: "So act that the rule followed by thee may be a universal law, and that every human being is treated as an end, and not merely as a means."

In 1894 in France the Union for moral action proposed to its members a certain number of rules to be observed, some of which come very near to Indian practice. Among them were these.

> "We would make known in our own persons the usefulness of rule, of discipline, of resignation and renunciation; we would explain the creative part which suffering plays.
>
> We would wage war on false optimism and on the base hope of happiness coming to us ready made; on the immoral and anti-social multiplication of our wants.
>
> We would preach affectionate simplicity in our relations with inferiors and insignificant persons.
>
> We forbid ourselves all seeking after popularity.
>
> We forbid ourselves the use of sarcasm.

"To Browning I owe everything. He taught me the dignity and the work of life by demonstrating that nothing is trivial or meaningless; he revitalised my faith at a time when it was becoming dead, by showing me that spiritual progress is the very essence of living, and that for one who so wills it there can be no defeat."

The great peoples of the world can be distinguished by the methods and results of their thinking out the meaning of life and of their ordering it. The most elaborate of these systems which are known to us are those of India with its network of caste, and feudal Japan. Western systems are radically different; European peoples emerged from the guild system long since: they believe in increasing independence, in discovering rules for themselves they feel that a method thought out by themselves has far greater dynamic value than a tradition, and this spirit has been one cause of Western advance by evolution or revolution and also a cause of the instability of Europe compared with China.

Thus we find that while the literature of the East is full of ancient wisdom, and no wise saying is despised as commonplace, in Europe people get tired of what they have often heard: they regard it as sheer laziness to rely on other people's ways of saying things instead of on one's own; and there is a constant effort to achieve individual expression. So it happens that a great deal of modern wisdom is but a new expression of old truth, and this itself is not a bad thing. Experience has infinite variety and should be expressed with infinite variety. For many of our writers commonplace is the great sin, and so the world of Western literature is marked by constant energy. Classic calm is rare, and the energy often degenerates to mere restlessness, but freshness is given by the variety.

It is often very interesting to come across parallels in old and modern thought independently arrived at, or between Eastern and Western thinkers who have had no contact. The other day in class we were reading how Keats speaks of the 'negative capability' of Shakespeare, meaning that Shakespeare was perfectly content that there should be unsolved problems in the world, and did not feel himself called upon to attempt their solution. The very same evening I accidentally came on a passage where the Persian poet Jalaluddin Rumi says:

> "Avoid entangled thoughts, that you may find their explanation in Paradise."

And one of my Mohammedan pupils tells me that this is quite a familiar point of view in Persian poetry.

As comments on life proverbs form a primitive part of literature, sometimes even prehistoric. They have survived not only owing to their partial truth and fitness as, admonition and weapons in verbal warfare, but because they are sharpened by rhyme or assonance.

We generally know them isolated, but they pass into literature, as in the plays of the Greek tragedians. When they are main charateristic of any kind of literature, it is known as gnomic.

As Rules of life they form a part of individual or social ethics. It is of this side that I should like to speak now.

We may say, by a very rough analogy, that just as words are built up into thoughts, so proverbs, the concentrated wisdom of our ancestors, are transformed into philosophy. A man who has command of words may learn to build them into thoughts by the activity of his mind: a man to whom proverbs appeal may learn to go beyond them and discover principles and passages to higher interpretation of life.

When we leave school and become students in a College we are in the midway stage between this ready-made inherited knowledge, which depends upon our memory, and the higher power of philosophy, which enables us to act on our own initiative.

Of course we do not throw overboard this wisdom we have learnt from our forefathers,—we remember the best of it; and it often happens that the memory of one or some of the maxims saves a man and makes his life fruitful and of service to his fellows.

We even add to this ancient wisdom, and search for more. One of the writers we have been studying in class, J. A. Froude, says: "Piety, like wisdom, consists in the discovery of the rules under which we are actually placed, and in faithfully obeying them."

You will notice that Froude does not say *in the learningof the rules*, but in their *discovery*, which makes all the difference.

Proverbs are anonymous wisdom. For the past two thousand five hundred years wisdom has been signed,—we attribute it to individuals, and in all literatures there are writers who are known for their power of formulating rules of life: we call them didactic writers. In some countries they play the robe of prophets: in modern times we find them as creators of literature, men like Goethe, Carlyle, Ruskin, Browning, Tolstoi and Iqbal. Writers like these transform the moral life of whole nations. Some years ago an American student who was sent to Oxford as a Rhodes scholar wrote these words about Browning :

Silence is a tumult to the timid.
All songsters are brothers.
He cannot judge who cannot listen.
None is wealthy but one that enjoys it.
No good will come from long sleeping.
Nothing is heavy but earth.
Necessity will break a law.
A town will extinguish a wilderness.
It is better to open than to contain.
Two parts of a work is the beginning.
The best name is *I own it.*
The play is best when left off.
A lazy man is the devil's walking stick.
The coward is afraid of his shadow.
A whistle for a child, a plough for a man.
Drink will pull off the mask.
The best religion is mutual charity.

Each of these proverbs might be extended into a sermon or a book, and just of such things sermons and books have often been made, sometimes to our edification, more often to our regret. Old proverbs are children of truth,—never the whole truth, only a part, or, as we should say today, facets of the truth.

They come from different fields of thought, and they vary much in value. Some are psychological notes, some suggestions for action; some are condensed reprobation, some cunning hints, and some contain higher wisdom.

Such proverbs represent the popular wisdom of the ancient world: their like are found in all countries,—in India, England, Russia, and among the Eskinos,—as well as in the old literature of the Greeks, Chinise and Arabs. There is not one of us in this city, weherever in the four continents he may come from, who does not remember a stock of these proverbs learnt of his nurse or his grandmother.

They are so numerous that an English writer of two centuries ago, Georeg Savile, said of them:

> "When a man looketh upon the rules that are made he will think there can be no faults in the world; and when he looketh upon the faults, there are so many he will be tempted to think there are no rules."

Some Welsh Proverbs

BY

E. E. SPEIGHT

BEING A PAPER RECENTLY READ AT THE HINDU HOSTEL

OF

OSMANIA UNIVERSITY.

THE purpose of this paper is to illustrate the advance made in human judgment since the days when folklore was supreme,---the passage of primitive ethical judgment into the richer content and setting of modern thought. I have chosen some sayings from the speech of a very lively remnant of the old Keltic race, a people who made their presence felt in all parts of Europe two thousand years ago, because they are likely to be less familiar than those of other Western peoples. Here are the proverbs, and with the first three I give the original Welsh, from which a little of its relationship to other Western languages will be apparent.

Two parts of a road is knowing it.
(Denbarth ffordd ei gwybod)

There is no sea without land beyond.
(Nid mor heb dramor)

He that would be top, let him be a bridge.
(A fo pen lid pont)

Children of truth are old proverbs.
He is the wisest who has not trusted to his own wisdom.
He who has distributed heaven has received.
Better than learning is innate sense.
The apple will not fall far from the tree.
Let the ingenious hide his design.

SOME WELSH PROVERBS

ERRATA

Two articles from the pen of one writer would not have been allowed room in this issue had we not hoped to publish it three months ago, at a time when, owing to examinations, contributions were as rare as cool moments. I regret that I had no opportunity of seeing proofs of this paper, and that a number of errors have crept in and apparently refused to be ejected. It is astonishing how the word *magnificent* is being superseded in the East by a form which rhymes with *deficient*, as if in return for many Oriental words wrongly spelt in English.

BLACKWOOD'S MAGAZINE recently reported of some one:

"He sat for the Examination, but his arithmetical ideas were like the English auxiliary verbs, either irregular or defective or both, and in his spelling he was 'too independent in his speculations to be orthodox in his conclusions.'"

And one of my colleagues has a spelling test of which a possible version is: 'A harrassed pedler met an embarassed cobler in a scemetary gazing with unparalled ecstacy at the simitry of a marriagable ladies ancles.'

The eleven mistakes in this sentence give us a multiple proof of the need for every student to possess at least the Oxford Pocket Dictionary, and to use it freely.

There are no lovable mistakes here, as when a student told me his baby was creeping on all *floors*; no constructive ones, as in the statement of another student that Tokyo was the *capacity* of Japan; no 'fascinating command of the wrong words in exactly the right places' (to quote Mr. G. M. Hoyt), as when someone spoke of treating a person with cool *content*. Good proof-reading is becoming a lost art: we no longer find books like that edition of Shakespeare so carefully printed that the publisher was safe in offering £50 for any mistake discovered.

E. E. S.

P. 195	l. 12	should be Deubarth	P. 199	l. 7	should be Browning
„	l. 16	„ bid	200	l. 7	„ one.
196	l. 29	„ Eskimos	„	l. 29	„ rhythms
„	l. 30	„ Chinese	„	l. 30	„ Speak
„	„	„ wherever	„	l. 32	„ Artsibashef
„	l. 34	„ George	201	l. 2	„ rhythmic
197	l. 3	„ Fitness as admonition	„	l. 16	„ This
„	l. 6	„ the main	202	l. 26	„ Martineau
„	l. 34	„ role of prophets	„	l. 34	„ magnificent
198	l. 2	„ worth of life	203	l. 1	„ Somebody
„	l. 12	„ themselves;	„	l. 18	„ fight shy
			„	l. 22	„ Something
			204	l. 11	„ as the canon

tramping over five feet of snow. During these electric waves, the points of dry twigs were tipped with a smoky blue flame, and sometimes bands of this bluish flame encircled green trees just below their lower limbs. I looked at the compass a few times, and though the needle occasionally swayed a little, it was not affected in any marked manner.

The effect of the electrical waves on me became less as I descended, but whether from my getting below the electrical stratum, or from a cessation of the current, I cannot say.

But I did not descend much below eleven thousand feet, and at the lowest point I crossed the south Poudre, at the outlet of Poudre Lake. In crossing I broke through twice and received a wetting, with the exception of my right side above the hip. Once across, I walked about two hundred yards through an opening, then again entered the woods, on the south-easterly slope of Specimen Mountain. I had climbed only a short distance up this slope when another electrical wave struck me. The effect of this was similar to that of the preceding ones. There was, however a marked difference in the intensity with which the electricity affected the wet and the dry portions of my body. The effect on my right side and shoulder, which had escaped wetting when I broke through the ice, was noticeably stronger than on the rest of my body. Climbing soon dried my clothes sufficiently to make this difference no longer noticeable. The waves became more frequent than at first, but not so strong. I made a clumsy climb of about 500 feet, my muscles being muscle-bound all the time with rigidity from electricity. But this climb brought me almost to timber-line on Specimen Mountain, and also under the shadow of the south part of it. At this place the electrical effects almost ceased. Nor again did I seriously feel the current until I found myself out in the sunlight which came between the two peaks of the mountain. While I continued in the sunlight I felt the electrical wave, but, strange to say, when I again entered the shadow I almost wholly escaped it.

When I started on the last slope towards the top of North Specimen, I came out into the sunlight again, and I also passed into an electrical sea. The slope was free from snow, and as the electrical waves swept in close succession, about thirty seconds apart, they snapped, hummed, and buzzed in such a manner that their advance and retreat could be plainly heard. In passing by me, the noise was more of a crackling and humming nature, while a million faint sparks flashed from the stones (porphyry and rhyolite) as the wave passed over.

As I lay on the snow gazing upward, I became aware that there were several flotillas of clouds of from seven to twenty each, and these were moving toward every point of the compass. Each seemed on a different stratum of air, and each moved through space a considerable distance above or below the others. The clouds moving eastward were the highest. Most of the lower clouds were those moving westward. The haze and sunlight gave colour to every cloud, and this colour varied from smoky red to orange.

At two o'clock the haze came in from the east almost as dense as a fog-bank, crossed the ridge before me, and spread out as dark and foreboding as the smoke of Vesuvius. Behind me the haze rolled upward when it struck the ridge, and I had clear glimpses whenever I looked to the south-west. This heavy, muddy haze prevailed for a little more than half an hour, and as it cleared the clouds began to disappear, but a gauzy haze still continued in the air. The feeling in the air was not agreeable, and for the first time in my life I felt alarmed by the shifting, rioting clouds and the weird haze.

I arrived at timber-line South of Poudre Lake about 4-30 p. m. aud for more than half an hour the sky, except in the east over the foothills, was clear, and the sunlight struck a glare from the snow. With the cleared air there came to me an easier feeling. The oppressiveness ceased. I descended a short distance into the woods and relaxed on a fallen tree that lay above the snow.

I had been there but a little while, when---Snap! buzz! buzz! buzz! ziz! ziz! and electricity began to pull my hair and burn around my ears. The electricity passed off shortly, but in a little while it caught me again by the hair for a brief time, and this time my arm momentarily cramped, and my heart seemed to give several lurches. I arose and tramped on and downward, but every little while I was in for shocking treatment. The electrical waves came from the south-west and moved north-east. They were separated by periods of from one to several minutes in length, and were about two seconds in passing. During their presence they made it lively for me, with hair pulling, heart-palpitation, and muscular cramps. I tried moving speedily with the wave, also standing still and lying down, hoping that the wave would pass me by; but in each and every case it gave me the same stirring treatment. Once I stood erect and rigid as the wave came on, but it intensified suddenly the rigidity of every muscle to a seemingly rupturing extent, and I did not try that plan again. The effect of each wave on me seemed to be slightly weakened whenever I lay down and fully relaxed my muscles. I was on a northerly slope, in spruce timber,

Electric Storms

BY

ENOS MILLS

[Enos Mills was employed by the Hydrographical Department of the U. S. A. Government as State Snow Observer, and his duty was to wander along the top of the Rocky Mountains, which he did unarmed and generally alone. He met with many adventures, but the following description of his experiences in electric storms is probably unique in literature.]

THE day before the Poudre flood, I travelled for eight hours north westerly along the top of the Continental Divide, all the time being above timber-line and from 11000 to 12000 feet above sea-leve .

The morning was cloudless and hot. The western sky was marvellously clear. Eastward, a thin dark haze overspread everything below ten thousand feet. By 9-30 a. m. this haze had ascended higher than where I was, and the snow on which I walked, though it had been frozen hard during the night, was soggy and wet. At this time a calm that had prevailed all the morning gave way before an easy intermittent warm breeze from the South-east. About 10-30 several heavy clouds rose from behind Long's Peak, moving toward the north-west, rising higher into the sky as they advanced.

The wind, at first in fitful dashes from the South-east, began to come more steadily and swiftly after eleven o'clock, and was so warm that the snow softened to a sloppy state. The air carried a tinge of haze, and conditions were oppressive. It was labour to breath. Never except one deadly hot day in New York, have I felt so overcome with heat and choking air. Perspiration simply streamed from me. These oppressive conditions continued for two hours, and while they lasted my eyes pained, ached and twitched. There was no glare, but only by keeping my eyes closed could I stand the half-burning pain. Finally I came to some crags and lay down for a time in the shade. I was up 11500 feet and the time was 12·20.

Then he read some Persian lines, dealing with the Sufi's view of God and the fatalism of the world.

We replied that the study of any literature or science does not turn a man into a *dahraya* or non-believer. We asked him whether the Prophet had not bidden us: "Seek knowledge, though it be in China." But his answer was that the knowledge referred to it that which purifies the soul and connects man with the Supreme Being. Then a facetious friend asked whether the taking of opium and the smoking of tobacco is not a sin according to the precepts of the Prophet. The company began to laugh, but the old man turned pale, and seemed almost at his wits' end. He was a smoker of the old-fashioned *Chutta*, and was obviously an opium eater. With a perplexed and harassed voice, he said: "Merciful God will forgive me."

Then the same friend said: "Merciful God will forgive us too, if only our mind is pure. What harm if we read English and Science? We adopt new fashions because they are pleasing and interesting to us, not with the purpose of revolting from god and the law of the Prophet".

After this the old man kept silent, realising his mistake. We mused, and when the meal was ready we took it with greater pleasure.

The Old and the New

IT happened so that the last winter vacation was a time of religious festivals, the month being Rajab. In this month the Muslims here observe festivals in honour of the Saint Imam Jaffari Sadig, not according to any religious injunction but merely as a thing traditional and customary. Delicious sweets are prepared and friends are invited. As this ceremony is not, strictly speaking, related to any particular date, the festivals last the whole month through, and every day we have invitations from others. Thus the leisure of the vacation is redoubled by the happiness of the occasion.

One day I had an invitation from a relative of mine. Along with some friends I went to him in the morning. Though it was already eight, it was cool, and the sun had not risen high. We had to wait a little, as the food was not yet ready, nor had all the guests assembled.

Meanwhile an old gentleman appeared. He was rather tall, but his back was bent as if by some heavy burden. He had a cap on his head, which was of course bald, and his beard was small and sparse. He was of a dark brown colour, and the marks on his face were like deep furrows, showing that he was very old and careworn.

Some of my friends knew this man perfectly and used to tease him. They purposely began to talk of the absurdity of old fashions and of traditional ceremonies. The old man was also drawn into conversation with us. He said that this was the age of disbelief and materialism, and began to reproach the new ideas, frequently quoting lines from Sadi or Rumi. While he was thus excited, we in turn continued to dwell upon the greatness and excellence of new ways and the new education.

"All poetry," he said, "came to an end with the great Persian poets. By reading English your brains have been turned out; you cannot recognise the greatness of our old poets. You read science and become *Sais* (grooms): the study of this fatal science has led you astray from the ways of God and the Prophet. You are becoming more and more materialistic and agnostic."

PLATE XVIII

توان کرد ن تمام عمر را مصروف آب وگل - که شاید یکد می صاحبد لی د روی کند منزل

TRANSLATION

"The whole life is worth devoting to water and clay, so that perchance a man of piety may repose in it for a while."

ساختم ایں خانه را تا د وستی منزل کند - ورنه عاقل عمر خود کی صرف آب وگل کند

(25) This inscription has been omitted in the history of Bijapur.

XIX. This is inscribed on Bare Saheb's well near the Police station, opposite the town gate. The characters are in coarse Nastaliq and much obliterated. I read it thus :---

PLATE XIX

۱ — بڑی صاحب نامدار سعید - زتوفیق حق ساخت حوضی جدید
۲ — بہ طول وبہ پہنای چون سلسبیل - نمود او بوقف امام شہید
۳ — حسن سال تاریخ او باز گفت - بنوش آب لعنت بکن بر یزید
۱۲۱۷

TRANSLATION

1. "Bare Saheb (who is) celebrated and august, by the grace of God built a new reservoir.

2. "In length and extensiveness it is like 'Salsabil' (a fountain in Paradise) He endowed it in the name of Martyr Imam (Husain).

3. "Hasan, said the chronogram of its erection, drink water and curse on Yazid (26) 1217" (A. H.)

S. A. ASGAR BILGRAMI

(26) Son of Mu'aveya.

XVII. This tablet of black basalt is now lying in the record room of the Tahsildar of Udgir. It originally belonged to the bath of Mahmudi or Ahmadi Bagh which was to the west of the town, but is now in complete ruins.

It was transferred from there by the late Nawab Framurz Jung (23) My reading of the inscription is as follows.

PLATE XVII

۱ — بحر جود و فیض حسام الله خاں — آنکه نام نامیش لطف علی
۲ — ساخت حوضی بس وسیع و با صفا — می کاید همچو جام صیقلی
۳ — گوی صافی برد چون زا مثال خود — شد از ان رونام او کوثر قلی
۴ — بهر تاریخش رضا چون فکر کرد — ها تفش گفتا بآواز جلی
۵ — پنج عدد از پنجتن کیر و بگو — بانی کوثر قلی لطف علی
۱۱۶۳

(23) He was the Commissioner of Medak and author of many interesting monographs on the history of the Deccan. His History of Udgir Fort has been freely utilized by the author of the History of Bijapur Kingdom, which has been frequently referred to by me in this article.

1. "Hisamullah Khan, better known af Lutfe-Ali, is an ocean of beneficence and liberality.

2. "Built a reservoir, which being superbly spacious and neat, appears like a polished cup.

3. "As it surpassed in neatness others of the same lik, it assumed the name of Kousar Quli.

4. "When 'Riza' reflected about its chronogram, the Divine conjurer said in loud voice:

5. "Subtract five numerals from 'Panjtan' (the holy five) and say: 'Builder of Kousar Quli' is Lutfe Ali 1163" (A. H.)

XVIII. This inscription is on the western facade of Andheri Mahal, but it originally belonged to the 1st House of Baghe Hisam and was below XVI. The first (24) portion of this is lying in the Haveli of Nawab Nasir-ud-Dowlah Bahadur in Bidar and will be dealt with among the inscriptions of Bidar. According to the History of Udgir Fort by Nawab Framurz Jung page 33, it was lying in the Tahsildars's office in 1313 A. H. My reading of the 2nd portion, which is in good Nastaliq, is as follows:---

TRANSLATION

"Hisamuddin Khan (22) who is an object of munificence, built a garden which in its pleasantness is like Paradise. From the invisible speaker a voice comes in the ear, that the chronogram of its erection is Baghe Nau:" (New garden) (1059 A.H.) (1649 A.D.) .

XV (c) (lst from left)

PLATE XV (c)

۱ — ابن نظام الدین خاں
۲ — ابن غیاث الدین علی آصف خاں
۳ — ابن آقا ملا ابن بدیع الزمان ابن
۴ — بدر الدین حسن القزوینی نور الله مضجعهم

TRANSLATION

1. "Son of Nizamuddin Khan.
2. "Son of Ghiyathuddin Ali Asaf Khan.
3. "Son of Aga Mulla son of Badi-uz-Zaman son of
4. "Budruddin Hasan of Qazvin, May God illuminate their sepulchres."

(22) After Mughal Khan he became Qiladar of Udgir in the 30th regnal year of Shah Jahan and was given the title of Khane Jahan. Hisamuddin Khan's sister was married to Itimadud Dowla Mirza Ghiyath Beg, whose daughter Mehrun-nisa better known as Nur Jehan was the beloved wife of Emperor Jahangir. He was a descendent of Shaikh Shahabuddin Suhrwardi and the son of Nizamuddin Khan.

XVI. On the green reservoir of the basement wall on the East, in the lst house of Baghe Hisam.

PLATE XVI

۱ — بحساب جمل باغ نویکهزار و پنجاه
۲ — و نه هجری می شود مطابق
۳ — جلوس همایون سنه بیست و یک

TRANSLATION

"According to the reckoning by Abjad (aggregate of) Baghe Nau comes to one thousand and fifty nine Hijri. Corresponding to the August regnal year twenty-one.

PLATE XIV

۱ – علی اللہ فی کل الامور توکلی
۲ – و بالخمس اصحاب الکساء توسلی
۳ – محمد المبعوث و ابنیہ بعدہ
۴ – و فاطمۃ الزھرا و المرتضی علی

TRANSLATION

"I depend (with confidence) in all matters upon God, and have recourse to the five Apostles of the Cloak, *viz.* Muhammad the prophet and his sons (Hasan and Husain) and Fatimatudhahra and Murtaza Ali."

XV (a) These are from the lst house of Baghe Hisam (3rd from left).

PLATE: XV (a)

۱ – در زمان شہ آفاق ستان صاحبقران ثانی
۲ – باعث امن و امان شاہ جہان
۳ – باد گیتی ز سحاب فضلش
۴ – تا ابد تازہ تر از باغ جنان

TRANSLATION

In the reign of Emperor Shah Jehan, the 2nd lord of happy conjunction, who subdues regions and who is the generator of peace and tranquility. May the world by the bounties of his grace be more sublime than Paradise:"

XV (b) (2nd from left)

PLATE. XV (b)

۱ — ساخت باغی بفرح بخشی ملک
۲ — مظہر فیض حسام الدین خان
۳ — بہر تاریخ وی از ھاتف غیب
۴ — باغ نو آمدہ در گوش روان (سنہ ۱۰۵۹)

3. "When I enquired the chronogram of its erection, Wisdom said: This mosque will be a source of general abundance (to mortals) 1152 (A.H.) (1739 A.D.)

4. "In the name of God, the Beneficent, the Merciful".

5. "God. Muhammad. Ali."

XIII. This is on the Bechi's well, which has three steps and is about 2 feet deep. near Khwaja Dargah.

PLATE XIII

۱ – یا اللہ یا محمد یا علی

۲ – قل انک انا

۳ – اعطینا ک الکوثر

۴ – سنہ ۱۱۵۱ – سنہ ۱۱۵۲

۵ – امام زماں قاسم کوثر آمد (۲۱)

TRANSLATION

1. "O Muhammad! O God! O Ali!

2 & 3 "Said unto thee. we have bestowed on thee the Kousar (a nectar-flowing river in Paradise)

4. "The year 1151(A.H.) (1738 A.D.) The year 1152 (A.H.) (1739 A.D.)

5. "The Apostle of the age,(who is) distributor of the Kousar came."

(20, 21) These two inscriptions have been entirely omitted in the History of Bijapur.

XIV. BAGH HISAM

Hisam Bagh which was built by Hisamuddin Khan Quladar 1059 A.H. is situated about a mile to the south west of thetown and is now surrounded by cultivated fields.

This Arabic inscription is fixed on a green tablet high upon the wall facing the East on the floor above the basement, in the Ist house (Bara Mahal) of Baghe Hisam. It is a two storied building of old Persian style raised high on a vaulted basement, with an octagonal cupola at the top commanding a good view.
(Last from the left)

TRANSLATION

"The chronogram came out of the heart of Jani, (devoted lover) (that) Kamal Multani was accepted, on 17th of Rabiu-thani. Sincerely offer him a present by reciting the first chapter of the Quran."

XI. This is inscribed on the grave of Martyr Abdullah Beg in the Northern direction of Khwaja Dargah.

PLATE XI

۱ – هر که از دنیا گذشت از بهر دین – خانه عقبای او معمور باد
۲ – یارب آن مظلوم در روز جزا – یا حسین ابن علی محشور باد
۳ – چون شهادت یافت عبداللهبیگ – گفت هاتف مرقدش پرنور باد
۱۰۱۹

TRANSLATION

1. "Everyone who left this world for the sake of religion, may his abode of the future world be abounding in delight.

2. "O God may that oppressed (one) on the day of judgement be raised with Husain son of Ali. 3. "When Abdullah Beg attained martyrdom, the invisible speaker said, may his sepulchre be illustrious (lit. full of light.) In the year 1019 (1610 A.D.)."

XII. These are inscribed on a mosque near Bechi's well out. side the Qandhari gate, close to the Khwaja Dargah Nos. 4 & 5 are in Tughra. My reading of the inscriptions is as under:--

PLATE XII

۱ – مسجد آ کبیت العتیق – ۱۱۵۱
۲ – هذ ا بیت الله عالی مقا م – کعبه آسا سجده گاه خاص و عام
۳ – سال تعمیرش چو پرسیدم زعقل – گفت این مسجد بود فیض انام
۱۱۵۲
۴ – بسم الله الرحمن الرحیم
۵ – الله - محمد - علی (۲۰)

TRANLSATION

1. "This mosque resembles an antiquated house (Mecca) 1151 A.H. (1738 A.D.)

2. "Excellent : the House of God of high dignity. Like the square building of Mecca it is the place of worship (touching the ground wifh fore-head) for high and low.

VIII. This inscription is on the Northern wall near Andhera Mahal on the road leading to the Taluqdar's house at the back of the reservoir, opposite the mosque. It originally belonged to the house of Mughal Khan (a foster brother of Shah Jahan) which was situated at the back of Geti Burj.

(17) He was appointed Qiladar of Udgir in 1094 A. H. by the Emperor Aurangazeb.

PLATE VIII

۱ — ولد دوست بیک قوم مُغل — شده طیار این خجسته مکان
۲ — ساخته مرشد قلی خان دیانت خان
۳ — غره مُحرم سنه ۱۰۹۴

TRANSLATION

1. Son of Dost Beg of Mughal nationality this auspicious edifice was erected.

2. Constructed by Murshad Quli Khan son of Diyanat Khan.

3. Ist Muharram in the year 1094 (A.H.) (1682 A.D).

IX. These two inscriptions are engraved on a bronze gun of good workmanship, 7 feet long, which is lying on the top of the western tower of the Fort called Chandni Burj. The gun has the open mouth of a tiger for its muzzle and the figure of a lion on the breech.

PLATE IX

۱ — عمل اُستاد محمد ابن حسین رومی (۱۸)
۲ — ابو الغازی نظام شاه

TRANSLATION

1. Manufactured by Master Muhammad son of Husain Rumi.

2. Abul Gazi Nizam Shah.

X. This is on a small grave probably of a young lad, on the vaulted basement of Khwaja (19) Dargah inside the Qandahari gate and is in poor Nastaliq.

PLATE X

۱ — تاریخ وفات بر آمد از دل جانی
۲ — مقبول بشد کمال ملتانی
۳ — بتاریخ هفد هم ماه ربیع الثانی
۴ — اخلاص بر آن تحفه از فاتحه خوانی

(18) The Malik Maidan of Bijapur was made by the same man. In the history of Bijapur this inscription has been omitted.

(19) There is no inscription on the domed shrine of Shaikh Sadruddin Padsha Qadri better known as Khwaja Durgah. It is locally asserted that he came here about 800 years ago just after the demise of Udasgir Rishi.

TRANSLATION

1. O God, O Muhammad, O Ali.

2. In the reign of the King of the world, Murtuza Nizam Shah

3. This building was erected by Marjan of Farhad in the year 983 A.H. (1575 A.D.)

VI. This is inscribed on the left corner of the big arch of Sazawarul Mulk's house opposite the Taluqdar's quarters on black basalt. It is in poor Nasta'liq and is much obliterated, hence the reading of 3 is rather doubtful. I read it thus :---

PLATE VI

۱ – یا اللہ - یا محمد - یا علی
۲ – برین رواق ابد مُہر نامہ از لیست
۳ – از طفیل علی و آل علیست

1 O God, O Muhammed, O Ali.

2. On this eternal portico is the seal of eternity.

3. It is by the patronage of Ali and his descendants."

VII. This is inscribed on the front wall of the Tahsildar's Court House which was formerly called Farrash Khana. It originally belonged to the double storeyed house of Hatim Khan (17) which was situated on the right of Sazawarul Mulk's house and was considered to be a pigeon house.

PLATE VII

۱ – یافت در عہد شاہ عالم گیر — قلعہ داری قلعہ اودگیر
۲ – کمترین خانہ زاد حاتم خاں — کہ پراز اعتقاد داشت ضمیر
۳ – در سنہ الف اربع تسعین — کرد این قصر دل نشا تعمیر ۱۰۹۴ ھ
۴ – کاتبہ میر محمد عارف

TRANSLATION

Hatim Khan, the meanest child of the slave, who had a mind full of confidence, got the fort keepership of Udgir fort in the reign of Shah Alamgir. (and) In the year one thousand and ninety four built this exhilarating palace-1094 Hijri (1682 A.D.) written by Mir Muhammed A'rif.

(12,13 & 14) Ibid. Has entirely omitted these three inscriptions and the year at the end of V. (15 He was the son of Ali Bin Burhan Shah 1, and succeeded to the throne of Ahmednagar in 1009 A.D.

(16) Malik Marjan Hibshi was one of the Generals of Ahmednagar.

7. (and) that tower was completed in the month of Zul Qada, in the year 1047 A.H.-(1637 A.D.).

8. O the Eminent

9. O the Opener

10. O the Creator.

11. & 12. O the Constant.

13. Inscribed by Zainul Abidin

14. Under the supervision of Babu Khan.

15. Inscribed on the 2nd of Jamadel Ukhra 1048 A.H. (1638 A.D.)

IV (a & c) This inscription is written (twice) in Tughra on the big arch of the house of Sazawarul Mulk just opposite the Taluqdar's quarters.

PLATE IV (a and c)

يا مفتح الابواب (١٢)

TRANSLATION

O the opener of doors (lit. God)

IV (b) This is written in Tughra over the arched opening in front of the Taluqdar's quarters.

PLATE IV (b)

بسم الله الرحمن الرحيم

TRANSLATION

In the name of God, the Beneficent, the Merciful.

V. This is inscribed on the right corner of the big arch of the house of Sazawarul Mulk on black basalt.

PLATE V

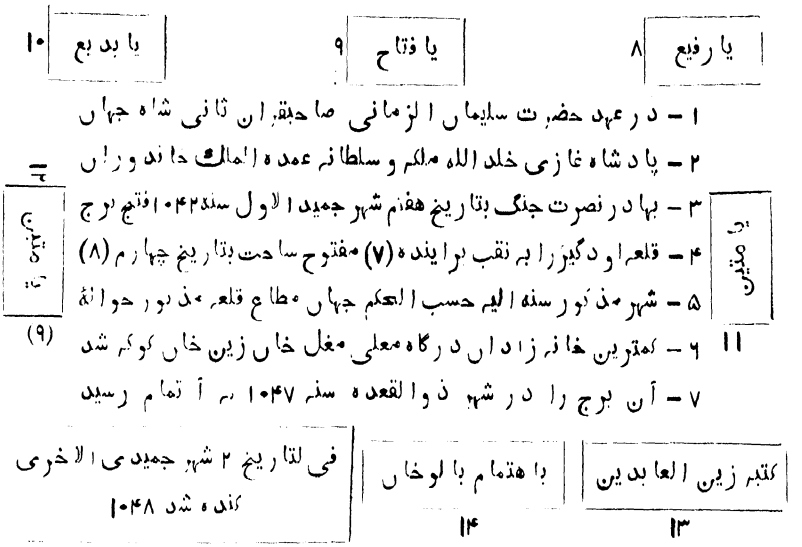
١ – يا الله - يا محمد - يا علی (١٤)

٢ – شاه عالم مُرتضی نظام شاه (١٥) ساطانی

٣ – این عمارت شد زمرجان (١٦) فرهاد خانی سنه ٩٨٣

(11) Moghul Khan, Nusrat Jung, a foster brother of the Emperor Shah Jahan, became Qiladar of Udgir in 1046 A.H. after Khudawand Khan who was Ist Qiladar of this Fort in the 9th regnal year of Shah Jahan.

PLATE III



TRANSLATION

1. In the reign of the Great Solomon of the Age the second Lord of the happy conjunction, Shah Jahan.

2. The victorious Emperor, may God perpetuate his reign and Empire. Umdatul Mulk, Khane Dauran.

3. Bahadur Nusrat Jung, on the 7th of the month of Jamadel-Awal in the year 1046 (A.H.) (1636 A.D.).

4. Took the Udgir Fort by destroying Fateh Burj (tower of victory) with mines, and on the 4th

5. Of the same month and year in obedience to the mandate which is obeyed by all the world the said fort was handed over to

6. The meanest child of the slaves of the sublime court, Moghul Khan (11) Zain Khan, Kokah (foster brother)

---

(7) History of Bijapur, Part 3, p.p, 27. He has wrongly read this to be نقب سرائیده

(8) Ibid. ditto. He has written چهاردهم

(9) Ibid. ditto. He has written یا معین

(10) Ibid ditto, This has been omitted altogether from the text.

The present fort was built about 899 A.H. (1493 A.D.). It is about 590 feet broad while the length is about three times the breadth. There is a deep trench on the South, while the sides and back have had a double ditch running round them. The rampart encircling the fort is high and strongly built of stone with bastions (2) at the angles and middle (3) of the sides. The front possessed at least three lines of defences of varying heights one behind the other, with a high tower at either end. Strong barbicans defend the only entrance into the fort which is approached by a narrow bridge thrown across the trench on this side. Before entering the fort, which is still in a fair state of preservation one has to pass three gigantic gates, the last of which owing to its darkness is called Andera Darwaza.

The following inscriptions are now decphired and edited for the first time from ink impressions prepared by Mr. T. Streenivas. Asst. Director of Archaeology, Hyderabad State. The language of the inscriptions is generally Persian and the style is for the most part Nastaliq.

1. At the right corner of Qandahari gate which is one of six gates of this village the following inscription may be found on a slab. My reading of the text is as follows:-

PLATE I

۱ – بحکم حضرت نوا ب مستطا ب جہا ن — وحید عصر سزا وار ملک (۴) عا لمشا ن
۲ – بنا نمود حسن خا ں یکی زقوم مغل — رواق و معبر و دروا زۂ زا طمینا ن
۳ – پس ا زفراق بنا وضع لفت تا ریخش — بسا ط معبر نو لا یق عبو رشہا ن (۵)
۱۲۱۰

TRANSLATION

The Moghal Hasan Khan, by order of illustrious Nawab excellent of the world, nonpareil of the age, Sazawarul Mulk (worthy of a great kingdom), built a portico and corridor and gate by the peace of mind. After the completion of the building (the poet) Waza pronounced thechronogram of its erection. The extensiveness of the new corridor is such that kings may pass over it,"---1210 (Hijri) (1795 A.D.)

II. This is inscribed over the Peta Gate :

(2) The Fort is surrounded by four big bastions viz Jamna Burj, Mang Burj, Geti Burj & Fateh Burj.

(3) Besides the above there are other 15 bastions.

The present fort was built about 899 A.H. (1493 A.D.). It is about 590 feet broad while the length is about three times the breadth. There is a deep trench on the South, while the sides and back have had a double ditch running round them. The rampart encircling the fort is high and strongly built of stone with bastions (2) at the angles and middle (3) of the sides. The front possessed at least three lines of defences of varying heights one behind the other, with a high tower at either end. Strong barbicans defend the only entrance into the fort which is approached by a narrow bridge thrown across the trench on this side. Before entering the fort, which is still in a fair state of preservation one has to pass three gigantic gates, the last of which owing to its darkness is called Andera Darwaza.

The following inscriptions are now deciphered and edited for the first time from ink impressions prepared by Mr. T. Sreenivas. Asst. Director of Archaeology, Hyderabad State. The language of the inscriptions is generally Persian and the style is for the most part Nastaliq.

1. At the right corner of Qandahari gate which is one of six gates of this village the following inscription may be found on a slab. My reading of the text is as follows:-

PLATE I

۱ – بحکم حضرت نواب مستطاب جہان — وحید عصر سزاوار ملک (۴) عالیشان
۲ – بنا نمود حسن خان یکی زقوم مغل — رواق و معبر و دروازۂ زاطمینان
۳ – پس از فراق بنا وضع هفت تا ربخش — بساط معبر نو لایق عبور شہان (۵)
۱۲۱۰

TRANSLATION

The Moghal Hasan Khan, by order of illustrious Nawab excellent of the world, nonpareil of the age, Sazawarul Mulk (worthy of a great kingdom), built a portico and corridor and gate by the peace of mind. After the completion of the building (the poet) Waza pronounced thechronogram of its erection. The extensiveness of the new corridor is such that kings may pass over it,"---1210 (Hijri) (1795 A.D.)

II. This is inscribed over the Peta Gate:

(2) The Fort is surrounded by four big bastions viz Jamna Burj, Mang Burj, Geti Burj & Fateh Burj.

(3) Besides the above there are other 15 bastions.

Inscriptions of Udgir

BY

SYED ALI ASGAR BILGRAMI

UDGIR is the headquarters of the taluq of the same name in Bidar District (Hyderabad) and is situated in 18° 24' N. and 77° 7' E. about forty miles to the west of Bidar. It has a strong fort which according to the local tradition was first inhabited by a Hindu Rishi Udling, or Udai-Gir, some eight hundred years ago. The fort was most probably built by Hindu Rajas and was subsequently fortified by Bahmani and Barid kings.

According to Farishta the forts of Qandhar, Ausa and Udgir were given as fief to Qasim Barid in 8-7 Hijri (1491 A. D.) who in 909 A.H. (1503 A.D.) usurped the Bahmani kingdom and entrusted the charge of this fort to his son Amir Barid. In 923 A. H. (1517 A. D.) Amir Barid fought a successful battle here with Khudawand Khan Habshi, a Jagidar of Mahur and killed him. Burhan Nizam Shah of Ahmednagar and Adil Shah of Bijapur utterly defeated Ali Barid in 952 A.H. (1548 A.D.) after which the fort of Udgir was annexed by Burhan Nizam Shah.

Later it was besieged by Shah Jahan's General Khane Dauran, Umdatal Mulk, in 1045 A.H. (1635 A.D.) and surrendered to him. In 1174 A.H. (1760 A.D.) a great battle was fought here between the Nizam and the Mahrattas. Nizam Salabat Jung and his brother occupied Udgir with 7,000 cavalry, but were surrounded by 60,000 Mahrattas. Desperate fighting continued for days and the Nizam was forced to agree to the terms of peace imposed by the Mahrattas.

According to Munim Khan, during the reign of Nawab Nizam Khan, Udgir was a purgannah of Nander Sarkar in Bidar Subah with 205 villages yielding a revenue of Rs. 2,66,907-8-0. At present it contains 207 villages of which 54 are Jagir and the land revenue is 3.1 lakhs.

---

(1) He was the second King of Ahmednagar, who succeeded in 904 Hijri (1533 A. D.) after the death of his father Ahmed Nizam Shah.

sprinkled with rupees, and soldiers were posted on both sides at regular intervals. Whoever was seen to stoop and pick up the money---such were the royal commands---was to be arrested at once, and brought before His Majesty. Nikammah, however, affixed thick pads of bees-wax to the soles of his shoes, and walked up and down the roads the whole day. He was thus able to remove a considerable sum unobserved by the stupid soldiers, who in their obedience to carry out the King's commands to the very letter, had their eyes fixed on the hands of each and every passenger, ready to pounce the moment any hand was seen reaching for the coins. They were, unable, however, to arrest a single man. Nevertheless, next day when the money was collected and weighed they found quite a number of rupees missing in spite of all their vigilance.

The King was duly informed of this fresh disappointment; in utter despair he had placards put up in all the streets, offering a large reward to the thief if he came forward and confessed to his deeds. Nikammah, knowing full well that his word only would be believed by no one, took all the evidence he could produce:---the King's purse, the Amin's presents, the Kotwal's uniform and the Vazir's gifts, and submitted them personally to the King in support of his claim. The King was surprised to find that a fellow who passed for a simpleton, had actually done such wonderful deeds, but kept his word, and Nikammah promised to live henceforth the peaceful life to which he had been accustomed until quite recently. But few people would believe that he was the real culprit. Foremost among the sceptics was the good woman whom he had served so faithfully while her husband was away. The latter returned shortly afterwards, and hearing of Nikammah's marvellous change of character adopted him as his son and heir.

M. A. R. K.

(Story told by an Indian lady and translated in June 1912. Re-written with slight verbal alterations in December 1928.)

'Marad jaise diste, chakki lekar piste'. He reached home without difficulty, and, once safe in bed burst into loud fits of laughter at the ignominious stupidity of the Kotwal---much to the wonder and annoyance of the mistress of the house. Before dawn the Kotwal's men came up with their master, and, seeing him in a strange garb and chanting the shameful song, could not help laughing.

When the news of the Kotwal's disgrace reached the palace the King was horrified, and urged the Vazir to attend to the affair personally, and rid his capital of the audacious thieves who had deprived him of all comfort for the past three days. After a late supper the Vazir set out armed with heavy weapons, swearing not to return home without capturing the cunning thieves who had disturbed the peace of the whole city. In his rambles outside the walls he came across a dhobi (washerman) banging a bundle of dirty garments on the ghat stone with the utmost steadfastness. He asked him rudely what he was doing. The dhobi answered meekly that he was washing clothes for a company of men that marched that way towards the city, punctually at mid-night. It was rather a hard task he said, as the clothes were often stained with blood, but he was paid liberally and so could not resist the offer. At the mention of blood the Vazir gave a start, but summoning all his ministerial courage, and perceiving in this account an excellent opportunity of capturing the thieves he told the dhobi, who was no other than our old friend, Nikammah, that he would stop with him to see those men. Hours passed, but there was no sign of any passer-by. To the Vazir's inquiry Nikammah gave the self-same reply that seeing two persons instead of one the men were hesitating to approach. The Vazir told Nikammah to put him into the large brass vessel half-filled with dirty garments, and cover it up till the men appeared, when on a signal from Nikammah he would have a peep at the cunning night-rovers. On the payment of a substantial bribe, Nikammah consented and after covering the vessel with the large washing tray he placed a heavy stone on the top of it and made off. The Vazir waited in the brass tub till he felt almost choked. He tried to get out, but the heavy stone prevented him from doing so. He shouted and blubbered until the patrol that had gone in search of him on his mysterious disappearance came upon the spot, and in the midst of jeers and insolent laughter pulled the poor half-dead minister out of his hiding place.

The King on hearing the news was dumb-founded. After a long consultation with his councillors he decided to catch the thief by the following unique method. All the principal roads of the city were

Amin romped and jumped, tumbled and fell---to the immense delight of Nikammah. The more the latter laughed and egged him on, the more violently the Amin carried on his capers. At last he lay on the floor, breathless and exhausted; Nikammah rolled him up into a bundle, dropped it into a large trunk near by and disappeared.

Early in the morning the patrol came to the Amin's tent to report of their unsuccessful night-watch, but they saw no signs of him. All at once a plaintive cry from the trunk startled them; they opened it, and, to their astonishment and horror, they found their officer bound in chains and weak as a suckling babe.

When the king heard of this he was more impressed by the thief's cunning than amused at the Amin's humiliation. Next night the Kotwal (Commissioner af Police) himself set out to catch the thief. Of course Nikammah came to know of this also, and dressed as a pisanhari (flour grinding woman), sat turning a hand-mill outside the city wall, at some distance from the main gate, singing from time to time in a cracked voice:

'Marad jaise diste, chakki lekar piste'. (With all the swaggering appearance of a man turning a hand-mill like a woman). Just after mid-night the Kotwal, on his rounds, heard this strange ditty, and was much surprised to see a woman grinding corn at that odd hour of the night, so far away from human habitation. He felt nervous but asked 'her' in a loud voice what 'she' was doing. 'Nikammah answered meekly that 'she' was a poor woman thrown out of employment, but of late, had found a means of subsistence in grinding corn for a company of armed horsemen that passed that way to the city every night. The Kotwal at once got into his head that those must be the very thieves that had caused such a turmoil in the city. All that had happened was, he thought, too elaborate to have been perpetrated by one man alone. Rejoiced at making this discovery he tipped the 'woman' and said he would stop with 'her' to see those horsemen. Nikammah consented, but after waiting a long time there was no sign of any passers by. The Kotwal got tired of waiting and asked Nikammah how it was that no horseman was to be seen. He suggested that perhaps the horsemen seeing on the spot two persons instead of one, got suspicious, and were hesitating to pass that way. The Kotwal readily believed this explanation, and begged Nikammah to exchange clothes with him, and go back into the city while he would sit at the hand-mill to decoy the horsemen. Nikammah appeared reluctant till he was tipped handsomely. As he was going towards the city-gate he heard distinctly the drone of the mill, and in a harsher and higher tone, the husky voice of the Kotwal pouring forth the ludicrous strain:

the purse from underneath the King's pillow and made off as fast as he could. Next morning he presented his mistress with the contents of the stolen purse. She tried to get him to tell her how he came by all that cash, but he gave such stupid answers that she thought it best not to bother about explanations, especially as the money had come at such an opportune moment.

Happiness returned to Nikammah's mistress. But it was quite otherwise at the King's palace. The slave, upon recovering from the trance, felt that something had gone wrong, and looking around perceived that the furniture had been moved. His restlessness awoke the King and they soon discovered that the royal purse was stolen. Next morning when the courtiers and officers of state assembled in the palace-hall to pay their usual homage, they found the King somewhat anxious and peevish. The Vazir soon learnt the cause, and ordered a vigorous search for the insolent thief. The Sadar-Amin (Senior Police Officer) was deputed to the work, and he gave orders for posting a cordon of Police round the City walls at night to catch the thief on his way to the city from his hidden haunts---never for a moment suspecting that the culprit might be lurking within the city itself.

Nikammah, who kept his eyes and ears open, soon came to know of these measures and at midnight dressed as a dancing-girl, with sparkling 'churis' (bangles) on her hands, heavy 'toras' on her ankles, a string of 'ghungrus' (small bells) tied round her legs, a gaudy 'kamar-band' encircling her waist, long showy 'malas' decorating her neck, a whole set of ear-trinkets and a shining 'teekah' poised on her fore-head, emerged from the city-gate to where the Amin was encamped alone. The music of Nikammah's ghungrus roused the Police Officer from drowsiness and he hailed 'her' with the delight of a gay old rake susceptible to the charms of the young and fair, silencing his spirit of discipline with the excuse that he would be able to keep awake better in the society of the 'beautiful damsel'. Wine flowed freely. Nikammah, new to this kind of exercise, danced in the most grotesque manner, but to the drunken eyes of the Amin this appeared most charming. Suddenly Nikammah spied in a corner hand-cuffs and chains, which the prudent Amin had kept ready at hand for the thief's capture; and with childish simplicity picked them up and said 'she' would entertain her cavalier with a dance wearing those 'ornaments'. This was too much for the gallantry of the chivalrous Amin. He gently took the irons away from Nikammah and begged 'her' help to put them on his own person so that 'she' could watch him dance. Nikammah laughed and did as he wished; but, unnoticed by the Amin, turned the padlocks as well. The poor

THE STORY OF NIKAMMAH

(OR NE'ER-DO-WEEL)

A FOLKLORE STORY OF THE DECCAN

ONCE upon a time there lived in a city a contented couple. They had no children, and could afford only one servant, named Nikammah, whose services were tolerated rather than utilised. He was hopelessly shallow-witted, and though not wanting in willingness rarely discharged satisfactorily any duty entrusted to him. All of a sudden the husband was called upon to leave the city on some important business. He gave his wife what little money he had saved, urging her to use it thriftily until his return. The wife accustomed as she was to simple living made the money go as far as it possibly could, praying day and night for the speedy return of her husband which, for some unknown reason, was delayed much longer than was expected. When the last coin was gone she took the shallow witted servant into her confidence, and told him how precarious their condition was. She had not the slightest faith in his capacity to help her out of the difficulty, but did so merely to relieve her mind by talking to somebody---as is the habit of women-folk generally. Nikammah listened to her with much concern, and, for the first time in his life, began to *think*. He sat in a corner, doubled-up, his chin resting on his knees---motionless as a statue. After a time he quietly walked out of the house without saying a word. The poor woman was much struck by Nikammah's thoughtful mood, which was so unusual; but when he had gone, she forgot all about him.

Nikammah left the house with a great determination. This was no less than to commit robbery in the King's own palace. On his way thither he bought of a druggist some salts which would cause the person who smelt them to lose consciousness. At dead of night he entered the King's bed-room, taking advantage of the darkness, the deep shadows of the palace walls, and, above all, the tipsiness of the guards. Luckily he found the slave who waited on the sleeping monarch snoring louder than his royal master---from the fatigue of long watching, or a heavy supper, or perhaps both. He forthwith held the druggist's salts close to the slave's nostrils so that there was no chance of his waking. Then quickly and stealthily Nikammah drew

insight, as mere whimsies without significance. They may be faint stirrings of the next thing that is destined to become fully alive. All that we can say is that the mind lives in a universe largely of its own creation, and that the universe, together with the mind, will change in ways we cannot foresee.

J. W. N. SULLIVAN

PASSION AND NATIONAL LIFE

Passion truly is a power in humanity, but it should never enter into national policy. It is a dangerous element in human life, though it is an essential part of our strangely compounded nature. But in national life it is the most dangerous of all guides. There are springs of power in ourselves which in passion we draw on and are amazed at their depth and intensity, yet we do not make these the master-light of our being, but rather those divine laws which we have apprehended and brooded upon, and which shine with clear and steady light in our souls.

As creatures rise in the scale of being the dominant factor in life changes. In vegetation it may be appetite; instinct in bird and beast; for man a life at once passionate and intellectual; but the greater beings, the stars and planets, must wheel in the heavens under the guidance of inexorable and inflexible law. Now the state is higher in the scale of being than the individual, and it should be dominated solely by moral and intellectual principles. These are not the outcome of passion or prejudice but of arduous thought.

A. E.

whatever in himself is powerful though inarticulate, upon his own passions and humours, the true essayist awakes in his readers the admiration of a soldier for his captain, the fondness of a lover for his last beloved. Intimacies stir and run out beneath the common soil, experience rains down and quickens the roots, and the thoughts of the author at length become the thoughts of the reader, his passions become our passions, his humours ours, his virtues and follies ours; for the main concern of any reader is with the author himself, and there is no bond so secure, no link so unrusting, as this that gleams between them. The literature of the last hundred years has seen the triumph of the novel, vast satrapies overrun and a border-war with science beginning..... Neverthless the Essay lives and thrives. Resuming metaphor for the last time it may be said that, like a huge oak, whose guttered trunk and fungus'd shoulder darkens the hill, the English novel stands boldly yet, his thin hair shaking in the cold winds; but the essay is like a thicket, changing and never dying, with dusks and deeps within, refuge of birds and shy wild beasts, home of strange and familiar voices.

JOHN FREEMAN

MAN AND NATURE

The proper attitude today in which the problem of man's place in nature should be approached is one of bewilderment and humility. Both the material universe and the mind of man are very mysterious things. At the present time it is only an inadequate mind which is confident that it knows what is impossible. There was never a time when hearty dogmatism and loud confidence were more out of place. We must think as best we can, of course. The next step upward in the development of the human conciousness will not be achieved by either slovenly credulity or slovenly scepticism, but only by a terrifying mental travail.

I see a human mind as some multiple plant, here in full flower, there in the bud. Different minds have flowered in different ways. Beethoven's greatest music points to the complete development in him of something which those of us who understand him have only in embryo. In those who do not understand him it is non-existent. And the great mystics ought at least to make us doubt whether is is we who are not deficient rather than they who are mad. It is rash to dismiss our exceptional moods, our strange flashes of what seem like

The strange part about it is that an idea need not be original. It seldom is. But it must be original to oneself. One often hears a statement of a truth which comes to one in the form of a revelation. And one says: "Why! of course, I've always thought that!" At the same time it has not been revealed to us before. It is as though there were a great common pool of ideas into which we are all allowed to dip. We draw out the ideas and they flow though our minds and when we have done with them they flow back again. And the pool is unfathomable, inexhaustible and terribly mysterious.

STACY AUMONIER

CRITICISM

A work of literature may possess significance of various kinds: it may be historical, ethical or aesthetic significance; that is, it may have importance at a particular phase of the human conciousness, or it may be valuable as expressing a particular attitude towards human life, or it may have more or less of a certain kind of artistic perfection which compels a peculiar artistic emotion in the reader. A work may have significance of one of these kinds, or all of them, or any combination of them. A critic is bound to have a predisposition towards one of these kinds of significance; he will be predominantly a historian, like Sainte-Beuve, a moralist like Matthew Arnold, or a technician like Dr. Bridges. He ought to be aware of his predisposition and alert to prevent it from running away from him. A perfect critic would combine all these predispositions in equal parts, but perfect critics are at least as rare as perfect writers. It is as much as one can ask that a critic should try to correct his predisposition by training his appreciation of other kinds.

J. MIDDLETON MURRY

THE ENGLISH ESSAY

My simple theme, then, is that the mere egotism of the author, freely confessed or subtly dissembled, forms the chief delight of the English Essay. Musing upon his own thoughts and instincts, upon

RANJI ON COVER-POINT

Prince Ranjit Singhji remarks on the splendid opportunities of cover-point, and cites the Rev. Vernon Royle as the cover-point to whom all cricketers give the palm during the last thirty years. "From what one hears," he says, "he must here been a magnificent fielder." He was. 'And I notice the fact, because Vernon Royle very be regarded as a concrete example of the typical fielder, and the typical fielder's value. He was a pretty and stylish bat; but it was for his wonderful fielding that he was played. A ball for which hardly another cover-point would think of trying he flashed upon, and with a single action stopped it and returned it to the wicket. So placed that only a single stump was visible to him, he would throw that down with unfailing accuracy, and without the slightest pause for aim... There were no short runs any where in the neighbourhood of Royle. He simply terrorized the bastmen; nor was there any necessity for an extra cover--now so constantly employed. In addition to his sureness and swiftness, his style was a miracle of grace. Slender and symmetrical, he waved with the lightness of a young roe, the flexuous elegance of a leopard---it was a sight for an artist or a poet to see him field.

FRANCIS THOMPSON

ON IDEAS

"I haven't an idea in my head!" How often does one not hear this expression! When stated by any kind of creative artist it implies a grave but usually temporary disorder. For the world is governed by Ideas. Indeed, the world wouldn't exist at all if some one hadn't had the *Idea* of a world. America wouldn't have been discovered if some one hadn't visualized an America. All the arts, sciences, religions, and philosphies owe their inception to an idea. The word comes from a Greek word which means 'to see.' And that is the whole point of Ideas. It is a question of mental vision. There is a twilight borderland where ideas dwell.....

One cannot force ideas, though they may be sometimes lured over the borderland. One has to lie in wait. Sometimes they creep out and gambol like rabbits at sundown. Then you have to seize one of the little rascals by the scruff of the neck and carry him off. And there is this to be said for them. Like rabbits they breed rapidly.....

in the government. He ushered them into his house and listenad gravely to their plea. Then, without a word, he turned, went to a basin of water, took a sponge and washed out his ears.

A. G. GARDINER
(Alpha of the Plough)

LLOYD GEORGE

To the question: "What do you think of the present state of affairs?" the Prime Minister replied:

"The eruption is subsiding: the lava in cooling. Black clouds have been shrouding the valley, but already I see glimpses of the sun upon the mountain-tops. The ship of state has been buffeted by squalls and hurricanes; and though the pilot's hair is now a trifle bleached, the port is in sight and we will soon slip anchor in calmer waters than those through which we have manfully ploughed."

"But," I said, "what of the Unemployment Question?"

"I am coming to that," answered the Premier.

"The sharks are surrounding the vessel, and we must throw them all the waste food we can spare to keep them from gnawing the rudder. They poison the waters about us, while we are prostrated with thirst. Sooner or later the crew must perish or overcome these despoilers of plenty...."

"How do you propose to deal with the serious question of high prices and lowering wages?" I broke in.

"I will tell you.", said the Premier "The corn is standing thick in the fields, but the reapers are wrangling in the market place..."

"Are there then *no* bright spots on the horizon?"

"I hear a rumbling under the earth.... Oh! that reminds me! I have to meet the Union leaders at the House in ten minutes. Good-morning. I think I have answered all your questions." And, with a gracious bow, Mr. Lloyd George slipped from the room.

HESKETH PEARSON

under which the living water roared and toiled fathoms below. The world of slang is a kind of topsy-turvydom of poetry, full of blue moons and white elephants, of men losing their heads and men whose tongues run away with them,-a whole chaos of fairy tales.

G. K. CHESTERTON

FLEET STREET NO MORE

Today I am among the demobilized. I have put off all the harness of a lifetime and am a person at large. For me, Fleet Street is a tale that is told, a rumour on the wind: a memory of far-off things and battles long ago. At this hour I fancy it is getting into its nightly paroxysm. There is the thunder of machinery below, the rattle of linotypes above, the click-click of the tape machine, the tapping of telegraph operators, the tinkling of telephones, the ringing of bells for messengers, reporters coming in with 'stories' or without 'stories,' leader-writers writing for dear life and wondering whether they will beat the clock and what will happen if they don't, night editors planning their pages as a shopman dresses his shop windows, sub-editors breasting the torrent of telegrams that flows in from the ends of the earth with tidings of this, that and the other. I hear the murmur of it all from afar as a disembodied spirit might hear the murmurs of the life it has left behind.....

For I have come into the inheritance of leisure. Time that has lorded it over me so long, is henceforth my slave, and the future stretches before me like an infinite green pasture in which I can wander till the sun sets. I shall let the legions thunder by while I tend my bees and water my plants, and mark how my celery grows and how the apples ripen.

And if, perchance, as I sit under a tree with an old book, or in the chimney corner before a chessboard, there comes to me one from the great noisy world, inviting me to return to Fleet street, I shall tell him a tale.

One day (I shall say) Wang Ho, the wise Chinese, was in his orchard when there came to him from the distant capital two envoys, bearing an urgent prayer that he should return and take his old place

THE FOUNTAIN

It was a month when the sun was a lion in the sky... I meant to fling myself down among the gorse between the cliff and the marsh when I saw a girl. It was as if a fountain had leaped out of the sand.

She was standing not ten yards away with her face towards me, but looking at the sea. She was dark, not tall, and slender, her eyes blue and cold and still. Her brow was like a half-moon under her brown hair, and was of a most pellucid purity and utterly serene. The blue of her dress was very cool against the yellow of the gorse. She might have been eighteen, not more. Her hair was wet and fell down over her breast and beyond her waist in two long plaits. She had seaweed in both her hands, and it hung down to the ground motionless, like dripping bronze.

I thought at once of a fountain in a desert. The purple heather and the yellow gorse were mistily and drowsily coloured and fragrant, and their fragrance and colour mingled and made one effect with the murmur of bees. My path lay within a yard of her, and I walked slowly up to her and past her, bathed in the freshness of her spirit. She moved a step or two forward that the interruption might be over more quickly.

My heart was beating fast, but not with hope. She was in another world from mine.... She was in sight for less than a minute as I went up from the sea over the moor, and when I turned in one of its hollows she had disappeared, and I saw nothing but sea and sky, which were as one.

EDWARD THOMAS

SLANG

All slang is metaphor, and all metaphor is poetry. If we paused for a moment to examine the cheapest cant phrases that pass our lips every day we should find that they were as rich and suggestive as so many sonnets. To take a single instance: We speak of a man in English social relations 'breaking the ice'. If this were expanded into a sonnet we should have before us a dark and sublime picture of an ocean of everlasting ice, the sombre and baffling mirror of the Northern nature, over which men walked and danced and skated easily, but

Once more on the road we went nearly all the way to Aloopka. The Tartars sang songs, the beasts of burden toiled; on one side the cliffs overwhelmed us, and on the other lay the dark sea on which the stars were peeping. The still night held us all.

STEPHEN GRAHAM

THE LATEEN SAIL

Now when during that great renaissance of theirs in the seventh century the Arabs left their deserts and took to the sea, they became for a short time in sailing, as in philosophy, the teachers of their new subjects. They took this sail which they had found in all the ports they had conquered along this coast---in Alexandria, in Cyrene, in Carthage, in Caesarea---they lightened and lengthened the yard, they lifted the peak up high, they clewed down the foot, and very soon they had that triangular lateen sail which will, perhaps, remain when every other evidence of their early conquering energy has disappeared. With such a sail they drove those first fleets of theirs which gave them at once the islands and the commerce of the Mediterranean. It was the sail which permitted their invasion of the northern shores and the unhappy subjection of Spain.

We Europeans have, for now some seven hundred years from at least the third Crusade, so constantly used this gift of Islam that we half forget its origin. You may see it in all the Christian harbours of the Mediterranean to-day, in every port of the Portuguese coast, and here and there as for north as the Channel..... The little ships, so rigged, come out like heralds far from the coast to announce the old dominion of the East and of the religion that made them: of the united civilization that has launched them over all its seas, from East of India to South of Zanzibar. They are the only made thing, the only form we accepted from the Arab: and we did well to accept it The little ships are a delight.

HILAIRE BELLOC

'material progress' she is easily ahead of the world. Never was the apparatus of life so skilfuly turned and handled as in New York. There are no two fixed points which are not easily connected by iron lines. There seems no reason why a citizen of New York should ever walk. If stairs exist, he need not use them, for an express lift, warranted not to stop before the fifteenth floor, will carry him in a few seconds to the top of the highest building. If he opens a cupboard door, the mere opening of it lights an electric lamp, and he need not grope after a coat by the dim light of a guttering candle. At his bed-head stands a telephone, and, if he will, he may speak to a friend a thousand miles away without moving from his pillow. But time is saved---of that there is no doubt. The only doubt is, whether it be worth saving. When New York has saved her time, what does she do with it? She merely squanders it in riotous movement and reckless 'transportation.' Thus she lives in a vicious circle---saving time that she may spend it and spending it again that she may save it. Nor can this material progress be achieved without a loss of what the Old World prizes most highly. To win all the benefits which civilization affords, you must lose peace and you must sacrifice privacy. The many appliances which save our useless time may be enjoyed only by crowds. The citizens of New York travel, live and talk in public. They have made their choice, and are proud of it.

Englishmen are still reckless enough to waste their time in pursuit of individualism, and I think they are wise.

CHARLES WHIBLEY

TRAMPING IN THE CRIMEA

At one of the many turnings of the road I came upon five dreamy waggons, and Tartar waggoners walked by the horses, for the loads were heavy. I made friends with the third waggoner, and he asked me to carry his whip and take his place whilst he talked with one of his mates. For eight miles I walked by the side of the plodding horses, and encouraged them or whipped them, coaxed or scolded them, as they slowly dragged their lumberous merchandise along the dark and heavy roads.

I almost fell asleep, but at an inn half-way I drank tea with the waggoners 'cheek by jowl and knee by knee,' and they saw me as one of themselves.

LONDON BY MOONLIGHT

Luckily, in the beginning, there were created, along with the earth, a sun and a moon, and neither policeman nor magistrate nor any other creature has any power over them, of regulation or control. It is the moon that makes London by night beautiful in war-time. It is the moon that makes the North side of Trafalgar Square white with romance like a Moorish city, and makes the South Kensington museum itself appear as though it had been built to music. London under the moon is a city of wonder, a city of fair streets and fair citizens. The arc-lamps in their cowls seem feeble and insignificant as dying torches when the moonlight performs her miracles and exalts this city of mean dwellings into a beauty equal to that of the restless sea.

ROBERT LYND

FEZ

The little alleys wind in and out among the houses. Sometimes they vanish into tunnels under the piled city, or pick their way across the chessboard shadows of a reed-roofed market. The blue sky comes suddenly round corners, and swarming streets end in the little hill-streams which pour through Fez. There is a sound of rushing water everywhere in the city. It goes whispering under humped Moorish bridges and mutters like a stage conspirator in little strangled tunnels beneath the heaped grey houses. The great town had seemed so silent from the hills above. But down in the maze, where the veiled women slip discreetly by in the half-darkness of the streets, it is alive with little sounds. Whispering water, the slow lilt of men at work, snatches of high, wailing, minor plain song (Spain learnt its music at the knees of Africa), low chants from little schools, the tapping hammers of the coppersmiths, are all caught between the tall, blind walls; and the hooded men crouch talking at every corner.

PHILIP GUEDALLA

NEW YORK

With all her undying haste New York is not content. She must still find other means of saving time. And to save time she has strained all the resources of civilization. In that rather dismal thing called

The Essay, like free verse, is the medium of expression of all who feel and think in the leisurely, discursive way in which life moves away from the great cities. Much that is beautiful and of high human value is lost to the world just because the people to whom it happens hesitate to write about it: they imagine they are not able to do so. They regard writing as a mystery; they are under the delusion that the skilled craftsmanship which they do not possess, or something equally beyond their reach called 'fundamental brainwork', are essential to all good writing. They may be. But it is an inspiring fact that if we only put down faithfully what we see and hear, we are well on the way to making literature.

A thousand read George Borrow, ten thousand read Dickens, for one that reads Herbert Spencer. Human life, with its multifarious interplay, is for ever taking new and surprising form and attitude. These melt into one another so rapidly that they pass by us as a stream we have long ceased to notice. But let a keen pair of eyes like those of Gilbert Chesterton or Henry Williamson come along, and what wonderful things are revealed where we saw only the dullness of life.

For students the essay is the natural form of composition in prose, and it is this alone we are attempting in our classes in this college. But it is just as difficult to persuade students to let themselves go when writing as it is to teach swimming to beginners. In each case we have to move in a new medium. In most of the three hundred pages I have each week to reshape or lend a hand to, deploringly or admiringly, the English is echoic of books and newspapers rather than of first hand experience in one's own language; an Indian student has the additional effort of translating into the foreign tongue; and the more homely the subject the more difficult the task. How few could write in a foreign language an account of the doings of little children! For such a subject the student has nothing to fall back on in his reading, for Little Me, W. V., and Christopher Robin never come toddling into our classrooms. So he turns from the task of translating the experiences of his own home into English, probably thinking them of small moment, and falls back on all too obvious generalities.

To give some idea of the various kinds of interest possessed by contemporary Essays, there follow a few extracts from, mostly, living writers of mark. The best collection of recent work is that entitled *Essays of Today and Tomorrow*, now in twenty four volumes at only one shilling each. They are published by Messrs. Harrap, for whom in India the Oxford University Press act as agents.

By one peculiarity the Essay stands apart from more precise forms of literature. In an ode or a sonnet or a quatrain, as well as in fiction and drama, our interest is objective: we look at it as a gem or a jewel, and the more nearly it approaches perfection the less are we drawn to the poet himself. Indeed a successful poem is like a lovely bird that flies away from its creator for ever; we watch its flight and listen to its song without a thought of its nest or nurture.

But as Essay is deliberately subjective; it shows us the author at work or as an idler; it takes you into the house and even into the kitchen. And so, isolating for us many of the little happenings of our daily life and thought which we let slip by without notice, it often performs one of the greatest miracles of art,---the revelation of supreme beauty in what we call the commonplace. Some of the most moving passages in our literature are to be found in the Essay.

A true poem is a condensation, a concentration, a crystallization of human emotion or intellectual energy,---and so part of the world of created things. An Essay is a glimpse of the creator at work, of his affections and his aversions, of his relations to his fellows and his circumstances. It shows us his trust and his mistrust, his fetters and his freedom; it is, most frequently, a frank display of a man and his material, not as yet fused into any lasting form.

An Essay may contain almost anything but lengthy statistics,---though even statistics treated by a poetical astronomer can prove fascinating. The modern essay gives us, in solution, a good deal of psychology, of sociology, of history, ethnology and even cosmology, besides mere garrulity, banter, persiflage and picturesque mendacity. It may be written in prose with the least pretension to style, and it may contain the deepest pathos and the truest poetry. It has, as other forms, become the vogue from time to time. At the present moment Essays are being written on every side, partly in reaction to the flood of fiction, partly as a change from irregular verse. These latter-day Essays embody not so much the wisdom of the past as the piquancy of the present. For a leading trait of their manner is the effort to avoid heaviness. Their matter has the variety of life itself. The Essays of Bacon and his followers were in the main reminiscent, aphoristic and close-packed; those of a century later were ingenuous or seemingly ingenuous reflections of contemporary society; while to-day, parallel with the extraordinary many-sidedness of life, all these qualities and their opposites are represented, together with much that is exotic, rebellious and fantastic.

Notes on the Modern Essay

BY
E. E. SPEIGHT.

THE Essay is the simplest and least organised of literary forms, so simple indeed that it was only discovered long after many elaborate literary forms had become perfected.

The name Essay has been given to writings of very varying length, from Bacon's of little more than a page to Locke's famous book on the Human Understanding, of 1690, and the English translation of one of the most valuable books of the last century, Lotze's *Microcosmus*, a work of 1500 pages. But I am here treating of the friendly, often unpretentious and discursive composition which at its best is like a talk by the hearth. The subject may be anything, but the treatment should not be pedantic if we are to be kept awake. The faults of the Essay are omniscience, affectation and dullness. Laughter or bright pages should be made of any subject save those which move us to deeper emotions.

The usual attribution of the invention of the Essay to the French nobleman Michel de Montaigne at the end of the sixteenth century is to be found in all histories of literature. Certainly it is to him that we owe the particular use of the word Essay for trial pieces of prose, and also the first recognition of the possibility of a formless form of writing that should yet have great human interest. But this was no more the beginning of either the matter or manner of the essay than is the popular story of Aphrodite rising from the sea-foam likely to be more than a poetical bit of false etymology. The great things of art are not born suddenly---they are bound up with the slow development of their own particular universe; and in the universe of literature one of the most fascinating things is the discovery of organic interconnection. The Essay as we find it in Montaigne is an expansion of the meditation of the classical world, on the verge of the new world realized by Bruno. Its roots go down to the letters and notebooks of Cicero and the two Plinies, the reflections of Seneca and Plutarch, and the characters of Theophrastus, to Plato, Euripides and even further into human records. Wherever diaries were kept and letters written, men and women were feeling for the Essay.

Urdu Section—(Contd.) Page

M. HABIBULLAH RUSHDI M, A., (Old Boy)

7 Man and Energy 34

A. M. FAIZ MUHAMMAD KHAN (M. Sc. Previous)

8 A Voice from the Meadow (a poem) 52

M. ABDU'L-QAYYUM M. A. (Osmania)

9 Bhu'bhu'ti, the Famous Sanskrit Dramatist 54

RHAGHUNATH RAO Bhusari (LL. B. Osmania)

10 Ra'j Kuma'ri' (a poem) 63

A. K. M. BADRU'D-DIN, M. B., B. S. (Student)

11 Arrangement of Post in Egypt and Syria during the Eighth Century Hijri .. 65

M. HAMIDULLAH (M. A. Final)

12 Nature and Life (a poem) 76

M. JALALU'D-DIN (Editor Urdu Section)

13 Urdu Prose and the Late Azmatullah Khan of Dehli .. 77

Mr. S. WAZIR HASAN

14 Graveyard in the Dark 94

MAS'UD HASAN (LL. B. Previous)

15 An Architechtural Study of the Mosque 96

M. AKBAR WAFAQANI

16 Quatrains: (An expression of self) 125

MAWLAWI SAYYID AHMAD HUSAIN *Amjad*

17 Persian Literature before the Islamic Conquest (An abridged translation from R. Levy's *Persian Lit.*) .. 126

SAYYID MUHAMMED, M.A. (Old Boy) Lecturer City College

18 The Voice of Nature (a poem) 137

M. BADRUDDIN SHAKIB, B. A. (Old Boy)

19 Persian Odes of Ghalib (a critical study) 139

M. ABDU'L QAYYUM M. A.

20 Avesta: (An abridged translation of the Introduction of A. V. W. Jackson's Avesta Grammar) .. 161

M. JALALUDDIN (Editor Urdu Section)

21 Greatness in Poetry (translation of Dr. Latif's Chapter VI from "Ghalib") .. 171

S. MOINUDDIN QURAISHI, M. A.

22 Review of Payam-i- Mashriq of Dr. Sir Muhammed Iqbal (translation from Islamica) .. 181

M. HABIBULLAH RUSHDI, M. A. (Osmania)

23 Mahrum-i-Khwa'b (translation of a Short Story). . .. 199

ZAHIRUDDIN AHMAD M.A. H.C.S. (Old Boy)

24 Naqsh-i-Shaba'b (translation of a Short Story) 207

QAZI ARAM (Old Boy)

25 College News 226

M. JALALUDDIN Editor Urdu Section

CONTENTS

ENGLISH SECTION

		Page
1	Notes on the Modern Essay .. .. Prof. E. E. SPEIGHT	143
2	The Story of Nikammah (or Ne'er-do-Weel) .. .. M. A. R. K.	156
3	Inscriptions of Udgir .. .. SYED ALI ASGAR BILGRAMI	161
4	The Old and the New .. .. BY A STUDENT	175
5	Electric Storms .. .. ENOS MILLS	176
6	Industrial Possibilities in Hyderabad .. .. .. AHMAD ABDU'L-AZIZ M. A., Alig. (Old Boy)	180
7	Some Welsh Proverbs .. .. Prof. E. E. SPEIGHT	195
8	The Pomegranate Queen .. .. SYED ZAINU'L-ABIDIN III year	205
9	The Thief Prince .. .. ABU TURAB ALI SIDDIQI III year	206
10	Modern Turkey .. .. HAMIDUZ-ZAFAR IV year	210
11	Artistic Impulse: Its Genesis and Florescence .. .. MOHD. ABDU'L HAKIM, B.A. (Osmania) Old Boy	217
12	Translations from Ghalib .. .. M. ABDU'L-QAYYUM, M.A. (Osmania)	229
13	Children and Old Folk .. .. IVAN CANKAR	233
14	Ferid .. .. VLADIMIR TRESCHEC	236
15	The Study of Poetry .. .. Prof. T. VIRABHADRUDU	241

URDU SECTION

1	Phonetics .. .. Prof. S. SAJJAD, M. A.	1
2	Nitches full of Mysteries *a poem* .. .. .. Mr. SHABBIR HUSAIN *Josh*	7
3	The Imagination and Conception of God .. .. MIR HASNU'D DIN, B. A., LL. B. (Old Boy)	9
4	A Ghazal (in Persian) .. .. NAWAB ZIYA YAR JUNG BAHADUR	18
5	Hali: A Study of his Poetry .. .. M. ABDU'L-QADIR SARWARI Asst. Prof. Urdu	19
6	Translation of a Poem on the City of Hyderabad by Mrs. Sarojini Naidu ..	33